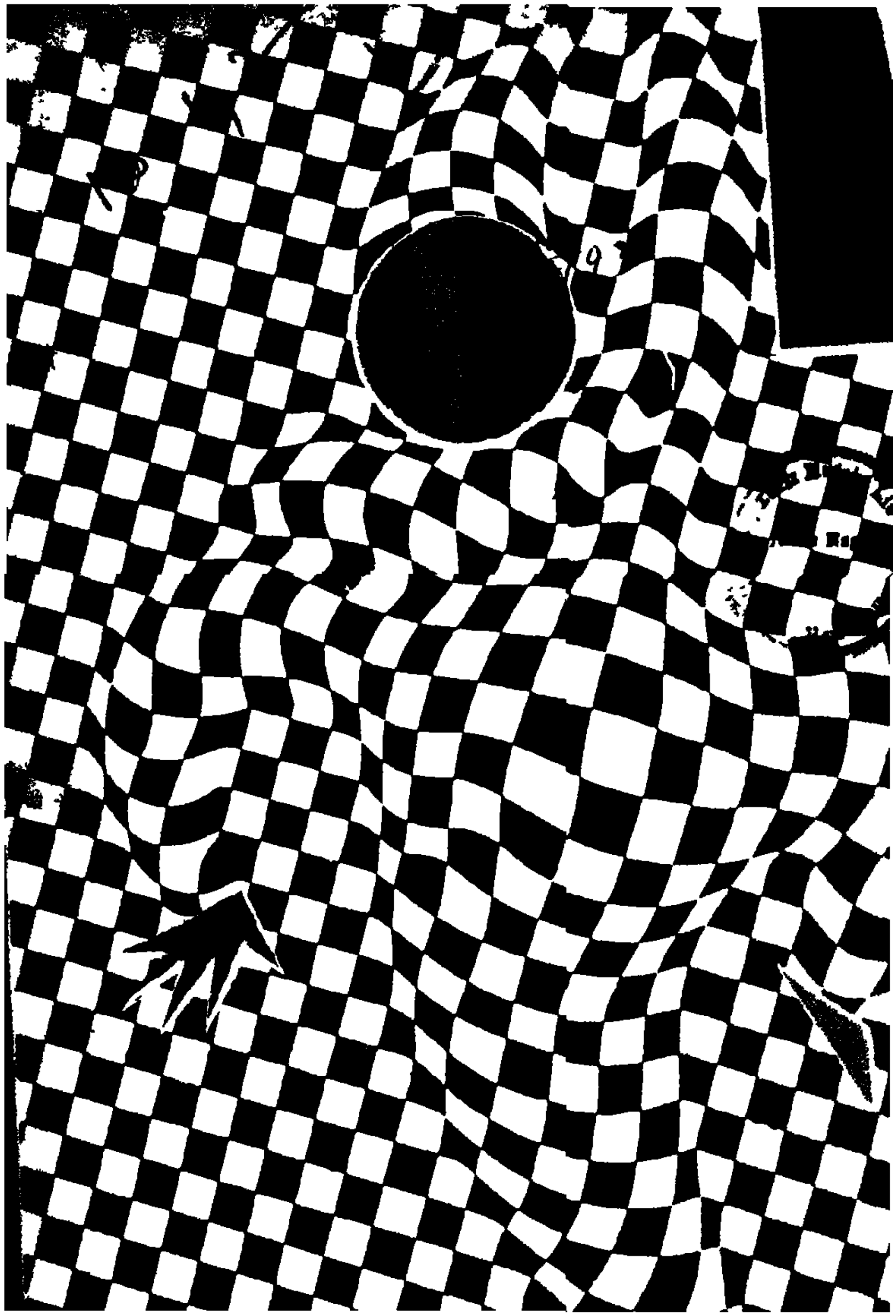


عالمی اردو ادب کی سب سے بڑی تاریخی

دستاویز

ایک ناتمام اشاریہ

شاعری — تازہ کارِ عصر [تین سو شعراء کا انتخاب مع تصاویر]
افسانہ — ڈراما [غیر مطبوعہ جدید ڈرامے] — ناول [چند غیر مطبوعہ نئے ناول]
طنز و مزاح [شگفتہ تحریریں] — خاکے [شخصی و سوانحی] — تنقید [تمام اصناف]
تحقیق [عصری اردو تحقیق کے مسائل] — ادبی مذاکرے
مکالمہ [مشاہیر قلم کاروں سے] — چہرہ چہرہ یادیں
آثار لفظ لفظ [مکاتیب مشاہیر کے عکس مع حواشی] — نقد و نظر [اہم کتب و رسائل]
یہ صورت گر [قلم کاروں کی تصاویر] — سوانحی اشاریے [خاص نمبر کے قلم کار]
اردو کی نئی بستیاں — غزل کا سفر [مسائل و مباحث اور انٹرویوز] — وفیات
سفرنامہ — انشائیہ [شگفتہ تحریریں] — بازیافت [نادر کتب کا تعارف]

توقیتِ میر ✿ توقیتِ سیماب

ان سب کے علاوہ بھی وہ بہت کچھ جو صرف

شاعر

کی تخلیق ہو گا

✿

مزید تفصیلات کا انتظار کیجئے

فکر امروز



شعر کی عروضی و لغوی کی تعریف سے اس وقت بحث نہیں۔
اس زمانے میں شعر کا مفہوم یہ ہے کہ دل میں چبھنے والا
ایک نشتر اور تکلم کی عام سطح سے بلند ایک کلام ہو۔
یعنی جو خیال شعر میں نظم کیا جائے وہ عامۃ النّاس
کے خیالات عام خیالات سے متوازن ہوں تو شاعر
ان کے موزوں کرنے کے سوا اور کوئی امتیاز نہیں دیا
جاسکتا۔ میری دانست میں ہر خیال کے نظم
کر دینے کا نام شاعری نہیں بلکہ شاعری نام ہے
خیالات کے بلند و محفوظ کی موزوں ترجمانی کا۔
اور شاعری نام ہے اس تصویر میں جان ڈالنے کا
جو نقشِ فطرت شاعر کے دماغ پر مرتسم
کرتا ہے۔

[۱۵ / جون ۱۹۳۵ء]

سیماب اکبرآبادی

شاعر

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم
جاری شدہ ۱۹۳۰ء
بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم
اشاعت کا ۶۴ واں سال
علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد — ۶۴
شمارہ — ۱
فون: ۳۵۹۹۰۴

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاون

ناظر نعمان صدیقی

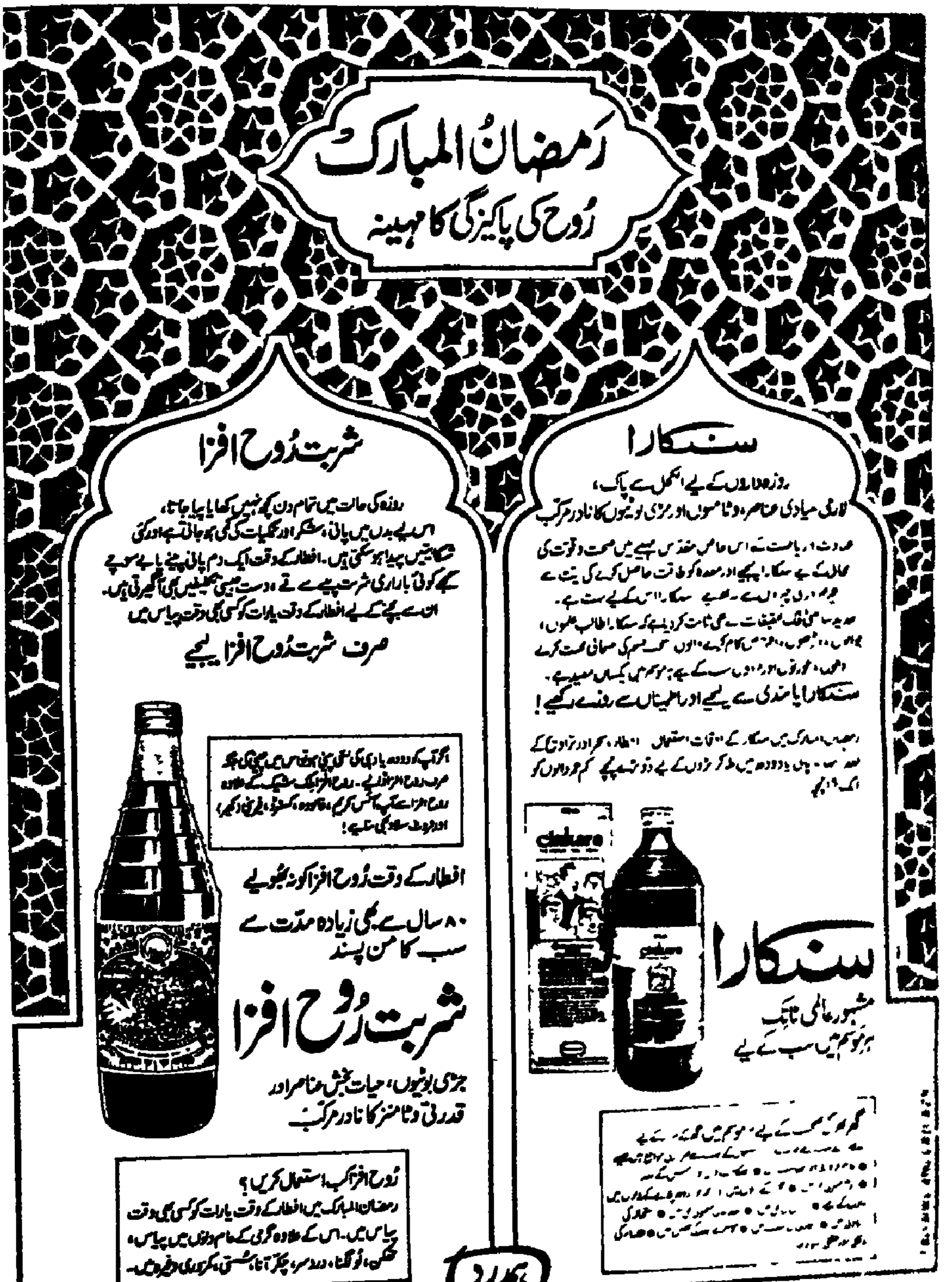
قیمت ۸ روپے

زرِ سالانہ ۶۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۷۵ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۸


رمضانُ المبارک
رُوح کی پاکیزگی کا مہینہ
شربت رُوح افزا
روزہ کی حالت میں تمام دن کچھ نہیں کھایا پیا جاتا،
اس لیے بدن میں پانی، شکر اور نمکیات کی کمی ہو جاتی ہے اور کئی
شکایتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ افطار کے وقت ایک دم پانی پینے یا بے سوچے
کوئی بازاری شربت پینے سے، دست جیسی تکلیفیں بھی آ گھیرتی ہیں۔
ان سے بچنے کے لیے افطار کے وقت یا رات کو کسی بھی وقت پیاس میں
صرف شربت رُوح افزا پیجیے
افطار کے وقت رُوح افزا کو نہ بھولیے
۸۰ سال سے بھی زیادہ مدت سے
سب کا من پسند
شربت رُوح افزا
جڑی بوٹیوں، حیات بخش عناصر اور
قدرتی وٹامنز کا نادر مرکب
رُوح افزا کب استعمال کریں؟
رمضان المبارک میں افطار کے وقت یا رات کو کسی بھی وقت
پیاس میں۔ اس کے علاوہ گرمی کے عام دنوں میں پیاس،
تھکن، لُو لگنا، درد سر، چکر آنا، سستی، کمزوری وغیرہ میں۔
سنکارا
روزہ داروں کے لیے الکحل سے پاک،
لازمی میاتی عناصر، وٹامنوں اور جڑی بوٹیوں کا نادر مرکب
سنکارا پابندی سے پیجیے اور ناطاقتی سے دور رہیے!
سنکارا
مشہور عالمی ٹانک
ہر موسم میں سب کے لیے
ہمدرد

مقالات

نئی نفسیات نئی شعری کائنات

نظمیں

غزلیں

کہانیاں

طنز و مزاح

[illegible]

جرعات

مکتوبات

شمارہ نمبر۔ ۱ [۱۹۹۳] جلد۔ ۶۴

نئی نفسیات۔ نئی شعری کائنات

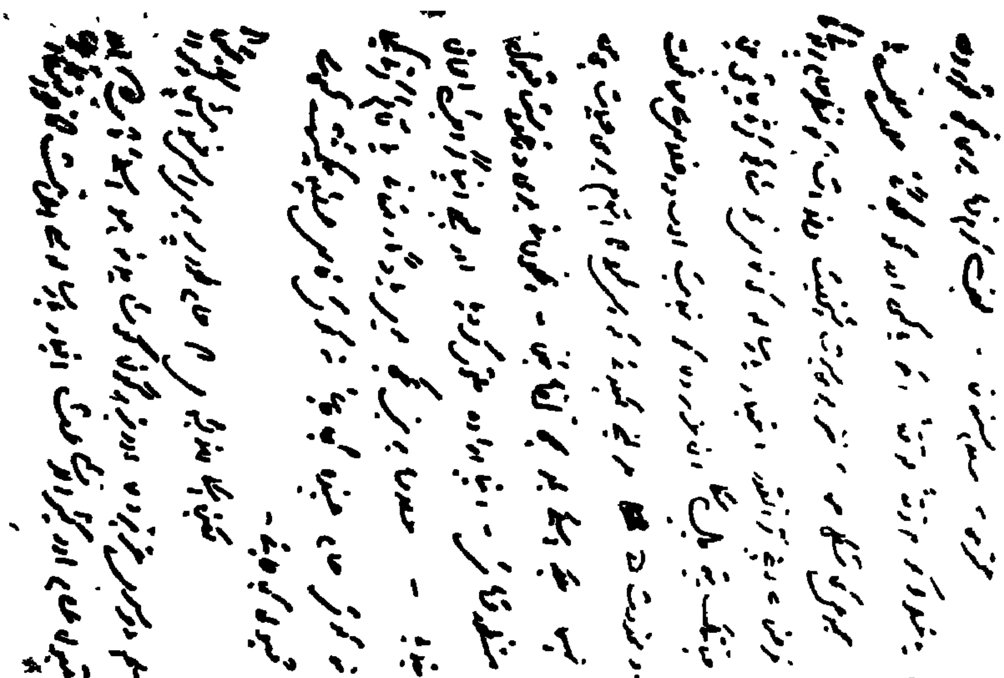
"شاعری سے کچھ وقوع پذیر نہیں ہوتا"

شاید اس جملے کا مفہوم یہ نہ ہو کہ مادّی اور عملی جدید عہد میں شاعری صرف سجے سجائے خوبصورت جملے ہیں۔ اس کے برعکس یہ ہو سکتا ہے کہ شاعری قوّت کا وہ سرچشمہ ہے جو ہمارے اندرون کے خالی پن کو کارآمد بناتی ہے۔ زبان اپنی جمالیاتی حدود کے ساتھ اس "کارآمد" سے تجربوں کو تخلیق کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ اس لئے شاعری صرف کسی وقوعے کی پیش کش نہیں ہے۔ ہاں! کوئی بھی فن پارہ اپنے آپ میں ایک تخلیقی وقوعہ ضرور ہے۔ اگر وہ فن پارہ ہے تو۔

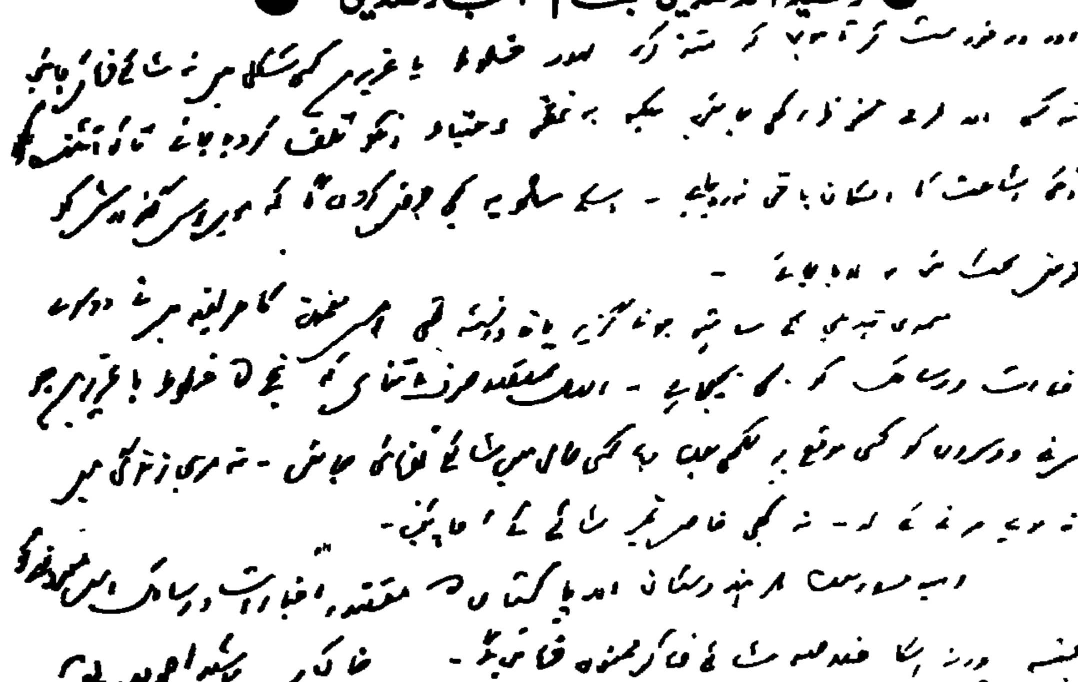
صدیوں سے شاعر کا کم و بیش یہی کام رہا ہے کہ وہ انسانی لاشعور کی تہوں، الجھنوں اور دلی محسوسات کے اندراجات، تفہیم، تجربوں کا جشن اور اُن کی ترسیل، اشیاء کا تعیّن۔ ان سب کے ذریعے خود شاعر کی زندگی اور اُس کے آس پاس کی زندگی کی عدم مرکزیت، بے ترتیبی اور سراب در سراب لمحوں کا تخلیقی اظہار کرتا رہا ہے۔ مگر نامعلوم جہانوں کی سیاحت بھی۔ ارتقاء پذیر دنیا کے تغیر و تبدل پر شاعری اثر انداز بھی ہوئی ہے۔

نیا تخلیقی ذہن، ختم ہوتی ہوئی صلیب صدی کو اپنے آپ میں جذب کرتے ہوئے ایک نئی صدی کی دھمک کو محسوس کر رہا ہے اور ایک بالکل مختلف سائیکی میں جی رہا ہے۔ وہ رد کر رہا ہے پہلے سے طے شدہ مفروضوں اور کلیوں کو۔ وہ لفظوں کو برت رہا ہے۔ مگر نئی بصیرتوں اور نئے سماعی، لہجوں کی تلاش میں بھی ہے۔ لفظ کے تمام لغوی اور تمام معلوم معنی تقریباً بے روح محسوس کر رہا ہے۔ دنیا کے شب و روز کی میکانکیت سے وہ اوب گیا ہے۔ زمان و مکاں کی لامحدودیت میں نیا ذہن خود کو محدود اور اجنبی تصوّر کرنے لگا ہے۔ وقت سے ماوراء ایک نئے وقت کا خواب دیکھنے والا۔ اجتماعی لاشعور سے کائنات کے ایک نئے شعور کا متلاشی ہے۔

(جاری)



رشید احمد صدیقی بنام اعجاز صدیقی



رشید احمد صدیقی [پ: ۲۴ دسمبر ۱۸۹۲ء۔ م: ۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء] کے ایک خط کا عکس پہلی بار شاعر کے صفحات پر دیا جا رہا ہے۔ مذکورہ خط کا متن ۱۹۶۳ء کے شاعر میں شائع ہو چکا ہے۔ نفسِ مضمون کا کچھ حصہ ان کے مکاتیب میں موجود ہے [بنام شبلی صدیقی ۳۰ اگست ۱۹۶۳ء] پروفیسر مسعود حسین خاں نے ان خطوط کو "ادب لطیف" [رقعاتِ رشید صدیقی ص۱۵] کہا ہے ——— شاعر کے کرشن چندر نمبر (۱۹۶۷ء) کے بعد رشید احمد صدیقی نمبر کا اعلان ہوا تھا مگر رشید صاحب اس نمبر کے لیے خود کو آمادہ نہ کر سکے۔ رشید صاحب کی سخت ناپسندیدگی کے باوجود ان کے انتقال کے بعد چار مجموعے شائع ہوئے۔ مکاتیب رشید احمد صدیقی مرتبہ خلیق احمد نظامی ۱۹۷۶ء، مکاتیب رشید [جلد اول] مرتبہ: سلیمان اطہر جاوید [۱۹۸۰ء] رقعاتِ رشید مرتبہ مسعود حسین خاں۔ [۱۹۸۷ء] خطوط رشید احمد صدیقی مرتبہ لطیف الزماں خاں [۱۹۸۸ء] تبصرہ اعجاز صدیقی [م: ۱۹۷۸ء] کے نام رشید صاحب کے بہت سارے ذاتی نوعیت کے خطوط، شاعر کے بہت سے خطوط کے ساتھ ہمارے مستقل شعبے سرد سامانی میں کہیں گم ہیں۔ [ادارہ]

محمود ہاشمی

۲۰۲۹ - روڈ گران، لال کنواں، دہلی - ۶

مجاز: کچھ سوالوں کے نرغے میں

ایک ایسے اجتماع میں جو مجاز کے نام سے منسوب ہے۔ اور لکھنؤ میں منعقد ہو رہا ہے۔ مجاز کے فن کا کوئی معروضی جائزہ پیش کرنا معاشرتی تعصبات کے اعتبار سے خاصا مشکل کام ہے۔ اس لئے کہ لکھنؤ ہی وہ شہر ہے جس سے وابستگی کے باعث، مجاز کو شاعرِ شہرِ نگاراں کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔

ادب کے طالب علموں کو یہ آگہی حاصل ہے کہ مجاز اپنے وقت کے مقبول ترین شاعر رہے ہیں۔ ان کے بارے میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند ناقدوں کی آرا، ان کی وفات کے بعد شائع ہونے والے ادبی رسائل کے ضخیم نمبر، ان کی زندگی اور شاعری کو بنیاد بنا کر لکھے جانے والے ناول۔ ان کی WIT اور WISDOM کے قصے اور عوام و خواص میں ان کی بے پناہ مقبولیت اور محبوبیت کی داستانیں آج بھی ادبی فضا میں موجود ہیں۔ لیکن تین دہائیاں گذر جانے کے بعد آج کی ادبی فضا میں مجاز کی شاعری یا ان کی شاعری کا وہ پرانا وقار کہیں نظر نہیں آتا۔ مجاز کا مجموعۂ کلام باقی ہے، لیکن ان کی شخصیت کا وہ والہانہ پن اور ان کی شاعری کے قدر دانوں کا وہ حلقے اب موجود نہیں ہیں۔ جن کے باعث اس تمام عرصہ میں مجاز کے فن پر وقتی شہرت اور قدر دانی کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ چنانچہ اب مجاز کا معروضی مطالعہ اور ان کے فن سے متعلق بعض سوالات قائم کرنے کی گنجائش پیدا ہو گئی ہے، لیکن ابھی یہ سلسلہ شروع نہیں ہو سکا ہے۔

مجاز اپنے ایک شعری مجموعے کے ذریعہ آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں، لیکن اب یہ مجموعہ، وقت کے بدلتے ہوئے تصورات، ادبی فکر کے نئے تناظر کی زد میں ہے۔ یہی صورتِ حال مجاز کے حقیقی جوہر کی بازیافت یا مجاز کے فن سے متعلق سوالات کی تشکیل میں معاون ہو سکتی ہے۔

آج کے نئے ادبی منظر نامے میں، مجاز کا مطالعہ اگر معروضی نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ تو سب سے پہلی بات تو یہی ذہن نشین ہوتی ہے کہ مجاز نے اپنی تخلیقات میں انسانی سرشت کے مجموعی مظاہر کو بنیاد بنایا۔ مجاز کی نظموں میں ایسا شعری کردار نمایاں ہوتا ہے، جو خود کو فطرت کا حاکم اور کائنات کا فاتح تصور کرتا ہے۔ لیکن یہ کائنات محض رومانی اور تصوراتی جذبات تک محدود ہے۔ مجاز کی نظموں میں جو تصادم یا TENSION ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجاز کا شعری کردار ایسا نظامِ زندگی وضع نہیں کر سکا ہے جو اس کو اس کے مزاج کے مطابق زندگی کی ضروریات مہیا کر سکے۔ اس کی زندگی کے بیشتر لمحات اپنے مزاج کی تکمیل اور خواہش کے حصول کی نذر ہو جاتے ہیں۔ جب وہ تھک کر اپنے ہم جنسوں سے الگ ہوتا ہے تو ہر طرف سے خلا اس کو اپنے نرغے میں لے لیتی ہے۔ خلاؤں کی گرفت سے بچنے کی خاطر وہ اپنے خیالات اور جذبات، اپنی یادوں کو پکارتا ہے، لیکن خلاؤں کے لامتناہی سلسلوں کے آگے اس کے سب خیالات، اس کے سب جذبات، اس کی سب یادیں، قائم نہیں رہ پاتیں اور ایک انتشار اور غم و غصہ کا منظر نامہ جنم لیتا ہے۔ اس انتشار سے شاعر کے دماغ پر مایوسی کی گرد بیٹھنے لگتی ہے۔ وہ پریشان ہو جاتا ہے، اور اس سے بچنے کے لئے ایک ایسے انقلابی کا رول اختیار کر لیتا ہے جسے فیض "انقلاب کا مطرب" قرار دیتے ہیں۔

مجاز کی شاعری کے اس اجمالی منظر نامے میں، میں نے مجاز کی بہت سی نظموں کا حوالہ نہیں دیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بہت سے مطربانِ انقلاب کی شاعری کا عمومی منظر نامہ اسی نوعیت کا ہے، اور مجاز کی جگہ کسی دوسرے شاعر کا نام چسپاں کر دینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

اگر صورتِ حال یہی ہے تو ہمیں مجاز کے سلسلے میں اس عمومی منظر نامے کے سوال پر، ان کے اسلوبِ شعر کے بارے میں، ان کی فنی اقدار اور طرزِ اظہار کے سلسلے میں کچھ اور سوالات پر غور کرنا ہوگا۔

پہلا سوال تو یہ ہے کہ کیا زندگی کے عمومی منظر نامے کو مجاز نے اپنے فن کے ذریعہ کوئی ایسا تناظر، ایسا مفہوم عطا کیا جو ان کی شاعری کا عصری سطح سے بلند ہو کر آنے والے زمانوں میں بھی اپنا مفہوم قائم کر سکے؟

دوسرا سوال مجاز کے شعری اسلوب اور ان کی لفظیات سے متعلق ہے۔ اس سے یہ بجا ہے کہ فن میں استعارے یا علامت کا وہ نظام نہیں ہے، جو ہماری قدیم شاعری
میں موجود ہے۔ لیکن VERSIFICATION کی بے پناہ صلاحیت نے مجاز کو ایک جیتی اسلوب کا حامل بنا دیا ہے۔ اس نوعیت کی
[illegible] یا بیان [illegible] کے [illegible] کتنے مختصر اور کتنے موزوں ہیں؟
[illegible] ہیں [illegible] صاحب کے دلائل سے بہت ہوتا ہے۔ فیض مجاز کو غنائی شاعر تصور کرتے ہیں لیکن مجاز کی نظموں اور غزلوں
میں [illegible] بہت سی موجود ہے۔ بہت سی نظموں میں ضمیر متکلم تو ہے لیکن یہ ضمیر متکلم صرف خود کلامی کی نمائندگی کرتا ہے۔ جہاں تک ترقی
[illegible] THUNDER نہیں بلکہ [illegible] یا گن گرج کی متقاضی ہے، جب کہ مجاز عام طور پر داخلی خاموشی سے اظہار
[illegible] کے تعارفات سے گزر کر [illegible] ایسی منزل تک پہنچتے ہیں جسے SUBLIME کہا جا سکتا
ہے۔

[illegible] بہت ہی خوب ہے لیکن تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

[illegible] موجود ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کا انفرادی فنی قدر و قیمت کیا ہے؟
[illegible] موں کا حسن، دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی خنک اور پُراسرار خاموشی یا ساکت د
[illegible] اس کے نازو انداز اور ان تمام حوالوں کا بیان، بڑی یا اہم شاعری کا باعث بن سکتا ہے؟
[illegible] کو ایک جدید کا ممتاز اور محبوب شاعر تصور کر لینے کے بعد ان کے معروضی مطالعہ کی
[illegible] تو مجاز کا ذکر ہی نہیں ہوا۔ وہ بزرگ نقاد جو ایک زمانے میں مجاز کے خوشہ چیں تھے، ان کی زبان پر
[illegible]

[illegible] کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجاز کے زمانہ میں سخن فہمی کی روایت پر کوئی ایک
[illegible] جس والہانہ انداز سے کر رہے تھے اسی کے ذریعہ ادب و شعر سے ابتدائی وابستگی کی تربیت تو حاصل ہو سکی
[illegible] اس لئے مجاز کے چاہنے والے یا تو مجاز سے آگے نہیں بڑھے یا پھر مجاز کو یکسر فراموش کر بیٹھے۔
[illegible] سے مطالعہ از سر نو کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ مجاز بہر طور ہماری ادبی تاریخ میں ایک مخصوص SPOT OF
[illegible] اس مخصوص نقطے کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ مجاز کے معروضی مطالعے کا آغاز ان کی نظم و ایک درست کی خوش مذاقی سے
[illegible] روایت اور [illegible] سب کچھ فراہم کر سکتی ہے۔ جو کتاب یا علم کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔ مجاز بنیادی طور پر
[illegible] INSPIRATION کے شاعر ہیں یہی دو بنیادی نکات ہیں۔ جو ان کے اسلوب کی تشکیل میں
[illegible] جس طرح اپنے تخیل اور داخلی احساس کو بنیاد بنایا، اس کی اپنی خصوصیت یہ ہے کہ ان
[illegible] مجاز کی شاعری کا دوسرا معروضی پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے زندگی کے منظر نامے سے جنس اور حسن کو
[illegible] اور یہ جو شاعروں کا خاص موضوع رہے ہیں، انہیں مجاز نے چھونے کی کوشش نہیں
[illegible]

[illegible] شعری کائنات میں ابتدا سے ہی کسی ایک محبوب کا وجود قائم رہا ہے۔ لیکن ایسے خدا
[illegible] اپنے محبوب کو ایک کائناتی تصور عطا کرنے کی کوشش کی ہے
[illegible] کو حقائق انداز میں پیش کرتا رہا۔ انگریزی کے شاعر ولیم بلیک نے اپنی محبوباؤں کو تشکیل کا نا
[illegible] روایت کے کیسے پرانی چال اور اپنی روایتی شناخت کے پیکروں کی تشکیل میں مصروف دکھایا۔ ظاہر ہے
[illegible] ایک مخصوص عہد کے انداز فکر کا عکس ہے۔
[illegible] منفرد عہد کے جذبات کی ترجمانی کرنے والے شاعر ہوں۔ یا ان کی نظم میں کوئی خاص تہہ داری موجود

[باقی صفحہ ۱۲ پر دیکھئے]



نیر مسعود

ادبستان، دین دیال روڈ، لکھنؤ ـ ۳

نُدبہ

میں نے بے حاصل مشغلوں میں زندگی گزاری ہے۔ اب اپنا زیادہ وقت یہ سوچنے میں گزارتا ہوں کہ مجھے ان مشغلوں سے کیا حاصل ہوا۔ یہ میرا اپنا اور شاید آخری اور شاید سب سے بے حاصل مشغلہ ہے۔

برسوں تک میں ملک میں اِدھر سے اُدھر گھومتا رہا۔ مقصد کچھ یہ تھا کہ اپنے چھوٹے بڑے شہروں سے واقفیت بڑھاؤں، لیکن ان دوروں کا حاصل یہ نکلا کہ مجھے اپنے شہر کے سوا سب شہر ایک سے معلوم ہونے لگے اور میں اپنے شہر واپس آکر کئی مہینے تک گوشہ نشین رہا۔ پھر میرا دل گھبرایا اور میں پھر نکل کھڑا ہوا۔ اب کی بار میرا رُخ دیہاتی آبادیوں کی طرف تھا لیکن بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ آبادیاں شہری آبادیوں سے کوئی بہت مختلف نہیں ہیں، یا کم سے کم مجھ کو مختلف نہیں معلوم ہوتیں۔ میں واپس لوٹ آیا اور بہت دن تک اس وہم میں گرفتار رہا کہ میں چیزوں میں فرق کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھا ہوں۔ میں اس وہم کو دل میں لئے دبا اور کوشش کرتا رہا کہ میری کسی بات سے اس کا اظہار نہ ہونے پائے، لیکن جب مجھے محسوس ہوا کہ میرے روز کے ملنے والے مجھکو عجیب نظروں سے دیکھنے لگے ہیں تو میں نے پھر مسافرت اختیار کی۔

اس مسافرت میں ایک عرصے تک میں اپنی قدیم سرزمین کے اُجاڑ علاقوں میں گھومتا رہا۔ ان علاقوں کے موسم سخت اور مٹی خراب تھی دریا ان سے دور پڑتے تھے اور زیادہ مزدور قوت والے انسانوں کا وہاں بسنا ممکن نہ تھا۔ پھر بھی یہ علاقے انسانوں سے خالی نہ تھے۔ میں ایسے علاقوں سے بھی ہو کر گزرا جنہیں انسان نے شاید کبھی اپنا مسکن نہیں بنایا تھا لیکن یہ محض بڑے بڑے غیر آباد جغرافیائی خطے تھے جو کسی مبہم انداز میں سمندروں سے مشابہ تھے اور غیر آباد ہونے کے باوجود اجاڑ نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اجاڑ علاقے وہ تھے جنہیں انسانوں نے قدیم زمانوں سے آباد کر رکھا تھا یہ علاقے ان جغرافیائی خطوں سے گزرتے ہیں کسی چھوٹے سے ٹاپو کی طرح اچانک مل جاتے تھے اور شاید انسانوں ہی کے ہونے سے اجاڑ معلوم ہوتے تھے۔ اور جس طرح یہ انسان اپنے علاقوں پر اثر ڈالتے تھے اسی طرح وہ علاقے بھی اپنے ان باسیوں پر ایسا اثر ڈالتے تھے کہ انہیں بھرے پُرے شہروں میں بھی دیکھ کر پہچانا جا سکتا تھا کہ یہ اجاڑ علاقوں سے آرہے ہیں۔ کم سے کم میں ان کو پہچان سکتا تھا اسلئے کہ میری مسافرت کا زیادہ زمانہ انہیں باسیوں کے درمیان گھومتے پھرتے گزرا۔

یہ چھوٹی چھوٹی برادریاں تھیں اور ہر برادری دوسری برادریوں سے مختلف تھی، یا کم سے کم مجھ کو مختلف معلوم ہوتی تھی۔ ان برادریوں کو دیکھنا اور کچھ کچھ دن ان کے ساتھ گزارنا اس مسافرت میں میرا مشغلہ تھا۔ اس مشغلے میں مجھے زیادہ انہماک اس لئے تھا کہ انسانوں کے یہ منتشر گروہ ایک ایک کرکے ختم ہو رہے تھے۔ کوئی اچانک وبا یا موسم کی کوئی بڑی تبدیلی ان کو آسانی سے مٹا سکتی تھی اور مٹا دیتی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کسی برادری میں کچھ دن گزارنے کے بعد جب میں دوبارہ اس کے علاقے سے گزرا تو میں نے دیکھا اب وہاں کوئی نہیں ہے اور وہ علاقہ کسی غیر آباد جغرافیائی خطے میں قریب قریب گم ہو چکا ہے۔ اس لئے ان برادریوں کی نشانیاں بہت جلد مٹتی تھیں، یا شاید ہوتی ہی نہیں تھیں۔

میں ان لوگوں کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں کر سکا اس لئے کہ اگرچہ وہ میری زبان کچھ کچھ سمجھ لیتے تھے لیکن ان کی بولیاں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں اور ہماری زیادہ گفتگو اشاروں میں ہوتی تھی۔ لیکن اس سے بھی مجھے کچھ بہت فائدہ نہیں ہوا اس لئے کہ الگ الگ برادریوں کے الگ الگ اشارے ہوتے تھے، اور کبھی کبھی ایک ہی اشارہ دو برادریوں میں ایک دوسرے سے بالکل برخلاف معنی دیتا تھا۔ ایک برادری خوشی کے اظہار میں جس طرح ہاتھوں کو پھیلاتی تھی، دوسری اسی طرح غم کے اظہار میں پھیلاتی تھی، ایک برادری سر کی جس جنبش سے کسی بات کا اقرار کرتی تھی۔

دوسری اسی جنبش سے اظہار کرتی تھی۔ ان کے اشاروں کو صحیح صحیح سمجھنے کے لئے وقت چاہئے تھا اور میں کسی ایک برادری میں زیادہ ٹکتا نہیں تھا اس لئے اشاروں کی مدد سے جو کچھ میں نے اپنے نزدیک معلوم کیا اس کا کوئی بھروسہ نہ تھا اور میں نے اس الٹی سیدھی معلومات کو واپس لوٹنے سے پہلے ہی پہلے بھلا دیا۔ جو کچھ مجھے یاد رہ گیا وہ ان برادریوں کا ندبہ تھا جو ہر جگہ مختلف ہوتا پھر بھی ہر جگہ میری پہچان میں آجاتا تھا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ محض اتفاق تھا یا ان لوگوں میں موتیں زیادہ ہوتی تھیں۔ لیکن بہت سی برادریوں میں میرے پہنچنے کے دوسرے ہی تیسرے دن کوئی نہ کوئی موت ضرور ہوتی جس کا اعلان مرنے والے کے قریب ترین رشتہ داروں یا ان رشتہ داروں کے قریب ترین رشتہ داروں کے چیخنے یا رونے سے ہوتا تھا۔ برادری والے ان سوگواروں کے پاس خاموشی کے ساتھ آتے اور انہیں چپ کرا کے خاموشی کے ساتھ واپس چلے جاتے۔ کچھ لوگ میت کو ٹھکانے لگانے کے بندوبست میں لگ جاتے۔ یہ بندوبست مکمل کر کے کہیں میت کو ٹھکانے لگانے کے بعد اور کہیں اس سے پہلے سب مل کر ندبہ کرتے جس کے لئے باقاعدہ مقام اور وقت مقرر ہوتا تھا۔ زیادہ تر برادریوں کا ندبہ فریادی لہجے میں موت کی شکایت سے شروع ہو کر مرنے والے کی یاد تک پہنچتا پھر اس میں تیزی آنے لگتی اور جب ندبہ پورے عروج پر آتا تو سب پر ایک جوش طاری ہو جاتا اور ان کے بدن کی جنبشوں اور ان کی آوازوں اور سب سے بڑھ کر ان کی آنکھوں سے غم کے بجائے غصہ ظاہر ہونے لگتا اور کبھی کبھی ایسا شبہ ہوتا کہ سب نے کوئی تیز نشہ استعمال کر لیا ہے۔ کہیں کہیں مجھ کو بھی اس رسم میں شریک ہونا پڑتا لیکن میں ایسے موقعوں پر جذبوں سے عاری بے عقلی کے ساتھ دوسروں کی بھونڈی نقالی کرتا رہ جاتا اور ندبہ ختم بھی ہو جاتا جس کے بعد سب ایک دوسرے کو تسلی دیتے۔ اس میں مجھے بھی تسلی دی جاتی تھی۔

ندبہ کرنے والوں میں کہیں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی کہیں مردوں کی۔ لیکن ایک برادری میں عورتوں اور مردوں کی تعداد بالکل برابر رکھی جاتی تھی۔ یہ پہلی اور آخری برادری تھی جن کی عورتوں کو اس رسم کے دوران میں نے بہت قریب اور چھو کر دیکھا۔ ان عورتوں کے قد چھوٹے اور رنگ گہرے سانولے تھے۔ ان کے عورت ہونے کی پہچان بنانے میں قدرت نے مبالغے سے کام لیا تھا اور وہ قدیم زمانے کی ان مورتیوں اور دیواری تصویروں کی اصل معلوم ہوتی تھیں جن کے بارے میں خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے بنائی ہیں جنہوں نے سچ مچ کی عورت کو نہیں دیکھا تھا یا قریب سے نہیں دیکھا تھا اور چھو کر تو بالکل ہی نہیں دیکھا تھا۔ اس برادری کا ندبہ یوں ہوتا تھا کہ ایک قطار میں مرد اور ان کے روبرو دوسری قطار میں عورتیں ننگی زمین پر دوزانو ہو کر بیٹھ جاتیں، اور یہ آمنے سامنے والے پہلے ایک دوسرے کی کہنیوں سے کہنیاں ملاتے، پھر کلائیاں ملاتے، پھر ہتھیلیوں پر ہتھیلیاں مارتے اور انگلیاں آپس میں الجھا کر جو کچھ کہنا ہوتا کہتے، پھر الگ ہوتے، پھر کہنیاں اور کہنیوں سے کلائیوں تک ملا کر ہتھیلیاں لڑاتے اور انگلیاں الجھا کر بول کہتے۔ ان کا ندبہ بار بار عروج پر آتا۔ دھیما پڑتا، پھر عروج پر آتا اور دیکھنے میں سمندر کا جوار بھاٹا معلوم ہوتا۔ یہاں تک کہ سب کی آنکھیں پلٹ جاتیں اور آخر سب پسینے پسینے ہو کر کپکپاتی ہوئی کم زور آوازوں میں ندبہ ختم کرتے اور آہستہ آہستہ ہانپتے ہوئے الگ ہو جاتے۔

میرے سامنے اس برادری میں تین موتیں ہوئیں۔ پہلی دو موتوں پر میں بھی ندبہ کرنے والوں میں شامل تھا، لیکن تیسری موت میرے بوڑھے میزبان کی ہوگئی۔ میں نے اپنے پاس موجود رہنے والی دواؤں سے اس کا کچھ علاج بھی کیا تھا لیکن وہ بچ نہ سکا۔ اس کی صورت ہی نہیں کئی ادائیں بھی میرے باپ کی یاد دلاتی تھیں اور میں نے اسے کچھ زبان سے اور کچھ اشاروں سے یہ بات بتانے کی کوشش بھی کی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے برادری والوں سے میرے بارے میں کیا باتیں کی تھیں۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد جو لوگ سوگواروں کو چپ کرانے گئے تھے ان میں سے دو ایک میرے پاس بھی آگئے اور اگرچہ میں خاموش تھا لیکن انہوں نے مجھے چپ کرایا۔ ان کے آنے سے مجھ کو اپنے باپ کی موت کا دن یاد آگیا۔ اس دن میرے گھر میں عورتوں کے رونے کا بے ہنگم شور تھا اور میں سب سے الگ چپ چاپ بیٹھا رہ گیا تھا۔ مجھے اپنے باپ کا آخری وقت کا چہرہ یاد آیا۔ پھر بوڑھے میزبان کی صورت یاد آنے لگی، اور جب اس کے آخری بندوبست کے بعد برادری کی عورتیں اور مرد آمنے سامنے قطاریں بنانے لگے تو میں خاموشی کے ساتھ اٹھا اور اس اجاڑ علاقے سے متصل غیر آباد خطے کی طرف نکل گیا اور وہیں کے وہیں میں نے اپنی مسافرت ختم کر دینے کا فیصلہ کیا اور اسی دن واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

اب جیسا کہ میں نے بتایا، میرا زیادہ وقت یہ سوچنے میں گزرتا ہے کہ مجھے ان مشغلوں سے کیا حاصل ہوا۔ اس طرح میری زندگی، جس کا بڑا حصہ

ناہمواری بھی نکل گیا اب ایک مدت سے بالکل ہموار گذر رہی ہے۔ البتہ صرف ایک دن اس میں تھوڑی سی ناہمواری آئی تھی۔ یہ ناہمواری شاید میرے ایک مشغلے کا حاصل تھی، لیکن ایسا حاصل جو، میں سمجھتا ہوں۔ بے حاصلی سے بھی بدتر تھا۔

۲

اس دن سویرے سویرے میرے مکان کے اس دروازے پر دستک دی گئی جو بازار کی طرف کھلتا تھا میں نے سستی کے ساتھ اٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھا محلے کا ایک پاگل لڑکا ہاتھ میں کاغذ کا ایک مڑا تڑا پرزہ لئے کھڑا ہے مجھے دیکھتے ہی اس نے پرزہ میرے ہاتھ میں تھمایا اور ہنستا ہوا بھاگ گیا اس کی عادت تھی کہ بازار کی گری پڑی چیزیں اٹھاتا اور دوسروں کو بانٹ دیتا۔ اسے وہ انعام دینا کہتا تھا اور بازار والے تقاضا کر کرکے اس سے انعام لیا کرتے تھے۔

تو آج مجھے بے مانگے انعام مل گیا میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے سوچا اور اپنے روزمرہ کے کاموں میں لگ گیا۔ میں نے یہ بھی سوچا جو میں کبھی کبھی سوچا کرتا تھا کہ اس لڑکے کو پاگل کیوں سمجھا جاتا ہے اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی سوا اس کے کہ وہ ہر وقت خوش رہتا اور بات بات پر ہنستا تھا، تاہم سب اس کو پاگل سمجھتے تھے میں بھی سمجھتا تھا

کچھ دیر بعد پھر اسی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے پھر دروازہ کھولا۔ پھر وہی لڑکا تھا۔

"بلا رہے ہیں، اس نے ہنسی روک کر کہا۔

"کون بلا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا

"جو آئے ہیں۔"

"کون آئے ہیں۔"

"پرچے والے" وہ بولا۔ زور سے ہنسا اور بھاگ گیا

میں نے دروازہ بھیڑ کر پلنگ پر پڑا ہوا پرزہ اٹھایا۔ پرانا کاغذ تھا اور اس پر میری ہی تحریر میں میرا نام پتہ لکھا ہوا تھا اور یہ تحریر ان زمانوں کی معلوم ہوتی تھی جب میں ہاتھ سنبھال کر اور حرفوں کو خوبصورت بنا کر لکھتا تھا۔ مجھے وہ زمانے یاد آئے یہ بھی یاد آیا کہ انہیں میں سے ایک زمانہ میں نے اجاڑ علاقوں کی برادریوں میں گھومتے گذارا تھا۔ مجھے یاد نہ آسکا کہ یہ پرزہ میں نے کب اور کہاں لکھا تھا، لیکن اتنا ضرور یاد آگیا کہ اس زمانے میں ایک مشغلے کے طور پر کاغذ کے ایک ایسے پرزے لکھ لکھ کر میں نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ برادریوں میں تقسیم کئے تھے۔ میں ان کی مہمان نوازیوں کا یہی ایک صلہ دیتا تھا۔ میں یہ تاکید بھی کر دیتا تھا زیادہ تر غلط سلط اشاروں کی زبان میں کہ اگر کبھی کسی کو میرے شہر میں کوئی کام آپڑے تو میری تحریر کی مدد سے سیدھا میرے پاس پہنچ جائے میں جانتا تھا کہ اپنی ان تحریروں میں سے کوئی بھی مجھے پھر کبھی دیکھنے کو نہیں ملے گی، لیکن اس وقت، اتنے زمانے کے بعد ایک تحریر کا پرزہ میرے ہاتھ میں تھا اور اگرچہ اطلاع دینے والا وہ تھا جس کو سب کے ساتھ میں بھی پاگل سمجھتا تھا۔ مگر مجھے اطلاع مل گئی کہ کچھ لوگ اس پرزے کی مدد سے مجھ تک پہنچ گئے ہیں اور مجھے بلوا رہے ہیں چند لمحوں کے اندر میری دیکھی ہوئی ساری برادریاں خواب کے خاکوں کی طرح میرے ذہن میں گھوم کر غائب ہو گئیں۔ اور میں گھر سے نکل کر بازار میں آگیا۔

بازار کھلنے کا وقت ہو گیا تھا لیکن زیادہ تر دکانیں بند پڑی تھیں دکان دار البتہ موجود تھے اور ایک ٹولی بنائے ہوئے آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ مجھ کو دیکھ کر سب میری طرف بڑھ آئے۔

"یہ کون لایا ہے؟" میں نے پرزہ انہیں دکھا کر پوچھا۔

انہوں نے کچھ کہے بغیر مشرق کی سمت اترنے والی اس بے نام کچی سڑک کی طرف اشارہ کر دیا جس کے دہانے کو بازار کے کوڑا گھر نے قریب قریب بند کر دیا تھا۔ میں نے اس طرف دیکھا۔ ایک نظر میں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوڑا گھر کی حد سے باہر تک کوڑے کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر لگے ہوئے ہیں لیکن دوسری نظر میں پتہ چلا کہ یہ زمین پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کی ٹولی ہے۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" کسی دکان دار نے مجھ سے پوچھا۔

"کوئی برادری معلوم ہوتی ہے" میں نے کہا اور ادھر بڑھنے کو تھا کہ ایک اور دکان دار نے پوچھا:

"انہیں آپ نے بلایا ہے؟"

"نہیں۔"

"ملنا تو آپ ہی سے چاہتے ہیں۔"

"مگر میں نے انہیں بلایا نہیں ہے۔"

"اچھا، ان کی گاڑی تو ہٹوا دیجئے، راستہ رک رہا ہے۔"

میں نے کچی سڑک پر کھڑی ہوئی گاڑی کو اب دیکھا۔ ایک بڑے سے پہیے کو بیچ سے کھڑا کھڑا کاٹ دیا گیا تھا اس طرح اس کی شکل مرتد پینڈے اور بغیر نوکوں والی چھوٹی ناؤ کی سی ہو گئی تھی یا شاید وہ کوئی بے مصرف ناؤ ہی تھی جس کے دونوں سروں پر کسی پرانے

درخت کے گول تنے کی بڑی بڑی ٹکیوں کے پہیے لگا کر اسے خشکی میں سفر کے قابل بنایا گیا تھا۔ میں نے گاڑی کو ذرا اور غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ جسے میں پہیا سمجھ رہا تھا وہ بھی کسی درخت کا آدھا کیا ہوا کھوکھلا تنا تھا جس کے نیچے ہری چھال کے ریشوں کی موٹی رسی میں بندھا اور زمین کو قریب قریب چھوتا ہوا ایک بڑا سا بے ڈول پتھر جھول رہا تھا۔ یہ شاید گاڑی کا توازن قائم رکھنے کے لئے لٹکایا گیا تھا، پھر بھی گرد سے اٹے ہوئے دو آدمی گاڑی کو دونوں طرف سے پکڑے ہوئے تھے میں نے بے دھیانی کے ساتھ سوچا اگر وہ چھوڑ دیں تو گاڑی آگے کی طرف الٹ گی یا پیچھے کو۔ پھر میں نے اسے اور غور سے دیکھا۔

گاڑی کے خلا میں اوپر تک گودڑ بھرا ہوا تھا اور ایک عورت اس پر جھکی ہوئی گودڑ کو مسلسل ادھر سے ادھر کو کر رہی تھی۔ سر سے پیر تک چادر میں لپٹی ہونے کے باوجود وہ جوان معلوم ہوتی تھی۔ میں نے ایک نظر اس کو اور گاڑی تھامے ہوئے دونوں آدمیوں کو دیکھا ہی تھا کہ ایک اور دکان دار کی آواز سنائی دی۔

"کون سی برادری ہے ؟"

میں نے مڑ کر کوڑا گھر کے آگے زمین پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا یہ دس بارہ آدمی تھے اور سب کے سب گرد میں اس طرح اٹے ہوئے تھے کہ ان کے کپڑوں کے رنگ تک آسانی سے پہچانے نہیں جا سکتے تھے ان لوگوں کو دیکھ کر مجھے کچھ بھی یاد نہیں آیا تاہم میں نے پہچان لیا کہ یہ اجاڑ علاقوں کی رہنے والی کوئی برادری ہے۔ میں نے انہیں دیر تک دیکھا وہ سب میری طرف بے تعلقی سے دیکھ رہے تھے اور مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ میں اس برادری میں کبھی نہیں رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرا نام پتا ان لوگوں کے پاس کہاں سے آ گیا اور میں نے ایک بار پھر کاغذ کے اس پرزے کو غور سے دیکھا۔ تب ان لوگوں نے بھی دیکھا کہ میرے ہاتھ میں کاغذ کا پرزہ ہے اور اچانک سب میں جان سی پڑ گئی۔ انہوں نے جلدی جلدی آپس میں کچھ باتیں کیں۔ پھر سب کے سب ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے کپڑوں سے تھوڑی گرد اڑی اور میں نے خود کو ان کے حلقے میں پایا۔ اسی کے ساتھ میں بازار والوں کے سوالوں کے بھی نرغے میں آ گیا۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنا آخری سوال دہرایا۔

"کون سی برادری ہے ؟"

میں نے بتا دیا کہ میں ان لوگوں سے واقف نہیں ہوں، پھر بھی وہ سب مجھ سے اس طرح سوال کرتے رہے جیسے مجھ کو ان لوگوں کا ضامن سمجھ رہے ہوں، مگر ان کے سوال ایسے تھے کہ میں ان کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ یہ ناپاک لوگ تو نہیں ہیں؟ شہر میں چوری کی وارداتوں میں جو اچانک اضافہ ہو گیا ہے کیا ان کا ان لوگوں سے کچھ تعلق ہے؟ یہ کہاں سے آئے ہیں؟ کیا یہ بھیک مانگنے والے ہیں؟

اب میں نے پوچھا

"کیا ان لوگوں نے کسی سے کچھ مانگا ہے ؟"

"ابھی تک تو نہیں" مجھے جواب ملا "ہم تو جس وقت آئے ہیں یہ کاغذ دکھا دکھا کر سب سے آپ کا پتا پوچھ رہے تھے۔"

"کس بولی میں ؟"

"اشارے سے"

"پھر ؟"

"پھر میں نے پوچھا، "اشارے سے بھیک تو نہیں مانگ رہے تھے ؟"

"مگر ان کا حلیہ تو دیکھئے" "دیکھ رہا ہوں۔"

"اور گاڑی . . . " "وہ بھی دیکھ رہا ہوں۔"

" . . . . اور گاڑی میں کس بلا کو بھرا لائے ہیں۔ ابھی ختم ہو جائے تو ٹھکانے لگانے کے لئے ہمارے ہی آگے نہیں رکھیں گے ؟"

اب میں نے گاڑی کے سوار کو دیکھا۔ ابھی تک میں سمجھ رہا تھا کہ گاڑی میں بھرا ہوا گودڑ کچھ اوپر ابھر آیا ہے لیکن یہ اس کے سوار کا بار بار جھکتا ہوا سر تھا جسے عورت سہارا دیتی تھی لیکن وہ پھر جھک جاتا تھا۔ میں بڑھ کر اس کے قریب گیا۔ عورت نے اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اٹھانا شروع کیا تھا کہ مجھے ان سب لوگوں کی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں اور میں ان کی طرف مڑ گیا۔

وہ بار بار میرے گھٹنے چھو رہے تھے اور بول رہے تھے ان کی بولی میری اپنی زبان کی کوئی بگڑی ہوئی۔ یا بگڑنے سے پہلے کی شکل معلوم ہوتی تھی اور میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ میرے گھٹنے چھوتے۔ پھر گاڑی کی طرف اشارہ کرتے اور ان کے لہجے میں لجاجت آ جاتی جو لفظوں کی محتاج نہیں تھی۔ اس وقت مجھ کو بھی شبہ ہوا تھا کہ یہ بھیک مانگنے والوں کی ٹولی ہے ان سے دو ہی چار باتیں کرنے کے بعد مجھ کو احساس ہو گیا کہ وہ بھی میری زبان نہیں سمجھتے ہیں، بلکہ میرا اسپاٹ لہجہ ان کو اندازے سے بھی میری بات نہیں سمجھنے دیتا خود ان کے لہجے مختلف تھے تاہم مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کسی قصبے سے آئے ہیں،

[بقیہ صفحہ ۹۴ پر دیکھئے]



علقمہ الہندی
جے - ۵/۴۰ آزاد پارک وارانسی - ۱

جواب

" پہلے موسیٰ پیدا ہوا یا ابراہیم ؟ "

" موسیٰ ! "

" نہ ، پہلے ابراہیم . . . "

" . . . . لیکن فادر ! اس سرکشی کو کوئی کب تک روکے رکھ سکتا ہے . ؟ "

ان بے مقصد مباحثوں کا کوئی حل نہ پاکر میں اچانک پٹری بدل دیتا اور اپنا یہ گھسا پٹا برسوں پرانا سوال دہرا دیتا ، پتہ نہیں زیر بحث موضوع سے پیچھا چھڑانے کی غرض سے ، یا اس کو چھیڑ کر مزہ لینے کیلئے ، یا پھر اپنے تجسس سے مجبور ہو کر۔

" جب تک ہم میں روکے رکھنے کی طاقت ہوگی ، یہی ہمارے اس مقدس منصب کا امتحان ہے عبدل ! ، جس دن وہ سرکشی ہم پر غالب ہوگیا ، ہم یہ چولا اتار پھینکیں گے ، اور عامیوں کی صف میں شامل ہو جائیں گے ۔ "

میں جرح کرتا " میں نے تو ایسا کبھی نہیں سنا کہ آپ کا کوئی بھائی بند اپنے منصب سے دست بردار ہو کر عامیوں کی صف میں شامل ہو گیا ہو . . . . . " نا ، ایسا کبھی نہیں ہوا ۔ لیکن ایک دریا کو ہم بہنے سے کب تک روک سکتے ہیں ، آخر ایک نہ ایک دن تو دوسرے راستے سے بہ نکلے گا . . . . . . بند پھلانگ جائے گا . . . . . ؟

تب فادر چپ سادھ لیتا اور اپنی میز پر رکھے مریم کے اس مجسمے کی طرف تکنے لگتا جس کی گود میں ننھا جیسس فادر کو عجیب نظروں سے دیکھتا ——— جانے کیوں مجھے جیسس کی معصوم نظروں میں بڑی گہرائی محسوس ہوتی ، اور مریم کا وہ مقدس مجسمہ سراپا بھی بڑا عجیب لگتا جو جیسس کو اپنی چھاتی سے چپٹائے رکھتی ۔

ایک دن میں نے پوچھا " فادر کیا بات ہے کہ کیتھولک مریم

کو بہت اہمیت دیتے ہیں ۔ لیکن کم بخت پروٹسٹنٹ اس کو کچھ نہیں سمجھتے ؟ "

" یوں سمجھو عبدل . . . . . " اس نے بڑی پیاری مثال دے کر مجھے سمجھایا . . . . . " جیسے تم نے میری دعوت کی ، لذیذ کھانے کھلائے ، لیکن کھانا کھا لینے کے بعد میں کھانے کی تعریف کرنے کی بجائے کفرانِ نعمت کرنے لگ جاؤں کہ یہ کھانا ذرا بھی اچھا نہیں تھا ، بنانے والا بالکل اناڑی ہے ، وغیرہ وغیرہ ، اور اگر وہ کھانا تمہاری مدر نے بنایا ہو تو اس وقت تمہیں کیسا لگے گا ؟ "

" آپ سمجھ سکتے ہیں . "

تو سوچو ، جس مریم نے اپنی کوکھ سے جیسس کو جنم دیا ، پرورش کی ، اس کو کوئی اہمیت نہ دینا اور محض ایک دائی سمجھنا کتنا بڑا ظلم ہے . " اس کے پاس میرے ہر سوال کا تسلی بخش جواب ہوتا ، مگر ایک جواب . . . . . .

ایک دن میں خلافِ معمول دوپہر کو چرچ پہونچا ، اس وقت بڑے ہال میں ویڈیو سٹ پر کوئی فلم چل رہی تھی ، بائبل ورلڈ کی بنی ہوئی ، چرچ کا یہی معمول تھا ، اتوار کو تمام دن نئے پرانے عہد نامے کی تلاوت ہوتی ، اور باقی چھ دن ——— ہال میں ٹی وی اسکرین سے آتے والی روشنی کی مدد سے میں نے ایک کرسی سنبھالی ۔

" ہلو عابڈل ! " یہ جل ترنگ بغل والی کرسی سے بجا تھا ۔

" ہلو ڑلیا ! " میں نے بھی تبسم کے ساتھ سر ہلایا ۔

" اشانک تو تم کہاں سے ٹپکا ؟ "

" چور دروازے سے ! ، فادر رولانڈ کہاں ہے ؟ "

" اوہ عابد . . . چھوڑو اس بوڑھے . . . . . "

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی، حالانکہ فادر رولانڈ قطعاً بوڑھا نہیں تھا، پھر......

"آؤ کچن میں..... اس نے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا... کوفی پینے کو موڈ کر رہا ہے" ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھے بیٹھے شاید اس کے دماغ کی کوئی نس تن گئی تھی۔ ہمارے لکھنے پر کوئی متوجہ نہیں ہوا، فرصت کہاں تھی۔

"تو تم آج کرائسٹ نگر گیا تھا۔؟" ہال سے ملحقہ کچن میں پہنچ کر اس نے سلنڈر کا بٹن آن کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہنیں کل گیا تھا۔"

"برادر برونِنگ سے ہارا۔ میتھیو بولا؟ کیا بولا؟"

"آج بشپ فرڈینیان تین دن کے لئے بلیا جا رہا ہے برونِنگ تمہاری کتاب کل یا پرسوں لے کر آئے گا۔"

"وہٹ.... آر یو ریئل؟"

"تو کیا میں تمہیں انطونی اور قلوپطرہ کی کہانی سنا رہا ہوں؟"

"ہپ، ہُرّے...." اس نے اپنی داہنی مٹھی کو بائیں ہتھیلی پر مارا اس کی آواز میں مسرت تھی، میں سوچنے لگا یہ اس نادیدہ کتاب کے پلنے کی خوشی ہے۔ یا برونِنگ کے آنے کی، شاید اس کا جواب اس کے چہرے پر پیدا ہونے والے تاثر میں چھپا ہو، اور میری نگاہیں بلا اختیار اس کے چہرے پر جم گئیں، لیکن...... اس مسرت... وہ مسکراہٹ تو ایسی تھی جیسے کوئی غم زدہ مسکرائے۔ اس کے پیچھے نقاہت و پژمردگی صاف مترشح تھی بڑا تعجب ہوا۔

"ارے بڑھیا! تم ٹھیک تو ہو؟"

"کیوں؟..... کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"اتنے دنوں میں میں پہلی بار تمہیں اداس سا دیکھ رہا ہوں، ایسا کیوں، طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہوں!...." اچانک وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"اوہ شاید تمہاری طبیعت گڑبڑ ہے، ٹھہرو، میں فادر رولانڈ کو......"

"پلیز عابد ڈِل...... نائمیں....." اس نے جھٹکے سے میز پر بات ایک دی، اور میں پیالی رکھتے رکھتے ٹھٹھک کر اس کی طرف دیکھنے لگا تب ہی وہ اپنی پائی کا فی واش بیسن میں انڈیل کر تیزی سے باہر نکل گئی اور میں ہجو نقوں کی طرح صلیب پر جکڑے مظلوم جیسس کو تنہا چھوڑ کر

لگا۔

اس روز بھی دوپہر کا ہی وقت تھا، گرمی کی جھلستی دوپہر، پسینے سوکھ کر ریت کی طرح گردن میں چبھ رہے تھے، لمبی سڑک کی حدِ نظر پر آگ لگی ہوئی تھی، چرچ میں بھی جھلسن تھی، لیکن وہاں ایرکنڈیشن بھی تھے۔ میں نے کچھ دیر تک سانسیں نیچے اوپر کیں، رومال سے پسینا جھاڑنے کے بعد فادر رولانڈ...... لیکن فادر رولانڈ کا دروازہ بند کیوں ہے، اس وقت وہ کہاں جا سکتا ہے۔ اور گیا بھی تو دروازہ کیوں بند کر گیا....؟ مگر اس میں تو تالا نہیں لگا ہے، پھر بھی بند ہے؟.... کھٹ.... کھٹ.....

"? WHO" سن کر اطمینان ہوا۔

"اس وقت کون ہو سکتا ہے"

"ایک منٹ عابد ڈِل۔"

کئی منٹ گزر گئے مجھے اس کاریڈور میں، سورج بھی تھک کر نیچا ہونے لگا تھا، سائے مغرب سے مشرق کی طرف دراز ہو رہے تھے.... تب اندر سے آواز آئی۔ وہ دروازہ ہال کی طرف کھلتا تھا۔ کھٹ.... کاریڈور کا دروازہ کھلا۔ "اوہ فادر بہت زحمت دی آپ کو، میری وجہ سے آرام حرام ہو گیا...." اور میں بلا توقف اندر گھس گیا۔

میرا جانا پہچانا کمرہ جس میں سب کچھ وہی تھا۔ ایک طرف کونے میں رکھا ہوا پیانو، دیوار پر ٹنگی ہوئی پاپائے اعظم کی تصویر اور ٹھیک اس کے بغل میں فادر رولانڈ کو پوپ کی عطا کردہ جنت کی سند، میز پر رکھا ہوا میری اور جیسس کا اسکیچو، سامنے بڑی سی وال ہینگنگ پر ایک روپئے کے سکوں سے نمایاں کیا گیا "FR. ROWLAND"

سب کچھ وہی تھا، لیکن ایک طرف کھڑے چار فولڈ کے خوش نما جالی دار سہارنپوری پردے ـــــ کم بخت سہارنپوری کاریگروں نے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے جنون میں پردے کا مفہوم فراموش کر دیا تھا ـــــ میں اسے دیکھ رہا تھا، فادر مجھے دیکھ رہا تھا، جیسس فادر کو دیکھ رہا تھا، اور میری جیسس کو اپنے مقدس آنچل میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

اُردو ہندوستان کی ہے
ہندوستان اُردو کا ہے



راناروی ٹھگو شاہین

نیرچوک - ۱۷۵۰۲۱ - (ہماچل پردیش)

بنجارے

یونیورسٹی کی طرف جانے والی سڑک کی دونوں جانب ایک نالے کے قریب، شاید رات ہی رات میں، ٹھٹھیروں کی ایک بستی ابھر آئی۔ چھوٹے چھوٹے دو دو کھمبوں کے سہارے تنی ہوئی یہ جھونپڑیاں دو قطاروں میں تھیں۔ عورتوں کی اونچی آواز میں ہونے والی باتوں سے، بچوں کے رونے یا سڑک پر کھیلنے سے، اور مردوں کے ہنڈیا یا لوہا کوٹنے کی ٹھک ٹھک سے، اس مردہ سڑک میں جیسے ایک نئی جان آگئی تھی۔ بالو اور مٹی سنی یہ سڑک ایک مردہ سانپ جیسی لگتی تھی جو گویا ندی کنارے رینگتا اچانک مر گیا ہو۔ یوں تو یہ سڑک بجری اور کولتار سے پکی کی گئی ہے۔ لیکن جس طرح ایک سوتیلی ماں اپنے سوتیلے بچوں سے لاپرواہی برا سلوک کرتی ہے، نگر مہا پالیکا کے ہاتھوں اس سڑک سے بھی ویسا ہی برتاؤ ہوتا ہے۔ ندی کنارے بنی مٹی اور بالو کے باندھ سے ریتیلی مٹی اس سڑک پر برابر بچھتی رہی ہے۔ کچھ کچھ کر وہ اس قدر پکی ہوتی چلی گئی کہ وہ مٹی اب شدید بارشوں میں بھی نہیں گھل پاتی۔ سڑک کے پختہ ہونے کے ایک ایک ثبوت جیسے اس مٹی کی تہوں میں سماتے چلے گئے۔ یہ سڑک اب پکی نہیں لگتی اسکو دیکھنے سے ایک ریگستانی سڑک کا گماں ہوتا ہے اور اگر مہا نگر پالیکا کے سوتیلے برتاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا تو اس سڑک کے پکا ہونے میں دلچسپی صرف تاریخ سازوں ہی کو رہ جائے گی۔ شہریوں کی نہیں۔

اور اسی سڑک پر نگر مہا پالیکا نے تو نہیں البتہ ٹھٹھیروں کی بستی نے کچھ جان ڈال دی تھی۔

ٹھٹھیروں کی یہ پندرہ بیس جھونپڑیاں جھونپڑیوں جیسی بھی نہیں لگتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا گویا شیڈ تاپ کے بڑے مکانوں کے ماڈل رکھے ہوئے ہیں دس گیارہ بانس کی چھوٹی چھوٹی بلیوں کو رسیوں سے اس طرح باندھا گیا تھا جیسے کوئی گرمی سے بچنے کے لئے دو پودوں سے ایک چادر باندھ کر اپنے لیٹنے لائق سایہ بنا لے۔ ایک ایک جھونپڑی میں میں نے چار چار یا پانچ پانچ "بستر" دیکھے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ اتنے کھاتے پیتے تو تھے نہیں کہ ایک ایک بستر پر ایک ایک آدمی سوئے۔ ہر بستر پر ایک سے زائد لوگ تو سوتے ہی ہوں گے۔ اور بستر بھی کیا بستر۔ نیچے زمین پر ایک پتلی جالی دار بوری، وہ بھی سب کو نصیب نہیں، اس طرح بچھائی ہوئی جیسے بڑے گھروں میں قالین بچھائے جاتے ہیں۔ اس کے اوپر تین چار بوریوں کو اکٹھا سی کر بنایا گیا گدا یا ایک بچھاون یا کپاس کے بنے موٹے کھیس یا کوئی پھٹا پرانا کمبل۔ اس طرح کے بستروں کا دیدار مجھے اس وقت ہوا جب میں اس سڑک پر ان کے بیچ سے ہو کر گزر رہا تھا۔ کم و بیش ایسے ہی بستر سب کے لگے۔ کوئی فرق نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان میں "جو کھاتا پیتا" بن گیا اس کے بچھاون میں دو ایک بوریوں کا مزید اضافہ ہو گیا، اس کی جھگی تھوڑی اونچی اٹھ گئی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

صبح جب میں ادھر سے گزرتا تو عورتیں اپنی اپنی جھگیوں کے آگے سڑک پر بیٹھی برتن مانجھتی ہوئی ملتیں۔ اکیلے دکیلے بچے سڑک پر ہی ٹٹی پیشاب پھر رہے ہوتے یا پھر دونوں ہی کام ساتھ ساتھ کر رہے ہوتے۔ اس ٹٹی کو سڑک پر سے اٹھانے کی زحمت وہ عورتیں نہیں کرتیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ اس پر مٹی پھینک دیتیں۔ اس ڈھیر پر کسی کا پاؤں پڑ جائے یا سائیکل کے پہیوں سے وہ ڈھیر چپک جائے، ان کی بلا سے۔ آتے جاتے راہ گیروں کے نتھنوں سے ٹکرا کر وہ بدبو کتنی کراہیت پیدا کرتی ہوگی اس سے ان کا کوئی واسطہ نہیں، ان کا اپنا روز مرہ کا کام چلتا رہتا اور اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

مردوں کی روز مرہ کی مصروفیات بھی اسی طرح مشینی تھیں۔ صبح اپنی سائیکلوں پر نکل جانا، ادھر ادھر سے لوہے اور جست کے ٹوٹے پھوٹے برتن اکٹھے کر کے لانا، ان میں لوہے اور ٹین کے پیندے لگانا، انہیں بیچنا۔ ٹھرا پینے کی عادت سب کو تھی۔ بچوں، عورتوں۔ سب کو پی کر بہک جانا یا بہک جانے تک پینا وہ لازم سمجھتے تھے۔ اور اکثر شام ہی سے جب ان

لوٹ لیا ہوتا۔ وہ لوگ شروع ہو جاتے تھے۔

کل شام دو بیوپاریوں میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ جس جھگڑے کی بنیاد ایک بچہ تھا۔ وہ سڑک کے اُس پار کسی دوسرے کی جھگی کے نزدیک ٹٹی کر بیٹھا تھا۔ اس جھگی والی نے اسے دیکھ لیا تو اس کی ماں کو پکارا کہ وہ اس ٹٹی کو وہاں سے صاف کر دے۔ اس نے انکار کیا اور الٹا اس عورت پر الزام دھر دیا "تمہارا بچہ بھی تو ہماری طرف ٹٹی پھر گیا تھا" یہاں سے لفظی جنگ شروع ہو گئی۔ دونوں عورتیں پھر گتھم گتھا بھی ہو گئیں۔ اب مردوں کے بیچ میں پڑنے کی باری تھی۔ دراصل وہ اپنی اپنی بیویوں کو چھڑانے گئے تھے لیکن حالات ایسے ہے کہ ان میں بھی جوتم پیزار ہونے لگی۔ اب دونوں لہولہان تھے۔ ٹٹی کے جس ڈھیر کی وجہ یہ مہابھارت چھڑی تھی اس کا اب کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ ایک رہبڑی والے نے مجھے بتایا کہ ایک رات یہ لوگ اس لئے لڑ رہے تھے کہ ایک جھگی سے نکلنے والا پانی سڑک لانگھ کر دوسرے کی جھگی کی بوری بھگو گیا تھا۔ اور یہ بھی کہ ان کا جھگڑا عورتوں سے شروع ہو کر مردوں کے لہولہان ہو جانے پر ختم ہوتا ہے۔

آج صبح جب میں پھر اس سڑک سے گزرا تو جھونپڑوں کی وہ بستی وہاں سے غائب تھی۔ میں پل بھر کو ٹھٹکا۔ اس "دو بستی" کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک میری نظر گھوم گئی۔ ٹوٹے پھوٹے چولہے اتا تھ سے لگ رہے تھے جن میں کل کی بچی راکھ اب بھی موجود تھی اور جو اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ بستی ابھی تازہ تازہ اکھڑی ہے۔ اتفاق سے وہ رہبڑی والا مجھے پھر دکھائی دیا۔ اچانک ہی میں نے اس سے پوچھا "ان لوگوں کا کیا ہوا؟"

"سنا ہے صاحب کہ نگر پالیکا والوں نے انہیں یہاں سے کھدیڑ دیا ہے"

میری نگاہ ایک بار پھر اس اجڑی ہوئی بستی کی طرف اٹھ گئی مجھے خیال آیا کہ یہی وہ سڑک ہے جسے ان لوگوں نے بانٹ لیا تھا کسی دوسرے کا "اپنے علاقے" میں آنا انہیں برداشت نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ سڑک تو یہیں کی یہیں رہ گئی مگر وہ لوگ ضرور اکھڑ گئے یہاں سے۔ ایک ہلکی سی ہمدردانہ مسکراہٹ میرے چہرے پر پھیل گئی اور میں اپنے دفتر کی طرف بڑھ گیا۔

ایک بجے مجھے بینک جانا پڑا جو میرے دفتر سے تقریباً ایک کلو میٹر دور کا پیسہ ہے مہا نگر کا یہ علاقہ ابھی تعمیر کے ابتدائی مراحل سے گزر رہا تھا۔ بینک میں جاتے جاتے میری نگاہ بینک کی بغل میں بنی جھونپڑوں کی ایک اور بستی کی طرف اٹھ گئی جہاں سے ٹھک ٹھک کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں بے ارادہ ہی اس بستی کی طرف چل پڑا۔ پندرہ بیس جھگیاں دو رویا بنائی گئیں تھیں کچھ ابھی بن رہی تھیں نزدیک جانے پر دیکھا تو میں چونک گیا یہ تو وہی لوگ تھے جو یونیورسٹی والی سڑک پر ڈیرا جمائے ہوئے تھے اور وہیں مجھے وہ دو مرد بھی دکھائی دئیے جو گذشتہ رات کو لڑے تھے۔ ان دونوں کی پیشانیوں پر کپڑا بندھا تھا جس پر زخموں سے رسے خون کے دھبے صاف نظر آ رہے تھے وہ دونوں آمنے سامنے بنی اپنی اپنی جھگیوں کے باہر بیٹھے لوہا کوٹ رہے تھے اور ہنستے ہوئے بتیا بھی رہے تھے۔ میں مڑتے ہوئے ایک بار پھر مسکرایا اور سیدھا بینک میں چلا گیا۔ ❀

بقیہ صفحہ ۶ مجاز کچھ سوالوں کے نرغے میں

جذبات کی ترجمانی کرنے والے شاعر ہوں، یا ان کی فکر میں کوئی خاص تہہ داری موجود نہ ہو لیکن وہ ہماری اس شعری روایت کا حصہ ہیں، جس کا رشتہ ایک طرف اختر شیرانی سے ملتا ہے اور دوسری جانب ترقی پسند ادبی روایت سے، ان کی شاعری محدود ہے، لیکن اسے شاعر کی کمزوری نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ ان کی شاعری میں حدود احساس کا جو سلسلہ ہے اس کا سلسلہ ان کے معاصرین کی اور ان کی شان میں رطب اللسان رہنے والے ناقدوں تک پھیلا ہوا ہے۔

مجاز کا کوئی بھرپور معروضی مطالعہ ہی یہ باور کرا سکتا ہے کہ ادبی تاریخ میں مجاز کا اپنا مقام کیا ہے۔ اور ان علاسئے ادب کی بساط اور شناخت کیا ہے جنہوں نے ایک زمانے میں مجاز کو اتنی بلندی تک پہنچا دیا تھا کہ اس بلندی سے نیچے اتر کر، وہ اپنے بعد کی ادبی نسل کے تصورات کا حصہ نہ بن سکے۔ اور کسی گم شدہ ستارے کی مخلوق بن کر رہ گئے اس گم شدہ مجاز کی بازیافت، ایک گم شدہ عہد کی بازیافت ثابت ہو سکتی ہے۔ ❀



فضلِ حسنین

اے۔ ۷ پیشکار کالونی، اشوک نگر۔ الٰہ آباد۔ ۱

مجموعی رسوائی

تخلیق کار بننے کی جستجو میں کن کن صعوبتوں سے گزرنا پڑتا ہے یہ تو وہی لوگ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں جن پر قلمکار بننے کی تہمت لگ چکی ہے۔ بہرحال جب کسی طرح لوگوں نے ہمیں ایک ادیب کی حیثیت سے برداشت کر لیا تو ہمارے خیر خواہوں کو ہماری تخلیقات کا مجموعہ شائع کرانے کی ایسی زبردست خواہش پیدا ہوئی جیسے اگر ہماری کتاب جلد از جلد منظرِ عام پر نہ آ گئی تو دنیائے ادب ایک عظیم شاہکار سے محروم رہ جائے گی۔ اور آخر کار یار لوگوں نے یہ نیک فریضہ انجام دے کر ہی دم لیا۔

کتاب چھپ جانے کے بعد ہم نے اپنی چال میں کچھ تبدیلی سی محسوس کی۔ غالباً یہ صاحبِ کتاب بن جانے کا غرّہ تھا جو ہم اپنی رفتار میں پندار کا انداز محسوس کر رہے تھے بہرحال اس "سانحے" پر ہمارے بیشتر اعزّا نے حسبِ توفیق اظہارِ افسوس کیا۔ کچھ معصوم قسم کے رشتہ داروں نے بے خیالی میں ہمیں مبارکباد بھی دے ڈالی احباب میں تو خیر واہ واہ ہونی ہی ہونی تھی۔ لیکن کتاب کے اتنے سارے نسخوں کا کیا کیا جائے، اب یہ مسئلہ درپیش تھا۔ ہم نے اپنے مخلصین سے مشورتاً دریافت کیا کہ کن کن دوکانوں پر کتاب رکھوا دی جائے؟ اس پر لوگوں نے سخت حیرت کا اظہار کیا اور ہماری معصومیت پر کفِ افسوس ملتے ہوئے بولے۔ "حضرت! آپ کس دنیا میں رہتے ہیں؟ ادبی کتابیں خریدنے کا رواج تو کب کا اٹھ چکا ہے۔ کتب فروش اپنے شوکیس میں ادبی کتابیں لگا کر اپنا معیار گرائیں گے" اپنی بدنامی کرائیں گے" اس پر تو ہم واقعی چونک پڑے اور حیرت سے بولے۔ "تو بھائیو! پھر کتاب کے اتنے نسخوں کا کیا ہوگا؟" ایک بہی خواہ نے آگے بڑھ کر اپنا سینا ٹھونکتے ہوئے فرمایا۔ "ہم سارے احباب بہ یک زبان کس طرح لوگوں کے پیچھے لگیں گے اور انہیں کسی نہ کسی طرح کتاب بیچا جائیں گے۔ سیدھے نہ سہی تو ٹیڑھے" اب تو ہمارے کان کھڑے ہونے تھے اور پہلی بار ہمیں احساس ہوا کہ کتاب چھپوا کر ہم نے کتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ ہم نے دست بستہ گزارش کی کہ خدارا مجموعے کی رسوائی کم از کم ہماری زندگی میں تو اس طرح نہ کی جائے۔ لیکن ہماری التجا کا ذرا بھی اثر نہ ہوا اور سب ایک آواز ہو کر بولے "حضرت اردو کی کتابیں نکالی ہی اس طرح جاتی ہیں۔ آپ تو دن رات نئے پلاٹ کی تلاش میں گم رہتے ہیں۔ آپ کو دین دنیا کی کیا خبر! آپ نے بعض ادیبوں کو دیکھا نہیں۔؟ اپنی کتاب ٹانگے ٹانگے پھرا کرتے ہیں۔ یہاں تو آپ کے لئے یہ کام ہم اپنے ذمّے لے رہے ہیں۔ کہ ادیب کو بذاتِ خود یہ کام زیب نہیں دیتا۔" اس طرح اپنے خیر خواہوں نے اپنے اپنے نام کچھ نہ کچھ نسخوں کا کوٹہ بک کر لیا یہ الگ بات ہے کہ بیشتر احباب کے توسط سے کتاب کی ایک جلد ہی نکل سکی یعنی جو نسخہ موصوف کو ہدیۃً نذر کیا گیا تھا بس وہی۔

اب ہمارے خلاف شکوے شکایات کا سلسلہ چل پڑا بعض اعزّا نے ہمیں مغرور قرار دیا۔ بعض نے احسان فراموش۔ ہمارا جرم صرف اتنا تھا کہ ہم نے کتاب ان کے گھر تک نہیں پہنچائی جب ہمیں اس شکایت کا علم ہوا تو ہم نے اپنے نورِ نظر کو حکم دیا کہ جس جاننے والے کے گھر کتاب ابھی تک نہ پہونچی ہو، پتہ لگا کر وہاں کا "حصّہ" فوراً پہونچا دیا جائے۔ اس پر ہمیں دوسری طرح کی شکایت سننے کو ملی۔ "ارے واہ! فلاں کے یہاں تو حضرت خود کتاب لے کر پہنچے تھے اور ہمارے یہاں کتاب اپنے چھوکرے سے بھجوا دی۔ ہم کسی سے کم ہیں کیا۔؟

یا پھر یہ کہ " اوروں کو تو اتنے بھی چھوڑ کے القاب ... کی اور ہمیں یوں ہی کوری بھجوا دی ۔ ارے ہم کس طرح اپنا نام ... لیتے ہیں ۔ بالکل ہی جاہل بھی نہیں ۔"

جب یہ خبر گاؤں تک پہونچی تو وہاں لوگوں نے مجموعے کو جانے کیا سمجھا اور اس قسم کے شکوے موصول ہونے لگے ۔ " کبھی ہم نے حضرت کو شادی بیاہ ، ختنہ ، عقیقہ ، کب نہیں پوچھا اور آج جب انہیں ایک کام (یعنی تقریب) کرنے کی توفیق ہوئی ، تو ہمیں بلانا تو درکنار ، ہمارا حصہ تک نہ بھجوایا ۔"

ادھر ہمارے احباب بھی اب ہم سے کترانے لگے تھے کیونکہ ان میں بیشتر نے اپنے نام کچھ نہ کچھ نسخوں کا کوٹہ بک کرا رکھا تھا ۔ چنانچہ ہم نے اعلان کروا دیا کہ " صاحبو ! کتاب کے سارے نسخے ختم یعنی تقسیم ہو چکے ہیں ۔ اس لئے کسی کو اب مزید روپوش ہونے کی ضرورت نہیں ۔ جو صاحب جہاں بھی ہوں ، فوراً منظر عام پر آ جائیں کیونکہ اب ہم پہلے ہی کی طرح ایک عام آدمی ہو چکے ہیں ۔

لیکن اب ایک دوسرا مسئلہ آن کھڑا ہوا تھا ۔ اردو اکادمی نے ہماری کتاب کو انعام سے نواز کر ہمارے لئے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی اب کیا تھا ۔ یار لوگوں نے ایک بار پھر ہمیں نرغے میں لے لیا اور اس " نئے حادثے " کے جشن کے سلسلے میں ایسے ایسے مشورے آنے لگے کہ اگر ہم ان پر واقعی عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے تو شاید ہمارا گھر تک بک جاتا ۔ ایک بہی خواہ اس بات پر مصر تھے کہ مجموعے کی رسم اجرا اس دھوم دھام سے کی جائے کہ لوگ عش عش کر اٹھیں ۔ ہم نے نہایت عاجزی کے ساتھ عرض کیا کہ جب کتاب کے سارے نسخے ختم ہو چکے ہیں تو پھر اب یہ رسم اجرا کیسی ؟ اس پر بہی خواہوں نے ہمیں پوری طرح تعاون دینے کا یقین دلایا ۔ کہ اس نیک کام کے لئے وہ اپنے حصے کی کتاب واپس کر سکتے ہیں کیونکہ دوستی میں قربانی پیش کرنے کا حق انہیں بھی ہے ۔ بیشتر لوگوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ ان کو نذر کیا گیا نسخہ ابھی جوں کا توں پڑا ہے صرف گرد جھاڑنے کی زحمت کرنی پڑے گی ۔ لیکن ہم نے تمام تجاویز یکسر مسترد کر دیں کہ اب ہم میں مزید رسوائی برداشت کرنے کی سکت نہ رہ گئی تھی ۔ البتہ خوشنودی حاصل کرنے اور خود نمائی کا جذبہ راہ میں حائل تھا ۔ جس کے نتیجے میں انعام میں ملنے والی ساری رقم مٹھائی کھلانے اور تقسیم کرنے میں خرچ ہو گئی اور ایک بار اعزہ نے پھر ہم پر الزامات کی بوچھار کر دی ۔ مثلاً جیسے انعام ملا ہے ، حضرت نے شکل نہیں دکھائی ۔ جیسے ہم انعام میں ملنے والی رقم چھین ہی تو لیتے اس بار تو ہمیں واقعی بڑا غصہ آیا لیکن چونکہ ہمیں اپنی باقی ماندہ زندگی انہیں کے درمیان گزارنی ہے ۔ اس لئے ہم نے تمام جاننے والوں کے گھر ٹھیک اسی طرح حاضری دے ڈالی جیسے کوئی سیاسی لیڈر اتفاقیہ طور پر الکشن جیت جانے پر اپنے حلقے میں گھر گھر شکریہ ادا کرنے کے بہانے مبارکباد وصول کرنے نیز آئندہ کے لئے اپنا ووٹ پکا کرنے جاتا ہے ۔

بہر حال لکھنے پڑھنے کی علت تو خیر کیا چھوٹ سکے گی البتہ مجموعہ چھپوانے کی حماقت ہم اب کبھی بھول کر بھی نہ کریں گے کہ اس میں رسوائی در رسوائی ہے ۔

بقیہ صفحہ ۱۰ اندلس

میں مبتلا ہیں ۔ طرح طرح کی مصیبتیں جھیلتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں مجھ سے کسی قسم کی امداد چاہتے ہیں ۔ اور ان سب باتوں کا تعلق گاڑی کے سوار سے ہے ۔

اس عرصے میں عورت مستقل سوار کی نشست درست کرتی اور اس کے جھکتے ہوئے سر کو سہارا دیتی رہی تھی ۔ میں اس کے بالکل قریب پہنچ گیا ۔ سوار سینے تک گود ڑ میں دفن تھا اور اس کے سر پر بھی گودڑ لپٹا ہوا تھا ۔ عورت نے ایک طرف سرک کر دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ اوپر کیا اور میری طرف گھما دیا ۔ (باقی شمارہ نمبر ۲ ۔ ۹۳ میں دیکھیے)

بیانِ ملکیت اور دیگر تفصیلات "شاعر" بمبئی

(مطابق فارم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ۸)

مقامِ اشاعت	بمبئی
پرنٹر و پبلشر	ناظر نعمان صدیقی
پتا	دینا ناتھ بلڈنگ تیسرا منزلہ فاکلنڈ روڈ بمبئی ۴
ایڈیٹر	افتخار امام صدیقی
پتا	دینا ناتھ بلڈنگ تیسرا منزلہ فاکلنڈ روڈ بمبئی ۴
وقفۂ اشاعت	ماہنامہ
قومیت	ہندوستانی
ملکیت	ناظر نعمان صدیقی
قومیت	ہندوستانی

میں ناظر نعمان صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں ۔

دستخط ناظر نعمان صدیقی ۸ فروری



نئی نفسیات نئی شعری کائنات



عزیز پری ہار

◆

کوئی رمز نشانی دے
سوچ کو گہرا پانی دے
موسم گذرے پت جھڑ کا
سپنے کوئی لافانی دے
پھر سوچ میں ڈوبے ہوں
آنکھ کو وہ تابانی دے
تو کیوں گم صم بیٹھا ہے
جا پودوں کو پانی دے
بچہ سونے والا ہے
اس کو راجہ رانی دے

◆

یہ لمحہ لمحہ حسیں دھوپ کے اُترنے کا
عجیب سلسلہ ہے عمر کے گذرنے کا
وہ اک شہر اماں رہ گیا بہت پیچھے
وہی مقام تھا شاید مرے ٹھہرنے کا
اداس شام کا منظر یہ صبح کی لالی
یہ سلسلہ ہے مرے ڈوبنے ابھرنے کا
وہ پوچھتا ہے پتہ اپنا اب خلاؤں سے
بہت تھا شوق اُسے خود سے بات کرنے کا
گھنا درخت ہے کوئی یا خشک پتہ ہے
وہ اک لمحہ ترے پاس سے گذرنے کا

نجات

پردے کھینچ لوں
نظریں ہٹا لوں
بھول جاؤں
منظر مفلسی کے، وحشتوں کے،
میں گنہگار نہیں
صبح فردا کا پیشرو بھی نہیں،
پھر کیوں جی کو ہلکان کروں
یوں ہی بے زار رہوں

کیوں نہ آج کوئی کتاب پڑھوں
روح کو سیراب کروں،

خط لکھوں اس شخص کو ،
جو بہت دور نہیں لیکن
جس سے برسوں سے رابطہ بھی نہیں

جاؤں کسی پھول کے پاس
کسی اکیلے پھول کے پاس
اکیلا جاؤں
کوئی بات کروں
فریاد کروں

ممکن ہے وا ہو مجھ پر
کوئی در

نظر آئے کوئی سمت
بلائے کوئی افق
کوئی شجرِ سایہ دار

میرے انتظار میں ہو!

یوٹوپیہ

آرام کرسی
کتابوں کے انبار
خیالوں کی بھرمار

عینک کے شیشوں پہ
گردِ رہِ شوق کی
دبیز پرتیں

روشنائی میں بھیگا قلم
ہواؤں کی زد میں
اوراقِ پریشاں
سگریٹ سے اٹھتا دھواں

فلسفی۔
ابھی تھا یہاں
وہ اب ہے کہاں!

● ایچ جے - ۱۷۲، ہاؤسنگ بورڈ کالونی فیروزپور روڈ، لدھیانہ ۱۴۱۰۰۱



احمد منظور



نور کی ہدایتوں کا پیش لفظ

پھر یوں ہوا کہ نور کے شفیق، ملتاتے پُرگداز لمس نے
مجھے جگا کے اپنے سارے رنگ مجھ پہ منعکس کئے
نہال ہوگیا !
میں آب دار ہو گیا
مرے روئیں روئیں میں بس گئے تمام رنگ
وہ رنگ جو کہ زندگی کی جان ہے
وہ رنگ بھی جو موت کا نشان ہے
وہ رنگ جو ازل سے مہربان ہے
وہ رنگ بھی جو آگہی سمان ہے
دھنک سحر شکار ہو گیا
میں بے قرار ہو گیا
مرے روئیں روئیں میں بس گئے تمام رنگ

ہوا چلی

ہوا چلی تو زندگی کے بے شمار راز مجھ پہ آشکار کر گئی
سکھا گئی کہ زندگی
محض ہوا کے رخ پہ بہتے رہنا ہی نہیں ہے کوئی زندگی
کہ زندگی تو نام ہے ہوا سے انحراف کا
شدید اختلاف کا
اس انحراف میں اگر تم اپنی جان سے گذر گئے تو کوئی غم نہیں
کہ اس فنا میں دائمی بقا کا اہتمام ہے
ہوا کا رخ بدل سکو تو جان لو کہ نام ہے
مقامِ احترام ہے
دوام ہی دوام ہے

◆

تصور سبز ہو جاتا ہے اک جنگل نکلتا ہے
فضا میں پھیلتی آلودگی کا حل نکلتا ہے

ندامت روح کو گہرائی تک پاکیزہ کرتی ہے
جہاں تنہا ہوئے آنکھوں سے گنگا جل نکلتا ہے

بدن سے سانپ ہیں لپٹے ہوئے اس سوچ میں گم صم
پسینے کی جگہ دیکھیں تو کب صندل نکلتا ہے

لہو کی دسترس دامن سے ہے گردن تلک لیکن
ابھی قاتل کا ہر نقشِ قدم مقتل نکلتا ہے

سکوتِ شب نہ تھا طوفان کا ٹھہراؤ تھا یعنی
جسے تم آخری سمجھے، وہی اوّل نکلتا ہے

نکلتے ہیں تو ہم سیراب کرتے ہیں زمینوں کو
مزاجِ آب دگل نا آشنا بادل نکلتا ہے

◆

آوازوں نے سیکھ لیا ہے جھلمل شیشہ ہو جانا
دل وادی میں چھن سے گرنا ریزہ ریزہ ہو جانا

اک دو فرد کا قصہ کب ہے یہ ہے مقدر نسلوں کا
پل دو پل کو ہوش میں آنا پھر دیوانہ ہو جانا

تنہائی کی ڈھیروں بارش جھیل چکے سیراب ہوئے
اب موسم کی آنکھ لگے تو سایہ سایہ ہو جانا

رگ رگ میں وحشت دیوالی جشن چراغاں آنکھوں میں
گمنامی کے غار سے اٹھنا اور افسانہ ہو جانا

کچھ پا لینے کی خواہش میں ہر دم کچھ نہ کچھ کھونا
حاصل جوڑنے بیٹھیں جب بھی دل ویرانہ ہو جانا

یادوں کی پھلواری ہونا، وحشت جنگل چھا جانا
دل نگری کا پل میں تو دل پل میں باشہ ہو جانا

ان صدیوں پہ چھا جانا گر پل دو پل کا قصہ ہے
تم احمد منظور سے آگے وقت کا حصہ ہو جانا

● پرنس انفارمیشن بیورو، ۱۰۱- این، کے روڈ، بمبئی- ۲۲



عالم خورشید

سیاہ رات کے بدن پر داغ بن کے رہ گئے
ہم آفتاب تھے مگر چراغ بن کے رہ گئے

کسی کو عشق میں بھی اب جنوں سے واسطہ نہیں
یہ کیا ہوا کہ سلسلے دل، دماغ بن کے رہ گئے

وہ شاخ شاخ لال، پیلے، نیلے رنگ کیا ہوئے
تمام دشت کے پرند زاغ بن کے رہ گئے

جنھیں یہ زعم تھا زمیں سے تشنگی مٹائیں گے
عجب ہوا وہی تہی ایاغ بن کے رہ گئے

ملیگا سب کو اپنا حق رہیں گے سب سکون سے
وہ وعدۂ فراغ سبز باغ بن کے رہ گئے

ہیں آسماں سے ٹوٹتے ہوئے ستارے ہم
گئے دنوں کی کہانی کے استعارے ہم

وہ انقلاب جو اب تک کہیں نہیں آیا
اس انقلاب کے مبہم سے ہیں اشارے ہم

مغائرت تو جلاتی ہے فاصلوں کے چراغ
ہمیں قریب سے دیکھو کہ ہیں تمہارے ہم

بلا رہی ہے تہہ آب کوئی شئے ہم کو
کھڑے ہوئے ہیں مگر جھیل کے کنارے ہم

تمام ہو گیا اب ذوقِ رنگ و بو عالم
اگا رہے ہیں ہر اک شاخ پہ شرارے ہم

یہ کیا ہوا کہ مشقت میں کچھ اثر ہی نہیں
شجر ہرے ہیں مگر شاخ پہ ثمر ہی نہیں

جدا ہو سب سے مری راہ یہ دعا کی تھی
سو اس سفر میں مرا کوئی ہم سفر ہی نہیں

ستارے مانگتا ہے ایک پھول سا بچہ
میں کیا کروں کہ مرے بازوؤں میں پر ہی نہیں

اسی لئے تو یہ سارا جہاں ہمارا ہے
کہ اس زمیں پہ کہیں اپنا کوئی گھر ہی نہیں

وہ ایک شخص کہ بھی منزلیں اسی کی ہیں
میں ایک شخص مری کوئی رہ گذر ہی نہیں

جاؤں کہیں بھی ہر جگہ تعزیر ایک ہے
اہلِ جنوں کے واسطے زنجیر ایک ہے

میرا وطن ہو یا وہ تمہارا دیار ہو
مظلوم پہ اٹھی ہوئی شمشیر ایک ہے

غم بے حساب ہیں مگر اہلِ جنوں کے پاس
راہِ نجات کی یہی تدبیر ایک ہے

ٹکڑے کا ایک روز بکھر جانا نفس کا نظام
انساں کے سارے خواب کی تعبیر ایک ہے

گیتا، قرآن، بائبل کچھ بھی پڑھو مگر
انسانیت کے باب کی تفسیر ایک ہے

معرفت اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ (پی) ایگزی بیشن روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۱



اشعر ہاشمی

پرندہ

پرندے کی یہ مشکل ہے
وہ دن بھر آسماں کی نیلگوں گہرائیوں میں
جس قدر اترے، پروں میں خون کے
دو چار قطرے رہتے رہتے
شام کے ڈھلنے سے پہلے ہی اسے تو
آشیاں تک لوٹ آنا ہے
پرندے کی یہ مشکل ہے
اجالے میں کبھی وہ آشیاں میں رہ نہیں سکتا
اسے تو دانہ دانہ تنکا تنکا جستجو میں
آسماں سے ارض تک تحلیل ہونے، پھر سمٹ کر
آشیاں تک لوٹ آنے کے لئے
اپنے پروں پر جھول جانا ہے
پرندے کی یہ مشکل ہے
وہ تنہا بے کراں نیلاہٹوں میں دیر تک
اور دور تک جیسے بھی چاہے، خوب لہرائے
مگر وہ اپنی سمتوں کے تقاضوں کو
کبھی جھٹلا نہیں سکتا
پرندہ ربط کی سرحد سے باہر جا نہیں سکتا!

انا گزیدہ

یہاں اسلام آذر نام کا اک منحنی سا شخص رہتا ہے
وہ میرا دوست
جو علم و عمل کا ایک پیکر ہے
میں جس کو دیکھ کر اکثر جھکا کرتا ہوں تو اکثر وہ اٹھ جاتا ہے
مگر فانی سے بانی تک
کسی کی بھی غزل کا تذکرہ نکلے۔ تو
جی یہ چاہتا ہے چوم لوں اس کی ذہانت کو
عجب وہ شخص ہے
کم بخت کتنا پڑھ کے بیٹھا ہے

مگر وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچا
کہ وہ جھک کر تو چلتا ہے
مگر خود ساختہ جھوٹے خداؤں کو کبھی سجدہ نہیں کرتا
کسی اونچی سی کرسی تک
کسی بارعب گدی تک
پہنچنے کے لیے جن ڈیوڑھیوں پر جا کے سر خم کرنا ہوتا ہے
کبھی ان ڈیوڑھیوں تک جانے والی راہ پر اس کو
نہیں دیکھا
بالآخر، جانشینی باپ کے حصے میں آئی ہے
اور اب وہ شہر کے ایک نامور ہوٹل کے سائے میں
بچھا کر اپنی چوکی بیٹھتا ہے اور ہنس ہنس کر
پکوڑے اور سموسے بیچتا ہے اس طرح جیسے
اسی کے واسطے ڈھالا گیا تھا اس کو سانچے میں

نازی پرساد لین میں

اسی مکان کے آنگن میں ہم سے چھوٹی تھیں
تمام چاہتیں بچپن میں ہم سے چھوٹی تھیں

سنا ہے بجھ گئیں وہ ریگ زار ہستی میں
چمکتی آنکھیں جو چلمن میں ہم سے چھوٹی تھیں

بہت وسیع تھا دامن یہاں عزیزوں کا
امنگیں سب اسی دامن میں ہم سے چھوٹی تھیں

ہری بھری ہیں، ثمر بار پیڑ کی صورت
جو کونپلیں کسی ساون میں ہم سے چھوٹی تھیں

کہاں قیام ہے موزوں، کہاں ہے ناموزوں
منازل ایک اسی الجھن میں ہم سے چھوٹی تھیں

مگر جو چھوٹے ہیں ان کو سمیٹ لانا ہے
تمام خفتہ تمناؤں کو جگانا ہے

کہیں سے لانا ہے اک شام اب چرا کے کہیں
یہ طے کیا ہے کہ چوپال پھر سجانا ہے

سی-۷۶، ہنومان روڈ فلیٹس بنگلہ صاحب لین، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۱



ارشد عبدالحمید

◆

نئے سرے سے ساخت کر
مجھ کو پھر دریافت کر

پہلے خلق کیا تھا کیوں
اب مجھ کو برداشت کر

غم کی آمد آمد ہے
گل بوٹے پرداخت کر

لفظ سبھی جھوٹے ہیں
بات براہِ راست کر

سب کو مارتا رہتا ہے
خود کو بھی نایافت کر

◆

اک آسیب نقل مکانی زندہ ہے
دریا اتر چکا، طغیانی زندہ ہے

چیخوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں
میرے اندر کا زندانی زندہ ہے

شہری آنکھوں سے تو ریت ابلتی ہے
سنتے ہیں دیہات میں پانی زندہ ہے

تیری تربیت، میری حیات، اپنی وفا
یعنی گھر میں بے ایمانی زندہ ہے

عکس ابھی تک بولتے ہیں آئینوں میں
وہ معدوم ہے اس کا ثانی زندہ ہے

◆

مسافتوں میں دھوپ اور چھاؤں کا سوال کیا
سفر ہی شرط ہے تو پھر عروج کیا زوال کیا

فراق ساعتوں کے زخم روح تک پہنچ چکے
میسر آئیں بھی تو اب ساعتِ وصال کیا

ہنر تو دھوپ جنگلوں کی مسکراہٹوں میں ہے
گلاب بستیوں میں ہنستے رہنے کا کمال کیا

امید ہی تو دل شجر کی آخری اساس تھی
شگوفہ یہ بھی ہو گیا خزاں سے پائمال کیا

تمام شہر ہی ہوا کے دوش پر سوار ہے
دکھائے کوئی زخم کیا سنائے کوئی حال کیا

◆

چاند تاروں کی نمائش ہو رہی ہے
رات اپنی چولی کھولے سو رہی ہے

ریشمی شالوں سے موتی گر رہے ہیں
الگنی پر دھوپ بھیگی رو رہی ہے

ناز کر ہم تجھ کو پانا چاہتے ہیں
ورنہ پتھر کی طلب کس کو رہی ہے

سوچتا ہوں اس کو پلکوں پر اٹھا لوں
پھول کی ڈالی زمین پر سو رہی ہے

ہم بھی ارشد ایک مفلس کا دیا ہیں
عمر بھر مدھم ہماری لو رہی ہے

● شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج، اجمیر۔ (راجستھان)



شکیل جمالی

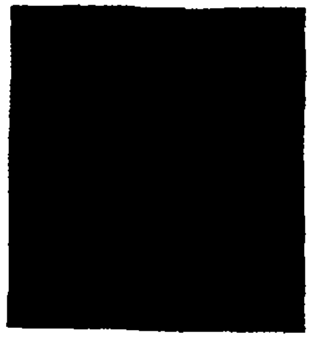
یہ تری خلق نوازی کا تقاضا بھی نہیں
کہیں دریا ہے رواں اور کہیں قطرہ بھی نہیں
اپنے آقاؤں کے عیبوں کو محاسن سمجھے
اتنی پابندِ عقیدت تو رعایا بھی نہیں
صرف گن لیتے ہیں تائید میں اٹھتے ہوئے ہاتھ
اعتراضات کی بابت کبھی سوچا بھی نہیں
سرخیوں تک ہے فقط خیر و خبر سے رشتہ
میں زیادہ کسی تفصیل میں جاتا بھی نہیں
ایک دو سانس ضرورت سے زیادہ لے لوں
کیا مرے دائرہ کار میں اتنا بھی نہیں
زندگی گھن کی طرح چاٹ رہی ہے بیکو
عمر پوری ہے مگر آدمی آدھا بھی نہیں
اختیارات سے حق تک ہیں زبانی باتیں
دستخط کیا کسی کاغذ پہ انگوٹھا بھی نہیں
کوئی امکان نہیں ہے کسی خوش فہمی کا
چارہ گر تم ہو تو پھر زخم کو بھرنا بھی نہیں
درد، ایثار، وفا، انس، محبت، نیکی
ان کتابوں کو تو احباب نے کھولا بھی نہیں

تمہارا نام بھی شائستگی سے لینا ہے
اب انتقام بڑی عاجزی سے لینا ہے
جوابِ ظلم کا دوں گا تجھے ضرور مگر
یہ کام بھی تری تلوار ہی سے لینا ہے
ہوا کبھی مرے معیار پر نہیں اتری
چراغ گھر کے لئے تیرگی سے لینا ہے
کہو! وہ اپنی سخاوت کو اپنے پاس رکھے
دیا ہے جس نے ہمیشہ اسی سے لینا ہے
لبِ فرات! میں پیاسا ہوں اور تو چپ ہے
حساب یہ تری دریادلی سے لینا ہے
وہ اپنے خون سے لکھنے لگا ہے خط مجھکو
اب اس مذاق کو سنجیدگی سے لینا ہے
یہ کام سخت بہت ہے مگر خدا کی قسم
حلال رزق اسی نوکری سے لینا ہے
میں اپنے گھر میں اکیلا کمانے والا ہوں
مجھے تو سانس بھی آہستگی سے لینا ہے

بولتا ہے تو پتہ لگتا ہے
زخم اس کا بھی ہرا لگتا ہے
راس آجاتی ہے تنہائی بھی
ایک دو روز برا لگتا ہے
کتنے ظالم ہیں یہ دنیا والے
گھر سے نکلو تو پتہ لگتا ہے
بوجھ سینے پہ بہت ہے لیکن
مسکرا دینے میں کیا لگتا ہے
دور تک کوئی نہیں ہے تم سا
تم جو کہتے تھے بجا لگتا ہے
اتنا نقصان اٹھایا ہے کہ اب
فائدہ بے سر و پا لگتا ہے
آج بھی وہ نہیں آنے والا
آج کا دن بھی گیا لگتا ہے
دو قدم پر ہے عدالت لیکن
سوچ لو وقت بڑا لگتا ہے
موڈ اچھا ہو تو سب اچھا ہے
ورنہ ہنسنا بھی برا لگتا ہے

جامع مسجد مارکیٹ، چاندپور (بجنور)





فرید پربتی

رہِ تمنا قدم قدم رہگزارِ بے سنگِ میل نکلا
قلیل سمجھا تھا میں جس سفر کو وہی بالآخر طویل نکلا

غبارِ وحشت ابھی دگر ہے جنوں کو بیدِ و بانہ کر دے
غمِ وفا سے غمِ جہاں تک جہاں پہ ہر پل عجیل نکلا

وہ اک سخن اعتبارِ صبر شکیب جس کو کہا گیا تھا
وہ اک سخن کیوں دکھا کے دل کو فروغِ مستیٔ دلیل نکلا

عتابِ نمرود بے ثمر ہے یہ معجزہ کم نہیں ہے یارو
میں عصرِ حاضر کے آگ میں ہوں سے بچ کے خلیل نکلا

حصولِ مرہم میں صد گذر آ ماں دیکھا کہ جلتوں کا
نمک سے بھرنے تمام زخموں کو بھر رفتہ بت جمیل نکلا

امیدوں کا سجا ہوا محل ہے زیرِ آب
حسرت کی دوڑ دھوپ کا حاصل ہے زیرِ آب

اے چشمِ گریہ ناک یہ منظر بھی دیکھنا
کشتی تو ہے سطحِ آب پہ ساحل ہے زیرِ آب

پانی تمہاری یاد کا سر سے گذر گیا!
اب تم کو بھی پکارنا مشکل ہے زیرِ آب

مچلی ہے موج موجِ تمنا جو دید کی
شاید اسی سبب سے مرادل ہے زیرِ آب

ٹھہروں اگر تو وسوسہ طغیانیوں کا ہے
اور لوٹنا بھی چاہوں تو منزل ہے زیرِ آب

خستہ جاں پابندِ کارِ رائیگاں ہونے کو ہے
جمع خار و خس برائے آشیاں ہونے کو ہے

زندگی کی حیرتوں میں پھر اضافہ ہو گیا
تھی جو ہونے کی توقع وہ کہاں ہونے کو ہے

سونپ کر جس کو چلا تھا میں نگہداری کا کام
وہ بھی محوِ سازشِ تیر و سناں ہونے کو ہے

واپسی کے راستے بھی ہو گئے مسدود سب!
اور مرے جی کو بھی احساسِ زیاں ہونے کو ہے

ساحلوں سے باندھ لی کشتیاں تو بھی فرید
پھر سے برگشتہ ہوائے بادباں ہونے کو ہے

ہم فکرِ دل و جاں میں فغاں کر نہیں
وہ اب کے گذرتی ہے بیاں کر نہیں

اس درجہ بڑھے نقلِ مکانی کے بیا
تعمیر کہیں پر بھی مکاں کر نہیں

یہ کیا کہ شب و روز فقط ان کی آ
یہ کیا کہ محبت کو عیاں کر نہیں پا

شاخوں سے لپٹی ہے ابھی سر سبز مو
بے برگ و نوا عزمِ جواں کر

اے خواہشِ دل نقش ذرا آب رو
نظارۂ اندوہ فشاں کر نہیں پا

شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر (کشمیر)



اکرم نقّاش

◆

یختے کلکارتے منظر تمام
وح میں پیوست ہیں خنجر تمام

س قدر آباد ہے یہ آسماں
بح دم پھر دیکھئے بنجر تمام

ات کی تاریکیوں کا خوف کیوں
بتو بستی ہیں مرے اندر تمام

ں نہ مانوں طے بھی ہوگا فاصلہ
مر چاہیے ہو ترے در پر تمام

نیند ہے سارے بدن سے بولتی
اور کانٹے ہو گیا بستر تمام

◆

سرل دنیا کو بہلانا
کھٹن خود کا بہل جانا

تری دولت فضائے ہجر
مری میراث ویرانہ

نوائے شام ہے گویا
کھنڈر آباد ہو جانا

بڑی لمبی مسافت ہے
کسی دل میں اُتر جانا

دھنک کا پھیلنا کیا ہے
تری آواز لہرانا

◆

حیرت سے دیکھتا ہوا چہرہ کیا مجھے
صحرا کیا کبھی، کبھی دریا کیا مجھے

کچھ تو عنایتیں ہیں مرے کارساز کی
کچھ میرے ہی مزاج نے تنہا کیا مجھے

یوں تو سزا کی قید سے آزاد تھا مگر
میری نگاہ سے کوئی دیکھا کیا مجھے

پتھرا گئی ہے آنکھ بدن بولتا نہیں
جانے کس انتظار نے ایسا کیا مجھے

آنکھوں میں ریت پھیل گئی دیکھتا بھی کیا
سوچوں کے اختیار نے کیا کیا کیا مجھے

◆

ایک ٹوٹا ہوا سنسان سا گھر باقی ہے
ایک تصویر لبِ بام مگر باقی ہے

دیکھ آئے ہیں زمانے کے نہاں خانے سب
آپ اپنے میں اُترنے کا سفر باقی ہے

گو نکل آئے بہت دور اَنا دلدل سے
کوئی اندیشہ رگِ جاں میں مگر باقی ہے

ایک اندوہ بلا تا بہ فلک سرگرداں
ایک محشر تہہِ دامانِ بشر باقی ہے

آن پہنچے تو کھلا منزلِ جاناں کا بھرم
مرحلہ وہ ہی بہ اندازِ دگر باقی ہے

رات بھیگے ہوئے قدموں کے نشاں ہیں معدوم
وادیٔ دل پہ جو چھایا تھا کہر باقی ہے

ربط ایسا بھی نہیں ہے کہ کروں تجھ سے گلہ
اور خاموش رہوں تو کوئی ڈر باقی ہے

دیکھتا ہوں تو مرا شہر ڈھلانوں کی طرح
بند کر لوں جو میں آنکھیں تو نگر باقی ہے

مکان نمبر: ۱/۲۳/۲۰۲۱-۷، بلال آباد۔ گلبرگہ۔ ۵۸۵۱۰۴

موت !
کتنا خوفناک شبد ہے یہ
ذرا اس کا تجزیہ کرو ۔
یا کہ کتنا آسان شبد !

سامنے والے کی پیشانی پر لکھا دھرم
اس کا فیصلہ کرے گا ۔

گرم لوہے کی چھڑ
اپنے کلیجے میں گھسیڑ کر دیکھو
درد اور جلن :
کس قدر مجبوری ہے اسے جھیلنے کی ۔

کسے فائدہ ہے
مندر بننے کا
یا مسجد نہیں ٹوٹنے کا ! ۔

وہاں نہ تو ہم نماز پڑھنے جائیں گے
نہ تم پوجا کرو گے،
کہ لاکھوں جنم استھلیاں اور عبادت گاہیں
ایسی ہیں،
جہاں چڑیوں کی بے لوث چہچہاہٹ
اور چمگادڑوں کی مردہ سنوں... سنوں
کے علاوہ کچھ بھی نہیں
کوئی اذان نہیں ہوتی
کوئی گھنٹا نہیں بجتا ۔

کیا بابر کو یہ معلوم تھا
کہ اس کے ایک مسجد کے عوض
یا سیتا کو اس کا اندازہ تھا
کہ اس کی ایک روٹی کی سوندھی مہک کے بدلے

لوگوں کی موت کا فیصلہ
ان کی پیشانی پر لکھا دھرم کریگا ؟؟





سائرینہ

نہیں، میں نہیں، تم قرضدار ہو

میں کوشش کر رہی ہوں
رفتہ رفتہ
تمہارا سب کچھ لوٹا دینے کو
کہ تم نے خالق کی طرح نہیں دیا
دیا ! جیسے —
کتے کو روٹی دی جاتی ہے
بھکاری کو پھینک کر اکنی دیجاتی ہے
اور اپنی چیز بندھک رکھ کر
پیسہ لینے والے انپڑھ قرضدار کیطرح
مجھ سے اپنی کوکھ پر انگوٹھا لگوالیا
اور جب جب جیسے من گیا
جتنا من گیا
کورے کاغذ پر لکھ کر
سود وصولتے رہے ۔

کوشش کر کر کے
ایک ایک برس سہج رہی ہوں
تمہاری دی ہوئی ممتا کا ۔
تمہارے دو ایک میٹھے بولوں کا
بھول سے ملے تمہارے مشفقانہ لمسوں کا
ایک ایک احساس سمیٹ رہی ہوں
کنٹیلے چبھتے ہوئے کانٹے
کسک اٹھتے ہیں
آنکھوں میں سوکھے کا وہ موسم گذر جاتا ہے
اور سود وصولی کا وہ منظر یاد کر کے
میں اب پھیکی سی ہنس دیتی ہوں ۔

کوشش کر رہی ہوں
کہ تمہارا دیا سب کچھ لوٹا سکوں
لیکن قرض تو قرض ہوتا ہے
ایک احسان ہوتا ہے
نہ مانو تو لوگ مغرور کہیں گے
چکا بھی دو تو اصل بچارہ جاتا ہے ۔

کوشش کر رہی ہوں
ڈھیر ڈھیرے تمہارا سب کچھ لوٹا دینے کو
یہانتک کہ تمہارے جنم داتا قطرے بھی ۔

کاش !
ایک بار، بس ایک بار
باری باری سے
میں تمہارا خالق بن جاتی
اور تم میری کوکھ سے پیدا ہوتے
شاید تمہیں معلوم ہو پاتا
اصل نہیں لوٹا پانے کا درد کیا ہوتا ہے !

امام منزل، لوہر واگھاٹ، عالم گنج، پٹنہ — ۷ (بہار)

مونالیزا لول

مونالیزا لول !
لوگ تجھے داؤنسی کی شہکار تخلیق کہتے
یا عورت ؟

تیری نہ ہنستی نہ روتی مسکراہٹ پر
کیوں فلسفہ شعریات ڈھونڈتے
تیری سادھی آنکھوں میں
کیوں رمزیت دیکھتے ہیں !
تیرے ماتھے کی لکیروں میں
کیوں کائنات خال و خط پاتے ہیں
تیرے زرد پڑے چہرے سے
کیوں خدائے یکتا کو جوڑتے

کیوں کہ تو
داونسی کی شہکار تخلیق ہے
عورت نہیں —!!!



اعجاز مصوّر

ماسٹر پیس

ایک خالی کینوس
کی مانند ہے اپنا وجود
ہر آتا جاتا راہ گیر
برش لیے
اس کینوس پر
اپنا نشاں بناتا ہے
اور یوں یہ خاکا ابھرنے لگتا ہے
لیکن!
ایک دن ایسا بھی آتا ہے
کہ ہم پر یہ افشا ہوتا ہے
کہ ہمیں خود
برش اٹھائے
یہ ادھوری تصویر پوری کرنی ہے
اور ہم کو بس یہ تعین کرنا ہے
کہ ہمیں ایک عام سی تصویر
بن کر رہنا ہے
یا ایک ماسٹر پیس!

ڈائورشن

کیا کھوجتی ہیں آنکھیں
خلاؤں میں
کن سوچوں میں رہتے ہو
تم اپنی سرخ آنکھیں
مرکوز کر دو
کینوس پہ
کچھ نقوش ابھریں گے
کھینچ دو لکیروں کو
اور بھر دو ان میں رنگ
تمہارا کرب سارا
رنگوں میں ابھر آئے
پھر تم
زباں کے گناہ سے مستثنیٰ!
گہری نیند میں سو جانا

فلیش بیک

ذہن و دل پہ ثبت کچھ تواریخ
زندگی سے وابستہ
وہ ناخواستہ منظر
جو جسم کو تار تار کیے جاتے ہیں
اے کاش!
انہیں زندگی سے خارج کرتا
اور پھر
ناکردہ گناہوں کی سزا سے پرے
اک غبارے کے مانند
ہوا میں اڑنے لگتا
کاش ایسا ہوتا۔۔۔!

فوکس

اور کیا ہوں گی جہاں میں لذتیں
وہ ایک لمحۂ پنہاں جس میں
دنیا بھر کی نعمتیں
جی تو یہ چاہتا ہے بس
اس ایک لمحے میں
مقید ہو کے رہ جاؤں

● آئینہ کاٹیج۔ ایم۔ ایس کے ملز روڈ، گلبرگہ ۲ (کرناٹک)





محسن رضا رضوی

قطرے میں اُبلتا ہوا دریا تو نہیں ہے
ذرّے میں بکھرتا ہوا صحرا تو نہیں ہے

ہے خون اُکتا ما، کہ ہے جگنو، کہ شرر سوہ
پلکوں پہ مچلتا ہوا قطرہ تو نہیں ہے

کیا جانیئے کا داک ہے کیوں نبض کی رفتار
دل سینے میں ہے محملِ لیلیٰ تو نہیں ہے

آنکھوں سے اتر آیا ہے جو میری رگوں میں
وہ اس کا جمالِ رخِ زیبا تو نہیں ہے

فن پاروں سے ماخوذ ہیں تنقید کے اقدار
فن پر کسی ناقد کا اجارا تو نہیں ہے

کبھی خودی تو کبھی تھا خدا کا اندیشہ
دعا کے ساتھ قبولِ دعا کا اندیشہ

بساطِ زیست پہ ہر لمحہ پیشِ راہ رہا
وہی کشاکشِ آب و ہوا کا اندیشہ

ہر اک مقام سے گذرا ہوں بے نیازانہ
مجھے نہیں ہے سزا و جزا کا اندیشہ

وہ اپنا دوست قریبِ رگِ گلو جو رہا
اسی سے مجھ کو رہا ہے بلا کا اندیشہ

کریں گے اس کے بزرگوں کا لوگ اس پہ گماں
غلط نہیں تھا یہ محسن رضا کا اندیشہ

چھین کر حسنِ طبیعت لے گیا
کون تھا جو مجھ پہ سبقت لے گیا

بام و در جب سے ہوئے محفل پرست
میرا گھر خود اپنی خلوت لے گیا

صلح کا پرچم میں لہراتا رہا
اور وہ مالِ غنیمت لے گیا

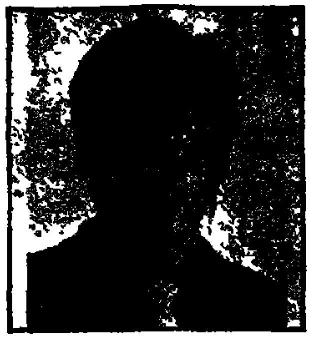
دوستی، عزّت، وفاداری، خلوص
یہ زمانہ ساری بدعت لے گیا

دید ناممکن جسامت کے بغیر
یوں نظر کی استطاعت لے گیا

سارے تن کو پیٹ کر لینے کا شوق
میری دستارِ فضیلت لے گیا

دے گیا منزل کی مجھ کو جستجو
اور خود ساری مسافت لے گیا

۱۲۸۔ کاویری ہاسٹل، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷



اشعر علیگ

جواپنے خونِ جگر کو حنا سمجھتے ہیں
سمجھ لو موت کو وہ دل رُبا سمجھتے ہیں

یہ آگ ان کے گھروں تک بھی جائیگی اک دن
فساد کو جو ابھی حادثہ سمجھتے ہیں

ہر ایک بات عیاں ہو گی روبرو ہو کر
تمہارے چہرے کو سب آئینہ سمجھتے ہیں

نفس کی آمد و شُد پر ہی سب ہوا موقوف
یہ لوگ کیوں مجھے عہدہ برآ سمجھتے ہیں

مزاج دہر سے واقف نہیں ہوئے اشعر
ہر ایک شخص کو کیوں پارسا سمجھتے ہیں

درپیش تجھ کو مسئلہ اب کیا سفر میں ہے
تو منزلِ تقابلِ عیب و ہنر میں ہے

کیا انقلابِ نو کوئی طبعِ بشر میں ہے
سامانِ دل کشی یہاں رقصِ شرر میں ہے

احساس جاگنے لگا مردہ وجود میں
لگتا ہے کوئی بات ترے نیشتر میں ہے

سوچوں تو دل میں ہے وہی دیکھوں تو آنکھ میں
رشتہ عجیب سا مرے قلب و نظر میں ہے

اندیشہ نارسائی کا اشعر نہیں رہا
جب شوق بھی جنوں کے دستِ ہنر میں ہے

ساری دنیا سراب ہو جائے
اب نظر کامیاب ہو جائے

پڑھتے پڑھتے میں اس کو سو جاؤں
وہ جو میری کتاب ہو جائے

میری نظروں کا لمس کافی ہے
اس کا چہرہ گلاب ہو جائے

بسترِ درد پر کسی کا خیال
نیند آنکھوں کی خواب ہو جائے

جشنِ گریہ ہے لے غمِ دوراں
کچھ پرانا حساب ہو جائے

شہر کو چھوڑ کر چلے آنا
زندگی جب عذاب ہو جائے

۵/۸ بادشاہ نگر کالونی، لکھنؤ ۔ ۲۲۶۰۰۶



وسیم قریشی

◆

صلیبِ فکر سے ست وجود پر مصلوب ہو جانا
مرے احساس نے سیکھا کہیں مغلوب ہو جانا

نہ میں ناصح نہ میں زاہد نہ میں کوئی پیمبر ہوں
حوادث کی عنایت ہے مرا معتوب ہو جانا

عجب انداز ہے اس مختصر سی زندگانی کا
کبھی معتوب ہو جانا، کبھی محبوب ہو جانا

حیات زیست ہے مجھ کو اے دوستو لیکن
خرد والوں کو کھٹکے گا مرا مجذوب ہو جانا

ہے ٹھنڈے سائے کی مانند تپتے ریگزاروں میں
مری روحِ شکستہ سے ترا منسوب ہو جانا

◆

بصیرتوں پہ کچھ ایسے عذاب آئے ہیں
ہر ایک سمت نظر میں سراب آئے ہیں

لکیریں ہاتھ کی اب بھی بہت چمکتی ہیں
اگرچہ ہاتھ میں سکے خراب آئے ہیں

جہاں کئے تھے بہت کارِ خیر اے مالک
اسی زمیں پہ لٹا کر ثواب آئے ہیں

ہم اب کہاں تری باتوں میں آئیں گے اے دل
سمجھ کے عقل و خرد کا نصاب آئے ہیں

یہ انتظار پلک بھی نہ موندنے دے گا
اگرچہ آنکھ کے پہلو میں خواب آئے ہیں

◆

یارب شکست کا نہ مسلسل عذاب دے
تلوار میری توڑ دیا اس پہ آب دے

مایوس زندگی کو نئی زندگی ملے
پانی نہ دے تو تشنہ دہن کو سراب دے

دستِ سوال اپنا لئے لوٹ جاؤں گا
چپ کیوں ہے میرے یار تو کچھ تو جواب دے

یوں تو ہر اک جبیں پہ لکھا ہے وفا پرست
اے وسعتِ نظر تو کوئی انتخاب دے

ہاتھوں کو کر عطا کوئی بیباک سا قلم
خاموشیٔ زباں کو طرزِ خطاب دے

◆

ایک ہی ذات میں سمٹی ہوئی دنیا لگنا
یوں بھی لگتا ہے کسی شخص کا اچھا لگنا

رات بھر جاگتے رہنا کسی آہٹ کے لئے
رات کے پچھلے پہر پھر کوئی دھوکہ لگنا

چونک کر جاگنا اٹھ بیٹھنا سوتے سوتے
بند پلکوں پہ کوئی لمس لبوں کا لگنا

بند آنکھوں میں اجالے ہی اجالے ہر سو
آنکھ جب کھول کے دیکھوں تو اندھیرا لگنا

میری اندر کی اداسی کا سبب ہے شاید
شہر سے دور یہ تنہائی میں جی کا لگنا

● ای۔ ۲۶۸ تکونہ پارک جامعہ نگر (اوکھلا)، نئی دہلی ۲۵۔

مکتوبات

[illegible] کے نام

شاعر کے حالیہ شماروں پر قارئین کے بے شمار خطوط موصول ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ہم اپنے تمام معلوم نامعلوم قارئین کا اسی کالم میں شکریہ ادا کرتے رہے ہیں۔ کیوں کہ ان کے خطوں ہی کی روشنی میں ہم شاعر کو ترتیب دیتے ہیں۔ قارئین سے ہمیں بے حد افسوس ہے اور معذرت خواہ ہیں کہ شاعر کے شمارہ نمبر ۶ اور ۸ کے متعلق موصولہ خطوط شامل نہیں کئے جاسکیں گے۔ ڈھیر سارے خطوں کی محدود صفحات میں کسی بھی طرح ممکن نہیں ہو پا رہی ہے۔ شاعر کے صفحات میں اضافہ زیر غور ہے۔ مگر آپ اسی طرح محبت بھرے خطوط لکھتے رہیئے۔ اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہیئے۔ "لہو رنگ لہجے" کے متعلق بھی خاصی تعداد میں خطوط موصول ہوئے ہیں۔ طویل و مختصر۔ وہ خطوط جن میں "لہو رنگ لہجے" کے حوالے سے موجودہ سیاسی سماجی حالات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ شامل نہیں کئے جارہے ہیں۔ اس کے لئے شاعر کا ایک پورا شمارہ درکار ہوگا۔ جو ممکن نہیں — (ادارہ)

طارق سعید، ۱۵۔ اردو باغ ہمدانی سبزی منڈی، فیض آباد۔

لہو رنگ لہجے نے بے حد متاثر کیا۔ کیا اس کی آواز تھی جسے آپ نے محسوس کیا۔ یا یوں کہیئے کہ جس حادثے نے ہم سب کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ شاعر کے لہو رنگ لہجے نے ان سب کیفیتوں کو سمیٹ کر بیان کر دیا ہے۔ کم از کم آپ نے مجھ پر بے حد احسان کیا کہ لہو رنگ لہجے کی اشاعت میں خود میں بھی انتخاب کو شریک تصور کر رہا ہوں۔ آپ کی سوچ اور فکر کی سلامتی کیلئے رب العزت سے دعا گو ہوں۔

شاہد کلیم — دودھ کٹورہ، آرہ (بہار)

"لہو رنگ لہجے" کی تمام چیزیں ایک ہی نشست میں پڑھ گیا۔ فوری ردعمل کے طور پر ایودھیا کے سانحے کے متعلق شعراء کی تخلیقات کی یکساں اشاعت یقیناً ایک مستحسن قدم ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بیشتر شعراء نے آپ کی فرمائش پر تخلیقات روانہ کی ہیں اور آپ نے بھی ان کے انتخاب میں غور و فکر سے کام نہیں لیا ہے۔ لہٰذا تخلیقات میں وہ بات نہیں آئی جو شاعری کو شاعری بناتی ہے۔ بیشتر تخلیقات بیزاری اور اضطراری کیفیات کی غمازی کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں اچھی تخلیقات کا انتظار کریئے تو یقیناً بات بن جائے گی۔

خدا ابرار حسین — ۱۲۔ ۱۲ عبدالعزیز روڈ، چوک لکھنؤ۔

شمارہ نمبر ۹ میں علی امام نقوی کی کہانی "پھندے کے پھول" پڑھی۔ آپ کے انتخاب پر حیرت ہوئی۔ ایک ہی موضوع پر اگر دو کہانیاں آپ کے پاس ہوں تو آپ کو یہ ضرور چاہیئے کہ دونوں میں سے جس کہانی میں زیادہ تخلیقی جوہر ہوں اسے ترجیح دیں۔ بار بار ایک ہی موضوع چھاپنے سے ہی کہانیاں کی کہانیاں منتخب کر کے آخر کیوں وقت خراب کر رہے ہیں۔ شاعر کے سابقہ شمارے میں شکیلہ اختر (ظہیر اختر) کا افسانہ تمام منفی تجربوں کے ساتھ اور کہانی سے زیادہ پاورفل ہے۔ ہمیں علی امام اور اختر امام سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ اس طرح کا انتخاب ان کا نام گم کر دیں۔

فرحت جہاں، بی ۳۳ میدہ محلہ ضلع دربھنگہ (بہار)۔

شاعر کے تازہ شمارے میں (۱—۱۰) افسانات کے موضوع پر اچھی تخلیقات پڑھنے کو ملیں۔ پھر آپ تو اردو میں قلم کار کر سکتے ہیں۔ یہ سلگتا ہوا موضوع ہے۔ جو حقیقی شاعر احساس پر فرض رکھتا رہتا ہے۔ آئندہ بھی اس موضوع پر مخصوص حصہ شائع کرتے رہیئے۔ شاید آدمی کو آدمی ہونا آ جائے۔

شمس الرحمان فاروقی — ۱۹ ہاشنگٹن روڈ — نئی دہلی۔

شاعر بہت اچھا نکل رہا ہے۔ بس مضامین کا معیار ذرا بلند ہونا چاہیئے۔ بابری مسجد کے سانحے سے متعلق نظموں کا سلسلہ اچھا ہے۔

اندر پرتاپ نیر — ۵ / اے، بیر گھوڑا سنگھ مارگ، لدھیانہ۔

"لہو رنگ لہجے" کئی بار دھیرے دھیرے پڑھ چکا ہوں۔ اختر سعیدی نے بڑا دل خراش اور منفرد لہجہ پایا ہے۔ اکیلا نہ وہ بابری مسجد کے شہداء کے خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ قلم سے نہیں تیشے سے لکھا ہوا یہ ادبی شہ پارہ روح کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔

ستیہ پال آنند — POST BOX 85471 RIYADH

شاعر کا مشترکہ شمارہ "لہو رنگ لہجے" کے متعلق میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایودھیا کے افسوسناک سانحے اور بمبئی کے فسادات کے منظر و پس منظر پر جو منظومات شاعر نے شائع کی ہیں۔ وہ یادگار رہیں گی اور مدتوں لوگوں کے ذہن میں محفوظ رہیں گی۔

نامی انصاری — ۱۹۵/ ۱۱۱/ بی، نارووڈ، محسن گنج، کانپور — ۲۰۸۰۰۱

شاعر کے تازہ شمارے میں اکبر حمیدی (پاکستان) کا مضمون "جدید غزل میں جعلی سازیاں" پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ موصوف اردو شاعری کی مبادیات سے ہی واقف نہیں ہیں۔ شاعری حال و قال دونوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ کسی شاعری صرف اپنے معاملات و مسائل کو اپنے حال اور اپنی واردات کو اپنے ذاتی مزاج کے مطابق بیان کرنے کا ہی نام نہیں ہے۔ بلکہ اس میں وہ تمام حقیقی و غیر حقیقی، مادرائی اور غیر مادرائی، فطری اور غیر فطری افکار و مسائل بھی آ جاتے ہیں۔ جن سے شاعر کے ذہن کا کوئی گوشہ متاثر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ شاعری میں طرز ادا کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ شاعر ان افکار و خیالات کو بھی بعض اوقات دوبارہ نئے انداز میں پیش کرنے کی سعی کرتا ہے جن کو قدماء اپنے انداز میں پہلے ہی پیش کر چکے ہیں۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر لیجئے

تو اگر بھول گیا ہو تو پتہ بتلادوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

اسی مضمون کو جگر مرادآبادی نے نسبتاً زیادہ موثر اور دلنشین انداز میں پیش کیا ہے۔ جس کی وجہ سے جگر کا شعر غالب کے شعر سے یقیناً آگے نکل گیا ہے۔ جگر کا شعر ہے

کیا لطف کہ میں اپنا پتہ آپ بتاؤں
کیجیے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

دوسری بات "نقل" سے متعلق ہے۔ ولی سے جگر ولی اتنی امدادی تک کوئی ایسا غزل گو شاعر نہیں گزرا ہے۔ جس نے صرف اپنے ذاتی جذبات و محسوسات تک خود کو محدود رکھا ہو اور دنیا کے دیگر افکار و مسائل کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہوں۔ اردو شاعری کا معتد بہ حصہ دوسروں کے خیالات و تجربات کی بازیافت پر مشتمل ہے اور اس سے کسی شاعری کے وقار پر کوئی حرف نہیں آتا۔ پھر آپ مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی وغیرہ اصناف سخن کو کس خانے میں رکھیں گے۔ جن کی بنیاد ہی خارجی مسائل، تجربات اور واقعات پر قائم ہے۔ جدید غزل کا بہت بڑا حصہ جعلی یا نمبر دو نہیں ہے جیسا کہ اکبر حمیدی صاحب نے فرمایا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ترقی پسند غزل ہو، جدید غزل ہو، کلاسیکی غزل ہو، یا کوئی اور غزل ہو، ہر دور میں قابل ذکر شاعر معدود سے چند ہی ہوتے ہیں۔ مقلدوں کی بھیڑ زیادہ ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض شعراء اپنے دور میں مقبول و معروف بھی ہوتے ہیں۔ مگر آخر آخر تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ کے لئے گم ہو جاتے ہیں۔ زندہ وہی شاعر رہتے ہیں۔ جن کی تخلیقی توانائی درجہ اول کی ہوتی ہے۔ غالب کے دور میں جو مشہور شاعر تھے ان میں غالب، مومن اور ذوق ہی کی شاعرانہ وراثت ہم تک پہنچ سکی ہے۔ جب کہ اس دور میں صرف غالب کے شاگردوں کی تعداد ہی لگ بھگ دو سو کے قریب تھی اور ذوق کے شاگردوں کا تو شمار ہی اب تک نہیں کیا گیا۔ یہی حال لکھنؤ میں آتش و ناسخ کے دور کا ہے۔ تو غالب و ذوق اور آتش و ناسخ کے مقلدوں اور شاگردوں کی شاعری کو کیا جعلی یا نمبر دو کی شاعری کہنا مناسب ہوگا؟ اسی طرح جدید غزل میں قابل ذکر شاعروں کے نام درجن بھر سے آگے نہیں بڑھتے۔ مگر پورے ہندو پاک میں تگ و دو ایک بڑا شاعر جدید غزل کہنے کے دعوے دار ہیں۔ یہ سب شاعر جعلی ہیں نہ ان کی شاعری جعلی ہے۔ ہاں ان کی تخلیقی توانائی کے مختلف مدارج ہیں ——— اور مستقبل کی ادبی تاریخ صرف انہیں شاعروں کو یاد رکھے گی جن میں یہ توانائی زیادہ ہوگی۔ اکبر حمیدی صاحب کو اس سلسلے میں پریشان ہونے یا دوسروں پر الزام تراشی کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ موصوف نے یہ مضمون لکھ کر اپنا وقت بھی خراب کیا ہے اور دوسروں کا بھی۔

نریندر سنگھ سیتاپوری — ۱۰/ ۳ سیکٹر، بی جنڈی اکثل (ہریانہ)

نیا شمارہ شاعر کا ملا۔ حسب معمول خوشی ہوئی۔ پڑھ کر حیرانی بھی ہوئی کہ آپ نے ادبی دنیا میں سیاسی رنگ بھرنے کی ضرورت تھی۔ ۶ دسمبر کو ہندوستان میں جمہوریت کے نام پر آمریت نے انسانیت کی موت ہوتی دیکھی۔ جب لوگوں کے دلوں میں بھگوان اور اللہ کی شکل مندروں اور مسجدوں میں دکھائی دینے لگ گئی تو کیا فرق پڑے گا انہیں مسمار کرنے سے

کر دی مسمار دیا مصر کی مسجدوں اور مندروں کو گویوں کہ جب انسانیت مر گئی ہے تو لاشوں میں کیا رہ گیا ہے۔ جنگلوں اور اقدار مصر بھی سلامت نہیں رہے۔ میری گزارش ہے کہ ادب کو سیاست سے دور رکھئے گا۔ مجھے مشرف کی کہانی "مو تری" پسند آئی۔ اس میں ایک مو تری کا ذکر ہے۔ جس میں کسی نے لکھا تھا ہندوستان کی ماں کی ——— دوسرے دن کسی نے لکھ دیا پاکستان کی ماں کی ——— اور تیسرے دن (ان حضرت کا احترام میرے دل میں ابھی تک ہے) ایک حضرت نے لکھ دیا دونوں کی ماں کی ——— مسجد کو نہ تو ہندوؤں نے مسمار کیا اور نہ مندروں کو مسلمانوں نے۔ دونوں مذہبوں میں شیطان تھے۔ جنہیں ہندو اور مسلمان کہلانے میں شرم آنی چاہئے۔ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد جو ۳۰۰۰ سکھ مرے وہ ہندوؤں نے کیا مارے ہیں۔ نہیں مگر شیطانوں نے اور سیاسی چالوں نے۔ ادب کو دور رکھئے گا آپ نے جمہوریت کے نام پر آمریت کر ڈالی ہے۔ ہم سب کو آمریت چاہئے انسانیت کے نام پر۔ ہو سکے تو رشید امجد کی کہانیوں کو ایک ایک کر کے پھر سے شائع کرنے کی کوشش کیجئے۔ جو انہوں نے "ہم وحشی ہیں" کے نام کے مجموعے میں لکھی ہیں۔

عشرت ظفر ——— ۸۸/۲۸۸ گلشن اقبال کانپور ۲۰۸۰۰۱

شاعر کے دو شمارے اور دونوں افسانہ نمبر، دیدہ زیب ہوں کیا خوبصورت نقوش ہیں۔ جو سلسلہ ادب بہ غیر قابلیت کا اطلاق ہیں۔ مختوروں نے سکتے ہوئے لمحوں کے لہولہان لفظوں کو جس طرح الفاظ کے لمحے تالوں میں سمیٹا ہے۔ اس سے شاعر کے وقار میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ آپ کو منفرد اور لکھنے والوں کا تعاون حاصل ہے۔ گویا آپ اس میراث کا تحفظ کرنے میں پھر سے ثابت ہوئے جو آپ کے اسلاف کی روایت نے بے مثال ہے۔ صد تحسین و صد آفریں۔ دونوں شماروں کے مشمولات سے جی خوش ہوا۔ مگر حیدر قریشی کی کہانی "۷۵ سال بعد" "سب سے اچھی کہانی ہے۔ دراصل فکشن نگاروں کو لازم ہے کہ اساطیر کے حوالے سے ہی ادب تخلیق کریں۔ کیوں کہ ادب کے بقا پانے کی ایک مسافت بے کراں ہے۔ جس میں ہم سب سانس لے رہے ہیں۔ تو۔ ہم ادبیات کے وسیع تر افق پر جلوہ رو شنیوں کا ہجوم ہے۔ نئی نسل کو اس سے اکتساب کرنا چاہئے۔ یہی ایک صورت ہے غیر فانی اور حسیت آمیز عصری ادب تخلیق کرنے کی، دیگر افسانہ نگاروں میں رشید امجد اور اختر یوسف اہم ہیں۔ منظومات تقریباً سبھی عصری کرب کو نمایاں کرتی ہیں آپ قابل مبارکباد ہیں۔

بدر عالم خلش ——— نمبر ۲، بلاک ۳، شاستری نگر، کدم کنواں، پٹنہ بہار (بھارت)

شمارہ ۸۰ میں A.RUSSELL کا مضمون ساختیات کی ایک متوازن، مدلل اور بہت معقول تعبیر پیش کرتا ہے۔ اردو میں ساختیات کو جس طرح پیش کیا گیا ہے۔ اس سے یہی غلط فہمی عام ہوئی ہے کہ ساختیاتی تنقید کو صرف مجرد تحلیل سے سروکار رکھنا چاہئے اور فن پارے کے ماخذ پر وہ کار فرما نفسیاتی، سماجی اور تہذیبی جیسے دیگر عوامل کو اسے نظر انداز کر دینا چاہئے۔ کرامت علی کرامت نے مذکورہ مضمون کا ترجمہ کر کے ایک تحسین کام انجام دیا ہے۔ ردِ تنقی کرے ہمارا مضمون گو کہ اپنے عنوان کی وجہ سے متاثر ضرور کرتا ہے۔ لیکن حمد گرامی کی معروضات بہت متعلق ہیں۔ اصلی بات تو یہ کہ ترقی پسندی ایک مخصوص سماجی نظریئے کے گرد گھومنے اور گھمانے والی ادبی تحریک کا نام تھا جو آج تک اپنی موضوعاتی تحفظات کی وجہ سے جانی پہچانی رہی ہے۔ لیکن رد تنقی کرے ہم "ترقی پسندی" کا اطلاق ایک مخصوص عہد کے افسانوی ادب کے اسلوب پر کر رہے ہیں جب کہ وہ "ترقی پسندی" کو REDEFINE کر رہے ہیں تو کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کی یہ خود ساختہ اسلوبیاتی تعریف اس "مشترکہ" سے کہاں تک مطابقت رکھتی ہے جو کسی زمانے میں مختلف ترقی پسند مصنفین کے سلسلۂ مقصد پر کوئی نئے کا ثمرہ تھا۔ رد تنقی کرے ہم کا فارمولا ہے کہانی + کہانی پن = ترقی پسند کہانی، جبکہ ایسا نہیں ہے کیوں کہ کہانی پن جسے وہ کہہ رہے ہیں وہ تو ترقی پسندوں کے عہد سے پہلے کے افسانوں میں بھی موجود ہے اور ترقی پسندوں کے ان ہم عصروں کے افسانوں میں بھی جن کو ترقی پسند تحریک سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اسی طرح کہانی ——— کہانی پن = تجریدی، علامتی کہانی کا ایک عمومی فارمولا بنا کر جدیدیوں کے بارے افسانوی ادب کو لا معنی قرار دینے کی کوشش بھی ایک طرح کی انتہا پسندی ہوگی۔ کیا علامت کے بطن میں کہانی پن کا عمل ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ کیا سریندر پرکاش، انیس مسعود، بلراج مین را، احمد ہمیش اور سلام بن رزاق کا کم سے کم ایک ایک افسانہ بھی ایسا نہیں ہے READIBLE ہو۔ دیکھئے آپ مجھے ہرگز غلط مت سمجھئے گا۔ ترقی پسند تحریک کا فکشن میں اور دیگر اصناف ادب میں جو رول رہا ہے میں نہ تو اس سے نابلد ہوں اور نہ اس کا منکر ہوں۔ اور نہ جدیدیوں کی بے راہ روی ہی میرا مقصد ہے۔ اس سلسلے میں میری اپنی سوچ ہے کہ دونوں ہی تحریکیں ادبی فاشزم کا شکار رہی ہیں (ورنہ کیا وجہ ہے کہ شاعر کے افسانہ نمبر میں قمر احسن کو "با استثنائے چند" اور حسین الحق کو بغیر کسی استثنا کے کوئی بھی پسند نہیں آیا؟) اور اس فاشزم کے منفی اثرات ابھی تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑنے والے ہیں۔ اگر یہ عہد ہمارے فکشن کے فروغ کے لئے تلافی مافات کا عہد ہے۔ تو پھر اردو فکشن کی تنقید کو نہ صرف ترقی پسندی اور جدیدیت بلکہ ہر قسم کی شدیدیت اور افراط و تفریط سے گریز لازمی ہے ورنہ پھر کسی دوسری وبا (بعض نہیں تو AIDS) کا امکان ٹالا نہیں جا سکتا۔ سرشار بلند شہری کی تخلیقات میں سادگی و پرکاری کا امتزاج میرے لئے قابل رشک ہے۔ نظموں میں فرحت قادری، مدحت الاختر، شمیم انجم وارثی اور حیدر ریاض الدین نے متوجہ کیا۔ غزلیں تعداد میں زیادہ ہیں۔ پھر بھی کچھ غزلیں اچھی ہیں۔ خاص طور سے عطیہ قاسمی، ظفر گورکھپوری، منظر اعجاز اور نفیس ظفیر الحسن کی غزلیں پسند آئیں۔ شمارہ ۸۰ میں اور بھی کچھ کے تحت جس سلسلے اور ساختیاتی و معنیاتی اور اسکے دور کے نوعیں ہو سکے تو منظوم مکتوب لکھیں جو ادب کا معجز ہے اور لفظ بہ لفظوں کو تحریک دی، کیا نظم اور کیا غزل ہر صنف میں تخلیقات سے روشنی ملی۔

خوب خوب متاثر کیا اور جس بے باکی اور جرأت مندی سے آپ نے شمارہ مرتب کیا ہے آپ اس میں پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔ تمام تحریریں کہنے کے معقول، میں موضوع کی انفرادیت اور کردار نگاری کی مہارت کی بدولت کامیاب نظر آتی ہیں۔ رشید امجد کا افسانہ اپنے اسلوب کی ہنرمندی اور بیانیہ کا جو تقاضا ہے کہ معنی دو چہرے میں تہہ داری کے نئے نقش ابھارنے اور سنوارنے کی ہنرمندی کے لئے قابل تحسین ہے۔ "شوق بند من کی موجیں" کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ افسانے میں کم سے کم حسی حوالوں سے کام لیا گیا ہے۔ (زیادہ سے زیادہ بصری تمثالوں ہی کا استعمال کیا گیا ہے) اور افسانے کو نام اور دیگر زمانی و مکانی قیدوں سے محروم کیا گیا ہے۔ میرا مطلب ہے افسانے کا کردار جو فکشن نہایت ہی GENERALISED ہو کر قاری کے سامنے آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود افسانے کی پوری فضا قاری کو کسی بھی طرح نامانوس اور طلسماتی نہیں لگتی۔

ذکاء الدین شایان ——— بکریا محلہ بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲

"لہو رنگ لمحے" کے عنوان سے آپ نے جن شعراء کے کلام کو شائع فرمایا ہے۔ ان میں مجھے "ادب" کی سنجیدہ گہرائی کے بجائے "صحافت" کے غصہ زدہ لہجے کا اثر غالب نظر آیا۔ جو بہر حال ادب، شعر کی متوازن اور ٹھہری ہوئی فکر سے محروم تمام وقتی حالات کے تحت مشتعل منظر کے محسوسات تھے جو نفرت کے نقطے سناتے ہیں۔ اور پھر آپ نے ان لمحوں کو "لہو رنگ لمحے" کا عنوان دیا ہے۔ یہ تو غیض و غضب کے لمحے ہیں۔ جو علی گڑھ بالکل یک طرفہ ہیں۔ ندا فاضلی اور گلزار کے یہاں لکھ لہو کم ہے۔ یعقوب راہی تو آخر میں جیسے بالکل شخصی غصہ کا اظہار کر رہے ہیں۔ حنیف اخگر ملیح آبادی، منظور ہاشمی، نظام الدین نظام کے یہاں بھی یہی عالم ہے۔ ریاض لطیف کا عنوان "خدا کی انتہا" بہت نامناسب ہے اور ان کی نظم بھی اسی طرح ہے۔ شکیل اعظمی کو چاہئے کہ غزل کہتے وقت "نماز میں پڑھنے" اور "صفیں بچھانے" کے اہتمام سے گریز کریں۔ یہ شاعری نہیں، بہتر ہے وہ تبلیغ و اصلاح کا براہ راست کام انجام دیں۔ "بمبئی" کے حوالے سے ساحر، ساغر، ساجد حسن، جمیل مرصع پوری، عبد اللہ کمال، جاوید ناصر، نسیم طارق، عبد الاحد ساز، مستحسن عزم، ماشق ہرگانوی، اسلم اور پوری، چودھری ابن النصیر، تاجدار عادل اور خود آپ نے جو نظمیں شائع فرمائی ہیں۔ وہ بھی "ادب" کی بجائے زیادہ "صحافت" سے وابستہ ہیں۔ افسانے بہت کم متاثر کرتے ہیں۔ حیدر قریشی، معین الدین عثمانی کے افسانے متاثر کرتے ہیں۔ سہیل وحید کا افسانہ اس شمارے کا سب سے کامیاب افسانہ ہے۔

انور مومن ——— کیف منزل، ساہا پول، نئی محل، اتر سی

"لہو رنگ لمحے" کا عنوان بھی خوب ہے۔ اور ندا کی نظم "میں زندگی ہوں"، گلزار کی نظم اور ریاض لطیف کی نظم "خدا کی انتہا" خوب ہیں۔ دلیپ سنگھ کا "لہو بازار سے لے آئے" بھی قابل داد ہے۔ عبد اللہ کمال کی "فردوس شہر رمدان" اور ظفر گورکھپوری کے دوہوں نے متاثر کیا مگر میں اس جانبداری سے افسوس کرتا ہوں کہ ان حالات میں شاعر آپ کی زیادہ توجہ کا طالب ہے۔ ★★

7.3.95

MAHARASHTRA HERALDS A NEW ERA OF INDUSTRIAL DEVELOPMENT

INDUSTRIAL POLICY - 1993

* PURCHASE OF LAND FOR INDUSTRIAL USE MADE EASY
* LIBERAL FISCAL INCENTIVES
* COMMITMENT TO INFRASTRUCTURE
* SPECIAL INPUTS FOR SSI SECTOR
* IMPETUS TO AGRO-PROCESSING, SOFTWARE ETC.
* EXPORT ORIENTATION
* STRATEGIC THRUST ON COMPETITIVENESS ....

HARNESSING LIBERALISED ECONOMY FOR PROGRESS AND PROSPERITY

فکر امروز



…. جس شعر کے سننے سے طبیعت میں اتنا غلط کشا د پیدا ہو کہ سامع کو بے اختیار ہنسی آجائے وہ غزل کا شعر نہیں ریختی کا کوئی ٹکڑا ہو سکتا ہے۔ شعر وہ ہے جو سماعت میں کیف اور دل میں اہتزاز پیدا کر دے۔ شعر وہ ہے جس کے سمجھنے کے بعد روح میں ایک روشنی اور معلومات میں اضافہ محسوس ہو۔ شعر وہ ہے جو باوجود کوشش جاہل یا کم علم موزوں طبع شخص نہ کہہ سکے۔ اور شعر وہ ہے جو زبان سے زیادہ کاغذ پر موثر ثابت ہو۔

[۲ر دسمبر ۱۹۳۵ء]

— سیماب اکبرآبادی —

۱۸/۸/۹۳

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰

بیادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۴ واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر

جلد —— ۶۴
شمارہ —— ۲

فون: ۳۵۹۹۰۳

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاون

ناظر نعمان صدیقی

قیمت — روپے

زر سالانہ ۶۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۷۵ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

ماہنامہ شاعر مکتبہ قصر الادب بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی

ترتیب

مقالات

نئی نفسیات نئی شعری کائنات

نظمیں

غزلیں

کہانیاں

ناول

آثار لفظ لفظ

جرعات

مکتوبات

شمارہ نمبر - ۲ [۱۹۹۴ء] جلد - ۶۴



نئی نفسیات۔ نئی شعری کائنات

نیا تخلیقی ذہن ہر طرح کے اصرار کی نفی پر آمادہ ہے۔ وہ آدمی کے ادھورے پن کو مکمل کرنے کی شدید خواہش تو رکھتا ہے، مگر اپنے ادھورے پن سے نئے جہاں آباد کا خوگر بھی ہے۔

بہت ساری سچائیوں کے باوجود فکری سطح پر آدمی جیسے بکھر سا گیا ہے، مذاہبِ عالم اور مکمل تاریخی شعور کے باوجود۔

نئی نفسیات۔ نئی شعری کائنات، ان تخلیق کاروں پر مشتمل ہے جو عصری ذہنی گونج کا حصہ ہیں۔ ان میں سے کئی نام ۲۱ ویں صدی کے اجتماعی لاشعور میں نفوذ کے امکانات رکھتے ہیں۔ وہ ایک نئے انقلاب کا آہنگ بنیں گے۔ نئے قلم روں میں وہ نام بھی ہیں۔ جو شاعری کے مخصوص مطالعے کے ناسٹیلجک ذہنوں پر دستک دیں گے۔ اگر وہ سنجیدہ ہیں تو۔ اپنے حصار سے باہر نئے منظر ناموں کو دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ اگر وہ صرف اپنی آنگن پر ٹھہری ہوئی دنیا ہی کو سب کچھ نہ سمجھ رہے ہوں۔ خوش فہمیوں کے قہقہے اچھے تو لگتے ہیں، مرعوب بھی کرتے ہیں اور متاثر بھی۔ مگر ان قہقہوں کی اثر پذیری کا اختتام مبارک نہیں ہوتا۔

اس پیش کش پر کوئی تبصرہ مقصود نہیں۔ تمام تشریحات و توجیہات فن کار اور فن پارے سے مکالمہ کرنے میں حائل ہوتی ہیں۔ اور پھر فن کار بھی کہاں رہ جاتا ہے۔ فن پارہ اور قاری۔ فن پارہ اور سامع فن پارہ اور وقت۔ مگر یہ سچے اور کھرے رشتے سماجی منصب داریوں اور وسیلوں نے تقریباً ختم کر دیئے ہیں۔ کچھ بڑے نام یا کوئی ادبی گروہ یا حلقوں میں بٹے ہوئے ادبی رسائل۔ اپنے اپنے منتخب ناموں کی گردان میں اتنے محو ہو گئے ہیں کہ آس پاس کی سچائیاں پس منظر ہوتی جا رہی ہیں۔

شاعر ایسی ہی سچائیوں کا نقیب ہے۔ آفاق مزاج نئے نئے جہانوں کو خلق کرنے والا۔ نت نئی کہکشاؤں کو سجانے والا۔ تلاش و جستجو کا یہ عمل مسلسل جاری ہے۔

آپ کو یہ شمارہ کیسا لگا۔

CALCUTTA OFFICE
1 WATERLOO STREET
P O BOX 2081

BOMBAY OFFICE
YUSUF BUILDING
CHURCHGATE ST
FORT

TELEGRAMS "RIYASAT"   TELEPHONE NO 5277

The Riyasat

DIWAN SINGH MAFTOON

DELHI
INDIA

Dec 31st 1938

سردار دیوان سنگھ مفتوں بنام سیماب اکبرآبادی

مکرمی سیماب صاحب

سنا ہے کہ آپ کے اور جوش صاحب کے تعلقات خوشگوار نہیں ہیں۔ اس سلسلہ میں اگر میں آپ دونوں کی خدمت کر سکوں تو حاضر ہوں۔ ساغر صاحب سے بھی میں نے یہی کہا تھا۔

آپ دہلی کب آ رہے ہیں

مخلص

دیوان سنگھ

سیماب [پ: ۱۸۸۰ء] اور جوش [پ: ۱۸۹۶ء] کے درمیان ساغر نظامی [پ: ۱۹۰۵ء، تلمیذ سیماب] اختلافات کا سبب بن گئے تھے۔ اس کی بہت ساری وجوہ میں سے ایک جوش صاحب کا مخصوص مزاج بھی تھا۔ اس کی جھلکیاں "جوش بنام ساغر" مرتبہ خلیق انجم [۱۹۹۱ء] کے خطوط میں موجود ہیں۔ سردار دیوان سنگھ مفتوں شخصی تنازعات کے ماہر تھے اور اپنے اخبار ریاست کو اسی مقصد کے لئے استعمال بھی کرتے تھے۔ اخبار ریاست ہی کے ایک شمارے [۱۹۵۶ء] میں ساغر نظامی کے خلاف جوش ملیح آبادی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ سیماب، ساغر، جوش تنازعے کا پس منظر اور پیش منظر کسی موقع سے شائع کیا جائے گا۔ [ادارہ]



ذکاء الدین شایان

نزد اولڈ پوسٹ آفس، پکڑیا، پیلی بھیت ۔ ۱ (یوپی)

عصری افسانے کی بکھری ہوئی پتیاں

نئے ہوتے دوشت پر

میں کیا؟ ۔ اور میری تنقید کی بساط کیا۔ ؟ ہاں کچھ دنوں پہلے شمس الرحمن فاروقی نے ساتویں دہائی کے بعد نمایاں ہونے والے نئے افسانہ نگاروں سے اپنے کسی مقالے کے آخر میں یہ سوال ضرور کیا تھا۔ "آخر یہ لوگ اپنے افسانہ کو "شاعری" کیوں بناتے جا رہے ہیں" فاروقی کا یہ جملہ افسانے کے جدید مسائل کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے کا بلیغ اشارہ ہے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ داستانی ماحول کی خیالی اور واقعی قدروں کی کشاکش کے بعد جو افسانہ ماضی کے ادبی اوراق پر ابھرا، اس کا ابتدائی شدید رجحان ادبِ لطیف کی تخیلی پستی ہی کا اسیر معلوم ہوتا ہے جس میں براہِ راست "کہانی" کے عنصر کا فقدان تھا اور شخصی احساسات کی جذباتی اور لسانی مینا کاری زیادہ تھی۔ لیکن ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں اردو افسانے کو پریم چند مل گئے اور پھر افسانے نے اپنے حقیقی سفر کو پہچان لیا۔ اس تحریک کی قیادت اور رسافت میں طے ہوتا ہوا اردو افسانہ "قصہ" کے فن کو کہیں مجروح نہیں کرتا بلکہ اس کو تخیلی بھول بھلیوں سے آزاد کرکے اپنے زمانے کے گوناں گوں اور پیچیدہ مسائل کی ہمہ رنگ جہات سے جوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں کردار، ماحول، واقعات زبان، مکالمہ بیانیہ کے ساتھ علامتی انداز سے کبھی منحرف نہیں ہوتے۔ ہمارے نقاد جب پریم چند کا ذکر کرتے ہیں، تو یہ ترشح ہوتا ہے جیسے "کفن" کے علاوہ ان کا کوئی افسانہ بہت زیادہ قابلِ ذکر نہیں ہے۔ میں یہاں مثال کے طور پر ان کے صرف دو افسانے "گلی ڈنڈا" اور "روشنی" کی یاد دلانا چاہتا ہوں۔ جن میں کہانی کے باوجود "کہانی" غائب ہے اور ایک کرداری دائرے میں افسانہ نگار کے مرکزی احساسات نے اپنے عہد کے متاثر اور مظاہر کو پوری طرح سمیٹ لیا ہے۔ ہندوستان کی اپنی روایات ہماری مغربی نمائش پسندی کے سہارے ہمیں کہاں لئے جا رہی ہیں۔ ان افسانوں میں اس کی کامیاب عکاسی ہے۔

ہمیں ایک بار پھر غور کرنا چاہیئے کہ ترقی پسندی کے زمانے میں اردو افسانے کی زمین، جو مجموعی حیثیت سے کہانی اور اس کے ماحولیاتی اور کرداری و زمانی بنیادوں پر استوار نظر آتی ہے، وہ افسانوی رسمیات کی کہانی بیان کرنے سے مختلف کیوں ہے؟ اور اس نے اپنے اوقتی مسائل کو کہاں تک شریک فن کیا ہے؟ ۔۔۔ ترقی پسند تحریک کے فنی تقاضے شاید افسانے کی مخصوص صنف ہی کے منتظر تھے، جنہوں نے "شاعری" کے جمالیاتی، علامتی اور ابہام آمیز افاقیت کے حدود سے باہر آتے ہوتے زندگی کو اپنے مکمل سیاق و سباق سے مربوط کرنا چاہا ۔۔۔ اور اس میں کامیابی حاصل کی۔

ساتویں دہائی کے بعد جب ترقی پسند افسانہ نگاری اپنے ارتقائی کمالات کا مظاہرہ کر چکی، تو نئے افسانے کے گراف کا دائرہ اٹھنے کا کوئی راستہ نہ ملا۔ اس کے مبلغین نے مجبوراً شاعری کو افسانے کا اہم مرکزی جزو بنانے کا تہیہ کر لیا۔ کیوں کہ اس سے پہلے انشائے لطیف کے نثری کارنامے اپنا فریضہ انجام دے چکے تھے۔ جن میں یک کرداری تخیلی آمیزی کے شخصی شاعرانہ اسالیب کی بہت گنجائش تھی۔ اور کہانی کی بے ترتیبی بھی اٹل تھی۔ چنانچہ یہ مقولہ وضع کیا گیا کہ افسانے کے جدید اسلوب و فن میں کہانی کا وجود غیر ضروری ہے ۔۔۔ بس پھر کیا تھا ہمارے نئے افسانہ نگاروں نے قلم اٹھایا اور افسانوں کے نام پر شاعری اور ذاتی احساسات کے تمام منتشر مواد کو نثر کے اوراق پر بکھیر دیا اور

ہر اس افسانے کو بُرا کہنے لگے جو کسی "کہانی" سے وابستہ تھا۔ افسانوی تخلیق کے نئے رہنماؤں نے یہ نہ سوچا کہ افسانہ کسی وقت بھی "کہانی" سے جدا رہ کر اپنا صنفی کردار نہیں ظاہر کر سکتا۔ دراصل شاعری سے الگ جب ہم افسانے کی شناخت متعین کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو کہانی کسی منظر نامے کے لباس میں فرد در موجود ہوتی ہے اب افسانے کے اندر تخلیق کردہ واقعات، سانحات کردار، ماحول اور زندگی کے تصورات زبان و فوبے کے آہنگ میں زبان و مکاں کی پابندی کے باوجود اس سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اس وقت افسانے سے "کہانی" منہا ہو جاتی ہے۔ جو محض آزاد روایتی افسانے ایسا نہیں کر سکتے وہ صرف زبان و مکاں کی قید میں وقتی اور واقعاتی روئیداد سے ہر سطح پر کہانی ہی کا حلقہ رہ جاتے ہیں۔ "افسانہ" نہیں ہو سکتے۔

گذشتہ دو تین دہائیوں کے نمائندہ نئے افسانوں کا یہ مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ اردو افسانہ نگاروں نے موجودہ زمانے کی حقیقی عکاسی کے ساتھ ماضی بعید کے داستانی، تاریخی اور اساطیری کردار و حالات کو اپنے افسانوی تخیل کے منظر نامے کا اہم عنصر بنا لیا ہے۔ ہماری داستانوں میں مافوق الفطرت خیالی کردار اور واقعات حاوی ہیں۔ نئے افسانہ نگاروں کے یہاں اس کی تخیل کے وافر نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ حال کی سرگرمیوں کی زد پر ماضی کی یہ پرچھائیاں اتنی گہری کیوں ہوتی جا رہی ہیں؟ اس کا سبب اگر تلاش کیا جائے تو یہی اندازہ ہوگا کہ عصری سطح پر رونما ہونے والا کوئی بھی واقعہ اب نئے افسانہ نگار کے لئے اس وقت تک زندہ اور دائمی نہیں ہے جب تک کہ تمثیلی اور تلمیحی دائرے میں اس کے رشتوں کا سراغ ماضی سے کسی نہ کسی صورت میں منسلک نہ ہو ــــ حالیہ قحط مائی زمین پر افسانوی کرداروں کی پس منظری فکر ہمیں افسانوں اور ڈراموں کے اُس بڑے حصے کو ذہن میں تازہ کرتی ہے جن میں کرداری خود کلامی اور ماضی کے واقعات حادثات کا ذہنی تجزیہ اور اعادہ جھلکتا ہے آگے چل کر یہی رجحان جدید طرز میں "شعور کی رَو" بن گیا ہے۔ موجودہ زندگی کے اعمال کو جب افسانہ نگار چھونے میں منہمک ہوتا اور اس سے متعلق مسائل سر اٹھانے لگتے ہیں تو وہ فکری رُخ پر صدیوں کی دھند میں غائب شدہ داستانی دنیا کی طرف اتنی شدت سے کیوں جھک جاتا ہے اور اس کی پرچھائیوں کو از سر نو زندہ اور متحرک کرنے کی سعی میں نیا افسانہ نگار حال کے واقعاتی منظر نامے کو پیچ کر داستانی تلمیحی اور تمثیلی کردار اور مناظر کی تصویر کشی پر اتنا متوجہ کیوں ہو جاتا ہے؟ نئے افسانے کے اس طریق پر ناقدین کی نظر ہونا چاہیئے۔

اسی مقام سے افسانے کی جدید زبان کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے جب موجودہ واقعاتی حقائق کی موجودگی کے باوجود بہالاً نیا افسانہ نگار داستانی ماحول کی گم کردہ زندگی میں نئی زندگی کے تقاضوں کا مداوا ڈھونڈنے لگتا ہے اور دونوں کے آمیزے سے انسانیت کی کارگزاری کا جائزہ لیتا ہے تو اُسے مجبوراً ایسے آہنگ اور اسلوب کی ضرورت لاحق ہوتی ہے جو اس کے احساسات کو مصور کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے افسانوں میں شاعری اور استعاراتی اور تاریخی تمثیل نگاری کے اثرات ناگزیر ہو جاتے ہیں۔

نئے افسانے میں موضوعات کی نوعیت کیا ہے؟ اس نقطۂ نظر سے جدید افسانوں کو پرکھا جائے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان میں زندگی کے سیاسی سماجی اور مذہبی ہر قسم کے بظاہر اونچی آواز کے اصلاحی اعلانات کے اندر در پردہ اس کے تصنع اور کھوکھلے پن پر نئے افسانہ نگار کی پوری نظر اور گرفت موجود ہے۔ وہ زندگی کی وجودیت اور اس کی معنویت اور بے معنویت کے لامتناہی سلسلوں کی گردشوں میں انسانی ذات کی کرب آمیز جھوٹی مسرتوں کی بھاگتی ہوئی پرچھائیوں کا تماشا دیکھنے میں نہ صرف غرق ہے بلکہ وہ سامنے کی جیتی جاگتی زندگی کے تمام اعمال کو شکوک سا سمجھ رہا ہے اور وہ تنازعِ بقا کے درمیان کائنات کے مظاہر کی بدلتی ہوئی صورتوں کے حصار میں انسان کی تمام زمینی طاقتوں کے باوجود ماورائی قوتوں کے ٹکراؤ اور تسخیر فطرت کے نام پر خود انسان کی ہر قدم پسپائی کے نظاروں کا گواہ بنا ہوا دیومالائی دنیا ہی کو اپنے ذہنی سفر کا رہنما تسلیم کرنے پر مجبور معلوم ہوتا ہے۔ آج موضوعات کے اعتبار سے اُردو کے نئے افسانہ نگاروں کا یہی ذہنی رویّہ اور منظر نامہ ہے، چنانچہ انہی احساسات کے تحت جدید افسانے کی زبان منقلب ہوتی جا رہی ہے۔ پاکستان کے مقابل ہندوستان میں نیا اردو افسانہ اپنی حقیقی "زمین" اور "زبان" سے پچھلی دو دہائیوں کے اندر جتنا مختلف ہوا ہے۔ پاکستانی نیا افسانہ اس تناسب سے نہیں بدلا ہے۔ اس میں وہاں کے کردار، ماحول، زمینی خوشبو اور کرداری اور لسانی اظہارات کہانی پن کے ساتھ مربوط ہیں۔ ہندوستان کے نئے افسانہ نگاروں کے یہاں جو مصنف کی ذاتی فکر اور اُس کے شاعرانہ اسلوبیاتی رویّوں کے پابند افسانے دیگر تمام کردار اور اعمال میں تاثر زدہ محسوس ہوتے ہیں۔

[باقی صفحہ ۱۸ پر دیکھیے]

منیر مسعود

تُدبہ

۲

میرے سامنے ایک بچے کا سوجا ہوا چہرہ تھا اس کے پپوٹے بہت زیادہ پھول گئے تھے ایک پپوٹے کے نیچے ہلکی سی درز تھی جس میں سے وہ مجھ کو دیکھ رہا تھا۔ دوسرا پپوٹا بالکل بند تھا لیکن اس پر چونا یا اور کوئی سفیدی پھیر کر بیچ میں کاجل یا کسی اور سیاہی کا بڑا سا دیدہ بنا دیا گیا تھا جس کی وجہ سے اس ابھرے ہوئے پپوٹے پر ایسی آنکھ کا دھوکا ہو جاتا تھا جو حیرت سے پھٹی پھٹی رہ گئی ہو۔ میں نے اس حیران آنکھ پر سے نظریں ہٹا لیں اور جھک کر دوسری آنکھ کی درز میں جھانکا۔ الجھی ہوئی پلکوں کے پیچھے چھپی ہوئی نگاہ میں اذیت بھی تھی۔ لجاجت بھی تھی اور اکتاہٹ بھی۔ میں نے اس کے چہرے کو ذرا اور قریب سے دیکھنے کی کوشش کی۔ تو گاڑی میں ٹھنسے ہوئے گودڑ میں لہریں سی پڑنے لگیں۔ سوار نے ہلکے جھٹکے سے اپنا چہرہ پیچھے کر لیا اس کے ہونٹ سکڑے اور دانت باہر نکل آئے۔ مجھے اپنی پشت پر دکانداروں کی ہنسی کی آوازیں سنائی دیں۔ دور سے سوار شاید ہنستا ہوا دکھائی دیتا تھا لیکن مجھ کو وہ کسی بیمار کتے کی طرح نظر آیا۔ جس کی طرف شریر لڑکے بڑھ رہے ہوں۔

اچانک ہنسی کی آواز بازار والوں کی بھنبھناہٹ اور برادری والوں کی تیز آوازوں میں دب گئی۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ آپس میں الجھ پڑے ہیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دونوں گروہ ایک ساتھ مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے لیکن میری سمجھ میں کسی کی کوئی بات نہیں آئی۔ اسی وقت عورت نے میرا ہاتھ دبوچ لیا اور میں اس کی طرف گھوم گیا اس نے اپنا دوسرا ہاتھ گودڑ میں ڈالا اور اِدھر اُدھر ٹٹول کر سوار کا ایک ہاتھ کہنی تک باہر نکال لیا۔ میرے سامنے تین ہاتھ تھے۔ میرا اپنا جانا پہچانا ہاتھ، اس کی انگلیوں میں انگلیاں الجھائے ہوئے عورت کا پسیجا ہوا نرم مگر مضبوط ہاتھ اور ہم دونوں کی ہتھیلیوں کے درمیان سوار کا چھوٹا سا سوکھا ہوا ہاتھ جس کی کلائی سے کہنی تک رنگ برنگے ڈورے لپٹے ہوئے تھے۔ اور ان کے بیچ بیچ سے جھانکتی ہوئی مردہ کھال میں جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ عورت کی انگلیاں میری انگلیوں میں لپٹ کر دل کی طرح دھڑکیں۔ مجھے ہلکی سی جھرجھری آئی۔ اور سوار نے منہ سے ایک آواز نکالی اس بیمار کتے کی طرح جس کی طرف شریر لڑکے بڑھ رہے ہوں۔

ایک دکان والے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میں اُدھر مڑ گیا۔

"گاڑی ہٹوا دیجئے،" وہ کہہ رہا تھا، "دکان داری خراب ہو رہی ہے۔ سویرے سویرے یہ لوگ . . . . ."

میں برادری والوں کی جانب مڑا اب وہ سب خاموشی سے مجھ کو تک رہے تھے میں نے انہیں سیدھی سڑک پر شمال کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا جوان کی سمجھ میں فوراً آگیا۔ گاڑی کو سہارا دینے والے دونوں آدمیوں نے اسے آسانی سے گھما دیا۔ عورت نے میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور سوار کا ہاتھ گودڑ کے اندر کر کے اس کے سر کو سہارا دینا شروع کیا اور گاڑی ہلکی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ آگے بڑھی اس کے پیچھے اپنی اپنی میلی کچیلی پوٹلیاں سنبھالے اور ہاتھوں میں لمبی لمبی لاٹھیاں تھامے۔ ایک قطار میں برادری والے چل رہے تھے اور سڑک کے دونوں طرف دکان دار اور محلے کے دوسرے لوگ جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ خاموش کھڑے تھے۔ میں گاڑی کے آگے آگے تیزی سے چلتا اور دکانوں کے سلسلے کو پیچھے چھوڑتا ہوا پکی سڑک کے مغربی موڑ پر پہنچ کر رکا۔ میں نے مڑ کر ان لوگوں کو اس موڑ پر آ کے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتے رہے۔ ان کے آس پاس گرد اڑ رہی تھی، اور اب مجھے سب کچھ ایک ساتھ نظر آیا۔ ان میں ہر فرد اور ہر شے کہنہ اور بوسیدہ اور عنقریب بکھر جانے والی معلوم ہو رہی تھی، پھر بھی میں نے سوچا، اگر سب کچھ اتنا غبار آلود نہ ہوتا اور اگر گاڑی کے نیچے لٹکتا ہوا پتھر کچھ سڈول ہوتا تو اس جلوس پر کسی شاہی سواری کا گمان ہو سکتا تھا۔

وہ میرے قریب آ کر رک گئے میں نے ان کے پیچھے کچھ دور پر بازار والوں کو اپنی اپنی دکانوں کی طرف جاتے اور تماشائیوں کی قطاروں کو منتشر ہوتے دیکھا پھر میں برادری والوں کی طرف متوجہ ہوا اور انہوں

نے سمجھ لیا کہ اب میں اطمینان کے ساتھ ان کی بات سن سکتا ہوں۔ انہوں نے بھی اطمینان کے ساتھ بولنا شروع کیا۔ میری سمجھ میں صرف اتنا آیا کہ وہ گاڑی کے سوار کے بارے میں مجھے تفصیلیں بتا رہے ہیں لیکن ان تفصیلوں کا صرف ایک جز میری سمجھ میں آسکا کہ گاڑی کا وہ سوار آخری ہے۔ چھوٹی برادریوں میں گھومنے کے دوران میرے سامنے آخری کا مفہوم مختلف بولیوں میں اور مختلف اشاروں کی مدد سے اتنی بار ادا کیا گیا تھا کہ اب اسے میں آسانی سے سمجھ لیتا تھا۔ اس برادری کا بھی قریب ہر آدمی سوار کا حال بتانے کے بعد میرے گھٹنے چھوتا اور لجاجت کے ساتھ جتاتا کہ وہ سوار آخری ہے۔

میں نے بلا سبب خود کو ان کا اور ان سے زیادہ اس سوار کا ضامن محسوس کیا اور انہیں مطمئن ہو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگے پھر سب نے ایک دوسرے کو مطمئن ہو جانے کا اشارہ کیا اور واقعی مطمئن ہو گئے۔ میں نے انہیں وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا، جیسے ابھی واپس آتا ہوں، اپنے مکان کے دروازے پر آ گیا۔

پاگل لڑکا دروازے پر کھڑا تھا اور ڈرا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

"وہ کون لوگ ہیں؟" اس نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"پرچے والے ہیں،" میں نے جواب دیا، "تم نے انہیں انعام نہیں دیا؟"

"انعام؟" اس نے یوں پوچھا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہو۔

میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور کہا:

"جاؤ، دوڑ کر انعام لے آؤ، پھر ان کے پاس چلیں گے۔"

"نہیں۔" اس نے کہا اور پہلے سے بھی زیادہ ڈرا ہوا معلوم ہونے لگا۔

"اچھا، جاؤ کھیلو،" میں نے کہا، "مجھے کام ہے۔"

"وہ بڈھا کون ہے؟"

"بڈھا؟"

"جو گاڑی میں چھپا ہوا ہے۔"

"وہ بڈھا نہیں ہے" میں نے کہا۔

پھر میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ میں نے سوار کو بچہ کیوں سمجھ لیا تھا؟ وہ کوئی بوڑھا بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اس کی ہیئت یاد کی۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور ہاتھ پر جھریاں تھیں میں نے اس کے ہاتھوں کی بناوٹ یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی جگہ مجھے عورت کا پسیجا ہوا ہاتھ یاد آیا جس کی انگلیاں میری انگلیوں میں الجھی ہوئی تھیں اور دل کی طرح دھڑک رہی تھیں۔ میں نے زور سے سر کو جھٹکا اور برادری والوں کی باتوں اور اشاروں کو یاد کرنے لگا۔ میری سمجھ میں صرف اتنا آیا تھا کہ وہ آخری ہے۔ برادری کا آخری بچہ، یا آخری بوڑھا؟ کسی آدمی کی یا کسی زمانے کی، آخری نشانی؟ کسی چیز کی، یا کسی واقعے کی آخری یادگار؟ میرا دماغ الجھتا گیا۔ اور میں نے اس الجھن میں شاید بہت وقت گزار دیا۔ اس لیے کہ جب میں نے فیصلہ کیا کہ اسے پھر سے جا کر دیکھو تو پاگل لڑکا جا چکا تھا اور دوپہر ڈھلنے کے قریب تھی۔

کوڑا گھر اور دکانوں کے سلسلے کو پیچھے چھوڑتا ہوا میں آگے بڑھا تو میں نے دیکھا کہ وہ سب میری طرف آ رہے ہیں۔ گاڑی آگے آگے تھی۔ سوار کا چہرہ گاڑی کی کگار پر ٹکا ہوا تھا اور اس کے سر پر لپٹا ہوا گودڑ جگہ جگہ سے کھل گیا تھا۔ عورت بار بار خود بھی گاڑی میں سوار ہونے کی کوشش کر رہی تھی اور ہر بار کوئی نہ کوئی اسے پکڑ کر پیچھے گھسیٹ لیتا تھا۔ مجھے گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ کے پیچھے ان کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ کچھ گاتے ہوئے سے معلوم ہو رہے تھے۔ باری باری ایک آدمی کچھ بول کہتا اور اس کے آخری دو تین لفظوں کو سب مل کر دہراتے تھے۔ انہوں نے ایک صف بنائی تھی اور ان کی آوازیں بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ ایک آدمی صف سے آگے نکلا۔ اس نے لحن سے کچھ کہا اور سب نے اسے دہرایا۔ وہ آدمی صف میں واپس چلا گیا اور دوسرا آدمی آگے نکلا اس کی آواز اور دوسروں کی جوابی آواز پہلے کی آوازوں سے زیادہ بلند تھی اور اب ان کے ہاتھ اور بدن کچھ رقص کے سے انداز میں جنبش کر رہے تھے کچھ کچھ دیر بعد کوئی ایک آدمی صف سے آگے بڑھتا۔ کچھ بول کہتا، سب اس کا ساتھ دیتے پھر چپ ہو کر یوں سر ہلاتے جیسے اسے داد دے رہے ہیں۔ میرے خیال میں وہ داد دینے کا اشارہ تھا، لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس برادری میں اس اشارے کا کیا مطلب ہے۔

میں ان کی آنکھوں کے ٹھیک سامنے ہونے کے باوجود انہیں شاید نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ میری ہی طرف بڑھ رہے تھے ان کی پیش قدمی کے ساتھ میں الٹے قدموں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا جا رہا تھا میرے کان ان کی آوازوں پر اور نگاہیں ان کے اشاروں پر لگی ہوئی تھیں۔

وہ کوئی داستان سنا رہے تھے اور اس داستان کے مبہم منظر میرے سامنے خواب کے خاکوں کی طرح بن بن کر مٹ رہے تھے میں نے دیکھا کہ ایک بچے کو گودیوں میں کھلایا جا رہا ہے، بچہ چلنا سیکھ رہا ہے چلتے چلتے گر کر رو رہا ہے، بہلایا جا رہا ہے، بہل گیا ہے، دوڑ رہا ہے، تھک کر سو گیا ہے، سو کر اٹھا ہے اور ہتھیلیوں سے آنکھیں مل رہا ہے اور اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی ہیں۔

مجھے بہت سی سرخ آنکھوں کے جوڑے اپنی طرف بڑھتے دکھائی دیئے: اب وہ سب ایک ساتھ، ایک ہی لحن میں ایک ہی اشارے سے آخری، آخری کہہ رہے تھے اور ان کے سر پیچھے جا رہے تھے۔ ان پر ایک جوش طاری تھا اور معلوم ہوتا تھا سب غصے سے پاگل ہو رہے ہیں پھر سب پر ایک ساتھ نشہ سا چڑھ گیا۔ گرد نے ان کے کپڑوں سے اڑ کر اور قدموں کے نیچے سے اٹھ کر ان کو لپیٹ لیا اور ایک چھدرے بادل کی صورت میں ان کے آگے منڈلانے لگی۔ گرد کے پیچھے گاڑی کے سوار کے چہرے کو عورت نے پھر سہارا دے کر اوپر اٹھا دیا تھا۔ اس کی آنکھ کی دراز بند ہو گئی تھی۔ لیکن دوسری، سفیدی اور سیاہی سے بنی ہوئی، آنکھ مجھ کو حیرت سے دیکھ رہی تھی اور گرد میں اٹ جانے کے بعد بھی بند نہیں ہو رہی تھی۔ گاڑی سڑک کے کسی کھانچے پر سے گذری۔ سوار کے سر کو ایک جھٹکا لگا اور اس پر لپٹا ہوا گودڑ تھوڑا اور کھل گیا۔ آنکھ میں ملامت جھلکی، پھر غصہ، پھر ہلکا سا تشفی اور پھر حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔

دکانوں کے سلسلے کے قریب پہنچتے ہی وہ سب خاموش ہو کر رک گئے، سب تھکن سے چور اور میری موجودگی سے بے خبر معلوم ہو رہے تھے اب انہوں نے آپس میں کچھ مشورہ کیا اور دور پر میرے مکان کی طرف اشارے کرنے لگے میں مڑا اور تیز قدموں سے اپنے مکان کی طرف چلا۔ دروازہ آنے سے کچھ پہلے میں نے پلٹ کر دیکھا اب وہ میری طرف اشارہ کر کر کے ایک دوسرے کو کچھ بتا رہے تھے پھر وہ آگے بڑھنے لگے۔ سیدھے میری طرف۔ میں مڑا اور اپنے دروازے کو پیچھے چھوڑتا ہوا کوئی چالیس قدم آگے نکل کر پھر رکا۔ آہستہ سے گھوم کر میں نے ان کی طرف دیکھا۔ بیٹھتی ہوئی گرد میں وہ مجھے کوڑے کے ایک جلتے ہوئے ڈھیر کی طرح نظر آئے پھر ان کی ترتیب بگڑ گئی اور سب نے سر جھکا لئے۔

دیر تک مجھ پر یہ خیال غالب رہا کہ میں نے کوئی منظر دیکھا ہے جسے اب کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔ مجھے ہلکا سا پچھتاوا بھی ہوا کہ میں خود اس منظر میں شامل نہیں تھا۔ لیکن میں نے خود کو بہت محفوظ بھی محسوس کیا اس لئے کہ اب وہ لوگ مشرق کی سمت کٹنے والی اس بے نام کچی سڑک پر اتر رہے تھے جو شہر سے باہر اجاڑ علاقوں کی طرف جاتی تھی۔

بقیہ صفحہ ۱۲ تنقید

تخلیق کے منصب ہی سے واقف ہیں اور نہ ہی تنقید کے صحیح مفہوم سے۔ یہی بات شدت پسند ناقد کے بارے میں بھی کہنا مناسب ہے۔

تخلیق کے وجود پر بحث کرتے ہوئے جذبہ، خیال، فکر، تجربہ، مشاہدہ وغیرہ؟ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کائناتی علوم مثلاً عمرانیات، سیاسیات منطق و فلسفہ، جغرافیہ و سائنس وغیرہ کی تفہیم تخلیقی سرگرمیوں میں معاون تو ہو سکتی ہے مگر تخلیق کو اس کا پابند تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ بہ الفاظ دیگر علوم کی حیثیت تخلیق کے لیے طفیلی اور ثانوی درجہ رکھتی ہے جب کہ تنقید کے لیے یہی چیزیں مقدم ہو جاتی ہیں۔ اس نوعیت سے دیکھا جائے تو خالق کے مقابل ناقد کا قد بہت بڑا قرار دیا جاتا ہے اور یہی چیز اسے ممتاز بھی کر دیتی ہے۔ تخلیق اگر لاشعوری محرکات کا نتیجہ ہوتی ہے تو تنقید شعوری سطح سے ابھر کر لاشعوری محرکات تک پہنچنے کا فرض ادا کرتی ہے علم کے بغیر شعور کا تصور پیدا نہیں ہوتا اور ناقد باشعور ہونے کی بنا پر زبردست عالم کے فرائض ادا کرتا ہے۔

تخلیق کی ہئیت میں جو عناصر فنکار کے لاشعور و شعور کے پر اسرار راستے سے غیر محسوس کن انداز میں داخل ہوتے ہیں ایک تنقید نگار ما فی الضمیر کے خارجی حقائق سے ان کے رابطوں ہی کو تلاش نہیں کرتا بلکہ ان کے اثرات سے بھی آگاہ کرتا ہے اور فنی معائب و محاسن کا تجزیہ بھی حیات و کائنات سے متعلق جتنے بھی علم ہیں اگر ان میں سے کسی ایک سے بھی تنقید کے دباؤ کو ہٹایا جائے تو یقیناً کچھ وقت کے بعد وہ علم جامد اور بے حس ہو جائے گا ادب میں تخلیق و تنقید کے اس رشتے کی نفی تخلیق کے لیے بھی مضرت رساں ثابت ہو گی،، نتیجۃً ادب اور ادیب کے بارے میں واضح تصور پیدا نہیں ہو سکے گا۔
اور خالق جنگلوں میں رہنے والے قدیم قبائل کے بچوں کی طرح غیر مہذب بن جائے گا یا اسے مہذب بننے کے لیے خود ہی نقاد کے فرائض انجام دینے ہوں گے۔



اسلم حنیف

گنور، ضلع بدایوں (یوپی) - ۲۰۲۵۲۲

تنقید

(مفروضات، ماہیت اور حقیقت)

ہر دور اور ہر ادب میں تنقید کی جانبداری اور اس کے دفاع کے لئے دو متحارب گروہ پیدا ہوتے رہے ہیں لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ قدیم دور سے تاحال کے مباحث کو یکجا کرکے ان کا مطالعہ کیا جائے تو سوائے بنے بنائے سوالات اور دیئے گئے جوابات کی بازگشت کے کچھ نظر نہیں آئیگا۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہی کہنا مناسب ہوگا کہ متنازعہ فیہ مسائل کا حل ہنوز تلاش نہیں کیا جا سکا ہے ورنہ صدیوں قدیم محاذ پر رجز خوانی کرنے والے اب تک نئے پہلو اور نئے رن ضرور تلاش کر لیتے۔

اکثر علماء ادب تخلیق کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف تو کرتے ہیں کہ تخلیق بغیر تنقیدی شعور کے معرض وجود میں نہیں آتی لیکن جب تنقیدی شعور کا ذکر آتا ہے تو یہی لوگ تخلیق کے مخالف سمت میں چھلانگ مار جاتے ہیں۔ اس رویئے سے تخلیق اور تنقید کے دائرے ایک دوسرے میں نفوذ کرنے کے بجائے مخالف جہتوں کا سفر شروع کر دیتے ہیں۔ اور نتیجۃً تخلیق اور تنقید کے تعلق اور صحیح حد فاصل کے تمام تر پہلو غیر منطقی طرز استدلال کی دھند میں گم ہو جاتے ہیں۔ یہاں صدیوں قدیم گھسے پٹے گنجلک اور مبہم موضوع کی از سر نو تفتیش کے بجائے گفتنی نئے سرے سے بیان کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ ذہنی مغالطوں اور مفروضہ افکار کو نئے تناظر میں دیکھا جا سکے۔

میں "اجتماعی شعور" کے وجود کے اثبات کے لئے ایک مستقل مضمون لکھ چکا ہوں۔ اس لئے تفصیل میں جائے بغیر اتنا دہرا دینا ضروری ہے کہ فرائڈ اور یونگ کے نظریات سے بھرپور استفادہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب ہم اجتماعی شعور COLLECTIVE CONSCIOUS کو بھی دیگر نفسیاتی اصطلاحوں کی طرح درست تسلیم کریں۔ اس کی نفی کا جواز تلاش کرنا معاشرتی نظام یا انسان کے خارجی ماحول یا انفرادی شعور، قبل شعور اور انفرادی لاشعور و نسلی لاشعور وغیرہ کے وجود کو بھی شکوک و شبہات کی حدوں میں داخل کر دیتا ہے۔ جب ہم یہ مانتے ہیں کہ لاشعور بچپن سے آخری عمر تک صرف دبائے ہوئے خیالات یا جذبات و احساسات وغیرہ کو خود میں محفوظ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ قبل شعور PRE CONSCIOUS بہت سی باتوں کو اپنی حد میں رکھ چھوڑتا ہے جو زور دینے پر شعور میں آجاتی ہیں لیکن ناآسودہ خیالات و جذبات جب خارج سے لاشعور کی طرف سفر کرتے ہیں تو کیا شعور CONSCIOUS سے نہیں گزرتے؟ اور جب یہ لاشعور سے خارج کی طرف منتقل ہو کر تخلیق کا روپ اختیار کرتے ہیں تو شعور کی منزل کو خیرباد کہہ دیتے ہیں؟ ہر صورت خارجی ماحول اور لاشعور UN CONSCIOUS کے درمیان شعور کو ایک پل تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ یہی بحث اجتماعی یا نسلی لاشعور COLLECTIVE UN-CONCIOUS کے سلسلے میں بھی برقرار رہتی ہے۔ اس سلسلے کو مختصر کرنے کے لئے فنی و ادبی سطح پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصناف اور ان کی مخصوص ہیئتوں و فارم، کا تعلق اجتماعی شعور سے ہے۔ موضوع و مواد لاشعور فراہم کرتا ہے اور انفرادی شعور انہیں اپنے طور پر برتتا ہے یعنی اسلوب کی بحث اسی کے ذیل میں آتی ہے۔ شعور چونکہ ادراک اور قوت ممیزہ سے مل کر بنتا ہے اس لئے اسے مبنع تنقید کہنا غلط نہ ہوگا۔ قبل شعور انسانی یادداشت کا کام بھی انجام دیتا ہے اور شعور کا حتمی تصور ہونے کی وجہ سے اسے پہلا ناقد بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور تخلیق چونکہ باطن سے خارج کی طرف آتی ہے اس لئے اسے تنقیدی عناصر سے ماورا شے قرار دینے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اور شعور جتنا مستحکم اور متنوع ہوتا ہے تخلیق بھی اتنی ہی آفاقی بن جاتی ہے۔ اور جس طرح لاشعوری محرکات و ہیجانات کو کوشش کے باوجود شعور تک لانا غیر ممکن ہوتا ہے اسی طرح فنکار اپنی شعوری یا تنقیدی صلاحیتوں کے بارے میں بہت کم جانتا ہے یا جاننے

[redacted] •••••

کی کوشش میں ناکام رہتا ہے۔ کیوں کر وہ جانتا ہے اسی وقت جب تخلیق وجود میں آجاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے لاشعوری ہیجانات سے آگہی کے لئے اس کا شعور پر حملہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ فریڈا فورڈھم FREDA FORDHAM اجتماعی لاشعور پر بحث کرتے ہوئے یونگ JUNG کے نظریئے کی وضاحت جن انداز میں کرتا ہے اس کے مطالعے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تخلیق کے وجود میں آنے کے اسباب و علل کی بھرپور گرفت نہیں کر سکا۔

"یہ درست ہے کہ جب دیو مالا خارجی صورت اختیار کرتی ہے اور الفاظ کے سانچے میں ڈھلتی ہے تو یہ پیکر شعور عطا کرتا ہے' لیکن دیو مالا کی روح یعنی وہ تخلیقی رجحان جو یہ منعکس کرتی ہے اور جس احساس کا اظہار کرتی ہے بہت حد تک اس کا ماخذ بھی اجتماعی لاشعور کا براہِ راست اظہار ہے" [ادب اور نفسیات دیویندر اسر ص۳۱]

یہ شعور کے انکار کی غلط توجیہہ ہے لاشعور کو تخلیق و تخریب کا سرچشمہ قرار دے کر وظائف و اعمالِ حیات کو اسی دائرے میں اسیر کر دینا غیر مناسب ہے۔ شعور نفسِ انسانی کا متحرک اور فعال حصہ ہے جس کا اجتماعی شعور سے گہرا تعلق ہے اور جس طرح اجتماعی شعور زمانی اور مکانی لحاظ سے تغیر و تبدل کی لچک رکھتا ہے اس سے کہیں زیادہ انفرادی شعور میں یہ مادہ موجود ہوتا ہے جو ہر صورت مختلف صورتوں میں تخلیق پر اثر انداز ہوتا ہے اور اسی بنا پر ہر تخلیق کی روح اپنے معنوی اعتبار سے جدا جدا ہوتی ہے۔ یعنی اختصار کے لئے یہاں صرف یہ اقرار کر دینا بہتر ہے کہ تخلیق شعور اور لاشعور کے امتزاج کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر تخلیق میں تنقیدی عناصر اسی طرح موجود رہتے ہیں جس طرح خون میں سفید ذرّات۔

سطور بالا میں جس تنقید کا ذکر ہوا ہے وہ خالق کے شعور سے وابستہ ہے یعنی تخلیق کی عملیات کی تدوین بغیر تنقیدی جوہروں کے ناممکن ہے اس لئے اسے "تنقید مشترک" کے نام سے موسوم کیا جانا چاہیئے۔ اس مقام تک پہنچنے کے بعد جو سوالات براہِ راست ناقد اور اس کے تنقیدی افعال کے سلسلے میں قائم کیے جاتے ہیں ان کا بڑا حصہ لایعنی بن جاتا ہے قطع نظر اس سے اب یہ دیکھنا ہے کہ تنقید مشترک کا عمل تخلیق پر کن صورتوں میں اثر انداز ہوتا ہے۔

فنکار کا تنقیدی شعور یوں تو تخلیقی عمل کے دوران مکمل طور پر بیدار رہتا ہے لیکن تنقید مشترک کا عمل تین صورتوں میں واضح طور پر ظہور پذیر ہوتا ہے۔

(۱) ماقبل تخلیق (۲) درمیان تخلیق (۳) بعد از تخلیق

تنقید کے وجود سے انحراف کرنے والا طبقہ جذباتی افعال کا ذکر کرتا ہے اس کے نزدیک ہر فعل عقل و شعور کا تابع نہیں ہوتا بلکہ بہت سے فعل غیر ارادی صورت میں بھی سرزد ہوتے ہیں۔ تھوڑی سی دیر کے لئے اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی ہماری بحث پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیوں کہ ایسے افعال کی مقدار بہت کم ہوتی ہے۔ لیکن اس دلیل کی صحت کئی رخوں سے مشکوک ہے مثلاً "بچے"، بالغ اور عمر رسیدہ لوگوں کے جذباتی افعال یکساں نہیں ہوتے یعنی ان کا تعلق بھی شعور ہی سے ہے۔ جیسا جس کا شعور ہوتا ہے جذباتی اور غیر ارادی فعلوں کی نوعیت بھی ویسی ہی ہوا کرتی ہے۔ پھر شعور اور فعل میں مطابقت یا عدم مطابقت کے بارے میں بھی سوچنا چاہیئے۔ ضروری نہیں ہے کہ ایک دانشور کا ہر جذباتی فعل بھی لائق ستائش ہو۔ جذباتی افعال اکثر ردِعمل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں جن پر عقل کے بروقت تصرف سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور فنی و ادبی سطح پر تخلیقی کاموں کے بارے میں دیگر وظائفِ حیات کی طرح سوچنا یوں بھی درست نہیں ہے۔ تمام فنونِ لطیفہ فنکار کے تنقیدی شعور سے مربوط ہوتے ہیں۔ فنکار کے ذہن میں تنقیدی عمل تخلیق سے پہلے اس وقت وجود میں آتا ہے جب کسی موضوع کے بارے میں کچھ تحریری کام کی ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ یا کسی صنف کے خارجی ڈھانچے میں ترمیم و تنسیخ کو وہ ضروری سمجھتا ہے۔ سوچے ہوئے انداز کے تحت تخلیق کو ڈھالنے کی کوشش ارادے کی مرہونِ منت ہوتی ہے یہی ارادی قوت ماقبل تخلیق جس عنصر کو خود میں رکھتی ہے اسی کا نام تنقید ہے۔

ثانی الذکر تنقید مشترک، کا عمل تخلیق کے نقطۂ آغاز سے انجام تک پہونچتے ہوئے ہر اس مقام پر کارفرما ہوتا ہے جہاں شعور تخلیقی مواد، جملوں کے نظم و ضبط اور الفاظ کی نشست و برخاست سے مطمئن نہیں ہوتا تخلیقی مواد جتنا بہتر، عظیم اور پختہ ہوتا ہے یا شعور کی پختگی تخلیقی مواد کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں جس قدر تیز اور برمحل رد دینے میں ڈھل جاتی ہے دورانِ تخلیق کا ترمیم و تنسیخ کا طریقہ کار بھی کمزور پڑتا چلا جاتا ہے۔ اس کے مظاہر فنکار کے ابتدائی دور میں زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔

ثالث الذکر تنقیدی رجحان تخلیق کار کے یہاں اس سطح پر پیدا ہوتا ہے جب تخلیق اپنے تمام تر مراحل کو سر کر لیتی ہے اور فنکار اپنی ہی تخلیق پر نظر ثانی کرتا ہے یعنی اپنی تخلیقی کمزوری کو خود پرکھتا ہے اور جہاں اس کے شعور کو جھٹکا لگتا ہے وہ اس کی صحت کر دیتا ہے۔ تخلیق کے معرض وجود میں آنے کے بعد خود اپنی تنقید کے بارے میں اگرچہ ہر ادب میں مثالیں مل جائیں گی ابن رشیق نے اسے واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ "

واصنع القرائض ما قارب النظم

وان کان وضحا متبینا [مقدمہ ابن خلدون ص ۵۹۳]

"یعنی نظم پوری کر چکنے کے بعد اپنے اشعار کی خود اصلاح و تنقیح کرو اگرچہ وہ واضح اور صاف ہوں "

ابن خلدون نے تفصیل کے ساتھ اسی نظریے کی حمایت کرتے ہوئے لکھا ہے

" جب اشعار نظم کرنے سے فراغت مل جائے تو خود اپنے اشعار پر ناقدانہ نظر ڈالنی چاہیئے ...... کیوں کہ شعر انسانی فکر کی پیداوار ہے اور اس کی طبیعت کی ایجاد اکثر خود پسندی کے دھوکے میں آکر ایک بھدے سے شعر کو اچھا سمجھ لیتی ہے لیکن جب وہ دوبارہ غور کرتا ہے تو اپنا عیب اپنے سامنے کھل جاتا ہے" [ابن خلدون ص ۵۹۲]

اس اجمالی وضاحت کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ تخلیق اپنا مجرد تصور نہیں رکھتی ..... یہ لاشعور سے ابھر کر تحت شعور اور درمیان سے انفرادی شعور تک پہنچنے میں جو مراحل طے کرتی ہے اسے تنقید سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور چونکہ شعور سے آگے اجتماعی شعور بھی ہوتا ہے جسے یہ متاثر کرنا چاہتی ہے اس لیے تنقیدی گرفت کے بغیر یہ وجود میں آ ہی نہیں سکتی۔

اب آئیے اس تنقید کی طرف جس کا نام لے کر وضاحت کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ میں اس تنقید کو تسہیل بیان کے لیے "فاسلی تنقید" کے نام سے موسوم کر رہا ہوں حالانکہ یہ نام موزوں نہیں ہے کیوں کہ یہ تنقید حاسل کے بجائے تنقید کی تنقید ہوتی ہے۔ اس کی توجیہہ و تشریح کے لیے "ہومر" کی ایلیڈ میں موجود اس تنقیدی اشارے پر غور کیجئے جس میں "ہیفیسٹس" کے بنائے ہوئے اکیلز ACHILLES کی ڈھال پر سنہرے نقش کی تعریف کی گئی ہے۔ یا یونان کے اسی قدیم شاعر کی دوسری تصنیف "اوڈیسی" کے آٹھویں حصے کا یہ اقتباس کہ :

اس مقدس "ڈیموڈوکس" کو مت دو کیوں کہ خدا نے اسے جیسی گانے کی صلاحیت دی ہے کسی اور کو نہیں اس لیے جیسے اس کا دل چاہے اس طرح گا کر وہ انسانوں کو خوش کرے [بوطیقا : ترجمہ عزیز احمد ص ۲]

"ہیفیسٹس" کا سنہری نقش اور "ڈیموڈوکس" کی خوش الحانی فنکاروں کے ذاتی احتجاج کو ظاہر کرتی ہیں (یہاں احتجاج کا لفظ سماج کے خلاف ردّ عمل پر شعوری کوشش کے وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔)

یہی فنکاروں کی تنقیدی لہریں ہیں جسے اپنے حسن و انداز سے ابھری ہیں "ہومر" نے انہیں کو ابھارنے کی سعی کی ہے اور یہ عمل بذات خود تنقید نہیں بلکہ تنقید کی تنقید ہے۔ یعنی تخلیق بھی ہر اعتبار سے تنقیدی ہوتی ہے لیکن اس میں شعور کا دخل لاشعور کے مقابلے میں کمزور ہونے اور دوسرے اجزا ر تخلیق کے غلبے کی بنا پر تخلیق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

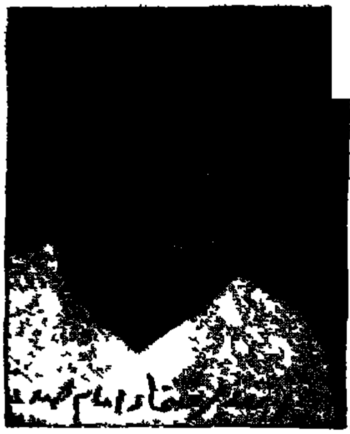
مذکورہ حوالے ذہن میں رکھتے ہوئے "بوطیقا" کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے۔

" گلاکن نے سچ کہا ہے کہ۔ " اگر نقاد کسی بات کو بلا وجہ جیسا چاہتے ہیں سمجھ لیتے ہیں اور پھر اپنے ہی نکالے ہوئے نتیجوں کو صحیح سمجھ کر ان کی بنا پر بحث کرتے ہیں۔۔ "

"ہومر" اور "ارسطو" کی ان تنقیدوں کے پیش نظر تنقید کا ایک اہم رول ہمارے سامنے ابھر آتا ہے وہ یہ کہ صحت مند تنقید چاہے خالق کے حوالے سے وجود میں آئے یا ناقد کی وساطت سے بہر صورت اس سے فنکار اور فن پارہ اپنے حسن و قبح کے ساتھ ابدی حیثیت کے حامل بن جاتے ہیں۔

خالق اور ناقد دونوں ہی اجتماعی شعور کا اٹوٹ حصہ ہوتے ہیں اس لیے اپنے اپنے مقام اور منصب کے اعتبار سے دونوں کو عظیم کہنا چاہیئے جو لوگ ناقد کو ادب کی جراحم تخصیت قرار دے کر اپنے نفس کو مطمئن کر لیتے ہیں وہ جہالت کے گڑھے میں اوندھے لٹکے ہوئے ہیں کیونکہ وہ نہ تو

[باقی صفحہ ۹ پر دیکھئے]



حسین الحق

ریڈر، شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا (بہار)

مردہ راڈار

گئی رات تک اُس کے رونے اور کراہنے کی دل چیرتی آواز سنائی دیتی رہی۔

وہ جاڑے کی ایک انتہائی سرد اور قدرے ابر آلود رات تھی، سورج دن بھر بادلوں کے نرغے میں گھرا رہا تھا، ہڈیوں کو چیرتی ہوا لگتا ہے گا ہے رم جھم بارش، زندگی جیسے ٹھٹھری گئی تھی۔۔۔۔ ایسے ہی موسم میں مغرب کی اذان سے کچھ پہلے یا کچھ بعد وہ پانی کے اس جماؤ کا حصّہ بنا تھا۔

پانی کا وہ جماؤ شہر کے ایک پوش حصّے میں تھا، بڑے بڑے خوبصورت عالی شان مکانات، مکانوں کے اردگرد چہار دیواری، زیادہ مکانوں کے اندر گیراج اور زیادہ گیراجوں میں گاڑیاں، اور چہار دیواریوں کے اندر، چاروں طرف پھول پودوں کا انبار، عہدِ قدیم سے ہم مہذب ترین اقوام میں گنے جاتے رہے ہیں، کالونی والوں کو تقریباً ساری سہولتیں میسر تھیں۔۔۔۔۔ غلاظت کی نکاسی کے انتظام کے سوا۔۔۔ اس پوشش کالونی میں بھی گندہ پانی جمع ہو ہی جاتا تھا۔

بات پہ بات نکلتی ہے اور بات پہ بات یاد آتی ہے، اسی کے حوالے سے شرفو چچا اور منّے بھائی نے خاصی دھواں دھار بحث کی تھی۔ شرفو چچا کا کہنا تھا کہ "اب اس کالونی میں زمین کی قیمت ڈیڑھ لاکھ روپے کٹھے سے کم نہیں ہونی چاہیئے۔" منّے بھائی نے ابھی مکان نہیں بنایا تھا اور اسی کالونی میں زمین کے متلاشی تھے، وہ کہنے لگے ڈرینج سسٹم صحیح نہیں ہے، اتنی قیمت کون دے گا؟ شرفو چچا دلیل لائے کسی گھر کا پانی کسی گھر میں تو نہیں سڑتا۔۔۔۔ "بس ایک پوش کالونی میں بھی پانی کا جماؤ موجود تھا۔ اور گئی رات تک اُس کے کراہنے اور رونے کی آواز دل چیرتی رہی۔

طاہر علی گئی رات تک بولایا بولایا پھرا، اس کے گھر کے بالکل بغل میں تھا۔۔۔۔۔ پانی کا وہ جماؤ۔۔۔، اُس نے کھڑکیاں اور دروازے سب بند کر رکھے تھے۔ مگر دروازوں کے شگافوں اور جھرّیوں کا وہ کیا کرتا؟ بار بار اس کی خواہش ہوتی کہ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے اور پچھواڑے سے گرتی اس دکھ بھری آواز کا درد آشنا بنے۔ مگر اس دن اتفاق سے گھر میں، مرد کی صورت میں وہ تنہا تھا اور ان دنوں ڈاکوؤں اور لٹیروں کے خوف سے گھروں کے دروازے، سرِ شام ہی بند ہو جاتے تھے، دراصل یہ غنڈے اور اچکّے بیسیوں گھروں میں گھس چکے تھے اور بہت خوف و ہراس پھیلا چکے تھے اور اُن کی گرفت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ حالاں کہ ایسا نہیں کہ اس علاقے یا شہر سے پولس چوکیاں ختم کر دی گئیں تھیں مگر "مارا کانڈ" میں سارا انتظامیہ اس طرح الجھ کر رہ گیا تھا کہ اسے شہر کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں مل رہی تھی۔ لہٰذا کوئی بھی ذی روح، کسی نالے، یا گڑھے پانی یا گندگی کے جماؤ میں گھر جاتا اور گئی رات تک کراہنے اور رونے کی دل چیرتی آواز سنائی دیتی رہتی۔

اس دن بھی، مغرب کے آس پاس ہی سے بھچّی بھچّی، چیخنے اور چلانے کی آواز دل چیرتی اور رونگٹے کھڑی کرتی رہی طاہر علی ہڑبڑا کر باہر نکلا اور عقب کی طرف دوڑا۔۔۔۔۔۔ منظر دیکھ کر پہلے تو ہنسی آئی پھر فاری کا ایک مصرعہ یاد آیا اور پھر آہستہ آہستہ افسوس کی ایک کانٹے دار لہر نے اس کے چاروں طرف اپنا جال کسنا شروع کیا مگر اسی وقت بیوی کا فون آ گیا۔۔۔۔ بیٹے نے آکر بتایا تو وہ بلا سوچے سمجھے گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ اس کا باس نوجوان تھا اور ریلیک ورڈ بھی اور کچھ کرنے کا خواہش مند بھی اس لیے قانون اور ضابطے کی زبان بہت بولتا تھا۔ اور طاہر علی جیسے آزاد مزاج ڈھائی جھگڑوے اور زور زبردستی سے اپنا کام نکلوانے والے نہیں ہوتے، ان کے لیے قانون کا ڈنڈا ہمیشہ "تنبیہ الغافلین" بنا رہتا ہے طاہر علی حتی الامکان اس کی کوشش کرتا تھا کہ اس

کا شمار خانوں میں نہ ہو۔ وہ باس کی آواز پر کیسے نہ دوڑتا؟ باس سے فون پر گفتگو ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ کچھ لوگ ملنے آ گئے۔ آنے والے طاہر علی کے بے تکلف دوستوں یا پسندیدہ افراد میں سے نہیں تھے۔ مگر ان کی آمد سوشل اسٹیٹس کا درجہ ضرور رکھتی تھی ...... اب ایسے میں وہ اس گرنے والے قطیر؟ صفت کی طرف کیا متوجہ ہوتا!

وہ ڈرائنگ روم میں ان لوگوں سے باتیں کرتا رہا اور اس کے رونے اور کراہنے کی آواز آتی رہی۔

پانی کا وہ جماؤ ایک ایسے خطۂ زمین پر تھا جس کے چاروں طرف چہار دیواری تو تھی مگر مکان یا پلاٹنگ نام کی کوئی چیز نہیں، اور چونکہ ابھی اس پر مکان تعمیر نہیں ہوا اور انتظامیہ نے بھی کالونی سے غلاظت کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ اس لئے ارد گرد والوں نے اپنی اپنی نالیوں کا رخ اسی خطۂ زمین کی طرف کر دیا تھا اور اس پر طرفہ تماشا یہ کہ برسات کا پانی بھی ارد گرد کے سارے ڈھلوانوں سے ہوتا ہوا یہاں تک آ جاتا، بات صرف یہیں تک رہتی تو شاید مسئلہ اتنا شدید نہ ہوتا۔ مگر ہر گھر والے اپنا کوڑا کرکٹ بھی تو اسی پانی میں پھینکتے پس پانی آتا بھی ہے، جمتا بھی ہے، سڑتا بھی ہے اور دلدل بھی بنتا ہے

طاہر علی کو بات کرتے کرتے اچانک یاد آیا کہ وہ "قطیر زادہ بھی تو دلدل ہی میں پھنس گیا ہے۔ اور اسے پھر سنائی دی ...

اس کے رونے اور کراہنے کی آواز ...... دل چیرنے کی حد تک دل دوز ..... پھر ایک مرتبہ خواہش ہوئی کہ وہ باہر جائے اور اس کو اس مصیبت سے نجات دلائے ..... پچھلی مرتبہ بھی تو ..... "

پھر خیال کی رو بھٹک گئی ...... اس شہر میں وہ ابھی نووارد ہی تھا، ملازمت کے سلسلے میں وہ یہاں آیا اور اسی کے واسطے سے یہاں کی وہائٹ کلرڈ سوسائٹی کا حصہ بنا پھر اس کے انداز گفتگو نے اسے انٹلکچوئل صفوں تک پہنچا یا، مسائل پر اس کا جو منفرد نقطۂ نظر رہتا تھا۔ اور اس منفرد نقطۂ نظر کو وہ جس مدلل انداز میں پیش کرتا تھا، اس کے سبھی قائل تھے مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ۔ "ایک صالح معاشرے میں سماجی انصاف کی قدر کو عمل میں کس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے؟"

طاہر علی جانتا تھا کہ ایک دن کیا اگر ایک نشست میں بھی بحث کے مجموعی منظر نامے پر کوئی دوسرا غالب آ گیا تو پھر طاہر علی کو اپنا انٹلکچوئل والا امیج بچانا دشوار ہو جائے گا ...... اس نے ہوا میں ہاتھ لہرایا۔ اور کہنا شروع کیا:

"صالح معاشرہ ہمیشہ صالح اقدار کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے اور صالح اقدار کے فروغ کا مطلب ہے۔ ——— سماجی انصاف کا حصول، اور سماجی انصاف کا کلیدی نکتہ ہے زندہ رہو اور زندہ رہنے دو"!

طاہر علی بولتے بولتے اچانک رک گیا، اینل کمار سب جج بیچ ہی میں پوچھ بیٹھے "یہ کتے کا پلا کہاں رو رہا ہے؟"

طاہر علی کو غصہ تو بہت آیا مگر اس نے ضبط کیا اینل کمار کی یہ کوئی نئی حرکت نہیں تھی۔ جب بھی جج صاحب دیکھتے کہ فریق ثانی مجلس پر حاوی ہو رہا ہے تو وہ ایسی ہی غیر متعلق باتیں اٹھا کر بات کا رخ موڑ دیتے، مگر اس دن طاہر علی نے بھی طے کر لیا تھا کہ چاہے جو ہو، انہیں کمار کو تو کامیاب نہیں ہونے دینا ہے "...... اس لئے جواباً صرف اتنا بولا "کتے تو بھونکتے ہی رہتے ہیں" اور پھر اپنی کہی بات کا سرا بعد کی بات سے جوڑنے لگا ..... "دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ ..... "

کتے کا پلا روئے جا رہا تھا ..... دلدل میں جو بھی پھنستا ہے وہ رونے کراہنے کے سوا کیا کر سکتا ہے؟

بحث ہمیشہ کی طرح بے نتیجہ رہی، کتے کے پلے کے رونے کراہنے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ..... حالانکہ پچھلی مرتبہ دو تین بجے دن میں اچانک پچھواڑے سے کئی بکریوں کے بے تابانہ ممیانے کی آواز سن کر جب وہ دوڑا تھا تو صورت حال اس سے بھی زیادہ بھیانک تھی۔ ایک بکری نہ جانے کس طرح اس "تھپیتے" دگندے پانی کا جماؤ" میں گر گئی تھی۔

بکریاں تو پانی سے ایسے ہی بھاگتی ہیں اور رہ رہاں یہ مصیبت آن پڑی کہ ایک بکری گھورے پر دانے کی تلاش میں گئی اور پھسل کر پانی میں گر پڑی، ظاہر ہے کہ اس کا چیخنا بالکل فطری تھا۔ مگر اس کی چیخ سن کر جہاں کئی بکریاں دوڑیں وہیں کتوں کو سن گن مل گئی۔ بکریاں .... محبت کی ماری .... آواز پر .... دوڑ تو گئیں مگر اپنی فطرت سے مجبور، پانی سے سگ گزیدہ جس طرح ڈرے، کنارے پر پہنچ کر منکا کر سبھی ہمت ہار گئیں کنارے پر کھڑی میں میں کرتی رہیں اس کو بلاتی رہیں مگر پانی میں کیسے اترتیں؟ وہ ایک آفت زدہ بیوقوف بکری ..... وہ تو اپنے ہی وقتی سے پانی میں گھر گئی تھی!

مگر کتوں کی توہین آئی، چار پانچ کتے پانی میں کود پڑے اور چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ سبھی حیرت زدہ رہ گئے، ان جانوروں میں جنگی حکمتِ عملی کا اتنا بالغ شعور کہاں سے آ گیا! کیا انہوں نے آدمیوں سے سیکھا؟ یا آدمیوں نے ان سے سیکھا؟ صورتِ حال یہ تھی کہ بکری کسی طرح اُس گھیرے کو توڑ دینا چاہ رہی تھی اور کتّے غالباً بکری کی یہ خواہش محسوس کر چکے تھے ــــــــ

وہ غالباً یہ بھی سمجھ چکے تھے کہ بکری اپنا دفاع صرف چار پیروں سے کر سکتی ہے، شاید اسی لئے کتوں کا پہلا اور مسلسل حملہ بکری کے پیروں پر تھا۔ شکتے مطمئن ہوں گے کہ اگر بکری کا پیر بیکار ہو گیا تو پھر یہ خود ہی ڈھ جائے گی اور تب اس کے جسم کا کوئی بھی حصّہ من مانے ڈھنگ سے نوچا اور کھایا جا سکتا ہے۔

ادھر پانی میں گھری بکری بھی شاید اس سازش کو سمجھ چکی تھی۔ اور غالباً اسی لئے وہ پورے وجود سے چِنگھاڑ رہی تھی۔ اور چیخ رہی تھی۔ اور کنارے پر جو بکریاں تھیں ان کا عالم یہ تھا کہ وہ چیختے ہوئے چہار دیواری کے چاروں طرف دوڑ رہی تھیں، ان تین چار بکریوں میں ایک سب سے زیادہ بے چین تھی، وہ بے تابانہ بار بار دیوار پر چڑھ جاتی دیوار کے حدود میں جمع پانی کی طرف جھکتی اور پھر جھک کر بے اختیارانہ پیچھے ہٹ جاتی جیسے سہم گئی ہو۔۔۔۔۔ مگر اس کی چیخ کسی طرح رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

کسی نے بتایا کہ گرنے والی اس کی بیٹی ہے۔

ممتا کے درد اور جان کے عشق کی ایسی کشمکش شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔

شور و غوغا سن کر ارد گرد کے لوگ گھروں سے نکل آئے، مرزا رجب علی، سرور کمال، درشہوار علی خان، برکت اللہ انصاری۔۔۔ نزدیک آتے ہی درشہوار علی خان کے تو ہوش اڑ گئے۔ "ارے یہ تو میری بکری ہے، میں نے اسے قربانی کی نیّت سے پالا ہے۔ سن کر سبھی تشویش میں مبتلا ہوئے اول تو قربانی کا جانور، جس کے سلسلے میں واقعہ مشہور ہے کہ ایک بڑے بزرگ برہمن نے جانور لے جاتے ہوئے قصاب کو ڈانٹ دیا تھا۔ شرم نہیں آتی؟ قربانی کے جانور کو نالی کا گندا پانی پلاتے ہو؟ اور اس پر درشہوار علی خان کی بکری۔۔۔۔ سبزی کے پتوں کی جگہ سبزی کھانے والی۔۔۔ تنومند، خوب صورت دیکھ کر ہی لالچ آ جائے!

بڑوں کی تشویش بچوں تک پہنچی اور بچے جوش میں کود پڑے مگر تھوڑا ہی آگے بڑھنے پر احساس ہوا کہ وہ پورا خطۂ زمین دلدل بن چکا تھا۔ آگے بڑھتا ہوا ہر قدم زمین میں دھنستا اور پیچھے لوٹنا مشکل ہوتا جاتا، لڑکے کسی طرح باہر نکل آئے مگر کتوں کا حملہ جاری رہا اور بکریاں بے تحاشہ ہو کر چیختی رہیں منظر بہت تکلیف دہ تھا لوگوں نے پھر لڑکوں کی ہمت بڑھائی" مگر لڑکے بالکل ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بہت ضد کرنے پر ایک لڑکا جھلا کر بولا "ارے تو جان بچانے کے لئے تو جان دینا ہو گا۔ مگر اسی وقت درشہوار علی خان نے پچاس روپئے انعام کا اعلان کر دیا۔ انعام کے اعلان پر لڑکے گرد بڑھا گئے کتوں کا حملہ بکری پر جاری تھا۔ پھر لڑکوں نے طریقۂ کار بدل دیا اب کے وہ کہیں سے لمبے لمبے بانس لے آئے اور کنارے ہی سے کتوں کو دھکیلنا شروع کیا اور ایک نے تو کمال ہی کر دیا، گھر سے غلیل لے آیا اور غلیل سے جو نشانہ لینا شروع کیا تو کتوں کے پاس بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

مگر اب کے تو صورتِ حال ہی بدلی ہوئی تھی۔ شدید سرد اور قدرے ابر آلود موسم، رات کا وقت، بجلی حسبِ دستور غائب، چاند کی بیسویں یا اکیسویں رات اس لئے چاندنی کی بھی آس نہیں، طاہر علی کیا کر سکتا تھا۔؟ لڑکوں کو پانی چڑھانے کی کوشش کی۔ "پچھلی مرتبہ بھی تم لوگوں نے ایک جان بچائی تھی۔ ذرا پھر ہمت کرو۔

مگر لڑکے صاف جواب دے گئے۔ "پچھلی مرتبہ کی بات دوسری تھی بکری کا معاملہ تھا اور دن کا وقت تھا۔"

"وہ بھی قربانی کی بکری تھی۔" دوسرے نوجوان نے ایک اور نکتہ اٹھایا

پھر خاں صاحب نے ۵۰ روپئے جو بطور انعام دیئے وہ الگ!"

تیسرے عزیز نے بھی پہلو پیدا کیا۔

طاہر علی کا جی چاہا کہ وہ بھی انعام کا اعلان کر دے۔۔۔ مگر پیچر کلاس اتنی فضول خرچی کہاں سے کرے۔

"بیٹا جان تو جان ہے" ایک بزرگ نے سمجھایا۔

"چچا کتے اور بکری کے درمیان تو فرق کرنا ہوگا۔" ایک عزیزہ نے تڑ سے جواب دیا، سبھی لاجواب سے ہو گئے اور اس کے ذہن میں آواز دل چیرتی رہی کہ اسے بیچ بیٹے نے آکر بتایا ـــ "ابا کا فون ہے۔"

کافی رات گئے ڈرائنگ روم خالی ہوا طاہر علی گھر میں آیا،

کتے کا پلّا دلدل میں گھرا چیختا رہا اسے پھر وہ منظر یاد آیا۔ روشنی تو غائب تھی، کئی مار چھلانگ روشنی میں دیکھا ہوا بس ایک منظر، منظر انحنت راتوں تک جلتا اور بجھتا رہا۔ کتے کا پلّا دلدل میں پھنسا نکلنے کیلئے ہاتھ پیر مارتا رہا، اور اس سے کچھ فاصلے پر دو تین کتے بڑی بے چینی سے اچھلتے کودتے اور چیختے رہے کتے اور انسان تو بڑے پرانے دوست ہیں اس لئے دونوں ہی پر ایک دوسرے کے چیخنے چلانے کا کوئی اثر نہیں پڑتا، مگر وہ چیخیں تو عجیب تھیں، لگتا ان چیخوں میں غصہ، افسوس اور خوف تینوں شامل ہیں، ایک تو بالکل پھٹی پھٹی آواز میں مسلسل چیخے جا رہا تھا۔ ادر ادھر کتے کا پلّا بار بار نکلنے کی کوشش کرتا اور ہر بار چھپاک سے پانی میں گر جاتا طاہر علی وہاں پر آدھا گھنٹہ کھڑا رہا اور اتنی دیر تک یہ بے معنی عمل لگاتار جاری رہا، کتے چیختے رہے کتے کا پلّا ڈوبتا رہا۔۔۔ اسی بیچ باس کا فون آگیا پھر لوگ آگئے، پھر بحث چھڑ گئی۔۔۔۔ "ایک عام معاشرے میں سماجی انصاف کا کلیدی نکتہ۔۔۔۔"

گئی رات تک وہ منظر پیچھا کرتا رہا: دلدل میں گھرا روتا چیختا بے چارہ پلّا۔۔۔ اور اس سے بھی زیادہ بھیانک آواز میں شور کرتے ہوئے کتے۔۔۔ کتے اپنی زبان میں کیا کہہ رہے تھے، طاہر علی یہ تو سمجھ نہ سکا مگر ایک بات جو سمجھ میں آ چکی تھی وہ بار بار یاد آتی رہی۔۔۔ کتے اور بکری کے درمیان تو فرق کرنا ہی ہوگا۔۔۔ " اور پھر رات گئے تک جو بحث جاری رہی۔۔۔

سماجی انصاف کی قدر کو عمل میں کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے؟ طاہر علی کے اندر درد، افسوس اور پشیمانی کا ایک جلتا بجھتا سورج طلوع ہوا اور اسے لگا وہ دھیرے دھیرے جل رہا ہے۔

اسی عالم میں نہ جانے کب نیند آگئی، پھر شاید بیچ رات میں طاہر علی کی نیند ٹوٹی تو فوراً ہی اس کا خیال اس بے چارے پلّے کی طرف گیا اس نے آہٹ پر کان لگایا۔ کراہ جاری تھی۔۔۔ تھکان سے چور وجود کی آخری کراہ۔۔۔۔۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ اور سناٹے میں صرف اس کی انتہائی درد اور خوف میں ڈوبی تھکی تھکی بہت مدھم کراہ ابھر رہی تھی۔۔۔ طاہر علی نے کھڑکی کھول کر دیکھا، چہار دیواری کے اندر پانی کی سطح بالکل ٹھہری ہوئی تھی، کسی حصے پر بھی وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا، شاید گردن تک دلدل میں دھنس چکا تھا۔

اس کے باقی ہم قوم شاید مجھن سرد اور سیاہ رات سے ہار گئے تھے بمبدہ رہ کر مغربی کنارے پر پانی میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا محسوس ہوتا، اور ایک انتہائی کمزور آواز کا گمان گزرتا۔۔۔۔ اوہہ۔۔۔۔ ہ۔۔۔ ہ۔۔۔۔ اوہہ۔۔۔۔ ہ۔۔۔۔ ہ۔۔۔۔"
یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ دلدل میں ڈوبتا یہ گریہ کتے کے پلّے کا ہے یا انسان کے بچے کا۔

ایک بے چین تصور، ناامیدی کے بھنور میں ہچکولے کھاتی کسی کراہ کا بے ہیکر ہیولا سا ابھرتا محسوس ہوتا اور طاہر علی اندازے سے تعین کرتا۔ وہاں۔۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔۔۔ وہیں سے آواز ابھری۔ پھر اس نے ٹارچ جلا کر صحیح جگہ کا احساس کرنا چاہا تو نتیجہ تقریباً یکساں ہی رہا۔

ہر گھر کا دروازہ بند تھا۔ اور وہ چھوٹی سی ننھی سی جان پانی کے بگولوں میں تنہا جل رہی تھی۔!
گلیوں میں بھونکتے رہنے والے کتے کہیں نہیں تھے۔۔۔۔۔
طاہر علی کو عجب سا احساس ہوا۔ کیا انہیں اس کی موت کا یقین ہو چکا تھا؟ ________ یا وہ خود خاموش رہ کر مرنے والے کی موت آسان بنا رہے تھے۔؟

طاہر علی بستر پر نہیں سوالات اور اضطراب کی سیج پر تھا اور صحرا کی جلتی ریت پر پڑے مٹر کے دانے کی طرح جل رہا تھا۔۔۔ وہ رات بھر جلتا رہا اور کتے کا پلّا رات بھر پانی میں بھیگتا رہا، ابھرتا رہا ڈوبتا رہا چیختا رہا کراہتا رہا۔۔۔۔۔ پھر جیسے جیسے رات گزرتی گئی اس کی کراہ بھی کمزور پڑتی گئی، صرف کراہنے کا ہلکا ہلکا سا احساس باقی رہ گیا، عجب سی، انتہائی درد اور بے بسی میں گھری کراہ۔۔۔"
طاہر علی کو دوبارہ نیند آنے تک وہ کراہ سنائی دیتی رہی۔۔۔ آہستہ آہستہ مدھم اور معدوم ہوتی ہوئی۔۔۔ وقت کے بھیانک صحرائی طوفان میں، بگولوں کے بھنور میں گھری، سیلاب کے تھپیڑوں کا نشانہ، ہچکولے کھاتی ہوئی ڈوبتی ہوئی مرتی ہوئی۔۔۔ ایک بے بس وجود کا
!SOS
صبح کو بچوں نے بتایا کہ کتے کا پلّا ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں کھا کھا کر مر گیا۔
کسی کو اس کی موت کا افسوس نہیں تھا۔ صرف طاہر علی کو بہت دنوں تک سماجی انصاف کا کلیدی نکتہ یاد آتا رہا، اور کتے کے پلّے کی چیخ سنائی دیتی رہی!!



قسط نمبر ۱۹

سریندر پرکاش

۴/۴ بھگوان آشرم، بیسن، بوگا مارگ، کالینا، بمبئی ۹۸

فسانے

سرکار انگریزی کے ساتھ بھی سرکار لاہور کے دو ایک معاملے ایسے ہو گئے کہ راجہ ہیرا سنگھ سرکار انگریزی سے بھی ناراض ہو گیا۔ ایک یہ کہ گاؤں موٹان نام سرکار نابھہ کی عملداری میں تھا چونکہ راجہ کا ایک عزیز رہنا سنگھ نام مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں معزز عہدہ پر نوکر تھا اس کی جاگیر میں وہ گاؤں اپنی طرف سے راجہ نابھہ نے دیا ہوا تھا اس وقت اگرچہ وہ تمام علاقہ سرکار انگریزی کی حفاظت میں اور حکومت میں تھا مگر اس کی اطلاع انگریزوں کو نہ تھی۔ بارہ تیرہ برس کے بعد راجہ نابھہ کسی کام سے کسی سبب سے رہنا سنگھ پر ناراض ہو گیا اور اس نے وہ گاؤں ضبط کر کے اس کا مال و اسباب لوٹ لیا اس بات کا استغاثہ رہنا سنگھ نے سرکار لاہور میں کیا۔ دربار لاہور سے بذریعہ وکیل صاحب ایجنٹ کی خدمت میں یہ پیغام پہنچا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چونکہ اطلاع اس امر کی سرکار انگریزی کو نہ تھی اور رہنا سنگھ کا نام کسی ستلج کے جاگیرداروں میں نہ تھا سرکار انگریزی نے اس میں دست اندازی نہ کی۔ اور لکھا یہ معاملہ باہمی رہنا سنگھ اور راجہ نابھہ کا تھا اس بات پر اہالیان دربار لاہور میں انگریزوں کی شکایت تھی۔ دوسرا یہ کہ راجہ سوچیت سنگھ کا پندرہ لاکھ روپیہ نقد فیروزپور میں ایک شخص کے پاس تھا اور وہ اس واسطے اس روپیہ کو وہاں لے گیا تھا کہ بوقت مہم کابل کے نواب گورنر جنرل بہادر نے بھی ستلج کے رئیسوں سے روپیہ قرض سودی لیا تھا اور اس نے بھی چاہا تھا کہ انگریزوں سے دوستی قائم کرنے کے لئے ان کو یہ روپیہ قرض دوں گا مگر پھر روپیہ قرض دینے کا موقع نہ ہوا اور وہ روپیہ وہاں ہی رکھا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جب راجہ سوچیت سنگھ لاہور میں ہی مارا گیا تو اس کے نوکر جو اس راز سے واقف تھے اور سند روپیہ کی جوان کی تحویل میں تھی لے کر وہاں جا پہنچے اور روپیہ لے لیا سرکار انگریزی کو عین وقت پر کسی نے خبر کر دی اور خزانہ روک لیا گیا اور ملازم واپس آ گئے۔ جب راجہ ہیرا سنگھ کو یہ خبر پہنچی تو راجہ نے دعویٰ اس بات کا پیش کیا کہ خزانہ بموجب سال سرکار لاہور کا ہے ایک تو یہ کہ راجہ سوچیت سنگھ لاولد مر گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسرے اس نے سرکشی کی اور برخلاف سرکار لاہور کے مستعد بجنگ ہو کر آیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سرکار انگریز نے اس بات پر التفات نہ کیا اور راجہ سوچیت سنگھ کی سرکشی کو سرکار کی سرکشی تصور نہ کیا بلکہ اس کو باہمی عداوت چچا بھتیجے کی قرار دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

معراں سنگھ جو آوردہ دست پروردہ راجگان جموں کا تھا اس نے بھی اس خاندان سے علیحدگی اختیار کی اور رانی جنداں والدہ مہاراجہ دلیپ سنگھ سے رابطہ ارادت کا ایسا پیدا کیا کہ رانی اس کے کہنے میں آ گئی۔ وہ بھی ہر وقت رانی کو پنڈت جلا کی طرف سے ایسی باتیں پہنچاتا تھا کہ جس سے وہ سخت دشمن پنڈت جلا کی ہو گئی اور فی الحقیقت پنڈت جلا نہایت بدزبان آدمی تھا۔ بعض اوقات وہ مہارانی کی نسبت بھی ایسے ناشائستہ کلمے کہہ دیتا تھا کہ جس سے تمام اراکین دربار ناراض ہو جاتے تھے اور سردار جواہر سنگھ مہارانی کے بھائی کو تو وہ برسر دربار بے عزت کر دیتا تھا۔ جب ایسی حالت ہونے لگی تو مہارانی اور سردار جواہر سنگھ نے پھر سکھان فوج کو بگڑایا اور تمام فوج اس بات پر مستعد ہو گئی کہ راجہ ہیرا سنگھ پنڈت جلا کو معزول کر کے دربار سے نکال دو۔ تمام اراکین دربار بھی اس بات کے ممد و معاون ہوئے مگر مہاراجہ ہیرا سنگھ کو پنڈت جلا کی جدائی ہرگز منظور نہ تھی اور فوج کا پیغام بھی پے در پے پنڈت جلا کے نکالنے کے لئے پہنچتا تھا اس سے راجہ ہیرا سنگھ کو یقین ہو گیا کہ اب فوج درصورت نہ علیحدہ کرنے پنڈت جلا کے میری جان کی دشمن ہو گئی ہے مجھکو وہ ہرگز زندہ نہ چھوڑے گی آخر وہ ۲۱ دسمبر ۱۸۴۴ء کو لاہور سے بھاگ جانے پر مستعد ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب سولاری دریا راوی کے قریب پہنچی تو سکھان فوج کو خبر ہو گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سنتے ہی سوار و پیادہ فوج توپ خانے کر اس کے تعاقب کو دوڑی اور پانچ میل کے فاصلہ پر جا کر گھیر لیا اس وقت جب فوج سکھان نزدیک پہنچے تھے راجہ ہیرا سنگھ ایک روپیہ اشرفی کا بکھیر دیتا تھا اور سکھ لوٹنے میں مشغول ہو جاتے

تھے پھر وہ آگے بڑھ جاتا تھا آخر اس طرح پانچ میل کا فاصلہ طے کیا آخر وہ دولت کب تک وفا کرتی۔ سکھوں نے چاروں طرف سے ان کو گھیر لیا اور وہ ہاتھیوں ...... سے اتر کر پیادہ ہو گیا اور تلواریں لے کر سکھوں پر پل پڑے۔ جس طرف وہ جاتے تھے سکھوں کو بھگا دیتے تھے آخر پانچ چار آدمیوں کا کیا وجود ہے سب سے اول پنڈت جلا نے آگے بڑھ کر جان دی پھر سوچیت سنگھ اور لابھ سنگھ مارے گئے پھر راجہ ہیرا سنگھ پر نوبت آئی ...

راجہ ہیرا سنگھ کے قتل کے بعد سردار جواہر سنگھ وزیر و مدار المہام سلطنت کا قرار پایا ...... اور مہاراجہ لال سنگھ کو راجگی کا خطاب دے کر انتظام مملکت میں اپنے ساتھ شامل کیا ...... اس وقت سب اہالیان دربار کی نظر راجہ گلاب سنگھ کی دولت مندی پر تھی اور چاہتے تھے کہ اس سے بھاری رقم روپیہ کی وصول کی جائے۔ چنانچہ سکھان فوج کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ جموں پر یورش کر کے راجہ گلاب سنگھ سے روپیہ وصول کریں ......

جب فوج علاقہ جموں میں داخل ہوئی ایک لڑائی راجہ گلاب سنگھ کی فوج کے ساتھ بہت اچھی ہوئی مگر آخر کو راجہ گلاب سنگھ نے سکھوں کو انعام و اکرام و ضیافت دے کر راضی کر لیا سکھوں نے جو احکام دربار لاہور کے اس کو پہنچائے وہ اس نے منظور کیے۔ ایک تو یہ کہ راجہ سوچیت سنگھ کی کل جائداد وہ سرکار لاہور کے حوالے کر دے گا۔ دوسرے راجہ دھیان سنگھ و ہیرا سنگھ کی جائداد جس قدر جموں میں ہے وہ تمام و کمال حق سرکار لاہور کا متصور ہوگا۔ تیسرے اب جس قدر روپیہ از روئے حساب اس کے ذمہ نکلے گا وہ ادا کرے۔ آئندہ سال بسال چھتیس لاکھ روپیہ سالانہ بابت خراج علاقہ کوہستان کے دیا کرے گا۔ چونکہ فیصلہ زربقایا کا سوائے حاضری راجہ گلاب سنگھ کے بمقام لاہور میں مشکل تھا بلا تامل وہ ..... سکھوں کے ہمراہ ہو لیا۔ لاہور میں پہنچا۔ اس کے لاہور پہنچنے پر سکھوں کے خیالات بدل گئے اور چاہا کہ راجہ گلاب سنگھ بڑا نااہل کار ہے اور دولت مند سردار ہے۔ اگر یہ وزیر ہو جائے تو بہتر ہے ... یہ خبر جب سردار جواہر سنگھ و راجہ لال سنگھ کو ہوئی چاہا کہ جلدی سے اس کو لاہور سے نکال دیں۔ چنانچہ اڑسٹھ لاکھ روپیہ زربقایا کا اس کے ذمہ نکال کر بہ تقرر اقساط تمسک لکھا تھا اور راجہ سوچیت سنگھ اور راجہ ہیرا سنگھ کے ملک و املاک جاگیر کے واپس دینے کا تحریری وعدہ دے کر اس کو لاہور سے رخصت کر دیا گیا۔ راجہ گلاب سنگھ نے بھی اسی وقت لاہور سے نکلنا غنیمت جانا کیونکہ لاہور کی خون خوار وزارت پر متقرر ہونا تو اس کو منظور ہی نہ تھا .....

لال سنگھ درپے اس بات کے تھے کہ خود وزیر بن جائے۔ اس نے سکھوں کو بہت بھڑکایا اور خبر دی کہ سردار جواہر سنگھ انگریزی علاقہ میں بھاگ جانے کو تیار ہے اس واسطے سکھوں نے سردار جواہر سنگھ کو واسطے جواب دہی قتل پشورا سنگھ کے چھاؤنی فوج میں بلایا۔ اس بات پر رانی جنداں اس کی ہمشیرہ نے بہت عذرات پیش کیے اور چاہا کہ کسی طرح غضب فوج کا فرو ہو مگر نہ ہوا۔ آخر ۲۱ ستمبر ۱۸۴۵ء کو دو بجے کے وقت سردار جواہر سنگھ مہاراجہ دلیپ سنگھ کو گود میں لے کر اور اپنی ہمشیرہ رانی جنداں کی ہمراہی میں سوار ہو کر فوج میں گیا جب پلٹن میں پہنچا سکھان پیک اجل کی طرح اس پر آن پڑے اور ہاتھی پر چڑھ کر مہاراجہ دلیپ سنگھ کو اس کی گود سے لے کر ایک خیمہ میں لے گئے اور اس کو ہاتھی کے اوپر بیٹھے ہوئے قتل کر ڈالا ......

دوسرے روز جب جنازہ سردار جواہر سنگھ کا نکلا اور دو زوجہ اور چار کنیزیں اس کے ساتھ ستی ہونے کو نکلیں تو سکھان فوج بھی آموجود ہوئے اور ستی ہونے والی عورتوں پر کمال دست اندازیاں کیں ان کے زیورات اتار لیے اور ان کے کانوں کی بالیاں اس زور سے کھینچی کہ ان کے کانوں سے خون کے فوارے جاری ہوئے ....

سردار جواہر سنگھ کے قتل کے بعد عہدہ وزارت کا کسی ارکان سلطنت نے منظور نہ کیا اور نہ افسری فوج کی کسی کو منظور ہوئی اس وقت فوج اور الاکین کی تجویز سے راجہ گلاب سنگھ کو لاہور میں بلایا گیا مگر ایسے وقت میں وہ کب آتا تھا اس وقت مہارانی جنداں خود دربار کرتی تھی اور احکام عموماً پنچ کی تجویز سے جاری ہوتے تھے۔ اور تمام الاکین سلطنت فوج سے ایسے ترساں و لرزاں تھے کہ ہر ایک دم کو دم آخریں سمجھتے تھے۔ [جاری]

بقیہ صفحہ ۵ عصری افسانے کی بکھری ہوئی پتیاں

یہ طریقہ پاکستانی نئے افسانہ نگاروں نے قبول نہیں کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں کرداروں کی زندگی اور ان کی سچی زبان کے بہ رنگ اور ہمہ جہت اشارے زیادہ بھرپور اور کامیاب ہیں۔ اور ہمیں افسانے کی اصلی "زمین" سے جس حد تک جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہندوستانی نئے افسانوں میں یہ عناصر کم ہیں۔ افسانے کے سنجیدہ قارئین اور نقادوں کو ایک مرتبہ پھر نئے اردو افسانے کے خدوخال، لب و لہجہ اور اس کی روش کا تجزیہ کرنا چاہیئے۔

نئی نفسیات نئی شعری کائنات

تنہا ہونے کی کوشش میں



حامد اکمل

جب تم
تنہائی کا قصہ کہتے ہو
تنہا نہیں ہوتے
ساتھ تمہارے
میری یادیں
میری باتیں ہوتی ہیں
ان سب کے موجود عدم سے گھبرا کر
تم خود کو تنہا کہتے ہو

میرا غم خلوت ہے
جہاں میں تنہا ہونے کی کوشش میں
خود سے باتیں کرتا ہوں
اور کوئی۔ اپنے کو مخاطب جان کر
خوش ہوتا رہتا ہے
کون ہے وہ؟
تنہائی کا غم
یا کوئی انجان مسرت
جس کے لئے ہم سرگرداں ہیں
اپنا آپ گنوا کر
جانے کس کی باتیں کرتے ہیں

چاند تیرا ہم سفر

چاند تیرا ہم سفر ہے
میرا ہم بستر نہیں
تمتماتے سورجوں کے درمیاں
خنک گھاٹی کا تصوّر
بے عمل لذّت کا خواب
دور جلتی بستیوں کے لوگ
اب بھی نوحہ خواں
ماتم کناں
ہیں ہمارے منتظر
۔ آخرِ شب کے قریں
چاند ان کا ہمنوا ہے

آج کی رات ہوئی پردیسی

آج کی رات ہوئی پردیسی
منزلیں، دور، بہت دور ہوئیں
راستہ، رات کی باہوں میں
کہیں۔ کھو سا گیا
دور ہی دور۔
بہت دور ہوئیں
منزلیں کس کو پتہ کس لئے مجبور ہوئیں
جانے کیوں ظلمت ہوئیں
منزلیں دور بہت دور ہوئیں
آج کی رات ہوئی۔
پردیسی

رُت بدل گئی

رُت بدل گئی تو
دیر تک
تھی سمیٹتی رہی پلک پلک
سفیر خواب کے
کسی دیار میں
تھکن اتارنے لگے
فصیلِ درد سے پرے
تمہیں۔
ہمارے نام سے پکارنے لگے

● ایڈیٹر ہفت روزہ "ایقان" عثمانیہ مسجد، کھاری باؤلی، مومن پورہ گلبرگہ - ۵۸۵۱۰۴





محبوب عالم

◆

اس زمیں کے غم کا سدِّباب ہوتے جا رہے ہیں
آسماں کے ہاتھ ہم مضراب ہوتے جا رہے ہیں

رات بھر تقدیر سے الجھے ہوئے تھے کس لئے ہم
صبح کاذب ہی سے کیوں بے تاب ہوتے جا رہے ہیں

صرف دھرتی ہی نہیں ہے برف جیسی دھند میں گم
مہر و انجم، آسماں بے آب ہوتے جا رہے ہیں

تشنگی بھٹکا رہی ہے کن سرابوں میں کہ ہم بھی
لڑکھڑاتی راہ میں سیراب ہوتے جا رہے ہیں

بٹ گئے تھے جو ضرورت بھر ہماری بستیوں میں
وہ خزانے آنکھ کے سیلاب ہوتے جا رہے ہیں

اپنی بے فیضی سے کیسے بحر و بر سمٹ کر
ٹاپو زیرِ آب یا تالاب ہوتے جا رہے ہیں

گفتگو میں لفظ پر محبوب رکھو احتیاط
شربتوں کے جام بھی زہراب ہوتے جا رہے ہیں

◆

نگاہ حسن کی پرچھائیوں کے پیچھے ہیں
ہم اپنی روح کی تنہائیوں کے پیچھے ہیں

مچی ہوئی ہے قیامت عجیب دنیا میں
ہم اپنے وقت کی دانائیوں کے پیچھے ہیں

سروں میں آگ بھری ہے کہ شہر جل جائے
عجیب لوگ ہیں شہنائیوں کے پیچھے ہیں

اسی بہانے ہمارے لہو میں جان تو ہے
کہ پربتوں میں چھپی رائیوں کے پیچھے ہیں

ہر ایک جست مری حوصلوں کی داد میں ہے
لہو نشان قدم گھاٹیوں کے پیچھے ہیں

ہمارے سامنے محبوب لفظ دریا ہے
بہت ہی کم ہیں جو گہرائیوں کے پیچھے ہیں

◆

عکس در عکس سلسلہ ہوگا
آسماں سر پہ ٹوٹتا ہوگا

رات بھر محو خود کلامی تھا
میرے کمرے میں بھی خدا ہوگا

آج تنقید سخت کر آئے
کل سے ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوگا

قول پھر آئے گا تری خاطر
سامنے خود ترا کہا ہوگا

ٹوٹتی ہیں مکاں کی دیواریں
قرب کا فاصلہ بھی کیا ہوگا

رات کھڑکی پہ چاند اترا تھا
دل سمندر کا جل رہا ہوگا

بیچ آیا نگاہ کا جوہر
خواب آنکھوں کے دیکھتا ہوگا

لفظ محبوب منتخب کر دو
شعر ہیرے کے آب کا ہوگا

● الف / ایل ۔ ۱/۷ چیتا کیمپ، ٹرامبے ۔ بمبئی نمبر ۴۰۰۰۸۸





خورشید اکبر

حکمرانی بیاں سے باہر ہے
بے بسی اب مکاں سے باہر ہے

درد کا ذائقہ بتاؤں کیا
یہ علاقہ زباں سے باہر ہے

ایک سجدہ ہے اپنی مرضی کا
وہ ترے آستاں سے باہر ہے

دھوپ چاہے شدید ہو جتنی
آپ کے سائباں سے باہر ہے

ایک مٹھی زمیں کی خواہش بھی
سرحد آسماں سے باہر ہے

گھٹن کی میز پر تازہ لطیفہ چھوڑ جانا ہے
نئے تیور سے جینے کا سلیقہ چھوڑ جانا ہے

خوشامد اس کی رگ رگ میں لہو بن کر مچلتی ہے
اب اس کے ہر نوالے میں قصیدہ چھوڑ جانا ہے

منافق توقت کی زد میں ہے کیسے امن کا مکہ
مہاجر حوصلوں کو پھر مدینہ چھوڑ جانا ہے

خدا کے نور کو نام و نسب میں بانٹنے والے
مجھے تیرا یہ تقسیمی قبیلہ چھوڑ جانا ہے

مہذب شہر کے خاکی درندے جاگ جائیں گے
مجھے افواہ کا بس ایک فلیتہ چھوڑ جانا ہے

سناؤں درد کیسے داشتہ مرادوں کا
تمام شہر کھلونا ہے شاہ زادوں کا

وزیر قید ہوا اب تو شہ کی باری ہے
بڑھا چڑھا ہے مگر حوصلہ پیادوں کا

بساطِ خواب! تجھے ٹاٹ تک نصیب نہیں
یہ کیا صلہ ہے ترے ریشمی ارادوں کا

تصورات سے عاری ہے الگنی دل کی
کہیں تو ذکر چلے بھیگتے لبادوں کا

یہ اور بات کہ ہم ہیں غلام فطرت لوگ
مگر دماغ ملا ہے رئیس زادوں کا

تری مرضی کا پیادہ نہیں ہونے والا
میں گنہگار فرشتہ نہیں ہونے والا

مرثیہ ہوں میں غلاموں کی خوش الحانی کا
شاہ کے حق میں قصیدہ نہیں ہونے والا

شہر کو پھونک دو افواہ کی چنگاری سے
خود سے روشن یہ فلیتہ نہیں ہونے والا

خون سے لکھی ہوئی تحریر غنیمت ہے یہاں
ایک بھی چہرہ صحیفہ نہیں ہونے والا

اپنے ہی گھر میں مہاجر کی طرح جی لیں ہم
اب کوئی شہر مدینہ نہیں ہونے والا

معرفت: بک امپوریم، سبزی باغ - پٹنہ ۴ - ۸۰۰۰۰



شفق سوپوری

◆

ہم نے برسرِ آتش پیکر رقص کیا
سائے نے پسِ دیوار و در رقص کیا

ہم نے جنوں میں ساری رسمیں توڑی ہیں
ہم نے گلوں کے مرجھانے پر رقص کیا

ہم نے آگ لگا دی سارے خیموں میں
ہم نے جرس کو ساز بنا کر رقص کیا

ہم نے پیارے خنجر رکھے ہونٹوں پر
ہم نے فرشِ گل کے اوپر رقص کیا

ہم نے چشم از شبنم شامل ماتم کی
ہم نے دل با سروِ صنوبر رقص کیا

کیا جانے وہ نغمہ تھا یا نوحہ تھا
ہم نے ساری رات برابر رقص کیا

شمع، دھواں، شعلہ، پروانہ اور محفل
تیری خاطر منظر منظر رقص کیا

◆

شہر گھر سا خراب کچھ دیکھا
پھر نظر نے سراب کچھ دیکھا

بول اے وحشتِ در و دیوار!
سایۂ تن نے خواب کچھ دیکھا

کون تھا وہ فصیل کے پیچھے
آج شب، ماہتاب! کچھ دیکھا

ساتویں در پہ رک گئے تم بھی
تم نے بھی محوِ خواب کچھ دیکھا

اک محل جو بنا ہے پتھر کا
جس کی چھت ہے حباب کچھ دیکھا

دیکھ لی بے نیازیٔ عشق
تیغ کو صرفِ آب کچھ دیکھا

ماں!

ماں!
تو رات کی گھنی
بارش کا جنگل
میں
دوپہری کی دھوپ کا مسافر

ماں!
میں پرکٹی دھوپ کا
ضعیف سایہ ہوں
تو مجھ کو
اونچے پہاڑ کی
پہلی سیڑھی پر
کب تک روکے گی

کشتیوں کا شہر

وہ بہت ہی دور اندیش تھے
انھوں نے کشتیوں کو اپنے
آنگنوں میں باندھ کر
اونچے مکانوں کی آخری
منزلوں میں پناہ لی
پھر ہواؤں کی ایک شام
پانی چھتوں کو پھاڑ کر
رات بھر سیڑھیاں اترنے لگا
سرِ صبح وہ اپنے
بے نم صحنوں میں
سبھی کشتیاں سلامت دیکھ کر
پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے

● شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل، سری نگر (کشمیر)



معصوم نظر

◆

پانی کے اس بہاؤ میں رختِ سفر نہیں
ٹھہروں گا میں کہاں مجھے یہ بھی خبر نہیں

آکر اندھیری راہ میں جگنو کرے سوال
کیا کارواں کے ساتھ کوئی راہ بر نہیں

پنجرے سے چھوڑ کے انہیں اوپر اچھال دو
اڑتے ہوئے پرندوں کا مذبح! یہ گھر نہیں

ٹکرا رہا ہے رات کی دیوار سے یوں ہی
لیکن تری نگاہ میں خوابِ سحر نہیں

کب مشکلوں کی قید سے آزاد ہوگی روح
زندانِ جسم و جاں میں کوئی شور و شر نہیں

طے کر چکا تمام محبت کی منزلیں
پہنچا وہاں جہاں پہ کسی کا گذر نہیں

◆

آکے ملتی ہی نہیں کوئی نہر دریا میں
منفعل ہوگئی گھبرا کے لہر دریا میں

موج در موج اٹھی ہیں یہ صدائیں کیسی
آرزوؤں کے بھنور ہیں یا قہر دریا میں

کٹ رہی ہیں یہ کناروں کی چٹانیں ساری
گھل گیا کیسی عداوت کا زہر دریا میں

ایک تصویر سی بن کے یوں ہی ٹوٹ گئی
اک ابھرتی ہوئی آئی تھی لہر دریا میں

گہرے پانی میں اتر کے یہ خیال آیا تھا
جیسے کہتا ہو کوئی اب نہ ٹھہر دریا میں

◆

روز اٹھتا تھا مرے دل میں دھواں اب نہ رہا
وہ مرا شہر وہ امید مکاں اب نہ رہا

تیر جس سمت سے آیا تو بدن میں ہی بنا
بے رحم کھینچتا رہتا تھا کماں اب نہ رہا

میرے ہاتھوں سے تو قسمت کی لکیریں بھی مٹیں
جو اترتا تھا مقدر بھی یہاں اب نہ رہا

آرزوؤں کے شجر سائے میں رہنے دے مجھے
درد کی دھوپ میں جلنے کا سماں اب نہ رہا

اب بھی معصوم سی آنکھوں کے ہرن پیاسے ہیں
جلتے صحرا میں کوئی آبِ رواں اب نہ رہا

● شاہ منزل، لال پورہ، ڈونگرپور - ۳۱۴۰۰۱ (راج)



شارق کیفی

برسوں جنوں صحرا صحرا بھٹکاتا ہے
گھر میں رہنا یوں ہی نہیں آجاتا ہے

پیاس اور گرد کے عادی ہو جاتے ہیں ہم
جب تک دھوپ کا کھیل سمجھ میں آتا ہے

موت بھی اک حل ہے تو مسائل کا لیکن
دل یہ سہولت لیتے ہوئے گھبراتا ہے

عادت ہی سو پکار لیا اُس کو، ورنہ
اتنے کرب میں کون کسے یاد آتا ہے

اک تم ہی تو گواہ ہو میرے ہونے کے
آئینہ تو اب بھی مجھے جھٹلاتا ہے

اف یہ سزا یہ تو کوئی انصاف نہیں
کوئی مجھے مجرم ہی نہیں ٹھہراتا ہے

کیسے کیسے گناہ کئے ہیں خوابوں میں
کیا یہ بھی میرے ہی حساب میں آتا ہے

ایک مدت ہوئی گھر سے نکلے ہوئے
اپنے ماحول میں خود کو دیکھے ہوئے

ایک دن ہم اچانک بڑے ہو گئے
کھیل میں دوڑ کر اُس کو چھوتے ہوئے

سب گذرتے رہے صف بہ صف پاس سے
میرے سینے پہ اک پھول رکھتے ہوئے

جیسے یہ میز، مٹی کا ہاتھی، یہ گل
ایک کونے میں ہم بھی ہیں رکھے ہوئے

بس بہت ہو چکا آئینے سے گلہ
دیکھ لے گا کوئی خود سے ملتے ہوئے

شرم تو آئی لیکن خوشی بھی ہوئی
اپنا دکھ اُس کے چہرے پہ پڑھتے ہوئے

زندگی بھر رہے ہیں اندھیرے میں ہم
روشنی سے پریشان ہوتے ہوئے

وار پر وار کر رہا ہوں میں
کچھ زیادہ ہی ڈر گیا ہوں میں

راستے بھر نہیں کھلا مجھ پر
یہ کہ اتنا تھکا ہوا ہوں میں

اُف اداسی یہ میری آنکھوں کی
کس قدر جھوٹ بولتا ہوں میں

جارحانہ سے ہیں مرے تیور
جب سے دیوار سے لگا ہوں میں

وقت کی گہری کھائی ہے نیچے
اور کنارے ہی پہ کھڑا ہوں میں

اجنبیت کی ہے فضا ہر سو
آئینوں کے لئے نیا ہوں میں

طنز تو دوسرے بھی کرتے ہیں
صرف خود سے ہی کیوں خفا ہوں میں

مکان نمبر - ۱۳۲، گڑھی راؤ بہار سنگھ، بریلی (یوپی)



پرویز اختر

اک امتحاں کا دریا عبور کرنا ہے
شکستہ ناؤ ہے اور پار بھی اترنا ہے

اب اور کوئی بھی ہجرت ہمیں قبول نہیں
یہیں پہ جینا ہے ہم کو یہیں پہ مرنا ہے

ابھی سراغ کہاں ہے کسی بھی منزل کا
ابھی تو آگ کے دریاؤں سے گذرنا ہے

اک آفتاب کی مانند ہے حیات مری
اِدھر تو ڈوب رہا ہوں اُدھر ابھرنا ہے

تجھے ملال کا موقع ذرا نہیں دوں گا
ترے زوال کا سودا مجھی سے کرنا ہے

◆

ساتھ ہیں میرے ماں کی دعائیں
ندی، نالے، پربت آئیں

آپس میں سب بھائی، بھائی
آؤ چلو اک سوانگ رچائیں

گھر، دنیا اور تیری تمنّا
ایک نفس اور کتنی بلائیں

پیار، وفا، ایثار، محبت
تاریکی میں دیئے جلائیں

جھوٹی امیدوں پہ آخر
کب تک اپنا جی بہلائیں

◆

جاں کے لئے آزار ہوئے
سب رشتے بیوپار ہوئے

مت پوچھو حالات مرے
دو دھاری تلوار ہوئے

اب جنگل کا رستہ لے
شہر بہت خونخوار ہوئے

پہلے دنیا تھی اور اب
ہم دنیا پر بار ہوئے

ہو نہ پایا کچھ ہم سے
شاعر آخر کار ہوئے

◆

دوہے

اک کو سوکھی روٹیاں، دوجا کھائے کھیر
دونوں کی ماں ایک ہی، الگ، الگ تقدیر

بیوپاری ہر آدمی، ہر ناتا بیوپار
ایسے کیسے ہو بھلا، دنیا کا اُدھار

دنیا کی کیا سوچتے، رہی نہ اپنی کھوج
اپنے ہی پریوار کا، اٹھا نہ ہم سے بوجھ

کیا تجھ کو معلوم ہے، لالچ کا اتہاس
سرمایہ جتنا بڑھے، بڑھتی جائے پیاس

ہنس نے چن لی سیپیاں، روٹی کھا گیا کاگ
سورج سر پر آ گیا، جاگ ابھاگے جاگ

● محلہ آت اصفی سرائے چاند پور ۔۔ ۲۴۶۷۲۵ ۔ یوپی)



رفیق اعظم

آنے والے وقت کی بنیاد کہاں رکھی جائے

کوئی بتلائے
آنے والے وقت کی بنیاد کہاں رکھی جائے ؟
دیہاتوں میں ؟
جہاں
سہارے کے لئے
لوگ
اندھیرے میں
اپنی پرچھائیں کھوجتے ہیں ؟
یا !
فلک بوس شہروں میں ؟
جہاں
سہارے کے لئے
لوگ
روشنی میں
اپنی پرچھائیں سے ڈرتے ہیں ؟
کوئی بتلائے !
آنے والے وقت کی بنیاد کہاں رکھی جائے ؟؟

ایک نظم

زنگ آلود
بکس میں
پڑی ہوئی
استعمال شدہ
تارتار پھٹی زندگی میں
پیوند لگا کر
پھر سے استعمال کرنے کی سوچ رہا تھا میں
بکس جو کھولا
تو اسٹیل کی پلیٹ نئی ملی
پوچھا تو پتہ چلا
زندگی سے بدل لی گئی ہے ۔

تھکی تھکی سی ہے زندگی

تھکی تھکی سی ہے زندگی
تھکا تھکا سا ہوں میں
جلتی سخت دھوپ ہے
درخت سوکھے شاخیں ننگی
گرم چاند تاروں کی رات ہے
ویرانے میں کہیں چھاؤں ملتی نہیں
تلوے سے خون رستا ہے
پھر بھی پانی کا چشمہ پھوٹتا نہیں
تپتے صحرا میں چلتے چلتے
جھلس گئی ہے زندگی
جھلس گیا ہوں میں

زندگی چاہتی ہے فرار مجھ سے
میں زندگی کو چاہتا ہوں
زندگی کا ہنگامہ ہے ہر سو
زندگی ہے گامزن انحراف کی طرف
جنس سیاست شاعری کھینچے ہے مجھ کو اپنی طرف
تھکی تھکی سی ہے زندگی
تھکا تھکا سا ہوں میں

● محلہ رتن پورہ ، اوجھا ٹولی نزد اندرا جگ جیون اسکول ، اچھپورہ — ۸۴۴۱۳۰۱





عفت زریں

مری تنہائی مجھ کو سن رہی ہے
اکیلی آرزو، کچھ بُن رہی ہے

سب کچھ بھی ہوا اُس سے روٹھنے کا
مگر اکثر اُسی کی دُھن رہی ہے

اسے بھی زندگی کی ہے تمنّا
جو لڑکی پھول بن میں چُن رہی ہے

وہ آئینے کی باتیں جھوٹ ہونگی
مگر دل میں یہی سُن گن رہی ہے

اب آنکھیں موند کر زریں یہ سوچو
اداسی کس لئے سر دُھن رہی ہے

بُت سب ٹوٹ چکے دستِ ہنر باقی ہے
راستے ختم ہوئے پھر بھی سفر باقی ہے

جس کو چھونا بھی تھا افسردگیٔ جاں کا علاج
دل کے صحرا میں ابھی تک وہ شجر باقی ہے

جس کی خوشبو سے معطّر تھا میرا لمسِ جنوں
میری آنکھوں میں ابھی تک وہ سحر باقی ہے

اس کو افسانہ نہیں حرفِ تمنّا کہئیے
آئینہ ٹوٹ گیا ہے وہ نظر باقی ہے

ٹوٹ جاتا ہے جہاں جا کے ستاروں کا طلسم
کیا دعائیں، مری اب بھی وہ اثر باقی ہے

جانے وہ کون سی منزل کی طرف لوٹ گیا
ہاں وہ آیا تھا کبھی، اتنی خبر باقی ہے

جو سہہ رہا ہے مسلسل عذاب موسم کے
اُسی کے نام ہوں جیسے حساب موسم کے

حسین یادوں کے چھپکے سے ذہن و دل پہ مرے
یہ کس نے ڈال دیئے ہیں نقاب موسم کے

سلگتے اشکوں میں بھی جیسے اس کی خوشبو ہے
مہک رہے ہیں جو دل میں گلاب موسم کے

نگاہیں اب بھی ستاروں کے پھول چنتی ہیں
اگرچہ ٹوٹ چکے کتنے خواب موسم کے

ہماری روح کے افسانے قید ہیں جن میں
وہی حصار ہیں زریں خراب موسم کے

مکان نمبر ۵۴۳، گلی حکیم جی، چوڑی والان، دہلی — ۶



راشد جمال فاروقی

تمام قضیہ مکان بھر تھا
مکاں کیا تھا، مچان بھر تھا

یہ شہر لاحدّ و سمت میرا
گلوب میں اک نشان بھر تھا

گماں بھر تھے تمام دھڑکے
تمام ڈرامتحان بھر تھا

روایتوں سے کوئی تعلق
جو بچ رہا پاندان بھر تھا

جو جیت تھی ایک مشت بھر تھی
جو شور تھا آسمان بھر تھا

گلزار و سبزہ زار و شجر بھی مرے لئے
یہ رنگ رنگ برگ و ثمر بھی مرے لئے

فصلیں بھی لہلہائیں تو میرے ہی واسطے
زم زم بھی اور لقمۂ تر بھی مرے لئے

سب لامکاں کی وسعتیں، پنہائیاں مری
جنت نما حسین سا گھر بھی مرے لئے

میری سیاہ راتوں کی قسمت میں سب نجوم
اور تابناک شمس و قمر بھی مرے لئے

تسخیرِ کائنات کا حق بھی بس اک مجھے
اور بے پناہ علم و خبر بھی مرے لئے

ترغیب بھی شعور بھی اور انتباہ بھی
اور کارزارِ عیب و ہنر بھی مرے لئے

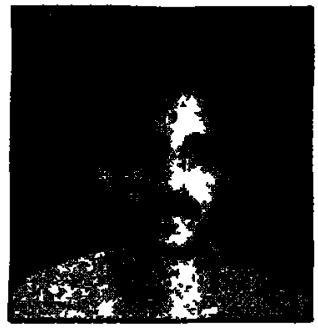
رنگینیاں بھی بوالہوسی بھی گناہ بھی
یعنی جہانِ فتنہ و شر بھی مرے لئے

یہ خوفِ تازہ

میں پہلے جب بھی کبھی ڈرا ہوں
تو اک واضح سی شکل
میرے حواس پہ ناچتی رہی ہے۔
مگر یہ تازہ سا خوف
کتنا ڈراؤنا
کیسا مبہم ہے کیا بتاؤں
کریہہ گینڈے کی جلد جیسا
غلیظ سور کی تھوتھنی سا
کسی اندھیرے مہیب جنگل میں
الوؤں کی پکار جیسا
وہ کہنہ کہنہ سی داستانوں کی ڈائنوں سا۔
اس آکٹوپس کی انگلیوں کا
حصار گھٹتا ہی جا رہا ہے
میں ہوں کہ
بجلی کے ننگے تاروں کے ایک جالے میں پھنس گیا ہوں
فصیلِ ہوش و حواس کی نیو
جیسے دیمک نے چاٹ لی ہے۔

● آئی ڈی پی ایل انٹر کالج، ویر بھدر رشی کیش، ضلع دہرہ دون ۲۴۹۲۰۲





سراج اجملی

پسپا لشکر، جنگ کا میداں میں
اپنے کئے پر پھر بھی نازاں میں

میرے نام کا خطبہ منبر پر
تنہائی میں سر بہ گریباں میں

میرے فن کا واحد پارکھ تو
خلق کی لعنت پھر بھی رقصاں میں

کبھی خود اپنا نام نہ یاد آئے
کبھی کبھی تو مہدیِ دوراں میں

کتھا نگر میں جی گھبرائے اور
تیری خاطر سدا غزل خواں میں

کبھی مسخر سب کچھ اور کبھی
اک ذرّے کو دیکھ کے حیراں میں

سمندروں میں سراب اور خشکیوں میں گرداب دیکھتا ہے
وہ جاگتے اور راہ چلتے عجب عجب خواب دیکھتا ہے

کبھی تو رشتوں کو خون کے بھی فریبِ وہم و گماں سمجھا
کبھی وہ نرغے کو دشمنوں کو ہجومِ احباب دیکھتا ہے

شناوری راس آئے ایسی سمندروں میں ہی گھر بنا لے
کبھی تلاشِ گہر میں اپنے تئیں وہ غرقاب دیکھتا ہے

کبھی تقدس طواف کا سا کرے ہے طاری وہ جسم و جاں پر
سروں پہ گرتا ہوا کبھی لعنتوں کا میزاب دیکھتا ہے

وہ اختتامِ سفر کی ساعت میں حیرتی سا ہر ایک سر پر
غبار و خاشاک راستوں کے بہ شکلِ اسباب دیکھتا ہے

توقعات سے پایا سوا مگر بے سود
ہے دور اب بھی وہ بندِ قبائے سرخ وجود

ہماری وسعتِ قلب و نظر ذرا دیکھو
بہ یک قلم تمہیں بخشا جہان لامحدود

ہمیشہ ہم رہے معتوب صاحبانِ حشم
ہمیں نہ کہنا کبھی حامیانِ عاد و ثمود

ہے آبروئے قلم رہنِ اقتدار کے ہاتھ
تمہارے شہر میں دانش کا کون ہے مسجود

فصیلِ شہرِ ملامت کی پرکشش ترشے
ہمارے نام کا پرچم تھا اب نہیں موجود

وہ ماں کے لہجے میں تیری دعائے نیم شبی
مرے لئے ہوئی وجہ فلاح اور بہبود

ای ۔ ۸۷ / ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۔ ۲۵



احمد محفوظ

◆

لگ دنوں سے یہی خواب دیکھتا ہوں میں
تمام شہر کو بیتاب دیکھتا ہوں میں

ہیں ہے مشق ستم ایک مجھ پہ ہی موقوف
ہواؤں کو بھی سزایاب دیکھتا ہوں میں

یہ اضطرابِ دل بے سبب نہیں اے دوست
کوئی عکس تہہِ آب دیکھتا ہوں میں

کتابِ حال میں کیا کیا لکھا ہے کیا معلوم
ابھی تو سرخیِ ابواب دیکھتا ہوں میں

حجاب آتا ہے خود اپنے رب سے محفوظ
جب اس خرابی کے اسباب دیکھتا ہوں میں

◆

حصارِ وہم سے خود کو نکال، باہر آ
ذرا لباسِ یقیں تن پہ ڈال، باہر آ

تری زباں پہ کب تک یہ مہرِ خاموشی
خیال و فکر کو لفظوں میں ڈھال، باہر آ

اندھیری شب کا یہ منظر بڑا ہی دلکش ہے
فلک پہ دیکھ ستاروں کا جال، باہر آ

بس ایک لمحہ بہت ہے دیا جلانے کو
ابھی ہواؤں میں ہے اعتدال، باہر آ

پکارتی ہے تجھے اجنبی صدا کوئی
رکھ اب کتابِ فراق و وصال، باہر آ

◆

نہیں مانوس حرفِ رہگذر سے
کہ پہلی بار وہ نکلا ہے گھر سے

کئی راہیں نظر کے سامنے تھیں
عجب مشکل ہی تھا جاتا کدھر سے

کسی کو وسعتِ دریا میسر
کوئی اک قطرۂ شبنم کو ترسے

مرا ہی شہر مجھ کو بھول بیٹھا
میں برسوں بعد کیا لوٹا سفر سے

خموشی اس قدر محفوظ کب تک
چلو باتیں کریں دیوار و در سے

◆

آج بجھتے ہوئے شعلوں کو ہوا دیں بھی تو کیا
اب بچا کچھ بھی نہیں شور مچائیں بھی تو کیا

گھپ اندھیرے میں تو پہچان بھی مشکل ہوگی
رات آدھی ہے مگر لوٹ کے جائیں بھی تو کیا

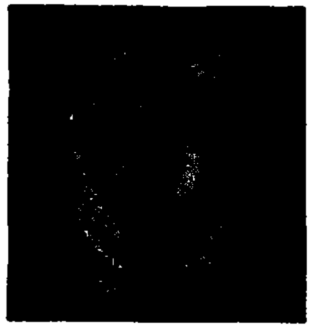
ہو گئی شام تجسس کا سفر ختم ہوا
ایسے پائیں تو کیا اور نہ پائیں بھی تو کیا

شکل بننے نہیں پاتی کہ بگڑ جاتی ہے
کوئی بنتی ہی نہیں بات بنائیں بھی تو کیا

یونہی روشن ہے بہت خانۂ ویراں اپنا
اک چراغ اور سرِ شام جلائیں بھی تو کیا

● ۱۴۳ ـ پیریار ہوسٹل، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی ـ نئی دہلی ـ ۶۷

[redacted] ۳۱



پروین راجہ

◆

بہت حسین زمیں تھی لہو لہان ہوئی
نزولِ حشر میں تو ایک آسمان ہوئی

مرے سکوت نے خوابوں کی داستان لکھی
یہ اور بات ہے آنکھوں سے ہی بیان ہوئی

صدائیں دیتی رہی ساحلوں سے شام کیسے
ہوا کا رخ تھا کدھر ناؤ بے نشان ہوئی

بکھر کے گونج اٹھے دشتِ جاں کے ماہ و سال
مگر وہ ایک ہی ساعت جو مہربان ہوئی

بغیر یاد مرا توشۂ سفر کیا تھا
جہاں جہاں میں گئی دھوپ سائبان ہوئی

◆

دور ساحل پہ ستاروں کی چمک ہے کیسی
خونِ آدم کی نہیں ہے، تو مہک ہے کیسی

کیوں ٹھہر جاتے ہو تم خامشی کے کھنڈر میں
دل کی آواز میں لوگو! یہ کھنک ہے کیسی

لوٹ کر آئیں نہیں برف کے کہساروں سے
تیری دہلیز پہ پریوں کی جھلک ہے کیسی

یاد پھر چاند کے زینے سے اتر آتی ہے
وادیِ خواب میں بے نام کسک ہے کیسی

میں زمیں پر کبھی فاصلے طے کرتی رہی
اب مرے ساتھ شفق سیرِ فلک ہے کیسی

◆

ساری دیواریں گرا دے وہی لشکر چاہوں
ہر نفس روشن و آزاد و معطر چاہوں

اب کے مقتل میں اتر آیا نیا ماہِ مبیں
پر میں کیا کرتی اگر چشم کو بھی تر چاہوں

شب کا آسیب مرے سامنے ایستادہ تھا
صبح سورج کی شعاعوں کا جو منظر چاہوں

کس توقع پہ یہاں آئی سمندر کی ہوا
پاس اپنے بھی رہا کیا جس سے گھر گھر چاہوں

زعفرانوں کی مہک اُس رخِ چناروں کی چمک
پھر اسی خلدِ حسیں کو میں زمیں پر چاہوں

◆

خستہ زندانوں کے باہر نوحہ گر ایسا نہ تھا
رات کی تاریکیوں کا دیدہ ور ایسا نہ تھا

ہر طرف تھا سایہ سایہ تتلیوں کا سائباں
ان چناروں کے تلے خوف و خطر ایسا نہ تھا

اس ہوائے تازہ میں بھی زعفرانوں کی مہک
پہلے بھی کتنا ہی بیخود تھا مگر ایسا نہ تھا

آسماں پر چاند بھی شب بھر صدا دیتا رہا
خطۂ تاریک میں رقصِ شرر ایسا نہ تھا

وادیِ احمر کی کلیوں کے ترانے بجھ گئے
خون میں ڈوبا ہوا میرا نگر ایسا نہ تھا

● بٹ مالو باراں پتھر سری نگر۔ کشمیر ۱۹۰۰۰۹

مکتوب

شاعر قارئین اور محبت بھرے

محبوب جوہر ——— ۱۹۵ علی جند ٹیم لین، رتہ کھوا، نواب پورہ، ہلٹ (بنگلہ دیش)

"شاعر" کا تازہ شمارہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور بے انتہا خوشی بھی۔ حیرت اس وجہ سے کہ ہمیں یہ توقع نہیں تھی کہ ہندوستان سے فی الحال کوئی اردو کا رسالہ منظر عام پر آسکے گا۔ اور وہ بھی بمبئی سے۔ لیکن تازہ شمارہ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ آندھیوں میں بھی چراغ جلانے والے چراغ جلا ہی لیتے ہیں۔ اور خوشی بلکہ بے انتہا مسرت سے ہمکنار ہوا ——— کہ شاعر کا موجودہ شمارہ اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اہم سمجھ اور خاص کر اردو زبان و ادب کے لئے زندہ و پائندہ دل رکھا ہے۔

سید انیس شاہ جیلانی محمد آباد، تحصیل صادق آباد (پاکستان)۔

شاعر ایک ادبی پرچہ ہے۔ اب تو سیاسی پرچے بھی چل کے نہیں دیتے۔ ڈائجسٹ اور "کہانی" کے پرچے ہر سانس لے رہا ہے۔ اردو بہرحال جئے تو جانی ہے۔ آپ کی ہمتوں اور حوصلوں کے کیا کہنے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھ سے عام آدمی کے ذوقِ مطالعہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے شکر گزار ہوں۔ بقول برت شملوی مرحوم "آپ کا لطف، آپ کا کرم"۔

نوید ——— ۱۲۱، سی ماڈل ٹاؤن لاہور (پاکستان)۔

میری پوری کوشش رہتی ہے کہ ادبی مسائل کے لئے خاص کر وہ رسالے جو کھڑی تلواروں تلے چھپتے ہیں، پڑھتی رہوں۔ لیکن کچھ تو عمر کا تقاضا ہے، کچھ حالات دم نہیں لینے دیتے۔ بہرکیف "شاعر" ایسے رسالے ہی اردو کی بقا کا باعث ہیں۔ اللہ آپ کو ہمت دے۔

رنقوی۔ 4104 S LIONS AVE BROKEN ARROW, OK 7400 / USA

شاعر سے میری دلچسپی، تعلق روز افزوں ہے۔ اور بڑی خوشی ہے کہ آپ ایسے ماحول میں شمع ادب روشن کئے ہوئے ہیں۔ صرف اپنی محفل میں چراغاں کرتے ہیں بلکہ دوسروں کی محفلوں کو بھی کرنیں عطا کر رہے ہیں۔ شاعر کا آفاقی احساس کا باعث ہوتا ہے۔ اور ہمارے ادیبوں پر واجب ہے کہ وہ آپ کی اور شاعر کی اعانت کریں۔

ہلال مرادی ——— ۲۰۰ سی ۸۔ بلاک ڈی، نارتھ ناظم آباد، کراچی۔

آپ کی عنایات نے شاعر کو میری عادت بنا دیا ہے۔ میں اسے کسی صورت کھونا نہیں چاہتا۔ اب آپ ہی بتائیے کیا کیا جائے اس کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے اس شوق کی تسکین کے لئے مجھے شاعر بھیجتے رہیئے۔ ممنون ہوں گا۔

مرزا احمد ——— ۳۱۔ ڈی، تیسر کالونی، نذیر روڈ، لاہور۔

آپ کے رسالے کا اپنا ایک خاص انداز ہے۔ اور ایک حلقہ بھی ہے۔ جو جاندار اور کھرا نظر آتا ہے۔ شعری حصہ مجھے خاص طور پر بہت اچھا لگا۔ تنقید کے بارے میں صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ اتنے بہت سے مسائل کے بارے میں ہم تک خبر دیر سے آتی ہے باتیں ہی کتنی ہے تو ظاہر ہے کہ پڑھنے میں لطف

کہاں سے آنے لگے آپ کا مضمون "غزلیہ اور نا تنقیدی سلک" پڑھ کر ندر محنت آتا ہے۔ وہ میرا مکمل ہوا نکلی ہے۔ افسانوں کا مجھے کوئی خاص شوق نہیں۔ لہٰذا یہ میری کمزوری نہیں۔

حنیف اختر ——— 80-22 159TH STREET JAMAICA NEW YORK NY 11432

آپ کے رسالے کے متعلق میرے خیالات اور رائے نیز اہم ہیں۔ لیکن میں آپ کے اس رسالے کو جدید میعاری خیال کرتا ہوں۔ اور یہ رسالے ہندو پاک کے مختلف رسائل سے شاعر کو متعارفاً بہت ہی زیادہ بہتر پانے پر مختصر ہے۔ آپ کی خوشنودی اور ستائش کے لئے نہیں۔

نذیر قیصر ——— ۱۸ ماڈل کالونی، حسکو روڈ، کوٹ لکھپت، لاہور۔

شاعر کے "ہم عصر اردو ادب نمبر" شائع کرنے کا خیال خوبصورت اور پر معنی ہے۔ شعر و ادب میں عصری تقاضوں کی عکاسیاں ہمارے عہد میں جس طرح نمایاں ہوئی ہیں۔ وہ ہماری سماجی، سیاسی اور ثقافتی زندگی کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ جس میں بنیادی تصور کی حیثیت انسان دوستی، امن، آزادی اور محبت کو حاصل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے لکھنے والوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ کم از کم اس "انسان دوست" روایتوں کے حامل خطے کو جنگ، نفرت، اور تعصبات کے ہولناک سایوں سے دور رکھنے کی کوشش کریں۔ امید ہے کہ شاعر اس بشارت کو لوگوں تک پہنچائے گا۔

ادا جعفری ——— ۸۔۴۳ بی بلاک ۶، پی ای سی ایچ سوسائٹی، کراچی — ۲۹

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں اور ہمیشہ خیریت سے رہیں۔ آمین یا رب۔ قلم کے رشتے بہت عظیم ہوتے ہیں۔ میں ان کی قدر کرتی ہوں۔ آپ کے خلوص سے دل خوش ہوتا ہے۔ بمبئی کے حالات کی وجہ سے پریشانی رہی۔ یہ گھر ہر یادہ گھر۔ دعاؤں کے سوا ہمارے بس میں کیا ہے۔ شاعر کا تازہ شمارہ بھی مل گیا۔ شکر گزار ہوں۔

مقصود الٰہی شیخ (مدیر راوی) 282 THORNTON ROAD BRADFORD BD8-8TU

آپ میرے حال پر بہت کرم فرماتے ہیں۔ آپ سے سرخروئی میرا منشور نہیں جانے۔ آپ خود ایک رسالہ نکال رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بے شک یہاں سے وہاں زیادہ اردو داں ہوں گے۔ مگر اخباروں، رسالوں بالخصوص اردو کے بلکہ اردو والوں کی تقدیر ہر جگہ یکساں ہی ہے۔ شاعر کے موجودہ شمارے بہت اچھے ہیں۔ آواز صورت بہت موثر ہے۔ ضمیر کو جھنجھوڑتا ہے۔ اگر کسی کے پاس ضمیر ہو تو۔ خدا ہر طرف خیر و امن رکھے۔ آمین۔

انور نسیم ۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۲ ۳۳ ریاض ۱۱۴۱ (سعودی عرب)

شاعر کا نیا شمارہ ملا۔ اس خوبصورت جریدے کے لئے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اردو سے آپ کی محبت، آپ کا جذبہ اور انتھک کوشش کسی کی تصدیق یا شہادت کی محتاج نہیں۔ اس کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ اردو کی نئی بستیاں نمبر کے لئے ہر طرح سے مدد اور تعاون کے لئے حاضر ہوں۔ آپ ہر ممکن طریقے سے کوشش کریں کہ "نئی بستیاں نمبر" ایک یادگار نمبر بن جائے۔ خلیجی ممالک میں بہت سارے لوگ اردو کے لئے کام کر رہے ہیں۔ خاص طور پر دوحہ قطر اور دبئی میں۔ لیکن میری رائے میں افسوس کی بات یہ ہے کہ برصغیر کے باہر کی تمام ادبی سرگرمیاں اب تک محض مشاعروں تک محدود رہی ہیں۔ اور یہ محض تفنن طبع کا سامان رہا ہے۔ میری رائے میں یہ بے حد ضروری ہے کہ آپ ایسے سنجیدہ لوگ جو مکمل COMMITMENT کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ وہ باہر کے ملکوں میں لوگوں سے مل کر باہمی صلاح و مشورے سے سنجیدہ اور ٹھوس کام کریں۔ اب ۲۱ویں صدی میں زبان کی ترقی اور فروغ کے تقاضے بالکل مختلف ہوں گے اور اس کے لئے سوچ کا انداز بھی بدلنا پڑے گا۔ مثبت تعمیری کام ہی اس سلسلے کا آغاز ہے میری رائے یہ بھی ہے کہ سائنسی انداز فکر اور طریقوں ہی کو اپنانا ہوگا۔ یعنی نئے وسائل، نئی چیزیں۔ اس پر مفصل تبادلہ خیال ہونا چاہئے۔ اور FAX اور CLECTRONIC MAIL کا یہ زبان کی ترقی اس کے بغیر ممکن نہ ہوگی۔ شاعر عالمی اردو جریدہ بن سکتا ہے۔ شاعر اس نوع کے کام کے لئے اپنا ایک مزاج رکھتا ہے جو دوسروں سے مختلف ہے۔

طارق کلیم ——— ۲۳ ای ، ارس چیمبرز، آب پارہ، اسلام آباد۔

شاعر کا تازہ شمارہ ملا تھا۔ اس کی خبر ہفت روزہ "مسلمان" میں لگا دی تھی۔ شاعر ایک خوبصورت ادبی جریدہ ہے۔ نثر و نظم دونوں شعبے قابل ستائش ہیں۔ دعائیں اور مبارکباد۔

ظل آفندی ، پوسٹ بکس نمبر ۳۳ منامہ بحرین (اے جی)

شاعر کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ عرصہ دراز کے بعد شاعر کے شمارے دیکھنے کو ملے، طبیعت خوش ہو گئی۔ شاعر کی تزئین و آرائش کے لئے آپ کے حوصلے اور اقدام یقینی طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ شاعر ایک روایت کا نام ہے۔ اور اب یہ روایت بہت مستحکم ہو گئی ہے۔

جمیل حسن ——— HAGALUNDSGT 42, 7TR 171 50 SOLNA SWEDEN

شاعر کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ خوبصورت انتخاب اور منفرد انداز پیش کش سے دل خوش ہوا۔ علامہ سیماب کی یاد تازہ ہو گئی۔ میں جب ملتان میں زیر تعلیم تھا تو بزم سیماب (ملتان) کے مشاعروں میں اکثر جاتا تھا۔ اس حوالے سے ان کی شخصیت کی یادیں میرے دل میں بھی محفوظ ہیں۔ اردو کی نئی بستیوں کے حوالے سے شاعر کا خاص نمبر یقیناً ایک گرانقدر ادبی خدمت انجام دے گا۔ خدا آپ کو مزید ترقی عطا فرمائے۔ اپنا رسالہ "منزل" شائع ہوتے ہی ارسال کروں گا۔

گلزار بخاری ——— ۱۵ ڈی انگوری باغ، لاہور۔

آپ ایک عظیم ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ادب کی خدمت شاعر کی مسلسل اشاعت کے ذریعے کر رہے ہیں۔ شاعر بہت بڑا ادبی جریدہ ہے۔ مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ سب سے پہلے میرا کلام شاعر ہی میں شائع ہوا۔ میں شاعر اور آپ کے لئے دعاگو ہوں۔

شاعر

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۴واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد — ۶۴
شمارہ — ۳

فون: ۲۵۹۹۰۴

مدیر

افتخار امام صدّیقی

●

معاون

ناظر نعمان صدّیقی

قیمت ۸ روپے

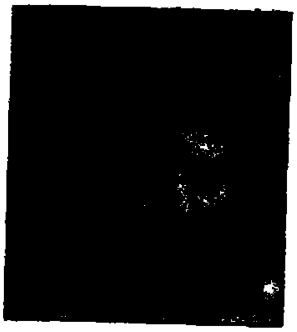
زرِ سالانہ ۶۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۷۵ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

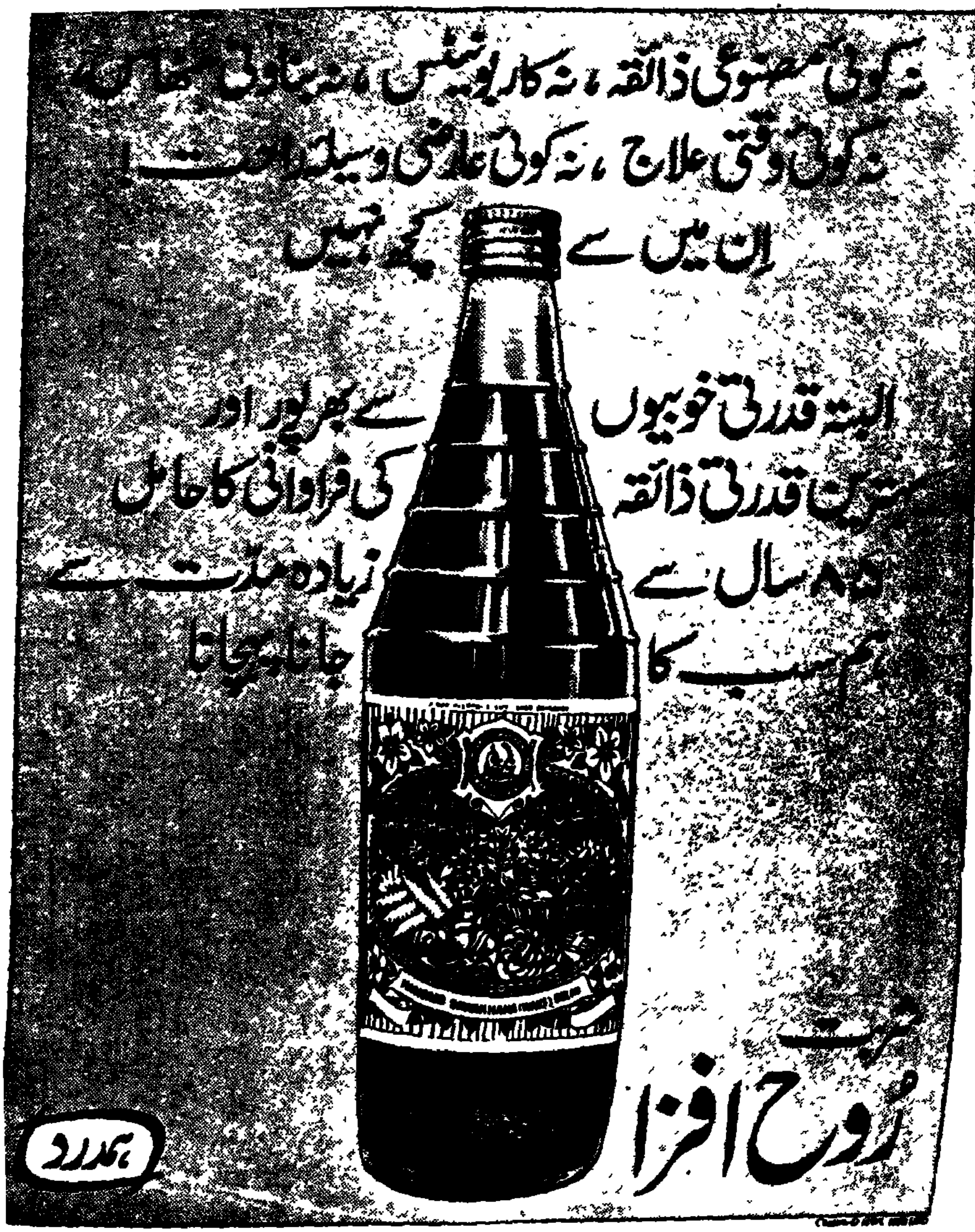
ماہنامہ شاعر مکتبہ قصر الادب بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۸

فکر امروز



جس طرح علم شاعری کے لئے ضروری اور لازمی ہے اسی طرح محبت اور شاعری کو بھی میں لازم و ملزوم سمجھتا ہوں۔ اور خیالات میں تصنّع یا بناوٹ کا حامی نہیں۔ میں خیالات کو صداقت اور محبت پر مبنی دیکھنا چاہتا ہوں اور حقیقی واردات قلب کی ترجمانی میرا مسلکِ بیان ہے۔ گو مجھے تمام اصنافِ سخن پر فطرت نے قدرت دی ہے مگر میں نظم، غزل اور رباعی کو اظہارِ خیال کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ شعری الہامی حیثیت پر میرا ایمان ہے۔ میں شعر میں بلند خیالا کے ساتھ بلند الفاظ کا مؤید ہوں۔ ایسے الفاظ جن میں غرابت نہ ہو اور جنھیں تعلیم یافتہ اصحاب بہ آسانی سمجھ سکیں۔ [شعر الحیات، کلیم عجم]

— سیماب اکبرآبادی



نہ کوئی مصنوعی ذائقہ، نہ کاربونیشن، نہ کیمیاوی مٹھاس،
نہ کوئی وقتی علاج، نہ کوئی عارضی وسیلۂ راحت!
اِن میں سے کچھ نہیں
البتہ قدرتی خوبیوں سے بھرپور اور
بہترین قدرتی ذائقہ کی فراوانی کا حامل
۸۵ سال سے زیادہ مدت سے
ہم سب کا جانا پہچانا
شربت
روح افزا
ہمدرد

ترتیب

سرورق

ساون

عمل

اعجاز مصور

شمارہ نمبر ـ ۳ * جلد ـ ۶۴

محفل اپنی

شاعر کے مشترکہ شمارے

شاعر کا یہ شمارہ (۳-۴) بھی مشترکہ شمارہ ہے۔ سابقہ شماروں کی طرح یہ بھی صرف ایک سرورق کے ساتھ مگر اپنے آپ میں دو علاحدہ شماروں کے روپ میں ہے۔ قطعی مکمل اور جامع۔ بعض خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ قارئین ان مشترکہ شماروں کو ایک ہی شمارہ سمجھ رہے ہیں اور شکایتی خط لکھ رہے ہیں۔ ہم اپنے تمام قارئین کو ایک بار پھر بتانا چاہتے ہیں کہ جو شمارے آپ تک پہنچ رہے ہیں وہ مشترکہ شمارے ہیں۔ یہ ناگزیر عمل دو وجوہ سے ہے۔ بھٹی کے فسادات نے کئی ماہ ضائع کر دیئے اور اب ہم عصر اردو ادب نمبر کی بے طرح مصروفیات۔ سعی مسلسل یہی ہے کہ شاعر کی اشاعتوں میں مزید بے قاعدگی نہ آ سکے۔ رواں سال سے ہم اپنے قارئین کو ۱۲ شمارے اور ان شماروں میں وافر اور منتخب مواد فراہم کر رہے ہیں۔ خاص نمبر کے بعد شاعر کی اشاعتیں ماہ بہ ماہ آپ تک پہنچیں گی۔ ویسے ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ شاعر آپ تک پہنچ رہا ہے۔

ہم عصر اردو ادب نمبر

خاص نمبر کی ترتیب کا کام ایک بار پھر زوروں پر ہے۔ حجم کے اعتبار سے یہ شاعر کے سابقہ خاص نمبروں سے کہیں زیادہ ضخیم ہوگا۔ ایک غیر معمولی کام نہایت ہی نامساعد حالات میں مکمل کرنے کی کوشش ــ مگر یہ خاص نمبر کسی معجزے سے کم نہیں ہوگا۔ ملک اور بیرون ملک سے موصول ہزاروں مسودات کو پڑھنا، منتخب کرنا، جوابات دینا یہ کسی بڑے ادارے اور بہت سارے لوگوں کا معمولی کام ہے۔ جسے ہم تنہا انجام دینے کی سعی کر رہے ہیں۔ اس کا تصور بھی دوسروں کے لئے محال ہوگا۔ ہمیں شکایتی خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ خطوں کا بھی زبردست دباؤ ہے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ منتخب تخلیقات کی اطلاع قلم کاروں تک پہنچے۔ یہ بذات خود ایک بہت بڑا کام ہے۔ اس درمیان غیر مطبوعہ تخلیقات خاص نمبر میں شمولیت کا اصرار خطوں کا تانتا۔ خاص نمبر ہمارے لئے ہر طرح سے ایک چیلنج ہے۔ ہمارے لئے دعا کیجئے گا۔

مکتوبات

شمارہ نمبر ۱ اور ۲ کے مکتوب کی طباعت سے قارئین نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ ایک بہت نمایاں تبدیلی کی گئی ہے۔ جو مستقبل میں ایک بڑی تبدیلی کا خوب صورت اعلامیہ ہے۔ بیشتر قارئین کو مذکورہ کالم کی خفی کتابت سے خاصی شکایات تھیں اور ان کا اصرار تھا کہ کتابت قدرے جلی کی جائے۔ اب مکتوبات کو کمپیوٹر کتابت کے ذریعے پیش کیا جا رہا ہے۔ نہایت واضح اور روشن۔ یہ تبدیلی آپ کو پسند آئی ــ؟ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ شاعر کی مقبولیت کا اندازہ موصول خطوط سے ہو رہا ہے۔ دنیا بھر سے خطوں کا ایک سلسلہ ہماری مسرتوں میں اضافوں کا باعث ہوتا ہے۔ ہم اپنے قارئین کے خطوط کی روشنی ہی میں شاعر کو ترتیب دیتے ہیں۔ مگر کچھ دشواریاں بھی پیش آ رہی ہیں خطوں کی بڑھتی ہوئی تعداد میں طویل مراسلے اہم ہونے کے باوجود شامل نہیں ہو رہے اور اگر ایسا کیا بھی جائے تو بے شمار لوگوں کو شامل نہ ہونے کی شکایات ہوتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ "مکتوبات" کے باب کو اور زیادہ بامعنی، سنجیدہ اور بہتر کارآمد بنائیں۔ اس کے لئے بے حد ضروری ہے کہ قارئین مختصر مگر جامع تاثرات ارسال کریں۔ ذاتیات اور تعریف و توصیف سے ہٹ کر مفید و کارآمد باتیں تحریر کریں۔ مکتوبات کیلئے علیحدہ کاغذ پر صاف، خوش خط اور واضح روشنائی سے لکھیں۔ خط کے سرنامے پر اپنا نام قدرے جلی اور پتہ اردو میں تحریر کریں۔ ایک ہی خط میں مبارکبادی، تہنیتی اور دیگر ضروری غیر ضروری امور کے ساتھ شاعر کے مندرجات پر کیا گیا اظہار خیال ٹکڑوں میں رہ جاتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ قارئین شاعر ہماری گزارش پر توجہ دیں گے اور ہمارے کاموں کو آسان کریں گے۔

مختار صدیقی بنام سیماب اکبرآبادی

قبلہ و کعبہ برحق

سلام مسنون۔

آج دو تین مہینہ کی غیر حاضری کے بعد شرفِ عرائضہ نیازی حاصل کر رہا ہوں۔ اس دوران میں بہت سی نظمیں غزلیں ہوئیں اور اپنی طویل نظم کے دو تین مناظر اور سپردِ قلم ہوئے۔ مگر ان دنوں کچھ ایسی پریشانیاں اور چند در چند مصروفیات رہیں کہ حاضرِ خدمت نہ ہو سکا۔ امید ہے کہ معذور سمجھا جاؤں گا۔

آجکل گرمی اور مصروفیت لازم و ملزوم ٹھہری ہیں۔ اکتوبر میں p.e.s کا امتحان دینے کا ارادہ ہے۔ نکرے بیکار بیٹھا نہیں جاتا۔ اور گرمی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی کام سرگرمی اور سنجیدگی سے کیا جائے۔ بہت تشویش ہے۔ دعا فرمائیں۔

دو ایک چیزیں ارسالِ خدمت ہیں۔ التفاتِ عالیہ کی محتاج ہیں۔

"وحشتِ عشق بمن گفت کہ جرعہ بجگر" اور "وحشتِ عشق بمن گفت کہ یک جرعہ بگیر"

ان میں کونسے مصرعہ میں "جرعہ" استعمال صحیح ہے۔ اور دونوں میں کونسا مصرعہ چست اور وسیع ہے

نیز آیا جب "ڈونگرا مینہ کا" استعمال کیا جاتا ہے تو مصرعہ میں باقی الفاظ ایسے ہونے چاہئیں کہ انکا مفہوم یا صوتیات مینہ کے چھاجوں برسنے کی آواز کی طرف بھی رہنمائی کریں؟

"ڈونگرا مینہ کا برستا ہے کہ رم جھم آنسو" اور "ڈونگرا مینہ کا برستا ہے کہ آنسو ہیں رواں"

ان کس مصرعہ میں ڈونگرا کا استعمال صحیح ہے۔ "ڈونگرا" کا صحیح مفہوم اہلِ زبان کے نزدیک کیا ہے؟

والسلام ——

خاکسار

مختار صدیقی

★ مختار صدیقی [پ: یکم مارچ ۱۹۱۹ء — م: ۱۸ ستمبر ۱۹۷۲ء] کا تعلق سیالکوٹ سے تھا۔ ابتدائی تعلیم گوجرانوالہ میں حاصل کی۔ بی اے لاہور سے کیا۔ تمام عمر ریڈیو اور ادبی صحافت سے وابستہ رہے۔ علامہ سیماب اکبرآبادی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ میرا جی کے ساتھ حلقۂ اربابِ ذوق لاہور کے تحت شاعری میں نئے نئے تجربے کیے۔ نظم نگار شعرا میں مختار صدیقی کا نام بھی اہم ہے۔ ایک شعری مجموعہ "منزلِ شب" ۱۹۵۵ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ [ادارہ]



سید محمد عقیل

محمود منزل، دریاباد الٰہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

کہانیاں کیوں لکھتے ہو اور کس لیے؟

بھلا کسی نے کہا کہ تم کہانیاں لکھو؟ مگر تم بھی اس کے جواب میں کہہ سکتے ہو کہ کس نے کہا کہ تم ہماری کہانیاں پڑھو۔ مگر میں تو قاری ہوں، اور بغیر میرے پڑھے ہوئے تمہاری کہانی بیکار ہوگی۔ آخر تم کہانیاں لکھتے ہی کیوں ہو۔ اگر مجھے پڑھنے سے روکتے ہو کیا تمہارے لکھنے کا کوئی مقصد ہے یا یوں ہی بس تمہارے جی میں آئی اور تم نے کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ کیا جو کچھ اپنے گرد و پیش تم دیکھتے ہو اور محسوس کرتے ہو، وہی لکھتے ہو یا محض خیالی اور "بے معنی زندگی" اور صرف کہانی لکھنے کا ایک نیا ڈھنگ ہی تمہارے پیش نظر رہتا ہے۔ کہانی تمہیں لکھے یا تم کہانی لکھو، مگر ہمیں بھی تو اپنے ساتھ شریک کرو۔ آخر تم کس دنیا کی باتیں کرتے ہو۔ کن کے تجربے بیان کرتے ہو اور کن لوگوں کے لیے؟ تم کہہ سکتے ہو کہ آخر فن اور آرٹ بھی تو کوئی چیز ہے۔ کیا ضروری ہے کہ ہم تجربے ہی بیان کریں۔ وہ جو الف لیلیٰ و لیلیٰ، طرز کی کہانیاں لکھتے تھے۔ جو دیو اور پریوں کے قصے لکھا کرتے تھے، وہ جادو کی دنیا اور تخیلاتی FANTACY لکھا کرتے تھے، وہ کس لیے لکھتے تھے۔ اور ان میں زندگی کے کون سے تجربے ہوا کرتے تھے؟ مگر یہ کہانیاں قاری کو ایسا لپیٹ لیتی تھیں کہ بھلا تم انہیں شروع کر کے پڑھنا یا سننا چھوڑ سکتے تھے؟ یا آج بھی کیا تم چھوڑ دوگے؟ کیا زندگی اور اس کی معنویت وہی ہے جیسا کہ تم جیسے قاری سمجھتے ہیں۔ کیا زندگی اور حقیقتِ زندگی کا مکمل عرفان ممکن ہے۔؟

تصور اور اس کے مختلف امکانات، زندگی کیوں نہیں؟ اگر ان تصورات کو زبان نہیں ملتی تو اس کا مافی الضمیر تلاش کرو، تم کو کہانی مل جائے گی۔ داستانوں اور الف لیلوی، صورتوں کو کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ کیا دیو اور پریوں کی کارکردگیاں، زندگی کی حقیقتیں تھیں؟ نہیں، ان داستانوں اور الف لیلوی صورتوں کو چھوڑنا ممکن نہیں، کیونکہ ان کہانیوں میں انسانی ذہن اور اس کی تمناؤں کا سب سے بڑا راز چھپا ہوتا ہے اور وہی قاری کو ان کی طرف متوجہ کرتا ہے اور وہ راز ہے، ایک تجسس، جو انسانی اعمال اور کارناموں کی سب سے بڑی طاقت ہے، جو آرزوؤں کو بھی لپیٹ کر چلتا ہے۔ زندگی سراب میں گم ہو جانے کا نام نہیں بلکہ نت نئی صورتوں کی تلاش اور نئے امکانات پیدا کرنے کا نام ہے اور انہیں امکانات کی تلاش نے زندگی کو میدانِ عمل میں متحرک کیا ہے اور قصوں کہانیوں کی لپیٹ میں جو "پھر کیا ہوا" کی چاٹ چھپی ہوئی ہے، اسی کی تلاش نے قاری کو ایسی کہانیوں اور واقعات میں لپیٹ رکھا ہے۔ تو کہانی کی ریڑھ میں جو اسے قائم رکھنے والی ہڈی ہے۔ وہ جستجو ہی ہے اور باقی باتیں اس کی تزئین DECORATION کے لیے ہیں۔ اب تجسس یا تلاش کس بات کی؟ یا تو زندگی کی بصیرت کی یا اس کے نئے امکانات کی یا پھر نئے تجربوں سے کچھ نئے نتائج تلاش کرنے کی فکر یا للک، دیو پریوں کی کہانیاں، الف لیلیٰ و لیلیٰ کے قصے، میرامن کی داستانوں، یا طلسم ہوش ربا کے واقعات، سب زندگی کے امکانات اور انسان کی قوتِ فکر و عمل کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور پھر اس کی "انہونی" کے "ہو جانے" کی تمنا، قاری اور سامع کو واقعات میں لپیٹے رہتی ہے۔ اور پھر ان کوششوں سے اچھے برے نتائج کی تلاش۔ اچھے برے نتائج جو ایک موجود سوسائٹی کے حلال و حرام اور ایجاب و انکار TOTUM TABOO سے آئے ہیں۔ یا پھر عالمی UNIVERSAL ہیں جن میں زندگی کی بصیرت ہے اور اس کے جلال و جمال کی تفتیش۔ حضرت امیر حمزہ خیر و نیکی کی علامت ہیں تو ان کے واقعات میں قاری خیر و نیکی اور اپنی کامیابی تلاش کر کے، ان کا طرف دار ہو جاتا ہے جبکہ لقا اور افراسیاب

حیات جادو، اشفاق نقارہ نواز اور ملک اخضر گوہر پوشی، بدی اور آخر کار شکست کی علامتیں ہیں۔ اور پھر قاری ان کا مخالف ہو کر انہیں ویلن VILLAIN سمجھنے لگتا ہے اور ان کی ہزیمت پر تالیاں بجاتا ہے اور اگر کہیں ولن رقیبوں کو وقتی کامیابی ملی تو متفکر نظر آنے لگتا ہے۔ تاہم ان کے ہر عمل میں ان کے ساتھ ساتھ چلتا بھی رہتا ہے۔ راقم الحروف نے ایسے مناظر بھی دیکھے ہیں جہاں کسی بیٹھک میں دس پانچ آدمی بیٹھے ہوئے، افیون گھول رہے ہیں اور داستان گو، طلسم ہوش ربا پڑھ رہا ہے، یا اس کا کوئی قصہ بیان کر رہا ہے۔ اگر عمرو عیار کسی ساحر کے سحر میں پھنس جاتا ہے تو سب افیون چھوڑ کر دست بدعا ہو جاتے ہیں اور جب عمرو عیار، ساحر کو مار کر اس کے سحر سے نجات پاتا ہے تو سب شکر کا سجدہ بجا لاتے ہیں اور پھر خوش ہو کر افیون کی چسکیاں لینے لگتے ہیں جبکہ ان داستانوں کا ذہین قاری، صرف مسکرا کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ ابھی ایسے گھرانوں کے کچھ پرانے افراد موجود ہوں گے، جہاں جب طلسم ہوش ربا پڑھی جاتی تھی تو گھروں میں عورتیں کھانا پکانا چھوڑ کر داستانوں میں گم ہو جاتی تھیں اور بازار سے کھانا منگا کر کھا لیا جاتا تھا۔ آخر یہ محویت کیوں؟ اور کیسی؟ پھر نیک کرداروں کے ساتھ قاری کو اپنی پسند اور قدروں کی تسکین ملتی تھی مگر بدکرداروں کی پیش کش اور ان کے انجام کی بھی اسے کیوں فکر رہتی تھی؟ افراسیاب اور تاریک مشکل کشا کے بدکرداروں میں بھی قاری کی دلچسپی کیوں؟ شاید اس لئے کہ وہ قاری کے لئے چیلنج بھی تھے اور ویلن بھی اور ویلن کو اپنے کیفر کردار کو پہنچنا ہی چاہئے۔ تجسس کا اتار چڑھاؤ اور پھر بقول غالب ع لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی، یہ بھی ایک سبب تھا۔ اس کی بھی فکر تھی کہ ایک خاص دور کی سوسائٹی نے جو اچھے اور برے معیار، زندگی کے لئے بنا رکھے تھے، ان کا کیا بنا؟ یہ سمجھتے رہنا چاہئے کہ کامیابیوں اور ناکامی پر، ہر دور کے قاری کی نظر رہی ہے۔ وہ فن کار کو اس نظر سے بھی آنکتا رہا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کی بصیرت اور پیچیدگیوں کو کہاں تک پکڑا ہے اور پھر ان کا حل کن راستوں سے تلاش کیا ہے اور یہ حل کہاں تک حقیقی زندگی میں ممکن ہے؟ کیا یہ انسانی زندگی کے عمل و ارتقا کی تصدیق اور وضاحتیں بھی کرتے ہیں؟ سوسائٹی میں ایسے افراد ہو سکتے ہیں جو خیر، کو سادگی اور ناکامی سے تعبیر کر سکتے ہیں اور شر، کو چالاکی اور کامیابی سمجھتے ہیں اور اس طرح ڈکنس کا یورا ہیپ URIA HEAP بھی کامیابیوں کی تعبیر ہو سکتا ہے مگر آج کے افسانہ نگار کی ایک بڑی مشکل یہ بھی ہے کہ وہ آج کی زندگی کے خیر و شر کی وضاحت اور توجیہہ کس طرح کرے، لیڈروں کی سوسائٹی کے خیر و شر، بار بار قتل و غارت گری، بہو بیٹیاں جلانے، یا سڑکوں سے موٹر کاریں چرانے کے اخلاقی جواز: ورکنگ لکھوٹ برداشت میں مادیت کی راہیں تلاش کرنا، اسمگلنگ، دھوکہ دھڑی اور تمام بازیوں کو کامیابیاں سمجھنے والی سوسائٹی کے معیاروں کو کس طرح چھان پھٹک کر دیکھنے اور پھر کہانیاں لکھتے وقت، کس طبقے کے مفاد کا خیال رکھتے اور کہاں اپنے ضمیر [illegible] سے سمجھوتہ کیجئے۔ پھر کہانی کار کی ذمہ داری کیا ہوتی؟ کبھی کبھی صاف گوئی اور ضمیر کی آواز مہنگی پڑتی ہے اور گلا گھونٹ برداشت کرنے کی صورتیں نظر آتی ہیں۔ گیلیلیو سے لے کر حبیب جالب اور منٹو سے لے کر کرشن چندر تک یہ صورتیں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں

پھر سوسائٹی سے دور علیحدہ ہو کر، پوری قوم کی تصدیق اور فروتنی نامنظوری بھی آڑے آتی ہے، جارج ڈبلیو رینالڈس کی تخلیقات کا رشتہ قوم کی کمزوریوں، درباری محل سرائے کی عیاشیوں کے اظہار کے لئے، سزا کے طور پر، انگریزی ناول کی تاریخ میں کوئی جگہ نہیں پا سکی۔ تو کہانی کار اور ناول نگار کا ضمیر آزاد ہو کر بھی خائف رہتا ہے۔ آج ان تمام باتوں سے نپٹنا آسان نہیں۔ پھر کہانی کار کے پاس صرف تفہیم اور اظہاریت ہی کا راستہ ہے جس سے وہ سوسائٹی کے مزاج کا شناسا بھی بنتا ہے اور اس میں تبدیلی لانے کی استطاعت اسے حاصل ہو سکتی ہے اور اس طرح، وہ اپنا نقطہ نظر بھی بیان کر سکتا ہے۔ اردو میں جدید علامتی کہانیاں جو آج تک لکھی گئی ہیں، ان کے مصنفین، "میں اپنے لئے لکھتا ہوں، میں سب کے لئے لکھتا ہوں، میں کسی کے لئے نہیں لکھتا۔ میں صرف تجربے کے لئے لکھتا ہوں اور میں صرف لکھنے کے لئے لکھتا ہوں" جیسے تمام مفروضات اور عمل یعنی پریکٹس سے گزر چکے ہیں۔

ان تمام صورتوں میں بہت سی کہانیاں لکھی گئیں اور علامتی کہانیوں میں کچھ اچھی، کہانیاں لکھی بھی گئیں مگر زیادہ تر علامتی کہانیوں کا سرا دھڑ نہیں ملتا۔ کچھ کہانیوں کی شارحین نے ایسی ایسی تعبیریں کی ہیں کہ شاید، کہانی کار کے حاشیہ خیال میں بھی وہ بات نہ رہی ہوگی جیسے انور سجاد کی کہانی "گائے"۔ یا رشید امجد کی کہانی "پھسلتی ڈھلوان پر فروان کا ایک لمحہ" جس کے بارے میں یہ کہا گیا کہ "یہ کہانی قوت پر خاص توجہ

کا نتیجہ ہے ..... جہاں پر عقلیت کی ہر تہذیبی اپنا روح گھونٹا بیٹھتی ہے اور ایک اجاڑ پن کا احساس جنم لیتا ہے۔" انور سجاد کی کہانی گائے کی بھی تعبیرات عجیب عجیب طرح سے کی گئی ہیں۔ کچھ اسے پاکستان میں فوجی حکومت کے خلاف احتجاج کی کہانی بتاتے ہیں، کچھ کا خیال ہے کہ یہ کہانی پاکستان کی بدلتی ہوئی تہذیب کی کہانی ہے، کچھ اسے نئی نسل اور پرانی نسل کی آویزش سمجھتے ہیں۔ یہ تقسیم ہند کی بھی کہانی ہو سکتی ہے "گائے"، کو اگر ہندوستان سمجھ لیا جائے تو گائے، ہندوستانی تہذیب کے وہ عناصر بھی ہو سکتے ہیں جنھیں پاکستانی نئی بنتی ہوئی تہذیب اور خصوصاً وہاں کے مولویوں کی تہذیب، دیس نکالا دے رہی ہے، کوئی گائے، کو قدامت پرستی کی علامت بھی کہہ سکتا ہے۔ جیسے اب دنیا کی کمپیوٹر والی تہذیب ٹرک میں لاد کر باہر پھینک دینا چاہتی ہے مگر انتظار حسین، ناصر شہزاد اور ابن انشا اور کچھ مہاجرین اسے سینے سے لگائے رہیں۔ جاتک کہانیوں کے پردے میں ماضی کی بازیافت کا شغل اٹھا کر یا ناصر شہزاد گیت کی گلاسری میں غزلیں لکھ کر، بیل گاڑی کے دور کی تہذیب کے گن گا رہے ہیں۔ غرض کہ علامتوں اور تعبیرات کا کوئی انت نہیں ہے۔ ع ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں، یہ سبھی مگر جہاں قاری، کہانی میں سر ٹکرا کر واپس لوٹ آتا ہو تو پھر ایسی کہانیوں اور بیانات کا حاصل؟ کچھ نمونے ایسی کہانیوں کے دیکھتے ہیں۔

(۱) میں نے دیکھا گرد اڑاتی سیاہ راہ پر گاڑی کا ہیولیٰ ابھر رہا ہے۔ سفید بیل جن کی آنکھوں پر سیاہ کھوپے چڑھے ہیں، اور ناکوں میں موٹے رسے اور سیاہ کپڑوں، ملگجی چادروں کے جھلوں میں چہرہ چھپائے، نیم خوابیدہ گاڑی بان جو شاید اس کا تھا، بجری، دکھ، دہشت بھری مہک کی ہمہ وقت قربت سے بے ہوش رہتے ہیں اور ان کے پیچھے سیاہ پردے۔ ایک لرزش، مجھے سر سے پاؤں تک لرزا گئی۔ تینوں دیہاتیوں کی آنکھوں سے چمک رخصت ہو گئی۔ جیسے وہ موت کے قریب ہوں۔ گاڑی آہستہ آہستہ قریب آرہی تھی۔ گاڑی بالکل قریب آ گئی یہاں تک کہ ہمارے برابر سے گزر گئی۔ گاڑی بانوں کے چہرے چادروں میں چھپے تھے۔ اور سیاہ پردے (یا دیواریں) مدہم ہوا سے ہلنے کے باوجود نہ ہلتے تھے۔ اچانک وہ تینوں اس گاڑی کے پیچھے بھاگے اور ایک ساتھ انھوں نے پردہ اٹھا دیا۔ ان کے سر پردے میں چھپ گئے مگر پردہ اٹھنے کے باوجود نہ اٹھا تھا۔ دوسرے ہی لمحے ایک دہشت زدہ عجزانہ سی چیخ کے ساتھ وہ تینوں پلٹے اور دیوانوں کی صورت دیہات کی طرف بھاگے۔ "تم نے کیا دیکھا"؟ "تم نے کیا دیکھا؟" میں ان کے پیچھے بھاگا مگر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ بھاگتے رہے۔ "بولو" "بولو" میں نے ان کی منت کی مگر وہ بھاگتے رہے یہاں تک کہ میں بھی ان کے ساتھ بھاگتا بھاگتا، شہر سے کوسوں دور نکل آیا۔ "مجھے بتاؤ مجھے بتاؤ" آخر میں نے مترخص کی چادر پکڑ لی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھیں میری جانب پھیر دیں اور پھر اپنا منہ کھول دیا۔ اس کی زبان تالو کے ساتھ چپک چکی تھی۔ وہ تینوں گنگ ہو چکے تھے۔ میں چکرا کر گر گیا مگر وہ تینوں بھاگتے رہے اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کے پیچھے گرد اڑتی رہی۔ پھر وہ بھی بیٹھ گئی اور میں گھر لوٹ آیا ...... اسی دن سے گاڑی نے اپنا راستہ بدل لیا ہے۔ اب وہ شہر سے نہیں گزرتی ـــــ پل سے ہو کر پکے میں اتر جاتی ہے اور مضافات کا رخ کرتی ہے۔ اہل شہر اس دکھ، دہشت بھری مہک کے اس طرح عادی ہو چکے ہیں کہ اس کا احساس نہیں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ وہ تلوار کی کاٹ کا تھی لہریں کر گئیں۔ بھولی بسری کہانی کی طرح۔ مگر میں، اب بھی انہیں اپنے جسم میں اترتا جان پاتا ہوں اور کوئی دن رات میرے اندر بولتا ہے "بابا! اب تمہاری باری ہے اب تم دیکھو گے" اور آج میں اسی پل پر آن کھڑا ہوا ہوں ـــــ اسی سواری کے انتظار میں"

(سواری۔ خالدہ حسین۔ مجموعہ پہچان)

(۲) جب تم یہاں تک آ گئے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دوسرے راستے پر چل رہے ہو، ورنہ تم تیسرے راستے پہنچتے اور مجھے دیکھ میں نے روزن نہیں کھودا تھا۔ آج کوئی سفر نہیں لاحق ہے۔ بس تیسرا راستہ ہے، پڑکون اور دا فع ـــــ تو یہ تعویذ کھولو اور گزر جاؤ۔ الوداع۔ اسی لیے کہ اب تمہاری واپسی ناممکن ہے کیونکہ تمہارا نقش قدم بھی مٹایا جا رہا ہے

جس کے اسباب تمہیں اکیسویں منزل پر معلوم ہوں گے کہ فنکار نے وقت مقرر کر رکھا ہے۔

وہ بہت تیز بھاگتا وہاں سے گزر گیا اور کئی منزل آگے آنے کے بعد جب اس تعویذ کا خیال آیا تو کھول کر پڑھنے کی خواہش ہوئی۔ لیکن اس شخص نے تو منع کیا تھا کہ کھولنا نہیں ورنہ اثر زائل ہو جائے گا۔ نہ جانے وہ کون شخص تھا۔ سرمد تھا یا کوئی پیچ۔

جب اس نے تعویذ کھولا تو اس میں لکھا تھا

ہوزا میم فہمزدان ہنر ہنر ماس ورزماس
ہرشیو ہر دیور فرشید شمت ستے ہرشندہ
ہرشنگر زمریاں فزدہیدرد

شام	کا	دیپک	جلا	مَن	کا
دیا	بجھنے	لگا	یا	ربوس	شام
کا	دیپک	ج	من	کا	دیا

یہیں سے اس نے تیسری تباہی میں قدم رکھا۔ یعنی جب وہ دشت قراقرم واضح ہو کر قراقرم ایک پہاڑ ہے دشت نہیں) کو عبور کرکے ۱۲ویں منزل پہ آ گیا تو اسے ۔ ہو جیسے اس کے پیچھے کوئی گھسٹ رہا ہو۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ چونکہ میں اتنی دور رینگتا آیا ہوں اس لیے اس ہاں دوسرے نشانات واضح ہوں گے لیکن جب مڑ کر دیکھا تو لگا تار چیخوں سے دوسروں کی نیندیں اچاٹ ہونے لگیں۔ نہ جانے کس منزل سے ایک لاش اس کے ساتھ گھسٹتی آ رہی تھی جو اس کے رک جانے کے بعد بھی گھسٹ رہی تھی۔"

[ہوزا۔ میم۔ فیہ از قمر احسن]

(٤) ! بیتے اس آنات سے پہلے گزرے کل، کھلے آسمان تلے۔ میں ان جانے میں، ان گنت لفظ کھو بیٹھا۔ تاریخ جغرافیہ دیو مالا، کہاوتیں خون کے رشتے ناطے اور دل کے معاملات، صبح و شام سچے۔ کبوتروں کا پھڑ پھڑانا، بھوک تھی اور لغزش یا پیاس، ہنستے ہنستے رو دینا شاعری تھی اور رو دینے۔ دستے جنس دنیا کہانی۔ پو پھٹنے سے پہلے بدھ ملتا، بعد دوپہر، خیام اور شام ڈھلے، دیوداس۔ کبھی قدر عنا کو آنکھیں نم کیے غم کی تصویر دیکھتے اور کبھی روکھے سوکھے لمبے بال، پریشان، سیاہ بالوں میں سورج کے ذرّے۔ بازوؤں پر پیشانیوں کا ہلکا ساد دار موسم گرما کی دھوپ۔ بیوں کا لمس، الاؤ کی آنچ اور بدنوں کا ملاپ، بارش اور بعد بارش کا شکوہ —— زمان و مکاں کی یکسانیت میں تبدیلی کا در تھا، کہ جس میں میں شریک تھا یوں کہ ایک وقت سازش کا شکار اور سازش میں شریک تھا، لفظوں کو معنی نہ دے پایا۔ سدا جو دن تھے۔ گرما، برسا، خزاں، بہار کے گرد چکر کاٹتے رہے۔ موسم جو لفظ تھے، معنی نہ تھے۔ سازش کا شکار میں یوں تھا کہ حقیقت یہ تھا زر سے میں شریک یوں تھا کہ میں نے اس حصار کو توڑنے کی کوشش نہ کی۔ وہ دن ہوس پرستوں اور شہرت پسندوں کے دن تھے۔

[آخری کمپوزیشن۔ عرفان میترا]

(یہ سوال بھی دوسری بار تحریروں کی طرح، شب خون [الٰہ آباد] میں بڑے اہتمام سے شائع کی گئی تھی اور مدتوں ادبی حلقوں میں اس کہانی کے بڑے چرچے تھے۔)

کیا یہ سوال کہانی کی کسوٹی کو متعین کرتی ہیں؟ یا کہانی کوئی کسوٹی بنائی ہیں۔؟ تو وہ کون سی کسوٹی ہے؟ آخر کہانی یا انسانی زندگی سے، ان کا کیا تعلق ہے؟ پھر تخلیق کو بھی یہ کیسے متعین کرتی ہیں؟ فینٹسی FANTACY اور خیال کی اڑان نے یقیناً انسانوں کی مدد کی ہے۔ ذہن کی یہ صورتیں، ہوائی قلعے تعمیر کرتی ہیں، مگر یہی ہوائی قلعے انسانوں کو سوچنے پر مجبور کرتے رہے ہیں کہ کیا ان ہوائی

قلعوں کو بھی راہ عمل مل سکتی ہے؟—

اور اگر انہیں راہ عمل مل گئی تو یہی ہوائی قلعے زندگی کی حقیقت بھی بن جاتے ہیں۔ طلسم ہوش رُبا میں افراسیاب جادو کے بنائے ہوئے طلسمی پتلے، جب تمام کام کرتے تھے تو قارئین اور سامعین انہیں محض خیالی اور ایک ناممکن العمل چیزیں سمجھتے تھے مگر جب انہیں خیالی صورتوں نے آج روبو ROBOT کی شکل اختیار کرلی۔ اپنی پیٹھ میں گیس کے ڈبے باندھ کر، گوشت و پوست کے انسان کھلی ہوا میں آسمان میں پرواز کرنے لگے اور قلابازیاں دکھانے لگے اور خلائی اسپتنک، اپلیس جب چاند ستاروں میں پہنچنے لگے، تو تخت پر زبرجد پہ سوار ہو کر عمرو عیار کا اڑانا، حقیقی اور عملی دنیا کا کارنامہ معلوم ہونے لگا۔ طلسم ہوش رُبا کے جادوگروں کا زمین میں ڈوب کر زمین کاٹتے ہوئے چلنا، کس قدر محیّر العقول اور ناممکن العمل معلوم ہوتا تھا۔ لوگ اسے محض زیب داستان سمجھتے تھے۔ مگر آج زمین دوز ریلوں اور کوئلے کی کانوں میں کام کرتی ہوئی مشینوں نے ان تمام محض خیالی باتوں کو حقیقت بنا دیا ہے —

کیا یہ انسانی ذہن کے تجسس اور عمل کی کارفرمائی نہیں ہے؟ مثالیں اور بھی ہوسکتی ہیں مگر خیر لیکن ان تمام خیالات اور فیلسی نے کبھی تفہیم کا دامن نہیں چھوڑا کہ یہی تفہیم اور توجیہات تو خیالات کو حقیقت کا روپ دینے میں مدد کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان باتوں سے خفا ہو کر تجریدی افسانے لکھنے والا کوئی ہمارا افسانہ نگار تن کر کھڑا ہو جائے اور کہے کہ جب زبان اور اسکے پرانے مفہوم تک منتقل ہونے کے اصول ختم ہوچکے ہوں گے اور زبان اپنی تفہیم اور رسل و رسائل کے نئے اصول بنالے گی اور واقعات سننے یا پڑھنے کے بجائے صرف دیکھنے VISUAL کی چیزیں رہ جائیں گے۔ کیونکہ جس طرح سمعی اور بصری AUDIO VISUAL تجربے اور امکانات بڑھتے جاتے ہیں، شاید کچھ دنوں میں لکھنے پڑھنے کا کام ہی ختم ہو جائے۔ جب پورا ناول چند کیسٹوں میں قید ہو جائے گا تو کوئی کتابیں کیوں چھپوائے گا اور کوئی کتابوں کا اتنا بڑا بوجھ کیوں اٹھائے پھرے گا۔ تب ان تجریدی افسانوں کی زبان اور ان کا مافی الضمیر محض آواز کے اختصار اور بلندی سے اپنا مفہوم ادا کریں گے اور تب ان افسانوں میں تحریر شدہ باتیں صرف تصویروں کے پس منظر سے ابھاری جائیں گی اور تب مجموعۂ الغریم (سریندر پرکاش کا افسانہ تلقارمس، ہوزہ میم، فز، چپ چڑانگ، بچھو، غار، نقش داوز سجاد کا افسانہ) مٹی گھوڑوں والی بگھی کا پھیرا (مرزا حامد بیگ کا افسانہ) سب کا "معنیاتی نظام" اور اس کی "دو شیزہ فرنیا" وغیرہ سب اپنا طلسم در بند، کھول دیں گے۔

لیکن دنیا کی کوئی فکر یا تجربہ، جو عام انسانوں کی مشترک ذات کو اپنے ساتھ نہیں لیتے، وہ عام انسانوں کی دلچسپی کا سبب کبھی نہیں بنتے۔ عام انسانی سوسائٹی، ہر فکر، خیال اور تجربے میں اپنے تجربوں اور سوچ کی تصویر دیکھنا چاہتی ہے۔ اور جب تک، یہ مشترک صورت کسی طرز تحریر میں اسے نہیں ملتی، ایسے تجربے کبھی پسندیدہ نہیں ہوسکتے —

اسلئے افسانے کی نئی نسل نے ایسے افسانوں اور ایسی افسانوی "حکمت" کو ٹھاٹھ باہر کر دیا ہے اور اپنی زمانی تفہیم اور زندگی کے نئے مسائل کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ یہ آگے بڑھنا ہی زندگی کی دلیل ہے اور زندگی سے محبت بھی کیونکہ خیال کے آگے بڑھنے کے ساتھ، زندگی بھی بہتر صورتوں کے تقاضے لے کر آگے بڑھتی ہے۔ ماضی تو صرف تاریخ بن جاتا ہے۔ لیکن مستقبل تاریخ بناتا ہے اور انسانوں کے لئے کسی بہتر دنیا کی تعمیر کی فکر کرتا ہے۔ یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایسے افسانے بھی آج کی زندگی کے تناظر اور اس کی لایعنیت اور پیچیدگیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ آج "خیر" کی بھی مختلف پرتیں بن گئی ہیں اور "شر" میں بھی ان گنت قسمیں پیدا ہوگئی ہیں۔ یہ کہانیاں بھی ایک الجھی ہوئی ملٹی کرنٹ زندگی کی کہانیاں ہیں اور نئی زندگی کی پراسراریت کو ظاہر کرتی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کچھ پروا نہ تھا۔ مگر سارا مسئلہ تو اظہاریت کا ہے اور گرد و پیش کی حقیقی زندگی سے ان کا تطابق۔ یہ صحیح ہے کہ سماج میں سب کچھ اچھا اچھا ہی نہیں ہوتا رہتا۔ لیکن خراب سچویشن میں بھی اچھی کہانی بنتی ہے۔ ایجابی بھی، اخلاقی بھی۔ مگر تلاش اور گرفت، تجسس کے بغیر کہاں ہاتھ آتے ہیں۔ تجسس، واقعات اور حالات کو کہانی کے فن کی نادرہ کاریاں متضاد ہوتی ہیں اور نادرہ کاری ناقابل تفہیم علامتوں سے نہیں پیدا ہوتی۔ زندگی کا نیا پیرہن

کا معیار بدلتا ہے اور اس کی بالغ اور شعوری گرفت، کہانی کی نئی صورتیں پیدا کرتی ہے۔ پریم چند نے جب حسن کے معیار کو بدلنے کی بات کہی تھی تو وہ بھی یہی تھی کہ جاگیردارانہ سماجی نظام اور بورژوائی دادے نے جو حسن کا معیار، اپنے مفاد اور لطف کے لئے بنایا تھا اس سے الگ ہٹ کر آج کی اصلیت کو تلاش کرو۔ اس حسن کا بھی ادراک کرو جو جھونپڑوں کے صحت مندوں میں ہے، یہ حسن محلوں اور محفلوں کے حسن بیمار سے الگ اور کہیں زیادہ حسین ہے اس حسن کی تلاش ضروری ہے۔ کہ یہ ایک نئی طاقت ایک نیا جذبہ اور نئی تلاش ہے جو اپنی عصری زندگی کے نئے رخ کا ادراک ہے۔ یہی حسن کی نئی قدر و قیمت ہے کہ اس زندگی میں بھی انسانوں کی ایک دنیا بستی ہے۔ اس دنیا اور اس کے مسائل کو دیکھنا بھی نئے کہانی کار کا فرض بنتا ہے۔ کہانی کا تجسس صرف یہ نہیں کہ قاری ایک خواب سے چونک کر دوسرے خواب میں جلایا جائے۔

یا ریل کی پٹریوں کے نیچے، ایک بزرگ نماز پڑھتے ہوئے ملیں اور قاری دریائے حیرت میں غوطہ کھانے لگے یا پھر ایک سیڑھی سے اوپر آئے اور دوسری سے نیچے جا کر کنوئیں کی تہہ میں پانی کا منبع تلاش کرنے میں لگ جائے۔ کہانی کا تجسس ان طاقتوں کا ڈھونڈنا بھی ہے جو اپنی سیاسی فتح اور کامرانی کے لئے، انسانوں کی لاشوں کو کھیتوں میں بیج کی طرح آخر کس لئے بو رہی ہیں اور ایسا کرنے میں ان کی کس ذہنیت اور سیاست کا اظہار ہوتا ہے۔ ان چھپے ہاتھوں اور گھناؤنی سازشوں پر کہانیاں لکھنا کیا نئے کہانی کار کا فرض نہیں ؟ کیا فرقہ واریت کی نئی لہر کی لپیٹ میں آئی ہوئی ہندوستانی قوم اس کی بے بسی اور الجھنیں ہمارے کہانی کاروں کا مسئلہ نہیں ؟ شاید ہمارے افسانہ نگار ان باتوں کو صحافت سمجھتے ہیں اور جو چیز وقتی اور صحافتی ہو اسے بہت سے لوگ ادب نہیں سمجھتے۔ اگر ملک میں ہونے والے یہ واقعات، جو ایک گف WELL KNITT سماج کے انتشار کا سبب بنے ہوئے ہیں ہمارے ادب اور ادیبوں کا مسئلہ نہیں تو پھر، موضوع تمہاری کہانی کا کیا ہوگا ؟ یہ جو نئی کلا شکوف تہذیب سے زندگی کے عدم تحفظ اور آتنک واد تک کے مسائل پیدا ہو رہے ہیں، کیا یہ تمہاری کہانیوں کا مسئلہ نہیں ؟ کیا آج کی زندگی کو مقتل میں بدلنے والوں کے چہرے سے نقاب ہٹانا، جدید دور کا تجسس نہیں ہے۔ ؟ کیا بمبئی، گجرات، کانپور اور کلکتہ کے قتل عام میں مرنے والے انسان، تمہاری کہانیاں نہیں۔ کہانی کارو ! یہ نہ بھولو کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ سب تمہاری سماجی تاریخ بھی ہے جسے آواز چاہیئے۔ مجرمانہ خاموشی نہیں، عزم و ہمت چاہیئے خوف کا پرچار نہیں، درد کا شعور چاہیئے محض درد شنا: کا بھولوں سے بھرا گلدستہ، نہیں۔ یہ ایک ایسا لمحہ ہے جس میں ملک کا پورا کردار داؤں پر لگا ہوا ہے ہزاروں سال کی مشترکہ تہذیب منقلب ہو رہی ہے۔ یہ ایک ایسا وقت ہے جس میں اس گنگا جمنی تہذیب کے تار و پود بکھر رہے ہیں۔ ان صورتوں کو اپنی کہانیوں میں سمیٹ لو اور اپنے فیصلے کی آواز کو تیز کرو اور اپنے اشاروں کی سمتیں واضح۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ وقت آجائے جب تم کو اس کی اجازت بھی نہ ملے کہ تم اپنے محسوسات کا اظہار بھی کر سکو۔

نازی جرمنی کے ادیبوں کی طرح اور تمہارے دیکھنے کے لئے صرف حکومت کی آنکھ رہ جائے یا پھر تم کنسنٹریشن کیمپ میں پہنچ جاؤ جہاں تمہارے محسوسات اور تمہاری آواز کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ کنوئیں کے اندر سے کیا آواز آ رہی ہے ؟ سواری کے انتظار میں کوئی خوف سے پیلا چہرہ بنائے اپنے وجود کی لایعنیت تلاش کر رہا ہے، سورج سے اپنا گمشدہ تلاش کرنے میں لگے ہوئے ہو۔ مگر یہ تمہارے اپنے سماج اور دور میں جو موت کے کنوئیں بن رہے ہیں، جو گیس چیمبروں میں انسانوں کو ڈالنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں، جو استحصال اور اقتدار کی نفی کا بازار گرم ہے، وہ تمہیں دکھائی نہیں پڑتا ؟ فرقہ پرستی کی آگ میں جلتا ہوا ہندوستان، پاکستان میں مہاجروں کے مسئلے اور عالمی گٹھ بازیاں تمہارے جو کہیں تم کو دکھائی نہیں دیتے ؟ اگر ان باتوں کے لئے تمہارا دل نہیں دھڑکتا، تمہارا قلم متحرک نہیں ہوتا، انسانوں کے یہ غم اور یہ مسائل، جو تمہیں متاثر نہیں کرتے جو برصغیر اور عالمی افق پر ایک مستقل مسئلہ بنے ہوئے ہیں تو پھر نہ زندگی تمہارا مسئلہ ہے اور نہ آرٹ، نہ انسان نہ تو پھر تم کس کی کہانیاں، کس لئے، اور کس کے لئے لکھ رہے ہو۔ ؟

*

بخطِ شاعر



فغا ابن فیضی

سایۂ بام تھا، تری دیوار پر میرا ابھی ہے
ہوں مہاجر میں، تو حق انصار پر میرا ابھی ہے

تیرا میرا مسئلہ ہے، ایک دو پر مشترک ______
منحصر سب کچھ، انہیں اقرار پر میرا ابھی ہے

کیوں الجھتی پانو سے، بے وجہ، بیاباں کی طناب ______
بوجھ، لیکن، گردنِ دیوار پر میرا ابھی ہے

ہوں یہ ظاہر تو، کسی درویش کے کشکول سا ______
قرض، یہ اپنی قوم کے سردار پر میرا ابھی ہے

میں بھی ہوں، مستحق رواقِ آبلہ پایانِ عمر ______
اک لہو قطرہ، سرِ ہر خار پر میرا ابھی ہے

چشمِ خوں بستہ کا میری، استعارہ ہی سہی ______
اک شفق پارہ، لبِ دلدار پر میرا ابھی ہے

تم کو بھی معلوم ہے، اک خو شریفانہ سا دباؤ ______
منفعل حالات کی رفتار پر میرا ابھی ہے

تم دعائیں دیتے جاؤ، اور میں یوں ہی چپ رہوں ______
کچھ نہ کچھ قابو، لبِ اظہار پر میرا ابھی ہے

ہے مزاج اپنا کہ شاخِ گل کی صورت نرم ہوں ______
ہاتھ ورنہ، وقت کی تلوار پر میرا ابھی ہے

آؤ! ڈھونڈیں کوئی آبِ سرد کا چشمہ یہاں
گھر، اسی جلتے ہوئے کہسار پر میرا ابھی ہے

گھل گیا ہے آج، کچھ تلخی سی لہجے میں فغا
ورنہ، ایماں حرفِ اشعار پر میرا ابھی ہے

دستِ دعا مفلوج ہے، کھولے کون دعا کے دروازے
مدت سے چپ چاپ پڑے ہیں، شہرِ صدا کے دروازے

سب کو، اسی میں داخل ہوکر، اس کے پاس پہنچنا ہے
سانسوں کی دیواریں ٹھہریں، قصرِ فنا کے دروازے

مجھ سے، خیر و خبر موسم کی، سبز پرندو مت پوچھو!
بند کیے بیٹھا ہوں میں تو، ابر و ہوا کے دروازے

میرے لیے ہستی کا سفر بھی، تنگ حویلی جیسا ہے
رستوں کے یہ موڑ ہیں، یا، نقشِ کفِ پا کے دروازے

خوش نفسانِ گل گوں شیوہ، آج بہت ہی یاد آئے
گونج رہے ہیں خوشبو کی دستک سے، صبا کے دروازے

یوں لگتا ہے، خوابوں کی دہلیز پہ جب بھی اترا ہوں
مجھ سے باتیں کرتے ہیں، رنگ اور حنا کے دروازے

ہمسایوں سے ربط و رفاقت، ایک پرانی بات ہوئی
سب نے تو دیواریں اونچی کرلی ہیں، ہٹا کے دروازے

شاید کوئی آ نکلے، بستی ہے مہاجر لوگوں کی
اس امید پہ پھرتا ہوں، کاندھے پہ اٹھا کے دروازے

اک ذرا موسم نے کروٹ لی، اور، کھنڈر ہو جائیں گے
ہم ہیں فغا! پانی کے دریچے، اور ہوا کے دروازے

مؤنلتہ بھبن - ۲۷۵۱۰۱ (دہلی)



کنور سین

۴۔ اے۔ ویسٹ پٹیل نگر، نئی دہلی ۔

مریض

وہ میرے پاس موت کی چادر اوڑھ کر آیا تھا۔

میں نے اُسے اپنے پاس اسٹول پر بیٹھتے ہی جان لیا تھا کہ اس کا رنگ و ریشہ موذی مرض میں مبتلا ہو چکا ہے اور بیماری نے آخری حد بھی پار کر لی ہے۔

اس کی آنکھوں میں بسی گہری زردی اور اس کے وجود پر چھایا ہوا پیلا پن اس مرض کو واضح کر رہا تھا پھر بھی وہ مریض تھا اور میں حکیم۔

وہ میرے پاس یونہی نہیں چلا آیا تھا۔ اُسے میرے بارے میں جو معلوم تھا وہی اُسے اتنی دور سے میرے پاس لایا تھا۔ میں اس کا اپنے میں بے پناہ اعتماد اور بھروسہ دیکھ کر قدرے بدحواس ہو گیا تھا۔ یا پھر میں اس لیے پریشان ہوا تھا کہ اس نے اپنا دایاں بازو میری طرف بڑھاتے ہی مسکرانا شروع کر دیا تھا۔

اس کی مسکراہٹ غیر معمولی تھی۔ اس میں امید میں لپٹی مایوسی تھی اور مایوسی میں لپٹی امید۔ دونوں کو ایک ابھرتے ڈوبتے دیکھا اور اپنے آپ میں بنے رہنا آسان بات نہیں تھی۔

میں نے اس کی کلائی پر اپنی انگلیاں رکھیں تو وہ کچھ کہنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میں نے اس کی نبض پڑھی تو مجھے لگا اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے کچھ بتائے اور میں اس کے بتائے ہوئے کی بنا پر اس کے مرض کی تشخیص کروں اگر ایسا ہی کرنا تھا تو میرے لیے اپنے حکیم ہونے پر فخر کرنے کا جواز ہی کہاں رہ جاتا تھا۔ میں منہ میں قید بے قرار زبان کی بجائے نبض کی دھڑکن کو پڑھنے میں ہی اپنے پیشے کی برتری کا اظہار کرنا چاہتا تھا اور مریض سے کچھ پوچھے بغیر ہی اس کی بیماری، بیماری کی حالت اور بیماری کا علاج ڈھونڈنے میں مسرت حاصل کرتا تھا۔

وہ پہلا مریض تھا جو مجھے ایک طرف کر کے میری توقع اور خواہش کے خلاف بولنے لگا۔

”حکیم صاحب! آپ بہتر نہیں جانتے ہیں کہ نہیں لیکن مجھے سب معلوم ہے۔“

میری آنکھوں میں پھیلی حیرت کو دیکھتے ہوئے وہ کہیں دور ڈوبنے لگا۔ ”کیا آپ کو نہیں معلوم میرا اور آپ کا تعلق صدیوں پہلے سے ہے۔ شاید آغاز سے ہے اور اختتام کی بات بے معنی ہے کہ آغاز بھی کوئی حقیقت نہیں۔ جس کا کوئی منبع نہ ہو اس کا آغاز کون ڈھونڈ سکتا ہے۔ پھر بھی لفظوں کو قید مانتے ہوئے بھی اُن میں پناہ لیتے چلے جانا ہی شاید ہمارا مقدر ہے“ وہ ٹھٹھکا۔ یہ میں کہاں جانے لگا۔ مجھے تو بس اس رشتے کی بات کرنی چاہیے جو بہت ہموار بھی ہے اور پیچیدہ بھی۔ آپ کو بھی تو یاد ہوگا۔“

وہ پھر رکا اور میرے چہرے کو اپنی زرد نگاہوں میں سمو کر بڑے رازدارانہ انداز میں آگے بڑھا ”کیا آپ وہ واقعہ بھول سکتے ہیں؟“

”وہی مریض اور اس کے لائے ہوئے پیشاب اور اس کی بیماری کا تعلق۔“

”میں کوئی آج کی بات نہیں کر رہا نہ ماضی قریب کا قصہ سنا رہا ہوں۔ آپ حیران کیوں ہونے لگے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ حقیقت کئی بار افسانے سے بھی زیادہ حیران کن ہوتی ہے اور دلچسپ بھی اور میں تو اس حقیقت کا انکشاف کر رہا ہوں جس کا تعلق ہم دونوں کے سوا اور کسی سے نہیں۔“

"پتہ نہیں کتنا عرصہ گزر گیا۔ اس وقت کی بات ہے جب آپ کوٹھے میں بیٹھے مریض کے پیشاب کی رنگت کو دیکھ کر یا شاید اس پر ایک نظر ڈال کر اس کی بیماری کی تشخیص کیا کرتے تھے۔"

"میں جوانی میں قدم رکھ رہا تھا۔ آپ بڑھاپے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آپ کی شہرت کا ڈنکا چاروں طرف بج رہا تھا۔ آپ کی شہرت آپ پر غالب تھی اور میری چڑھتی جوانی کا جوش مجھے بے قابو کر رہا تھا۔ مجھے نت نئی شرارت سوجھتی اور چھوٹے سے قصبے میں کوئی نہ کوئی ہنگامہ کرنے میں لطف آتا۔ اس کو چھیڑنا، اس کا مذاق اڑانا، کسی پر پھبتی کسنا کسی کے سامنے گستاخ ہو جانا۔"

"ہمارے گھر یا محلے میں یا کہیں اور کوئی بیمار ہو جاتا تو آپ کا ذکر آتا اور آپ کی قابلیت کا تذکرہ ہونے لگتا۔ آپ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے۔ نہ بولنے والوں کی زبان تھکتی نہ سننے والوں کے کان پکتے۔ دھیرے دھیرے مجھے آپ کی شہرت کو داغدار کرنے کی سوجھی اور میں کوئی ترکیب گھڑنے لگا۔"

"آپ شرافت کے پتلے۔ خاندانی حکیم۔ مریض کو دیکھتے ہی اس کی طرف متوجہ ہو جانے والے۔ نہ وقت کا خیال نہ مقام کی پرواہ بس مریض کو اپنے سامنے دم توڑتے ہوئے دیکھنے کی خواہش اور مریض کو صحت یاب ہوتے دیکھنے کی تمنا۔

"آپ کی لگن اور اپنے پیشے کے ساتھ جنون کی حد تک وفاداری کے احساس نے ہی میرے دماغ میں خلل پیدا کیا۔ ایک صبح چار بجے کے قریب اٹھ کر میں نے منہ ہاتھ دھویا اور موٹے موٹے کپڑے پہن کر کمبل اوڑھ لیا۔ پھر ایک پیشاب سے بھرا کٹورا اٹھا کر آپ کے گھر کی طرف چل دیا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ گلیاں اندھیری اور سنسان تھیں کتے بھی جو نکما صبح کرتے کوں کوں کر کے سردی سے ٹھٹھر رہے تھے لیکن میں جانتا تھا۔ کہ آپ ایسی حالت میں بھی دروازے پر مریض کی دستک سن کر جاگ اٹھیں گے۔"

"جن دنوں کی بات میں کر رہا ہوں۔ ان دنوں صرف سرسوں کے تیل سے جلتا مٹی کا دیا ہی اندھیرے سے لڑنے کا واحد ذریعہ تھا۔ گھر میں ایک آدھ کمرے میں ہی اُجالا ہوتا باقی حصہ اندھیرے کی گھٹن میں پڑا اپنے نصیب کو کوستا رہتا۔ سرسوں کے تیل سے جلنے والا چراغ بھی ہر کسی کی قسمت میں کہاں تھا۔ شاید اُجالا بس چند ایک کا ہی مقدر بن سکتا تھا۔" وہ اپنی بات کو دہراتے ہوئے لرز اٹھا۔ اور میرے چہرے پر اُگی داڑھی

میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔:

آپ نے دستک سن کر دروازہ کھولا اور اپنے ہاتھ میں جلتے ہوئے مٹی کے دیئے کو میرے چہرے کے قریب لا کر مجھے پہچاننے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے اپنے کو کمبل میں پوری طرح چھپا رکھا تھا اور میں ایسے ہونک رہا تھا جیسے تیز بخار مجھے پھونکے جا رہا ہو۔

آپ اپنی مسند پر بیٹھ گئے اور مٹی کا دیا ہاتھ کے ٹکڑے پر رکھ دیا۔ مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا اور مجھے بھول کر دیئے کی لو میں ہلکی جھلک دکھاتے ہوئے کٹورے میں پڑے پیشاب کو دیکھنے لگے۔ آپ کی بوڑھی ہوتی ہوئی آنکھوں پر کوئی چیز تھا۔ نہ ہاتھ میں کوئی آنکھ پر لگانے کے لیے شیشے کا ٹکڑا۔

"میں حیران تھا کہ آپ اس مری مری سی روشنی میں نہایت ہلکی جھلک دکھانے والے پیشاب میں چھپی میری بیماری کو کیسے کھوج سکیں گے لیکن میں نے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ آپ میرے سامنے تھے اور مجھ سے بہت دور کہیں اور بھی۔ نہ میں نہ مٹی کا چراغ، نہ چراغ کی میلی روشنی نہ کمرہ نہ اس میں بچھی مسند یا کوئی دیگر چیز۔ شاید کچھ بھی نہیں تھا۔ آپ کی نگاہ تھی اور پیشاب کا وجود۔

"کچھ دیر بعد آپ نے ہنکارا بھری اور آنکھیں بند کر کے اپنے میں سمٹ گئے۔ مجھے لگا اس سے پہلے آپ کائنات کو اپنے سے باہر نکالنے میں جٹے ہوئے تھے اور اب اسی کائنات کو اپنے اندر جذب کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

"آپ نے زبان کھولی اور میں کانپ اٹھا۔"

"اس بیماری کا نسخہ سنو،" آپ کی آواز میں بہت وزن تھا۔

"مجھے تیز بخار ہے اور جسم بھی بری طرح ٹوٹ رہا ہے۔ بھوک تو بالکل جاتی رہی ہے اور ..." میں یہ سب کہتے ہوئے اندر تک ہل گیا۔

"تم نسخہ سنو۔" آپ کے لہجے کا تحکم دہشت خیز تھا۔ اس مریض کے لیے جس کا یہ پیشاب ہے ضروری ہے کہ وہ ایک پاؤ بنولے، ایک پاؤ کھلی، ایک چھٹانک سونف، آدھ پاؤ السی اور آدھ پاؤ گڑ کو اچھی طرح کوٹ کر اور باہم ملا کر دن میں دو بار کھائے اور صرف ہرے چارے پر گزارہ کرے۔ تین دن بعد اسی وقت صبح سویرے میرے پاس پھر پیشاب لانا تاکہ مریض کی حالت

کہ مجھے پتہ چل سکے اور میں نسخے میں کوئی تبدیلی کر سکوں یاد دوائی دینا بند کرنے کے لئے کہوں۔"

اس نے پھر سے میرے وجود کا جائزہ اپنی زرد نگاہوں سے لیا اور بولا۔ "آپ کی بات سن کر میں گھبرا گیا۔ میں تو انسان ہوں لیکن پرنسخہ۔

"آپ مسکرائے اور بڑی نرم آواز میں بولے" میں کچھ نہیں جانتا۔ میں تو بس پیشاب کو پہچانتا ہوں۔ یہ پیشاب جس کی کا بھی ہے۔ اس کے لئے اس سے الگ کوئی دوسرا نسخہ نہیں تجویز کر سکتا اس کے بعد آپ ایک دم کہیں گم ہو گئے اور میں پیشاب سے بھرا کٹورا اٹھا کر آپ کے مطب سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی میں نے پیشاب نالی میں بہا دیا اور دبا دبا سا گھر کی طرف چل دیا۔

وہ زرد آنکھوں اور پیلے وجود والا مریض میرے حواس پر سوار ہونے لگا۔ میں کبھی اس کی بیماری کا سوچتا کبھی اس کی اس کہانی کا جو اس نے مجھے سنائی تھی۔ میں اس وقت کو یاد کرنے کی کوشش کرتا اور پیچھے لوٹتا رہتا۔

آخر یہ سب کیا تھا۔ میرے مطب کے باہر دوسرے مریضوں کی بھیڑ تھی۔ اور ہر کسی کا مجھ پر برابر کا حق تھا لیکن زرد مریض نے پتہ نہیں مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا کہ میں اس کا نسخہ لکھنے کے لئے اپنی کرسی سے اٹھ کر کہیں اور کچھ کھوجنے کے لئے بے چین ہو اٹھا تھا۔

ایک ہفتے بعد وہ پھر آیا اور اپنی آنکھوں کی زردی میرے اندر اتارنے لگا۔ میں نے اس کی کلائی پر اپنی انگلیاں اس کی نبض ٹٹولنے کے لئے رکھیں تو وہ پھر کچھ کہنے کے لئے بے چین ہو اٹھا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے نرم یا سخت لہجے میں منع کروں وہ کہہ اٹھا۔ "حکیم صاحب! آپ وہ واقعہ یقیناً بھولے ہوں گے۔ جب میں اپنے ایک بیمار دوست کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ وہ بات بھی بہت پرانی ہے۔ ہم دونوں کو ایک ہی بیماری تھی جیسے بیٹھے بٹھائے یکدم گھٹ رہا تھا۔ ویسے ہی میرے دوست کا بھی۔ ہم دونوں کو ایسے محسوس ہوتا جیسے اگلے دو چار لمحوں میں ہمارا دم نکل جائے گا۔ ہم لمبا سانس لینے کی کوشش میں تڑپنے لگتے اور ہمارے گھر والے ہمارے سینے پانی کے گلاس لے کر دوڑے آتے

وہ بیماری باہر کو نکلی پڑتی آنکھوں کو دیکھتے اور جو بھی طبی امداد فوری طور پر میسر آسکتی ہمیں مہیا کرتے اور ہم ہزار جتن کے بعد اپنے آپ میں واپس آتے۔ نارمل دکھائی دینے کے لئے ہمیں مزید کئی گھنٹے لیٹ کر آرام کرنا پڑتا۔

"آپ کی شہرت چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ دور دراز کے علاقوں میں آپ کے نام کا وظیفہ پڑھتے تھے۔ زلیخا، جہاز لبے نواب، اور رئیس تو بس زندگی کو اللہ کے بعد آپ کی عنایت سمجھتے تھے ہر وقت آپ کی خدمت کرنے کا بہانہ ڈھونڈتے رہتے۔ اپنی زندگی کی رنگ رلیوں اور عیاشوں کو جاری رکھنے کے لئے آپ سے ہر قسم کی تقویت پاتے۔ لیکن آپ حکیم ہونے کے ناطے ہر طبقے کے لوگوں پر اپنا دروازہ کھلا رکھتے بے شک آدمی ہونے کے ناطے کہیں کہیں سمجھوتوں اور مصلحتوں سے بھی کام لینے کو برا نہ سمجھتے۔"

میں اس کی نبض ٹٹول رہا تھا اور شاید اور بھی بہت کچھ۔ میں بہت جاننا چاہتا تھا۔ لیکن وہ بھی چاہتا تھا۔ میں خاموشی سے اس کے بیان کو جانچنے کا طریقہ نکال رہا تھا۔ اور وہ مجھے بہت پیچھے لے جا کر اپنی کہی جانے پر اڑا ہوا تھا۔ نہ وہ مجھے اس پر پہلے نسخے کے اثر کی بات جاننے کی اجازت دے رہا تھا۔ نہ اس وقت اگلے نسخے کے بارے میں سوچنے کی۔ میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ اور وہ مجھ سے بیگانہ ہوا بولتا جا رہا تھا۔

"آپ کو بھی یاد ہی ہوگا۔ کوئی آدمی اپنی کرامات کو بھول بھی کیسے سکتا ہے۔ کرامات اور کرشمہ ہر کسی کے بس کی بات تو نہیں ہوتی لیکن آپ نے جو کچھ کیا وہ معمولی بات نہیں تھی۔ لوگ یونہی تو آج تک آپ کا نام عزت سے لیتے آرہے ہیں۔" اس کی آواز قدرے نم دار ہو گئی۔ شاید وہ جذبات کی رو میں بہہ گیا تھا لیکن وہ لوٹ آیا۔

"مجھے آپ پر یقین تھا اور میری آپ میں عقیدت کا جواز وہ واقعہ تھا۔ جو مدتوں پہلے آپ کے اور میرے درمیان پیش آچکا تھا۔

آدمی کے ہاتھ میں پکڑے کٹورے میں پڑے پیشاب کو دیکھ کر نسخہ لکھ دینا، وہ پھر میری داڑھی میں الجھنے لگا۔

"یہ واقعہ جو میرے ذہن میں آج بھی محفوظ ہے معمولی نہیں ہے۔ آپ اس دور میں مریض کی پیشانی دیکھ کر مرض کی

تشخیص کیا کرتے تھے۔ پہلی بار میرا دوست آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ نے ہمیں باری باری اپنے سامنے بلایا۔ میرے دوست کا نمبر پہلا تھا۔ آپ نے اُس کے آپ کے پاس بیٹھنے کے جلدی بعد نسخہ لکھ دیا لیکن مجھے اپنے سامنے دیر تک بٹھائے رکھا۔ میری پیشانی کو پڑھتے ہوئے آپ پھر کہیں گم ہو گئے اور میں نے دیکھا پہلے مسکراہٹ پھر کراہٹ آپ کے چہرے پر ابھری۔ آپ نے میری بات سنتے ہوئے بھی ان سنی کر دی اور نسخہ تجویز کرنے کی تیاری کرنے لگے لیکن میں بول اٹھا۔ "میں ان تھ ہوں آپ نسخہ ..... " میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جن میں دہشت بھی تھی اور وحشت زدہ محبت بھی۔"

وہ زرد آنکھوں اور پیلے وجود والا مریض دوسری کہانی سنا کر مجھے کچھ آگے کا ڈھونڈنے پر مجبور کر گیا میں بے خبری کے عالم میں ہر جانی اپنی جگہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا "آخر کیں تو ......"
میں نے لمبا سانس لیا۔

وہ تیسری بار آیا "تو مجھے اپنی آنکھوں میں جھانکنے اور اپنے وجود پر نظر ڈالنے سے روکتا ہوا سا تبلانے لگا" آپ کو اب تو یاد آ گیا ہوگا۔ آپ بھی تو آگے بڑھنے سے پہلے پیچھے لوٹے ہوں گے۔ اپنے کو اگلی جست بھرنے سے پہلے گرم کرنے کے لئے کیا آپ چند قدم پیچھے نہیں ہٹے۔" وہ اور بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"یہ سب باتیں تو بس بات کو آگے بڑھانے کے لئے ہیں پھر بھی ان کا تعلق میرے اور آپ سے متعلق ہے۔ مجھے یقین ہے آپ میرے ساتھ لوٹ چلیں گے۔ میں ان دنوں کی بات کر رہا ہوں جب آپ مرض کی تشخیص مریض کی زبان دیکھ کر کیا کرتے تھے۔ ان دنوں میرے گلے میں شدید درد رہا کرتا تھا۔ درد میری زندگی اجیرن بنا رہا تھا۔ لگتا تھا میرے گلے میں کہیں کچھ ٹنگی جا رہی ہیں میرا سر چکرانے لگتا تھا۔ دماغ ماؤف ہونے لگتا تھا۔ میں اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بڑے عجیب و غریب اور کریہہ احساس سے بھر جاتا تھا۔ کیا میں واقعی جان لیوا مرض کا شکار ہو چکا ہوں عجیب بے بسی تھی جو مجھے اژدہے کی طرح جکڑے جا رہی تھی۔
"درد کے علاج کے چکر میں ایک کے بعد دوسرے ڈاکٹر کے پاس جانے لگا۔ کوئی کچھ کوئی کچھ بتانے لگا۔ اپنا اپنا علاج سمجھانے لگا۔ ایک ڈاکٹر نے مجھے گلے کا آپریشن کرانے کا مشورہ دیا اور وہ اپنے کلینک میں بیٹھے دوسرے مریضوں کو نظر انداز کر کے مجھے بازو سے پکڑ کر ذبح کی جانے والی بکری کی طرح گھسیٹا ہوا آپریشن تھیٹر میں لے گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اسی وقت میرا گلا ہر آلائش سے پاک کر دے گا اور اس نے مجھے آپریشن ٹیبل پر لیٹ جانے کو کہا۔ وہ اس الماری کو کھولنے لگا جس میں آپریشن کرنے کے لئے استعمال ہونے والے اوزار رکھے تھے۔
اوزار مجھے دکھاتے ہوئے اس نے کہا۔ یہ چمکتے ہوئے چاقو اور نشتر پوری طرح سے پاک صاف ہیں۔ میں نے قصائی کی چھری کے نیچے پڑی بکری کی طرح خوفزدہ نظروں سے اُسے اور اس کمرے کے ماحول کو دیکھا تو وہ مسکرایا۔ صرف چند منٹوں کی بات ہے۔ میں اس کے چہرے پر پھیلی سفاکی کو دیکھ کر لرز اٹھا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔
"حکیم صاحب کے آتے ہی مجھے اپنا بے وقوفی کا احساس ہوا اور میں آپ کو یاد کرنے لگا۔ آپ علاج کریں آپریشن نہیں۔ وہ میری داڑھی میں جھانکنے لگا۔ میں اسے نظر انداز کر کے اس کی نبض کی دھڑکن کو پڑھنے والا ہی تھا کہ وہ پھوٹ پڑا۔" صاحب! مجھے وہ صبح نہیں بھولتی جب میں کمبل اوڑھے اور کچھ سا اٹھائے ....."

اس سے پہلے کہ وہ جملہ پورا کرتا میں مزید سفر پر روانہ ہو گیا راستے میں اس بات کو طے کرنے میں ہی مگن ہو گیا کہ یہ مریض میرے پندار کو للکار رہا ہے یا میرے اندر لپٹنے لئے پیدا ہوئی ہمدردی کو بے پناہ بنانے کے لئے یہ حربہ آزما رہا ہے۔ میں ٹھٹکنے لگا۔ اس کی بیماری اور میرا علم اور بیماری کی تشخیص۔ بیماری کی تشخیص اور نسخہ۔

"میں دن رات اس مریض کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے، ہنسنے رونے، جاگنے سونے۔ بار بار مجھے عجیب احساس جکڑنے لگتا اور میں بری طرح بدحواس ہو جاتا لیکن ہزار کوشش کرنے پر بھی اس سے چھٹکارا نہ پاتا۔ عجیب حالت تھی۔ اس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتا اور اس کے آگے

کی راہ دیکھتا۔ اس سے بھاگتا پھرتا اور اسی کی طرف بھاگتا رہتا۔ میں جو نہ چاہتا وہی چاہتا چلا جاتا۔ اس سے خوف کھاتا اور اسی کے لئے ہمدردی سے بھر جاتا۔ کیسی متضاد کیفیتوں میں سے ہو کر گزرتا رہتا میں اپنے آپ کو کوستا اور اپنے آپ کو ہی حوصلہ دیتا۔ علاج اور لاعلاج کے بیچ ڈولے رہتا۔ منہ کا سواد کسیلا ہو جاتا اور اس کو لے کر منہ کا ذائقہ سنوارنے کی فکر کرتا رہتا۔ میرے باقی مریض بھی کئی بار مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے۔ کئی ایک تو آہ بھرتے۔ میری انگلیاں کئی بار ان کی نبض میں بھی اسی کی بیماری ڈھونڈنے لگتیں اور علم کی کتابوں میں سینہ بہ سینہ سفر کرتے آرہے ذخیروں کو کھنگالتا رہتا۔ نہ کھانے کی سدھ نہ آرام کرنے کی فکر۔ بس ایک دھن اور ایک ہی خیال!

وہ جو پہلی بار میرے پاس آیا تو بھی مسکرا رہا تھا۔ مجھے پریشان دیکھ کر بولا،، حکیم صاحب میری آپ میں عقیدت کم نہیں۔ ہوئی آپ کچھ بھی سوچیں، کچھ بھی کہیں میں آپ کو نہیں بھول سکتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کوئی بہت پرانی بات نہیں۔

اور سب معالج میری بیماری کو لاعلاج قرار دے چکے تھے ڈاکٹر بھی تمام ٹیسٹ کرنے اور مشینوں کے ذریعے میرے رگ و ریشہ کو جانچنے کے بعد مجھے صرف موت کا انتظار کرنے اور اللہ کو یاد کرتے رہنے کے لئے کہہ چکے تھے۔ میرے ہاتھ پاؤں زبان ناک اور آنکھ اور کان تک۔ ناکارہ ہو چکے تھے۔ مجھے کچھ پتہ نہ تھا کہ میں کس حالت میں ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔ ایسے میں میرے گھر والے مجھے گھر کی ڈیوڑھی میں بدھی گائے بھینس کے پاس چارپائی پر ڈال کر مرنے کے لئے چھوڑ دینے کا ارادہ کر چکے تھے۔ کہ میرے دادا کو آپ کی یاد آئی۔ وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی بساط کو سمیٹ کر لمبا سفر طے کر کے مجھے آپ کی چوکھٹ پر لے آیا۔

ان دنوں آپ آنکھ کی پتلی کو دیکھ کر مرض کی تشخیص کیا کرتے تھے۔ نبض کی طرف آپ کی توجہ کہاں جاتی تھی۔ خیر! یہ تو مرض کی تشخیص کرنے کے اپنے اپنے طریقے کی بات ہوئی بات تو مریض کے شفایاب ہونے کی رہی،،

وہ ہنس ہی دیا،

،، آپ نے تشخیص کرنے کے لئے میری دائیں آنکھ کھولی تو آپ خود ہی گھبرا اٹھے۔ "میں تو بس نسخہ لکھتا ہوں۔!،،

اس کے ایسا کہتے ہی میں مسند سے اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا اور اپنی رفتار کو تیز کرتا گیا۔ مجھے پتہ نہیں کیا کچھ چھپا رکھا تھا۔ میرا پندار مجھے چابک مار رہا تھا۔ اور اس مار کی آبرو رکھنے کے لئے میں کچھ بھی کر گزرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کس سے کہوں؟ کیسے سمجھاؤں مجھے خود سے نجات ہے نہ اس سے چھٹکارا۔ کیسی مصیبت ہے! میں جو نہیں چاہتا وہی چاہتا ہوں۔ میں کئی بار محسوس کرتا ہوں میں بہت تھک گیا ہوں لیکن مجھے وہ جو کچھ بتانا ہے جیسے جان کر میں پھر دوڑنے لگتا ہوں۔

آج وہ زرد کھال کا لباس پہنے میرے سامنے بیٹھا ہے۔ میری انگلیاں اس کی کلائی پر ٹکی ہوئی ہیں۔ میں اس کی نبض پڑھ رہا ہوں۔ اس کی پیشانی کو پڑھ رہا ہوں۔ اس کی زبان دیکھ رہا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں امڈی چلی آتی پیلاہٹ کو دیکھتا ہوں۔ وہ تڑپ اٹھتا ہے۔ حکیم صاحب میں مریض ہوں۔ آپ کا میرا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مرض اور آپ اکٹھے پیدا ہوئے ہیں۔ باقی سب تو بہت بعد کی بات ہے یہ آلات یہ مشینیں یہ اوزار، ان سب کو وجود میں آئے عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ آپ تو آغاز سے ....

میں اس کی بات سنتا ہوں اور اس کی زردی میں اس چمک کی تلاش کرتا ہوں جس کی جھلک سرخ ہو۔ کیونکہ اس کے خون کے سرخ ذرات ہی آج تک اسے ہر بیماری سے لڑنے کی طاقت دیتے آئے ہیں وہی اس میں بیماری کی مدافعت کی قوت پیدا کرتے آئے ہیں۔ ان خون میں ہرلتے سرخ ذرّوں کی بدولت ہی میری دوائی کے کارگر ہونے کی امید مجھے اس کا علاج کرتے چلے آنے کا حوصلہ دیتی رہی ہے۔ میں نسخہ لکھتا چلا آرہا ہوں۔ لیکن اس زردی میں۔ اس پیلے پن کے سیلاب میں وہ سرخ جھلک کہیں دکھائی نہیں دیتی اور اس کے بغیر مریض اور اس کا مرض اور میں؟ ✱



مظہر امام

آزاد غزلیں

سراسر اس پہ تہمت ہے کہ مجھ سے اس نے کچھ رشتہ نہیں رکھا
جہاں کے کارِ غم بخشے، مجھے تنہا نہیں رکھا

تمازت مہرِ امکاں کی کچھ اتنی خوش مروّت تھی
شجر ہم نے لگایا گھر کے آنگن میں، مگر سایہ نہیں رکھا

رہیں بے خانماں سب نیکیاں اپنی
خدا نے میرے رستے میں کوئی دریا نہیں رکھا

ہمیں سب رنگ اس کے زہر لگتے ہیں
زمانے کو شکایت ہے کہ ہم نے اپنی آنکھوں پر کوئی پردہ نہیں رکھا

سمندر سے گزرنا بہت مشکل نہ تھا، لیکن
ہمیں نے اپنی کشتی کے جزیرے سے نکلنے کا کوئی رستہ نہیں رکھا

نشے میں خوش گمانِ صبح تھے اتنے
کسی نے زخمِ شب پہ آج تک پھاہا نہیں رکھا

اک انجانی صدا کانوں سے ٹکرائی
دیئے لے کر چلے ہم، پھر خیال آیا کہ ہم نے گھر میں دروازہ نہیں رکھا!

حالِ دل یوں تو عیاں تھا، پہ نہاں کتنا تھا!
سود کتنا تھا! زیاں کتنا تھا!

وہی دو گز کی سسکتی ہوئی تنہائی، وہی قہرِ سوال
ساری دنیا تھی تری، میرا جہاں کتنا تھا!

وہ مرے عکسِ قدم تھے کہ نقوشِ کفِ پا تھے تیرے
ریت پر سلسلۂ حرف عیاں کتنا تھا!

شہریاری کی جسارت تھی بہت آپ کی مشہور زمانے بھر میں
آپ کو آپ کے ہی شہر میں اندیشۂ جاں کتنا تھا!

خود کو دیکھا بھی نہیں، آنکھ میں آنسو بھر آئے
تیری محفل میں دھواں کتنا تھا!

مجھ سے پوچھو کہ اسے قسطوں میں مرتے ہوئے دیکھا میں نے
پارۂ روح تپاں کتنا تھا!

کون آیا تھا چرانے مرے ماضی کے کھنڈر
کل یہاں شورِ سگاں کتنا تھا!

کچھ کتابیں! جو رہیں نام و نشاں سے محروم
حاصلِ عمرِ رواں کتنا تھا!!

۱۷۴-بی پوکٹ-۱ فیس-۱، میور وہار، دہلی-۹۱



(۱۸)

گلزار

بوسکیانا، پالی ہل، باندرہ، بمبئی ۴۰۰۰۵۰

کس کی کہانی

اتنا بھاری نام ہے انوکا، تب پتہ چلا جب سکول کے میگزین میں اس کی کہانی چھپی۔ انل کمار چٹو پادھیائے، چھٹی جماعت۔ مجھی سے افسانہ نگار بننے کا شوق تھا اُسے کہانیاں خوب سوجھتی تھیں اور مجھے تو ہمیشہ سے یقین رہا ہے کہ شاعر یا ادیب ہونا کوئی خدائی دین کی بات ہے، ورنہ ہر کوئی شاعر نہ ہو جاتا۔ انو میں وہ بات تھی جو بڑے بڑے فنکاروں کو پیدائشی ملتی ہے۔

ہم جب گلی ڈنڈا کھیل رہے ہوتے تب بھی انو سب سے الگ بیٹھا کاپی میں کچھ لکھ رہا ہوتا، یا سوچ رہا ہوتا۔ اور مجھے ہمیشہ یہ جاننے کی بے چینی لگی رہتی کہ انو کے دماغ میں اب کیا چل رہا ہوگا؟— کیسے وہ خلا میں ایک کردار پیدا کر لیتا ہے اور اسے سامنے پڑے کاغذ پر اتار دیتا ہے۔ پھر وہ چلنے پھرنے لگتا ہے۔ انو جہاں جی چاہتا ہے اسے وہاں بھیج دیتا ہے جو چاہے اس سے کروا لیتا ہے۔ اور جہاں جہاں سے وہ گزرتا ہے کہانی کا ایک پلاٹ بنتا چلا جاتا ہے۔ واہ یہ افسانہ نگار بھی کمال ہوتے ہیں جسے چاہیں مار دیں جسے چاہیں زندگی دے دیں ہے نا خدائی جیسی بات۔

تو ہمارا یہ کالج کے زمانے کی بات ہے۔

"ایسا نہیں ہے۔ میرے کردار من گھڑت نہیں ہیں اور وہ میرے بس میں بھی نہیں ہیں۔ بلکہ میں ان کے بس میں رہتا ہوں۔"

وہ اب بات بھی رائٹرز کی طرح کرتا تھا، مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کی کہانی جب "پرتاپ"، "ملاپ" یا "جنگ" کے سنڈے ایڈیشن میں چھپتی تو مجھے بڑا فخر محسوس ہوتا، میں نے اخبار ماں کو دکھایا۔

"یہ دیکھو — انو کی کہانی۔ انل کمار چٹو پادھیائے۔ اسی کا نام ہے۔"

"اچھا؟ سنا تو۔"

میں نے کہانی پڑھ کے سنائی ماں کو۔ ایک غریب موچی کی کہانی تھی۔ ماں کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"ارے یہ تو اپنے ہی محلے کے بھیکو موچی کی کہانی ہے۔ اس کی ماں کے ساتھ ایسا ہوا تھا۔"

یہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ لیکن میں نے فوراً انو کے الفاظ دہرا دیئے۔

"اس کی کہانیاں من گھڑت نہیں ہوتیں ماں۔ وہ کردار پیدا نہیں کرتا بلکہ اپنے ماحول سے کردار چنتا ہے۔ اس کے لئے آنکھ اور کان ہی نہیں، سوچ اور سمجھ کی کھڑکیاں بھی کھلی رکھنی پڑتی ہیں۔"

ماں بہت متاثر ہوئی۔ شاید میرے جملوں سے، جو انو کے تھے۔

گلی میں ایک بہت بڑا جامن کا پیڑ تھا۔ اسی کے نیچے بیٹھا کرتا تھا۔ بھیکو موچی۔ سارے محلے کی جوتیاں اسی کے پاس آیا کرتی تھیں، اور انو کا تو اڈا تھا۔ کپڑے چاہے کیسے بھی میلے کچیلے ہوں "چپلیاں" خوب چمکا کے رکھتا تھا انو۔

بھیکو اپنے بیٹے گھسیٹا کو چل کے انگوٹھے میں ٹانکا لگانا سکھا رہا تھا۔ میں نے جب بھیکو کی کہانی اس کو سنائی تو اس کا گلا رندھ گیا۔

"ہمارے دکھ درد اب آپ لوگ ہی تو سمجھو گے بیٹا۔ اب آپ لوگ نہیں جانوگے ہماری کہانی تو اور کون جانے گا!"

انو کا رتبہ اس دن سے میرے لئے اور بڑھ گیا۔ وہ سچ مچ پیدائشی ادیب تھا۔

کالج ختم ہوا اور میں دلی چھوڑ کر بمبئی چلا آیا۔ میری نوکری لگ

گئی تھی۔ اور اقی، اپنے بڑے بھائی کی "بیٹھک " پران کا ہاتھ بٹانے لگا جہاں سے وہ آیورویدا اور یونانی حکمت کی دوائیاں دیا کرتے تھے۔ کسی سرکاری دفتر میں نوکر تھے۔ لیکن صبح و شام دو دو گھنٹے اپنی بیٹھک میں یہ دواخانہ بھی چلاتے تھے۔ انہوں نے اس کے لئے بہت سی نوکریوں کی سفارش کی لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔

میں ایک بار بہن کی شادی پر دلی گیا تو ان سے ملاقات ہوئی کافی بیمار تھے۔ مجھ سے کہنے لگے:

"تمہیں کچھ سمجھاؤ اس کو۔ کچھ کام کاج کرے۔ یہ دنیا بھر کی کہانیاں لکھنے سے کیا ہوگا؟"

میں چپ رہا۔ وہ دیر تک سینے کے بلغم خالی کرتے رہے۔ خود ہی بولے:

"وہ حرامزادی اس کا پیچھا چھوڑ دے تو اس کی مت ٹھکانے آجائے۔"

میں نے ان سے پوچھا وہ حرامزادی کون ہے؟ بولا:

"افسانہ نگاری! بس اسی کو گالیاں دیا کرتے ہیں بھائی صاحب! وہ سمجھتے نہیں۔ وہ جسمانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ میں سماجی اور روحانی مریضوں کا علاج کرتا ہوں۔ میں سماج کے رستے ہوئے ناسوروں پر انسانوں کے پھاہے رکھتا ہوں۔ اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے مظلوم انسانوں کے لئے چراغ جلاتا ہوں۔ انہیں اپنی ذہنی غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے ہتھیار مہیا کرتا ہوں ——— "

میرا جی چاہا تالی بجادوں۔ وہ بہت دیر تک بولتا رہا۔ اس نے بتایا اس کی پہلی کتاب چھپنے کے لئے تیار ہے۔ ملک کے بڑے بڑے ادبی رسالوں میں اس کی کہانیاں چھپ رہی ہیں۔ اکثر تقاضے آتے ہیں رسالوں سے، لیکن وہ سب کے لئے لکھ نہیں پاتا۔ وہ ایک ناول بھی لکھ رہا ہے لیکن "بیٹھک" سے اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ جلدی سے پورا کر سکے۔ بڑے بھائی بہت بیمار رہتے ہیں۔ اور ان کے دو بچے! بیچارے!! ——— ان بچوں کے بارے میں بھی وہ ایک کہانی سوچ رہا تھا!

اس کی بات چیت میں اب بڑے بڑے مصنفوں کا ذکر آتا تھا۔ کچھ نام میں نے سنے ہوئے تھے۔ کچھ وہ بتادیتا تھا۔ سعادت حسن منٹو۔ احمد ندیم قاسمی۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی کے بعد کافکا، اور سارتر" کا ذکر میرے لئے نیا تھا۔ کچھ باتیں میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ پہلے وہ کہانیوں کے پلاٹ بتایا کرتا تھا اب وہ کافکا، سارتر" اور SYMBOLISM کے EXISTENCIALISM کی بات کر رہا تھا مجھے لگا شاید کہانی کہیں پیچھے چھوٹ گئی لیکن انل کمار چوپڑا وحیات نے مجھے سمجھایا:

کہانی صرف پلاٹ کے واقعات کی تفصیل اور اس سے پیدا ہونے والے کرداروں کے تعلقات کا ہی نام نہیں ہے بلکہ ذہنی حادثات کے تاثرات بھی اپنے آپ میں ایک کہانی کو جنم دیتے ہیں اور اس کے جمالیاتی تاثرات کو ——— "

بات میرے اوپر سے ضرور گزر رہی تھی۔ لیکن میں اس کے ذہن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا!

انل ایک بار بمبئی آیا کسی رائٹرز کانفرنس میں حصہ لینے اس کی چاروں دستخط شدہ کتابیں میں نے الماری سے نکال کے دکھائیں وہ کتابیں میں دوستوں کو دکھاتے میں بڑا فخر محسوس کرتا تھا اتنے بڑے ادیب کی کتابیں اور اب وہ خود میرے یہاں رہ رہا تھا میں نے بھائی صاحب کے دونوں بچوں والے افسانے کے بارے میں پوچھا۔ وہ لکھا؟

اس نے ایک افسوسناک خبر دی۔

"بھائی صاحب گزر گئے اور رشتے داروں نے مل کر ان کی بیوہ پر چادر ڈال دی۔ مجھے شادی کرنی پڑی۔ میں اب ان دونوں بچوں کا باپ ہوں۔"

کچھ روز رہ کر انل واپس چلا گیا۔

اب اس کے بارے میں اکثر اخباروں میں بھی پڑھ لیا کرتا تھا جب کوئی نئی کتاب چھپتی وہ مجھے ضرور بھیج دیتا تھا۔

بہت سالوں بعد ایک بار پھر دلی جانا ہوا۔ اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ اس سے کہا تھا اپنے رائٹر دوست سے ضرور ملاؤں گا۔

اسی شام۔ جامن کے پیڑ کے نیچے انل اپنی "کھٹریاں" پالش کر رہا تھا۔ گھسیٹا سے۔ اس کا اڈا اب بھی وہی تھا۔ بات پھر چل نکلی افسانے کی:

"نئی کہانی کا سب سے بڑا مسئلہ حقیقت کا بدلتا ہوا تصور ہے حقیقت صرف وہ نہیں جو دکھائی دیتی ہے بلکہ اصل حقیقت وہ ہے جو آنکھ سے نظر نہیں آتی۔ کہانی صرف ایک LOGICAL RELATIONSHIP کا نام نہیں ہے بلکہ اس SUBCONSCIOUS کیفیت کا نام ہے جو کردار کے

[باقی صفحہ ۲۹ پر دیکھیے]

پریم کمار نظر



حاصل ہوا وہ بھی جو وصیت میں نہیں تھا
سب جھوٹ کر انصاف عدالت میں نہیں تھا

جس شہر طلسمات میں آئینے بہت تھے
صد حیف وہاں بھی کوئی حیرت میں نہیں تھا

ہر چند کہ اس کوچے کی تھی خاک بھی سُرمہ
جب کشف ہی کچھ اپنی بصیرت میں نہیں تھا

ہم خاک نشینوں کو فقیری ہی امیری
سچ دیکھ کا یہ حق کا مہ شہرت میں نہیں تھا

کیا رخت سفر باندھ کے خوابوں کے سہارے
اس شہر کو جاتے جو حقیقت میں نہیں تھا

اے تشنہ لبی خیمۂ احباب سے آگے
پانی جو میسر تھا وہ کثرت میں نہیں تھا

چرچ روڈ، سول لائنز ہوشیار پور (پنجاب)

◆

آنے والے انقلاب آئے نہیں
کیا کوئی اہل کتاب آئے نہیں

پڑھ لئے سب دفتر کون و مکاں
جن کی خواہش تھی وہ باب آئے نہیں

اسم اعظم بھی پکارا ہے بہت
غار سے لیکن جواب آئے نہیں

ہو رہا ہے کچھ نہ کچھ زیر زمیں
کونپلیں پھوٹیں گلاب آئے نہیں

خشک لب لوٹے ہیں کیوں صحرا نورد
راستے میں کیا سراب آئے نہیں

ہم کو اک چشمک بھی سیل اشک سے
اس لئے ہم زیر آب آئے نہیں

شفا تھاپوری



نظم

خواب کے دل میں آنکھ جاگی ہوئی
دل کی دھڑکن میں رات جلتی ہوئی
رات کی بات کھوئی کھوئی ہوئی
بات: لفظوں کا خواب، ٹوٹا ہوا
لفظ: مٹی سے کھیلتا بچہ
مٹی: مٹی ہے صرف مٹی ہے
بے حس و بے وفا بڑی ظالم
مٹی انگور کا وہ خوشہ ہے
جس کی خاطر اچھلتے رہنا ہے
اُس کو پانا ہے، پا کے کھونا ہے
ایسا جینا بھی کوئی جینا ہے
جی کے مرنا ہے مر کے جینا ہے
آنسوؤں کی لڑی پرونا ہے
کچھ بچے اداس لمحوں میں
سانس در سانس مسکرانا ہے
رات مٹی کی، دن بھی مٹی کا
وقت مٹی ہے خواب مٹی ہے
پیاس بجھتی نہ بھوک مٹتی ہے
بے حس و بے گمان و بے لذت
بے دلی سے بھرا ہوا اک دل
اب تو یہ دل بھی صرف مٹی ہے
اپنی مٹی خراب ہے یارب!
زندگی اب عذاب ہے یارب!

پوسٹ آفس زنگم میٹھے ڈسٹرکٹ، گلبرگہ ۵۸۵۲۲۰



ممتاز حمید
۲-سی/ ۳۰۶، باپ خان نگر، مرول مروشی روڈ، اندھیری بمبئی ۵۹

کتاب

شام نامے میں ان کا آرٹیکل پڑھنے کے بعد اگلی صبح میں نے رائے صاحب کو فون کیا:

"بھئی آپ کا کالم پڑھا۔ غضب کا ہے۔ مبارک ہو۔"

"شکریہ۔ اور تم نے وہ کتاب پڑھ لی؟"

"جی ہاں! بڑی مشکل سے ہاتھ آئی ایک لائبریری میں۔ ایسی تحریریں تو نایاب سمجھئے۔ کتاب کیا ہے مینارۂ نور ہے! رائے صاحب! چودہ طبق روشن ہو گئے!"

"ہم نہ کہتے تھے ایک نئے تجربے سے روشناس ہو جاؤ گے۔"

"یقین کیجئے، ایک عجیب کیفیت طاری ہے۔ علم اس قدر حقائق بھی ہو سکتا ہے، اس کا آج تک علم نہ تھا۔"

وہ ہنسنے لگے: "اور سناؤ۔ تمہاری طرف سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

"اب تک تو ہے رائے صاحب لیکن کب تک رہے کہا نہیں جا سکتا۔ کیسا وقت آ گیا ہے۔ سوکالڈ پڑھے لکھے لوگ دھڑلے سے جھوٹ کا پرچار کر رہے ہیں۔ نوخیز ذہنوں کو زہر آلود کر کے فضا کو مکدر کئے جا رہے ہیں۔"

"ہاں لیکن اتنا سمجھ لو یہ تا دیر زیادہ عرصے چلنے کا نہیں۔ تھوڑے ہی دن ہیں حماقتوں کے۔ سچ کا آخر بول بالا ہوتا ہی ہے۔ بس کچھ روز اور برداشت ... اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں ..."

رائے صاحب بڑے پرانے اور تجربہ کار جرنلسٹ ہیں۔ ساری زندگی غریب اور پس ماندہ طبقوں کے لئے کام کیا، بہتّر کے قریب ہوں گے، اتنی عمر میں بھی ویسے ہی چاق و چوبند ہیں۔ بڑی ڈھارس بندھائی ان کی باتوں نے۔

رائے صاحب سے گفتگو کے بعد تازگی محسوس کرنے لگا۔ ناشتے کی میز سے اٹھا تو گنگنانے لگا "چند روز اور میری جان فقط چند ہی روز..." پھر اسی موڈ میں لائبریری جانے کو تیار ہوا تو مسرت پُرتشویش نگاہوں سے دیکھتی سامنے آن کھڑی ہوئی۔ مجھے پچھلی شام کی بات یاد آ گئی۔ مسرت نے بڑی تفصیل سے، کافی دیر تک اس دہشت ناک واقعے کا ذکر کیا تھا۔ ضرور یہی وجہ ہو سکتی ہے ورنہ کیا سبب صبح صبح شریکِ حیات کے چہرے پر بارہ بج رہے ہیں۔ مجھے سوچ کر ہنسی سی آ گئی۔ یوں تو مسرت بڑی سمجھدار اور حوصلہ مند ہے لیکن پچھلے کچھ دنوں سے وہ کافی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ خود اعتمادی، وہ حالات سے لڑنے کا عزم، وہ پیچیدگیوں سے نمٹنے کی ہمت جیسے ٹوٹ سی گئی تھی۔ میری نگاہوں میں اُس مسرت کا چہرہ گھوم گیا جو بیاہ کے بعد اپنے گاؤں کی تمام معصوم تازگیوں سمیت شہر آئی تھی۔ جس کا چہرہ پہلی نظر پڑتے ہی شکست خوردگی کا احساس زائل ہو جاتا اور حوصلوں کو تازیانے لگتے۔ اُن دنوں بڑی سے بڑی مشکل آسان لگتی تھی۔ یوں لگا جیسے ابھی کل ہی کی تو بات ہے:

ہم نئے نئے اس دور افتادہ مضافاتی ہاؤسنگ کالونی میں رہنے آئے تھے۔ یہ مکان میرے ایک دوست کے نام الاٹ ہوا تھا اور وہ بھی وہاں کچھ یوں ہی جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں بے گھر تھا اور گیارہ مہینے کی ایگریمنٹ پر آج یہاں تو کل وہاں، منشی کرائے دار کی خانہ بدوش زندگی گزار رہا تھا۔ مجھے جب اس نے وہاں بھی ڈپازٹ پر اس ایک روم کچن مکان کا آفر کیا تو لگا جنتِ گم شدہ لوٹائی جا رہی ہو۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں فوراً تیار ہو گیا۔ اس نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا تھا۔ اچھی طرح دیکھ بھال کر فیصلہ کرو، کل کو مجھے دوشی نہ ٹھہرانا۔ ویسے تو تم چاہو جب تک وہاں رہ سکتے ہو۔ میرے لئے رہائش کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مطلق میں وہاں جانا ہی نہیں چاہتا۔ ہاؤسنگ بورڈ میں چکر چلا کر اس کے بجائے، کرلا میں الاٹمنٹ کراؤں گا۔ لیکن اس کام کو چار پانچ سال لگ

جائیں گے۔ کیونکہ کُرلا کی کالونی ابھی تیار نہیں۔ زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔"

"کمال ہے یار۔ کُرلا تو بڑا کنجسٹڈ، گنجان علاقہ ہے۔ گورے گاؤں چھوٹا کھلا، ہوادار اور صاف ستھری جگہ ہے۔"

"ٹھیک ہے مگر دور ہے۔"

"اتنی بھی نہیں۔ دراصل تمہیں ٹرین کی عادت نہیں رہی شروع سے اس لئے ایسا سوچ رہے ہو۔"

"اس کے علاوہ بھی ایک بات اور ہے۔ اہم بات۔"

"کیا؟"

"وہاں ملی جلی آبادی ہے۔ بلکہ اکثریت ان لوگوں کی ہے۔ کُرلا میں زیادہ تعداد میں اپنے لوگ ہیں۔ اچھے بُرے وقت میں۔۔۔"

"حد ہو گئی یار۔ پڑھے لکھے ہو کر اس طرح سوچتے ہو۔ میں بتاؤں بے فکری سے مجھے جو تجربہ دیا؟ دسیوں مکان بدلے میں نے اور جہاں جہاں کاسموپولیٹن آبادی میں رہا مقابلتاً اچھا ہی رہا۔ آس پاس کے لوگوں نے، پڑوسیوں نے ہمسائگی کا حق ادا کیا۔ کبھی کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔"

"ٹھیک ہے تمہاری بات بھی لیکن میرا تجربہ کچھ اور ہے۔"

مجھے کیا پڑی تھی کہ بحث میں الجھتا۔ میرا تو کام بن رہا تھا۔ فوراً ڈپازٹ کی رقم دی۔ اپنا مختصر اسباب باندھا اور بیوی اور اپنی تین سالہ گڑیا بیٹی انو کو لے، سدھارتھ نگر میں ڈیرا ڈال دیا۔ پڑوس میں ایک طرف مراٹھی فیملی تھی دوسری طرف ایک سندھی پریوار تھوڑے ہی دنوں میں اجنبیت کی ساری دیواریں گر گئیں اور یوں لگا ہم خاندان الگ الگ نہیں، ایک ہی ہیں۔ انہیں دنوں مقامی لوگوں نے ایک علاقائی تحریک شروع کی، شہر میں بسے جنوبی ہند کے باشندوں کے خلاف، جو بعد میں جارحانہ رخ اختیار کر گئی۔ دنگے فساد ہونے لگے، شہر کے حالات بگڑنے لگے لیکن ایسے موقعوں پر مسرت ہی ہمیشہ ہمت بندھاتی رہی۔ "آپ دیکھتے نہیں بھلا یا تنگرا اور راجی نروانی مجھے سگی بہنوں کی طرح چاہتی ہیں۔ یہی نہیں سامنے والی بیچاری گھوسلا اور بیچاری پشپا دیشپانڈے بھی کتنا خیال رکھتی ہیں۔ ان کے گھر والوں سے آپ کا بھی اچھا دوستانہ ہے۔ پھر پریشانی کیسی؟"

"ڈر کس بات کا؟"

"ہاں مگر پھر بھی؟"

"پھر بھی کیا؟ ۔۔۔ کچھ نہیں ہوگا۔ کیا یہ لوگ ہمیں اور ہماری انو کو کوئی نقصان پہنچانے کا خیال تک، دل میں لا سکتے ہیں؟ آپ تو بس یونہی۔۔۔" اور واقعی سارے اندیشے بس یوں ہی تھے۔ میری ملازمت کی نوعیت ایسی تھی کہ شفٹوں میں ڈیوٹی لگتی تھی۔ صبح، دوپہر اور رات کی، لیکن پڑوسیوں نے کبھی کوئی گزند پہنچنے نہیں دیا۔ ہمیشہ ساتھ دیا۔ ان واقعات نے ہمارے اور میل ملاپ کے جذبوں میں یقین کو کچھ زیادہ ہی مستحکم کر دیا تھا۔ پھر چند دن بعد، وہ واقعہ پیش آیا جس نے مسرت کی دھاک بٹھا دی سب کے دلوں میں۔۔۔ گورے گاؤں سے لے کر بوری ولی تک کے علاقے میں کن پٹی مار کی دہشت سے سرِ شام ہی سناٹا چھانے لگا تھا۔ وہ جنونی کئیوں کا شکار کر چکا تھا۔ لیکن پولیس اسے گرفتار کرنے میں ناکام رہی تھی۔ عجیب اور پُراسرار واقعات کو اس کی شخصیت سے جوڑ کر، طرح طرح کی افواہیں سارے میں پھیلائی جا رہی تھیں۔ لوگ اپنے سائے سے ڈرنے لگ گئے تھے۔ ایک دن اوور ٹائم کی وجہ سے گھر لوٹنے میں دیر ہو گئی۔ کچھ اتنی دیر بھی نہیں ہوئی تھی یہی کوئی شام کے ساڑھے سات آٹھ بج رہے ہوں گے۔ ٹرین سے اُترا تو روڈ پر چھایا سناٹا دیکھ کر پیدل چلنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ سوچا بس سے چلتے ہیں۔ عام دنوں میں ہمیشہ پیدل چلنے کو ترجیح دیتا کہ پندرہ بیس منٹ سے زیادہ کا فاصلہ نہ تھا۔ بس تقریباً خالی تھی۔ چند مسافر کام کاج سے لوٹنے والے، ایک دوسرے کو عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں دروازہ کے قریب کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بس چلنے لگی تو ایک کانسٹیبل بھی دروازے سے لٹک گیا۔ میں نے یوں ہی کچھ وقت کاٹنے اور کچھ ڈر دور کرنے کے لئے خاموشی توڑی:

"کیا ہوا حوالدار صاحب، وہ کن پٹی مار پکڑا گیا کہ نہیں؟"

"نہیں۔"

"نہیں؟ اپنی بمبئی کی پولیس تو دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے بعد دوسرا نمبر ہے اپنا۔۔۔ پھر بھی؟"

"کیسے پکڑے گا؟ کس کو پکڑے گا؟"

"کیوں؟"

"آدمی ہوئیں گا تو پکڑا جائے گا نا!"

اسٹاف پر اتر کر گھر تک چند قدموں کا فاصلہ انتہائی طویل تھا۔ یوں لگا بے شمار بدروحیں ننگے ہتھیار اٹھائے پیچھا کر رہی ہیں۔ گھر میں داخل ہوا۔ مسرت کے چہرے پر نظر پڑی تو جان میں جان آئی۔۔۔

دسترخوان پر بیٹھ کر کانسٹبل کے احمقانہ خیالات پر خوب ہنسے ہم لوگ۔ کیسے کیسے جاہل پولیس فورس میں بھرتی کر رکھے ہیں جس کے ذمے حفاظت سونپی گئی وہی لوگوں کو باور کرا رہا ہے کہ کتا کوئی مارا آدمی نہیں کوئی فوق الفطرت شے ہے، کوئی جن بھوت ہے اور ویسے بھی ہمارے یہاں عام لوگوں میں توہم پرستی کچھ زیادہ ہی ہے اور سائنسی سوچ کا بڑا فقدان۔ سچ پوچھو تو ہماری پسماندگی کا بڑا سبب یہی طرزِ فکر۔ گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کر باتیں تو کی جا سکتی ہیں۔ وہی ہم کر رہے تھے۔ سونے سے پہلے میں چپکے سے اٹھا اور اطمینان کر لیا کہ دروازہ ٹھیک سے بند کر دیا گیا ہے۔

انہی دنوں میری طبیعت خراب ہوئی۔ اور شدت کا بخار چڑھا اتنا کہ تقریباً بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ ایک رات بخار کی شدت کچھ زیادہ ہی تھی اور مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ مسرت میری حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔ ڈاکٹر کو فون کیا تو اس نے اتنی رات گئے وزٹ کرنے میں تردد کا اظہار کیا۔ یوں ہی تسلی دی کہ فکر نہ کریں ٹھیک ہو جائیں گے بخار نہیں اتر رہا ہے؟ گھبرائیں نہیں ماتھے پر ٹھنڈی کولن کی پٹیاں رکھتی جائیں۔ میں تو اس وقت نہیں آ سکتا۔ ضروری سمجھیں تو کسی کو بھیج دیں دوا دے دوں گا۔ صبح تک بخار نہ اترا تو دیکھ جاؤں گا ویسے...
مسرت، گھونسلہ کے گھر سے فون کر کے لوٹی تو بخار تیز تر تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اٹھی اور ڈرائیو نے سناٹوں کو چیرتی۔ ان دنوں ہمارے فیملی ڈاکٹر جمالا کے گھر پہنچ گئی۔ معمر ڈاکٹر دنگ رہ گیا۔ "مسرت تم۔ اتنی۔ اکیلے کیسی آ گئیں۔"

مسرت بولی: ان تمام باتوں میں فی الحال وقت ضائع نہ کریں۔ آپ ساتھ چل سکتے ہوں تو بہتر ورنہ فوراً کوئی زود اثر دوا دیں۔" ڈاکٹر نے کچھ کیپسول دیے، کچھ گولیاں اور بڑی تشویش کے ساتھ مسرت کو اپنے کمپاؤنڈ کے گیٹ سے رخصت کیا۔ بخار اتر گیا۔ دو چار روز نقاہت رہی پھر سب ٹھیک ہو گیا۔ لیکن سارے پڑوسی اور خاص طور سے ڈاکٹر جمالا کئی دنوں تک اس واقعہ کا ذکر کرتے رہے۔"
"مسرت تمہیں کن پٹی مارے ڈر نہیں لگا؛ کہیں مل جاتا تو؟ ۔۔۔" تو میں اس کی کن پٹی سیدھی کر دیتی!" مسرت ہنس کر جواب دیتی۔

آنا وہی مسرت جو صدکھو بیٹھی ہے۔ ٹوٹ سی گئی ہے۔ میں نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا: "کیا بات ہے؟ اتنی پریشان کیوں ہو؟ بس لائبریری تک تو جانا ہے۔ دراصل یہ کتاب بڑی اہم حوالے کی کتاب ہے۔ تاخیر ہوئی تو جرمانہ وغیرہ تو خیر ٹھیک ہے! دوسروں کو کافی تکلیف ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کو لوٹا کر اور دوسری کتاب ایشو کرا کے، فوراً لوٹ آؤں گا۔"

"لیکن آپ لائبریری جانے کے لئے جس علاقے سے گزریں گے وہی...."

قریبات آخر وہی تھی!

پچھلے کچھ دنوں سے افواہیں گشت کر رہی تھیں کہ بھیڑیے کی جسامت کا ایک کتا پاگل ہو گیا ہے۔ کچھ لوگ یہاں تک کہتے کہ اتنا بڑا ہے کہ بھیڑیا نہیں شیر لگتا ہے۔ اس پاگل کتے نے گلی کے بہت سارے دوسرے کتوں کو کاٹ لیا ہے۔ اور اس زہر کے اثر سے وہ بھی پاگل ہو گئے ہیں۔ ہر آتے جاتے پر لپکتے ہیں کاٹتے ہیں۔ افواہوں کی تصدیق ہونے لگی اور شہر کے اسپتالوں میں ناقابلِ علاج مریضوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اخباروں کی سرخیاں بڑھنے لگیں اور ایک بار پھر سارے شہر میں دہشت پھیل گئی آج کے اس ترقی یافتہ دور میں کتے کے کاٹے کا علاج نہ ہو ایسا نہ تھا لیکن کہا جا رہا تھا سے بیز کے انجکشن غائب کر دیئے گئے ہیں جو ہیں بھی تو ان میں ملاوٹ ہے اور فائدہ نہیں ہو رہا ہے۔ وبائی امراض کی روک تھام کرنے والے غفلت کی نیند سوتے رہے، جاگے تو دیر ہو چکی تھی اور زہر نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ لوگ سرِ شام گھروں میں بند ہونے لگے تھے۔ میں حالات سے بے خبر نہ تھا۔ دفتر میں، بازار میں، ہوٹلوں میں لوگوں کی بات چیت میں اس خوف کی پرچھائیاں کئی دنوں سے سرسرا رہی تھیں لیکن کام کاج بند کر کے گھر میں کوئی کتنے دن بیٹھ سکتا ہے پھر ہو سکتا ہے بات اتنی بھیانک نہ ہو جتنی بنائی جا رہی ہے۔ میں نے مسرت کو سمجھانا چاہا؛ محترمہ آپ ایک کتے سے اتنا ڈر گئیں! اس شہر میں ہر شخص پریشان بہت ہے اور پریشان ہونے کے اسباب بھی بے شمار۔ کتے تو بھونکتے ہیں، بھونکا کریں۔"

"نہیں یہ زہریلا کتا صرف بھونکتا نہیں، کاٹتا ہے اور اس کی ٹولی کے بے شمار کتے بھی یہی کر رہے ہیں۔"

"تم خواہ مخواہ ڈر رہی ہو۔ ایسا کچھ نہ ہو گا۔ میں پوری احتیاط برتوں گا۔ ٹھیک ہے نا؟ بس یوں گیا۔ یوں آیا۔۔"

گھر سے نکل کر باہر آیا تو دیکھا سڑک کی دونوں طرف جگہ جگہ پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ نکڑ پر بڑا سا بلیک بورڈ آویزاں تھا جس پر سفید اور لال چاک سے جلی حرفوں میں جانے کیا تحریر تھا۔ میں جلدی جلدی قدم اٹھاتا

[باقی صفحہ ۳۶ پر دیکھیے]

ساحل احمد

شہر میں کوئی مکاں میرا نہیں
کیا یہ نیلا آسماں میرا نہیں

دفن کتنی ہو گئیں نسلیں یہاں
آج بھی یہ گلستاں میرا نہیں

اب کسے اپنا کہوں میں شہر میں
ایک بھی تو مہرباں میرا نہیں

کیوں مرا جذبہ نہ صادق بن سکا
ثبت پتھر پر نشاں میرا نہیں

پوچھتے ہیں لوگ آخر کیوں پتہ
جب کہیں نام و نشاں میرا نہیں

جل گئی بستی دھواں ہی ہے دھواں
لگ رہا ہے گھر یہاں میرا نہیں

● ۴۶ چک الٰہ آباد ۔ ۲۱۱۰۰۳



سلطان سبحانی

تمام عالم کا تیر اُس کی کمان میں ہے
مگر یہ نازک سا دل تو تیرے امان میں ہے

ہر ایک نعمت اگرچہ تیرے جہان میں ہے
یہ ڈھول مٹی کا جشن میرے مکان میں ہے

بہت دنوں سے جہانِ نو، جو گمان میں تھا
مجھے پتہ تھا کہ عہدِ ماضی کی شان میں ہے

حدِ مکاں، لامکاں کے اسرار کھولتی ہے
یہ کون طاقت؟ مرے زبان و بیان میں ہے

میں اس کا ہو کر بھی اس کو ہرگز نہ دیکھ پاؤں
یہ کیسا رشتہ؟ کہ یوں لباسِ گمان میں ہے

میں ساری دیواریں توڑ تجھ تک پہنچ ہی جاؤں
مگر حصارِ انا مرے امتحان میں ہے

● ۱۹۴ ۔ ایم ۔ ایچ ۔ بی کالونی، مالیگاؤں ۔ ۴۲۳۲۰۳



اسعد بدایونی

سمجھتے ہم تھے کہ آنکھیں ہیں خواب دیکھنے کو
پتہ چلا کہ ملیں ہیں عذاب دیکھنے کو

عجیب شوق تھا آنکھیں بجھا کے بیٹھ گئے
گھروں سے نکلے تھے ہم آفتاب دیکھنے کو

بہت عجب ہے یہ دل چاہتا ہی رہتا ہے
کبھی تجھے کبھی خود کو خراب دیکھنے کو

یہ دیکھنا ہے کہ کس حال میں پلٹتے ہیں
جو چل دئے ہیں شبِ ماہتاب دیکھنے کو

تماشہ گاہِ خس و خار میں سب ایک سا ہے
بدیر دیکھنے گویا شتاب دیکھنے کو

تو خواب دیکھ سکے بس یہی غنیمت ہے
بہت سے لوگ ہیں تعبیر خواب دیکھنے کو

● ضیاء کمپاؤنڈ، مارس روڈ، علیگڑھ ۔ ۲۰۲۰۰۲



فاروق راهب
محلہ شانتی پوری، محلہ تاری، (بہار)

دہشت گرد

احساس کی ساری چنگاریاں اس میں زندہ تھیں!

تبھی تو وہ سفید برف پوش پہاڑیوں کی جان لیوا ڈھلانوں والی چوٹیوں پر دور تک دیوانوں کی طرح دوڑتا تھا اور اس کا پیچھا کرنے والی اس کی بھیڑیں تھک کر ہانپ کر اس سے بہت بہت پیچھے چھوٹ جاتیں اور جگالی کرتی ہوئی حیرت سے اس کی اڑانوں کو دیکھتیں ـــــ اور وہ قہقہے اچھالتا ہوا مڑتا، انھیں منہ چڑاتا اور اسی رفتار سے نیچے اتر کر وادی میں پھیلی ہری گھاس پر لوٹیں لگانے لگتا ـــــ اپنے جھونپڑے سے نکلتے ہی اس پر یہ دحشت سوار ہوتی تھی۔ وہ دوڑ دوڑ کر تمام مناظر ایک بارگی اپنے اندر سمو لینا چاہتا تھا۔ خود کو پیوست کر دینا چاہتا تھا ہر منظر میں بارش ہوتی تو گھنٹوں بھیگتا رہتا اور برفباری کے دوران برف کے سارے ذرات اپنی ہتھیلیوں پر رکھنے کی کوشش کرتا ـــ بچپن میں تو ماں اسے گھسیٹ کر اندر لے جاتی تھی۔

"مرے گا تو ایک دن اسی طرح!" یہ کہتی ہوئی وہ اسے گود میں سمیٹ کر آگ کے پاس بیٹھ جاتی۔

تو اسے اس کی دیوانگی کو ڈانٹنے جمیلہ آتی ـــ جمیلہ جو اس کے پڑوس میں رہتی تھی۔ اس کی سانسوں میں بچپن سے رچی بسی ہوئی تھی۔ جب اس کے قریب غراتی ہوئی آتی تو وہ ہتھیلیوں پر جمع برف اس کے سیب نما گالوں پر مل دیتا اور وہ جھنجھلاتی ہوئی اس کی چھاتی پر پیار کے گھونسے برسانے لگتی۔

"ایک دن تو میری جان بھی لے گا۔"

وہ اسے گود میں اٹھا کر قہقہے لگاتا ہوا وادی کے چکر لگانے لگتا اور وہ سہمی ہوئی اس کی چھاتی سے چپٹی اس کی گرم سانسوں کا مزہ لیتی ہوئی ہلکے ہلکے مسکراتی رہتی ـــــ جمیلہ کا خیال آتے ہی وہ پوری طرح بیدار ہو گیا۔

ذہن پر چھائی دھند صاف ہوتے ہی وہ سہم گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ دہشت گردوں نے اسے اغوا کیا ہے۔ ادھر چند دنوں سے اُن کی بستی میں ایسے واقعات پیش آ رہے تھے۔ کئی نوجوان غائب ہو چکے تھے۔ دہشت گرد بننے کے خوف سے ہی اس نے جھرجھری سی لی اور دل ہی دل میں اپنے دوست کو کوسنے لگا۔ شام میں وہ اس کے گھر اسی کے ساتھ قہوہ پی رہا تھا کہ اس پر غشی سی طاری ہوئی تھی اور... اور

اسے اپنی سوچوں کو یہیں روکنا پڑا۔ کیونکہ دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا تھا اور کمرے میں روشنی کے گھستے ہی ہتھیاروں سے لیس کئی افراد داخل ہوئے تھے۔

"تمہاری کوئی بھی غلط حرکت تمہاری موت بن جائے گی۔" ان میں سے ایک نے کہا اور اس کے ہاتھ پیر کھول دیئے۔ "بس خاموشی سے ہمارے پیچھے چلے آؤ۔"

وہ اسے گھیرے میں لئے ایک بڑے میدان میں آ کر رک گئے جہاں پہلے سے ہی کچھ لوگ جمع تھے۔ ان میں اس کی بستی سے اغوا کئے ہوئے جوان بھی موجود تھے۔

"سنو!" ایک لمبا شخص جو دیکھنے میں انتہائی خطرناک لگ رہا تھا، اس سے مخاطب ہوا۔ "تمہیں باز پارٹی کا رکن نامزد کیا گیا ہے۔"

"لل... لیکن" وہ ہکلایا۔

"سمجھاؤ اسے۔" اس نے پھنکارتے ہوئے اپنی بغل میں کھڑے ایک آدمی سے کہا۔

"یہی باز ہیں اور ہمارے گروپ کے سرغنہ بھی ـــــ اور جب یہ بولتے ہیں تو ہم صرف سنتے ہیں۔ ورنہ ان کی آواز سے آواز ملانے والا زندہ نہیں رہتا۔"

"ہم تمہاری ریاست میں تمہاری مدد سے اپنی حکومت قائم کرنا

چاہتے ہیں۔ جس میں تمہاری برابر کی حصہ داری ہوگی۔"

یہاں وہ کہنا چاہتا تھا کہ اپنی حکومت میں تو وہ آج بھی برابر کا شریک ہے۔ لیکن کچھ سوچ کر چپ رہا۔

"تمہاری یہاں سے بھاگنے کی کوشش یا ہم سے غداری صرف تمہاری ہی نہیں، تمہارے پورے خاندان اور جیلہ کی بھی تباہی کا سبب بن جائیگی۔"

جیلہ کے نام پر وہ چونکا تو باز کے ہونٹوں پر ایک سفاکانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ٹھیک ہے" یہ کہتا ہوا وہ جانے کے لئے مڑ گیا اور اس نے خود کو بدلے ہوئے حالات میں ڈھلنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ جلد ہی بہت کچھ سیکھ اور جان گیا۔ دہشت گردی کے ہر فن کا وہ ماہر ہو گیا تھا۔ اس کی بہادری اور چستی کو دیکھ کر باز بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اسے اپنا نائب مقرر کر دیا ——— اور دو سال بعد جب ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں تو اسے ایک بار پھر اپنی وادی میں لوٹنے کا موقع ملا۔

خودرو جھاڑیوں اور لمبی گھاسوں سے گھرے ایک بہت پرانے مسمار قلعے کے محفوظ تہہ خانوں کے ایک بڑے ہال میں آج رات ان کی ایک اہم میٹنگ ہونے والی تھی۔ وہاں کے انتظام کی ذمہ داری اسے سونپی گئی تھی۔

آج کی رات اس پر بہت بھاری تھی۔ آج اس تاریخ کا تعین ہونا تھا، جب ایک ہی روز ایک ہی وقت میں پوری ریاست دھماکوں سے تھرتھرا جاتی ——— جب ہتھیاروں کے سارے عکس ہال میں رکھ دیئے گئے اور ہال میں سناٹا ہو گیا تو اس نے اپنا خوفناک کھیل شروع کر دیا۔ اپنی کامیابی پر پوری طرح اطمینان ہو جانے کے بعد اس نے ہال کا ایک سرسری جائزہ لیا اور تہہ خانے سے باہر نکل آیا۔ وہ دھیرے دھیرے وادی میں اترا۔ شام کی بڑھتی خاموشی میں پورے چاند کی چاندنی کی سنسناہٹ کے تیز مگر بوجھل قدموں کے ہمراہ چلتی ہوئی ایک مکان کی کھڑکی کے پاس آ کر رک گئیں۔ جمیلہ اسے دیکھتے ہی اچھل کر کھڑی ہوئی اور بھاگتی ہوئی آ کر اس کے جسم سے چپکی اور رونے لگی۔ اس نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑتے ہوئے خود سے جدا کیا اور کہا۔

"سن، تو مجھے دہشت گرد نہ سمجھنا اور گواہ رہنا کہ نصیری وطن فروش نہیں تھا ——— بس خدا حافظ" یہ کہہ کر وہ ایک جھٹکے سے الگ ہوا اور سے تیز تیز چھوڑ کر تیز قدموں سے چلتا ہوا پہاڑیوں میں گم ہو گیا۔

ہال میں جب وہ داخل ہوا تو سبھی پہونچ چکے تھے۔ باز نے دیکھتے ہی چہکا۔

"ارے نصیری! آؤ، آؤ۔ تمہیں ہی تو گروپ تشکیل دینا ہے جو ریاست کے گوشے گوشے میں جا کر دہشت پھیلائیں گے۔"

اس کی باتیں ختم ہوتے ہی نصیری نے اپنی گھڑی کے بٹن پر انگلی پھیری اور ایک زبردست دھماکے کے ساتھ سب کے پرخچے اڑ گئے ——— اور اس کے بعد صرف دھماکے ہی رہ گئے۔

دہلا دینے والے دھماکوں سے جب وادیاں لرزنے لگیں تو جمیلہ چیختی ہوئی اپنے مکان سے باہر نکلی۔

"زندہ باد نصیری! زندہ باد!" اور ہتھیلیوں میں منہ چھپا کر بلکنے لگی۔ ✻

بقیہ صفحہ ۲۴ کتاب

بقیہ صفحہ ۲۴

شانتی چوک تک پہنچ گیا۔ چھٹی کا دن تھا لیکن چوک میں پہلی سی گہما گہمی نہ تھی۔ اکّا دکّا لوگ آجا رہے تھے، سہمے سہمے تیز قدموں لاستا تا پیچھے چوک سے بائیں طرف لائبریری جانے والے راستے پر مڑا ہی تھا کہ گرجدار غراہٹ سنائی دی۔ اور سان خطا ہو گئے۔ سامنے وہی بھیانک لیکن لاغر جسم کا سرخ آنکھوں والا کتا کھڑا تھا۔ وہ بدستور غراتا اور خونخوار آنکھوں سے مجھے تاک رہا تھا۔ نتھنوں سے مٹی اور دھول اڑا تا یوں لگ رہا تھا کہ کوئی پل میں جست لگا کر مجھے آن دبوچے گا۔ اس کی تیاری صاف نظر آ رہی تھی۔ میری زبان خشک تھی چہرہ پسینے میں تر تھا اور آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ خوف کے مارے سارے بدن میں کپکپی تھی اور دماغ جیسے ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ کتا چھلانگ لگا ہی رہا تھا کہ اچانک انتہائی بیکا نیکی انداز سے میرے دونوں ہاتھ مدافعت کو اُٹھے۔ اس طرح کہ بیچ دبی ضخیم کتاب تھی ——— کسی ڈھال کی طرح سامنے سے ہونے والے وار کو روکتی ہوئی، میرا واحد دفاع! — اور پھر وہ ہوا جس کا سان و گمان بھی نہ تھا۔ کتا جھجکا، سہم کر پیچھے ہٹا پھر مارے خوف کے یوں لرز اٹھا جیسے ان دیکھی طاقتوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا ہو ——— اس کے منہ سے دبی دبی چیخ نکلی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پیچھے پلٹا، اور دُم دبا کر بھاگ کھڑا ہوا ——— ✻



فاروق شفق

طبیعت کو وہی یک رنگ دیکھوں
خود اپنے آپ میں اک جنگ دیکھوں

وہی ہر چار جانب زرد آندھی
وہی موسم کو میں بے رنگ دیکھوں

دھواں آنکھوں میں بھرتا جا رہا ہے
زمین اور آسماں ہم رنگ دیکھوں

جدھر دیکھوں فضا ساری کشیدہ
جہاں جاؤں زمیں کو تنگ دیکھوں

کہیں کچھ بھی بدلنے کا نہیں ہے
مگر کچھ روز یہ بھی رنگ دیکھوں

یہی اپنے لئے اب رہ گیا ہے
زمانے کے نرالے ڈھنگ دیکھوں

سفر آساں سا لگنے لگا ہے
قدم راہوں سے ہم آہنگ دیکھوں

● جی۔ ۱۸۵، دھان کھیتی، گارڈن ریچ۔ کلکتہ۔ ۲۴



بلراج کمار

اگلی نسلوں کے لئے زرد ہوائیں رکھنا
حکم شاہی تھا کہ ورثے میں خزائیں رکھنا

ٹوٹ جائے نہ کہیں شہر خموشاں کا فسوں
زیب دیتا نہیں آنکھوں میں صدائیں رکھنا

مل ہی جائیں گے طلبگار ہزاروں اے دوست
میری خاطر ہی بچا کر نہ دعائیں رکھنا

دل تو پہلے ہی سے اجڑے ہوئے ویرانے تھے
اب ضروری ہے سروں میں بھی خلائیں رکھنا

دوڑتے پھرتے ہیں گلیوں میں اندھیرے کے دائیں
آجکل ہاتھ میں مشکل ہے شعائیں رکھنا

پھر کوئی فکر کے صحرا میں نہ بھٹکے بلراج
ڈھونڈ کر اپنے لئے ایسی سزائیں رکھنا

● پلاٹ نمبر ۴۰، اودھم پور ۔ ۱۸۲۱۰۱ (کشمیر)



پرویز رحمانی

گیت

زمیں یا آسماں کیا تھا
ہمارے اور اس کے درمیاں کیا تھا

خلا تھی خامشی تھی تیرگی کیا تھی
کراں تا بہ کراں کیا تھا

کوئی خوشبو تھی کوئی رنگ تھا یا روشنی کیا تھی
جبینِ خاک پر آخر نہاں کیا تھا

ہے آدم سر بہ دو زانو
مقدر بھی زمیں تو پھر جوازِ امتحاں کیا تھا

ہماری نامرادی کا سبب کوئی تو بتلائے
خدا نامہرباں یا مہرباں کیا تھا

کہاں، کیوں، کس لئے ہے وہ، الجھنا کیا
خدا ہی تھا وہاں پر بھی جہاں "کیا" تھا

اُسی کو علم ہے پرویز رحمانی
ہمارا اس کا رشتہ کب کہاں کیا تھا

● نیو رحمت کالونی، ڈورنڈہ، رانچی۔ ۸۳۴۰۰۲



سریندر پرکاش

۴/۱۴ بیگ دادا آشرم، جنس۔ روڈ مارگ، کالینا بمبئی ۹۸

فسانے

قسط نمبر ۲۰

کبھی فوج کی یہ درخواست پیش ہوتی تھی کہ دیوان دینا ناتھ نے بڑا مال خالصہ کا کھایا ہے تو وہ ایک ایک اشرفی طلائی خالصہ کو دیں۔ کبھی بخشی بھگت رام کبھی راجہ نہال سنگھ پر طمع کی نظر ہوتی تھی۔ جب تمام اہلکار دربار نے جانا کہ اب جان کا بچانا سکھوں کے ہاتھوں سے سخت مشکل ہے اور سرکوبی ایسی زبردست فوج کی سوائے صاحبان انگریزی بہادر کے کسی سے نہیں ہوسکتی مناسب ہے کہ ان کو صاحبان انگریز بہادر کے ساتھ لڑنے کے لئے مستعد کیا جائے چنانچہ بعد تجویز و تدبیر ایک جلسہ بمقام شالامار قرار پایا اور اس جلسہ میں تمام پنچان فوج بلائے گئے اور ان کے روبرو بیان کیا گیا کہ خالصہ جی صاحبان انگریز نے آج کل اپنی قدیمی عہد و پیمان جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ کیے گئے تھے۔ بالکل لوح خاطر سے محو کر دیئے ہیں۔ چنانچہ موضع موڑاں جو شمال علاقہ از روئے دریائے ستلج کے سرکار لاہور کا حق تھا لاجنا انھوں نے فیصلہ کر دیا اور انگریز اس کے ہرگز پرساں حال نہ ہوئے۔ راجہ سوچیت سنگھ کا پندرہ لاکھ روپیہ جو مقام فیروزپور رکھا تھا وہ بھی انہوں نے نہ دیا۔ بہتر یہ ہے کہ خالصہ جی اس میں کمر ہمت باندھ کر اور صاحبان انگریز سے جنگ کریں تاکہ انگریزوں کے دل پر بہادری خالصہ جی کی نقش ہو جائے اور آئندہ کبھی خالصہ جی کے حق میں دست انداز نہ ہوں۔ یہ بات سنتے ہی فوج نے بڑا تعجب کیا اور کہا کہ انگریزوں کی کیا طاقت ہے کہ خالصہ جی کے ملک و مال کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہایت تیزی اور تندی کے ساتھ ۱۱ دسمبر ۱۸۴۵ کو سکھی فوج لدھیانہ وغیرہ مقامات پر روانہ ہوگئی۔ شروع ماہ دسمبر میں یہ خبر انگریزوں کو پہنچ گئی تھی کہ لاہور سے سکھی فوج صاحبان انگریز کے ساتھ لڑنے کو آئی ہے۔ اس وقت نواب گورنر جنرل بہادر بمقام انبالہ صاحب کمانڈر انچیف بہادر سے ملا اور تجویز پیش کی کہ فوج اضلاع مغربی مقامات سے آکر بمقام فیروزپور لدھیانہ جمع ہو چنانچہ انہیں ایام میں سترہ ہزار آدمی اور اکثر ضرب توپ ان دونوں مقامات پر آموجود ہوئی اور

لارڈ ہارڈنگ بہادر نے لدھیانہ کے قلعہ کا نہایت استحکام کیا اور لارڈ ہارڈنگ صاحب بہادر بھی چالیس ہزار فوج اور توپ خانوں کے ساتھ سکھوں کے مقابلہ کے لئے مستعد و تیار ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سکھوں کی فوج کا ۔ ۔ ۔ ۔ تخمینہ ساٹھ ہزار سے زیادہ تھا۔ فوج سکھی کے سپاہی اور سپہ سالار سردار تیج سنگھ اور راجہ لال سنگھ سردار شام سنگھ اٹاری والا قرار پائے اور تمام فوج لاہور سے تین فوج بن کر روانہ ہوئی راستہ میں اس فوج نے اپنے ملک میں بڑی زبردست دست اندازیاں کیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تمام فوج جب دریائے ستلج کے کنارے پر پہنچی تو انگریزوں نے بہت سے اشتہار اس مضمون سے بھیجے کہ سرکار انگریزی کی دوستی لاہور کی ریاست کے ساتھ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے قائم کی اور اس روز سے آج تک فریقین میں سے کوئی مرتکب عہد شکنی کا نہیں ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب بھی خالصہ کو مناسب ہے کہ دریا نہ اترے اور لاہور کو واپس جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یہ اشتہار بہت سے افسران فوج کے ملاحظہ میں گزرے مگر جب افسران کو فوج کو قتل کرانا ہی منظور تھا تو اس پر عمل کیوں کر ہوتا۔ جب فوج سکھی دریا سے اتر گئی صاحبان انگریز بڑی سختی کے ساتھ ان کے مقابل ہوئے اور پانچ لڑائیاں فریقین میں ہوئیں۔ پہلی لڑائی موضع مدکی کے مقام پر ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ یہ دسکھی، فوج انگریزوں کے مقابل بڑی چستی و چالاکی کے ساتھ ہوئی اور بڑی تیزی اور تندی سے لڑی۔ لڑائی کے وقت ان کا قدم پیچھے نہ ہٹا۔ صاحبان انگریزی کی طرف سخت آگ برسائی گئی اور پیادہ فوج نے ایسی بہادری سے جنگ کی کہ اگر ایک ساعت تک لڑائی رہتی تو میدان سکھوں کے ہاتھ رہتا۔ جب راجہ لال سنگھ سپہ سالار نے دیکھا کہ میری فوج بڑھتی جاتی ہے یقین ہے کہ فتح یاب ہو گی چاہا کہ بھاگ جائے اور اپنی فوج کو شکست دلائے۔ کیوں کہ اصلی مطلب اس کا فوج کو ذلیل کرنا تھا یہ سوچ کر وہ آٹھ ہزار سوار کے ساتھ میدان سے بھاگا جب افسر ہی بھاگ گیا اور سوار بھی چل دیئے تو لڑنے والی پیادہ فوج میں

سے بہت سا حصہ بھاگ آیا۔ صرف گیارہ ہزار سپاہی اور توپ خانہ تیار رہا ۔۔۔۔۔ اس وقت انگریزوں نے پے در پے حملے سکھوں پر کیے جس سے وہ عاجز و بے دل ہو گئے اور ستر توپیں میدان میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ انگریزوں نے ان کا تعاقب کر کے ایسا قتل کیا کہ ایک کا دوسرا خبر گیر نہ تھا۔ اس لڑائی میں چھ سو ستاون آدمی انگریزوں کے زخمی ہوئے اور دو سو مارے گئے۔ مسٹر براڈ فٹ صاحب ایجنٹ انگریزی بھی مارے گئے اور دوسری لڑائی بھائی پھیرو کے مقام پر ہوئی۔ سکھی فوج بارہ پلٹن اور دس رجمنٹ سواران اور سو ضرب توپ تھی۔ اس فوج کے مقابلے پر سر ہیو گف بہادر سپہ سالار اور لارڈ ہارڈنگ صاحب گورنر جنرل بہادر موجود تھے ۔۔۔ دونوں طرف سے گولہ باری ہوئی سکھوں کی ایک سو ضرب توپ چلتی دور دور تک اس کی مار ہوتی ۔۔۔۔۔ انگریزی فوج کمال بہادری اور مردانگی سے آگے بڑھتی آئی۔ سکھوں نے ان کے حملے سخت زور اور قوت کے ساتھ روکے۔ سردار تیجا سنگھ سپہ سالار اس فوج کا علیحدہ کھڑا ہوا لڑائی دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کو دل میں ایسی سوجھی کہ بے سبب و باعث بھاگ اٹھا۔ جس قدر اس کی گھر کی فوج اس کی حفاظت میں تھی وہ بھی بھاگ جانے میں اس کے ساتھ شامل ہوئی۔

اس کی فوج نے جب دیکھا کہ سپہ سالار بھاگ گیا ہے اور بہت سی فوج بھی ہمراہ لے گیا ہے تو وہ فوج بھی بے دل ہو گئی اور ستر توپیں میدان میں چھوڑ کر بھاگ آئی۔ وہ سب توپیں اور سامان میگزین جو میدان میں چھوڑ گئے تھے انگریزوں نے لے لیا ۔۔۔۔۔ تیسری لڑائی لدھیانہ کے متصل ہوئی اور اس کی تشریح اس طرح ہے کہ ایک فوج سکھی کا سردار رنجودھ سنگھ مجیٹھیہ کے ماتحت مع فوج نہال سنگھ اہلو والیہ، راجہ جیت سنگھ لاڈوہ والہ متصل لدھیانہ کے اترا ہوا تھا اور فرودگاہ موضع بدووال تھا جب انگریزی فوج نے تحت جنرل سمتھ صاحب بہادر کا سکھوں کے سامنے اتفاقاً گزر ہو گیا تو سکھوں نے ان پر گولہ باری شروع کی ۔۔۔۔۔

تھوڑی دیر لڑائی ہوتی رہی آخر بسبب اس کے انگریزی فوج تھوڑی تھی۔ میدان چھوڑ کر لدھیانہ چلی گئی ۔۔۔۔۔ جب لاہور میں خبریں پہنچ گئیں کہ دو طرف سکھی فوج نے شکست کھائی اور کمال نقصان اٹھایا ہے تو رانی جنداں مدار المہام سلطنت نے ستر سوار روانہ کر کے فی الفور راجہ گلاب سنگھ کو لاہور طلب کیا اور وزارت کا خلعت دے کر اس کو وزیر اور امور سلطنت اس کے تفویض کیے۔ چوتھی لڑائی علی وال اور جونڈری کے مقام پر ہوئی۔ اس کا حال یہ ہے کہ جب فوج جنرل سمتھ صاحب کی شکست کھا کر لدھیانہ میں پہنچی بٹھے کمپو کو جنہوں نے مدد کے لیے طلب کیا جب فوج مدد کو آ گئی تو دوبارہ لڑائی شروع ہوئی۔ جب لڑائی خوب گرم ہوئی تو سردار رنجودھ سنگھ بہادر بزدل ہو کر سب سے اوّل ہو کر بھاگا مگر فوج نے اس کے بھاگ جانے کی پروا نہ کی اور بدستور لڑائی جاری رکھی۔ آخر افسر کے بھاگ جانے سے بے دل تو تھی جب انگریزوں کی طرف سے کمال زور پڑا تو بھاگ نکلی۔ انگریزوں کی فوج نے ان کا تعاقب کیا اور دریا کے کنارے تک پیچھا کیے ہوئے چلی گئی۔ سکھوں نے بے اختیار اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیا اور سیکڑوں پانی میں غرق ہو گئے ۔۔۔۔۔۔۔ پانچویں لڑائی سبراؤں کے مقام پر ہوئی اس میں سکھی فوج تیس ہزار جوان سکھ پیادہ و سوار اور ستر توپیں تھیں جب لڑائی گرم ہوئی فریقین سے بڑے حملے فریقین پر ہوتے ۔۔۔۔ سردار تیج سنگھ جرنیل سپہ سالار یکایک میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ۔۔۔۔ پھر بھی فوج نے قدم پیچھے نہ ہٹایا اور برابر میدان گرم رکھا۔ جب دوسرا افسر شام سنگھ اٹاری والہ بھی مارا گیا تو پھر فوج کا حوصلہ باقی نہ رہا اور بے اختیار ہو کر بھاگے۔ مگر انگریزوں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور مارتے مارتے دریا تک لے گئے باقی ماندہ دریا میں غرق ہو گئی ۔۔۔

اس لڑائی کے بعد سکھوں کی لڑائی ختم ہو گئی اور انگریزوں کو رو برو کوئی لڑنے والا نہ رہا۔ نواب گورنر جنرل بہادر فی الفور دریا ستلج پار آیا اور مع بیس ہزار فوج جمار کے مقام قصور ڈیرا کیا۔ [جاری]

بقیہ صفحہ ۱۹ کس کی کہانی

بقیہ صفحہ ۱۹

واقع ہو رہی ہے ———"

میں منہ کھولے چپ چاپ سن رہا تھا۔ انل کمار کہہ رہے تھے

" پچھلے پچاس سالوں میں بڑی تبدیلی آئی ہے اردو افسانے میں ہماری کہانی نے ان پچاس سالوں میں اتنی ترقی کی ہے کہ ہم اسے [illegible] دنیا کے کسی بھی ———"

گھسیٹا نے پاؤں کی چپتی ہوئی "کھڑیاں" آگے کرتے ہوئے کہا!

"۔ کس کی کہانی کی بات کر رہے ہو بھائی صاحب؟ جن کی کہانی لکھتے ہو، وہ تو وہیں کے وہیں پڑے ہیں۔ میں اپنے باپ کی جگہ بیٹھا ہوں اور آپ اپنے بھائی صاحب کی "بیٹھک" چلا رہے ہو ترقی کون سی کہانی نے کر لی ——— ؟"

"کھڑیاں" دے کے گھسیٹا ایک چپل کے انگوٹھے کا ٹانکا لگانے میں مصروف ہو گیا۔ ✻

دھنک رنگ

[redacted]

مصباح السمیع

دور تک پھیلے سمندر اور میں
پھیر دی آنکھوں میں منظر اور میں
برف کی بارش میں جلتا ہے بدن
مفلسی کی کہنہ چادر اور میں
اک سمندر سی بظاہر خامشی
ایک طوفاں اندر اندر اور میں
آئینے پر کیوں خراشیں آگئیں؟
روبرو ہے میرا پیکر اور میں
دوسرا کوئی نظر آتا نہیں
ایک سایہ ہے برابر اور میں

● ۴۳۲/ظہرہ باغ، سول لائنس دودھ پور علیگڑھ

شناور کرتپوری

اے ہوا ساحل کی جانب، مجھ کو کن منزلوں کا نشاں چاہیے
شکوہ کربِ اہل کربلا، میت کشتیوں کیلئے بادباں چاہیے
جنگلی تیز سنگیوں پر چلنے نہیں بیٹھ پر وار کرنے کا دستور ہے
اپنے شانے پہ ترکش کو باندھے ہوئے اک سپاہی میں کارواں چاہیے
زندگی کی ہتھیلی پہ لکھا ہوا کالے حرفوں میں کس کا مقدر ہوں میں
چاند منظرِ شب میں چمکتا ہوا کہہ رہا ہے مجھے آسماں چاہیے
میں کہ سرسبز شاخوں پہ بیٹھا ہوا آس میں زرد کا آخری پھول ہوں
کون جانے ہواؤں سے کیسے بچے مجھ کو کوئی نہیں باغباں چاہیے
ہر طرف مستقل تیرگی آشنگی رقص کرتا ہوا دستِ بے چارگی
اے خدا منصفوں کے مقدس خدا تیرے بندوں کو امن و اماں چاہیے

● میراج گیمیٹی، کرتپور، بجنور، یوپی

رؤف رضا

جو بھی کچھ اچھا برا ہوتا ہے جلدی ہو جائے
شہر جاگے یا مری نیند ہی گہری ہو جائے
یار اکتائے ہوئے رہتے ہیں اب غزلوں سے
آج کی شام کوئی جھوٹی کہانی ہو جائے
یاد آئے تو بدلنے لگے گھر کی صورت
طاق میں جلتی ہوئی رات پرانی ہو جائے
یوں بھی ہو جائے کہ برتا ہوا رستہ نہ ملے
کوئی شب لوٹ کے گھر جانا ضروری ہو جائے
ہم سے کیا پوچھتے ہو شہر کے بارے میں رضا
بس کوئی بھیڑ جو گونگی کبھی بہری ہو جائے

● ۶۷۰ بازار چتلی قبر — دہلی ۶

عشرت واحد قریشی

ترے مزاج میں اترو ں سوال کی حد تک
یہ انتظار نہ پہنچے ملال کی حد تک
کسی کی سوچ پہ پابندیاں نہیں پھر بھی
یہ وقت یاد رہے۔ اعتدال کی حد تک
دباؤ ایسا بھٹک جائے اپنی سمتوں سے!
ہو احتجاج تو لیکن مجال کی حد تک
مرے غنیم مجھے تیغِ بے نیام نہ دے
میں چاہتا ہوں رہوں صرف ڈھال کی حد تک
بساطِ جنگ کی پیمائشیں لہو والی
مگر شعور ہے میرے کی چال کی حد تک

● ۱۱ — پولس کا ہیلیکس جاورہ کمپاؤنڈ — اندور

خواب اکبرآبادی

جو دل کی کیفیت ہے وہ بیاں ہے
تصور کی مجھے فرصت کہاں ہے؟
کہاں سے آرہی ہیں یہ صدائیں
مرے اندر بھی کیا کوئی نہاں ہے؟
خلا میں کچھ زمینیں اور بھی ہیں
مگر سب کا وہی اک آسماں ہے
کہیں کچھ جل رہا ہے میرے اندر
گھٹا جاتا ہے دم ایسا دھواں ہے
ملا ہے جسمِ ظاہر کو ٹھکانہ
مگر دل خواب اب بھی بے مکاں ہے

● اے-۲ کملا نگر — آگرہ

تحسین منور

کالی گھٹا نے گھیر لیا تھا
اس دن چاند بہت رویا تھا
رات نے خیمے گاڑ دیئے تھے
سورج بھی تو ڈوب گیا تھا
دیواریں رنگین ہوئی تھیں
اندر سے گھر ٹوٹ رہا تھا
تم بھی ہمت ہار چکے تھے
میں بھی شاید ٹوٹ گیا تھا
اس کے گھر کے دروازے پر
پہلے میرا نام لکھا تھا!

● ۱۶۵ حوض رانی مالویہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

مکتوب

★شمس الرحمٰن فاروقی — معرکی، نئی دہلی
"اُردو کی نئی بستیاں" کے تحت ساقی فاروقی اور عرفانہ عزیز خوب ہیں۔ یہ عنوان اور منصوبہ بھی خوب ہے۔ شعرائے مہجر کو خاص طور پر شائع کیا جائے۔ بشیر بدر پر ندا فاضلی نے اچھا لکھا ہے۔ ان کی خود نوشت (یا خود نوشت پر مبنی ناول) اُردو میں غیر معمولی چیز ہے۔ آپ نے پہلے اسے باقاعدہ شائع کر کے اچھا کام کیا ہے۔ ندا نے خود نوشت لکھی ہے۔ لیکن خود کو جس طرح پس منظر میں رکھا ہے اور قصے کو زمانۂ حال میں بیان کر کے اسے بالکل نیا رنگ دے دیا ہے۔ یہ دونوں باتیں اس کتاب کو ممتاز کرتی ہیں۔

★بشیر بدر — بھوپال اپارٹمنٹ، کوہِ فضا، بھوپال
ندا کے مضمون اور غزلوں کی اشاعت کا شکریہ۔ مضمون اس نے لکھا ہے کہ ندا اس سے زیادہ سچی تعبیر و تاثر سے بھی نہیں نبھا سکتے۔ ہم سب اپنی نفسیات کا احترام کرتے ہیں اور کرنا چاہیے۔ مرا افسانہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو زندگی انہوں نے جی ہے اور اب بھی جی رہے ہیں اس سے فرار حاصل کر کے وہ اپنے گیتوں میں ۱۹۵۰ء، ۱۹۶۰ء کی لڑکیوں کا معصوم سا عشق لوٹانے اور ۱۹۵۰ء کی لڑکی سے مونا سینما جانے میں کامیاب ہیں۔ ان کی زندگی میں شاید وہ عورت آئی نہیں جو صحیح معنوں میں فن کی روح کا عکس ہوتی ہے۔ میں ندا سے محبت کرتا ہوں۔ میری محبت میں کتنی بڑی سچائی ہے کہ بغیر پڑھے لکھا ایسا مضمون لکھ دیا جس میں کوئی بھی بڑی بات سچ نہیں ہے۔ لیکن کچھ باتوں پر یقین کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کسی کی ذاتی زندگی میں جھانکنا ادب کے دائرے سے باہر ہے۔ انہیں یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے تخیل میں یہ پاکیزگی ہے کہ وہ تجربے کو ہنسا کر زندگی کی خوشبو لیتے ہیں۔ وہ اپنے تخیل سے ساحر لدھیانوی سے ایسی ملاقاتیں کرتے ہیں کہ باقر مہدی، ساحر سے اچھے شاعر لگنے لگتے ہیں۔ میں کیا اور میری بساط کیا، اگر وہ ہی لگا کر خدا پر مضمون لکھ دیں تو شیطان (نعوذ باللہ) پاک، صاف و دانا نظر آنے لگے۔ ندا پورے ایمان سے جھوٹ بولتے ہیں اسی لئے فن کار نظر آتے ہیں۔

مظہر امام — ۶ ماڈل ٹاؤن — ایکس — ... — دہلی —۹
"شاعر" کے عام شماروں کو بھی انفرادی رنگ عطا کرنے کی کوشش تحسین ہے۔ شمارہ ۱۰ — ۹ (۹۲) میں "لہو رنگ لہجے" کے عنوان کے تحت اس دور کے سب سے بڑے المیہ پر آپ نے شعرا کی تازہ ترین نظمیں اور غزلیں شائع کیں اور ۲ کے آخری شماروں کو آپ نے "اُردو کی نئی بستیوں" میں مقیم ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات کے لئے وقف کیا۔ یہ ایک قابل قدر کام ہے۔ دیارِ غیر میں آباد محبانِ اُردو کی تخلیقی کاوشوں کو ایک جگہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک کی تحریر اعلیٰ معیار کی حامل نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان نگارشات کو پڑھ کر ان اطراف کی خیریت اور احوال کے ساتھ لکھنے والوں کی تخلیقی صلاحیتوں کے بارے میں مجموعی طور پر ایک تاثر قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ جو معروف نام ہیں۔ ان سے تو خیر ہم آشنا ہیں۔ ان شماروں پر تفصیل سے اظہارِ خیال فی الحال ممکن نہیں۔ بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن پر بعض سامنے کے تسامحات کی گرفت کریں گے۔ شاہد فریدی نے "بے محابہ" استعمال کیا ہے جو سرے سے کوئی لفظ ہے ہی نہیں۔ اصل لفظ "بے محابا" ہے۔ فراق گورکھپوری کی اعلیٰ غزل میں دو مصرعے یوں درج ہیں

تلاش کر کوئی دل فریب نیا عنوان
اور نظر نجوم نہیں آتے تعاقب میں ہوں

دوسرے مصرعے میں "آتے" کے بعد "ہیں" تو فالتو ہے اب سے غلط ثابت کیا ہو، لیکن دوسری غلطیاں تو شاعر کی ہیں۔ محبت پر آپ کی ذمہ داری تھی کہ آپ یا تو ان کی تصحیح فرما دیتے یا ان اشعار کو قلم زد کر دیتے۔ بہتر ہے "شاعر" جیسے موقر جریدے میں اس طرح کے سامنے کے تسامحات نہ ہوں۔

شین صفر ادیب — 65 BLACKBURN STREET BLACKBURN BB1 7NG LANCS U.K.
مشکور فرمائیے آپ نے غیر ممالک میں آباد اُردو قلم کاروں کے لئے وقف کیا ہے اور میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ شمارہ پچھلے شماروں کی نسبت بہتر ہے۔ کتابت، طباعت، تخلیقات کا انتخاب اور ترتیب سب کچھ عمدہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس معیار کو برقرار رکھیں گے۔ ہندو پاک میں یہ عام رجحان ہے کہ یورپ اور امریکہ میں آباد اُردو ادیبوں اور شاعروں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ادبی رسالوں کا مطالعہ کیجئے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ برصغیر ہند و پاک سے باہر اُردو زبان و ادب کا کوئی وجود نہیں ہے۔ تنقیدی مضامین اور ادبی جائزوں میں مغرب یا امریکہ کے تخلیق کاروں کا کوئی ذکر نہیں ہوتا حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ مغرب میں بہت اچھا شعر بھی کہا جا رہا ہے اور بہت اچھا افسانہ بھی لکھا جا رہا ہے۔ اور میں تو یہاں تک کہوں گا کہ مغرب میں اُردو ادب کی ایک نئی روایت قائم ہو رہی ہے۔ جس کا ہندوستان اور پاکستان کے افسانے یا شعر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ "شاعر" کا یہ شمارہ جو "اُردو کی نئی بستیاں" کے تحت شائع ہوا ہے۔ ہند و پاک میں اُردو زبان و ادب کے ناقدوں کو بتائے گا کہ لندن، ناروے، سویڈن، جرمنی، امریکہ اور کینیڈا میں اُردو کے لئے کتنا کام ہو رہا ہے۔ اور تب امید ہے کہ وہ مغرب میں آباد اُردو قلم کاروں کا نوٹس بھی لیں گے۔ اتنا اچھا شمارہ شائع کرنے پر آپ کو مبارک باد۔

حمیرہ رحمان — 3-YOUNG AV YONKERS NY 10719 U.S.A.
"اُردو کی نئی بستیاں" ایک اچھی کوشش ہے۔ دنیا اب اس طرح ایک دوسرے کے قریب آ گئی ہے کہ اُردو دنیا کا رابطہ استوار ہونا اور ایک دوسرے کے بارے میں جاننا ایک اہم ضرورت بن چکا ہے۔ نیویارک میں ظفر زیدی میموریل کلچرل سوسائٹی گزشتہ دس سال سے جواں مرگ شاعر ظفر زیدی کی یاد میں سالانہ مشاعرہ کرتی ہے اور اس بہانے سے نہ صرف شمالی اور جنوبی امریکہ بلکہ پوری دنیا کے مختلف ممالک سے شعرا اس میں شریک ہوتے ہیں۔ "اُردو کی نئی بستیاں نمبر" ان رابطوں کے سلسلے میں ایک اہم مدد کرے گا۔ ندا فاضلی کا مضمون بشیر بدر پر پڑھا۔ میں دونوں سے مل چکی ہوں۔ اس لئے صحیح معنوں میں پڑھ کر مزا آیا۔ یہ ایک دوست کا دوسرے دوست کے حق میں سچا خراجِ عقیدت ہے۔ اس مقالے سے اُردو کے بہت سے نام نہاد نقادوں کو سبق سیکھنا چاہیے۔

انور قمر — ۳۰۳ — اے گل اپارٹمنٹ، ۴۴۴ بی — سینٹ اینڈریوز روڈ، باندرہ، بمبئی —۵۰
بشیر بدر کی شاعری اور شخصیت پر ندا فاضلی کا مضمون "بشیر بدر — نئی شاعری کا ایک نام" پڑھ کر بہت ہی خوشی ہوئی۔ ندا فاضلی کی تحریر عام فہم اور دلکش ہے اصطلاحات سے بوجھل نہیں۔ انہوں نے اپنا مفہوم اور منظوم احساسات بڑی گہرائی سے بیان کر دیا ہے۔ بشیر بدر کی شاعری پر انہوں نے جو اعتراضات کئے ہیں ان میں یہ اعتراض بالکل بجا ہے کہ عوامی شہرت تخلیق کار سے جوہرِ لطیف چھین لیتی ہے اور اس کے فنِ تخلیق کو تماشے میں بدل دیتی ہے۔ اس بات کو ندا فاضلی نے جس پیرائے میں کہا ہے وہ طرزِ ادا کا بہترین نمونہ ہے۔

"——— ان کی عوامی مقبولیت کے کروڑوں شور رنج نے انہیں تروتازہ تو رکھا لیکن ان کی فطری نشوونما کو روک کر انہیں بون سائی بنا دیا۔" کیسا بلیغ جملہ ہے۔ "بون سائی" جاپانی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی بالشت بھر اور درخت بھی ہیں اور بالشتیہ درخت بھی۔ اس لفظ کے تخلیقی استعمال پر غور فرمائیے اور ندا فاضلی کی بصیرت کی داد دیجئے۔ سچ ہے مشاعروں کی بخشی ہوئی شہرت کو اچھی شاعری کا معیار بنایا جا سکتا ہے۔ یا نہیں اس بات کو موضوعِ بحث بنا کر ندا فاضلی نے ترقی پسندوں کے متعلق سے جو جملہ لکھا ہے "مشاعروں کی کامیابیوں نے کئی ترقی پسند نظریوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے" چوں کہ تعریض کی ذیل میں آتا ہے لہٰذا مواخذہ طلب ہے۔ "شاعر" کے توسط سے "ملاقاتیں" کے گم گشتہ مصنف کی بازیافت ہوئی ہے۔ ہمارا آپ کو حق حاصل ہے کہ آپ انہیں قصر الادب میں ضبط کر لیں۔

احمد سہیل — ALTER SQUARE APT H 42 7500-COOK ROAD HOUSTON TX 77072
شاعر کا "اُردو کی نئی بستیاں" نمبر/شمارہ پسند آیا۔ بہت سے اپنے جیسے دربدر لوگوں سے ملاقات ہو گئی جو لوگ تو یہاں رہ کر بھی نئے ڈھنگ کی شاعری کر رہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ ان شعرا کا کھلا ہوا ذہن ہو یا زندگی اور معاشرہ کا روشن خیال تناظر — جوگندر پال کے افسانے "فاختائیں" نے بھی متاثر کیا۔ اس افسانے میں ناسٹیلجیائی کیفیت شدت سے ابھر کر آئی ہے۔ حالانکہ اس موضوع پر پال صاحب نے شاید ہی کوئی افسانہ لکھا ہو۔ حامدی کاشمیری کے مضمون کا موضوع اچھا تو تھا مگر انہوں نے ہر مسئلے یا نکتے کو جلدی جلدی حوالہ بناتے ہوئے مضمون کا اختتام کر دیا۔ اُردو میں اسلوبیاتی یا ہئیتی تنقید کے علاوہ بات خاصی آگے تک چلی گئی ہے۔ شوکت صدیقی کا مضمون اُردو افسانے پر تشنہ لگا۔ اس میں پرانی باتیں ہی دہرائی گئی ہیں۔ انہوں نے افسانہ نگاروں اور افسانے کے نقادوں کی جو فہرست دی ہے اس میں چند اہم لکھنے والوں کو نہ جانے کیوں نظر انداز کر دیا ہے۔ آئندہ شمارہ "نئی نفسیات — نئی شعری کائنات" بڑے کام کی چیز ہو گا۔ چوں کہ اب اُردو میں امتزاجی تنقید کی ابتدا ہو چکی ہے۔

★شموئل احمد — [illegible] گرشتہ شمارہ بحث نہ پالی [illegible]
میرا خیال ہے کہ آپ کہاں کہاں اردو کی نئی بستیوں کی بات کرتے رہتے ہیں۔ یہ آپ کے وسیع تعلقات بلکہ خلوص جذبات اور اردو کے تئیں بے لوث محبت کا مظہر تو ہے اور آپ کی ادارتی صلاحیت و بصیرت کا ثبوت بھی۔ شاعر کا شمری حصہ ہمیشہ ہی خوب ہوتا ہے۔ شکیلہ رفیق کی نظم "جواب" نہ آئے [illegible] گوپند، پال کی بے حد خوبصورت کہانی آپ نے شائع کی ہے۔ پال نے جس خوبصورتی سے ماضی اور حال کو گڈمڈ کیا ہے کا اسلوب پر [illegible] شیشے کی طرح ہے۔ جس میں آسانی سے ماضی اور حال دونوں ایک ساتھ بھی دکھا جا سکتا ہے۔ غضنفر کی کہانی بھی اچھی لگی۔ ایک اور سے حد تخلیقی شمارے کیلئے مبارکباد۔

★سیفی سرونجی [illegible]
اردو کی نئی بستیوں کے حوالے سے آپکی کارکردگی نئی بستیوں کے تخلیق کاروں کے ہاں یقیناً قدر سے دیکھی جائے گی۔ محترم شوکت حیات کی [illegible] افسانے کے بارے میں تحریر بہت [illegible] ہے۔ اگر ہمارے ادیبوں نے ان کی مطالعہ کرنے کی نصیحت (مم عصر ادب کا مطالعہ) پر غور فرمایا تو بہتوں کا بھلا ہو [illegible] ہی اضافہ ہے۔ [illegible] بخش لائلپوری، [illegible] سہیل، [illegible] دانش اور ناہد حسین تمنا کا کلام [illegible]

★فیاض رفعت [illegible] (ما لک)
تمہاری ادارت میں شاعر بہ [illegible] کھلا آ رہا ہے۔ گزشتہ کئی شماروں سے تم مسلسل "[illegible]" والی نظمیں اور غزلیں [illegible] کر [illegible] تخلیقی عصری شاعری سے تم نے [illegible] شائع [illegible] اردو کی نئی بستیاں تمہاری [illegible] کے نئے ذخیرہ [illegible] شمارہ [illegible] شمارہ [illegible] واقعی تمہیں [illegible] توقعات تم سے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہوتا ہے [illegible] اور [illegible] نہیں [illegible] کا اسلوب [illegible] کرتا ہوں [illegible] شوکت حیات کا مضمون اردو افسانے [illegible] ہے [illegible] ساتھ [illegible] "[illegible]" بھی اچھا افسانہ ہے۔ مجھے یقین ہے [illegible] بھی تحقیق کریں گے۔
شمارہ نمبر ۸ میں [illegible] [illegible] گیا [illegible] طالم ہے۔ [illegible] نے بہت [illegible] غزلیں [illegible] ہوں۔ اور خوش ہوتا ہوں۔ [illegible] خوشی ہے [illegible] کے بطن سے پیدا ہوتی ہے۔ عبیرہ [illegible] کی نظم بھی اچھی ہے۔ ان کی عورتوں کی [illegible] غزلیں بھی [illegible] اسی طور [illegible] کی [illegible] قدروں کی

[illegible] کی بڑی خوبی ہے EPIC [illegible] ہیں۔ [illegible] اور تبسم صدیقی کی غزلوں کے متفرق اشعار مزہ دے گئے۔ شفیق [illegible] کی غزل کا مطلع بہت پسند آیا۔ اسی طور حنیف ترین کی غزل بھی لائق توجہ ہے۔ شمارہ نمبر ۸ میں [illegible] نے خاصی [illegible] کے ساتھ بشیر بدر [illegible] مضمون لکھا ہے۔ مضمون اچھا ہے۔ میں بھی بشیر بدر سے کہا جاتا ہوں شہرت کی بلندی بھی ایک پل کا تماشہ ہے دوسرا مصرع قصداً نہیں لکھ رہا ہوں۔ بشیر بدر کے لئے میرے پاس تاسف کے سوا کچھ بھی نہیں۔ [illegible] کے شاعر بشیر بدر کو مرحوم [illegible] ہے۔ [illegible] کوئی بڑا شاعر کیسے ہو جاتا ہے۔ بشیر بدر، شاعری کے [illegible] ہیں اور مسلسل خراب نہیں لکھ رہے ہیں۔ تم نے ان کی جو بھی غزلیں چھاپی ہیں وہ خراب [illegible] شاعری کا اچھا نمونہ ہیں۔
شموئل احمد کا "بہرام کا گھر" بڑا افسانہ ہے۔ شاہین کی دونوں غزلیں اور نظم "سیب، دھنک اور خواب" بے حد خوش کن ہیں۔ [illegible] طارق [illegible] لائلپوری، جمشید مسرور، اور محمد ممتاز [illegible] کی غزلیں بھی [illegible] کا باعث ہوئیں۔ نظموں میں [illegible] [illegible] دانش اور [illegible] حسین تمنا متاثر کرتے ہیں۔ لیکن شکیلہ رفیق نے اپنی نظم سے بہت [illegible] بہت لکھایا، جس کے موضوع پر اسی نے ایک نظم برسوں بعد پڑھی۔ شکیلہ رفیق کی [illegible] نظمیں چھاپئے اور ہاں اب کی [illegible] سریندر پرکاش کے [illegible] میں کیسے ایسے [illegible] خطوط شائع کر دیئے سریندر پرکاش اس برصغیر کا ایک بڑا نام ہے۔ بے حد صاف و شفاف [illegible] اس میں [illegible] نام کو نہیں۔

★قاضی قیصر الاسلام — بنگلہ نمبر سی ۲۵/، سیکٹر ۳۸ [illegible] ۳۳ [illegible] روڈ کراچی
شاعر [illegible] مواد کے اعتبار سے بھی آپ کا انتخاب عمدہ [illegible] تبسم کے افسانے اس لئے اچھے نہیں ہیں [illegible] لکھے [illegible] ہیں۔ بلکہ واقعی خوب ہیں۔ غزلیں اور نظمیں بھی معیاری ہیں۔ [illegible] کی تعریف نہیں کروں گا۔ اور وہ اس لئے کہ [illegible] دوست ہے۔ اور جانبداری سے میں [illegible] ہوں۔ تنقیدی مضامین نسبتاً تشنہ رہے۔ اس میں لکھنے والوں کا کوئی قصور نہیں بلکہ مدیران کی مجبوریاں شامل ہوتی ہیں۔ تنقیدی عمل میں جزئیات نگاری اور نظیروں سے اگر مضمون کا طول [illegible] رہ جائے تو رسالے کے گنجائش کے پیش نظر [illegible] رسائی کیوں [illegible] ذرا سوچئے۔

★حفیظ [illegible] — [illegible] شفقت [illegible]
[illegible] کا مضمون بشیر بدر پڑھا۔ خود پرستی کے اس اندھیرے میں بشیر بدر کو راستہ دکھائی نہیں دیا اور معیاری شاعر ہوتے ہوتے رہ گئے۔ مگر مشاعروں کے مقبول ترین شاعر کہلانے جانے لگے۔ مگر راستوں کا تعین کرنے والے [illegible] خود ایک مدت سے [illegible] رہے ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ [illegible] کہنے سے پہلے پہنچا دے میں [illegible] ضروری ہے۔ شاعروں پر گذر بسر کرنے والوں کو تو یہ شکایت

ہونی بھی نہیں چاہیئے کہ وہ اپنی قیمتوں کی عمر پار اجرت وصول کرتے ہیں۔ مگر معیاری ادب سے بے چاروں کا کیا لینا دینا۔ اتنی سمجھ بوجھ کیوں کی بنیاد پر اگر [illegible] کو خود کو منوا بھی لیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اور یہ سلسلہ تو یوں بھی [illegible] ہے۔ دراصل [illegible] فاضلی کو اس طرح کی تحریریں لکھنے کی خاصی مشق ہے۔ ملاقاتیں دیکھیں یا عصر شاعر کے [illegible] شماروں میں قسط وار سوانح اور اب کتاب۔ وہ گفتگو اسی انداز سے کرتے ہیں [illegible] چیزیں متاثر کرتی ہوں مگر ان کی عمر لمبی نہیں ہوتی۔ جس باتوں کی نشاندہی بشیر بدر کے تعلق سے کی گئی ہے صرف بشیر بدر کی جگہ "ندا فاضلی" کر دیں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

★مناظر عاشق ہرگانوی — [illegible]
شاعر کے دونوں شماروں میں "اردو کی نئی بستیاں" شمر والا سلسلہ خصوصی طور پر پسند آیا۔ وسیع و عریض دنیا میں پھیلے ہوئے اردو کے ان قلمکاروں نے اپنی شناخت جس طرح بنائے رکھی ہے۔ اور اردو ادب کے فروغ کے لئے جس طرح خود کو جوڑے رکھا ہے اس سے دنیا سمٹ کر سامنے آکھڑی ہوئی ہے ولی عالم شاہین کی طرف سے "فروغ اردو کی بین الاقوامی تنظیم" کا اعلان اور سلیم جعفری کے اندیشے بھی اردو کی مقبولیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ شمارہ نمبر ۸ میں حامدی کاشمیری کا مضمون بے حد تشنہ ہے۔ آج تنقید ساختیات اور پس ساختیات سے آگے جا چکی ہے۔ ایسے میں وہ پرانی لکیروں کو پیٹ کر "موجودہ صورت حال" کے کس چیلنج کا سامنا کر رہے ہیں؟ لسانی قسم کی باتوں پر چند عنوان چسپاں کر کے وہ تنقیدی نظریات کی تیرہ نصیبی اور معروضیت پر [illegible] تقاضوں سے بہت دور جا کھڑے ہو گئے ہیں۔ شمارہ نمبر ۲ میں شموئل احمد ایک زندہ اور سچی کہانی بیان کرتے کرتے عنوان کے گورکھ دھندے میں الجھ کر رہ گئے۔ کہانی کا اختتام وہ نہیں ہے اور ہو [illegible] نہیں چاہیئے جو وہ بیان کر گئے ہیں۔

★منیر الدین احمد
شاعر کے شمارے (۱۹۹۲) میں میری نظر سے گزرا ہے کہ بعض لوگوں کو سریندر پرکاش کے ناول پر اعتراض پیدا ہوا ہے۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "انہیں کیا معلوم کلمہ کی حقیقت کیا ہے مذہب اور عقیدہ کسے کہتے ہیں۔" یہ بات وہ سریندر پرکاش کے بارے میں لکھ رہے ہیں۔ جس کی ماں مسلمان تھی اور جو اپنے آپ کو نصف مسلمان کہتا ہے۔ خالد جاوید نے لکھا ہے کہ سریندر پرکاش کی تحریر سے یہ تاثر ملتا ہے کہ "ہندوستان کے لاکھوں ہندو جو کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوتے رہے ہیں۔ وہ محض کلمہ پڑھنے کی حد تک مسلمان ہیں ورنہ عملاً وہ ہندو ہی ہیں" میں نے چونکہ اس تحریر کو نہیں پڑھا اس لئے اس تبصرہ کی درستی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ الواقع [illegible] عملاً ہندو ہی ہیں۔ بلکہ بدھ مت کے پیرو ہیں۔ ہمارے رسوم و رواج آج تک ویسے ہی ہیں۔ بلکہ [illegible] بھی نہیں پڑا۔

فکرِ امروز



میں نظم کو غزل پر ترجیح دیتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ شعرؔ
غزل سے زیادہ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوں اس
لئے کہ غزل جس چیز کا نام ہے وہ اپنی قدامت و کہنگی
کی وجہ سے اب زیادہ کارآمد نہیں۔ شعرائے
متغزلین اس صنف کو بہ تمام و کمال پامال اور ختم
کر چکے ہیں۔ نئے شعراء کے لئے بھی غزل میں
اجتہاد و ایجاد کی گنجائش بہت کم باقی ہے، مگر نظم
کا میدان ہنوز وسیع ہے اور یہ صنفِ سخن
اردو شاعری کو کارآمد اور مفید بنا سکتی ہے۔
اس لئے زیادہ توجہ اسی کی طرف ہونی چاہیئے

[شعر الحیات، کلیم عجم]

سیماب اکبرآبادی

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۴ واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر

جلد — ۶۴

شمارہ — ۲۰

فون: ۳۵۹۹۰۳

23/9/93

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاونہ

ناظر نعمان صدیقی

قیمت روپے

زرِ سالانہ ۶۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۷۵ روپے

شاعر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

ماہنامہ شاعر مکتبہ قصر الادب ممبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ ممبئی ۸

❖ حنیف ترین کے جس شعری رویے نے متاثر کیا وہ یہ کہ ان کے لہجے میں خود رحمی یا رحم انگیزی نہیں ہے، وہ اپنے عہد کے نشیب و فراز کو اپنی شاعری میں سمیٹ لیتے ہیں [نثار احمد فاروقی]

❖ حنیف ترین کے ذہنی وقوعے اور جمالیاتی تجربے، لسانی اظہار کی رکاوٹوں کا تاثر ختم کرنے کے باوجدان کے اسیر نہیں ہوتے وہ اپنی راہ تخلیق کرتے ہیں اور جو کچھ ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہمارے سامنے ابھرتا ہے، وہ اپنی حد بندیوں کے باوجود ایک انوکھے منظر نامے کی تشکیل کرتا ہے۔ جو دیدنی ہے، اور جو شاعر کے لئے حسن حق ہے [حامدی کاشمیری]

❖ ان کی (حنیف ترین) نئی غزلیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی تخلیقی قوت غیر تخلیقی ذہنی پردوں کو چاک کرنے اور ان کی انفرادیت، روایت کی سخت فصیل کو چیرنے کے لئے بے قرار ہے۔ مجھے ان کے ذہن و تخیل کا یہ انداز بہت پسند ہے [عنوان چشتی]

❖ انھوں نے نئی نئی زمینوں میں فکر و خیال کی تخم کاری کی ہے اور لفظوں کی ایسی فصلیں تیار کی ہیں جن سے تازہ دم تشبیہات و استعارات کی ایک انوکھی سگندھ پھوٹ کر قاری یا سامع کے دل و دماغ تک پہنچتی ہے اور اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ [مخمور سعیدی]

❖ ڈاکٹر حنیف ترین پیشے کے اعتبار سے معالج ہیں اور وجدانی دونوں طور پر شاعر۔ اس لئے وہ انسان کی نبض پر ہی نہیں انسانیت کی نبض پر بھی ہاتھ رکھتے ہیں۔ شاعری ان کے لئے گہرے ذوق و شوق بلکہ جنون کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ شعر کہتے ہی نہیں، شعر جیتے بھی ہیں۔ [مظہر امام]

ڈاکٹر حنیف ترین سنبھلی

کا

اولین شعری مجموعہ

رباب صحرا

وہ خوب صورت شعری مجموعہ جسے شاعری کے قارئین و سامعین اور نقادوں نے پسند کیا اور سراہا

صفحات: ۱۱۲ ❁ قیمت: پچاس روپے

رابطہ:
◆ فرینڈز بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یوپی)
◆ اخبار نو ۔ ۱۷۲۴، کوچہ دکھنی سرائے، پٹودی ہاؤس ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
◆ ڈاکٹر حنیف شاہ خان ۔ متوصف الجدیدہ، عرعر (شمالی) سعودی عربیہ

شمارہ نمبر ۔ ۴ ۔ ❀ ۔ جلد ۔ ۶۴

محفل اپنی

شاعر کا سالانہ زرِ تعاون

مشترکہ شماروں کی پیش کش اور ماہ و سال کی بے ترتیبی کے سبب شاعر نواز حضرات زرِ تعاون ارسال کرنے میں جو تاخیر کرتے ہیں اس سے شاعر کے کاموں پر اثر پڑتا ہے۔ ہم اپنے محدود وسائل کے ساتھ رسالے کو ہر اعتبار سے مکمل بنانے کی سعی میں مصروف رہتے ہیں اور یہ توقع کرتے ہیں کہ شاعر نواز حضرات اپنی مدت خریداری تمام ہوتے ہی تجدید خریداری کریں گے۔ شمارہ نمبر اور اپنی ممبر شپ کے ساتھ ۱۲ شمارے مکمل ہوتے ہی اگر زرِ سالانہ ارسال کر دیا جائے تو ہم اپنی بہت ساری دشواریوں پر قابو پا سکتے ہیں۔ شاعر صرف ایک ادبی رسالہ ہی نہیں، ایک روایت بھی ہے۔ ایک تحریک اور مشن بھی ہے۔ اردو زبان ہی نہیں ہندوستان کی تاریخ کا ایک روشن باب بھی ہے۔ ہم تمام اردو والوں کو ہر حال میں شاعر کو زندہ رکھنا ہے اسے روشن رکھنا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ شاعر کے لئے کیا کر رہے ہیں ——؟

شاعر: اردو کا عالمی ادبی جریدہ

شاعر کے حالیہ شماروں کی پسندیدگی ہمارے عزائم کو مزید مستحکم کر رہی ہے۔ پوری اردو دنیا شاعر کی طرف متوجہ ہے۔ شعر و ادب کے قدر دان، اردو دوست چاہتے ہیں کہ شاعر کو اور زیادہ سنوارا، نکھارا جائے اور اسے اردو کا عالمی ادبی جریدہ بنا دیا جائے۔ معنوی اعتبار سے تو شاعر اردو کا معیاری ادبی جریدہ ہے ہی اور ہم خود بھی اس کے گیٹ اپ وغیرہ میں کچھ اور تبدیلیوں کے خواہاں ہیں۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کے بعد وہ سب کچھ ممکن ہوگا۔ جو ہم شاعر کے لئے مدت مدید سے سوچ رہے ہیں۔ شاعر کا مجوزہ اردو کی نئی بستیاں نمبر ہمارے خوابوں کی نہایت ہی خوب صورت تعبیر ہوگا۔ مگر ضرورت ہے اس بات کی کہ شاعر کو بنے بنائے فارمولوں سے ہٹ کر دیکھا جائے۔ ہم نے شاعر کو شخصی، گروہی، علاقائی، سرحدی الجھنوں اور الجھاووں سے پاک رکھا ہے۔ اپنے پورے عصر کو اپنے وجدان کو نئی تخلیقی جہات کے ساتھ پوری ایمانداری اور دیانت داری سے پیش کرنے کے جنون میں دنیاداری ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ سماجی منصب داریوں سے ہمارا، ہم تو صرف اور صرف شاعر کے لئے وقف ہیں —— اور سچ تو یہ ہے کہ ۶۵ سالہ ادبی روایت یوں ہی نہیں بن گئی۔ انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد شاعر ایک مکمل عالمی ادبی جریدہ بن کر ابھرے گا۔ لیکن آپ سب کے عملی تعاون کے ساتھ۔

ایک گزارش اور

شاعر کے لئے اپنی تخلیقات ارسال کرتے وقت ان امور کو ذہن میں رکھئے اور ہماری بے طرح مصروفیات اور پریشانیوں کو کم کیجئے۔ نثر و نظم کا مسودہ تیار کرنا بھی ایک فن ہے۔ اس موضوع پر کبھی تفصیل سے لکھا جائے گا۔ فی الحال تو آپ سفید و سادہ کاغذ کا استعمال کیجئے۔ سیاہی روشن اور ابھری ہوئی ہو۔ تحریر واضح اور خوش خط ہو، صفحے کے صرف ایک طرف پیراگراف بنا کر لکھئے۔ سرنامے پر اپنا نام اور تحریر کے آخر میں اردو و انگریزی میں پتہ جلی قلم سے لکھئے۔ زیروکس اور کاربن کاپی قطعی نہ بھجوایئے۔ مناسب ڈاک ٹکٹ یا لفافہ مع پوسٹ کارڈ ارسال کیجئے۔ شاعر کو ارسال کی گئی تخلیقات کہیں اور بھجواتے وقت ہمیں بھی اطلاع دیجئے۔

الم مظفر نگری بنام اعجاز صدیقی

منگلور
۱۰ نومبر ۶۵ء

برادر عزیز سلام مسنون

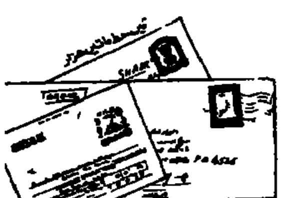
کتاب سدرہ و طوبیٰ کی ایک جلد بذریعہ رجسٹری آپ کو بھیج چکا ہوں ملاحظہ سے گزری ہوگی
ذرا نگار میں اس پر تفصیلی تبصرہ لکھ دیجئے، اور ضرورت سے جو شعر لکھیے ان میں بعض
رسمی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کو بغور ملاحظہ فرمانے کے بعد ایسا کچھ لکھیں جو اہل نظر کے لیے
قابل توجہ ہو — میری ایک مثنوی جو تین سو صفحات کو محیط ہے عنقریب شائع ہونے والی [illegible]
یہ واقعات کربلا پر ہے اور مولانا ترابی کے [illegible] مشہور انداز پر ہے —
ایک تازہ غزل نگار کے لیے بھیج رہا ہوں کسی مناسب مقام پر لکھوا دیجئے —
اکتوبر کے نگار میں نیاز صاحب [illegible] کے متعلق ایک مختصر مضمون
لکھا ہے نظر سے گزرا ہوگا — مولانا کا روحانی مرض [illegible] گیا ہے
معقول ہو رہی ہے — ان شاء اللہ معرکۂ کربلا اس سے بہتر ثابت ہوگا — تاریخی
اور ادبی حیثیت سے اردو میں پہلی چیز اہل ذوق کے سامنے آئے گی —

آپ کا
الم مظفری

❁ (مولانا محمد اسحاق) الم مظفر نگری [پ: ۱۹۰۰ء — م: ۲۸ مئی ۱۹۶۹ء] علامہ سیماب اکبر آبادی کے فارغ الاصلاح شاگردوں میں سے تھے۔ علم نجوم کے ماہر۔ نہایت پرگو نظم نگار، ان کی پانچ کتابیں شائع ہوئیں ان میں: سلسبیل، کوثر و تسنیم، سدرہ و طوبیٰ، معرکۂ کربلا [تاریخ و ادب ۱۹۶۳ء، لاہور] گیتا (منظوم)۔ مؤخر الذکر کتاب پر یوپی حکومت نے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تھا۔ [ادارہ]

خط باتیں ہزار (۲)

شاعر کے ہر شمارے پر موصولہ خطوط اتنی بڑی تعداد میں ہوتے ہیں کہ ان سب کی سمائی کسی ایک شمارے میں ممکن نہیں ہو پاتی۔ بعض اہم خطوط محض اپنی طوالت کے سبب قابل اشاعت نہیں ہو پاتے۔ غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ / افسانہ نمبر ۱۹۹۲ء کے متعلق خطوط کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ایسے ہی بہت سارے خطوط میں سے ۲ خط ذیل میں دیئے جا رہے ہیں۔ اپنے مندرجات کے اعتبار سے ان میں بعض اہم عصری ادبی مسائل کی مجموعی گونج قارئین شاعر کو اپنی طرف متوجہ کرے گی۔ [ادارہ]





ستیہ پال آنند

پوسٹ بکس نمبر ۸۵۴۰۱۔ ریاض ۱۱۶۹۱ (سعودی عربیہ)

غزل پر ایک اور مکالمہ

شاعر شمارہ نمبر ۹ ستمبر ۱۹۹۲ میں اندر موہن کیف صاحب کا خط غور طلب ہے۔ ویسے بھی اب یہ ضروری ہے کہ "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" کے تحت ہوئی بحث کی روشنی میں کچھ مفروضات کو ایک بار پھر پرکھا اور تولا جائے۔ میں کیف صاحب کا ممنون ہوں انہوں نے ناقدانہ نظر سے ان تمام نکات کا جائزہ لیا ہے جو میرے انٹرویو سے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ یوں بھی ذاتیات کے کیچڑ سے بچ کر جن احباب نے میرے افکار اور خیالات پر لائے زنی کی ہے۔ وہ سبھی کیف صاحب کی طرح مندرجہ ذیل باتوں پر متفق ہیں۔ اختلاف لائے تو وجوہ کے بارے میں ہے۔ نتائج کے بارے میں نہیں۔

- ایک: تقسیم ہند کے بعد صنف نظم کی ترقی دھیمی رہی ہے۔ اس کی نشو و نما نہیں ہو سکی۔
- دو: وجہ غالباً صنفِ غزل کی عامیانہ مقبولیت ہے۔ جسے شاعروں سے ہر دل عزیز ہونے کی سند ملی ہے۔
- تین: جن نظم گو شعراء کو فوقیت حاصل ہوئی بھی ہے۔ وہ سبھی ڈاکٹر الایمان صاحب مستثنٰی ہیں، غزل کی لفظیات کے دائرے میں رہ کر نظموں کی تخلیق کرتے ہیں۔ غزلیں کہتے ہیں اور مشاعرے پڑھتے ہیں۔
- چار: غزل کی صنف برصغیر کے تہذیبی ورثے سے اس حد تک جڑی ہوئی ہے کہ یہاں کی شعری روایات کے سیاق و سباق میں ہی اس پر غور و خوض ہو سکتا ہے۔ میرے انٹرویو میں اس پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور جو پیمانے میں نے استعمال کئے ہیں۔ وہ مغربی ادب کے لئے تو موزوں ہیں۔ صنف غزل کے لئے نہیں ہیں۔
- پانچ: تنقید نگار حضرات اس الزام سے نہیں بچ سکتے کہ انہوں نے کبھی اس صورتِ حال کو پرکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی، اردو کا شعری ادب عصری عالمی شاعری کے مقابل اپنی کوئی حیثیت کیوں نہیں متعین کر پایا۔ اور مغرب کی یونیورسٹیوں کے کورسز میں جہاں جاپانی چینی، کوریائی اور جنوبی امریکہ کے ہسپانوی ادب کے شہ پارے پائے جاتے ہیں۔ وہاں اردو کا عمل دخل کیوں نہیں ہے۔ جب کہ اردو ایک بڑی زبان ہے اسے کروڑوں لوگ بولتے ہیں اور اردو کی نئی بستیوں میں تارک الوطن اردو داں احباب نے اسے چار دانگ عالم میں پھیلا دیا ہے۔
- چھ: فیض احمد فیض کیا اس لئے شہرت دوام کی سند حاصل کر سکے کہ وہ بہت اچھے شاعر تھے؟ یا ترقی پسند تھے اور کمیونسٹ تھے؟ یا اپنی نظموں میں بھی روایت سے عبارت لفظیات، استعارات اور تشبیہات سے اوپر نہ اٹھ کر انہوں نے غزل کی لفظیات کا احترام کیا؟

کیا وہ واقعی عالمی سطح کے شاعر تھے؟ کیا ان کا درجہ ن م راشد سے واقعی بلند تھا؟ کیا POETS' POET ہونے کی حیثیت سے انہوں نے ایک پوری نسل کو متاثر کر کے اردو شاعری کو فیض یاب کیا یا نقصان پہنچایا؟ یہ بحث طلب ہیں اور ان پر بحث ہونی چاہئے۔

میں اس خط میں "دست برگ" کا ذکر نہیں کروں گا جو ۱۹۹۱ء میں چھپی۔ ان نظموں کا بھی ذکر نہیں کروں گا جو "وقت لا وقت" (زیر طبع) میں شامل ہیں اور اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ میں نے کبھی نہ تو ان نظموں کو "ردِ غزل" کے طور پر دیکھا ہے اور نہ ہی اس غرض سے تخلیق کیا ہے کہ وہ ترجمہ ہو سکیں اس لئے اس شک کا ازالہ ضروری ہے۔ میں نے اپنے انٹرویو میں یہ کبھی نہیں کہا کہ چونکہ غزلیہ شاعری ترجمے کی زد میں نہیں آسکتی۔ اس لئے اس میں اچھا شعر کہنا ممکن ہی نہیں ہے۔ صرف یہ عرض کیا ہے کہ عصری عالمی شاعری کے مدمقابل کوئی بھی شعری تخلیق صرف اپنی ترجمہ شدہ حالت میں ہی رکھی جا سکتی ہے اور چونکہ غزل کا ہر شعر اپنی لسانی حد بندیوں میں مقیّد اس فردِ واحد کی طرح ہے جو اپنی مادری زبان کے سوائے کچھ نہیں بول سکتا عصری عالمی شاعری سے اس کا مکالمہ ناممکن ہے۔ وہ بیرونی دنیا کی شاعری سے ہم کلام نہیں ہو سکتا۔ غالب صدی کی تقریبات کے دنوں میں کم از کم تین ترجمے دیوانِ غالب کے انگریزی میں چھپے لیکن وہ کہاں ہیں؟ کیا باہر کی دنیا کے کسی قاری تک ان کی رسائی ہوئی ہے؟ کیا برصغیر میں ہی انگریزی داں طبقے میں ان تراجم کا ذکر ہوا ہے؟ یہ پوچھنے سے میری مراد غالب کے بارے میں کوئی VALUE JUDGMENT دینا نہیں ہے۔ صرف ایک حقیقت کا اظہار ہے جسے بیشتر خطوط میں تسلیم کیا گیا ہے کہ غزلیہ شاعری ترجمے کی زد میں نہیں آسکتی۔

یہ مکتوب اس بات کا اہل تو نہیں کہ تفصیل سے لکھا جائے پھر بھی یہ ضروری ہے کہ صنفِ غزل کے بارے میں کچھ باتیں جو انٹرویو کا حصہ نہیں تھیں، اب کی جائیں، یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ "غزل پر نیا تنقیدی مکالمہ" انٹرویو کے صرف اس حصے پر مبنی تھا۔ جو غزل کے بارے میں ہے۔ اور کئی لحاظ سے تشنہ رہ گیا ہے۔

کچھ نکتے جو میں نے اپنے ایک حالیہ مضمون (مطبوعہ طلوعِ افکار، کراچی) میں اٹھائے ہیں۔ ان کا ذکر ضروری ہے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ غزل کی بنیادی ضرورت مضمون آفرینی ہے۔ معنی آفرینی نہیں، اور جس حد تک یہ مضمون آفرینی کی نمائش کے لئے معنی آفرینی سے گریز کرتی ہے اس حد تک یہ روایت سے بدھتی چلی جاتی ہے۔ اس مضمون آفرینی کو سمجھنے کے لئے اور غزل کے سیاق و سباق میں اس کا تجزیہ کرنے کے لئے MICHAEL RIFFATERRE کے اس نظریہ کو جاننا ضروری ہے جسے انگریزی میں SUBMERGED MATRIX کہا گیا ہے۔ ایک اور پیمانہ جس کا استعمال بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ وہ کرستیوا اور اس کے پیروکاروں کا ہے جسے INTER TEXTUALITY کہتے ہیں۔ کرستیوا کے انٹر ٹیکسچویلٹی کے نظریے کو فرائڈ کے ہم عصر یونگ JUNG کے اجتماعی نسلی لاشعوری بیداری COLLECTIVE RACIAL PARAMNESIA سے جوڑیں تو جو تصویر غزل میں مضمون آفرینی کی نکلتی ہے۔ وہ یہ ہے:

"غزل کا ہر شعر متقدمین اور ہم عصر شعرا کے مضامین کے SUBMERGED MATRIX کو اپنے استعارات، اپنی علامتوں اور اپنی لفظیات میں RE-CREAT کرتا ہے اور اُسے خود میں جذب کرتے ہوتے نئے یا پرانے ڈھنگ سے نئے یا پرانے علامتی یا استعاراتی سیاق و سباق میں وہی بات بار بار کہتا ہے۔"

[انگریزی سے ترجمہ۔ پراجیکٹ رپورٹ صفحہ ۲۱]

میں بات کو ختم کرتے ہوئے صرف ایک مثال دے کر اپنا منشا واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ زیرِ نظر شمارہ نمبر ۴ کے صفحہ ۷ پر محترم دوست محمود سعیدی کی ایک غزل ہے جو اسی بحر میں ہے جس میں "دست برگ" کی یک مصرعی نظمیں ہیں، یعنی بحر خفیف مسدس مخبون محذوف مقصور۔ فاعلاتن مفاعلن فعلن۔ شعری روایت سے عبارت اور عہدِ رفتہ کے شعرا یا ہم عصروں سے حاصل شدہ داخلی متنیت کے استعاروں کی رینج RANGE کس قدر محدود ہے اور انٹر ٹیکسچویلٹی کے متقاربًا ایک ہی راگ کے ایک ہی سُر کو، یعنی ایک ہی مضمون کو کیسے بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اس کی ایک نہایت کارگر مثال یہ غزل ہے۔

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ مضمون کی بنیاد استعارہ ہے لیکن کوئی بھی استعارہ کلیتًا PARADIGMATIC نہیں ہو سکتا یہ SYNTAGMATIC بھی ہے۔ مغربی دنیا کی POETICS کی تھیوری کے مطابق استعارہ محض اصل تصویر کی SUBSTITUTION

[redacted] .....

سے بنتا ہے لیکن غزل کے اشعار میں ہمارے ہاں CONTIGUITY سے بھی استعارہ تشکیل پاتا ہے۔ اس غزل میں کل پندرہ اشعار ہیں۔ ان پندرہ میں سے لگ بھگ آدھی تعداد یعنی سات اشعار "سفر" کے استعارے سے عبارت ہیں۔ یعنی میرے محترم دوست محمود سعید کے پاس ہر دوسرے شعر کے لئے اپنی غزل میں ایک ہی مضمون ہے جس کی "آفرینی" کے لئے انہوں نے مختلف ذیلی پیکر تراشی کے نمونوں سے کام لیا ہے۔ یہ فارمولائی تخلیقیت کی کھلی مثال ہے۔ میں ایک چارٹ سے اس بات کو مزید واضح کرنے کی جسارت کروں گا۔

چارٹ

مضمون : زندگی میں بھٹکن

اس مضمون کے PARADIGMATIC استعارے کے مختلف پیکر (۱) سفر کی صعوبتیں، دھوپ، گرمی، پیاس، گھر، بیاباں، دشت، گھر، تاریک راہیں، شب، ہم سفر کا ہونا، یا نہ ہونا یا بچھڑ جانا، دربدر بھٹکنا، بھیڑ میں کھو جانا، وغیرہ وغیرہ

(۲) شعر نمبر تین : مضمون = "اجاڑ راستے" "سنسان رہگذر" ← SYNTAGMATIC TO (1)

(۳) شعر نمبر چار : مضمون = "دھوپ میں سفر" "راہ بے شجر" ← SYNTAGMATIC TO (2)

(۴) شعر نمبر پانچ : مضمون = نظر کا بھٹکنا ← SYNTAGMATIC TO (1)AND(2)

(۵) شعر نمبر سات : مضمون = "ظلمتیں رفیق سفر" "رات ہم سفر" ← SYNTAGMATIC TO (1), (2) AND (4)

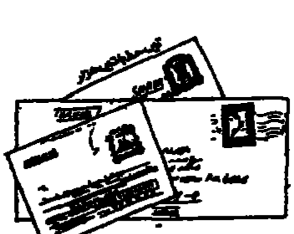
(۶) شعر نمبر آٹھ : مضمون = حسرتوں کے دیئے جلنا، شام کا بے گھر ہونا۔ ← SYNTAGMATIC TO (1)AND.5)

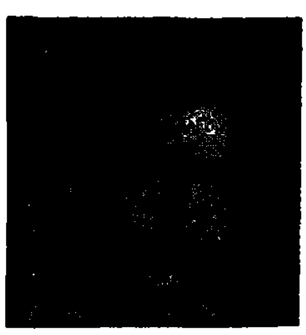
(۷) شعر نمبر نو : مضمون = سورج کا دربدر بھٹکنا ← SYNTAGMATIC TO (5)

(۸) شعر نمبر تیرہ : مضمون = بھیڑ میں کھو جانا ← SYNTAGMATIC TO (1), (5)

جو بات عام قاری کو پہلی نظر میں نہیں کھٹکتی لیکن جس میں غزل گو شاعر کی TRICK OF THE TRADE پوشیدہ ہے وہ ہے قوافی کا پہلے ہی سے تعین کر لینا۔ محترم شاعر نے اس غزل میں جو قوافی استعمال کئے ہیں۔ وہ ہیں، گھر، رہگذر، بے شجر، نظر، بے سحر، ہم سفر، دربدر وغیرہ۔ یہ قوافی بھی چارٹ کے بنیادی مضمون کے رٹے رٹائے سبق کو دہرانے میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔ "آمد" اور "آورد" کے جھگڑے میں نہ بھی پڑیں تو بھی یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ غزل کی آمد اور اس کا نزول کس قدر معنوی تخلیقی عمل ہے۔

محمود صاحب ایک اچھے شاعر ہیں، اہل نظر ہیں، اردو اکادمی کے جریدے کے مدیر ہیں۔ شعر و شاعری پر ناقدانہ نظر رکھتے ہوئے اپنے اداریوں میں اس پر اظہار خیال بھی فرماتے رہتے ہیں۔ اگر انہیں اردو کے پچاس فیصد غزل گو شعراء کا نمائندہ مان لیا جائے جو اس معیار کی غزل کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو کیا اس سوال کا جواب واضح نہیں ہے کہ غزل گوئی کی PERMUTATION اور COMBINATION پر بھروسہ کرتے ہوئے شاعری نہ ہو کر صرف VERSIFICATION ہی رہ جاتی ہے۔ *





ارشد عبدالحمید

شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج، اجمیر ۳۰۵۰۰۱

جدید تر نسل کے چند سوال

"شاعر" کے اگست ۱۹۹۲ء کے شمارے میں ارتضیٰ کریم کا مقالہ "جدید تر کہانی" ترقی پسندی سے انحراف یا اعتراف" شائع ہوا ہے۔ اس مقالے کی متعدد باتیں ایسی ہیں جن سے اتفاق یا اختلاف کے پہلو نکلتے ہیں لیکن سب سے پہلے ارتضیٰ کریم کو مبارک باد کہ انھوں نے ۱۹۸۰ء کے بعد اپنی تخلیقی

شناخت قائم کرنے والی نسل کے وجود کا اعتراف کیا ہے اور یہ مان لیا ہے کہ نئی نسل جدیدیت سے الگ اپنا ایک نظریاتی وجود رکھتی ہے چنانچہ نئی نسل کے افسانوں کو انھوں نے "جدید تر کہانی" کے نام سے معنون کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف افسانہ ہی نہیں شاعری اور تنقید میں بھی جدید تر نسل کا اپنا ایک نظریہ ہے اور اپنی نئی نسل کی پہچان ادب کے ہر شعبے میں قائم ہو رہی ہے۔

لیکن نئی کہانی کو جس طرح ارتضیٰ کریم نے ترقی پسندی سے جوڑ دیا ہے اور اسے جدیدیت کا باغی قرار دے کر اپنے پالے میں گھیرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے ان کی اس کوشش سے اتفاق نہیں ہے۔ دراصل جدید تر نسل کو اپنے پالے میں گھیرنے کا کام صرف انھوں نے ہی نہیں کیا ہے بلکہ یہ نیک کام جدیدیوں کی طرف سے بھی جاری ہے جس طرح ارتضیٰ کریم جدید تر کہانی کو ترقی پسند افسانے کی روایت کا احیاء اور توسیع قرار دیتے ہیں بالکل اسی طرح جدیدیوں نے بھی ۱۹۸۰ء کے بعد والی جدید تر نسل کو "نئی جدیدیت" یا "مابعد جدیدیت" کے نام سے جدیدیت ہی کی توسیع قرار دیا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ میری نسل کے فنکار نہ ترقی پسند خیمے سے وابستہ ہیں اور نہ جدیدیت سے۔ چونکہ میں ترقی پسند تحریک اور جدیدیت دونوں کو انتہائی اہم رجحانات کی حیثیت سے دیکھتا، سمجھتا ہوں اس لئے مجھے ان دونوں رجحانات کے مبلغین سے کوئی شکوہ نہیں۔ جدید نسل کا کوئی بھی فنکار نہ تو ارتضیٰ کریم ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی یا گوپی چند نارنگ وغیرہ کو کھلی کھٹی سناتا پھرے اور نہ ہی جدید تر نسل جدیدیت کی زرخیز غلام ہے کہ محمد حسن یا قمر رئیس وغیرہ حضرات کی شان میں گستاخی کرے۔ نئی نسل کے لئے تو ادب کی خدمت کرنے والا ہر شخص قابلِ احترام ہے جس نے اپنی تحریروں سے فنی یا فکری سطح پر لقمۂ فکر فراہم کیا ہو چنانچہ نئی نسل کے لئے شخصیتوں کی نہیں ان کی ادبی خدمات کی اہمیت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

جدید تر نسل ادب کے تئیں اپنا ایک الگ نظریہ اور رویہ رکھتی ہے اس کے ادبی رویے میں ماضی قریب و بعید کے ادبی رجحانات سے مثبت اور نئے عہد کے لئے کارآمد باتوں سے استفادہ کرنا شامل ہے۔ وہ ادب کو نہ تو محض سماجی مقصدیت تک محدود رکھتی ہے اور نہ ہی فرد اور ذات کے دائرے میں قید رہنا چاہتی ہے۔ سچائی یہ ہے کہ نئی نسل کی دو پیش رو تحریکوں یعنی ترقی پسند اور جدیدیت سے متعلق فنکاروں نے ادبی تخلیقات کے ذخیرہ میں گراں قدر اضافے کئے ہیں لیکن ان دونوں تحریکوں سے متعلق نقادوں نے کم از کم تنقیدی رویے کی حد تک ایک ہی کام کیا ہے کہ دونوں گروہوں نے اپنے لئے ادب کے دو مختلف و مثالی ماڈل مقرر کر لیے اور اپنے اپنے گروہ کے ادیبوں سے اس مقررہ ماڈل کی نقل کرنے کا حتی الامکان اصرار کرتے رہے اور ان دونوں گروہوں کا فیشن پرست طبقہ ان ماڈلوں کی کاربن کاپی اتارنے میں تباہ ہو گیا البتہ جو جینوئن فنکار تھے وہ اس ماڈل کے سحر میں گرفتار ہونے سے بچے رہے جس کی سب سے روشن مثال فیض احمد فیض کی شاعری، پروفیسر احتشام حسین کی تنقید اور انتظار حسین کی افسانہ نگاری ہے۔

ارتضیٰ کریم نے تو اپنا مقالہ جدید تر کہانی کے شناختی نشانات واضح کرنے کے بجائے جدیدیت کو بھلا برا سنانے میں صرف کر دیا لیکن میں جدید تر نسل کی تخلیقی پہچان سے دلچسپی رکھتا ہوں اس لئے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جدید تر نسل اپنی فکر سے اجتماعیت کو زائل کرنا اسی طرح غیر فطری سمجھتی ہے جس طرح فرد اور ذات کے مسائل کو رد کرنا غیر ضروری مانتی ہے۔ یہ دونوں ہاتھوں میں لڈو رکھنے کا عمل نہیں ہے بلکہ جدید تر نسل کو اپنے عہد کے جو مسائل جذباتی اور تخلیقی سطح پر متاثر کرتے ہیں ان میں فرد اور جماعت کی کشمکش بھی ایک بڑا مسئلہ ہے اور نئی نسل کے لئے دونوں سے نبرد آزما ہونا ناگزیر ہے۔

جدید تر نسل بنیاد پرستوں سے کس طرح جوجھ رہا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں لیکن مختلف اور متضاد طبقوں میں ہم آہنگی کا عمل اتنا آسان نہیں ہے کہ جذباتی نعروں سے لوگ، بقول راج کپور "جوبلیسٹ" ہو جائیں۔ چنانچہ جدید تر نسل کی سماجی مقصدیت کا پہلا زینہ خود فرد کی ذات کا کیتھارسس ہے اور یہیں سے جدید تر نسل کی مقصدیت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ نسل ذاتی مسائل کے ساتھ جماعتی مسائل کو زیر بحث لانے میں کوئی مشکل محسوس نہیں کرتی۔ جدید تر نسل کے یہ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ..... (پہلا سیٹ)

بس اپنا قبیلہ بکتا ہے بدبختی میں — کب ہم میں کوئی سردار بلند اقبال ہوا

شمار ہونا بھی مشکل ہے زنگاروں میں یہاں — بہت کٹھن ہے قبیلے کی آبرو ہونا

سوائے سر کی قطاروں کے اور کیا دے گا
کسی محاذ پہ فوجوں کا رُو برو ہونا

سب کے پیروں میں وہی رزق کا چکر کیوں ہے
گر یہ اس عہد کے لوگوں کا مقدر کیوں ہے

دریچے بند ہیں مخلوق خوابِ جاوداں میں ہے
اب ان گلیوں میں آوازِ سگاں سے کچھ نہیں ہوتا

قبیلے والے توقع کی شب منا رہے ہیں
بزرگ سردار شام سے اشکبار کیوں ہے

میں رزق کی آواز پہ لبیک کہوں گا
ہاں مجھ کو زمینوں سے محبت نہیں کوئی

یہ اشعار اسعد بدایونی کے ہیں۔ کیا انہیں پڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے اسعد بدایونی قوم، قبیلے یا جماعت کے مسائل سے ناآشنا ہیں یا انہیں ذاتی جذبوں کے علاوہ اور کسی مسئلے سے دلچسپی نہیں۔

اب ذرا تصویر کا دوسرا رُخ دیکھئے۔ اسعد بدایونی کے ہی کلام سے مزید مثالیں پیش ہیں .... (دوسرا سیٹ)

اداس چاند نے دریا کے دل پہ دستک دی
خوشی آمدید کو بڑھنے لگا بھنور کوئی

رہی اگرچہ نگاروں کی مہربانی بھی
بہت خراب کٹی رات بھی جوانی بھی

سمندروں کے سفر سب کی قسمتوں میں کہاں
سو ہم کنارے سے گرداب دیکھ لیتے ہیں

نہیں وہ جسم نہیں پھول ہیں لباس میں قید
یہ بات بندِ قبا کو پتہ ہے یا مجھ کو

بدن کے بحر میں کیا کیا بلائیں ہیں خدا جانے
کہ اپنی روح میں پیہم اذیت دیکھتا ہوں میں

آپ نے مثالوں کے دونوں سیٹ ملاحظہ کئے۔ کیا ان سے میرے موقف کی تصدیق نہیں ہوتی کہ جدید تر نسل فرد اور جماعت دونوں کے مسائل سے یکساں دلچسپی رکھتی ہے۔ یہاں اسعد بدایونی کے اشعار پیش کئے گئے۔ آپ جدید تر نسل کے کسی بھی قابلِ ذکر شاعر کا کلام اٹھا کر دیکھ لیجئے آپ کو سبھی کے یہاں یہی صورت نظر آئے گی۔ فرق صرف یہ ہے کہ جدید تر نسل کا کوئی بھی شاعر مقصدیت کے نام پر نعرے بازی یا کمیونسٹ نظریے سے وابستگی کو اپنے لئے لازمی نہیں سمجھتا ٹھیک اسی طرح جس طرح فرد، ذات یا نفسیاتی مسائل سے لئے وہ جدیدیت کی طرز پر ابہام، فراریت علیحدگی پسندی یا ہیئت پرستی کی اندھی تقلید کو منظور نہیں کرتا۔

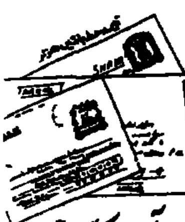
میں نے سطورِ بالا میں جدید تر نسل کے ایک رویے یا پہچان کی وضاحت کی جو بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ اس نسل کے دیگر خواص میں کمیونزم یا موڈرنزم کی جگہ ہیومنزم کی اہمیت ہے۔ یہ نسل اپنے لسانی رویوں میں توڑ پھوڑ یا چونکانے والے لہجے کے بجائے پائیدار اور متین لہجہ اختیار کرتی ہے۔ یہ فنی اور فکری سطح پر مشرقی تہذیب کا احیاء کرتی ہے۔ یہ اپنے عہد کے مسائل کو اپنی لفظیات میں پیش کرتی ہے۔ یہ نسل جماعت کی طرف متوجہ ہے لیکن خطابت اور نظریاتی جبر سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ یہ نسل ذات سے مخاطب ہے مگر خود کلامی اور مریضانہ ابہام یا تنہائی کے مرض کی شکار نہیں۔

اب آئیے جدید تر کہانی کی جانب۔ دہلی یونیورسٹی سے وابستہ بیشتر اساتذہ اور طلباء کی مانند ارتضیٰ کریم اردو فکشن سے بہت قریب کا تعلق رکھتے ہیں اور افسانے کے بارے میں مجھ سے کہیں زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مقالے میں جدید تر افسانے کا رشتہ ترقی پسند روایت سے قائم رکھنے کے لئے افسانے میں کہانی پن یعنی بیانیہ کے احیاء کو بنیاد بنایا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کہانی کو کہانی ہونے کے لئے کیا محض بیانیہ کی ہی ضرورت ہے؟ اور دوسری بات یہ کہ کیا بیانیہ ترقی پسندوں کی ایجاد ہے؟ اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے تیس پینتیس سال قبل وجود میں آچکا تھا اور سجاد حیدر یلدرم سے لے کر پریم چند تک کے افسانوں میں بیانیہ ایک مستحکم روایت بن چکا تھا۔ تو اگر جدید تر کہانی نے بیانیہ کو اپنایا ہے تو یہ ترقی پسند تحریک کی روایت ہوئی یا ترقی پسند تحریک سے قبل کی؟ مجھے افسوس ہے کہ ارتضیٰ کریم ترقی پسند افسانے کی روایت سے بھی واقف نہیں ورنہ وہ جدید تر افسانے پر ترقی پسندی کا لیبل چسپاں کرنے کے لئے بیانیہ کی جگہ طبقاتی کشمکش، سماجی معنویت، خیر و شر کا راست تصادم، موضوع کی مرکزیت، حقیقت نگاری اور مدلل واقعہ نگاری کا سہارا لیتے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ مریضانہ ابہام جدید تر نسل کا شعار نہیں لہٰذا نئی نسل نے صرف لایعنی تجریدیت، مبہم علامت نگاری، ماجرا کے فقدان

اور چوٹ کی اہمیت کو رد کیا ہے مکمل جدیدیت پسند افسانے کو رد نہیں کیا ہے ۔ غلش گزیدہ جدیدیوں کو چھوڑ دیں تو ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۶ء تک متعدد خوبصورت، کارآمد اور بہتر افسانے تخلیق کیے گئے ۔ اور ان خوبصورت جدید افسانوں کی پرچھائیاں جدید تر نسل کے بعض قابلِ ذکر افسانہ نگاروں مثلاً انور خان اور انور قمر سے لے کر مشرف عالم ذوقی اور غضنفر یا عبدالصمد وغیرہ تک کے افسانوں میں دیکھنے کو مل جائیں گی ۔ ترقی پسندوں کو یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ زمانی اور تخلیقی اعتبار سے جدیدیت ان سے آگے کی چیز ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح جدید پسندوں کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ جدید تر نسل ان سے آگے کی نسل ہے ۔ ہر تحریک یا ہر ادبی رجحان میں شدت پسندوں کا ہونا لازمی ہے کیونکہ یہ شدت پسندی دراصل کسی تحریک یا رجحان کو آگے بڑھانے میں سب سے پہلے کام آتے ہیں ۔ احتساب اور تجزیے کا عمل تو بہت بعد میں شروع ہوتا ہے ۔ ارتضیٰ کریم نے خود ترقی پسند تحریک کے شدت پسندوں کا شکوہ کیا ہے ۔ اسی طرح جدیدیت میں بھی شدت پسندوں کی کمی نہیں ۔ ہماری نسل یعنی جدید تر نسل اس شدت پسندی کو نظر انداز کرتی ہے اور دونوں رجحانات کے مثبت پہلوؤں کو ہر حال میں اپنانا چاہتی ہے یہ الگ بات ہے کہ جدید تر نسل جدیدیت سے قدرے قریب کا تعلق رکھتی ہے کیوں کہ جدید تر نسل کا پیش رو رجحان ترقی پسندوں کا نہیں بلکہ جدیدیت کا رجحان ہے اور یہ ایک زمانی سچائی ہے جسے قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ۔

تو اے ترقی پسندو! اور اے جدیدیو! جدید تر نسل کو اپنے اپنے پالے میں گھیرنے کی کوشش نہ کرو کیوں کہ نئی نسل خود اپنا ذہن، اپنا فکر اور اپنا ادبی رویہ رکھتی ہے اور اپنے فیصلے خود کرنے کی طرف گامزن ہے ۔ ✻





مشرف عالم ذوقی

۳۳ لنڈ گر ۔ نزد بیک انکلیو ۔ دلی ۔ ۹۲

آج کی اردو کہانی ۔ ایک لمحہ فکریہ!

شاعر کا افسانہ نمبر ۱۹۹۲ء بلاشبہ ایک چونکا دینے والا شمارہ ہے اس لحاظ سے بھی کہ آپ نے ادبی قلعے ڈھا دیے کہ اداریے آپ کے سوچ ستارہ، جملوں، اور فقروں نے جس طرح اس کا روپ نکھارا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے یہ چھوٹے چھوٹے فقرے کہیں الجھاتے ہیں، کہیں نئی نئی باتوں کو جنم دیتے ہیں اور کہیں کوئی CONTIOVERSY لے کر بیٹھ جاتے ہیں ۔ ان دلچسپ قلموں کے بعد نمبر آتا ہے افسانوں کا اور یہ افسانے تو گویا چونکا دیتے ہیں ——— ابھی، جس وقت آپ کا یہ پرچہ آیا ہے، چاروں طرف درگا پوجا کے ہنگامے ہیں ۔ اس موقع پر بنگال میں خاص نمبر نکلنے کا رواج برسوں سے ہے ۔ ان خاص نمبروں کی اصل کشش تو کہانیاں ہوتی ہیں ۔ خیر سے یہ رواج ہندی میں بھی ہے ۔ آج دیکھ کا خاص نمبر ہو یا دھرم یگ کا ۔ یہ تی یل کا کہانی نمبر ہو ۔ ایسے کئی کہانی نمبر بس ابھی چھپے ہیں اور مارکیٹ تک پہنچے ہیں مگر یہ سب کیوں لکھ رہا ہوں اس لئے کہ ان میں کہانیاں ہیں، وہ کہانیاں جو آپ کو پسند ہیں ۔ آپ کو خوش کر دیتی ہیں، حیران کر دیتی ہیں [اداریہ] اور اچھی چیزیں پڑھنے کا اپنا ایک مزہ ہوتا ہے ۔ آپ تو کہانیاں جانتے ہیں مگر! یہ سب کیا ہے ؟ آپ کو تو کہانیاں چاہیے تھیں ۔ اور آپ کا قصور بھی نہیں کہ بس وہی نام ہیں ۔ جو مارکیٹ میں چلتے ہیں لیکن کہانیاں کہاں ہیں ؟ مٹی سے جڑی کہانیاں، تیر و نشتر کی طرح اندر اندر اتر جانے والی کہانیاں ۔ تکنیک کی رو سے بھی کسی میں کوئی نیا پن نہیں ۔ مقصد کیا ہوتا ہے ۔ قصہ بنتا کیسے ہے ؟ تکنیک کیا ہوتی ہے ؟ بوجھل، بوجھل سے، زندگی کی روح سے بے نیاز، جملے کہانی نہیں ہوتے ۔ کہانی وہ ہوتی ہے کہ ایک ایک لفظ تخلیق کار کے خون کی گرمی مانگتا ہے ۔ ایک ایک لفظ محنت اور ریاضت مانگتا ہے صدیق عالم ہوں کہ رشید جہد انجم ۔ ان سب سے مجھے شکایت ہے ۔

یہ بات آپ نے بھی اٹھائی ہے آپ سے پہلے بھی کئی لوگوں نے اس کا ذکر کیا کہ افسانہ اور قاری کے درمیان سے کہانی پھسل گئی ۔ اب افسانہ نو

[redacted]

تو آیا ہے مگر اب بھی وہ پوری طرح کہانی نہیں بن سکا ہے۔ [اداریہ]

میرے بھائی، اس سطح پر بھی سوچنے کی ضرورت ہے کہ کہانی گم کیوں ہوئی؟ کہانی اب بھی ٹھیک سے لوٹی نہیں ہے تو کیوں؟ ۔

اس کا صرف ایک ہی جواب ہے۔ اور یہ جواب دینے سے ہم گھبراتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ ہم لکھنا ہی نہیں جانتے۔ کہانیوں کی باریکی سے، تجربات سے ہماری واقفیت نہیں۔ ہم ادبی بازیگری تو دکھا سکتے ہیں۔ کہانی بُن نہیں سکتے۔ کوئی کوئی کہانی اگر اتفاق سے اچھی نکل بھی آتی ہے تو اس کے ساتھ بہت سے اگر مگر، لگے ہوتے ہیں۔

ذہن کو ٹٹولیے تو پچھلے دس پندرہ برسوں میں لکھے جانے والے افسانوں کے نام پر بس چند ہی نام زبان پر آکر رہ جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ حقیقت ہے کہ زندہ افسانے وہی ہوتے ہیں۔ جہاں کہانی اور کردار کے درمیان کہانی کار ہٹ جاتا ہے۔ ہمارے یہاں اردو کا کہانی کار نہیں ہٹتا۔ وہ سینہ ٹھوکتا رہتا ہے— "نہیں ہٹوں گا۔ کیا کرو گے"— نتیجہ، پچھلے دس برسوں کے انتخاب میں اچھی طرح غور کرنے کے بعد بھی آپ شاید اچھی کہانیوں کا انتخاب نہ کر پائیں—

مجھے لگتا ہے، کہیں نہ کہیں ان مسائل میں مدیران رسائل کی ذہنی کمزوریوں کا بھی دخل رہا ہے— شمس الرحمٰن فاروقی کی علمیت اور قابلیت سے کسے انکار ہوگا۔ ان کا مطالعہ کس قدر وسیع ہے، سب جانتے ہیں۔ ظاہر ہے اچھے افسانے کی تعریف ان کے پاس ضرور ہوگی۔ لیکن شب خون نے پچھلے دس برسوں میں اچھا کیا دیا؟ شاعر پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

شاعر نے ادھر دس برسوں میں وہ کون سی زندہ کہانیاں دی ہیں جنہیں بھولنے میں برسوں لگیں گے؟ یہ بات شاعر، شب خون یا آج کل تک ہی محدود نہیں ہے جو بھی رسائل پابندی سے نکل رہے ہیں، یہ بات سب پر لاگو ہوتی ہے۔ یہ جاننا ہمارے لئے اس لئے بھی بے حد ضروری ہے کہ کچھ کو ذرا ٹھہر کر سوچنے، اور کچھ اہم فیصلے کرنے کی ضرورت ہے—

(۱) ایک فہرست تیار کی جائے۔ بھرتی کے وہ نام جو چاہے مشہور ہی کیوں نہ ہو گئے ہوں، اگر مسلسل واہیات لکھنے پر ہی مُصر ہوں تو پھر ان کا ادبی بائیکاٹ ہو— انہیں رسائل میں جگہ دینا بند کیا جائے—

(۲) افسانے پر کھل کر باتیں ہوں۔ یہ خوشی کا مقام نہیں ہے اگر یہ کہا جائے کہ برسوں بعد افسانے میں "ماجرا" کی واپسی ہوئی ہے— کہانی کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور اتنے برسوں بعد اگر ہم اردو والے محض ماجرا کی واپسی کے اعلان سے خوشی منائیں، تو یقیناً یہ ہمارے لئے ایک اور لمحۂ فکریہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہمارے نقادوں نے فکشن پر دھیان نہیں دیا۔ فکشن پر ہنگامے ہوئے۔ نئی نئی تعریفیں، اور شرح سامنے آئی۔ اور اس شرح کے لئے جنگی ہتھیار کے طور پر نئے ماڈل کے کلاشنکوف کا استعمال بھی کیا گیا۔ کسی نے کہانی کو "یوں" یا تو کسی نے "ووں"— کسی نے کسی افسانے کی بُرائی کر دی تو دوسرے نقاد نے اسی افسانے کی تعریف میں زمین و آسمان کی قلابے ملا دیئے۔ نتیجہ؟ بات فکشن پر کم ہوئی، آپسی میں پیچ زیادہ نکالے گئے۔ کس نے کیا کہا، پر زیادہ توجہ دی گئی— مگر اس بات پر زیادہ مغز ماری کی ضرورت نہیں کہ اردو کہانی اگر پچھلی دو ایک دہائی سے نئی نئی تعریفوں کے چکر میں پڑ کر گھومتی رہی۔ یا گم ہوتی رہی، تو اس میں قصور صرف لکھنے والوں یا نئے لکھنے والوں کا نہیں رہا، شمس الرحمٰن فاروقی کا بھی رہا ہے، ڈاکٹر محمد حسن کا بھی، افتخار امام صدیقی کا بھی، یعنی ان تمام مدیروں کا، ایک خاص وقت میں، جنہوں نے فکشن کو اپنے اپنے پیمانوں میں قید کرنے کی غلطی کی۔ یا فکشن کی تعریف اس طرح سے تشکیل کر دی کہ نئے لکھنے والوں نے تخلیق کو کسی پیمانے میں سمیٹنے کا فیصلہ کیا۔ ایک بات اور ہے۔ افسانے پر زیادہ کھوج بین یا ریسرچ کرنے والے فنکار بھی نہیں ہیں۔ ایک ہی بار میں، یا جلدی جلدی لکھنے، رکھ ڈالنے کی جلد بازی سے بھی اچھی کہانی پر فرق پڑا ہے۔ ہم کوئی [لکھنے سے قبل] نوٹ بک نہیں بناتے— کہانی اور کردار کے ساتھ، زیادہ سے زیادہ نہیں گھومتے۔ اور ادھوری کہانی کو اتار لیتے ہیں۔ پھر خود کو صفِ اوّل میں دیکھنے کی کرتب بازی شروع ہو جاتی ہے—

ہم نے ایک نئی صدی میں پاؤں دھرا ہے۔ لیکن کیا لکھنے کا سفر ختم ہو گیا ہے؟— ایک نسل حسین الحق، عبدالصمد، سلام بن رزاق کی تھی۔ ایک نسل مشرف عالم ذوقی، خورشید حیات (اب یہ تمام حضرات گمنامی کے اندھیرے میں کھو گئے) کی تھی۔ اس کے بعد والی نسل، جس میں خورشید اکرم، سہیل وحید وغیرہ کو شامل کر سکتے ہیں۔ ذرا جائزہ لیں، افسانہ چھوڑیں، افسانہ نگار دیکھیں، اس نئی نسل میں کتنے افسانہ نگار ابھرے؟— ظاہر ہے میری طرح آپ کے

موضوعوں پر بھی خاموشی ہی ہوگی۔ کیوں کہ نام ہی نہیں ہیں۔ تو کیا دس برسوں میں کوئی نیا نام ابھر کر سامنے نہیں آیا؟ جناب، دس برس بہت ہوتے ہیں، پورے دس برس ــ ان دس برسوں میں ہم ایک اہم اور معتبر نام نہیں دے پائے ــ تو پھر، فکشن پر مسلسل ہونے والی بحثوں کو کیا نام دیا جائے؟ یہ بحثیں تو اب تک فکشن کی صحیح تعریف نہ سمجھ پائی ہیں، نہ کر پاتی ہیں، صرف کاغذی باتیں ہو رہی ہیں، جہاں انکا ذکر زیادہ ہے اردو افسانے پر بات ہوگی تو اب بھی ہم منٹو کرشن بیدی اور عصمت سے زیادہ دور نہیں نکل پائیں گے۔ بہت آگے بڑھیں گے تو سہیل عظیم آبادی تک یا غیاث احمد گدی پر ہماری نگاہ ٹھہرے گی لیکن نسل بخش ادب کے نام پر ہم خاموش ہی رہیں گے۔

سوال اسی خاموشی کا ہے۔ اور اسی ٹھہرے سکوت کو توڑنا ہے لیکن یہ سکوت کیسے ٹوٹے گا اور کب ٹوٹے گا؟ ؟ ــ

خوشی ہوتی ہے جب قمر احسن، گوہر کے "بھوک" لکھتے ہیں۔ حسین الحق گونگا بولنا چاہتا ہے تک پہنچتے ہیں لیکن گوہر کا پھول جہاں بند بند معاشرے میں گھٹ رہی ایک مظلوم لڑکی کی داستان سے زیادہ آگے نہیں پاتا ــــ وہیں حسین الحق کے افسانے کا گونگا ایک بے حد معمولی علامت کے تارِ عنکبوت میں الجھا رہتا ہے۔ ہم مظلومیت اور خود سری کی داستانوں سے اس قدر آگے نکل گئے ہیں کہ اب جہاں معاشرے کی حد بندیاں ٹوٹی ہیں وہیں گونگے نے بولنا بھی سیکھا ہے۔ اور محض گونگے کا بولنا کوئی بڑی بات نہیں رہ جاتی۔ لیکن اس لحاظ سے، کہ ہم نے ابھی ابھی تجریدی اور لایعنی علامتوں کی عمارتیں ڈھائی ہیں اور گونگے کی بازیافت کی ہے، اس لحاظ سے ان نئی کہانیوں کی قدر وقدر ہونی چاہئے۔ یہاں ہم کہانی کہنے گئے ہیں یا ماجرا سننے گئے ہیں، جیسے "واقعات" پر بہت زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہم اس دور کی پیداوار ہیں جہاں مسائل کے بطن سے نت نئی کہانیوں کے نکلنے کا وقت ہے، جو کبھی وقت کے بہاؤ میں گم نہیں ہوں گی، جو ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ ہمیں اپنے دور کو سمجھنا ہے۔ اپنی ہستی، اپنی فرد داروں کی پہچان کرنا ہے۔ پھر لکھنا ہے، پھر قلم اٹھانا ہے۔ ہم ہی میں کوئی منٹو ہے۔ کسی میں بیدی کی تہہ در تہہ نفسیات چھپی ہے۔ لیکن ابھی ہم خود کو پرکھ نہیں رہے، اندر کے منٹو کو ڈھونڈ نہیں رہے، اس منٹو کو، واقعات کے زخم جسے اس قدر چھیل دیتے ہیں کہ ٹھنڈی گھوسنے والی بات سے باتھ شلوار کے ناڑے تک چلے جاتے ہیں۔ افسوس، یہ رتھ یاترائیں، یہ ایک اور تقسیم جیسی وارداتیں، فرقہ وارانہ فسادات، آنکھوں، آنکھوں میں ہوئی تقسیم، خود کا دوغلاپن، اگر ہماری آنکھیں ان واقعات میں کہانی نہیں ڈھونڈ پا رہی ہیں تو پھر ہمارے عہد کا تخلیق کار کہانی کہاں ڈھونڈ رہا ہے؟ ــ

اسے یہ سلطنت کی رتھ یاترائیں نظر کیوں نہیں آرہیں؟ ــــــــ

بھاگلپور، میانہ کے خون اسے کیوں نہیں نظر آرہے؟ ــــــــ

اگر نظر آرہے ہیں اور وہ پھر بھی انجان ہے تو یقیناً اسے جلد ہی اپنے قلم کو توڑ دینا چاہیئے اور کبھی کہانی نہ لکھنے کے لئے توبہ کر لینی چاہئے۔ اگر ایسا ہے تو یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ ہم اس بدترین دور سے گذر رہے ہیں جہاں کہانی ہمارے درمیان سے واقعی پھسل گئی ہے۔ یہ محاسبہ کا وقت ہے۔ یہ خود کو ٹٹولنے کا دور ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ایک اچھے بلکہ بہت اچھے کارنامے پر آپ کو ڈھیر ساری مبارک باد دینی چاہیئے تھی مگر میں گلے، شکوے لے کر بیٹھ گیا لیکن کیا کیجئے کہ آپ کی اتنی کوششوں اور محنت کے باوجود بیشتر کہانیاں اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکیں اور افسانہ نمبر کے حوالے سے کچھ اہم مسائل ابھر آئے۔ مجموعی طور پر یہ آج کی اردو کہانی کے مسائل ہیں جنہیں شاعر اور دیگر ادبی رسائل کے ذریعے سوچنا اور حل کرنا ہے ــ ✻

[illegible]

وہ سراپا
دیکھنے میں محفوظ اور مکمل تھا
جب تک وہ دو کے لیے لیکن
وہ شام کو
اپنے گھر کی جانب قدم بڑھاتا
تو اکثر اس کو خیال آتا
کہ اس کا کچھ کھو گیا ہے شاید
شریر سا کوئی انگ
کوئی عزیز
انمول شے کوئی سیم تن پرانی
متاعِ جاں، کوئی جانا انجانا رشتہ غم
کبھی سمجھتا وہ دل ہی دل میں
یا پھر کبھی خامۂ زباں سے
وہ اپنے شام و سحر کی میزان
جوڑتا، گھٹاتا، بناتا
تھکن سے جب چور چور ہوتا
تو نیند میں چونک چونک جاتا

عجب تواتر تھا اس عمل میں
کہ اس کے اعضا، تمام اعداد و بظاہر
رہے تھے سالم، مدام قائم
مگر وہ خود اپنے جسم و جان کے
وجود کے، اپنے پیرہن کے
شکستہ، وا ماندہ ٹکڑوں کی
تلاش میں، دور، اس قدر دور
اجنبی راستوں پہ ایسے نکل گیا
لوٹ کر وطن سے وہ آنہ پایا

جو اس کے اپنے تھے، اس کو دل سے عزیز تھے
روز و شب کے معمول میں
فراموش کر چکے ہیں اسے
مگر میں
(عجیب سی دلکشی تھی اس میں)
تلاش کرتا ہوں اس کو راہوں میں
جاں لیوا، اجڑتے، شکستہ اداس سم میں
خاک و خون میں
وہ کون تھا، مرا کون تھا وہ
جو گھر سے نکلا
جو آج تک لوٹ کر نہ آیا۔



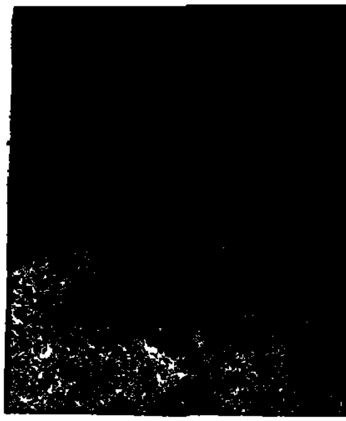
نظم ۔ نظم

میرے حلق سے اٹھنے والی
مجرم آوازوں کو
زباں نے
جب لفظوں میں ڈھالا تھا
میں نے اس کو
فوراً جڑ سے کاٹ دیا
میرے جسم کے زیرِ ناف کے سارے تر
اکثر راتوں کو
سرگوشی میں
انجانے پیمبروں کی باتیں کرتے تھے
ایک ہی وار میں
میں نے ان کو خاموشی کا درس دیا
دایاں ہاتھ جو اب تک تھا معروف کار
میرے اپنے بائیں نے بیکار کیا
آنکھیں راہ میں چلتے چلتے
پُر ترتیب، ہر منظر گرد کیا کرتی تھیں
آگ کے لمس سے میں نے ان کو
نظارے کے بندھن سے آزاد کیا۔
میں پاتال میں جس لمحے میں اترا تھا
میرے اندر ایک نیا سورج جاگا
مجھ پر سارے اندھے راز ہوئے روشن
میں خوش تھا لیکن پھر وہ دن بھی آیا
آخر آخر منظر کیا تھا
مجھ کو کچھ بھی یاد نہیں
مجھ کو کیا کچھ یاد نہیں؟

بلراج کومل

بخط شاعر

ای - ۱۳۹، کالکاجی، نئی دہلی - ۱۹



اوم کرشن راحت

۵۔ ایل/۵۲، فرید آباد ٹاؤن شپ۔ ۱۲۱۰۰۱

کنواری

شنو کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے گوردھن سیٹھ کے آدمی کو رات کے گیارہ بج گئے ساری رات بستی میں تلاش کرنے کے بعد جب وہ لطیف کے دارو والے کے یہاں پہنچا تو شنو کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی تھی شنو نے ابھی ابھی پینا شروع کیا تھا کیونکہ میز پر رکھے اَدّھے میں سے ابھی ایک پیگ ہی لگایا تھا اور گلاس میں بھی آدھا بھرا ہوا تھا۔ سیٹھ کے آدمی شنو کے پاس پہنچ کر اور قدرے جھک کر اس کے کان میں کچھ پھسپھسایا۔ شنو نے اس کی بات سن کر گلاس میں سے ایک بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے کہا "حمدو! میں نے سیٹھ کو کہا تھا ناں کہ مجھ سے ایسا کام آ پڑا کہ اتنی رات گئے بلاوا بھیجا ہے"

یہ ٹھیک بات تھی کہ شنو کو گوردھن سیٹھ سے کوئی خاص پہچان نہیں تھی لیکن اسے یہ ضرور پتہ تھا کہ شہر کے بیچ میں ایک مشہور ریستوراں ہے جس کا مالک گوردھن سیٹھ ہے دو برس پہلے اس نے ریستوراں سے ملحقہ مکان خرید کر ہوٹل بنانا شروع کیا تھا۔ ۔۔۔ بھی لگے تھے وہ بولا "حمدو بتا سیٹھ نے کہہ دیا کہ میرے کام سے پیسے کاٹ دو ۔۔۔ اور ۔۔۔ اس سے مجھ سے تو بھی بات کرنی ہے"

"یا شنو صبر نہیں کیا کرتے یار، گلاس اٹھا کر حلق میں ڈال اور چل میرے ساتھ سیٹھ تجھ سے ملنے کے لئے بیٹھا ہے۔ اگر تو میرے ساتھ نہیں چلے گا تو وہ مجھ پر بگڑے گا۔ چل نا یار دوستی کے ناطے" حمدو نے گڑگڑاتے ہوئے کہا

پھر پتہ نہیں کیا سوچ کر شنو نے گلاس میں بچی ہوئی اپنے حلق میں انڈیل کر اَدّھے کو بغیر فیصلہ کیے جیب میں ڈال کر وہ حمدو کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا شنو کو تین دن پہلے نوتن ہوٹل کی نوکری سے جواب ملا تھا جہاں وہ پچھلے پندرہ سالوں سے ۔۔۔ کام کرتا آ رہا تھا۔ وہ نوتن ہوٹل کے مالک نوین کے ۔۔۔ رازوں سے بھی واقف تھا اور خود اس سے بھی کئی ایسے کام سرزد ہو چکے تھے جن سے اس کی گردن پر نوین سیٹھ کی گرفت بہت مضبوط بنی ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے خوش بھی تھے اور خائف بھی۔ انہیں دونوں اثرات کے تحت ان کا نباہ بہت خوش اسلوبی سے ہو رہا تھا لیکن تین دن پہلے ایک سانحہ ایسا پیش آیا تھا کہ معاملہ بگڑ کر رہ گیا تھا۔

نوین سیٹھ اپنے آدمیوں سے گرد و نواح کے علاقوں سے نئی نویلی لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر یا لڑکیوں کے رشتے داروں کو معقول رقم دے کر بلواتا۔ اپنے ہوٹل میں ٹھہرنے والوں سے موٹی موٹی رقمیں وصول کر کے زندہ گوشت کا مزا چکھاتا اور مال باسی ہو جانے پر ان کو دور دراز کے علاقوں میں اونے پونے بیچ دیتا تھا اس سارے کام کاج کا انچارج شنو تھا اس کے علاوہ بھی اس کا ایک اور کام تھا جال میں پھنسی نئی نویلی لڑکیاں جب بہت ہاتھ پاؤں مارتیں تو ان کو رام کرنا بھی شنو ہی کو آتا تھا۔ دس سال پہلے اسی چکر میں شنو کے ہاتھوں اپنی بیوہ بہن کی لڑکی کا خون ہو گیا تھا۔ نوین سیٹھ نے بہت صفائی سے لڑکی کی لاش کو تو ٹھکانے لگوا دیا۔ لیکن وہ بھی ثبوت جو شنو کو پھانسی دلوانے کے لئے کافی تھے، اس نے اپنے قبضے میں رکھ چھوڑے تھے، شنو اس سانحے کے بعد پہلے پہل تو بہت گھبرایا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کا خوف دور ہوتا چلا گیا تھا۔
خفیہ طور پر اس سے بھی بردہ فروشوں کے ٹھکانوں اور نوین کے دور و نزدیک کے رشتے داروں سے جن کی لڑکیاں نوین نے اپنے یہاں بلوا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب کروا دی تھیں بہت سے گھناؤنے راز اکٹھا کر لئے تھے۔

تین دن پہلے کا واقعہ ۔۔۔ ایک نئی نئی خریدی ہوئی لڑکی کا تھا جسے شنو الفرڈ ہوٹل میں ٹھہرے کسی ادھیڑ عمر کے نو دولتیے کے لئے لے جا رہا تھا شنو کو نہ جانے اس باہر لڑکی پر ترس آیا یا اپنی ہاتھ سے نکلتی ہوئی جوانی پر، وہ اسے الفرڈ ہوٹل کے بجائے اپنے دو کمروں کے فلیٹ میں لے گیا تھا یہ پتہ لگا کر وہ لڑکی بالغ ہے اس نے اس لڑکی کی شادی کا شگن لی یہ پتہ نہیں لڑکی کے من میں اس دھندے کے خلاف کوئی جذبہ جاگ اٹھا تھا۔ یا شنو ہی نے بہت چکنی چپڑی باتوں سے اسے سبز باغ دکھائے تھے کہ وہ بھی راضی ہو گئی تھی۔ لڑکی

کو اپنی موسی کے یہاں چھوڑ کر شبو اس بھو رانے کے ڈراپ سین کے انتظار میں تھا کہ کھڑے کھڑے نوکری سے نکلوا دیا گیا۔ اس معاملے میں زیادہ بحث مباحثہ بھی نہیں ہوا تھا نوین کو آٹھ دس ہزار کی چوٹ لگی تھی اور شبو کو لڑکی کا جگی دے کر بھاگ جانے کا قصہ گھڑنا پڑا تھا۔

کار میں بیٹھ کر جیسے چندر اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہ اپنے ذہن میں اس کاروباری معاملے کے بارے میں غور کرنے لگا جو اسے پیش آنے والا تھا۔ اسے تو یقین تھا کہ معاملہ نوکری ہی کا ہے۔ سیٹھ کو نئے ہوٹل کے لئے ایک تجربہ کار آدمی چاہئے اور اس نے اپنے بارے میں غور کیا اور اسی نتیجے پر پہنچا کہ اس جیسا تجربہ کار اس شہر میں کوئی دوسرا ہے ہی نہیں۔ اس نے من ہی من میں اپنی نوکری کی شرائط بھی طے کر لی تھیں۔ تنخواہ کے علاوہ ہر لڑکی کے سودے میں وہ کم از کم پانچ فیصد۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کار ایک دھچکے کے ساتھ اس نئے ہوٹل کے سامنے رکی جس کی آرائش کو اب آخری ٹچ دیے جا رہے تھے۔

کار سے اتر کر اس نے سرسری نظر ہوٹل پر ڈالی جو اتنا بڑا تو نہیں تھا۔ لیکن بڑی خوش سلیقگی سے سجایا سنوارا گیا تھا۔ چندر اسے سیٹھ کے کمرے میں لے گیا جو اتنی رات گئے تک بھی شبو کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ شبو کو دیکھ کر سیٹھ مسکرا دیا اور اپنے پاس رکھی کرسی پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا "کیا پیو گے؟"

"جو مل جائے!"

"ہوں میرا خیال ہے کہ تم یہ تو سمجھ ہی گئے ہو گے کہ میں نے تمہیں کیوں بلوایا ہے، ہاں تجات چیت پینے سے پہلے کرنا چاہو گے کہ بعد میں" سیٹھ نے پوچھا۔

"جیسا آپ کو پسند ہو۔ ویسے میری رائے میں پینے سے پہلے بات کرنا ٹھیک رہے گا کیونکہ۔"

وہ سیٹھ ہنس دیا اور بولا "رات کافی ہو گئی ہے۔ تمہیں بھی اپنی نئی نویلی دلہن۔"

"نہیں نہیں سیٹھ جی ابھی میری شادی نہیں ہوئی۔"

"ارے بھئی! وہ معاملہ تو تم ٹھپ ہی سمجھو، نوین سیٹھ تم سے ٹکر نہیں لے گا۔ کچھ چوری چھپے منصوبے بنا رہا ہو اور بات ہے۔ ویسے میرا خیال ہے وہ چپ ہی رہے گا اور میری دانست میں اسے چپ رہنا بھی چاہئے۔ بیوپار میں جہاں نفع ہوتا ہے وہاں تھوڑا بہت خسارہ برداشت کرنا ہی پڑتا ہے اس نے لاکھوں کمائے ہیں اس دھندے میں دس بارہ ہزار کوئی ایسی بڑی رقم بھی نہیں جس کے لئے وہ تمہارا بڑا خطرہ مول لے۔ خیر چھوڑو میرے یہاں آ جاؤ گے تو بھی ہم بھی کوئی ایسے گئے گزرے نہیں ہیں۔ اپنی بھی پہنچ ہے۔ بولو نوکری کرو گے؟"

"ضرور کریں گے سیٹھ۔ پیٹ بھی تو پالنا ہے"، شبو نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "دیکھئے سیٹھ جی آپ میرے بارے میں اگر اتنا جانتے ہیں تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ نوین سیٹھ مجھے کتنی پگار دیتا تھا اور پگار کے علاوہ اس نے مجھے کون کون سی سہولتیں دے رکھی تھیں۔ بس وہ سہولتیں تو ہیں ہی۔ پگار میں کچھ رقم اور جوڑ دیجئے۔ اور۔ اور"

"اور کیا۔"

"دیکھئے سیٹھ جی ان دنوں میں اکیلا تھا اب تیل دار بننے والا ہوں مجھے ہر سودے میں پانچ فیصد آپ ایمانداری سے دیتے جائیے گا پھر میرے ہاتھ دیکھئے، اگلے سال ہوٹل کی دوسری منزل تعمیر کروا دوں تو شبو نام نہیں۔" شبو نے میز پر دھری بوتل کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ اسے یقین تھا کہ سیٹھ اس کی سبھی شرطیں مان لے گا۔ ہوٹل کے نئے نئے کاروبار میں اتنی جانکاری والا اور تجربہ کار آدمی ملتا بھی کہاں ہے۔ اس نے گلاس میں وہسکی انڈیل کر سیٹھ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لیجئے سیٹھ جی۔"

"نہیں نہیں یہ تم پیو۔ میں اپنا پیگ اپنی مرضی سے بناؤں گا" سیٹھ نے گلاس میں تھوڑی سی ڈال کر اس میں سوڈا ملاتے ہوئے کہا۔

وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر فٹ پاتھ سے گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ ایک عورت بہت زور زور سے بہت ہی غلیظ گالیاں دے رہی تھی۔ شبو نے کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور باہر جھانکا۔ بجلی کے کھمبے کے نیچے ایک بھکارن بیٹھی گالیاں بک رہی تھی اور اس کے پاس ہی ایک معصوم سی بچی بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ شبو نے باہر سے نظریں ہٹا کر سیٹھ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"وہاں شبو اپنے ہوٹل کے سامنے ایک ہی سیاہ دھبہ ہے۔ یہ بھکارن یہاں سے اٹھتی ہی نہیں۔ میں نے پولس انسپکٹر کو دو مہینے پہلے کچھ دے دلا کر اسے یہاں سے ہٹوایا تو تھا اور انسپکٹر اسے تھانے لے بھی گیا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد انسپکٹر کا ٹیلیفون آیا تھا کہ سیٹھ ہمیں کوئی اور کام بتلائیے جو آپ سے نہ ہو سکتا ہو۔ اس بھکارن کو وہاں سے اٹھانا ہمارے بس کا نہیں۔ ادھر تھانے میں آ کر اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا ہے۔ ایسی ایسی غلیظ گالیاں دیتی ہے جو ہم پولس والوں نے کبھی نہیں سنیں۔ میرے افسروں نے مجھے حکم دیا ہے کہ اس بھوت کے چھوکرے کو جہاں سے لایا ہوں وہیں چھوڑ آؤں اس دن سے یہ پھر یہیں پر براجمان ہے۔ میں نے سب کچھ کر دیکھا ہے۔ لیکن بیکار۔"

"لیکن سیٹھ اتنی رات گئے یہ گالیاں کس کو دے رہی ہے۔"

"اس کے پاس جو کمن چھوکری بیٹھی ہے وہ اس کی پروردہ ہے۔ روز رات کو اس علاقے کے بھک منگے ادھر آ کر ڈیرہ جما دیتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر یہ آپے سے باہر ہو جاتی ہے اور گالیاں بکنا شروع کر دیتی ہے۔ رات کو ایک رسّی اس لڑکی کی کمر سے باندھ کر دوسرا سرا اپنی گردن سے باندھ لیتی ہے۔ رات کے بارہ ایک بجے جب یہی بھک منگے اس کی گالیوں سے پیٹ بھر کر ادھر ادھر دبک جاتے ہیں تو یہ بھی دو تین گھنٹوں کیلئے سو جاتی ہے۔ چلو چھوڑو ہاں تو تم۔"

"دیکھو سیٹھ جی میں نے تو جو کہنا تھا سو کہہ دیا"، شبو نے دوسرا پیگ گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا "آپ کو کوئی اور آدمی ملتا ہو۔ سیٹھ آپ سمجھتے نہیں۔ آپ اس لائن میں نئے ہیں۔ یہ کام بہت جوکھم کا ہے۔ یہ جو آپ کے ہوٹل یا دوسرے ہوٹلوں میں شام کو بن سنور کر لڑکیاں آتی ہیں۔ ان کے بارے میں پولس کو اور ان کے گھر والوں کو سب پتہ ہوتا ہے۔ ان اونچے اور متوسط طبقے کی لڑکیوں اور خرید کر لائی گئی لڑکیوں میں بہت فرق ہوتا ہے پتہ ہے کس کس کے پاؤں پکڑنے پڑتے ہیں اور کس کس کا منہ بند کرنا پڑتا ہے اور کنواری کنواری لڑکیاں بہت مشکل سے ہاتھ آتی ہیں اور آج کل پتہ ہے کیا ہو رہا ہے کہ ہر ایک کا ایک کنواری کنواری چلاتا آتا ہے"، شبو نے گلاس حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا

"اچھا تو میں چلوں۔ رات بہت ہو گئی ہے۔ میری شرطیں منظور ہوں تو کہلوا بھیجئے گا، شراب بہت اچھی ہے۔" شبو نے بوتل کو ہاتھ میں لے کر ذرا سے کھا پھرا کر دیکھتے ہوئے کہا "اجازت ہو تو ایک پیگ....."

"ہاں! ہاں! تمہارے لئے تو منگوائی ہے۔ یہ لو" کہہ کر سیٹھ نے شبو کے ہاتھ سے بوتل لے کر اس کے گلاس میں وہسکی ڈالتے ہوئے کہا "دیکھو شبو میں سب کچھ ابھی طے کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہاری سب باتیں منظور ہیں لیکن میری ایک شرط ہے کہ اگر کبھی کوئی پولس کا بکھیڑا ہو گیا تو وہ تم

میرے مطلب یہ ہے کہ پولس والوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں ٹھہرا بال بچوں والا۔ میرا مطلب ہے کہ اس لائن کے تم ہی انچارج ہو گے اور بھگوان نہ کرے کوئی جھگڑا ہوا تو تم ہی نبٹو گے۔ دھندا تو میرا اب بھی چل رہا ہے۔ لیکن کچھ مزہ نہیں۔ میں اس دھندے کو اعلیٰ پیمانے پر چلانا چاہتا ہوں"، سیٹھ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"سیٹھ جی آپ نے پولس والوں کی ایک ہی کہی۔ سیٹھ جی آپ کو تو پتہ ہے کہ پیسے میں کتنی کشش ہے اس کے بدلے تو لوگ اپنی بہو بیٹیاں تک بیچ دیتے ہیں خیر چھوڑیے۔ اسی خوشی میں ایک ایک پیگ اور ہو جائے"

وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ سیٹھ نے وہیں بیٹھے بیٹھے کہا "COME IN!"

"سر ایک گاہک آیا ہے۔ شراب میں دھت ہے۔ ٹھیک سے بات بھی نہیں کر پا رہا ہے۔ ہوٹل میں کمرہ چاہتا ہے" بیرے نے اندر آ کر کہا ——

"ہندوستانی ہے یا فارنیر"

"سر باہر کا ہے۔ ناک نقشے سے عرب کا رہنے والا لگتا ہے۔ لیکن پوشاک انگریزی وضع کی پہنی ہوئی ہے ایئرپورٹ سے سیدھا اپنے ہوٹل آیا ہے۔ وہ اپنا لچھمن سنگھ ہے ناٹیکسی والا وہ لایا ہے ادھر۔ بولتا تھا بہت امیر آدمی ہے۔ سر وہ تو اپنے اکاؤنٹنٹ صاحب سے پیسے لے کر چلا گیا۔ سر آنے والا آدمی لڑکی مانگتا ہے... بکر بکر بولتا ہے"

"بکر کیا؟" سیٹھ نے پوچھا

"کنواری۔ ان ٹچڈ" شبو نے کہا

"تو بات کرو نا شبو۔ یہ تو اچھا مہورت ہے تمہاری نوکری کا"

"لیکن سیٹھ"، شبو نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "رات کا ڈیڑھ بج گیا ہے لڑکی کا تو انتظام اس وقت بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ بکر والی بات؟"

"وہ نشے میں ہے کوئی بھی چل جائے گی" سیٹھ نے کہا

"نہیں سیٹھ وہ پیسے دل کھول کر دے گا تو ___ صبح اٹھ کر وہ جھمیلا کھڑا کر سکتا ہے۔ فارینر ہے۔ لاکھ پولس والے ہمارے ساتھ ہوں۔ بات بگڑ سکتی ہے۔" شبو نے کہا۔

"بیرا اس آدمی سے بول دو ہمارے پاس کمرہ خالی نہیں ہے" سیٹھ بیرے سے مخاطب ہو کر بولا

"نہیں۔ نہیں سیٹھ۔ شبو ایسی گزرا نہیں۔ پہلا سودا ہے نئی نوکری کا۔" شبو نے بھروسہ مند آواز سے کہا اور پھر بیرے سے بولا "بیرا تم صاحب کا سامان کمرے میں فٹ کراؤ۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔"

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد شبو سیٹھ سے مخاطب ہوا "آٹھ دس ہزار کا سودا ہے سیٹھ یہ ہاتھ سے نہیں جانا چاہیئے۔ سیٹھ کوئی لیڈیز ڈریس ملے گا ادھر"

"نہیں!" سیٹھ نے کہا۔

"تو گھر سے منگواؤ۔ ساڑھی، شلوار قمیض، جینز اور بش شرٹ۔ کچھ بھی چلے گا ___ جلدی منگواؤ۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟" سیٹھ نے کہا۔

"سب سمجھ جائے گا سیٹھ سب سمجھ جائے گا۔ سیٹھ تمہیں تو معلوم ہے پیسہ بڑی چیز ہے۔ ادھر میرے ہاتھ میں پانچ سو روپے دو۔ جیا بولا ہے گھر سے کپڑے منگوا دو۔ بیرا سے بولو ایک چکن کی پلیٹ فٹ کرے یہ اپنا پہلا سودا ہے۔ سیٹھ تم شبو کو نہیں جانتے جب سالا اس بمبئی کا ملک میں کنواری چھوکری نہیں ملے گی تو کدھر ملے گی۔"

شبو ہاتھ میں چکن کری پلیٹ لے کر ہوٹل سے باہر نکلا اور سیدھا اس بھکارن کی سمت بڑھا جو اب اتنے ہی زور سے خراٹے بھر رہی تھی جتنے زور سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ قبل گالیاں دے رہی تھی۔ سڑک بھک منگوں کی سوچ کی طرح سنسان تھی۔ اونچی اونچی بلڈنگیں دن بھر شور و غل سے تنگ آ کر اونگھتی اونگھتی سی لگ رہی تھیں شبو شراب اور اپنے تجربے کے نشے میں مست اس بھکارن کے پاس پہنچا۔ وہ اب بھی سو رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اس رسی کے سرے پر تھا جو اس نے اپنی گردن کے اردگرد باندھ رکھی تھی اور اس کا دوسرا ہاتھ لڑکی کی چوٹی پر تھا جو بے فکری کی گود میں منہ چھپائے سو رہی تھی۔

بھکارن کے نتھنے پھڑ پھڑائے اور اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ شاید سالن کی بھوک بھڑکانے والی خوشبو اس کے نتھنوں سے ہو کر اس کی روح تک جا پہنچی تھی۔ گردن میں بندھی رسی کو ڈھیلا کر کے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اس کے منہ سے پانی رال بن کر ٹپکنے لگا تھا، حالانکہ آج ہی شام کو کئی دنوں بعد اس نے بھر پیٹ کھانا خود بھی کھایا اور لڑکی کو بھی کھلایا تھا جو جاگی تو نہیں تھی لیکن کروٹیں ضرور بدل رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ سالن کی خوشبو اس کے بھی نتھنوں میں گھس گئی تھی لیکن ابھی اس کی روح تک نہیں پہنچی تھی ورنہ وہ بھی اٹھ بیٹھتی۔

بھکارن نے للچائی نظروں سے شبو کی طرف دیکھا اور پلیٹ پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں اور پھر اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اس کا کانپتا ہوا ہاتھ پلیٹ کی طرف بڑھ گیا اور کب اس نے دوسرے ہاتھ سے کروٹیں بدلتی ہوئی چھوکری کو تھپتھپا کے جگا دیا جو اب آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی تھی اور پلیٹ میں پڑے سالن کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے وہ اپنی نظروں ہی سے چٹ کر جائے گی۔

شبو نے پلیٹ بھکارن کی طرف بڑھاتے ہوئے اس لڑکی کے خدوخال اس کے جسم کے نشیب و فراز کا جائزہ لے لیا تھا وہ اپنی چترائی پر بہت خوش تھا۔ بھکارن کے منہ سے باہر نکلتا ہوا لعاب اور شوربا اس کی ٹھوڑی سے ہو کر اس کی گردن تک بہہ رہا تھا۔ لڑکی مرغ کی ٹانگ کو اس طرح چبا رہی تھی جیسے وہ مرغ کو نہیں اپنی ازلی بھوک کو چبا رہی ہو۔۔ یہ نہیں کہ دونوں نے کبھی مرغ کھایا نہیں تھا۔ انہوں نے کئی بار ہوٹل کے باہر گندگی جمع کرنے والے ڈرم سے چچوڑی ہوئی ہڈیاں نکال نکال کر چوسی تھیں ان کے ساتھ چپکے ہوئے چھوٹے چھوٹے گوشت کے ٹکڑوں کو کتنی کتنی دیر اپنے منہ میں رکھ کر ان کا مزہ لیا تھا۔ ہاں! شوربے سے شرابور مرغ تو آج پہلی بار انہوں نے چکھا تھا۔ اس سے اٹھتی ہوئی بھاپ اور خوشبو ان کے چہروں پر پسینے کی بوندیں بن کر چمک رہی تھیں ——————

—————— کمسن لڑکی کے کھانے کا طریقہ بہت کراہیت انگیز تھا اس کا سارا چہرہ شوربے سے بھر گیا تھا۔ شوربے سے تربتر لال تھوتھ وہ بار بار اپنے چہرے سے بالوں کی لٹ پرے ہٹا رہی تھی۔ جس کی وجہ سے اب شوربہ اس کے بالوں پر بھی پت گیا تھا وہ دم بہ دم خالی ہو رہی پلیٹ کو بھوکی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کہ بھکارن بولی۔

"حرام زادی جنموں سے بھوکی، نردیدی کتیا کیسے بڑ بڑ کھا رہی ہے" بھکارن نے مرغ کی ٹانگ کو اپنے منہ سے نکالتے ہوئے اس کے منہ میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ "لے مجکس لے یہ بھی کھا لے سؤرنی یہ بھی کھا لے یہ نہیں کہ اس دیالو مانس کو ایک آدھ دعا ہی دے دے۔ سالی کھائے جا رہی ہے کھائے جا رہی ہے"

شبو نے اس لڑکی کو اس طرح کھاتے دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا اسے ابکائی آ رہی تھی اس نے بھکارن کی طرف دیکھا جو اب اپنی زبان سے پلیٹ کو چاٹ رہی تھی۔ شبو کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ شاید پلیٹ کو بھی کھا جائے گی اس نے بھکارن سے کہا

"موسی! اور لاؤں؟"

"نہیں رہنے دے" بھکارن نے پلیٹ سے زبان ہٹاتے ہوئے کہا ——

"یہ پلیٹ تم ہی رکھ لو" شبو بولا۔

"بہت گندی ہو گئی ہے کیا! میں اسے صاف ہی تو کر رہی ہوں"

"نہیں تم رکھ لو۔ یہ لو پانچ سو روپے۔ پورے پانچ سو ہیں" شبو بولا۔

بھکارن کی آنکھیں یہ بات سن کر ضرورت سے زیادہ کھل گئی تھیں پلیٹ کو چاٹنے کے لئے جو زبان اس نے منہ سے باہر نکالی تھی وہ

باہر ہی لٹکتی رہ گئی۔ لڑکی مرغ کی ٹانگ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی کہ کہیں گوشت کا ریشہ چپکا نہ رہ گیا ہو۔ دوسرے فٹ پاتھ سے ایک مریل سا کتا بس یونہی سونگھتا ہوا ادھر نکلا تھا اور دیر سے کھڑا دم ہلا رہا تھا۔

"تو تو بڑا داتا پُرش ہے رے" بھکارن نے اپنی انگلیاں منہ میں ڈال کر اپنی دانست میں انہیں صاف کر کے اور نوٹ سمیٹتے ہوئے کہا ——

"یہ تیری بیٹی ہے؟" شبو نے لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ——

بھکارن نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ شبو کی طرف دیکھ کر وہ لڑکی سے بولی "جا مردار بھاگ یہاں سے جا نل پر منہ دھو کے آ" ——

"نہیں اسے میرے ساتھ بھیج دے موسی۔ یہ وہیں نہا دھولے گی دیکھ نہ کیسی گندی ہو رہی ہے۔ اسے نئے کپڑے بھی پہنا دوں گا۔ دیکھ اس کی چولی چھاتی سے کیسے چیتھڑے چیتھڑے ہو رہی ہے"

"تو حرام زادے اتنی دیر سے تو اس کی چولی کے اندر جھانک رہا تھا! وہ بھی کی طرح نرمی تو نے اپنی جوان بہن کو نہلایا ہے کبھی اپنے ہاتھوں سے۔ سوئر کی اولاد۔ دتے! حرام جادے" بھکارن نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ کو شبو کے سر پر مارتے ہوئے کہا "تیری کنواری بیٹی کو بیچوں کسی سیٹھ کے ساتھ مجھے سب معلوم ہے تجھے کس نے بھیجا ہے ادھر دن چڑھنے دے اس حرامی کی مونچھیں اکھاڑ کر اس کی..... اور تجھے تو میں اس کتے سے پھڑواؤں گی" اس نے مریل کتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو ہڈیاں چبا رہا تھا۔

"میں تو بہت پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ اس حرامی سیٹھ میں بہ دیا کہاں سے جاگ اٹھی کل تک اپنی بیٹی کا یار جو جھوٹے برتن نہ دھوتا تھا ادھر۔"

اس نے پانچ سو روپے کے نوٹ شبو کے منہ پر دے مارے جو ادھر ادھر پھیل گئے تھے۔

"جلے جا اپنی ماں کو دے آ وہ بیچ دے گی تیری بہن کو اس رنڈی کھانے میں۔"

بھکارن نے ہوٹل کی طرف اشارہ کیا۔

رات کا سناٹا اس کی گالیوں سے چلانے لگا تھا ساری فضا اس کی بھر پور گالیوں کی بوچھار سے بھر گئی تھی۔ ارد گرد کے مکانوں کی کھڑکیاں کھل گئی تھیں۔

"دیکھ بے حرام کی اولاد" اس نے شبو کا گریبان پکڑتے اور ارد گرد کی بلڈنگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کبیاں ادھر رہتی ہیں۔ تری ماں تری بجیاں سب ادھری سے اس رنڈی کھانے میں آتی ہیں اور ان کے گاہک ادھری سے آتے ہیں۔ چل میرے ساتھ اندر چل میں دکھاتی ہوں تری ماں کس کمرے میں ہے بہن کس کمرے میں اور تری بیٹی کس کمرے میں۔"

شبو نے بہت تردد کے ساتھ اپنا گریبان چھڑا لیا تھا اور بھاگنے کی راہ دیکھ رہا تھا۔

بھکارن نے آوازیں دینا شروع کر دیں تھیں "منگو۔ بھکو۔ چندو۔ بجرنو۔ سب سالے کہاں مر گئے۔ ذرا آنا دیکھنا اس پلّے کو ——" ایک دو بھک منگوں کو آنکھیں ملتے ادھر آتے دیکھ کر شبو بھاگ کھڑا ہوا اسے بھاگتا دیکھ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگی "بھاگ گیا کتیا کا بچہ! اے منگو! سالے تو کہاں مر گیا تھا شام کو تو بہت گڑگڑا رہا تھا اس سالی کے لئے جالے جا اسے مر کہ اب مجھ سے یہ ذمہ داری نہیں سنبھالی جاتی۔ اس حرام جادی کو تو کسی نہ کسی دن وہ حرام جادے اٹھوا لے جائیں گے، کنواری ہے نا! جلے جا اسے۔ دیکھ میں نے اسے بہت لاڈ چاؤ سے پالا ہے میں بھگوان سے کہہ دوں گی وہ کچھ دنوں اپنی جھونپڑی خالی کر دے گا۔" بھکارن نے روتے ہوئے اس کمسن لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

منگو زیر لب مسکرا رہا تھا۔ ہوٹل کا مالک گوردھن سیٹھ جو ابھی تک کھڑکی سے لگا سارا تماشہ دیکھ رہا تھا، کھڑکی کے پردے گرا دیے تھے اونچی اونچی بلڈنگوں کی روشنیاں پھر سے بجھنے لگی تھیں اور سڑک کا سناٹا پھر سے اونگھنے لگا تھا کسی بھکارن کی سوچ کی طرح۔ ✻

اعتذار

شاعر کے حالیہ شماروں میں سہو کتابت سے مضامین نثر و نظم میں کئی بہت نمایاں غلطیاں راہ پا گئی ہیں جس کا ہمیں بہت ملال ہے۔

ادارہ شاعر اپنے محترم قلم کاروں اور معتبر قارئین سے بے حد معذرت خواہ ہے۔

[ادارہ]



جاوید ناصر

◆

کبھی عذاب، کبھی ایک تازیانہ ہے
ہمارا دورِ گذشتہ کا شاخسانہ ہے

بس ایک وعدۂ فردا پہ لوگ زندہ ہیں
بس ایک لمحۂ موجود آب و دانہ ہے

یہاں پہ روز تناظر بدلتے رہتے ہیں
تمہارا نیک رویہ بھی مجرمانہ ہے!

اب ایسی دھند میں مجھکو دکھائی کیا دیگا
ہے بس میں تیر نہ قابو میں وہ نشانہ ہے

وہ سنگِ راہ بھی، تازہ ہوا کا جھونکا بھی
کبھی قیام، کبھی ہر طرف روانہ ہے!

کہوں تو کس سے کہوں خاکدانِ تیرہ میں
بس ایک لمحۂ رفتہ کا آنا جانا ہے

◆

مرے مزاج میں راتیں بھی ہیں اُجالا بھی
ہر ایک بات پہ یارب تیرا حوالا بھی

میں ایک جھوٹ ہوں جیسے کوئی دُعا مانگے
محبتوں نے اچھالا مجھے سنبھالا بھی

کبھی جواب دیا، مطمئن کیا سب کو!
کبھی سوال کو ناراض ہو کے ٹالا بھی

وہ احتیاط ادھوری بھی ہے ضروری بھی
یہ اختیار مکمل بھی ہے نرالا بھی

مجھے خبر ہے، وہ ترمیم کرنے والا ہے
یہ دھڑکنیں مری تقریر ہیں مقالا بھی

● اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر، آل انڈیا ریڈیو، بمبئی۔



حسن عزیز

شکست و فتح پہ منظر پہنچنے والا ہے
کسی بھی پل یہاں لشکر پہنچنے والا ہے

زمیں پہ کوئی بھی سُنتا ہوا دکھائی نہ دے
بدن کا شور فلک پہ پہنچنے والا ہے

نکلنے والے ہیں دشتِ سیاہ سے ہم لوگ
سحر کا قافلہ اب گھر پہنچنے والا ہے

پھلوں کے رنگ بدلنے سے میں ہراساں ہوں
کہ شاخ شاخ پہ پتھر پہنچنے والا ہے

مرا حریف بھی کچھ کم نہیں کہ میری طرف
مری نگاہ سے بچ کر پہنچنے والا ہے

یہ خامشی نہیں چھوڑیگی کوئی گوشہ کہیں
یہ شورِ شہر سے باہر پہنچنے والا ہے

لہو کی دھار ابھی سے چمک رہی ہے حسنؔ
ہمارے ہاتھ میں خنجر پہنچنے والا ہے

● ۱۷۵/۲۰، چکلا پور، کانپور — ۲۰۸۰۰۱



[ہندی]

ہریش بھٹناگر

۵۔۲۰۲، پبلشرز کالونی۔ بھوپال

تلوار

پاس کے شہر میں دنگے ہوئے تھے۔ ان دنوں کی بات ہے۔ بات تو بہت چھوٹی ہے، لیکن اس نے مجھے بے چین کر رکھا ہے۔ دن پر دن گزرتے جا رہے ہیں۔ یہ ویسی ہی تازی ہے جیسی پہلے دن تھی۔ ہمیشہ دماغ پر سوار رہتی ہے۔ ایک پل کو نہ بسرتی، کیا دن، کیا رات!

میں نے کہا نا کہ دنگے میرے شہر میں نہیں ہوئے، پاس کے شہر میں ہوئے تھے۔ دو فرقوں میں خونی واردات ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ مارے گئے تھے۔ جگہ جگہ آگ لگی تھی۔ دھواں اٹھ رہا تھا۔ لوگ چیخ چلا رہے تھے اور شہر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے، دوسری جگہ پناہ کے لئے۔ میرے شہر میں ایسا کچھ نہ تھا۔ تھا تو صرف اس واردات کی دہشت۔ لوگ جو کنے تھے، اپنے میں سمٹے، خوف زدہ سے۔ ذرا سی کچھ ہوتا یا کوئی بدحواس سا بھاگتا تو بازار کے شٹر گرنے لگتے۔ لوگ گھروں میں گھس کر اندر سے کنڈی چڑھا لیتے۔ تھوڑی ہی دیر میں گلیاں، راستے سونے ہو جاتے۔ ایک، گشتی پولیس کا گھوڑا بدکا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ اس سنسنی کے ساتھ دنگا ہو گیا، پھر پل بھر میں راستے ویران ہو گئے۔ جہاں شور کے سوا کچھ سنائی نہیں پڑتا تھا۔ وہاں کوؤں کی کائیں کائیں گونج رہی تھی۔ بعد میں لوگ اس افواہ پر ہنسے۔ لیکن سنسنی کی دگدگی دل میں سمائی تھی۔ ایک دوسرے کو لوگ شک کی نگاہ سے دیکھتے۔ اور گھر کے باہر بہت ہی مجبوری میں نکلتے۔ ڈرتے کہ کہیں کچھ نہ ہو جائے۔

ایسی ہی مجبوری میں ایک شام میں بازار کے لئے نکلا۔ گھر میں سودا نہ تھا۔ ایک بوریت تھی۔ پڑوسیوں سے کئی چیزیں ادھار لے چکا تھا۔ اب ہمت نہ پڑتی تھی مانگنے کی۔ سو نکلا کچھ لینے۔

یہ جو راستہ ہے، کملا پارک سے کھرنی میدان کی طرف جانے والا، اس میں سب سے پہلے ڈھال، پھر طویل چڑھاؤ آتا ہے۔ چڑھاؤ سے پہلے بائیں ہاتھ پر بڑے تالاب کا کنارہ ہے۔ کنارے پر اس ہونا چاہئے۔ لیکن وہاں ہریالی ہے اور اس ہریالی کی شکل ایک پرانی مسجد۔ یانی اس کی کائی بھری دیواروں پر پچھاڑیں کھاتا۔ دبا اٹے کھڑے ہوں تو بھیگ جائیں۔ پتہ نہیں کیوں۔ مجھے وہاں کھڑے ہونے میں مزہ آتا ہے اور وہاں جا کر ہی مجھے لگتا ہے کہ میں ایک مغلئی تاؤ پر سوار ہوں۔ بہر حال! مسجد سے تھوڑا ہٹ کر یعنی چڑھاؤ کی طرف کئی ٹوٹے پھوٹے مکان ہیں، جنہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ کسی پرانی عمارت کے کھنڈر ہیں جنہیں لوگوں نے گھیر لیا، ٹین ٹپر ڈال کر رہنے لائق بنا لیا ہے۔

میں ان مکانوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس مکان کے بارے میں بتا رہا ہوں جو ان سے تھوڑا ہٹ کر ہے۔ بارش سے اس کا رنگ روپ زخمی ہے۔ اینٹوں نے اوپری کھال چھوڑ دی ہے اور اندر کی مستی جھانکنے لگی ہے۔ دروازے پر پردہ سا دھواں کھایا ٹاٹ پڑا ہے جو بیچ بیچ سے پھٹا ہے اور زمین پر ٹھہر رہا ہے۔ مکان کے پاس ہی اسکوٹر مرمت کرنے کی دو چار دوکانیں ہیں جن کے باہر کیچڑ، نم زمین پر میکینک اسکوٹر درست کرنے میں مشغول رہتے۔ مکان کے سامنے ایک بڑا سا پتھر پڑا ہے۔ پتھر پر جھکا آٹھ دس سال کا ایک لڑکا ہے۔

وہ لڑکا جو پتھر پر جھکا ہے، بھیانک حالت میں ہے۔ تن پر اس کے ایک پھٹی سی قمیص ہے۔ شریر کالا، میل سے بھولا نظر آ رہا ہے کہ جلنے سے بتیاں چھوٹنے لگیں۔ اس کے باوجود اس کے چہرے پر بھولا پن اور ایک ایسی کشش ہے، جس سے وہ خوبصورت لگ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانی زنگ آلود تلوار ہے۔ اور وہ پتھر پر رگڑ رگڑ کر اس میں دھار رکھ رہا ہے۔

جب میں پاس سے گزرا، تو لڑکا تلوار رگڑتے رگڑتے رکا، اس نے میری طرف دیکھا جیسے شناخت کر رہا ہو ــــ

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ یکایک ماحول کو دیکھ کر میں سنجیدہ ہو گیا اس بیچ وہ سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا۔ میرے چہرے میں اس نے کوئی ایسی

چیز نظر آئی جس سے وہ غصے میں بھر اٹھا۔ اس نے تلوار نیچے سے اوپر اس طرح لہرا کر تانی جیسے کامیاب تلوار باز کرتا ہے۔

میں کچھ بولتا کہ وہ مجھے ماں کی گالی دیتا للکارنے لگا۔ آتما ای اماں تھی۔۔۔ وہ تتلاتا ہے۔ تمہیں مال ڈالیں دے چھانے۔۔۔

مجھے غصہ آیا کہ چھٹانک بھر کا ہے، زمین سے اٹھا نہیں! اور ایسی باتیں! ماتھے پر بل آیا کہ اس لڑکے نے پھر گالی دی اور تلوار لہرانے لگا جیسے مار دے گا!

میں نے اسے زور سے جھڑکا اور پھر پرسکون لہجے میں کہا۔ کاہے مارو گے! میں نے کیا کیا ہے؟

اس پر اس نے تلوار زمین پر رکھی اور دونوں پنجے منہ کے سامنے کر کے ان پر تھوکا۔ پنجے رگڑتے ہوئے اس نے بایاں پنجہ گلے میں پڑے تعویذ کو چھوتے ہوئے بائیں ران پر مارا اور دائیں سے تلوار سنبھالی اور ایک ٹک دیکھتا گالی دیتا بولا۔ تم ہماری جات کے نہیں ہو! خونی ہو! ہم تمہیں مال ڈالیں دے! یہ کہتے کہتے اس نے تلوار لہرائی اور زور دوں سے پتھر پر دے مارا۔ پتھر پر رگڑ سے چنگاری سی اٹھی۔

تمہاری ہی ذات کا ہوں میں۔۔۔۔ منہ سے یہ بات پھوٹ ہی پڑی، بچکانی لگنے کے باوجود۔ مجھے شرم سی محسوس ہوئی جب اسکوٹر میکانک اس پر زوروں سے ہنس پڑے۔ ہنستے ہنستے وہ ہاتھ ہلانے لگے جیسے کہہ رہے ہوں کہ کاہے لونڈے لپاڑی کے منہ لگتے ہو، چلتے بنو۔

اس دوران لڑکا سپاٹے سے ٹاٹ والے پردے کو ہٹاتا گھر میں گھسا تلوار لئے اور ہاتھ میں بڑا سا لٹھ لے آیا کھینچتا ہوا۔ لٹھ اس نے زمین پر پٹکا جیسے تلوار کے ٹوٹنے پر اس کا استعمال کرے گا لٹھ کی جھنک کو پیر سے دباتا اب وہ طیش میں آگیا اور غصے میں بے تحاشا گالیاں بکنے لگا۔

تلوار پر سخت گرفت کی وجہ سے ہاتھ اور گلے کی نسیں تن گئیں اس کے چہرے پر سے وہ بھولاپن اور کشش غائب ہو گئی جو کچھ دیر پہلے تھی۔ اور اس کی جگہ پر اب ایک ایسی سفاکی آ گئی جو بھیانک اور خوف زدہ لگتی ہے۔

اچانک کوئی عورت ہنسی۔ میں نے دیکھا پردہ ٹاٹ کو اٹھائے چکٹ ساڑی پہنے الجھے بال بری طرح جھلاتی ایک عورت تھی۔ شاید یہ لڑکے کی ماں تھی۔ لڑکے کے کرتب پر نہال تھی، ہنس رہی تھی۔ میکانک بھی زور زور سے ہنسے جا رہے تھے۔ اب وہ تالی بجانے لگے جیسے کسی دھن پر یکساں تال دے رہے ہوں۔ ساتھ ہی آوازیں بھی لگانے لگے واہ! واہ!! ۔ واہ رے پہلوان! ایک اپ!! ۔ یہ آوازیں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں۔

میرا چہرہ سفید کاغذ سا ہو گیا اچانک لڑکے کی حرکت اور لوگوں کے اس روپ کے گھن سے بھر اٹھا اور ڈھیر ڈھیر سا تھوکنے لگا۔ یہ گھن اتنی بڑھی کہ میرا وہاں رکنا دشوار ہو گیا۔ میں آگے بڑھا۔ پیچھے ہنسی گونج رہی تھی اور للکار۔ واہ! واہ! واہ رے پہلوان! ایک اپ! اور لڑکے کی آواز بھی۔ تم ہماری جات کے نہیں ہو، ہم تمہیں جان سے مال دیں دے!!

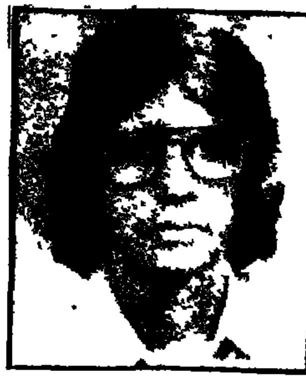
جھٹکے کے ساتھ تیزی سے مڑنے کی وجہ سے ٹین کی کٹی میرے گھٹنے ٹکرائی اور درد کی ٹیس اٹھی، لیکن درد پی گیا اور آگے بڑھنے بڑھتے میں نے ایک بار پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ دانت بھینچے لڑکا تلوار لہرا رہا تھا، اچھل اچھل کے۔ اس کے چہرے پر وہی سفاکی تھی۔ لڑکے کی ماں کے دانت نکلے ہوئے تھے اور میکانک تالی پیٹ کر ہنسے جا رہے تھے۔ میں کافی آگے نکل آیا تھا۔ آوازیں اب سنائی نہیں پڑ رہی تھیں۔ ان کی تالیوں، لوٹ پوٹ ہونے اور باہر نکلے دانتوں سے ایسا لگ رہا تھا۔

نکڑ پر آکر میں کھڑا ہو گیا۔ دل ہوا، پلٹ کر پیچھے دیکھوں لیکن پیچھے دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ جان رہا تھا کہ لڑکا گالی بکتا، تلوار لہرا رہا ہوگا۔ ماں نہال ہوگی۔ لوگ آوازیں لگا لگا کے تالیاں بجا رہے ہوں گے۔

اِس وقت کانپ رہا تھا میں ✻ [کہانی : آج ــــ ۱۹۹۲]

۱۹۹۲ء شاعر کا [illegible]

شمارے ۱۲ ★ ۴۸۸ صفحات



شین کاف نظام

کیفیت

کیل پر ٹنگے
کپڑے
میلے کیلنڈر
سمٹے پڑی
بوسیدہ آرام کرسی
گرد آلودہ کتابیں اور
پرانے پیلے پڑتے رسالے

میز پر بکھرا
حجامت کا سامان
تہہ میں پیالی کی جمی
چائے
صراحی میں ختم خشک ہوتا
پانی
اچانک کس لئے لگنے لگے اچھے
یہ سارے ◆

شناخت

گرا
لڑکھڑکا...
ابلق آ کار رہا
کون جانے
کون
سمجھے گا
تجھے ◆

فراموش

محسوس ہونے لگا
سستاتا ہوا
دھمنیوں میں
خون
اس سے پہلے...
کیا ہوا تھا.. ◆

پہاڑ پیڑ پگڈنڈی

پہاڑوں کی بلندی پر
بنتی پگڈنڈیاں
موسموں کے آنے جانے سے

پیڑوں کو تو مٹی روکتا ہے
حافظہ ہے نہ خواب
آرزو ہے نہ امید
گنجائشیں گنجلک ہیں ساری
سفر باقی
ایک آسیبی عہد کا ◆

آثار

بہا سمندر
سمٹ رہا ہے
ساکت سمتیں
صرصر۔ کل کل۔
کچھ بھی نہیں ہے

پوشیدہ رکھ سکنے کی۔ قوت
دیواروں، دروازوں کی
ختم ہو گئی

خوشبو
خوابوں سے بھرتی ہے
دیدہ اور نادیدہ خلا کو
شاید تم آنے والے ہو ◆

ایک منظر

فضاؤں کے فانوس میں
روشن ہوئی
شمع
کتنے پروانے ستارے ہو گئے ◆

● کلاس اسٹریٹ، جودھپور ــ ۳۴۲۰۰۱



شاہد اخلاق

۷/۲۲۴ جی ہی لال کا احاطہ، کانپور - ۲۰۸۰۱۲

دہشت گرد

آج پورے پانچ سالوں بعد ہم کیفے یادگار میں داخل ہو رہے تھے۔ آصف کے ڈیڈی ایک سرکاری کمپنی میں کسی اونچے عہدے پر فائز تھے۔ ان کا ٹرانسفر بنگلور ہو جانے کی وجہ سے سارے لوگ بنگلور چلے گئے تھے تاہم آصف سے میری خط و کتابت جاری رہی لیکن دوستی یاری کا لطف جب تک دوست قریب نہ ہو نہیں آتا ہے۔ لے دے کر آصف میرا اب تک کا پہلا اور آخری دوست تھا اسلئے پھر سے دہلی آجانے کی وجہ سے میں خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ آصف وہاں انٹرنیشنل اسکول آف کوڈکنال میں آرکیولوجی کا طالب علم تھا۔ میں دہلی میں رشین ادب پڑھ رہا تھا۔ آصف کے بنگلور جانے سے پہلے جب ہم سینٹ کیتوسا کے طالب علم تھے روبینہ بھی ہمارے ہی کلاس میں تھی۔ بلکہ ہمارے گروپ میں۔ ہر وقت ہم لوگوں کے ساتھ رہتی۔ بس ٹوائلٹ کو چھوڑ کر مگر وہاں بھی باہر تک چھوڑنے ضرور جاتی۔ اس کے لئے اسے دوسروں سے بڑی کڑوی کسیلی سننی پڑتیں۔ مگر چکنے گھڑے کی طرح اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ آصف تو اسے دیکھتے ہی دیوانہ ہو گیا تھا۔ وہ تھی بھی پہلی نظر میں دیوانہ کر دینے والی۔ اس وقت پندرہویں میں لگی تھی مگر اچھی غذائیں کھانے کی وجہ سے گول مول سی ہو رہی تھی۔ اسکرٹ سے جھانکتی ہوئی دودھیا پنڈلیاں، گول گول گھٹنے اور گلابی وائل کی شرٹ کے نیچے کالی باڈی کی الاسٹک، عین وسط میں ہک جس کی طنابیں اس کے شانوں پر چڑھ کر کچھ جھانکنے کی غرض سے آگے نشیب میں اتر گئیں تھیں۔ یہی سب نعمتیں تھیں جو آصف کے علاوہ اور بھی کئی لوگوں کو پریشان کئے ہوئے تھیں۔ آصف دوڑ دوڑ کر اس کے کام کیا کرتا اور اندر ہی اندر خوش ہوتا رہتا مگر اس شجر معصوم کے التفات کے تمام پھول میری جھولی میں آگرے۔ اس کی مجھے قطعی امید نہیں تھی۔ مبہم سی کوئی خواہش دل کے کسی کونے کھدرے میں پڑی ہو تو مجھے نہیں معلوم۔

میں لیب سے نکل رہا تھا تبھی وہ پونی ٹیل باندھے جاپانی گڑیا کی طرح نہ جانے کہاں سے وارد ہو گئی۔ مجھے آپ کی CHEMISTRY کی کتاب چاہئے۔ اس کے اس مطالبے پر مجھے خود حیرت ہوئی تھی کیونکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ کتاب اس کے پاس ہے پھر ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ ممکن ہے اس نے اپنی کتاب کسی اور کو دے دی ہو۔ میں نے اس سے کچھ پوچھے بغیر کتاب اسے دے دی اور دوسرے دن جب اس نے کتاب مجھے واپس کی تو اس میں سے ایک رقعہ برآمد ہوا۔ یہ اسی قسم کا رقعہ تھا جو اکثر و بیشتر اسکول کالج میں کتابوں کے ذریعہ لیا دیا جاتا ہے۔ حالانکہ میں بھی عمر کے اس خانے میں تھا جہاں اس طرح کے رقعے میرے صحن میں گرنا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی اور وہ رقعہ اگر روبینہ جیسی لڑکی نے لکھا ہو تو اس کے بعد کسی چیز کی خواہش نہیں ہو سکتی مگر میں آصف سے تو دھوکا نہیں کر سکتا اور پھر میرا دل روبینہ کے لئے اس طرح کبھی نہیں دھڑکا جس میں اذانوں کی بازگشت اور شوالوں کے ناقوس یا چرچ کے گھنٹوں کی صدا سنائی دیتی ہے۔ میں نے وہ رقعہ آصف کو دے دیا۔ دوسرے دن سے روبینہ اسکول کیمپس میں نہیں دکھائی دی۔ بعد میں آصف نے ہی بتایا کہ وہ اپنی دادی کے پاس گاؤں چلی گئی اور پھر وہیں اس کی شادی بھی ہو گئی۔ یہ انتقام شاید اس نے اپنے آپ سے لیا تھا۔ آج آصف کے ساتھ مل کر روبینہ کو یاد کرنا بھی ضروری تھا۔ وہ بھی زندگی کا کیا عجیب دور تھا جب ہم اپنی شامیں کیفے یادگار کے ڈسکوتھک میں گزارا کرتے تھے جہاں خوبصورت لڑکیاں ڈانس پاٹنر ہوا کرتیں تھیں۔ پانچ سال زندگی کا کوئی بہت بڑا حصہ نہیں ہوتا لیکن کس قدر تبدیلیاں آئیں تھیں ان پانچ سالوں میں ہر جگہ ہر فرد میں پچھلا وہ سب یاد کر کے مجھے خود بھی بڑا عجیب سا لگتا جب موٹر بائک پر کسی لڑکی کا مجھ سے

لپٹ کر بیٹھ جاتا یا تصور کر کے پر رقص کر لینا میں حسین زندگی تصور کیا کرتا تھا مگر آج جب دوبارہ میں اس ہوٹل میں آیا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ بچپن کی وہ بچکانہ گزرے سی ناپختہ سوچیں جنہیں میں وقت کے دریا میں بہا آیا ہوں اب تو وہ موجوں کے زیر و بم میں تحلیل ہو کر پتہ نہیں زمین کی کس تہہ سے جا ملی ہوں گی اب تو دنیا کے تغیرات میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ زندگی کے بہت سے مشکل و آسان سوال میں خود کی اپنے ذہن کی اختراع سے حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا

کویت۔ روس میں گورباچوف کی حکومت کا تختہ پلٹ عراق پر سعودی عرب اور کویت کے اشارے پر امریکہ کی تباہ کن بمباری صومالیہ میں سیاہ ادیبوں کا استحصال بوسنیا میں سربیائی فوجوں کا مسلمانوں پر ظلم و تشدد اور ہمارے یہاں بیاں، کشمیر [illegible] اب میری بیشتر [illegible] کے موضوعات ہی پر مرکوز ہوتے ——— اس وقت آصف کو کہ [illegible] کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر میں اسے [illegible] سایا کر [illegible] بعد [illegible] شوق ہو گیا۔ [illegible] تحریر [illegible] کہانیاں لکھنے کا شوق [illegible] دوسروں سے لگاؤ تھا ایک سالوں میں جہاں [illegible] کھینچے یا دکانیں [illegible] کی دیوار پر [illegible] پہلے [illegible] ہوئے تھے۔ اب [illegible] ایک [illegible] نسیاں [illegible] میں [illegible] گرنے ہوئے [illegible] آنکھوں [illegible] وقت کا احساس [illegible] ہم دونوں [illegible] پہلے [illegible] کر [illegible] ہوگا [illegible] نے [illegible] اگر اور [illegible] ہوگا۔

[illegible] دنیا [illegible] سے بالکل [illegible] سے پہلے [illegible] کی [illegible] سے [illegible] قاعدہ [illegible] لگا [illegible] ملک [illegible] دیکھا۔

میں [illegible] مجھے [illegible] کی [illegible] کی [illegible] منتظر [illegible] گفتگو کا سلسلہ [illegible] کے [illegible] منقطع کر دیا [illegible] بیٹے جانے کے بعد ہم پھر ایک دوسرے سے مخاطب ہوئے۔ یہ جان کر

کہ ادب سے تمہاری وابستگی میں اضافہ ہوا ہے مجھے بہت خوشی ہوئی "تو پھر سناؤ ——— کچھ ——— یوں ہی ——— دیکھیں آج کل کیا سوچ رہے ہو۔ ایک بات میں تمہیں اور بتا دوں ' ——— " جی ہاں ——— فوراً میں نے متانت سے کہا۔

"اب تم کو بس اتنا بید ہوا سنا کر مجھ پر اپنے فیصلے مسلط نہیں کر سکتے۔"

"اچھا ——— میں نے حیرت کا اظہار کیا ——— " ہوں " اس کے لہجے میں بلا کا اطمینان تھا۔ میں زیر لب مسکرایا پھر میں نے جیب سے سگریٹ نکالی۔ پیکٹ آصف کی طرف بڑھایا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے سگریٹ ہونٹوں پر دبائی۔ لائٹر کی لو نے گورے بدن والی سگریٹ کا بوسہ لیا تو شدت گرمی سے اس کے ہونٹ جل گئے۔ سانسوں کی شہوت کے بعد میں نے منہ سے مرغولے پیدا کیے۔ " وہ شہر کا سب سے مہنگا اور پوش علاقہ ہے اور وہ کوٹھی اس علاقے کی سب سے خوبصورت کوٹھی۔ شہر کے سارے لوگوں کی نظر اسی کوٹھی پر تھی کیوں کہ وہ دونوں اسی کوٹھی میں رہتی تھیں۔ اس علاقے میں ہی دور دراز تک ان جیسی خوبصورت لڑکیاں اور نہیں تھیں جب وہ سج دھج کر ایئر کنڈیشنڈ کار میں بیٹھ کر نکلتیں تو اچھے اچھے لوگوں کی نیتیں ڈول جاتیں پارساؤں کا بھی یہ خیال ہوتا کہ ایک بار ہی سہی دونوں میں سے کسی کے ساتھ کبھی جسمانی تعلقات قائم کرنے کی سزا اگر موت بھی ہو تو خسارہ ان ہی کا ہے دولت کا بھی کوئی حساب کتاب نہیں تھا۔ حالاں کہ یہ دولت ان کے پاس ہمیشہ سے نہیں تھی۔ ان کے دادا کو پشتینی مکان کے صحن میں چھپا ہوا خزانہ مل گیا تھا۔ بیش قیمت خزانہ ——— یہ خزانہ جب ان کے ابو کے ہاتھ لگا تو سب سے پہلے پرکھوں کا وہ مکان توڑ کر اس جگہ پر جدید طرز کی کوٹھی تعمیر کروائی۔ اس کوٹھی کے تعمیر کے بعد ہی دوسری کئی کوٹھیاں معاشرہ درج ہوئیں جو آج شہر کا سب سے مہنگا اور پوش علاقہ بن گیا۔ باپ جب تک زندہ رہا اس کوٹھی کو عیاشی کا گڑھ بنائے رہا۔ ہر وقت شراب کے نشے میں دھت اپنی خوابگاہ میں حسین عورتوں کے ساتھ اپنی راتیں رنگین کرتا۔ اس کا اثر جوان ہوتی ہوئی لڑکیوں پر بھی پڑا۔ دھیرے دھیرے وہ خود مختار ہو گئیں۔ جب جہاں جی میں آیا چلی جاتیں۔ جب جتنے پیسے چاہتیں خرچ کر دیتیں۔ کچھ دنوں بعد یہ ہوا کہ وہ رات گھر سے باہر رہنے لگیں اور کبھی کبھی نہیں بھی آتیں۔ یہ سب باپ کی آنکھوں سے بھی پوشیدہ نہ رہ سکا۔ اب وہ سخت فکر مند ہوا مگر وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ لڑکیاں جوان ہو چکی ہیں اور ان پر بے جا سختیاں اس کے لیے زیاں کا باعث ہو سکتی ہیں

بہت سوچ وچار کے بعد اس نے سوچا کیوں نہ ان پر ایک باڈی گارڈ مسلط کر دیا جائے۔ فوراً ہی خیال کی تکمیل ہوئی۔ ایک جوان اور صحت مند آدمی ان کے ساتھ کر دیا گیا۔ لڑکیاں باپ کے اس فیصلے سے کسی قدر برہم ہوئیں مگر کچھ بولنا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ اس زندان سے رہائی کی تگ و دو آئندہ پر ٹال دی اور کچھ سرگوشیاں کر کے خاموش ہو گئیں۔ اس کوٹھی کے مقابل جو کوٹھی تھی اس میں ایک جواں سال مرد رہتا تھا جو چھوٹی والی پر پہلی ہی نظر میں فریفتہ ہو گیا تھا۔ اس کے متعلق مقامی لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ وہ پہلے آوارہ لڑکوں کے ساتھ رہا کرتا تھا اور آئے دن پولیس تھانہ ہوا کرتا پر ادھر کچھ دنوں سے سب کچھ چھوڑ بیٹھا تھا۔ پتہ نہیں چھوٹی نے عشق کی وجہ سے یا اور کوئی وجہ ہو تو معلوم نہیں وہ اب کہیں آتا جاتا بھی نہیں تھا۔ بس ہر وقت کھڑکی یا ٹیرس پر کھڑے ہو کر چھوٹی کو تلاش کرتا رہتا۔ جلد ہی چھوٹی کو اس بات احساس ہو گیا کہ دو آنکھیں ہر وقت اس کا تعاقب کرتی رہتی ہیں مگر چھوٹی کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ لڑکے نے خادم کے توسط سے پیغام بھی پہنچائے مگر بے سود۔ لڑکی پھر بھی اس کے زیر دام نہیں آئی۔ لڑکے کا دل ٹوٹ گیا مگر اس نے امید کا دامن پھر بھی نہیں چھوڑا۔" میں نے محسوس کیا کہ آصف بور ہو رہا ہے اس کے باوجود میں نے کہانی آگے بڑھا دی۔ "لڑکیوں کی خود مختاری اور آزاد خیالی انہیں نائٹ کلبوں تک لے گئی۔ جہاں غیر مردوں کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر وہ رقص کیا کرتیں۔ اب وہ اس مقام پر آ گئی تھیں جہاں شاید اچھے بُرے کی تفریق ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ان کا اگلا قدم قعر معصیت کی طرف ہی اٹھنا تھا۔ عورت کا سب سے بڑا گناہ اور شاید آخری گناہ بھی۔ شدہ شدہ وہ اس کی بھی عادی ہو گئیں۔ یہ تمام باتیں بھی ان کے باپ کے کانوں تک پہنچیں مگر ایک عیاش مرد کسی عورت کو اس فعل سے روک بھی کیسے سکتا ہے۔ خواہ وہ مرد اس عورت کا باپ ہو۔ اس نے اس کے بعد بھی احتجاج کیا لیکن دوسرے دن وہ سو کر نہیں اٹھا بہت ہوشیاری اور احتیاط کے باوجود دنیا کو معلوم ہو ہی گیا کہ اس کا قتل ہوا ہے اور یہ قتل بھی کسی اور نے نہیں لڑکیوں کے محافظ نے کیا ہے۔ اس قتل کے بعد ہی علاقائی لوگوں نے محافظ کا نام دہشت گرد رکھا۔ دہشت گرد تو وہ شروع سے ہی تھا مگر یہ راز عوام پر ذرا دیر سے کھلا۔ جن لوگوں کو معلوم تھا بھی تو وہ اس سے خوف زدہ تھے۔ اس وجہ سے منہ کھولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اب وہ یہاں تنہا نہیں

تھا۔ وہ اپنے کچھ ساتھیوں کو بھی لے آیا تھا۔ دونوں بہنیں اس کی داشتائیں بن چکی تھیں۔ پتہ نہیں اس کے لئے ان پر جبر ہوا یا وہ خود رضامند ہوئیں معلوم نہیں۔ وہ دونوں میں سے جب جس کے ساتھ رات گزارنا چاہتا لے کر اپنی خوابگاہ میں چلا جاتا اور مزے کی بات یہ کہ صبح اٹھ کر پیسے بھی وہ نہیں دیتا بلکہ لڑکیاں خود اسے پیسے بھی دیتیں جتنے وہ مانگ لیتا اس سے بھی کچھ زیادہ ہی۔ یہ بات اب جا کر ظاہر ہو گئی کہ لڑکیاں تچل کر رہی ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے دہشت گرد کے منہ میں سگار لگاتی رہیں اور وہ مزے لے لے کر ان پر دھواں چھوڑتا رہا۔ یہاں سے بچ نکلنے کے لئے بھی اب ان کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ شاید وہ چاہتی بھی نہیں تھیں۔ ان کی زندگیوں کا طرز عمل تیز خیزی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ جو بھی سنتا حیرت کرتا۔ دنیا بھر میں لڑکیاں اپنے جسم کا سودا پیسوں کے حصول کی خاطر ہی کرتی ہیں لیکن ایسی لڑکیاں جو بلا کی حسین ہوں اور پیسے بھی خود دیں انہیں کس نام سے پکارا جائے یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ دہشت گرد کی قسمت پر لوگ رشک کرتے مگر حسد اس سے بھی زیادہ۔ ادھر سامنے والے پر تو عشق کا ایسا بھوت سوار تھا اسے کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اپنی معشوقہ کو ایک نظر دیکھنے کے لئے گھنٹوں ایک پیر پر کھڑا رہتا مگر اس سنگ دل پر پھر بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ شاید شہوت کی عادی ہو جانے کی وجہ سے وہ محبت کے کسی بھی معلوم یا نا معلوم جذبے سے دونوں ہی عاری ہو چکی تھیں۔ چھوٹی کی بے رخی سے زیادہ اذیت اسے اس بات سے پہنچتی جب وہ دہشت گرد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر قہقہے لگاتی ہوئی اس کے سامنے سے گزر جاتی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے اس کے ساتھی کھڑکیوں سے سر نکال نکال کر اس کا منہ چڑھاتے۔ یہ سب کچھ اس کے سامنے زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا ورنہ اب سے پہلے اس نے اتنے ضبط سے کبھی کام نہیں لیا تھا اسے یہ شکایت تو پہلے سے ہی تھی کہ باہر کے لوگ یہاں کے پر امن ماحول کو خراب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اب اس کے انتہائی ذاتی معاملے میں مخل ہو رہے ہیں۔ یہ ہتک اس کے لئے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی زہر کے کڑوے گھونٹ اب اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہے تھے وہ سوچنے لگا کہ کس طرح انہیں اس بدتمیزی سے روکا جائے اور ایک دن دہشت گرد اسے تنہا مل ہی گیا۔ اس نے راستے میں ہی روک لیا۔ اتنے دن اس علاقے میں رہ لینے کے بعد دہشت گرد کو بھی اس کے بارے میں

بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ایک لمحہ کو کانٹا نکل گیا تھا اسی لیے اس وقت اس سے الجھنا اس نے مناسب نہیں سمجھا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ وہ اس سے جیت بھی نہیں سکتا ایسے وقتوں کے لئے ہی تو اس نے لونڈے پال رکھے تھے۔ عاشق نے اسے اپنے راستے سے ہٹ جانے کا حکم بہت سخت لہجے میں دیا۔ دہشت گرد خاموشی سے سن کر چلا گیا۔ عاشق کے سامنے اب چھوٹی کو راہ راست پر لانا باقی رہ گیا تھا۔ اس نے پھر سے ایک بار چھوٹی کی منتیں کیں مگر وہ کسی طور اس کی منڈیر چڑھنے کو راضی نہیں تھی۔ یہی وہ وقت تھا کہ جب عاشق کے اندر کا سویا ہوا غنڈہ جاگ اٹھا۔ " میرے خیال میں اب ہمیں ایک ایک کپ چائے اور پینی چاہئے۔ آصف کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ بہت تھک گیا ہو" ہاں میرا بھی یہی خیال ہے ، آصف نے بھی میرے مشورے کی تائید کی۔ میں نے ویٹر کو بلا کر دو چائے لانے کو کہا۔ آصف سے کچھ اور پینے کو پوچھا۔ اس نے منع کر دیا۔ ویٹر چلا گیا تو میں نے کہانی کا منقطع سلسلہ اٹھایا۔ "چھوٹی کا عاشق بھی ایک نمبر کا غنڈہ تھا ایک رات موقع پا کر وہ چھوٹی والی کے یہاں آدھمکا۔ بڑی والی دہشت گرد کے ساتھ سوئی ہوئی تھی۔ اس نے جا کر چھوٹی والی کو جگایا۔ چھوٹی نے شور مچانے کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی وہ آنکھیں جن میں اب تک وہ اپنے لئے سر چھلکتی ہوئی موجوں کو دیکھا کرتی تھی آج نفرت کے شعلے سے بھڑک رہے تھے۔ وہ خوف زدہ ہو گئی مگر کسی طرح خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ اگر یہ میرے ساتھ صرف ہم بستر ہونا چاہتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں کون سی باکرہ ہوں جو اپنی عصمت لٹ جانے پر کف افسوس ملوں: وہ میرے اعضا کو نقصان نہ پہنچائے۔ اس نے عاشق سے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔ عاشق کو یہ سودا معقول لگا کیوں کہ اتنے دن میں وہ یہ تو جان گیا تھا کہ اس طرح کی خستہ لڑکیوں سے محبت اپنے لئے موت کا راستہ متعین کرنے کے مترادف ہے۔ ذرا سی دیر میں اس نے اپنی سوچوں میں زمین و آسمان کا فاصلہ طے کر لیا۔ لڑکی نے بغیر کسی چوں چرا اس کے اپنے جسم سے تمام کپڑے ایک ایک کر کے الگ کر دیے عاشق اس پر پوری طرح ٹوٹ پڑا۔ پھر رات بھر گداز بستر پر اس کا گوشت نوچتا رہا۔ اسے اپنے کئے پر پچھتاوا بھی نہیں ہوا بلکہ وہ تو خوش تھا کہ اس نے اپنی محبت حاصل کر لی وہ زندگی کی ہر شکست سے نتیجہ کشید کرنے والوں میں سے تھا۔ اپنے تو اس پر دھرا بوجھ اتار لینے کے بعد وہ خود کو ترو تازہ محسوس کر رہا تھا۔ صبح جب چھوٹی گھر میں نہیں دکھی تو دہشت گرد کو سمجھتے دیر نہ لگی کہ رات کیا ہوا ہے اور اب آگے کیا ہونا چاہئے وہ اس پر غور و خوض کرنے لگا اس نے فوراً اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کیا اور اس عاشق کی کوٹھی میں گھس کر توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ چھوٹی کو اس کے چنگل سے چھڑایا تاہم انہیں اس کے لئے بہت محنت کرنی پڑی۔ عاشق کے جسم پر چاقو کے کئی نشان آئے وہ سب تباہی مچا کر چلے گئے۔ عاشق کو فوراً اسپتال پہنچایا گیا جہاں صحیح وقت پر آجانے کی وجہ سے اس کی زندگی بچ گئی۔ جب کہ دہشت گرد نے اسے ختم کر دینے کی حتی الامکان کوشش کی تھی مگر ابھی اسے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں سالوں لگ سکتے تھے۔ ٹھیک ہو جانے پر شاید وہ اب کبھی چھوٹی کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھے مگر ڈاکٹروں کا یہ قیاس اس وقت دھرا رہ گیا جب ہوش میں آتے ہی اس نے کہا کہ وہ لڑکی اب میری محبوبہ نہیں داشتہ ہے اور میرے علاوہ اب کسی کے ساتھ نہیں ہو سکتی، میں اسے حاصل کر کے ہی رہوں گا لوگوں نے اس کی ہمت کو سراہا۔ چائے کا آخری گھونٹ پی کر میں خاموش ہو گیا۔ آصف نے میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ اس میں کہانی کہاں ہے... آصف کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔ مجھے آصف سے اس جملے کی قطعی امید نہیں تھی۔ میں نے ایک اور سگریٹ جلائی۔ اس دہشت گرد کا نام ... اگر امریکہ .. ہو .. وہ دونوں بہنیں۔ سعودی عرب اور کویت اور.. وہ سامنے کی کوٹھی میں رہنے والا... عا.. ش.. ق یہ.. عر.. ا... ق...؟ آصف نے ہی جملہ پورا کیا۔ میں نے تو صرف اثبات میں سر ہلایا... ہونہہ ❀

بقیہ صفحہ ۲۸ — مختصر کہانیاں

مجھے اچھا لگتا ہے ڈھلتا دن ... جو ان بکھرے اور پریشان حال لوگوں کو اپنی جانب مدعو کرتا ہے کہ "آؤ ، میری گود میں سر رکھ کر کچھ دیر آرام کر لو....."!

چڑھتی عمر بھی مجھے پسند نہیں ... ہر روز قدموں کو نت نئے گناہ کی جانب راغب کرنے والی ... مرمریں ہاتھوں سے تھپک تھپک کر مدہوش کر دینے والی عمر۔

مجھے پسند ہے ڈھلتی عمر... جہاں تھکا ہارا اور زخمی انسان ، ابھرتا سورج... ابھرتا دن اور ابھرتی عمر کی تمام تلخیوں کو قبول کر کے جیسے داغ ہو جاتا ہے ... ایک کورے سفید چادر کی طرح ❀



شاہد میر

شعر تو کہہ لئے بیان بھی دو
فصل پکنے لگی لگان بھی دو

تحفۂ "ارضِ دل" تو کم ہے بہت
اس کو آنکھوں کا آسمان بھی دو

خود کو خود سے الگ کرو اک روز
اس کی خاطر یہ امتحان بھی دو

مانتے ہو جسے خدا کا گھر
اس میں آکر کبھی اذان بھی دو

ہاں بنا تو لیا پرندۂ حرف
اب ذرا سی اسے اڑان بھی دو

یہ نشانی بھی کم نہیں اس کو
تحفۂ شہرِ بے نشان بھی دو

آبسا جو تمہاری آنکھوں میں
اس کو پلکوں کا سائبان بھی دو

● ڈانگ کشم کرشی وگیان کیندر سرونج (ایم پی)



واجد قریشی

کھیت کھلیان کا نہ گھر کا تھا
مسئلہ سارا رہ گزر کا تھا

کس کی دہلیز پر صدا دیتے
فیصلہ بے سروں کے سر کا تھا

کچھ تعلق بھی جان و دل کا نہیں
اور رشتہ بھی عمر بھر کا تھا

پاؤں پتھر کے ہو گئے پھر بھی
سر میں سودا اسی نظر کا تھا

کس کو ٹھہرائیں موردِ الزام
سلسلہ وہ بھی اپنے ڈر کا تھا

تیر و تلوار ساتھ کیا دیتے
سامنا ایک بے ہنر کا تھا

● ۹/۳ حویلی میر صاحب اجین ۴۵۶۰۰۶



نظام ہاتف

ویرانوں میں ویرانی ہے
یہ بھی اک خوش امکانی ہے

گر گئے آندھی میں سارے پھل
پیڑوں میں سرگردانی ہے

اصلی چہروں کے سوداگر
میرا یہ چہرہ ثانی ہے

گھر پر بھائی قابض ہوگا
مشکل یہ بھی پیش آنی ہے

میں نے تم کو خط نہیں لکھا
کیا اخلاقی نادانی ہے

گھر بیٹھے سب دیکھ رہا ہوں
اس میں اور پریشانی ہے

● ۱۱۶ بی، ریلوے اسٹیشن کالونی، مرادآباد۔ یوپی



ساجدہ عندلیب رحمان

ای ۷/۱، ابراہیم روڈ۔ کلکتہ ۔ ۷۰۰۰۲۳

مختصر کہانیاں

معمّہ

میں اس کی ماں نہیں کیونکہ میں نے اُسے نو ماہ اپنے بطن میں نہیں رکھا۔ اُس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی بھی ذمہ داری مجھ پر نہیں تھی۔

میں اس کی بہن نہیں کیونکہ ہمارا بچپن ایک ماں کی گود میں نہیں بیتا۔ ہم دونوں نے ایک چھت تلے لڑکپن بھی نہیں گزارا۔

میں اس کی بیوی نہیں کیونکہ اس کی خوبصورت بیوی کی تصویر میرے ڈرائینگ روم میں آویزاں ہے۔ میں اس کے بچوں کی ماں بھی نہیں۔

میں اس کی بیٹی نہیں کیونکہ میں اس سے صرف چھ سال ہی چھوٹی ہوں۔ اس نے کبھی اپنا شفقت بھرا ہاتھ میرے سر پر نہیں رکھا۔

میں اس کی محبوبہ نہیں کیونکہ اس نے کبھی مجھ پر اپنی محبت ظاہر ہی نہیں کی۔

میں اس کی دوست بھی نہیں کیونکہ ہمارا معاشرہ ایک دوست کے لئے اتنی عظیم قربانی کا تصور ہی نہیں کرسکتا۔ کیا محض ایک دوست کے لئے ہی کوئی تمام دنیاوی رشتوں اور رشتوں کو الوداع کہہ سکتا ہے؟

اگر میں اس کی ماں، بہن، بیوی، بیٹی، محبوبہ، دوست کچھ بھی نہیں تو پھر میں اس سے پیار کیوں کرتی ہوں؟ میں آخر کون ہوں؟

میں ایک "معمہ" ہوں! *

متضاد کرن

عالیشان مکان نے جھونپڑی سے کہا "مجھے تم بہت اچھی لگتی ہو۔ تمہارا بوٹا سا قد میرے دل کے تاروں کو جھنجھنا دیتا ہے۔ تمہارا ویسا دل جو سبھوں کو سہارا دیتا ہے میری توجہ کا خاص مرکز ہے۔ میں تو مصنوعی دکھاوے کے درمیان گھٹ کر رہ گیا ہوں میں تمہیں گلے لگانا چاہتا ہوں!"

مکان کی باتوں پر جھونپڑی ہنس پڑی اور بولی "آپ کا سر تو ہمیشہ ہی بلند رہا۔ آپ نے ہمیشہ فلک دیکھنا ہی پسند کیا۔ عالیشان ہمسایوں سے ہی آپ ہمیشہ محو گفتگو رہے۔ آپ کو فرصت ہی کب ملی جو زمین کی جانب دیکھ سکیں؟ آپ میں اتنی سکت ہی کہاں جو جھک سکیں! اگر آپ نے مجھے گلے لگانا چاہا تو اس کے لئے آپ کو جھکنا پڑے گا۔

جھونپڑی کی باتوں کو نظر انداز کرکے مکان اسے گلے لگانے کے لئے زمین کی جانب جھکنے لگا۔ . . . اور . . . پھر . . . . . اڑا ڈھ . . . . . دھڑام ایک آواز فضا میں اُبھری اور وہ زمین پر آن گرا . . . . . جھونپڑی کا کہنا درست ہی تھا کہ اس میں اتنی سکت ہی کہاں جو وہ جھک سکے اس کی بنیاد ہی کمزور تھی۔ وہ محض ایک اینٹ کی دیوار سے بنا تھا! *

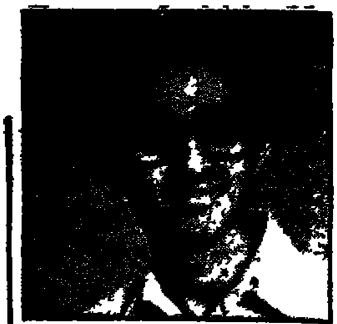
ڈھلتی عمر

ابھرتا سورج مجھے پسند نہیں۔ کیونکہ . . لوگ اسکی پرستش کرتے ہیں اسے سلام کرتے ہیں۔ کسی کے لئے یہ خوشی کا پیغام لاتا ہے تو کسی کو غم کے سمندر میں غوطہ زن ہونے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔

مجھے پسند ہے ڈھلتا سورج۔ تھکا ہارا سا . . . بادلوں کے آغوش میں کچھ لمحوں کے لئے ہی سہی مگر آرام کا طلب گار!

ابھرتا دن مجھے پسند نہیں . . . انسانی دماغ میں ہیجان برپا کرنے والا نہیں۔ شبنموں کے پاٹ میں پس کر رعنا وغیرہ کرکے بکھیر دینے والا!

[باقی صفحہ ۲۶۔ پر دیکھئے]



نعیم اشفاق

کرشمۂ مخفی

خدائے برتر
عظیم تر تھا گناہ میرا
وجود میرا تھا ایک گالی
میں اپنے ہونے کے غم میں زندہ
عذاب سارے اٹھا رہا تھا
اداس لمحوں اداس رستوں
کا ایک لمبا سفر تھا آگے
بصیرتوں کا بصارتوں کا
اک امتحاں تھا نظر کی حد تک
کوئی پڑاؤ کہیں نہیں تھا
زماں مکاں سے پرے تھا سب کچھ
مگر تری رحمتوں کی بارش
ہوئی کچھ ایسی فصیل شب تک
کہ چاہتوں کے گلاب پھوٹے
چہار جانب تری نوازش
تری ہدایت کے تار کھنکے
فضا میں گونجا نجات نغمہ
عذابِ ہجرت سے ہل گئی تھی
مجھے رہائی
عظیم تر ہے تری خدائی
تری خدائی عظیم تر ہے

مسندی محلہ، آسنسول۔ ۷۱۳۳۰۲



پرکاش تیواری

سمئے

غموں کی
چلچلاتی دھوپ میں
شکستہ
زندگی کی وہ گذر پہ بیٹھا
اک بشر
تلاش کر رہا تھا کچھ
کبھی زمیں کو دیکھتا
کبھی وہ آسماں کو۔
میں نے پوچھا!
کیا تلاش کر رہے ہو!
کھو گیا ہے کیا تمہارا ؟
مجھ کو دیکھ کر
وہ مسکرایا
اور اداس ہو کے
پھر کہا!
سمئے !!

۱۹۹۔ سیکٹر ۱۲، آر کے، پورم، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۲



[illegible]

سماج

میں نے پاپا کبھی نہیں کہا
میں نے ابّو کبھی نہیں کہا
میں نے ....

میں نے اپنی ممّی ، امّی سے
بارہا پوچھا ہے
میرے پاپا کہاں ہیں؟

وہ بڑے پیار سے
مجھے رجھاتی ہے
نہارتی ہے، چوم چوم لیتی ہے
گود میں بھٹا لیتی ہے
اور دُلار سے کہتی ہے
بیٹے ! تمہارے پاپا
اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں
رات ہوگی تو آئیں گے
تمہارے لئے بہت سارا
پیسہ دے جائیں گے
دوسرے دن آنے والے
تمہارے پاپا مگر !
بدل جائیں گے۔

کلکتہ کلاتھ اسٹورس، کتراپٹی، جھریا۔

مشاعر کے مشہور کالم "تعطل اور کتب و رسائل" ایک مدت سے رسالے میں شامل نہیں کئے جا رہے ہیں تاہم تبصرے کے لئے کتب و رسائل بڑی تعداد میں موصول ہو رہے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ موزوں کالموں کی عدم قبولیت کی کئی وجوہ میں سے ایک شاعر کے حجم میں کمی بھی ہے۔ ہم جس معیار اور انداز کے تبصرے دینا چاہتے ہیں اس کے لئے خاص نمبر کی اشاعت کا انتظار ہے۔ اس کے بعد ہی تبصروں کا باقاعدہ آغاز ہوگا۔ لطف تشنہ مطبوعات پر تبصرے مگر قارئین شاعر کے مسلسل اصرار پر ہم اس شمارے سے کتب و رسائل کا کالم پھر سے شروع کر رہے ہیں۔ خاص نمبر تک تمام موصولہ کتابوں کا مختصر مگر جامع تعارف دیا جا سکے گا۔ (ادارہ)

تاریخ مشاعرہ

بزرگ نقاد علی جواد زیدی نے ایک اہم ترین موضوع پر کتاب تصنیف کر کے تحقیقی کام کرنے والوں کو راستہ دیا ہے۔ اردو مشاعروں کی اپنی ایک طویل تاریخ ہے۔ مشاعروں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر اس موضوع پر کوئی مستقل کتاب موجود نہیں تھی کتاب کے ابواب میں سے۔ تاریخ مشاعرہ، بہار سے مشاعرے، دلی کے مشاعرے، لکھنؤ کے مشاعرے، دوسرے اہم علاقات کے مشاعرے، دور قدیم کا جائزہ، جدید مشاعرے، ترقی پسند تحریک اور مشاعرے، آزادی کے بعد اور کلیات ان ابواب میں جامع تحقیقی مواد شامل کیا گیا ہے۔ یہ کوئی مستند مکمل تاریخ تو نہیں لیکن ایک اہم ترین ماخذ ضرور ہے۔ ایک بہت ہی دلچسپ علمی کارنامہ جس کی پذیرائی ہونی چاہیئے ● ضخامت ۳۰۴ صفحات ● قیمت ۰ روپئے ★ سطبوعہ ۱۹۹۲ ★ ناشر علی جواد زیدی۔ اے ۵۸۱ ۵ گرین پیڈ، مہاتما گیوں روڈ، اندھیری (ایسٹ) بمبئی ۹۳۔

اردو افسانے کی روایت

۱۹۰۳ — ۱۹۹۰

افسانہ نگار اور نقاد مرزا حامد بیگ کی ایک گرانقدر کتاب ہماری اس اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے جو اردو زبان کے مختصر افسانوی ادب سے متعلق ادوار و پیش، مالی تسلسل پر محسوس کی جاتی ہے۔ یہ اردو افسانے کی ایک ایسی جامع تاریخ اور استعاریہ ہے جس میں مختصر کی اور اکستانی محقق و تنقید اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ نتیجے کے طور پر اس کتاب میں آپ کو ہر باتعمیر شدہ تحقیقی و تنقیدی ڈھانچہ سیر کی صورت میں یا سطر بہ سطر تشکیل پاتا دکھائی دے گا۔ اس کتاب میں ۱۹۰۳ء سے ۱۹۹۰ء تک افسانہ نگاروں کی اگلی اشاعتی کے ساتھ اردو افسانے کے مختلف ادوار کا تذکرہ کر کے ہر دور کے منتخب افسانہ نگاروں کے کئی زاویے کے تحسین اور تجزیہ ہم تا تغیر کے ساتھ ساتھ کیجئے کے بعد افسانہ نگاروں کے سوانحی تذکرے کا اصل و مستند تاریخ، اشاعت و نیات نے اصل اور علمی اصول اولین تحریروں اور اولین مطبوعہ افسانوں کی نشاندہی کر دی ہے۔ نیز مختلف مطبوعہ کتب، مضامین اور علمی تذکروں اور افسانوں کے تعارف کو ساتھ ساتھ انداز میں مرتب کیا ہے۔ جو اس سے قبل شاید کہیں دیکھنے میں آیا ہو۔ اس کتاب کا ایک گوشہ داستانوں سے افسانے تک کے عبوری دور سے متعلق ہے۔ جس سے خواجہ ناصر نذیر، فراق، حسرت لکھنوی اور میر باقر علی داستان گو کے افسانوی ادب سے متعلق اولین کام کی واضح نشاندہی ہوتی ہے۔ یوں بڑی تقطیع کے آٹھ سو صفحات پر مشتمل طویل تنقیدی مقالے اور تین سو صفحات کے قریب تحقیقی مواد، افسانوں میں بہ تدریج بدلنے والی زبان کے جائزے، نادر و نایاب تصاویر اور فوٹوگراف کی شمولیت نے اس کام کو ایک مستقل حوالہ جاتی دستاویز کا درجہ دلا دیا ہے۔ راشد الخیری سے مرزا حامد بیگ تک کل ۲۷۰ افسانہ نگاروں کا خصوصی مطالعہ اسکے ایک سے زائد افسانوں کی پیش کش کے ساتھ کیا گیا ہے۔ باقی افسانہ نگاروں کا جائزہ، پس منظر، رواں پس منظر اور پیش منظر کے تحت لیا گیا ہے۔ ★ ضخامت گیارہ سو آٹھ صفحات (آکھہ ٹرکیات) ★ قیمت پانچ سو روپئے مضبوط جلد، سفید کاغذ ★ مطبوعہ دسمبر ۱۹۹۱ ★ ناشر اکادمی ادبیات پاکستان ایچ ۸/۱ اسلام آباد (پاکستان)

نیا سفر (ادبی ساہتی)

ادبی سائل کی روایت میں ایک معیاری رسالے کا اضافہ، مشہور شاعر اور ادیب قمر رئیس (سابق مدیر عصری آگہی) کی ادارت میں سہ ماہی کا اولین شمارہ (جنوری تا مارچ ۱۹۹۳) کے متنوع سہ ماہی کے تحت موجودہ سیاسی صورت حال پر مدیر کا فکر انگیز اداریہ اور مختلف تنقیدی مضامین۔ ۴ افسانے، ایک کھلا خط، خود نوشت، سفر نامہ، ڈرامہ، سلویا پلاتھ کی ۶ نظموں کے تراجم، ۹ نظمیں مشاہیر کے خطوط، ۲۰ غزلیں، ۳ طویل تبصرے اور ۲۴ کتابوں کا مختصر لے تعارف شامل ہے۔ یہ سارا مواد خوش سلیقگی کا مظہر ہے ★ ضخامت دو سو صفحات ★ قیمت فی شمارہ بیس روپئے ★ پتہ سی ۲۶ اوکھلا — دہلی ۱۱۰۰۲۵

اکثر یاد آتے ہیں

مظہر امام کے ۸ مضامین اور خاکوں کا مجموعہ انکے خوش رنگ اسلوب کا خوبصورت اظہار ہے۔ لفظ لفظ میں ملی جلی تحریر، تصویر نگاری کا عمل متوجہ کرتا ہے۔ وہ شخصیتوں کی سائیکی کا عمیق مطالعہ کرتے ہیں اس طرح کہ سادی جزئیات کی عکاسی میں ان کی ہنرمندی کوئی یا تحقیقی روپ بنا دیتی ہے۔ تخلیقی اشاعتی ادارے ادب پبلیکیشنز (نئی دہلی) نے دیدہ زیب طباعت سے کتاب کو اور اہم کر دیا ہے۔ ★ مطبوعہ ۱۹۹۳ ★ ضخامت ۲۱۰ صفحات ★ قیمت ۷۵ روپئے ★ رابطہ ادب پبلیکیشنز، ۳۳۴۴ — اے حضرت نظام الدین ویلی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

گھٹتے بڑھتے سائے

علی امام نقوی کی کہانیوں کا تیسرا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ اس میں ۱۵ نئی کہانیاں شامل ہیں۔ یہ کہانیاں نئے تخلیقی بیانیہ کا خوبصورت استعارہ ہیں۔ یہ کہانیاں زندگی کی پرچھائیاں ہیں۔ خیال و خواب کا عملی اظہار ہیں۔ اس مجموعے کی ہر کہانی مجموعی عصری ذہنی کرب کا حصہ ہے۔ اچھی اور معیاری اردو کہانیوں کے باب میں یہ کتاب شامل رہے گی۔ پسند کی جائے گی۔ روشن کتابت، طباعت مضبوط و دستی سرورق ضخامت ۱۶۰ صفحات ★ قیمت ساٹھ روپئے ★ مطبوعہ ۱۹۹۳ ★ ناشر تخلیق کار پبلشرز ★ ۱۰۴ یکجہتی، لکشمی نگر، نئی دہلی۔

روشن دان میں چڑیا

نسیم سحر (سعودی عرب) کا تیسرا شعری مجموعہ جو تین سو ہائیکو پر مشتمل ہے۔ خوبصورت گٹ اپ اور روشن کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ بقول قادر اعجاز (پاکستان) "نسیم نے ہائیکو بڑھتے ہوئے شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ جاپانی کے ساتھ ساتھ ہائیکو کی ہیئت میں بھی آزادی کا قائل ہے۔ اس نے ہائیکو کی کلاسیکی ہیئت بھی اپنائی ہے اور بہت سی مروجہ اردو بحروں میں بھی ہائیکو کہے ہیں۔ اس عمل میں وہ ہائیکو کی صنف کو کہیں ثلاثی کی حدود میں لے گیا ہے اور کہیں مثلث کی تکون میں سامنے کا واقعہ اور مختصر نظم کی مہک بھی اسی کے ہائیکو کا حصہ بنی ہے۔" نسیم کی انہیں خصوصیت کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے ہائیکو کا مجموعہ اس صنف میں اب تک سامنے آنے والے مجموعوں سے کئی اعتبار سے نہ صرف مختلف ہوگا بلکہ مستقبل کے ہائیکو نگاروں کے لئے بہت سے امکانی راستوں کی طرف اشارہ بھی — مطبوعہ ۱۹۹۱ ★ ضخامت ۲۰۰ صفحات ★ قیمت ساٹھ روپئے ★ رابطہ پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز ۵۰ ۲ الو ٹرمال، لاہور۔

عصری ہندوستانی کہانیاں (دو جلدوں میں)

ساہتیہ اکادمی ادبی تراجم کے طور پر ہندوستان کی تمام بڑی زبانوں کا ادب شائع کرتی رہتی ہے۔ عصری ہندوستانی کہانیاں اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ دونوں جلدوں میں شامل کہانیاں انگریزی میں ترجمہ شدہ اردو میں منتقل کی گئی ہیں اور یہ کام ۹ دسمبر ۱۹۷۹ سے ۱۵ دسمبر ۱۹۷۹ تک ایک منعقدہ کہانی ورکشاپ میں کیا گیا۔ پہلی جلد میں ۱۵ کہانیاں شامل ہیں۔ اس میں اردو کے لئے عصمت چغتائی کی کہانی "تھی کی جانی" شامل ہے۔ دوسری جلد میں ۲۴ کہانیاں شامل ہیں۔ اس میں ایک اردو کہانی لاجونتی (راجندر سنگھ بیدی) شامل کی گئی ہے۔ بنگالی، انگریزی، گجراتی، ہندی، ملیالم اور پنجابی زبان کی ایک سے زائد کہانیاں ترجمہ کی گئی ہیں۔ عصری ہندوستانی کہانیاں، معیاری تخلیقی کہانیوں کے شائقین کے لئے ایک خوبصورت تحفہ ہے۔ جلد اول — ضخامت ۱۵۲ صفحات ★ قیمت ۵۰ روپئے ★ جلد دوم — ضخامت ۲۲۰ صفحات ★ قیمت سو روپئے ★ مطبوعہ ۱۹۹۲ ★ ناشر ساہتیہ اکادمی رابندر بھون ۳۵ فیروز شاہ روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

★علی جواد زیدی — ...ماہنامہ شعر و حکمت ... شمارہ ملا۔ آپ نے نئی خوشی کر دیا۔ اردو کی نئی بستیوں کے شاعروں اور ان کے کلام سے متعارف کروایا اور ہماری ادبی کاوشوں کی پھیلتی ہوئی دنیا کے بارے میں ہمیں یہ احساس دلایا کہ مملکتِ شعر و زباں اور بھی ہیں۔ یہ سلسلہ اچھا ہے اور آپ کی کاوش اور حسنِ ترتیب و انتخاب کا کامیاب نمونہ۔

★عبدالقوی ضیا — 961, AUGAR AVE SUDBURY ONTARIO P3A 4A7 CANADA

جن شعرائے کرام کا کلام آپ نے اردو کی بستیوں میں شامل کیا ہے وہ سب کے سب ترقی اور دوستوں میں سے ہیں۔ بشیر بدر کی شاعری پر ندا فاضلی کا مضمون بے حد پسند آیا۔ کیا انوکھا طرز اور رالا مزاج ہے۔ باتوں باتوں میں وہ بڑی بڑی باتیں کر گئے ہیں۔ راں سینڈ میں ان کا میرا ساتھ رہا تھا۔ اس کے علاوہ جب شمالی امریکہ تشریف لانے تھے تو کئی مشاعروں میں ملاقاتیں رہی تھیں۔ مجموعی طور پر سال گزشتہ کا یہ شمارہ مجھے بے حد پسند آیا۔

★توصیف احمد — ۵۰ بمبئی محل شاہجہاں آباد بھوپال

ندا فاضلی نے اپنے مضمون بشیر بدر نئی غزل کا ایک نام میں خلافِ توقع بشیر بدر کی غزل اور بشیر بدر کی شہرت کا یوں اعتراف کیا ہے۔

۱— بشیر بدر کافی مشہور شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کو پسند کرنے والوں کی تعداد دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔

۲— انہوں نے (بشیر بدر) اپنے آپ کو ترانا خرافاتی نہیں بلکہ اپنی غزل کی زبان موضوع اور اندازِ بیان کو بھی نئے تجربوں سے آراستہ کیا ہے۔

۳— اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

زندگی تری ... فکر میں کتنے چراغوں کو ہی ... بنا لیتی ہیں

محل جیسی طرحوں کے سوچتے نہ تھا ... ہوئے ... ہیں

ان دونوں شعروں میں جذبے اور احساس کی گھلاوٹ ملتی ہے۔ وہ انہیں دوسرے شاعروں سے نہ صرف الگ کرتی ہے بلکہ انہیں غزل کی عام لفظیات سے شعوری گریز اور اردگرد کے ماحول سے ان کی ذہنی قربت نئی تبدیلیوں کا اظہار بھی ہے جو بعد میں زیادہ مستقل اور جز رسانی کے ساتھ ان کی غزل کی شناخت بن جاتی ہے۔

۴— انہوں نے (بشیر بدر) انھیں روشن احساسات سے آہستہ آہستہ اپنی غزل کو کلاسیکی دھند لکوں سے آزاد کیا ہے۔ اس غزل میں اس روشنی لفظیات سے نئے تجربے پیدا ہوتے ہیں۔

۵— ان (بشیر بدر) کے کئی شعروں نے اردو غزل کے دامن میں نئے ستارے ٹانکے ہیں۔ ان کے تخلیقی مزاج میں کئی ایسے لفظوں کو بھی غزل کا جامہ دیا ہے۔ جو برسوں سے غزل کے دائرے سے باہر سمجھے جاتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ندا فاضلی کے ان بیانات کی روشنی میں بشیر بدر واقعی غزل کے بڑے شاعر ہیں لیکن جب اس مضمون کو تنقیدی معیار پر دیکھا جائے گا اور ان کی طرزِ نگارش کو تنقیدی سنجیدگی سے دیکھا جائے گا تو ان میں بہت سی غلطیاں ملیں گی۔ جن سے اس مضمون کو سنجیدہ اور منصفانہ تنقید نہیں کہا جا سکتا۔

مثلاً ندا فاضلی نے لکھا ہے ''اجالی'' میں یہ شعر بھی ہیں۔

یہاں دوسرا کوئی بستر نہیں
تو کیا ہیں تمہیں کوئی کھا جائے گا
''انگلیاں ڈوٹتی ہیں اندر وں پر
گھوڑے اسکوٹروں سے گرتے ہوئے

''اجالے'' کا صرف ایک ایڈیشن چھپا ہے۔ اور اس میں یہ دونوں شعر کہیں موجود نہیں ہیں۔ ایک دوسری جگہ ندا فاضلی لکھتے ہیں۔ ایک رسالے ''الفاظ'' کے سرورق پر موجودہ عہد قدری اور ادب کی دوری پر شاعروں اور ادیبوں کے خیالات چھاپے تھے۔ اس بحث میں بشیر بدر نے اپنے خیالات کو یوں زبان دی تھی۔ بشیر بدر کے بیان کو یہاں اس لئے درج نہیں کر رہا ہوں کہ اس رسالے میں ایسی کوئی بحث نہیں تھی اور بشیر بدر کا وہ بیان الفاظ میں کبھی نہیں چھپا۔ ایک اور جگہ ندا فاضلی لکھتے ہیں کہ بشیر بدر نے اپنی کتاب ''آزادی کے بعد اردو غزل'' میں بشیر بدر کو تقریباً ساٹھ سات سو سالہ ادبی تاریخ کی ناک کا تاج بنا دیا — یہ بات بھی بالکل غلط ہے اس میں ساٹھ سات سو تو کیا سو سال کی بھی غزل کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ تنقیدی مطالعہ صرف آزادی کے بعد کی غزل سے لیکر ۱۹۷۰ء تک کی غزل کا احاطہ کرتا ہے۔ ان تینوں مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ندا فاضلی حد درجہ غیر ذمہ دار نقاد ہیں۔ دراصل ان کے مزاج میں تنقید کی سنجیدگی اور سچائی دور دور تک نہیں ہے۔ وہ من گھڑت تعریفیں کرتے ہیں۔ جس کی بہترین مثال انکی کتاب ''ملاقاتیں'' ہے۔ حسن نعیم کی وفات پر ان کا تعزیتی مضمون سچائی نہیں بلکہ مزاج کی سفاکی کا نمونہ ہے۔ ندا فاضلی انسانی رشتوں کی صداقتوں، نزاکتوں، اور لطافتوں سے محروم ہیں۔ ابتدائی زندگی میں وہ خاندانی و تہذیبی تربیتوں سے محروم رہے ہیں وہ عورت اور مرد کے ایک ہی رشتے کو جانتے ہیں۔ وہ نہ باپ ہیں نہ بیٹے، عاشق ہیں نہ شوہر، نہ بھائی، نہ دوست۔ ایسی ظاہری زندگی جینے والا صرف داغ دہلوی کے بعض کمزور شعروں کے علاوہ سانس لیتی زندگی کا احترام نہیں کر سکتا۔ بشیر بدر نے جو وجود سے لبریز، محبتوں سے مہکتی ہوئی زندگی جی ہے۔ ان کا ماضی اور دہ کی شرافت، روایت، ان کا عصری تجربہ۔ علی گڑھ، میرٹھ، بستی کی مہذب خوشبو سے لے کر نیویارک اور ٹورنٹو کی ڈالر پر ناچتی ہوئی زندگی ہے۔ بشیر بدر کے نمائندہ شعروں کا تجزیہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک بڑے کردار نگار غزل گو ہیں۔ اردو کی پوری غزلیہ شاعری میں بشیر بدر سے زیادہ متحرک، تہہ دار اور معنی خیز امیجری اس لئے کہیں نہیں ملتی کہ بشیر بدر اکیسویں صدی کے دروازے پر کھڑے ہیں اور عصر اور زندگی جی رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ناولوں، افسانوں، مثنویوں کا نقطۂ عروج غزل کے تمام تر تہذیبی نظم و ضبط، نغمگی اور شائستگی کے ساتھ غزل کے ایک شعر کی کہانی بن جاتا ہے۔

★اسلم حنیف — گنور، ضلع بدایوں (یوپی)

شاعر کا شمارہ نمبر ۱۱ بروقت موصول ہوا ہے۔ وہی نیا انداز، وہی کہکشاں اور شوخی والی انفرادیت (جو اس کا طرۂ امتیاز رہا ہے) اپنی مکمل آب و تاب کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔ ''اردو کی نئی بستیاں'' کے ساتھ اردو کی نئی بستیوں کی تلاش کے تحت آپ جو کر رہے ہیں۔ یہاں متذکرہ شماروں کے مشہور شعراء کے منتخب کلام کے بارے میں مکمل طور پر کچھ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ساقی فاروقی کی خوبصورت غزلیں متاثر کرتی ہیں۔ تیسری غزل کے آخری دو شعر میری نظر میں خارج از بحر ہیں۔

''ایک کیلے بگھ زار میں گرد و باد کا رقص''

مصرع میر کے انداز پر کہہ دیا گیا ہے مگر بحرِ متقارب میں اس طرح کے اوزان کو برتنے کا جواز عروض سے فراہم نہیں ہوتا۔ میر کی غلطی ہمارے لئے دلیل نہیں بنتی۔ ریگ زار اس بحر میں باندھا نہیں جا سکتا۔ اسی غزل کا مصرع یہ بھی ہے۔

''ساقی تمہیں بخل کرنی نہیں متکبر ایسا تھا''

فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فع ارکان اس بحر میں بالالتزام لرزش پیدا نہ بھی کریں تب بھی شعر ناموزوں ہی رہیں گے۔ عابد اقبال نقوی کا شعر ہے۔

''اس نے عابد مجھ کو دیکھا ہے کچھ اس انداز سے
جیسے کہتے ہوں کہ تم سے عشق فرماتے ہیں ہم''

شتر گربہ کا نقص پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے بچنا انہوں نے کامل تھا۔ یا دوسرے مصرع کو کسی اور انداز سے کہا جاتا۔ عرفانہ عزیز کا مصرع ''تلاش کرو کوئی دل زیب نیا عنوان'' سہو کاتب کی نذر ہو گیا ہے یا غلطی۔ ''سا'' کو نیا باندھا گیا ہے اور عجب کیا۔ حمیرا رحمان نے لفظ ''یہ'' کا صحیح استعمال نہیں کیا۔ ا— ل— بیچارہ زنی تنہا تھی ... کر دینا چاہئے۔ اکبر حیدرآبادی نے ''میں'' کے مقام پر ''پہ'' کو غلط برتا ہے۔ ''طاق نسیاں پہ'' پڑھا ہوا ہے میں نے ''احمد سہیل کی پہلی غزل میں قافیہ سایہ۔ ''چہرہ وغیرہ میں صرف پانچویں شعر میں ''تھوڑا'' کو قافیہ بنا کر شاعر نے غلطی کی ہے۔ الف والے قوافی میں ہائے ہوز پر ختم ہونے والے الفاظ کو الف سے بدل کر قافیہ بنا لیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں معاملہ الٹا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی غزل کا شعر

جسم کے آئینے میں شعلہ سا دکھتا ہے سوال
پاؤں کی زنجیر کو حلقہ ستے غور ہے

مبہم ہو کر رہ گیا ہے۔ سیدہ محمود کی غزل کے مطلع میں ایطا کا عیب ہے اور سنانے حرفِ روی کو ختم کر دیا جائے تو سن اور اٹھا ہے جو ہم قافیہ نہیں اور ان میں کوئی لفظ بے معنی بھی نہیں۔ اسی غزل کے تیسرے شعر کے پہلے مصرع میں فنی خامی پیدا ہوئی ہے ''اس قدر بے حجاب ہے مجھ سے وہ نشیں'' حجاب کی ب کو ہے کی ی میں ضم کر دیا ہے جو کسی طرح درست نہیں۔ سرور عالم راز نے بھی مطلع میں سلسلہ اور فیصلہ قافیہ رکھ کر ماجرا اور کیا وغیرہ کے قافیے استعمال کرکے فنی ناپختگی کا ثبوت دیا ہے۔ جمیل احسن کے مطلع میں بھی ایطا کا عیب موجود ہے۔ خوشنود مکاری کا شعر — بجلیوں سے جا تقربات بھی تھی
آپ کیوں اپنا آشیاں چلتے

جلا کی جگہ جلتا کامل تھا۔ شعر بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔

نسیم سحری کی غزل کا مطلع "کس کا وجود منصور سے سامنے ہے" "منصور" کی خوبصورت نہیں ہے۔ پھر وجود منصور کی ترکیب محل نظر ہے۔ کاوش عباسی کی غزل کے کئی شعروں میں شکست ناروا ہوگیا ہے۔ مذکورہ شعروں میں مصرع کے پہلے حصے کے الفاظ کٹ کر دوسرے حصے میں نہیں جانے چاہئیں کیوں کہ اس سے آہنگ بندی طرح مجروح ہوتا ہے۔ اسی غزل میں شاعر نے لفظ "یادگرد" استعمال کیا ہے۔ یہ لفظ گرد و پیش کے معنی میں مستعمل ہے مگر میں آج تک اس کے معنی نہیں سمجھ سکا۔ شمارہ نمبر ۲ میں نئی بستیوں کے کئی شعرا کے یہاں بھی نئی مسائل موجود ہیں لیکن اس شمارے میں بشیر بدر کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ بدر صاحب کے کلام پر نظر ثانی ضروری ہے۔ ندا فاضلی نے بشیر بدر پر جامع مضمون لکھا ہے۔ الحمد کہ بدر کی شاعری کو موضوع بحث نہیں بنایا۔ جب کہ شاعری ہر طرح سے توجہ کی مستحق تھی۔ ہو سکتا ہے کہ مضمون کسی حد تک قلت میں لکھا گیا ہو۔ بشیر بدر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکے ہیں۔ شاعر عمر کے ساتھ پختگی کی طرف بڑھتا ہے۔ مگر بدر صاحب کے یہاں معاملہ برعکس ہے۔ شاعری آگے کے بجائے پیچھے کی طرف جاتی لگتی ہے۔ اگر یہ بات ضروری ہے:

کیا واسطہ غزل کو بدر اسے عروض سے
اور مجھے غزل کہ زبان میں یہی ہوں

بدر اسے عروض کی اصطلاح کچھ زیادہ ہی ہو رہی ہے۔ شاید انھیں ستے عروض کی کوئی سستی کتاب ضرور حاصل ہو گئی ہے جیسے مصنف بشیر بدر کو اپنے دور کے شاعر مانتے ہیں۔ بشیر بدر عروض کو نہیں مانتے۔ بہت اچھی بات ہے۔ منور بدر اصرار کرتے ہیں۔ یہ بھی بری بات نہیں۔ لیکن کیا وہ اس پر عمل پیرا ہیں؟—اگر منور ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے تو شاعر میں شامل بدر غزلوں میں وہ اپنے بہتر شعر نکال کر دکھائیں۔ جو بہتر شاعری کے ذیل میں رکھے جا سکیں۔ بشیر بدر کے اچھے کلام سے مجھے انکار نہیں ہے لیکن ان کے یہاں تجربات اور فکر کی کمی ہے۔ ... وہ اپنی شاعری میں اس نے تکمیل کے بل پر اچھے شعر کہہ ہی لیتے ہیں۔ لیکن جب وہ کسی تجربے کو شعری قالب عطا کرنے میں ناکام ہوتے ہیں تو مسلسل ہو جاتا ہے۔ بالکلیہ ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور سنجیدگی اور شگفتگی کی جگہ پھر رنگ غالب آجاتا ہے۔ فکری شاعری کے عناصر ان کے یہاں ہیں۔ بہر حال بشیر بدر کو چاہیے کہ وہ خود پر قابو رکھ کر شاعری کریں اور اپنے اندر سے اس احساس کمتری کو نکال پھینکیں جو انھیں غزل کی ناپختگی کے احساس سے برتری کی صورت میں ملا ہے۔

★ظفر ہاشمی — ۶۵ بل، عمدہ ڈپیر — ساکرہ شیدپور

شاعر کے تازہ شمارہ میں "فکر امروز" "نور" "قند لفظ لفظ" نے ایک بار پھر بھرپور طور پر اپنی شناخت پیش کی ہے۔ سلام مچھلی شہری کا خط تمام اس دور سے ادب دوست طبقہ ہے جو ادب میں صاحب طرزی کی بہترین مثالیں پیش کرتے ہیں اور آپ کا بڑا کام یہ ہے کہ ایسے نایاب احتجاج سے ہمیں روشناس کراتے ہیں۔ "اردو کی نئی بستیاں" سے تعارف بھی آپ کا اہم تاریخی کارنامہ ہے۔ ان میں بہت کم تخلیقات ایسی ہیں جنھیں زبان و بیان کی خامیاں مرتکز ہوں۔ اسی طرح شمارہ نمبر ۲ میں بشیر بدر پر ندا فاضلی کا مضمون بھی بے مثال ہے۔ مبارکباد۔

★یعقوب کاشی — ناروانی
60 - RUSHOLME RD. TORONTO ONT. M6J 3H5 CANADA

جوگیندر پال کا افسانہ "خانہ خش" بہت پسند آیا۔ جدید اردو افسانے کے مستقبل کے حوالے سے شوکت حیات کا مضمون ہم جیسے نئے لکھنے والوں کے لئے ایک معلوماتی اور فکر انگیز تحریر ہے۔ ندا فاضلی نے بشیر بدر کی تعریف اس خوبصورتی سے کی ہے کہ معلوم نہیں ہوتا تنقید کر رہے ہیں یا تعریف؟ لگتا ہے ندا صاحب کو بھی بشیر بدر سے کافی شکایات ہیں جن کا اظہار وہ احمد فراز کی طرح کھل کر نہیں کر سکے۔ مکتوبات میں شکیلہ رفیق نے اظہار خیال کرتے ہوئے اکثر کہانیوں سے بیزاری کا اظہار کیا ہے کہ جن کہانیوں میں ابلاغ نہیں ہوتا وہ دو چار سطریں پڑھنے کے بعد چھوڑ دیتی ہیں۔ شکیلہ رفیق جیسی افسانہ نگار سے اتنے سخت الفاظ کی توقع نہیں تھی۔ ٹھیک ہے وہ خود بہت اچھا لکھتی ہیں۔ لیکن کیا یہ ان کا فرض نہیں بنتا کہ وہ اس ادبی سفر میں راستہ بھٹک جانے والوں کی رہنمائی کریں اور کہانیوں کی دو چار سطریں پڑھ کر چھوڑ دینے کی بجائے اس کہانی کی کمزوریوں کی نشاندہی کریں تاکہ آئندہ کہانی لکھتے ہوئے ابلاغ سے محروم قلم کار ان کی نشاندہیوں کو مشعل راہ بنا سکیں۔

★سلیم جعفری
BOX 1695 ...

یوں تو آپ کے موقر جریدے میں کم و بیش تمام تحریریں دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ مگر مکتوبات کا حصہ خصوصی دلچسپی کے ساتھ کہ اس میں اظہار خیال میں بہت دلچسپ اور معلوماتی خطوط شامل ہوتے ہیں۔ حمایت و مخالفت میں غلو آمیز مبالغہ کے باوجود۔ اکثر لوگ پہلے رائے قائم کرتے ہیں پھر اپنے وکیل کی مانند اپنی رائے کے حق میں دلائل تراشتے ہیں تاہم اس پورے عمل میں تعصب کے ساتھ ساتھ ذہانت بھی عیاں ہوتی ہے۔ اور یہی میری دلچسپی کا باعث ہے۔ اس سال ہم نے مرحوم کیف بھوپالی کی "آہنگ کیف" اور منظوم ترجمہ قرآن کریم کا بعنوان "مفہوم القرآن" شائع کئے ہیں۔ ایسے مرحوم ہندوستانی شعرا کے جن کے لواحقین ان کا کلام شائع کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں، ان کا نام و لواحقین کا پتہ مرحمت فرمائیں تو احسان مند رہوں گا۔ کیا کوئی اشاعتی ادارہ کلیات قابل اجمیری شائع کرنا چاہے گا۔ غیر مشروط اگر ایسا ممکن ہو جائے تو مجھے خوشی ہوگی۔ بیرون ہند و پاک کے قلمکاروں کی ستائش ایک نہایت ہی مستحسن فیصلہ تھا آپ کا۔ یہ حکمت عملی فروغ اردو کی تحریک کو مزید تقویت بخشے گی۔

★سلیم انصاری — ٹیکو ڈروم پوسٹ ہیڈ کمپنٹ ڈسکٹ عباسی۔

شاعر کا تازہ شمارہ ۱۰-۲ پیش نظر ہے۔ جو اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ آپ نے برصغیر سے باہر کے تخلیق کاروں کی قابل ذکر تعداد کو شمارے میں شامل کر دی ہے۔ اس سے اردو اور شاعر دونوں کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ان تخلیق کاروں کے یہاں جنم لینے والی نئی نسل اردو سے نابلد ہے۔ وہ تہذیب و تمدن نہ صرف ناآشنا ہے بلکہ انگریزی تہذیب و تمدن سے متاثر ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ ہماری نسل دنیا کے کسی حصے میں ہو وہاں جاکر ہماری تہذیب اور کلچر سے ناآشنا نہ ہو جائے۔ کہانیوں میں جوگیندر پال کی "خانہ خش" ہجرت وطن کے المیے کا موثر ترین منفرد اظہار ہے۔ عابد اللہ قادری کی نظم "مہاجر" ذہنی ہجرت کے کرب کا اظہار ہے۔ جو ترک وطن کرنے والے فنکاروں کا فطری رد عمل ہے۔ ستیہ پال آنند، خالد سہیل، جمشید مسرور اور رضا نقوی کی نظمیں متاثر کرتی ہیں۔ ساقی فاروقی، حمیرا رحمان، اکبر حیدرآبادی، شمال احسن، حنیف ترین، بخش لائلپوری اور طارق قادری کی غزلیں بطور خاص پسند آئیں۔

★محسن عثمانی — اسلامی ۱۲۲۳ اسلام آباد

شاعری کی تو اتنی سمجھ نہیں ہے۔ افسانے اچھے لگے۔ "خانہ خش" "ناگورد" "بہرام کا گھر" "گھولے" "ہمسی" نے اپنی اپنی حیثیت میں متاثر کیا۔ مواد کے اعتبار سے بھی "شاعر" نے متاثر کیا۔ خطوط سے اندازہ ہوا کہ اس رسالے میں تنقید سہنے اور تنقید کرنے کا قرینہ مزاج کا حصہ ہے۔

★محمد سلیمان — انڈو قطر اردو مرکز دوحہ پوسٹ بکس نمبر ۸۴۸۸، دوحہ، قطر

شاعر کا نیا شمارہ "اردو کی نئی بستیاں" آپ کا ایک انتہائی مستحسن قدم ہے۔ انڈو قطر اردو مرکز کے مقاصد اور عزائم میں اولین مقصد یہی ہے کہ برصغیر کے باہر رہنے والے محبان اردو اپنے اپنے علاقوں میں اردو زبان و ثقافت کی ترویج و ترقی کے لئے سرگرمی کو ششیں کر کے اردو کی عالمی حیثیت اور اہمیت کو اجاگر کرتے رہیں۔ آپ کے اس قدم سے جہاں ہم لوگوں کو مسرت ہوئی اور ہمت ملے گی وہیں ہندوستان میں خاص طور پر سنجیدگی کے ساتھ اردو کی بے لوث اور پر خلوص خدمت انجام دینے والی شخصیتوں اور اداروں کے لئے بھی یہ بات حوصلہ افزا ہوگی کہ جس کام میں وہ اندرون ملک مصروف ہیں اسی کام میں ان کی ہمنوائی اور حوصلہ افزائی کے لئے بیرون ہند بھی کام ہو رہا ہے۔

★اختر حسن ساجد — محلہ سوداگران، گورکھپور (یوپی)

شاعر کا تازہ مشترکہ شمارہ "اردو کی نئی بستیاں" بے حد پسند آیا۔ ایسا لگتا ہے کہ شاعر واقعتاً ایک عالمی ادبی جریدہ ہے کیونکہ اس میں ایک عالمی ادبی جریدہ ہونے کی پوری صلاحیت ہے جو — جیسا کل تھا ہو بہو آج بھی ہے۔ آپ نے دنیا کے مختلف ممالک میں رہنے والے ہم خیال ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع کر کے شاعر کے قارئین کی دلچسپی کو دوبالا کر دیا ہے۔ میں بیرون ملک ان تمام اردو نواز شخصیتوں کا احترام کرتا ہوں جو دیار غیر میں اپنی زبان کی ترویج و اشاعت اور فروغ کے لئے کوشاں ہیں اور اردو زبان کو عالمی زبان بننے کا حق دار بنا دیا ہے۔

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

شاعر

اشاعت کا ۶۴واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد ــــ ۶۴
شمارہ ــــ ۵

فون: ۳۵۹۹۰۴

مدیر

افتخار امام صدیقی

●

معاون

ناظر نعمان صدیقی

قیمت	۸ روپے

*

زرِ سالانہ	لائبریریوں سے
۶۰ روپے	۷۵ روپے

تاعمر خریداری	معاونین سے
۱۰۰۰ روپے	۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر ـ ۱۵ پونڈ

ماہنامہ شاعر مکتبہ قصر الادب بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۸

فکرِ امروز



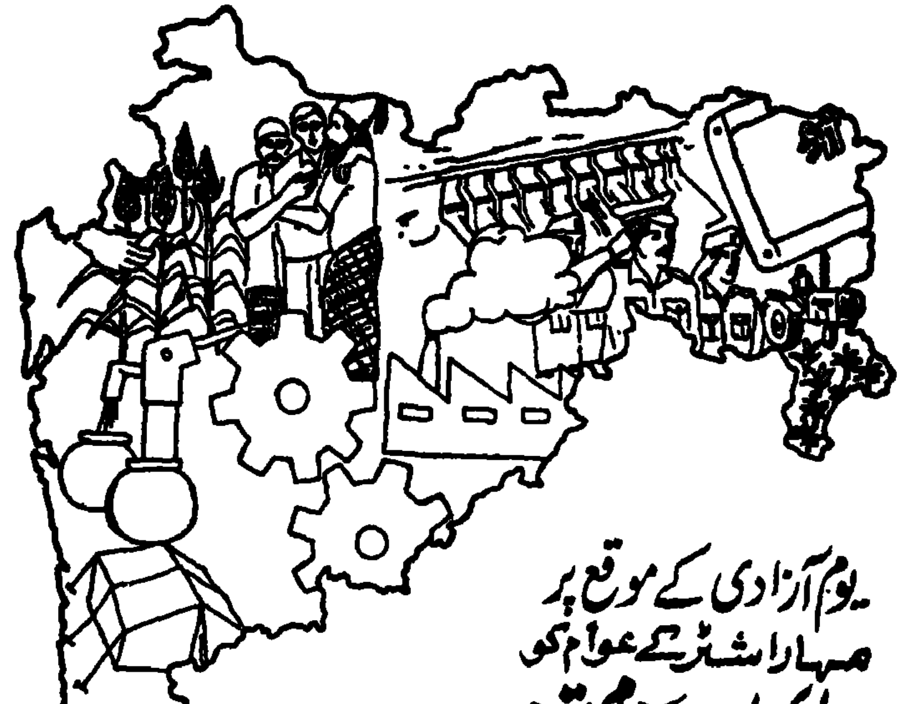
غرور و ناز کی ضرورت نہیں۔ خودنمائی و خود درائی کا موقع نہیں۔ کام کا وقت ہے، کام کیجیے، نام خود چمک جائے گا۔ اگر آپ کے قلم میں قوت، طبیعت میں جودت، خیال میں وسعت، اور کلام میں جاذبیت ہے تو دنیا آپ کا لوہا خود مان لے گی اور زمانہ آپ کی اہلیت کا خود اعتراف کرے گا۔

آج دنیا کی ہر قوم اور ہر جماعت تنازع البقا میں سرگرم ہے۔ آپ کو بھی ایسی ہی کوشش کرنی چاہیے کہ آپ کا کلام اور آپ کا نام باقی رہے اور جس طرح آج آپ متقدمین و متاخرین کو یاد کر کے ان کے کارناموں کا احترام کر رہے ہیں اسی طرح آئندہ نسلیں آپ کے نام اور کام کی عزت کریں اور آپ کو بقائے جاوداں حاصل ہو جائے۔

مشاعروں کی داد و تحسین کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس رسمی مطالبۂ نفس کی پرواہ نہ کیجیے۔ قدرتِ کلام یہ ہے کہ جب شعر کاغذ پہ آئے تو پڑھنے والا چند منٹ تک اپنی نگاہ اس سے نہ ہٹا سکے، اس کی نگاہوں میں اس کا دل سمٹ کر آ جائے۔ اور جو کچھ آپ نے کہا ہے وہ نگاہوں کے راستے دل میں اتر جائے۔

[۵ / اپریل ۱۹۳۰ء]

سیماب اکبرآبادی



یوم آزادی کے موقع پر
مہاراشٹر کے عوام کو
مبارکباد اور پیغام تہنیت

گزشتہ چند مہینوں کے دوران پیدا ہونے والی بحرانی کیفیت کا پورے عزم اور حوصلہ سے مقابلہ کرنے کے بعد ایک فعال، ترقی پسند اور جفاکش ریاست کی حیثیت سے مہاراشٹر کی شہرت میں اضافہ ہوا۔
اس کی باحوصلہ پیش قدمی کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

- فرقہ وارانہ فسادات، بم دھماکوں کی دہشت گرد تخریبی طاقتوں کے خلاف سخت اقدامات اور معمولات کی جلد بحالی۔
- فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ کے لئے شعوری جدوجہد۔
- پولیس فورس کو جدید تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنا۔
- آزاد معیشت کے لئے صنعتی پالیسی میں مناسب تبدیلی تاکہ کاغذی کارروائی کی مشکلات کم سے کم کی جائیں اور اقتصادی وسائل کا فروغ ہو۔
- قابل کاشت لاکھوں ہیکٹر فاضل زمین کو استعمال میں لانے کی بڑے پیمانے پر مہم۔ زرعی پیداوار کی کھپت کے لئے نئے میدانوں کی تلاش۔
- آبپاشی کے جدید طریقے اپنانے کے منظم منصوبے،
گزشتہ کارروائی کے تحت آبپاشی کے منصوبوں کی جلد تکمیل۔
- بجلی پیدا کرنے، سڑکوں کے ذریعہ مواصلاتی نظام اور بندرگاہوں کے بنیادی فروغ میں پرائیویٹ سیکٹر کی شمولیت۔
- سیاحت کے فروغ کے لئے سرکاری پالیسی میں ترمیم اور سیاحت کے نئے میدانوں کی تلاش،
سیاحت میں روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنا۔
- تعلیم کو عام کرنے کی سمت میں ۵ نئے کالجوں، ۵۰۰ ثانوی اسکولوں اور ۱۰۰ پرائمری اسکولوں کی ۱۹۹۳-۹۲ سال کے دوران منظوری۔
- کھیل کود کے جدید تقاضوں کے پیش نظر اسپورٹس کامپلکس اسکیموں کی تخلیق۔

آیئے ہم سب مل کر ترقی اور خوشحالی کے لئے جدوجہد کریں

ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز، حکومت مہاراشٹر

③ اداریہ

نہ جاگتا ہے — نہ خواب میں ہے

میں جب بھی اردو زبان و ادب کے عصری مسائل پر غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ فروعی مسائل بے شمار ہیں اور ہم ان میں بے طرح الجھے ہوئے خوش فہمیوں کا شکار ہیں۔

کوئی بھی فروعی مسئلہ انفرادی یا اجتماعی سطح پر حل طلب ہو سکتا ہے یا اہم ہو سکتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر غیر اہم بھی ہو سکتا ہے۔ اور ہم ایسے ہی بہت معمولی معمولی مسائل کو کہیں انہی تانے جوڑ دیتے ہیں، تو کہیں اپنے "ذاتی" معاشی مسائل سے ملا دیتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ آزادی کے بعد سے تا حال اردو زبان، سیاسی سطح پر اور خود اردو والوں کے ہاتھوں زوال آمادہ ہی رہی ہے۔ تمام اردو والے اپنے بنیادی اور مصنوعی مسائل سے بخوبی واقف ہیں۔ زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو ہر طرف صورت حال مایوس کن ہی ہے۔ کس کس کا ذکر کیا جائے اور کس کس کا رونا رویا جائے۔ کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے۔ جس پر اظہار خیال نہ کیا گیا ہو۔ ۱۹۵۰ تا ۱۹۹۳ کے رسائل و اخبارات اور کتابیں دیکھ لیجئے، تحریروں اور تقریروں کی کوئی کمی نہیں۔ مگر تکرار و اعادہ اور عملی سلسلے کسی شدید تحریک کا حصہ نہیں بن سکے۔ بظاہر جو جس جگہ ہے وہ اردو کے لئے مصروف ہے اور اپنی دانست میں یہ سمجھے ہوئے ہے کہ وہ اردو کی خدمت کر رہا ہے۔ اور یہ زبان صرف اور صرف اسی کی وجہ سے ہندوستان میں زندہ ہے۔ اور اس کا مستقبل روشن ہے۔ مگر بہت نمایاں باتوں کے ذکر کے ساتھ بعض بہت بنیادی مسائل کا اعادہ بھی ناگزیر ہو گیا ہے۔ کیوں کہ پورے ملک کا سیاسی انتشار اور بحران اقلیتوں کے لئے لمحۂ فکریہ تو ہے ہی اردو زبان کے لئے بھی سخت ترین ہے۔ آنے والا وقت کتنا قیامت خیز ہوگا اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ جس طرح سیکولرازم کی بنیادیں کھوکھلی کی جا رہی ہیں اور ملک کے دوسرے سرے تک چھوٹے چھوٹے سیاسی بونے اپنی کرتب بازیوں میں مصروف اپنی کم عقلی کے مظاہرے کر رہے ہیں۔ ان کے نتائج معلوم۔

یہ جو اتنے ڈھیر سارے مضامین نثر و نظم کے ذخیرے ہو رہے ہیں۔ اور بے شمار کتابوں کے انبار لگتے جا رہے ہیں۔ اس سے اردو زبان کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟ ہمارا شعر و ادب سرحدوں سے باہر دنیا کی بڑی بڑی زبانوں تک تو کیا پہنچے گا۔ خود ہمارے ملک کی بڑی زبانوں پر اس کا کوئی اثر نہیں۔ حالانکہ سرکاری سطح پر تراجم کے کام ہو رہے ہیں مگر اردو کے کونسے قلمکار اور کتابیں ترجمہ ہو رہی ہیں، سب جانتے ہیں۔ اردو والوں کے پاس ہر سوال کا جواب ہے اور ہر کام کا جواز ہے۔ کوئی اردو کانفرنس ہو، اردو کا سیمینار ہو، کوئی عوامی جلسہ ہو، شعلہ بیان مقررین، لفظوں سے جملوں سے وہ منظر نامے بناتے ہیں کہ معلوم ہوگا، اردو ہندوستان کی سب سے زیادہ فعال، بڑی سرکاری زبان ہے۔ اور دیگر علاقائی زبانیں اس کے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑی ہیں۔ مگر ہم سب اردو کے نام پر ذہن و فکر کا ایک مسلسل سراب میں گرفتار ہیں اور حقائق سے چشم پوشی کئے ہوئے ہیں۔

پورے ہندوستان میں مہاراشٹرا ایک ایسا صوبہ ہے جہاں اردو دوسرے صوبوں سے قدرے بہتر ہے۔ صرف بمبئی میں میونسپل کارپوریشن کے چار سو اردو میڈیم اسکول ہیں۔ مگر اب صورت حال تیزی سے بدل رہی ہے۔ مہاراشٹر کے وزیر تعلیم اور دیگر سرکردہ ماہرین تعلیم نے بتایا کہ ان اسکولوں میں طلباء کی تعداد کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ بہت سارے اسکولوں کے بند ہو جانے کا خدشہ ہے۔ ہندوستان کے دیگر صوبوں میں اردو اسکولوں کی صورت حال تو اس سے بھی بدتر ہے۔ کہیں اساتذہ نہیں تو کہیں بچے۔ نصابی کتابوں کی عدم دستیابی ایک الگ مسئلہ ہے۔ اور ان نصابی کتابوں کا معیار سب کو معلوم۔

(جاری)

شاعر — جلد ۶۴ — شمارہ نمبر ۵ [۱۹۹۳ء]



میکش اکبرآبادی بنام اعجاز صدیقی

میکش اکبرآبادی میوہ کٹرہ آگرہ
۱۰ اگست ۷۰ء

عزیز بھائی۔ خدا آپ کو صحت عطا کرے۔ آپ کا خط پڑھ کر دل کو تکلیف ہوئی۔ آج ہی آپ کا خط ملا۔ میرے پاس نگار کا ایک سالنامہ بھی نہیں ہے جہاں ہونا چاہئے وہاں بھی کوئی امید نہیں۔ آپ نے بہرحال جواب [illegible] لکھا ہے اسلئے یہ مراسلہ لکھ رہا ہوں [illegible] کرنے کے بعد اپنا کتب خانہ اور دیکھوں گا اور اگر کوئی بھی [illegible] میسر آئی تو [illegible]

میری کتابیں [illegible] ضائع ہو گئیں جہاں رکھوائی تھیں وہاں بھی نہیں ہیں۔ اب آپ کے سوالات کے ترتیب وار جواب عرض کرتا ہوں۔
(۱) شاعری [illegible] [illegible] مگر اسکی تمہید کی عبارت بہت غلط ہے [illegible]
[illegible] شائع کریں تو [illegible] کے بعد۔ (۲) [illegible] اور آگرہ [illegible] میں [illegible]
[illegible] ان کا [illegible]
[illegible] حضرت [illegible] کی اولاد سے تھے [illegible]
[illegible] (۳) مولوی حامد حسن قادری [illegible]
[illegible] آگرہ میں فارسی کے پروفیسر [illegible] (۱) تاریخ ادبیات فارسی۔ انگریزی [illegible]
(۲) انتخاب فارسی [illegible] (۳) ادبیات [illegible] ایک مضمون [illegible] مطبوعہ تاریخ و تنقید ادبیات اردو [illegible]
اسکے علاوہ [illegible] شائع ہوئے ہیں اور [illegible] کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ [illegible] ۵۵ء
کے [illegible] انتقال ہوا۔ [illegible] یاد ہے [illegible] سے کچھ سال پہلے ہوا تھا۔

ایک علمی یادداشت آپ کی خدمت میں اس گزارش کے ساتھ [illegible] ہوں کہ اسے واپس فرما دیجئے گا [illegible]
غالب کا ایک مکتوب [illegible] ہے۔ [illegible] اور غالب کے [illegible] یہ میری والدہ کی
کے دادا [illegible] ان کا [illegible] ایک [illegible] پاکستان [illegible] تو یہ قلمی کتاب [illegible] اس میں
ان کی کچھ غزلیں اور [illegible] کی عبارت [illegible] ممکن ہے یہ کتاب [illegible] مگر یہ غزلیں
[illegible] جو داستان میں [illegible] درج کی گئی ہیں۔

حسب ارشاد [illegible] ایک غیر مطبوعہ غزل حاضر کر رہا ہوں [illegible] کی خدمت میں [illegible] منگوائی تھی
ابھی [illegible] اسکے علاوہ میرے پاس [illegible] امید ہے کہ یہ نمبر بہت کامیاب ہوگا۔

نیاز مند
میکش اکبرآبادی

معتبر ادیب، شاعر اور صوفی میکش اکبرآبادی [محمد علی شاہ - پ: ۳ مارچ ۱۹۰۲ء - آگرہ
م: ۲۵ اپریل ۱۹۹۱ء] کا ایک بہت اہم خط جس کے مندرجات پر کئی تخلیقی امور روشن
ہو سکتے ہیں۔ [الف الف]



دیویندر اسّر
۱۵۳/۳ - بی، جنک پوری، نئی دہلی - ۱۱۰۰۵۸

اردو افسانہ۔ تہذیب، تجربہ اور مستقبل

"فنون" کے ایک حالیہ شمارے میں گلزار کی ایک کہانی شائع ہوئی ہے، عنوان ہے "کس کی کہانی"۔ مختصراً کہانی یوں ہے۔ راوی بیان کرتا ہے کہ اس کا ایک دوست ہے، انل، اس نے ایک کہانی لکھی، میں نے کہانی پڑھ کر ماں کو سنائی۔ ایک غریب موچی کی کہانی تھی۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ارے یہ تو اپنے محلے کے بھیکو موچی کی کہانی ہے۔ اس کی ماں کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ میں نے جب بھیکو کی کہانی اس کے بیٹے "گھسیٹا" کو سنائی تو اس کا گلا رندھ گیا۔ ہمارے دکھ درد آپ ہی لوگ سمجھو گے۔ اب آپ نہیں جاؤ گے ہماری کہانی تو اور کون جانے گا۔ برسوں بعد جب انل سے اس کی ملاقات ہوئی تو انل کہتا ہے۔ نئی کہانی کا سب سے بڑا مسئلہ حقیقت کا بدلتا ہوا تصور ہے۔ حقیقت صرف وہ نہیں جو دکھائی دیتی ہے بلکہ اصل حقیقت وہ ہے جو آنکھ سے نظر نہیں آتی کہانی صرف ایک منطقی رشتے کا نام نہیں بلکہ اس کیفیت کا نام ہے جو کردار کے تحت الشعور میں واقع ہو رہی ہے۔ پچھلے پچاس برسوں میں بڑی تبدیلی آئی ہے اردو افسانے میں۔ ہماری کہانی نے ان پچاس برسوں میں اتنی ترقی کر لی ہے کہ ہم اسے آج دنیا میں"۔ گھسیٹا نے چمکتی ہوئی کھڑیاں آگے کرتے ہوئے کہا "کس کی کہانی کی بات کر رہے ہو بھائی صاحب"!

ایک اور دلچسپ بات جس صفحے پر یہ کہانی ختم ہوتی ہے اس پر کہانی کے نیچے ایک اشتہار چھپا ہے۔ شہزاد منظر کی نئی کتاب "علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ" شائع ہو گئی ہے۔

گلزار کی کہانی میں بھیکو موچی کے کہانی سے غائب ہونے پر کچھ افسوس اور کچھ تشویش کا اظہار ملتا ہے۔ دراصل ہوری کی موت کے بعد ہیرو کی موت کا ایک طویل سلسلہ اردو افسانے میں جاری ہے۔ حقیقت پسندی سے علامت پرستی تک کا سفر، ترقی پسند افسانے سے وجودیت سے ہوتے ہوئے جدیدیت کی منزل تک پہنچنے کا سفر۔ اس طویل سفر میں ہوری کی موت کے بعد اور ہیرو کی موت سے قبل ایک اور موت واقع ہو چکی تھی۔ جس کی میت کے گرد مادھو اور گھیسو شراب کے نشے میں بہک رہے تھے نفس مضمون وہی ہے۔ غربت اور لاچاری لیکن جذبہ احساس اور طرز عمل بدل گیا ہے۔ گئودان کے روایتی دھارمک سنسکار کے بجائے شراب پی کر احساسِ غم سے عاری ہونے کا عمل۔ کیونکہ اطلاع ملی کہ انسان پہلے وجود رکھتا ہے اور بعد میں اس کی فطرت کی تشکیل ہوتی ہے۔ انسان کو اپنے جوہر سے پہلے اپنے وجود کا احساس ہوتا ہے: کوئی خدا نہیں، کوئی ازلی گناہ نہیں، کوئی ورثہ نہیں، کوئی ماحول نہیں، کوئی نسل نہیں، کوئی ذات نہیں، کوئی باپ نہیں، کوئی ماں نہیں، کوئی جبلّت نہیں، میلان یا کامپلیکس نہیں .... اور افسانے میں اینٹی ہیرو کا جنم ہوا، جسے انگلینڈ میں اینگری ینگ مین اور امریکہ میں بیٹ نسل نے پروان چڑھایا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ فرانس میں نئے ناول کے خالق ایلن راب گرییے، نتالی سرد، اور شیل بوتر نے اعلان کر دیا کہ وہ باکردار ناول کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ تو یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ کردار کی نفسیاتی گہرائی جیسی کوئی چیز ہوتی ہے۔

دراصل یہ صورت حال وجودی حقیقت اور حقیقت کی تشکیل یا ازسر نو تشکیل کے فرق کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی تہذیب کے اس زوال کی نشاندہی کرتی ہے جس کا ذکر آسویلڈ اسپنگلر نے THE DECLINE OF THE WEST میں کیا ہے اور جس کا تخلیقی اظہار ٹی ایس ایلیٹ کی "دی ویسٹ لینڈ" میں ہوا ہے اور انجام کار ایک بھیانک مستقبل، انٹی یوٹوپیا جارج آرویل کے ناول ۱۹۸۴ میں۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ اسپنگلر کی کتاب کی پہلی جلد ۱۹۱۸ میں اور دوسری ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی اور ۱۹۲۲ء میں ہی ایلیٹ کی "دی ویسٹ لینڈ" منظر عام پر آئی۔

آخر یہ سب کچھ کیسے ہوا کہ ایک کے بعد ایک موت کا اعلان ہونے لگا۔ نطشے نے خدا کی موت کا اعلان کیا۔ ایلیٹ نے ناول کی ایڈمنڈ ولسن نے شاعری کی، ایلون کیرنن نے ادب کی، لائینل ٹرلنگ نے ادیب کی، ڈینیل بیل نے نظریے کی۔ فرانسس فوکویاما نے تواریخ کی اور ہرنیت نے کہا کہ انسان مرگیا اور ہم اس کی موت کے گواہ ہیں ژاک دریدا اور مشیل فوکو نے THE DEATH OF THE SELF POST MODERNISM AND STRUCTURALISM میں جدیدیت کے خاتمے کا اعلان کر دیا اور بیچارہ قاری تو اس دوران کئی بار مر چکا ہے۔ اتنی ڈھیر ساری لاشوں کا جنہیں کبھی ہم زندہ سگے سمبندیوں کی طرح اپنے سینے سے لگائے افسانے کی تخلیق کرتے ہوئے انبار اپنے کندھوں پر لادے ہم مستقبل میں داخل ہو رہے ہیں۔ مستقبل جس کی جانب کبھی ایلون ٹافلر نے فیوچر شاک میں کہا تھا کہ اس کے صدمے کی تاب نہ لا کر ہم اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھیں گے اور آج میڈیا شاہی کے دور میں ٹافلر صاحب اپنی کتاب 'پاور شفٹ' میں ہمیں پھر آگاہ کرتے ہیں کہ ہم چاروں اطراف سے INFO WAR اور INFO WARRIORS سے گھر گئے ہیں جو تبدیلی اقتدار کے اس دور میں سب سے زیادہ اہم اور طاقتور وسیلے یعنی INFORMATION کو اپنے قبضے میں لے لینا چاہتے ہیں۔

میں ان سب باتوں کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں کہ میری تشویش کا باعث حقیقت پرستی اور علامتی افسانے کے FALSE ENCOUNTER نہیں بلکہ یہ ہے کہ POWER ELITES ہماری زبان، ہماری تہذیب، ہمارے لوک ورثے کو تہس نہس کر کے ہمارے سنگیت ہمارے آرٹ اور کلاسیکی رقص اور اب تھیٹر کو اغوا کر کے پانچ ستارہ ہوٹلوں کی تفریح گاہوں میں لے گئے ہیں اور انہیں ہمارے خلاف ہمارے ادب کے درپے خلاف اور ہمارے جمالیاتی ذوق کے خلاف اطلاعات کے تمام تر ذرائع پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر قابض ہو کر پہلے ہمیں مفلس و لاچار بنایا اور اب ہمیں اپنے ادب اور تہذیب سے محروم کرنے کے درپے ہیں تاکہ وہ یہ کہہ سکیں کہ سمیا سماج کی نہیں اور نہ ہی یہ سنکٹ سنسکرتی کا ہے بلکہ یہ ٹیکنالوجی ماڈرنائزیشن کے عمل کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ اب ادیب زندگی اور انسان کا تصور بدل گیا ہے۔ زندگی کی کوئی معنویت نہیں۔ ہم سب اجنبی ہیں، جلا وطن اور تنہائی کا شکار، دہشت کے مارے ہوئے بے یار و مددگار۔ انسان کا نیا تصور سامنے آ رہا ہے۔ سسی فس کی طرح تشنہ تکمیل مسلسل بے سود محنت کا بارگراں ہی جس کی حیثیت ہے جو اقدار کے خلاء میں بھٹک رہا ہے۔ گم شدہ ذات کی تلاش میں، ازل تا سحر۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انسان کا اصلی چہرہ کونسا ہے؟ وہ فرشتہ سیرت ہے یا شیطان خصلت، ازلی گناہ کا پروردہ یا وہ اپنی فطرت کی تشکیل خود کرتا ہے مشیت ایزدی کا غلام یا جبلت اور مادی معیشت کا قیدی؟ وہ اشرف المخلوقات اور مرکز کائنات ہے یا ایک ادنیٰ حقیر ذرہ محض ایک صفر۔

اور اس طرح آدرش کے فقدان، تہذیبی زوال، تنہائی کے احساس اور زندگی کے بے معنی اور لغو ہونے کے تصورات نے جدید افسانے کو کافی متاثر کیا۔ افسانے میں نئے نئے رجحانات اور فکری رویوں نے پرورش پائی، اظہار کے پیکر اور اسلوب بدلے گئے۔ ڈرامے میں ایبسرڈ تھیٹر اور فکشن میں اینٹی ناول، ورنئی اسٹوری کے تجربات ہوئے۔ فطرت نگاری واقعیت اور حقیقت نگاری، سماجی اور نفسیاتی حقیقت نگاری، اور شعور کی رو، علامت پرستی اور تجریدیت پسندی۔ افسانے نے کتنے روپ بدلے اور بہروپ بہروپ کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ افسانے میں حقیقت کی آگاہی اور تصویر کشی کیسی بھی ہو، کردار کوئی بھی ہو۔ افسانہ نگار کے ذہن میں ہمیشہ یہ جستجو کہ انسان کیا ہے؟، رہے گی۔ کیونکہ جب حقیقت سے علامت کی جانب جائیں گے تو سوال پیدا ہوگا کہ علامت کس شئے کا استعارہ کس کے حوالے سے تجریدیت کس تصور کی؟ اساطیر کس کے؟ سی فس، پرومیتھس یا یولی سس کے یا اروند گھوش کی ساوتری کے، سوپر مین، مرد مومن یا انتی مانو کے یا بھیڑ میں کھوئے ہوئے بے نام، بے چہرہ فرد اعداد اور مجرد کردار کے۔

لیکن افسانہ نگار کے سامنے سوال پھر پیدا ہوتا ہے کہ کیسی بھیڑ، کس کا جمگھٹ۔ آیئے کسی بھیڑ میں شامل ہو کر نظارہ کریں کہ یہ مسئلہ کیا ہے۔ ایک یہ ہجوم ہے جو مہانگروں کی سڑکوں پر بے حس و خاک کے ایک دوسرے سے کٹے ہوئے، کھوئے ہوئے سیلاب کی طرح بہہ رہا ہے اگر آپ ایک اور بھیڑ کی بہتی ہوئی لہروں کی لے کو محسوس کرنا چاہیں تو پشکر کے میلے اور اجمیر شریف کے عرس میں شامل ہوں۔ میں یہاں ان لوگوں کے وہم و وسواس اور توہم پرستی کی بات نہیں کر رہا بلکہ ان کے تہذیبی روحانی اور مشترک اجتماعی تجربے کا ذکر کر رہا ہوں اور اب اس بھیڑ میں شامل ہو کر دیکھئے جسے ہمارے سیاست داں اور ستاکے حکم حصول اقتدار کے لئے جلسے جلوسوں میں مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں

کو قتل کرنے اوران کے گھروں اور مال و اسباب کو نذر آتش کرنے کے لئے جمع کرتے ہیں۔ یہ لوگ بے نام نہیں بے چہرہ نہیں بھیڑ میں کھوئے ہوئے اجنبی نہیں، ان کا نام ہے، چہرہ ہے، پہچان ہے، بستی ہے۔ ان کے رشتے ناطے، سگے سمبندھی ہیں۔ ان میں مقتول بھی ہیں اور قاتل بھی۔ قاتل دور دراز سے آیا ہوا کوئی پراسرار نقاب پوش نہیں۔ اس کے چہرے پر فنکار انگلیوں نے اپنے جسموں سے بہتے ہوئے خون کی روشنائی سے صاف لکھ دیا ہے۔ قاتل ــــ تو پھر افسانے کے کردار الف بے جیم کیوں؟ مدا

آپ کافکا کے کردار۔ کے۔ کا حوالہ دے کر میری بات رد کر سکتے ہیں۔ جس کے لئے سب سے قریب ترین صداقت یہی ہے کہ وہ ایک کال کوٹھری میں بند دیواروں سے سر ٹکراتا ہے۔ جس کے نہ دروازے ہیں نہ کھڑکیاں۔ نہ کوئی راستہ ہے اور نہ کوئی منزل۔ ذات اور خارج کی ہر شئے ہر مظہر کے بیچ خلا ہے۔ جو سفر کو ہی نہیں بلکہ جستجو اور حاصل کو بھی لایعنی بنا دیتا ہے۔ لیکن یہ لیکن بڑا اہم ہے کہ کافکا کی کاسل اور 'ٹرائیل' میں اس دنیا جسے KAFASQUE کے نام سے موسوم کیا گیا ہے میں انسان کو خود آگہی کی اس حقیقت سے روشناس کراتا ہے جس کا انسان صدیوں سے متلاشی ہے۔ اس سچائی سے ہم کنار کراتا ہے مذہب، فلسفہ اور ادب اپنے اپنے وسائل سے، جس کا اظہار کرتے آئے ہیں۔ وہ زمان و مکاں، تاریخ اور معاشرے کی حدبندیوں سے نکل کر انسان کو آزادی اور DIGNITY کی طرف بڑھ لے جاتا ہے۔ جسے بی ایف اسکنز جیسے BEHAVIOURIST ماہرین نفسیات سماجی انجینئرنگ کے ذریعے کنٹرول میں لانا چاہتے ہیں اور کارل راجرس دوسرے HUMANIST ماہرین نفسیات جسے بحال کرنا چاہتے ہیں۔ اس ذہنی عمل سے گزرے بغیر تجربہ تکنیکیں کی نمائشی جدت اور افسانہ کرافٹ کا کھیل اور تخلیق دانشوری کا عیارانہ مشغلہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

خود فراموشی سے خود آگہی تک پہنچنے کی جستجو اور اس کے حصول کے سفر میں افسانہ زمان و مکان، تاریخ اور معاشرے کی حدبندیوں سے نکل کر انسان کی یادوں کی دنیا میں داخل ہوتا ہے جاگتے خواب دیکھتا ہے۔ اساطیر کی از سر نو تشکیل اور تفسیر کرتا ہے خوش آئند مستقبل کے لئے کسی یوٹوپیا یا بھیانک مستقبل سے آگاہ کرنے کے لئے اینٹی یوٹوپیا۔ بلونیو ورلڈ کی تخلیق کرتا ہے یا انسان کے ازلی اور اصلی سفر کی داستان سے۔ آگ کا دریا۔ کی تخلیق کرتا ہے۔

ماضی اور حال میں محض واقعات اور حادثات کا تسلسل قائم کرکے تاریخ جو خلا پیدا کرتی ہے روایت اور تہذیب کا شعور اسے پُر کرتا ہے۔ یہ اتنا اہم فرق ہے جسے قرۃ العین حیدر کا خلاق ذہن ہی محسوس کر سکتا ہے اور ہم اسے ورجینیا ولف اور رچرڈسن اور ولیم جیمز کے نظریہ شعور کی رو سے خلط ملط کرکے تنقید کا فریضہ سرانجام دے دیتے ہیں۔ ہم برگساں کے تصور زماں کی بات کرتے ہیں لیکن ہندوستان کے کال کی پوری کلپنا کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم داستان حکایت، کتھا اور اسطور سے وقت کی HYPHENS کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کیا یہ کافی ہے؟ یا یہی ایک ذریعہ ہے۔ ایک تہذیب کا مکمل شعور اس کے خارجی مظاہر اور اشکال اس کی داخلی DYNAMICS اس کا جدلیاتی عمل اور اس کی خلاقانہ قوت کا احساس ہمیں قرۃ العین حیدر کی تخلیقات نے دیا ہے۔ یہ ایسا تانا بانا او ٹیکسچر ہے جو فرد، سماج اور کائنات میں ایک فعال، زندہ حرکی اور تخلیقی رشتہ پیدا کرتا ہے۔ ان کی تحریروں میں اس پیچیدہ رشتے کی بے پناہ امکانات کے دروازے کھلتے جاتے ہیں اور انسان اور زندگی کا ایک مربوط تصور ابھر کر سامنے آتا ہے۔ علامتیں، استعارے، MYTHS یادیں، امیجری ایک گہرا، گھنا، معنی خیز تخیلی اور حساس روپ دھارن کر لیتے ہیں۔ یہ ایسی کیفیت ہے جس کی سرحدیں کبھی کبھی MYSTICISM کو چھو لیتی ہیں۔ جب یہ سارا عمل کلچرل داخلیت کی طرف مڑتا ہے تو ہم چونک پڑتے ہیں اور اسے صوفیانہ رجحان یا پیری مریدی کہہ کر مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ اگر ہم ژاں ژینے کے چور لٹیرے، بدمعاش قاتل، سادیت اور امرد پرست اور جنسی کج رویوں کے شکار کرداروں کے حوالے دیتے ہیں تو ہم کسی تخلیق میں صوفیانہ تجربے کو شک کی نظر سے کیوں دیکھتے ہیں؟ کیا یہ صوفی صفت منش نہیں جو انسان کی ارضی زندگی اور روحانی واردات کے تضاد کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ فرد اور کائنات میں ہم آہنگی تلاش کرتا ہے۔

میں یہ بات اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ ہندوستان کے ادب کو محض یورپ کے نظریات سے سمجھنا دشوار ہے۔ کارل مارکس کے

لئے ہندوستانی تہذیب ایک بوسیدہ سامنت شاہی کی مرتی ہوئی تہذیب تھی جو جنگلی دیوتاؤں اور دقیانوسی اندھ وشواسوں میں پوری طرح جکڑی ہوئی تھی۔ ہیگل اور ہائیڈگر نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہندوستان کی تہذیب اپنے کو ایک بار پھر زندہ کر سکے گی اگر وہ اپنے ماضی کو یورپ کے حال میں ڈھال دے۔ یورپ کا فلسفہ، کلچر اور ادب اور دیگر علوم نے ہماری ذہنی پرورش میں نمایاں اور اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ ہمارے تہذیبی ورثے کا بیش قدر سرمایہ بن چکے ہیں لیکن مستقبل میں یہ ہماری سوچ اور تخلیق کا ماڈل قرار پائیں ضروری نہیں۔ ادب اپنی تہذیبی روایات کو آثار قدیمہ کی صورت میں نہیں دیکھتا اور نہ ہی اپنے کلاسیکی ورثے کو اوراق پارینہ، اور نہ ہی اپنے آدی واسیوں کو بشریاتی ریسرچ کا ایک پروجیکٹ۔ وہ اپنے کلچر اور اپنے لوگوں سے حیاتی اور حسیاتی رشتہ قائم کرتا ہے ان داستانوں اور اساطیر سے جسے لیوی اسٹراس نے ANCHOR POINTS OF EASTERN CULTURE کہا ہے یہ ANCHOR POINTS اس رشتے کو گہرا، INTIMATE اور معنی خیز بناتے ہیں۔

سماج اور کلچر کے پس منظر یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کے اندر رہ کر ہی کوئی افسانہ اپنا جوہر حاصل کرتا ہے اور اپنے وجود، اپنے ہونے کی حقیقت، کو مستند بناتا ہے۔ افسانہ اپنی بنیادی اور مرکزی امیجری اور استعارا اپنی روایت کے سرچشمے سے حاصل کرتا ہے جسے کسی خطۂ زمین پر بسنے والے لوگ مشترکہ طور پر SHARE کرتے ہیں۔ جب یہ REFERENCE POINTS اور یادوں کے جزیرے غائب ہو جاتے ہیں تو افسانہ محض ایک ARTIFACT جنس بازار تفنن طبع کا کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ چیک مصنف میلان کندیرا نے کہا ہے کہ ایک آمری نظام کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح انسان کی یادداشت مٹا دے۔ کیونکہ اسے مٹا کر ہی حال کے جھوٹ کو منوایا جا سکتا ہے کین سیکے کی تخلیق ONE FLEW OVER A CUCKOO'S NEST انسان کو بے حس بنانے کی رقت آمیز تصویر پیش کرتی ہے۔

جب یسوع مسیح سے رومن پائلٹ نے یہ سوال کیا کہ تم اپنے کو سچائی کا مسیحا کہتے ہو تو مجھے بتاؤ کہ سچائی کیا ہے تو وہ خاموش رہے کوئی جواب نہیں دیا اور جب گوتم بدھ سے ایشور کے بارے میں پوچھا گیا، ایشور کیا ہے؟ تو وہ خاموش رہے دراصل جستجو اور جواب کے بیچ جو SPACE ہوتی ہے، سچائی اور ایشور کی، افسانہ نگار یا کوئی بھی ادیب اس میں داخل ہوتا ہے بیانیہ اور الفاظ اپنے معنی میں تخصیص حاصل کر چکے ہوتے ہیں اس لئے افسانہ نگار اس سچائی اور احساس کو بیان کرنے کے لئے CODES اور CODE SYSTEMS کی تشکیل کرتا ہے۔ آخر لفظ بھی تو ایک CODE ہے لیکن مسئلہ یہ درپیش آتا ہے کہ کیا یہ CODES قاری کے لئے بھی وہی معنی رکھتا ہے جو افسانہ نگار کے ذہن میں ہے یا اس کا مدعا ہے؟ افسانہ نگار افسانے کے TREATMENT میں استعارہ، علامت، تشبیہ اور MYTHS کا استعمال جمالیاتی تجربے کے علاوہ معنویت کو گہرائی اور گیرائی عطا کرنے کے لئے کرتا ہے۔ لیکن قاری اپنے DECODING کے عمل میں اپنے ذاتی تجربے، شخصی میلانات، تہذیبی پس منظر اور نسلی یا انفرادی یادوں کے دائرے سے گزرتا ہے۔ وہ کئی طرح کے اشاروں اور حوالوں سے اس کی معنویت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ساختیت اسے SIGNIFIER اور SIGNIFIED اور BINARY کی اصطلاحات میں دیکھتی ہے۔ آج کل ساختیت پس ساختیت اور مابعد جدیدیت کا بڑا چرچا ہے۔ ص۲

ساختیت اور مابعد جدیدیت کے اتنے گوناگوں اور بعض اوقات متضاد پہلو ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ یہاں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ جو ملک ابھی پوری طرح MODERNIZATION کے عمل سے بھی نہیں گزرا اس میں MODERNITY اور MODERNISM کے خاتمے کے اعلان کا اطلاق کہاں تک ممکن ہے۔ خود یورپ میں بھی اس کی تنقید کی گئی ہے۔ جس میں ایک اہم مطالعہ ایک برس قبل شائع TERRY EAGLTON کی کتاب THE IDEALOGY OF AESTHETICS ہے ص۳ حالات جس تیزی سے بدل رہے ہیں ملٹن اس کے ساتھ قدم ملانے میں اپنے کو بعض اوقات معذور پاتی ہے۔ اس لئے نیو جرنلزم یعنی DOCUMENTARY NARRATIVE نے جو چیلنج پیش کیا ہے اسے دیکھ کر یہ محسوس کیا جانے لگا ہے کہ یہ دور

افسانے کا نہیں نان فکشن ناول کا ہے۔ اگر افسانے کے زندہ رہنے کی کوئی صورت ہے تو وہ FABULATION یا FABULOUS FICTION یا META FICTION میں ہے۔ اپنے قاری سے اپنے افسانے کے ابلاغی نٹ ورک کو توڑنے کا یہی انجام ہوگا۔ یہ کوئی پیشن گوئی نہیں قارئین کے ردّ عمل کا تجزیہ ہے۔

ترقی پسند دور میں اردو افسانے کے چار کھونٹے تھے۔ کرشن چندر، بیدی، منٹو اور عصمت چغتائی۔ جدید افسانے کے بھی چار کھونٹے ہیں: بلراج مینرا، سریندر پرکاش، انتظار حسین اور انور سجاد۔ مینرا افسانے کی دنیا سے تائب ہو چکے ہیں۔ انتظار حسین اور انور سجاد پاکستان میں ہیں۔ اتنے بڑے ملک میں تن تنہا سریندر پرکاش ہیں۔ جو اپنی تخلیقی اپج اور ذہانت سے افسانے کا تمام تر بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ صورت حال اردو زبان کو بڑی زبان کہنے والوں کے لئے یقیناً باعث تشویش ہے لیکن کتنے ہی اور نام ہیں اس نسل میں انور عظیم، عابد سہیل، غیاث احمد گدی، اقبال متین، اقبال مجید، رام لعل، جوگیندر پال، رتن سنگھ، جیلانی بانو، شرون کمار ورما، اور بھی کئی نام ہیں۔ کیا ان کے دو چار افسانے بھی ایسے نہیں کہ ناقدین ان کی حمایت میں بھی لکھیں۔ اور کتنے ہی نئے نام ہیں۔

میں اردو افسانے کے بارے میں کوئی پیشن گوئی نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک بات ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اردو افسانہ کتنا بھی جدید یا عظیم کیوں نہ بن جائے بغیر قاری کے زندہ نہیں رہے گا۔ اس لئے جب ڈاکٹر انور سدید فرماتے ہیں کہ "افسانے میں کہانی کی واپسی کے عنوان سے اب جو بحث جاری ہے میں اسے ایک اعلامیے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اس اعلامیے سے افسانے کے کھوئے ہوئے اعتماد کو تو بحال کیا جا سکتا ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اہم فنی تجربہ جو تجرید اور علامت کی صورت میں چھٹی ساتویں دہائی کے افسانے میں کیا گیا وہ اس نئی آواز کے ہجوم میں اپنی قدر و قیمت کھو رہا ہے۔" انھوں نے کہا کہ "علامتی کہانی میں قاری کو علامت کی کلید کو تلاش کرنے اور معنی کی گرہ کشائی کی کوشش کرنی پڑتی ہے اور ان دونوں کے لئے ایسا ہی فنی ریاض ضروری ہے جیسا افسانہ نگار کر چکا ہے۔" تو میرا ذہن فکر اور تشویش میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ افسانہ کی انا پرستی ہے علامتی کہانی کے بارے میں یہ PATHALOGICAL OBSESSION دیکھ کر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارا افسانہ اس نہج پر پہنچ چکا ہے کہ وہ قاری کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے تجرید اور علامت کی پاکدامنی کو برقرار رکھنے کے لئے قاری کو بھی قربان کیا جا سکتا ہے اور اگر وہ افسانہ نگار کی طرح فنی ریاض نہیں کر سکتا تو اس کے اعتماد کو بحال کرنے کے لئے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی افسانہ نگار یہ دعوے کرتا ہے کہ وہ کسی ہیجروژن کی عکاسی کر رہا ہے۔ جو عام قاری کی نظر سے پوشیدہ ہے تو اسے ترسیل کی ناکامی کا المیہ کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔

میں اردو افسانے سے کوئی بہت بڑا مطالبہ نہیں کر رہا۔ میں تو صرف اپنے اندیشے کو الفاظ دے رہا ہوں کہ اگر ہم سے ہمارا لوک ورثہ، ہمارا کلاسیکی ادب، چھین کر ایک لذت پرست پاپولر کلچر CONSUMERISM اور میڈیا یا مدہوشی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے تو اپنی شناخت کے تحفظ اور اقدار کی پرورش کے لئے ہمارے پاس ادب کی SURVIVAL KEL کے سوائے کیا رہ گیا ہے۔ افسانے اور قاری کے بیچ خلا کی صورت نہیں رہ سکتی۔ اگر افسانہ EMPATHY اور ترسیل میں ناکام رہتا ہے تو اس خلا کو سفاک سیاست داں، مکار ریاست، مذہبی بنیاد پرستی اور عصبیت پر کرے گی اور ٹریجڈی یہ ہوگی کہ یہ سب کچھ تہذیب کے تحفظ اور ماضی کے احیا کے نام پر ہوگا۔

میں نے اپنی بات کا آغاز گلزار کی کہانی "بکس کی کہانی" سے کیا تھا اور اس مضمون میں اسے بالکل بھول گیا کہ ساٹھ ستر برس کے اتنے طویل سفر اپنی زندگی کے اور اردو افسانے کے بھی بھول جانا فطری ہے، یا یوں کہئے کہ خود فراموشی اور خود آگہی کے بیچ جو SPACE رہ جاتی ہے اسے پُر کرنے، اس پر پل باندھنے کی کوشش میں بھٹک جانے کا اندیشہ ہمیشہ رہتا ہے، لیکن جب تک آپ کے ساتھ اس سفر میں ہوری اور کالو بھنگی اور بھیکو موچی، سوگندھی، ہولی اور چیا احمد شریک ہیں اردو افسانہ ہزار پُرخطر راستوں سے گزرتے ہوئے منزل منزل اپنا سفر جاری رکھے گا۔

۱؎ "اردو کا نیا افسانہ بستیوں کا ذکر کرتا ہے۔ اس میں گاؤں کی فضا نہیں ہے۔۔۔ لوگ آبادی کی شکل میں رہتے ہیں۔ سماج کا

نام ونشان نہیں۔ کردار بے چہرہ اور بے نام ہیں اور پوری فضا داستانی، اسطوری کہانی اور پیغمبرانہ مکاشفوں کی لرزشوں سے کانپتی ہے۔ نفسیات کی جگہ روحانیت پلاٹ کی جگہ کہانی اور تخیل کی جگہ فنا شمہ نے لے لی ہے۔ افسانہ کا آرٹ ان تجربات کا بیان کرتا ہے جو آدمیوں کے بیچ زندگی بسر کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ان تجربات کا دائرہ وسیع ہے۔ اس لئے افسانے کی دنیا بھی زندگی ہی کی طرح وسیع اور رنگا رنگ ہے...... حقیقت پسندی کی جمالیات سے انکار اور عناصر افسانہ یعنی کہانی، پلاٹ، کردار، پس منظر اور ماحول سے بے نیازی نے اسے محض لسانی تشکیلات کا جمگھٹا بنا دیا ہے۔

[جدید افسانہ اور اس کے مسائل ۔ وارث علوی] بقول سلیم شہزاد۔ غیر ارضی، خوابناک موہوم تجریدی فضا زماں مکاں گم۔ کردار غائب اور زبان اجنبی ۔ قصہ جدید افسانے کا۔

صـ۲ ۔ اگر ہمیں ذات کی سچائیوں کا سراغ لگانا مقصود ہو تو پھر ہماری سچائیاں، ہمارے شعور کے بطن و بطون میں کہیں جا کر نہیں ملیں گے۔ بلکہ ان سچائیوں کی تلاش اگر کرنا ہے تو پھر انہیں ایسی دنیا میں تلاش کرنا ہوگا جس میں ہم زندگی کے عمل سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ ہم زندگی کے عمل کے دوران جن تاثرات، جن تخلیقات اور جس طرح کے بھی تخلیقی ہنر و فن کو جنم دے رہے ہوتے ہیں یعنی جس میں ہمارا ادب، ہماری داستانیں اور اساطیر ان کے علاوہ ہماری زبانیں، ہمارے مختلف النوع ثقافتی ورثے، وغیرہ نہ جانے کیا کیا شامل ہوا کرتا ہے۔ زندگی پر محیط یہ ساری صورت احوال الغرض ہماری اپنی سچائیوں کی حقیقی امانت ہیں۔ مگر ہماری اپنی ذات کی سچائیوں کا یہ حصول صرف اس وقت ممکن ہے جب ہم مختلف تقاضوں اور تمدنوں کے تال میل کا تقابلی مقابلہ بہ نظر غائر کریں۔ تب جا کر ہم انسانی دماغ کی کل ساختوں کی محض ایک حقیقت ہی دیکھ لینے پر قادر ہوتے ہیں۔

[مرکز سے محیط تک ساخت اور مابعد از جدیدیت، قاضی قیصر الاسلام، مطبوعہ ماہنامہ فنون، جولائی ستمبر ۱۹۹۱ء]

صـ۳ "From a radical viewpoint, the case for the defence of postmodernism might go roughly as follow: postmodernism represents the latest iconoclastic upsurge of the Avant-Garde, with its demotic confounding of hierarchies, its self reflex subversion of ideological closurer, its populist debunking of intelectualism and elitism. If that sounds a little too euphoric, one may always try instead the case for the prosecution, drawing attention to postmodernism's consumerist hedonism and philistine anti-historicism, its wholesale abadonment of critique and commitment, its cynical closure of truth, meaning and subjettivity, its blank reified technologicalism" (p. 373)

بقیہ صفحہ ۲۷ کہانی کی تلاش

کہ آپ میری باتوں سے بالکل بیزار ہو گئے جو میرے پاس ہی سے اٹھ کر چل دیئے ٹھیک ہے۔ جایئے۔ آپ کو جیسی کہانی چاہیئے وہ ہم جیسے بدحال فاقہ مستوں میں نہیں ملے گی۔ اس کے لئے آپ کو کسی ہوٹل کے جگمگاتے ہوئے لاؤنج میں جانا چاہیئے یا کسی ہوٹل اعلیٰ سوسائٹی کے کلب اور اس کے لان کی جاگتی ہوئی راتوں میں۔ وہاں بوتلوں کے اڑتے ہوئے کارگ۔ لچکتے ہوئے جسم۔ مہکتے لباس۔ تھرکتی ہوئی برہنہ ٹانگیں اور مدہوش آنکھیں ملیں گی ان سے اپنی کہانی کو سجایئے اور تھوڑی دیر کے لئے اپنی تشنہ زندگی کی پیاس کو وہاں کے لبالب بھرے جاموں میں غرق کر دیجئے۔ خدا حافظ

بقیہ صفحہ ۶ حکیم

مریضوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لئے ان کے نام اور شخصیت دونوں کو صیغۂ راز میں رکھنے کا حلفیہ دعویٰ فرماتے ہیں۔ اور ثبوت کے طور پر خود اپنے اصلی نام کو صیغۂ راز میں رکھ کر بڑے حکیم صاحب" "چھوٹے حکیم صاحب" "منجھلے حکیم صاحب" کی فرضی عرفیتیں اختیار کر لیتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے اس رازداری کے پیچھے مریضوں کی عافیت سے زیادہ انھیں خود اپنی عافیت مطلوب ہوتی ہے۔

بہرحال ان قابل گرفت بلکہ قابل گردن زدنی، اشتہاری دعووں سے کم از کم یہ بات تو صاف ہو گئی ہو گی کہ یہ نام نہاد حکیمان فتنہ انگیز، مریضان غم انگیز کو علاج سے صحت یاب کرنے کی جگہ خالی دعووں ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے پاس ہر بیماری کو رام کرنے کا ایک نسخہ ہوتا ہے یعنی ہر مرض کا ایک مداوا صرف زبانی دعویٰ

بخطِ شاعر

الجھنیں یوں ہی کوئی کم نہیں دورِ [illegible] کے
آپ سے کس نے کہا درد چھپانے کے لیے

قطرۂ خونِ شہیداں ہے کہ [illegible]!
تازہ عنوان [illegible] افسانے کے لیے

جانے والوں کی جگہ ہو یہ دل کیا جانے [illegible]
گر جڑ [illegible] دور سے گھر اپنا ہی جلانے کے لیے

دل [illegible] دستور کہ ہر اک [illegible] سمجھو
میں تو اک [illegible] کچھ [illegible] کے لیے

ہم [illegible] وقت سے لائے ہیں [illegible]
کوئی پیغام [illegible] درد زمانے کے لیے

یہ بھی [illegible] جانیں ستم پیشہ [illegible] کا تماشا
جیسے خوں کی بھی فصل [illegible] کے لیے

مجھ کو کیوں بزمِ سخن میں [illegible] زیدی
شعر کہتا نہیں [illegible] رنگ جمانے کے لیے

جلتی ہے چراغوں سے [illegible] تو کیا کچھ بھی نہیں
وہ جو ہیں سب بزم [illegible] کیا کچھ بھی نہیں

وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں نہیں ان کا جواب
میں سمجھتا ہوں کہ [illegible] کچھ بھی نہیں

آنکھوں میں آنکھیں [illegible] اگر [illegible] آئی
اور اسے دیکھ کر وہ خوش یا خفا کچھ بھی نہیں

رات اندھیری ہے، گھنا جنگل [illegible]
روشنی ہو [illegible] کچھ بھی نہیں

تیر [illegible] میں [illegible] دینے کی [illegible]
جو گزر جائے گا اس کا ماجرا کچھ بھی نہیں

حسن ہے [illegible] التفات [illegible] ہو گیا
وہ طرزِ شوق و اندازِ وفا کچھ بھی نہیں

آگہی کیا ہے [illegible] سلسلہ سکوت
ساحلوں پر شور ہے [illegible] کچھ بھی نہیں

شورشِ طوفاں ہیں یا امید [illegible]
[illegible] کچھ بھی نہیں
وہ بھی گویا کچھ نہیں [illegible] خدا کچھ بھی نہیں

کون [illegible] گا زیادہ [illegible] ہم دوش ہیں
وہ بھی مجرم بن گئے جس نے کہا کچھ بھی نہیں

غم کی تاریکی میں [illegible] جاودانی کی بات ہے
آپ [illegible] آپ ہی کی بات ہے

اے نگاہِ فتنہ جو، ہر قدم کا [illegible] اچھا نہیں
یہ کسی شگفتہ سر کی زندگی کی بات ہے

وحشتیں [illegible] کی [illegible] دیکھا ہیں
جو [illegible] دل میں [illegible] کی بات ہے

اے فریبِ آرزو آخر وہ منزل آ گئی
دل تو کہتا ہی تھا آگے [illegible] کی بات ہے

کارنامہ [illegible] ہے [illegible]
کون کہتا [illegible] کی بات ہے

گفتگو پیغام مبہم اشارہ کچھ نہیں
[illegible] کی بات ہے

لوگ کہتے ہیں کہ [illegible] کشتی نہ تھی
یہ نہیں معلوم لیکن کس صدی کی بات ہے

راہِ غم [illegible]
[illegible] کی بات ہے

تیرے چہرے [illegible] سوال
اے زمانہ یہ تو تیرے [illegible] کی بات ہے

اس سے بڑھ کر [illegible] انقلاب
دوستی کی بات بھی شرمندگی کی بات ہے

زخم پابند نہیں [illegible] کسی موسم کے
اٹھتے ہیں درد [illegible] غم کے

جب بھی جا کر تو رفیقانِ سفر کو چھوڑا
لوگ کچھ دور چلے ساتھ [illegible] غم کے

باغباں کی غلطی ہے نہ ستم آندھی کا
خود [illegible] اکثر [illegible] غم کے

[illegible] دیکھے ہوں گے
وہ جواں زخم جو محتاج رہے مرہم کے

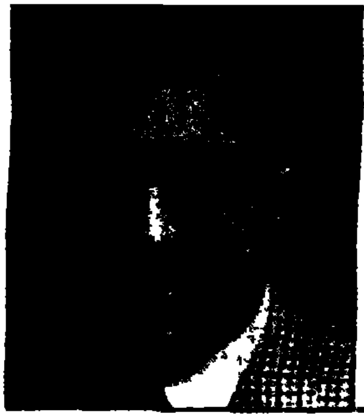
شکوہ [illegible] کا اس طرح [illegible] لوگ
جیسے بس ایک [illegible] غم کے

اور کیا [illegible] تحفہ [illegible] تھا
دیکھ [illegible] گوشہ چشم نم کے

دیکھو [illegible] عزیزان [illegible]
[illegible] اپنے ہی کاندھوں پہ سب بوجھ نہیں عالم کے



٥/١٥ ۔ اے، گرین فیلڈز [illegible] کالونی [illegible] روڈ، اندھیری (ایسٹ) ممبئی ۹۳



منیر الدین احمد

DEUTSCHES ORIENT INSTITUTE
MITTLEWEG 150-20148 HAMBURGH GERMANY

لینڈ لیڈی

پھر ایک بار میں لمبے عرصے کے بعد وطن لوٹا تھا۔ میرے عزیز مجھے رواج کے مطابق گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے آباؤ اجداد کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے لئے لے گئے۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ قبرستان کے گرد چار دیواری بنا دی گئی تھی اور لوہے کا گیٹ لگا ہوا تھا۔ پرانی قبریں، جنہیں میں پہلے وقتوں سے جانتا تھا۔ بدستور کچی تھیں۔ مگر نئی قبریں پکی بنی ہوئی تھیں اور ان پر سنگ مرمر کے کتبے لگے ہوئے تھے۔ قبروں کی قطاروں کے درمیان پھول دار پودوں کی کیاریاں بنی ہوئی تھیں اور قبرستان کا ماحول بے حد خوشگوار لگ رہا تھا۔ جس میں قبرستانوں والی سوگواری نام کو بھی نہ تھی۔

پہلے وقتوں میں کیکر کے پیڑوں اور جنگلی جھاڑیوں کے سبب قبرستان بالکل اجاڑ لگتا تھا۔ جس میں انسان دن کے وقت بھی داخل ہونے سے ڈرتا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں قبرستان کا کوئی چوکیدار نہ تھا اس وجہ سے پرانی قبریں اکثر ٹوٹ پھوٹ کر ڈھے جاتی تھیں اور بھیانک صورت اختیار کر لیتی تھیں۔ اب کے میں نے دیکھا کہ ایسی کوئی گری ہوئی قبر نظر نہ آ رہی تھی۔ پورے رقبے پر مٹی ڈال کر زمین کو برابر کر دیا گیا تھا۔ قبرستان میں خوشگوار تبدیلی دیکھ کر مجھے بے حد حیرت اور مسرت ہوئی ۔ ــــــ مگر مجھے اس وقت تک پتہ نہ تھا کہ گاؤں میں اس سے بڑھ کر حیران کن تبدیلیاں میری راہ تک رہی تھیں۔

سب سے پہلی چیز، جو میں نے نوٹ کی، وہ یہ تھی کہ گاؤں میں بجلی آ گئی تھی اور اکثر مکانوں کے اوپر لگے ہوئے اینٹینے اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ گھروں میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو لگے ہوئے تھے۔ میرے بچپن کے دنوں میں گاؤں میں بجلی نہ آئی تھی اور ٹیلی ویژن تو اس زمانے میں ابھی ہمارے ملک میں پہنچا ہی نہ تھا شہروں میں لوگوں کے گھروں میں اکا دکا ریڈیو سیٹ ہوا کرتے تھے

ہمارے گاؤں میں پہلا ٹرانسسٹر میرے ایک چچا، جو سیلانی آدمی تھے، یورپ کے کسی سفر سے ساتھ لائے تھے۔ مگر وہ ابھی بہت ابتدائی صورت میں تھا۔ ریڈیو سگنل تک رسائی کی خاطر انہوں نے حویلی کے عین درمیان اُگے ہوئے کیکر کی چوٹی پر انٹینا لگایا تھا۔ پھر بھی دن کے وقت کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ صرف رات کے وقت بہت توجہ سے سننے سے انسان بے حد مدہم آواز میں ریڈیو نشریات سن سکتا تھا۔

دوسری چیز جو میں نے نوٹ کی، وہ یہ تھی کہ گاؤں کی گلیوں کو اینٹوں سے پختہ کر دیا گیا تھا اور جگہ جگہ پر اسٹریٹ لائٹ کے بلب لگے ہوئے تھے۔ ہمارے خاندان کی حویلیاں اور مکانات تو خیر ہمیشہ سے پکے تھے میں نے دیکھا کہ دوسرے مکانات، جو پہلے وقتوں میں پتھروں اور گارے سے بنے ہوئے تھے، بھی پختہ بن چکے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ تو کچھ بھی نہ تھا، مجھے گاؤں کے گرد و نواح میں بن جانے والے بنگلوں کو دیکھنے کے لئے جانا چاہیے، جن کے نقشے یورپ سے بن کر آئے تھے۔ ان کے بنانے والے ہمارے گاؤں کے وہ باسی تھے، جو یورپ میں مقیم ہیں، مگر گاؤں سے اپنی وابستگی کو زندہ رکھنے کے لئے وہاں پر مکان ضرور تعمیر کرواتے ہیں۔

مولوی سعید ہمارے گاؤں کا پہلا شخص تھا، جو نوکری کرنے کی خاطر انگلستان گیا تھا۔ اس کا باپ مسجد کا امام الصلوٰۃ تھا اور اس نے اپنے بیٹے کو بھی اسی پیشے کے لئے تیار کیا تھا۔ اس نے خود اُسے قرآن پڑھایا تھا۔ اور نماز و روزہ کے احکام سکھائے تھے۔ اور دوسری ساری باتیں بتائی تھیں، جن کا جاننا ایک مولوی کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ رومال تو خیر اس کے کندھے پر ہمیشہ سے ہوا کرتا تھا۔ داڑھی نکل آنے پر وہ پکے کا مولوی لگنے لگا تھا باپ نے چھوٹے بچوں کو بغدادی قاعدہ پڑھانے کا کام اس کے سپرد کر دیا

اس طرح وہ دھرت باپ کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ بلکہ دھیرے دھیرے اس کی جانشینی کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ ان کی مسجد سڑک کے کنارے پر واقع تھی، اور سڑک پر سے گزرنے والے اونٹوں اور خچروں کے کارواں، جو اس زمانے میں مال برداری کا کام کرتے تھے۔ مسجد کے کنویں سے پانی بھرنے کے لیے رکا کرتے تھے۔ بعض اوقات کوئی اکّا دکّا مسافر رستے میں رات پڑ جانے پر مسجد میں ٹھہر جایا کرتا تھا۔ اس کے لیے خورد و نوش کا سامان گاؤں کے گھروں سے جاکر لانے کا کام مولوی سعید کے سپرد تھا۔ خود اس کے خاندان کی روٹی بھی گاؤں کے باسیوں کے ذمّے تھی۔ اگرچہ اس کے باپ نے آہستہ آہستہ تھوڑی بہت زمین خرید لی تھی۔ اور کھیتی باڑی بھی کرنے لگا تھا۔ اس طرح کچھ زائد آمدنی پیدا ہونے لگی تھی۔ مگر مولوی سعید اس بات سے مطمئن نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مستقل آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ نکل آئے چنانچہ اس نے سڑک کے کنارے مسجد کے ساتھ ایک کوٹھری بنا کر اس میں چائے خانہ کھول دیا۔ بشر تک سواریاں پہونچانے والی موٹریں وہیں پر آن کر رکنے لگیں اور ٹانگوں کا اڈّا بھی اسی جگہ پر بن گیا۔ چائے خانے کے باہر دو چار پائیاں اور دو تین کرسیاں پڑی رہتی تھیں اور چلم اور حقّہ ہر وقت موجود رہتے تھے۔ آنے جانے والے لمحہ بھر کے لیے رک کر ایک آدھ گھونٹ لے لیا کرتے تھے۔ انہی میں سے کسی نے مولوی سعید کو انگلستان کے بارے میں بتا دیا تھا۔ جہاں پر دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں، اور مزدوروں کی بے حد مانگ تھی۔ اور پھر ایک روز چپکے سے مولوی سعید چلا گیا۔ تھا ایک عرصے تک کسی کو پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں پر ہوتا تھا اور کیا کرتا تھا۔ چائے خانے کا کام اس کے چھوٹے بھائی نے سنبھال لیا تھا اور وہی باپ کا ہاتھ مسجد کے کاموں میں بٹانے لگا تھا۔ اس طرح پانچ برس گزر گئے۔ اس دوران میں اس کا باپ مر گیا۔

پھر ایک روز اچانک مولوی سعید واپس لوٹ آیا۔ پتہ چلا کہ وہ بلیک برن کے کوئلے کی کانوں میں مزدوری کرتا رہا تھا۔ مگر اس کے جلد دولت مند بن جانے والے سارے خواب ٹوٹ گئے تھے۔ پاکستان کے حساب سے وہ وہاں پر خوب پیسے کماتا۔ رہا تھا۔ مگر خرچ وہاں پر انگلستان کے حساب سے کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے جب وہ واپس لوٹا تو اس کے پلّے کوئی دولت نہ تھی۔ جب وہ موڈ میں ہوتا تھا تو انگریز میموں کے قصّے سنایا کرتا تھا۔ جو دیسی لوگوں کو بہت پسند کرتی تھیں۔ اگر وہ چاہتا

تو شادی بھی کر سکتا تھا۔ دو تین میموں نے اس کا بہت پیچھا کیا تھا، مگر وہ اُسے قابو میں نہ کر سکی تھیں، پھر دھیمی آواز میں جیسے اُسے خطرہ ہو کہ کہیں اس کا مرحوم باپ اس کی بات کو سن نہ لے، وہ اپنی فتوحات کے قصّے سنایا کرتا تھا۔ اس وجہ سے مولوی سعید کا چائے خانہ گاؤں کے بے فکروں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ اس کی باتیں سن سن کر ہر جوان آدمی کے دل میں اس جنت ارضی میں جانے کی خواہش پیدا ہونے لگی۔ وہ لوگ مولوی سعید سے سنے ہوئے قصّوں کی صداقت کے اس درجہ قائل ہو چکے تھے کہ اپنے بڑے بزرگوں کی بات پر کان دھرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ لال خان بہادر اور دوسرے بڈھے، جو پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں میں حصّہ لے چکے تھے اور یورپ میں گھوم پھر آئے تھے، مولوی سعید کی باتوں کے سحر کو توڑنے میں ناکام رہے۔

اس زمانے میں ہمارے گاؤں کے کچھ لڑکے نیوی ملازم تھے۔ ان کے جہاز گاہے بگاہے مرمت کی خاطر یا ٹریننگ کے پروگراموں کے سلسلے میں انگلستان جاتے رہتے تھے۔ ایک روز خبر آئی کہ ایک جہاز کا سارا عملہ لیورپول میں اپنے جہاز کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ انہوں نے قرب و جوار کے شہروں میں رہائش اور ملازمت تلاش کر لی تھی اور وہیں پر رہ گئے تھے۔ ہمارے گاؤں کا ایک لڑکا بھی ان بھگوڑوں میں شامل تھا بلکہ عرصے تک اس کا کوئی خط نہ آیا، کیونکہ اس بات کا خطرہ تھا کہ حکومت کو اس کے ٹھکانے کا پتہ چل گیا، تو پولیس اس کو گرفتار کر کے انگلستان سے واپس کر دے گی۔ مولوی سعید نے انگلستان میں اپنے واقف کاروں کے ساتھ مل کر گاؤں کے لڑکوں کو بھجوانے کا بندوبست کر لیا۔ پہلے پہل یہ سروس دوستی یاری میں ہوتی رہتی پھر باقاعدہ ایجنسی کی صورت اختیار کر گئی۔ مولوی سعید کو آمدنی کا ایک نیا ذریعہ مل گیا اور گاؤں کے لڑکے باہر لے انگلستان میں جاکر مزدوری کرنے لگے۔

جب میں جرمنی میں اپنی تعلیم کی تکمیل پر چند ہفتوں کیلئے پاکستان آیا تو گاؤں میں رشتہ داروں نے میری بہت عزت داری کی، باری باری سب گھروں میں دعوتیں دی گئیں۔ ماسٹر قربان، جس کے ساتھ ہماری دور کی رشتہ داری تھی، آؤ بھگت کرنے میں سب سے آگے آگے تھا۔ وہ مجھ سے کرید کرید کر جرمنی کے حالات پوچھتا رہا۔ آخر تان اس بات پر آن کر ٹوٹی کہ وہ مجھ سے جرمنی ساتھ لے جانے کا خواہش مند ہوا۔ مجھے پتہ تھا کہ اس کی اچھی بھلی زمین داری تھی۔ پھر ایک قریبی گاؤں کے مدرسہ میں وہ استاد تھا۔ جہاں سے اُسے ماہوار آمدنی ہو جاتی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ

کہ جس شخص کی گزر اوقات گھر بیٹھے اچھی خاصی ہو رہی ہو، اُسے بھلا سات سمندر پار جا کر مزدوری کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا اور بالآخر اس نے اپنی دانست میں سب سے اہم دلیل دی۔ اس نے کہا کہ گاؤں کے اتنے بہت لوگ انگلستان میں جا کر دولت کما رہے تھے۔ ان کے ساتھ اس کی دوستی اور بھائی چارہ تھا۔ جب وہ لوگ کسی شادی بیاہ کے سلسلے میں گاؤں میں آتے تھے اور ناچ گانے کی محفل لگتی تھی۔ تو اُسے ایسے موقعوں پر بے حد شرمندگی اٹھانی پڑتی تھی، کیونکہ وہ اپنے ہاں کے دستور کے مطابق اپنے دوستوں کے نام پر ایک یا دو روپئے کی بیل دیتا تھا، جب کہ اس کے انگلستانی دوست دس دس روپے کی بیل اس کے نام پر دیتے تھے۔ جب مراثی اس بات کا اعلان کرتا تھا تو وہ شرم کے مارے زمین میں گڑھ جاتا تھا، کیونکہ اس کی مالی حیثیت ایسی نہ تھی۔ کہ پوری رات ان کے مقابلے میں دس دس روپے کی بیلیں دے سکیں۔ اس وجہ سے وہ چاہتا تھا، کہ جرمن میں جا کر خوب پیسے کمائے اور جب اگلی بار اس کے انگلستانی دوست دس روپے کی بیلیں دیں۔ تو تو وہ بیس روپے کی بیلیں دے کر ان سے بدلہ لے۔ مجھے اس کی بات پر بے حد ہنسی آئی اور میں نے کہا کہ یہ بھی خوب رہی کہ تم مراثیوں کو بیلیں دینے کے لئے، جرمن جانا چاہتے ہو۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا اس نے کہا کہ وہ گاؤں کا آخری آدمی نہیں ہونا چاہتا تھا، جسے یورپ جانا نصیب نہ ہو اور جس کی زندگی کو لہو کے بیل کی طرح گاؤں اور مدرسہ کا چکر لگاتے لگاتے تمام ہو۔ اس زمانے میں چونکہ انگلستان میں داخلہ پر سخت پابندیاں لگ چکی تھی، اس لئے وہ جرمن جانا چاہتا تھا۔

میں جرمنی واپس لوٹا تو اقوام متحدہ کی ایک ذیلی آرگنائزیشن کی طرف سے میرے مصر میں تقرری کا پروانہ آیا ہوا تھا، جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ جلد از جلد قاہرہ جا کر چارج لے لوں۔ میں نے ماسٹر قربان کو اس نئی صورت حال کی اطلاع دی اور لکھا کہ وہ جرمنی آنے کا پروگرام میری مصر سے واپسی تک ملتوی کر دے۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک ماہ کے اندر اندر ضروری انتظامات کرنے کے بعد مصر چلا جاؤں گا۔ میری روانگی سے عین ایک ہفتہ قبل ماسٹر قربان کا ٹیلی گرام آ گیا، جس میں اس کی ہمبرگ میں آمد کا وقت اور فلائٹ نمبر درج تھا۔ اب صرف ایک دن کے اندر اندر مجھے اس کی رہائش کا انتظام کرنا تھا اور کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا تھا، جو میری غیابت میں ماسٹر قربان کو رہائش کا پرمٹ دلوا سکے اور کام کا بندوبست کر سکے۔

میں نے اپنی پریشانی کا ذکر اپنی سکریٹری سے کیا، جو ایک پادری کی بیوی تھی اور جس کے بارے میں مجھے پتہ لگا تھا کہ وہ غیر ملکیوں کی امداد و معاونت کرنے میں بہت مستعد تھا۔ سکریٹری نے کہا کہ اس کے خاوند کے چرچ کے ساتھ، جہاں پر ان کی اپنی رہائش بھی تھی، ایک بلڈنگ میں کمرہ خالی تھا۔ جس میں ماسٹر قربان کو ٹھہرایا جا سکتا تھا ان کے تعلقات فارن پولس کے محکمہ کے ساتھ اچھے تھے۔ اور انہیں یقین تھا کہ وہ اُسے رہائش اور کام کا پرمٹ لے کر دے سکیں گے۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں اسی ہفتے مصر کے لئے پرواز کر گیا، جہاں پر میری زندگی اس درجہ مصروف تھی کہ خط و کتابت کے لئے بھی وقت نکالنا مشکل تھا۔ اس طرح میرا رابطہ ماسٹر قربان کے ساتھ قائم نہ رہ سکا اور مجھے بالکل پتہ نہ چل سکا کہ اس کی زندگی جرمنی میں کیسے بسر ہو رہی تھی۔

نصف سال کے بعد جب میں مصر میں اپنے قیام کے خاتمے پر جرمنی واپس آیا۔ تو اس وقت تک ماسٹر قربان بدستور پادری کی فیملی کے ہاں مقیم تھا۔ اسکو کام مل گیا تھا اور اس نے ایک گرل فرینڈ بھی بنالی تھی میری سکریٹری نے بتایا کہ وہ اسکی سترہ سالہ بیٹی تھی۔ انہیں دونوں کی دوستی پر کوئی اعتراض نہ تھا، مگر وہ شادی کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ چونکہ دونوں کی عمروں میں بہت فرق تھا اس لئے انہیں خطرہ تھا کہ یہ رشتہ پائیدار ثابت نہ ہوگا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ماسٹر قربان سے اس سلسلے میں بات کروں، میں نے جب اس سے بات کرنا چاہی تو وہ صاف انکار کر گیا۔ کہ اس کا لڑکی کے ساتھ کوئی واسطہ تھا۔ اس کا کہنا تھا۔ کہ دراصل ماں باپ اپنی پاگل سی لڑکی کو اس کے سر منڈھ دینا چاہتے تھے۔ پھر مجھے پتہ تھا کہ پیچھے گاؤں میں اس کی بیوی موجود تھی۔

چند ہفتوں کے بعد میری سکریٹری نے بتایا کہ اس کی بیٹی حاملہ تھی۔ اس لئے انہوں نے اُسے ماسٹر قربان سے شادی کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ جرمنی میں تعدد ازدواج قانوناً ممنوع ہے۔ اس وجہ سے ایک سرٹیفکٹ کا پیش کیا جانا لازمی ہوتا ہے۔ کہ شادی کا طالب پہلے سے متزوج نہیں ہے۔ یا اگر پہلے شادی شدہ تھا تو اس دوران میں طلاق لے چکا ہے، مجھے پتہ نہیں ہے کہ ماسٹر قربان نے مطلوبہ سرٹیفکیٹ کیسے حاصل کیا تھا، جعلی بنایا تھا۔ یا کسی طریق سے رشوت دے کر نکلوایا تھا۔ بہر صورت ان کی شادی ہو گئی جس میں مجھے شامل ہونے کی دعوت نہ دی گئی۔ غالباً ماسٹر قربان مجھ

سے شرمندہ تھا اور پھر اسے خطرہ ہو گا کہ کہیں میں اس کا راز نہ فاش کر دوں۔ اس کے بعد ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا اور مجھے آئندہ سالوں میں کوئی پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں پر ہوتا تھا۔ اور کیا کرتا تھا۔

قبرستان سے نکل کر ہم رستے کنوئیں کا پانی پینے کے بعد گاؤں کی گلی میں داخل ہوئے، جہاں پر پہلی حویلی ماسٹر قربان کی پڑتی ہے عین اس وقت اس کی بیوی پریشانی کے عالم میں ننگے سر دروازے سے باہر نکلی۔ اس نے ایک ٹیلی گرام ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ اور کسی انگریزی داں سے اُسے پڑھوانا چاہتی تھی۔ مگر جس کسی کو اس نے ٹیلی گرام دکھایا تھا۔ وہ عبارت کو سمجھنے میں ناکام رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ عبارت جرمن زبان میں تھی۔ میں اسے پڑھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ کیونکہ اس میں ماسٹر قربان کے اچانک وفات پا جانے کی خبر تھی اور لکھا تھا کہ مارتھا خود اس کا جنازہ لے کر اگلے روز گاؤں پہنچ رہی تھی یہ سنتے ہی ماسٹر قربان کی بیوی چیخ مار کر زمین پر بیٹھ گئی اور سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔

اس اچانک خبر کے سبب میرے گاؤں میں آنے کی خوشیوں پر اوس پڑ گئی۔ سارے رشتہ داروں اور واقف کاروں کو ماسٹر قربان کی بیوی کے پاس جانے کی جلدی تھی۔ ہر کوئی مجھے خوش آمدید کے دو بول کہنے کے بعد جلد از جلد رخصت چاہتا تھا۔ مجھے بھی یوں لگا، جیسے میری گاؤں میں آمد ایک منحوس لمحے میں ہوئی تھی۔ اور یہ کہ میں نہ آتا تو شاید ماسٹر قربان نہ مرتا اور گاؤں کا امن و امان اس طرح نہ لوٹتا مگر ایک اور پہلو سے دیکھا جائے، تو میری وجہ سے ماسٹر قربان کی بیوی مبارکہ کو بیٹھے بٹھائے جرمن زبان کا مترجم مل گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مارتھا کو، جو نعش کے ہمراہ آرہی تھی، انگریزی نہ آتی تھی، اور گاؤں میں میرے سوا کوئی شخص موجود نہ تھا، جو اس سے جرمن زبان میں گفتگو کر سکتا۔

میرا قیاس درست نکلا۔ مارتھا کو صرف جرمن آتی تھی۔ اگر وہ جرمن ایئر لائینز لفت ہنزا میں سفر نہ کیا ہوتا، تو اُسے شاید گاؤں تک پہنچنے میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ مبارکہ نے بتایا کہ مارتھا ستر اسی برس کی بڑھیا تھی۔ اور ماسٹر قربان کی لینڈ لیڈی تھی۔ اس نے اس کی بہت تعریفیں کیں، کیونکہ وہ اس کا اور اس کے بچوں کا بہت خیال رکھتی تھی۔ جب بھی ماسٹر قربان سال دو سال کے بعد وطن آتا تھا، تو اُس کے ہاتھ تحفے تحائف اور بچوں کے لئے کپڑے اور کھلونے بھیجا کرتی تھی۔ بلکہ وہ کبھی ماہوار ان کو منی آرڈر بھیجتی تھی۔ اس نے کہا کہ ایسی نیک عورت شاید سارے جرمنی میں کوئی اور نہ ہوگی۔ اب اسی بات کو دیکھ لیں کہ ماسٹر قربان کا جنازہ لے کر خود آرہی تھی۔ جب کہ اس عمر کی عورتیں تو ہمارے ملک میں چلنے پھرنے سے بھی لاچار ہو جاتی ہیں۔

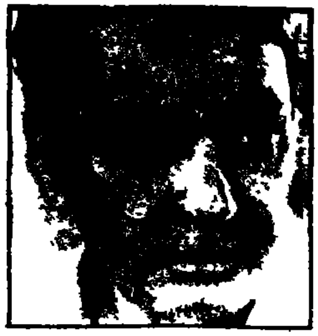
جنازہ پہنچا، تو میں نے دیکھا کہ مارتھا پینتیس چالیس برس کی عورت تھی جو غالباً میری سابقہ سکریٹری کی بیٹی اور ماسٹر قربان کی منکوحہ بیوی تھی وہ مبارکہ سے گلے لگ کر بے حد روئی اور اس نے مجھے کہا کہ صرف مبارکہ اس کے غم کو پوری طرح سمجھ سکتی تھی۔ کیونکہ وہ ماسٹر قربان کی بہن تھی، جسے اس کا مرحوم میاں بہت عزیز رکھتا تھا اور ساری عمر اس نے نوجوانی میں بیوہ ہو جانے والی بہن اور اس کے یتیم بچوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کئے رکھا تھا۔ وہ ان کی ایک ایک خواہش پوری کرتا تھا اور سال دو سال کے بعد ضرور گاؤں کا چکر لگاتا تھا، تاکہ ان کی دیکھ بھال میں کوئی کوتاہی نہ ہونے پائے۔

سارا گاؤں جنازے میں شریک ہوا۔ مولوی سعید سب سے آگے آگے تھا۔ پتہ چلا کہ وہی قبرستان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ یورپ میں فوت ہو جانے والوں کی لاشوں کو گاؤں میں واپس لانے کی ایجنسی بھی اُس نے کھول رکھی تھی، اور وہی قبروں کو پختہ کرواتا تھا اور ان پر سنگ مرمر کے کتبے لگواتا تھا۔ اس نے ایک مالی ملازم رکھا ہوا تھا، جو پودوں کو لگاتا اور انہیں پانی دیتا تھا۔ فرمائش پہ قبروں پر حجرے اور باقاعدہ مقبرے بنانے کا انتظام بھی موجود تھا۔ بر تھ ڈے پر یا دوسرے تہواروں پر قبروں کو پھولوں سے سجانے اور ان کو معطر پانی سے غسل دینے کا انتظام کیا جا سکتا تھا۔ ایک حافظ قرآن کی خدمات حاصل کر لی گئی تھیں، جو مخصوص دنوں میں قبروں پر تلاوت کرتا تھا۔

مارتھا ہفتہ بھر گاؤں میں ٹھہری رہی اور میں بطور مترجم کے اکثر وقت اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ مجھے اس بات پر کس قدر حیرت ضرور ہوئی کہ ماسٹر قربان کی بہن مبارکہ، جو جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے سال ایک بچہ جنتی رہی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ ہمارے رسوم و رواج کے بارے میں بہت زیادہ نہ جانتی تھی اور نہ ہی اپنے عیسائی اخلاقی اقدار کو ہم پر ٹھونسنا چاہتی تھی کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہاں بیوہ عورتوں کا اپنے خاوندوں کے مرجانے کے بعد بچے جننا معیوب نہ سمجھا جاتا ہو۔ دوسری طرف مبارکہ کو جرمن عورتوں کی صحت مندی

[باقی صفحہ ۲۵ پر دیکھئے]

ہم عصر نظمیں



محمد علوی

شاعرنامہ

عمر بھر غالب نشہ کرتے رہے
آپ کہیے آپ کیا کرتے رہے
قرض لے کر میر اک عطار سے
مرتے دم تک سود ادا کرتے رہے
کون سودا، وہ تو اک سودائی تھے
دوستوں سے بھی لڑا کرتے رہے
اور تو کچھ کر نہ پائے ذوق پر
شاہ کے حق میں دعا کرتے رہے
اور مومن خاں بتوں سے رات دن
بے وفائی کا گلہ کرتے رہے
جسم پر اردو کے دھبے تھے بہت
داغ دھبوں کو جدا کرتے رہے
مرتبہ اقبال کا کچھ کم نہیں
شاعری کو فلسفہ کرتے رہے
فیض گھر میں بھی رہے تو کیا رہے
جیل کا ہی تذکرہ کرتے رہے
شہر کی گلیوں میں ناصر کاظمی
اپنی ہی دھن میں پھرا کرتے رہے
میں تو عاشق ہوں ظفر اقبال کا
جو غزل کو برہنہ کرتے رہے
کون علوی، وہ تو بیکار ہیں
ان سے مت پوچھو کہ کیا کرتے رہے

ہارٹ پیشنٹ

بہت کام کرنے ہیں مجھ کو
لیکن وقت بہت کم ہے
یوں لگتا ہے جیسے بدن میں
دل کی جگہ ٹائم بم ہے!

نئی نسل کے نام

کہنے کو اب کچھ بھی نہیں
اب کیا شعر کہیں گے ہم
جو بھی کہا اس کے سائے
آپ کے شعروں پر پڑتے
دیکھ کے خوش ہو لیں گے ہم

ہم وہاں ہیں

روز شام کو
باغ کے
ایک گوشے میں
کچھ بوڑھے
آ بیٹھتے ہیں!
تھوڑی دیر
ایک دوسرے کو
قریب پا کر
خوش ہوتے ہیں
اور پھر
خود سے بھی دور
جا بیٹھتے ہیں!!

آخری نظم

اب کیوں میں باقی ہوں
اور میں خود سے جوجھ رہا ہوں

۷۔ آر سی۔ کارنر، نزد گجرات کالج، ایلس برج ۔ احمد آباد



ابواللیث جاوید

آزاد روڈ چندواڑہ۔ مظفر پور۔ ۸۴۲۰۰۱

بارش

بادل کی گھن گرج سن کر ہی میں نے اپنا سفر ملتوی کر دیا تھا اور اس اجنبی کا مہمان ہو گیا تھا۔ جس کی آنکھوں میں مجھے بڑی گہرائی تک انسانی ہمدردی اور دوستی کا جذبہ نظر آیا تھا۔

وہ زیر لب مسکرایا تھا۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ مٹیالے بادل بڑی تیزی سے رواں تھے۔ سارا آسمان بادلوں سے بھرا تھا۔ کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی اور آسمان کے اس رنگ نے شام کی تاریکی میں اور دبیز اندھیرا گھول دیا تھا۔ بڑا ہی بھیانک منظر تھا۔ ہر طرف کالے کالے بادلوں اور سائیں سائیں کرتی ہواؤں کا شور تھا۔ کوئی بھی چیز واضح نہیں تھی۔ ایک عجیب مبہم مبہم سا سماں تھا۔ سامنے کی چیز کبھی دکھائی دیتی تھی اور کبھی نہیں بھی۔ چیزوں کا وجود اپنے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان معلق سا ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے بھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہوں اور کبھی لگتا تھا نہیں ہوں۔ ہونے اور نہیں ہونے، کی اس کیفیت نے ایک اضطراری رنگ سارے آسمان پر پھیلا دیا تھا۔ جس میں سانس لیتے ہوئے سارے جاندار کیڑے مکوڑے کی طرح رینگ رہے تھے۔ اور ان کا کوئی اپنا رنگ نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے آسمان کی طرف سے نظریں پھیر لیں کہ مجھ میں ان تمام بدلتے رنگوں اور بدلتی کیفیتوں کا اپنے دل پر کوئی اثر لینے کی سکت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی ——

"آپ رات یہیں گے۔ ؟"

"اب تک میں نے یہ کیا ہی کیا ہے کہ آج رات ..... میں اپنی گستاخی پر نادم تھا۔

"جی —— وہ یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ ....،

"تمہارے چاہنے سے کیا ہو گا۔ جب میرا مقدر ہی رات ٹھہری تو اندھیروں کی کوکھ میں جو کچھ میرے لئے دھرا ہو گا مجھے مل ہی جائے گا۔ تم کون ہوتے ہو میرے اور رات کے درمیان ....."

"معاف کیجئے، آپ چاہیں تو کمرے میں روشنی کا انتظام ہو سکتا ہے۔"

"روشنی —— ! ارے بھئی اس اندھیرے میں روشنی کا تصور ہی میرے لئے کافی ہو گا۔ تم کہاں زحمت کرو گے۔ بس آرام کرنے کی تھوڑی سی جگہ اور کچھ نہیں۔"

"بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ آپ کو تو کچھ لینا ہی ہو گا۔ اور پھر میں اپنے لئے تو روشنی کروں گا ہی۔"

روشنی —— روشنی !

اور جب میں ہال میں داخل ہوا تو ساری چیزیں روشن روشن تھیں میرا میزبان سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

میں دن بھر کی مسافت کے سبب بے حد تھکا ہوا تھا۔ میری آنکھیں تھکان کی وجہ سے ڈھکی جا رہی تھیں، میرے میزبان نے میری حالت دیکھ کر مجھے آرام کرنے کی صلاح دی۔

اور جب میں پلنگ پر گرا نیند کی گہری وادیوں میں کھوتا چلا گیا ——

نیلی جھیل کے بیچوں بیچ نیلی آنکھوں والی جل پری مجھے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ میں شکارہ پر تنہا بیٹھا چاند کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے تھا مجھے چاندنی راتوں میں چاند کی طرف دیکھنا بڑا ہی بھلا معلوم ہوتا ہے ایسا لگتا ہے چاند کی ساری شیتل کرنیں آنکھوں کے راستے میرے اندر سما گئی ہیں اور میرا سارا وجود روشن سا ہو گیا ہے۔ ایسے ہی مجھے کوئی بھی اپنی طرف راغب کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جھیل کے مدھم بہتے ہوئے پانی کی سطح پر شکارہ دھیرے دھیرے ہلکورے

سے رہا ہے۔ میں چاند کی طرف بڑی محویت سے دیکھ رہا ہوں۔ کبھی کبھی جھیل کی سطح ساکت بھی ہو جاتی ہے اور میں چونک کر اس جل پری کی طرف دیکھ لیتا ہوں جو مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی ہوتی ہے —

"چلو چلو چلیں، چاند کے پار چلیں"

دور سے کوئی نغمہ ابھرا اور ہوا کا جھونکا چاند کی طرف رواں ہو گیا میں ہوا کے دوش پر تھا۔ چاند قریب معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کی طرف پھیلا دیئے اور کرنوں کو سمیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔

جل پری جھیل میں کھڑی میری طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی اب ہواؤں میں بادلوں کے قافلے بھی شامل ہو گئے تھے۔ گھنے اور کالے بادلوں نے چاند کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ میں نے مایوس ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں کو سمیٹ لیا۔ پھر ہوا کے جھونکوں میں پانی کی بوندیں بھی شامل ہو گئیں جو میرے چہرے پر بے رحمی سے وار کرنے لگیں۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو سارا ہال تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور پانی کی سرد بوندیں اب میرے رخساروں کو تر کئے جا رہی تھیں۔ میں پلنگ سے نیچے اُتر کر چھت سے ٹپکنے والی بوندوں کا اندازہ کرنا چاہتا تھا تو تاریکی میں سب کچھ گم تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے ہر قدم رکھتے ہوئے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں کھڑا ہو گیا۔ پلنگ پر پانی کی بوندیں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں

میں نے پلنگ کو ہال کے بیچ میں بڑی دھیرے سے آہستے کی طرف کر دیا پھر میں نے آنکھوں کے ساتھ بستر کی گود میں سمائی۔ خوابوں کے سلسلے پھر شروع ہو گئے۔ مگر رات کا مدل تک نیل ہو تا رہا، دورحالات کے شکنجے مجھ پر سخت سخت تر ہوتے رہے ساری ماحول میں مصلحتی آمد جاری رہی اور صداقت کی دھجیاں اُڑتی رہیں۔ حقیقت ... ہر کسی سقراط کا منتظر رہا مگر ہر طرف الٹی موت کی گشت کرتی رہی۔ دور دور تک تاحد نگاہ کٹ دھوپ تھی اور ... سے العطش العطش کی آوازیں آتی رہیں کوئی آواز ... شعب کے کڑے پہرے تھے۔ دریاؤں کا کنارا ... قید کر ... گئے تھے ایک عجیب سا منظر تھا۔ آسمانوں سے

خون کی بارش ہونے لگی تھی اور بھوکے پیاسے لوگوں کی خشک زبانیں ہوا میں لہرانے لگی تھیں۔ بوندوں کی ضرب میں نے بھی محسوس کی۔ سرد سا لہو میرے پورے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ یا خدا! میں کس کا قاتل ہوں۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور بے اختیار اپنے چہرے کو ٹٹولنے لگا۔ پھر اپنی ہتھیلی پر پھیلے خون کے دھبوں کو اندھیرے میں دیکھنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ میرے بستر پر کسی کا سرد سرد لہو ٹپک رہا تھا۔ میں ایک بار پھر پلنگ سے نیچے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اندھیرا اتنا دبیز تھا کہ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا اتنے اچھے خاصے پختہ ہال کی چھت شاید ٹپک رہی تھی۔ اتنے بڑے ہال میں میں ہی تن تنہا تھا۔ میرے میزبان نے مجھے رات بسر کرنے کی ساری سہولتیں مہیا کر کے اطمینان کا سانس لے رکھا تھا۔ میں اس اندھیری رات میں کس کو آواز دیتا، کس کو پکارتا کہ میں کسی کو جانتا بھی تو نہیں تھا۔

سارا ماحول میرے لئے اجنبی تھا۔

میں نے پلنگ کو پھر دوسرے کونے کی طرف سرکایا کہ شاید مجھے عافیت نصیب ہو جائے۔

میں بستر پر پڑا بے بسی کے عالم میں دیر تک چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے .... میں خاردار جھاڑیوں کے جنگل میں تھا ہر طرف نوکیلے کانٹے ہی کانٹے تھے۔ دور دور تک ہریالی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ راستوں پر بے شمار قدموں کے نشانات پڑے ہوئے آسمان کا منہ تک رہے تھے۔ اپنے چاروں طرف کسی کو نہ پا کر ایک عجیب بھیانک سی تنہائی کا احساس ہوا۔ میں نے بڑی سراسیمگی کے عالم میں اپنے چاروں طرف ڈری ڈری نگاہوں سے دیکھا کوئی جاندار نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر چاروں طرف سے سسکیوں کی دبی دبی آوازیں اُبھر رہی تھیں، ڈوب رہی تھیں ایک عجیب سا طلسماتی ماحول معلوم ہو رہا تھا۔ میں زور سے چلایا —— کون ہے —— سارا جنگل گونج اٹھا —

کون ہے .... کون ہے .... کون ہے ...... ! !

میں تیز تیز قدم اُٹھانے لگا۔ تمام راستوں پر نوکیلے کانٹے تھے میرے تلوے لہولہان ہو گئے۔ درد کی لہریں میری رگ رگ میں گشت کرنے لگیں۔ میں کراہنا چاہتا تھا مگر میری آواز میرا ساتھ نہیں

[باقی صفحہ ۲۵ پر دیکھئے]



کاوش بدری

یہ عجوبہ ہے نہ یہ نادرہ گفتاری ہے
سر بہ سر تلخ حقائق کی فسوں کاری ہے

زندگی خواب ہے، تعبیر سے ناواقف ہوں
نہ ہو توفیق تو ہر کام میں دشواری ہے

آخری سانس کا احساس کہاں ہے ہم کو
روز و شب تیرے مقابل کوئی سرشاری ہے

نہ خوشی کی ہے خوشی اور نہ غم سے کوئی غم
مشکل آسان بھی ہو جائے تو بے زاری ہے

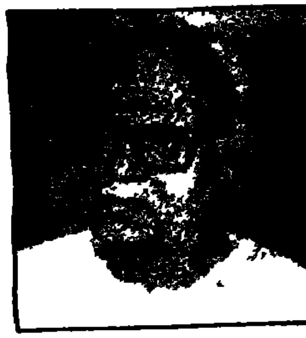
زہر قاتل ہے بہت علم و فراست کا غرور
سچ اگر پوچھو تو اخلاق ہی معیاری ہے

نہ فصاحت، نہ بلاغت، نہ تاثر، نہ کمال
جس کو فن پارہ سمجھتے ہیں وہ بازاری ہے

خود علاج اس کا نہیں حضرت لقماں کے پاس
جان لیوا تو فقط، وہم کی بیماری ہے

ہے عطا اشرفی داغ جگر کاوش کو
بند آنکھیں ہیں، نگاہوں کا سفر جاری ہے

● ۲۳- کانگا نا کیا نیو اسٹریٹ، ایمبور - ۶۳۵۸۰۲



قیصر شمیم

شکستہ خواب کے ملبے میں ڈھونڈتا کیا ہے
کھنڈر کھنڈر ہے یہاں دھول کے سوا کیا ہے

نظر کی دھند میں ہیں بھولی بسری تصویریں
پلٹ کے دیکھنے والے، یہ دیکھنا کیا ہے

ابھی تو کاٹ رہی ہے ہر ایک سانس کی دھار
اجل جب آئے تو دیکھوں کہ انتہا کیا ہے

رہے گی دھوپ مرے سر پہ آخری دن تک
جواں ہے پیڑ مگر اس کا آسرا کیا ہے

تجھے پسند کہاں حال پوچھنا میرا
تری نگاہ میں لیکن سوال سا کیا ہے

دھواں نہیں، نہ سہی آگ تو نظر آئے
یوں چپکے چپکے سلگنے سے فائدہ کیا ہے

اداس رات کی خاموشیوں میں اے قیصر
قریب آتی ہوئی درد کی صدا کیا ہے

● ۱۰- ہیم گھوش لین (شب پور) ہاوڑہ — ۷۱۱۱۰۲



عقیل شاداب

جسم و جاں کے آزاروں سے مت ڈرنا
پھول سے لوگو! تم خاروں سے مت ڈرنا

افواہوں کی عمر بہت کم ہوتی ہے
جھوٹے سچے اخباروں سے مت ڈرنا

اُگتا سورج شام کو ڈھل بھی جاتا ہے
سایوں کے ان ویساروں سے مت ڈرنا

ہار جیت کیول آنکوں کا کھیل نہیں
اتنے کم اتنے ساروں سے مت ڈرنا

اپنے اندر تم کو زندہ رہنا ہے
اپنے باہر کے واروں سے مت ڈرنا

ایک ہی نکتے پر یہ گردش کرتے ہیں
چھوٹے بڑے ان پرکاروں سے مت ڈرنا

● برج راج پورہ، کوٹہ ۔ ۳۲



پرویز یداللہ مہدی
۲۶-۵، چوتھا منزلہ، مرام، باندرہ ڈاسیلے، بمبئی -۵۱

بغلی گھونسے

[حکیموں اور طبیبوں سے معذرت کے ساتھ]

یوں تو اخبارات میں آئے دن شائع ہونے والے اشتہارات کی بھرمار میں، ہر اشتہار، اشتہا انگیز ہوتا ہے لیکن جو اشتہار اشتہا انگیز ہونے کے ساتھ اشتعال انگیز بھی ہوتا ہے اس کا تعلق نہ تو ملبوسات سے ہے نہ ماکولات سے، نہ مشروبات سے اور نہ دیگر مقبول عام مصنوعات سے۔ بلکہ علوم و حکمت عرف معقولات سے ہے یا سیدھے سیدھے یوں سمجھئے کہ براہ راست سہاگ رات سے ہے نتیجتاً جہاں یہ شادی کے طلبگار اور شادی سے بیزار دونوں طرح کے قارئین کی توجہ بیک وقت اپنی طرف کھینچتا ہے وہیں ہر چھوٹے بڑے معیاری، غیر معیاری اخبار میں اپنی بلا ناغہ اشاعت کے سبب اس امیر کی جانب بھی اشارہ کرتا ہے کہ اپنے ملک میں اشیائے خورد و نوش کی بھلے ہی قلت ہو، اشتہاری حکیموں اور طبیبوں کی کوئی کمی نہیں بلکہ وافر مقدار میں ان کا اسٹاک موجود ہے۔ گویا صرف حکماء اور اطباء کے حق میں اپنے ملک کی مٹی بہت زرخیز ہے اس لئے ان کی رفتار پیدائش بھی دگنی تیز ہے

مذکورہ اشتہار بالعموم اس شاہ سرخی کے ساتھ شائع ہوتا ہے "خودکشی نہیں شادی کیجئے"۔ سرخی مذکور فصاحت، بلاغت سلاست اور معنویت پوشیدہ ہے اس کی داد صرف بالغ ذہن دانشور حضرات ہی دے سکتے ہیں۔ کہ یہ معمولی سرخی اصل میں کھلم کھلا اعلان فرق ہے ... زندگی کہ ... رنے والوں کے خلاف ایک زبردست سازش ... دیکھئے تو سرخی مذکورہ اشتہاری حکیموں اور طبیبوں کا ... کردہ ... کوڈ ہے۔ جیسے ... اسے اصلی مفہوم کے ساتھ ... ہے کہ خودکشی نہیں، شادی کیجئے۔ ایک ہی بات ہے۔ گویا ان پیشہ ور حضرات کی نظر میں خودکشی اور شادی دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں ــــ ویسے مذکورہ اشتہار صرف اسی شاہ سرخی کے ساتھ شائع نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھار دوسری رجسٹرڈ اور پرمننٹ سرخیاں بھی منہ کا مزا بدلنے کیلئے استعمال کی جاتی ہیں جیسے

- "شادی سے پہلے، شادی کے بعد ــــ
- نہ منہ چھپا کے جیو، اور نہ سر جھکا کے جیو
- مایوس نوجوانو! مایوسی کفر ہے
- گزری ہوئی بہار، رو ٹھی ہوئی جوانی پھر واپس ــــ"

وغیرہ وغیرہ تاہم سرخی چاہے کوئی ہو ان مخصوص اشتہارات کا مقصد، منصب اور مدعا چونکہ ایک ہوتا ہے لہٰذا ان کا نفس مضمون بھی قریب قریب ایک ہوتا ہے۔ صرف سرخی اور جاری کنندہ کا نام اور پتہ بدلتا رہتا ہے۔ گویا ؎

تحریر وہی رہتی ہے فقط تصویر بدلتی رہتی ہے

کبھی یہ دلی کے حکیم بے بدل حضرت خبیث دہلوی ماہر امراض خبیثہ مالک کامیاب علاج دواخانہ کی طرف سے جاری ہوتا ہے تو کبھی طبیب دوراں حکیم زماں شری دھتورا نند فتورا نند گھاس منڈی والا مالک "امید کی کرن کلینک" کی جانب سے شائع ہوتا ہے

اتفاق سے کچھ عرصہ پہلے ہمیں ایسے ہی ایک اشتہاری حکیم صاحب کے دیدار کا شرف حاصل ہو چکا ہے تاہم اس دیدار کا سبب خدانخواستہ کوئی پوشیدہ آزار نہیں تھا۔ اصل میں مذکورہ حکیم صاحب ہمارے ایک شناسا کے قریبی ہمسائے ہوا کرتے تھے اور حسن اتفاق سے ہمارے شناسا کا غریب خانہ اس قدر مختصر تھا کہ اس میں خود اہل خانہ کی سمائی مشکل سے ہوتی تھی۔ لہٰذا حقوق ہمسائیگی کی دہائی دیکر کمال ہشیاری سے حکیم صاحب کے "دواخانے" کو اپنے "دیوان خانے" کے طور پر استعمال کرتے

تھے ۔ حکیم صاحب موصوف آدمی ویسے خاصے چرب زبان تھے اور نام بھی ان کا خمیرۂ گاؤزبان سے ملتا جلتا تھا۔ لیکن محلے بھر میں بغلی گھونسے کے نام سے مشہور تھے ۔ بغلی گھونسے کی یہ انوکھی عرفیت دراصل ہمارے شناسا ہی کی دماغی اپج کا نتیجہ تھی وجہ تسمیہ اس کی یہ تھی کہ حکیم صاحب کا مطب عین ان کے گھر کی بغل میں تھا ۔ دوسرے ہمارے شناسا کی ناخوشگوار ازدواجی زندگی میں میاں بیوی کی آپسی رنجشوں اور چپقلشوں سے زیادہ حکیم صاحب کے مجرب نسخوں اور حکیمی چٹکلوں کا عمل دخل تھا بغلی گھونسے کی مناسبت سے موصوف کے مطب کا موزوں ترین نام صرف اکھاڑہ ہی ہو سکتا تھا لیکن اس طرف غالباً کسی کا دھیان نہیں گیا ویسے موصوف کے دواخانے کا جو اوریجنل نام تھا وہ بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں تھا نام کیا تھا اچھا خاصا اشتہار تھا۔ کیونکہ پوری دو سطروں پر محیط تھا یعنی "آپ کے مطلب کا واحد مطب عرف تیر بہدف علاج کا واحد مرکز۔" لیکن افسوس اس دو سطری جملہ معترضہ کے باوجود مطب کے اس واحد مطب میں اکثر و بیشتر یا تو کتے لوٹتے دکھائی دیتے یا خود حکیم صاحب موصوف کبھی کبھار، تھوڑا بہت مرجوعہ دکھائی بھی دیتا تو اس میں ہمارے شناسا کے دوست واحباب اکثریت میں اور حکیم صاحب کے مریض اقلیت میں ہوتے اور ظاہر ہے اکثریت کے ہاتھوں ان کا بھی وہی حشر ہوتا جو کہ اقلیتوں کا مقدر رہے (سچ ہے اقلیتیں چاہے کسی ملک کی ہوں یا مطب کی اکثریت کی من مانی کے آگے ان کی ایک نہیں چلتی) بہرحال بات حکیم صاحب کی ہو رہی تھی ۔ اور ہم خواہ مخواہ اقلیتوں کا رونا لے بیٹھے ـــ ابتداء میں موصوف نے ہمیں بھی اپنے حکیمی داؤ پیچ میں پھانسنے کی بھرپور کوشش کی تھی یعنی ایک مرتبہ تنہا پا کر ہمارے عزت وناموس پر اس شعر کی آڑ میں دھاوا بول دیا ؎

یہ اڑی اڑی سی رنگت ، یہ بجھا بجھا تبسّم
تری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

لیکن جواب میں ہم نے یہ کہہ کر ان کا وار انھیں پر پلٹ دیا ـــ" قبلہ! رنگت میری اڑی اڑی نہیں آپ کے چشمہ کا نمبر اتر گیا ہے تبسم میرا بجھا بجھا نہیں آپ کی بینائی بجھ گئی ہے جس طرح ساون کے اندھے کو ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے اسی طرح حکیموں کی قوم کو بھی ہر تندرست شخص مریض ، ہر فریش (FRESH) آدمی فریش نظر آتا ہے۔"

اس کرارے جواب کے بعد موصوف نے پھر کبھی اپنا حکیمی پینترا ہم پر آزمانے کی حماقت نہیں کی البتہ ایک مرتبہ خود ہم نے باتوں باتوں میں ان کا انٹرویو لے ڈالا جس کا خلاصہ معلومات عامّہ کی خاطر پیش ہے ۔ تاکہ سند رہے اور آئندہ اشتہاری حکیموں کے بارے میں وقت بے وقت کام آوے ۔

ہمارا پہلا سوال تھا ـــ" آپ جسے حکمت کہتے اور سمجھتے ہیں اسے آپ نے سیکھا کہاں ہے ـــ؟ اس فن میں آپ کا استاد کون ہے ـــ"؟

گمبھیر لہجے میں بولے ـــ" حکمت کوئی فن سپہ گری یا فن رقص و موسیقی نہیں ہے کہ جسے ہر ایرا غیرا ، تھوڑی سی کوشش جستجو اور مشق سے سیکھ کر ماہر فن ہونے کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے ۔ حکمت اور طبابت تو عطائے خداوندی ہے ۔ برخوردار! ہر کس و ناکس اس عطا کا حقدار نہیں ہوتا ۔ جس طرح بعض بڑے شعراء تلامیذ الرحمٰن ہوتے ہیں ۔ اسی طرح کامل حکیم بھی تلامیذ الرحمٰن ہوتے ہیں ۔ یہ میری خوش نصیبی اور خدائے ذوالجلال کا بے پایاں کرم ہے کہ اس عاصی پُرمعاصی کو عطائی حکیموں کے خوش نصیب گروہ میں پیدا کیا ۔ اس کے باوجود مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ جہاں تک استادی شاگردی کا معاملہ ہے میں کسی حد تک ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کو اپنا غائبانہ استاد مانتا ہوں ـــ!"

ہم نے حیرت سے پوچھا "آپ کے یہ استاد ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کیا کوئی مشہور حکیم ہیں ـــ"؟

ہڑبڑا کر بولے ـــ" ہیں نہیں برخوردار تھے ـــ تعجب ہے آپ ادب کے آدمی ہو کر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کو نہیں جانتے ۔ جنھیں انگریزی سرکار نے "سر" اور مولویوں کے دربار نے "علامہ" کے خطاب سے سرفراز فرمایا تھا۔"

اس دھماکہ خیز انکشاف پر ہم نے گڑبڑا کر کہا ـــ" آپ کلیات اقبال والے "علاّمہ اقبال" کی بات کر رہے ہیں"؟

مسکرا کر بولے ـــ" جی ۔ کلیات اقبال والے بھی ، اور بانگ درا ، ضرب کلیم اور بال جبریل والے بھی۔"

ہم نے متحیر لہجے میں کہا ـــ" مگر قبلہ! علاّمہ اقبال تو فلسفہ کے ڈاکٹر تھے ۔ بہت بڑے شاعر تھے ان کے بارے میں یہ بات نہ کہیں پڑھی نہ سنی کہ وہ حکیم بھی تھے اور باقاعدہ مطب

چلاتے تھے۔"

ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔" یہی تو اس صدی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ برخوردار! مرحوم کی تمام تر حکمت ان کے فلسفے اور شاعری کے نیچے دب گئی ہے، ذرا سوچو اگر مرحوم صرف شاعر ہوتے تو ملک و قوم کا ایک بہت بڑا طبقہ انھیں "حکیم الامت" کے لقب سے کبھی نہیں پکارتا۔ افسوس محض شاعری کا چکر مرحوم کو حکمت کے باعزت پیشے سے دور لے گیا۔ ورنہ مشرقی حکمت کو بلاشبہ ایک اور حکیم اجمل خاں مل گیا ہوتا۔ تاہم مرحوم چونکہ بنیادی طور پر ایک حکیم کا ذہن رکھتے تھے اس لیے ان کے کلام میں حکمت کے روزمرہ نسخے منظوم صورت میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں بس دیکھنے والی نظر چاہیے۔"

بغلی گھونسوں کے تعلق سے اگرچہ یہ بات دعوے کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ یہ پیشہ ور حضرات علاج و معالجہ کے معاملے میں کچے کھلاڑی ہوتے ہیں یا نرے اناڑی لیکن زبانی دعویٰ دائر کرنے میں سرتاپا ماہر ہوتے ہیں۔ اور دعوے بھی ایسے کفن پھاڑ، تنبو اکھاڑ کہ اگر قانون کی رو سے بلند بانگ دعوے کا جرم قابل دست اندازیٔ پولیس ہوتا تو بیشتر اشتہاری حکیم اپنے دواخانوں میں جوشاندے چھاننے، جڑی بوٹیاں پیسنے کے بجائے مختلف جیل خانوں میں چکی پیس رہے ہوتے۔ خیر جہاں تک ان کے تحریری دعووں کا سوال ہے کوئی بھی اشتہار پڑھ جائیے، خواہ مردانہ کمزوری کا ہو یا زنانہ منہ زوری والا اول تا آخر اس میں صرف دعوے ہی دعوے ملیں گے دلیل کہیں نہ ملے گی نمونے کے طور پر چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے مع ان کے اصلی مطالب و مفاہیم کے۔

ایک اشتہاری حکیم صاحب کا باتصویر اشتہار اکثر اخبارات میں شائع ہوتا ہے اسے ہم باتصویر اس لیے کہہ رہے ہیں کہ اس میں خود حکیم صاحب کی تصویر بھی زیور طبع سے آراستہ ہوتی ہے۔ جس میں وہ اپنی نیپل کچھو نما مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے دعویٰ فرماتے ہیں کہ کسی کی مونچھ نیچی نہیں ہونے دیں گے (پہلے ہی علاج کے بعد مریض کی نظریں نیچی ہوتی ہیں تو ہو جائیں) اس دعوے کے نتیجے میں کچھ اس قسم کا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے کسی فلمی سین کی طرح ابھرتا ہے۔ اشتہاری حکیم صاحب کی ڈسپنسری کے آگے مایوس مریضوں کا جم غفیر قطار اندر قطار کھڑا ہے۔ اور امیدواروں کی آمد و رفت اس ترتیب کے ساتھ جاری ہے کہ داخل مطب ہونے والے مایوس امیدواروں کی مونچھیں "چمگادڑوں" کی طرح الٹی لٹکی ہیں۔ اور مطب سے باہر آنے والے امیدواروں کی "مونچھیں" کسی "انڈور، ٹی وی، انٹینا" کی طرح کھڑی ہیں۔ بلکہ مونچھوں کی نوک پر لیموں بھی ٹکے ہوئے ہیں۔ اور سبھی بامراد و شادکام اہل مونچھ کا رخ سیدھے اپنے اپنے "حجلۂ عروسی" کی طرف ہے۔

دوسرے اشتہاری حکیم صاحب اوّل الذکر سے بھی دو جوتے آگے بڑھ کر دوسروں کی ناخوشگوار ازدواجی زندگی کو شرطیہ خوشگوار بنانے کا ٹھیکہ اس دھڑلے اور دعوے کے ساتھ لیتے ہیں جیسے ان کے پاس واقعی کوئی "جادو کی چھڑی" ہے۔ جسے گھماتے ہی تمام مایوس شادی شدہ جوڑوں کی ناکام ازدواجی زندگی پلک جھپکنے میں کانٹوں کے بستر سے پھولوں کی سیج میں تبدیل ہو جائے گی۔

دعویداروں کی اس بھیڑ میں کوئی اس بات کا دعویدار کہ کسی کمسن کو نابالغ، کسی بالغ کو غیر شادی شدہ، اور کسی شادی شدہ کو ناشاد و نامراد نہیں رہنے دے گا۔ نعوذ باللہ کیا دعویٰ ہے۔ خدانخواستہ ایسے دس بیس حکیم اور پیدا ہو گئے تو پھر ملک کے طول و عرض میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی بچہ انگوٹھا چوستا نہ ملے گا۔ جو ملے گا مع بیوی بچوں کے ملے گا ایسے میں جو لاولد جوڑے کسی بچے کو گود لینا چاہیں تو انھیں بچے کے ساتھ اس کے بال بچوں کو بھی گود لینا پڑے گا۔

کچھ حکیم صاحبان بڑے زور و شور سے دس دن میں جوانی کی شرطیہ واپسی کی گارنٹی لیتے ہیں گویا ان کی نظر میں جوانی اور بیرنگ لفافہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بعض حکما ڈنکے کی چوٹ پہ دعویٰ کرتے ہیں کہ بچپن کی نادانی، بیماریوں اور اوائل جوانی کی غلط کاریوں کی وجہ سے عین عالم شباب میں منہ موڑ لینے والے بامراد دنوں اور امنگوں کی راتیں دوبارہ واپس لانے میں ناکام رہے تو طبابت چھوڑ کر حجامت کا پیشہ اختیار کر لیں گے۔

سبحان اللہ کیا دعویٰ ہے۔ لگتا ہے جیسے امنگوں کی راتوں اور مرادوں کے دنوں کا پرائیویٹ اونر لمیٹیڈ بینک کھول رکھا ہے۔ دعووں کی اس یلغار میں چند بھولے بھٹکے ہوئے اشتہاری حکیم

[باقی صفحہ ۱ پر دیکھیے]



حمید الماس

● ۱۱۶۳- اپ اسٹیرس، ۲۶- اے مین بلاک ۹ - جیا نگر، بنگلور- ۶۹

◆

کچھ نہ کچھ روز اگلتی ہے زمیں
اب کہاں مجھ سے سنبھلتی ہے زمیں

جنم دیتی ہے درختوں کو خود
پھر انھیں آپ نگلتی ہے زمیں

نگرانی کہ حفاظت ؟ کیا ہے
میں جو چلتا ہوں تو چلتی ہے زمیں

صاف سنتا ہوں تغیّر کی صدا
کروٹیں جب بھی بدلتی ہے زمیں

ٹوٹ کر کوئی ستارہ جو گرے
مدّتوں غم سے پگھلتی ہے زمیں

حاصلِ حرفِ دعا ہے شبنم
کس لیے صبح سے جلتی ہے زمیں

دل گرفتہ سہی الماس مگر
اس کے نغموں سے بہلتی ہے زمیں

◆

پھر نواحِ دیدہ و دل کا سفر کس نے کیا
اس زمینِ سوختہ کو معتبر کس نے کیا

اس کی شاخوں کو ملی تھی دولتِ برگِ انا
ایسے آسودہ شجر کو بے ثمر کس نے کیا

پھول کی مانند سینے میں مہکتا تھا ضمیر
میری اس خوشبو کو آخر منتشر کس نے کیا

مجھ سے وابستہ رہا ہے جوشِ دریائے فرات
تشنہ کاموں کا مداوا عمر بھر کس نے کیا

نقشِ فکر و نظر میں کچھ کمی سی رہ گئی
اعتماد اس درجہ میرے ظرف پر کس نے کیا

میں نے اس سے مانگ لی تھی نیند شب بھر کیلئے
ساعتِ آسودگی کو مختصر کس نے کیا

اک حمید الماس ہی تم کو بتا سکتا ہے یہ
حرف کو انجم تو لفظوں کو قمر کس نے کیا

◆

پاؤں سے کٹتی نہیں زنجیرِ شب
رات بھر پڑھتا ہوں میں تحریرِ شب

سب کے سب تھے شہر میں روشن نصیب
میں ہی تنہا تھا یہاں نخچیرِ شب

منزلِ تعبیر تک پہنچے نہ خواب
نامکمل رہ گئی تدبیرِ شب

چلتے چلتے جب وہ مدھم پڑ گئی
میرے گھر میں آ گئی تنویرِ شب

تاک میں بیٹھے ہیں کتنے زلزلے
کس سے ممکن ہے بھلا تعمیرِ شب

جل رہا ہے میرے سورج کا بدن
مل رہی ہے کیوں اسے تعزیرِ شب

کام آئیں اس کی شب بیداریاں
بڑھ گئی الماس سے توقیرِ شب

قسط نمبر ۲۱



سربلند پرکاش

۲/۲ بنگالہ آشرم، بنس۔ برگا مارگ، کالبتہ بیلی مسہ ۹۱۸

فسانے

۱۵ فروری ـــــــــــــــــــ

۱۸۴۶ کو راجہ گلاب سنگھ نے اور سکھ سرداروں کے نواب گورنر جنرل کی خدمت میں حاضر ہوا اور اظہار کیا کہ مہاراجہ دلیپ سنگھ خورد سال واجب الرحم و قابل پرورش ہے اور فوج جو خود سر تھی وہ اپنے ارادے سے سرکار انگریزی کے ساتھ لڑنے کو گئی تھی اس وقت اگر کوئی ارکین دربار منع ہے ان کو منع کرتے تو بے شک ان کی جان پر آفت آتی اور سکھ کبھی ان کو زندہ نہ چھوڑتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ایسی تقریروں کا نواب گورنر جنرل بہادر نے جواب دیا کہ سرکار انگریزی مہاراجہ دلیپ سنگھ سے اتحاد و محبت رکھے گی جس طرح اس کے باپ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ تھا اور بدستور اس کو مالک سلطنت سمجھیں گے لیکن تمام علاقہ سرکار لاہور جو دریائے ستلج کے شرقی غربی کنارے دریائے بیاس تک ہے وہ ضبطی میں آکر شامل علاقہ انگریزی میں ہو جائے گا دونوں دریا ستلج اور بیاس سرکار انگریزی کے اختیار میں رہیں گے اور ڈیڑھ کروڑ روپیہ جرمانہ نقد بابت اخراجات جنگ اور خون اس فوج کے اور افسروں کے جو اس لڑائی میں مارے گئے ہیں لیا جائے گا۔ راجہ گلاب سنگھ نے یہ حکم سن کر بہت سے معذرات کئے اور مہاراجہ خورد سال پر رحم کا طلب گار رہا۔ چنانچہ منجملہ ڈیڑھ کروڑ روپیہ میں پچاس لاکھ روپیہ معاف ہو کر ایک کروڑ قرار پایا[1] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۲۰ فروری ۱۸۴۶ کو نواب گورنر جنرل اور لشکر انگریزی لاہور میں داخل ہوئے اور دروازے پر اور قلعہ کے اندر انگریزی سپاہ کے پہرے قائم ہو گئے اور دوآبہ بست جالندھر اور علاقہ میں ستلج متعلقہ سرکار لاہور سے کارندہ اور اہل کار بلائے گئے اور وہ تمام پہاڑی اور میدانی علاقہ سرکار انگریزی کے قبضہ میں آگیا۔ اب ایک کروڑ روپیہ جرمانہ کی تجویز باقی تھی جو سرکار لاہور کے ذمہ بابت خرچہ فوج وغیرہ قرار پایا۔ مگر خزانہ میں اتنا روپیہ موجود نہ تھا۔ اس کے واسطے یہ تجویز قرار پائی کہ تمام علاقہ کشمیر وتبت ولداخ وجموں وغیرہ سے مادھو پور کی حدود تک جس قدر علاقہ زیر قلم سرکار لاہور کے ہے وہ تمام و کمال ایک کروڑ روپیہ میں فروخت

۵۰ لاکھ اس کے علاوہ دیگر شرائط مندرجہ ذیل تھیں ۔

(۱) مہاراجہ اپنی باغی فوج سے ہتھیار لے کر اور ان کے بقایا جات ادا کرنے کے بعد منتشر کر دے گا ۔

(۲) باقاعدہ فوج کی تعداد پیادہ ۲۵ بٹالین (فی بٹالین ۸۰۰) اور گھوڑسوار بارہ ہزار متعین کر دی اس میں اضافہ کرنے کے لئے برطانوی حکومت سے اجازت ضروری قرار پائی ۔

(۳) وہ ۳۶ توپیں جو انگریزی فوج کے خلاف سبراؤں کے مقام پر رکھی گئی تھیں برطانوی حکومت کے حوالے کر دی جائیں گی ۔

(۴) دریائے بیاس اور ستلج مٹھن کوٹ تک اور دریائے سندھ مٹھن کوٹ سے بلوچستان کی سرحد تک برطانوی حکومت کی تحویل میں دے دیئے جائیں گے۔ کپتان پر سے ٹول ٹیکس وصول کرے گی ۔ جو سالانہ حاصل ہوگا اس کا آدھا حصہ لاہور دربار کو دے دیا جائے گا ۔

(۵) اگر کسی وقت برطانوی حکومت کو اپنی فوجیں پنجاب سے گزارنی ہونگیں تو لاہور دربار اجازت اور دوسری سہولتیں مہیا کرے گی ۔

(۶) برطانوی حکومت کی اجازت کے بغیر مہاراجہ کسی برطانوی، یورپین یا امریکن کو ملازم نہیں رکھے گا ۔

(۷) گلاب سنگھ اور لاہور دربار کے درمیان اختلافات کو تصفیہ کے لئے برطانوی حکومت کی منظوری کے بغیر لاہور دربار کی سرحدوں میں تبدیلی نہیں کی جائے گی ۔

اگرچہ برطانوی حکومت نے اس معاہدے میں دلیپ سنگھ کی حکومت کو برقرار رکھنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اسے آزاد سلطنت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی اس کے تقریباً تمام حقوق برطانوی حکومت نے اپنے ہاتھوں میں لے لئے تھے۔ (باقی)

کر دیا جائے اور زرِ ثمن مشتری سے وصول کر کے داخلِ خزانۂ انگریزی ہو ۔۔۔ چونکہ ۔۔۔۔۔۔۔ یہ روپیہ راجہ گلاب سنگھ نے دینا منظور کیا اس واسطے وہ تمام ملک اس کو دے دیا گیا اور مہاراجہ جموں کا خطاب راجہ گلاب سنگھ کو گورنر جنرل بہادر نے عطا کر کے خلعت فاخرہ بخشا اور اس کا علاقہ سرکار لاہور کے علاقہ سے علیحدہ قرار دیا ۔ اگرچہ اس وقت اہالیانِ دربار لاہور نے گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں یہ اظہار کیا کہ راجہ گلاب سنگھ کے ذمہ سرکار لاہور کا ۲۰ لاکھ روپیہ از روئے حساب سابقہ علاقہ مفتوحہ کے واجب الادا ہے وہ روپیہ اس سے وصول کیا جائے اور زرِ جرمانہ میں محسوب ہو اور باقی روپیہ علیحدہ ایک کروڑ روپے کے سرکار لاہور بتقرار اقساط ادا کرے گی مگر نواب گورنر جنرل بہادر نے اپنی عملداری سے پہلے جھگڑے بکھیڑے میں دست اندازی نہ کی اور علاقہ بسیط سرکار لاہور کا اس کے ہاتھ فروخت کر ڈالا اور بڑا حصہ سلطنت کا اس کو دے کر مالک صاحبِ اختیار حاکم بنا دیا ۔۔۔۔ (جب انگریز فوج کوچ کرنے کے لئے تیار ہوئی) لیکن اس وقت بھی اراکین دربار لاہور کو بڑا اندیشہ سکھوں کی طرف سے تھا اور جانتے تھے کہ جب فوج انگریزی لاہور سے جائے گی سکھ بھڑ بیٹھ کر ہم کو قتل کر دیں گے اس واسطے یہ تجویز قرار پائی کہ نو مہینے تک اور انگریزی فوج لاہور میں رہے ۔ نو مہینے میں اراکین دربار اپنا انتظام بخوبی کر لیں گے ۔ صاحبان انگریز نے بصورت اپنے خرچ فوج کے یہ تجویز منظور کی اور انارکلی میں انگریزی فوج کی چھاؤنی قرار پائی ۔ [جاری]

◆ بقیہ صفحہ ۱۷ ۔ بارش ◆

دے رہی تھی ۔

یا الٰہی یہ کیسا عذاب ہے ؟ ۔

میں زخمی پرندے کی طرح دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا دفعتاً ایک اونچے پورے مگر سوکھے درخت کے نیچے سے گزرتے ہوئے میرا سر کسی کے جسم سے ٹکرایا ۔ میری پیشانی پر برف جمتی چلی گئی ۔ میں نے غور سے دیکھا کسی کا مردہ جسم درخت کی شاخ سے بندھا جھول رہا تھا ۔ آگے کا منظر بھی کچھ ایسا ہی تھا ۔ مجھ پر خوف طاری ہو گیا سا اور میں نے آنکھیں کھول دیں ۔ چھت سے پھر پانی ٹپک رہا تھا ۔ میرا سارا بستر شرابور ہو گیا تھا ۔

میں ہال کے فرش پر کھڑا کانپ رہا تھا ۔ ماحول میں گرمی کے باوجود میں سردی سے بری طرح کانپ رہا تھا ۔ رات اپنے پچھلے پہر میں قدم رکھ رہی تھی ۔

تھا اپنی نیند پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی اور ہال کے اندر کسی محفوظ جگہ کی تلاش جاری رکھی تھی ۔ پلنگ ہال کے چپے چپے میں سرکا چکا تھا مگر کوئی جگہ محفوظ نہیں تھی ۔ کہیں بھی جائے امان نہیں تھی ۔ تمام ہی چھت بری طرح ٹپک رہی تھی ۔ اور اب سردی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا ۔ آسمان کے کناروں پر ہلکی ہلکی روشنی کھلنے لگی تھی ۔ باہر مطلع بالکل صاف تھا اور بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی مگر یہاں ہال کے اندر پانی کی داستان تھی اور سردی کا راج تھا ۔

نیند سے میری آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہو رہے تھے ۔ صبح کی آمد کے ساتھ ہی ہال کا بڑا دروازہ چرچرایا اور صبح کی روشنی کی طرح میرا میزبان بھی ہال میں داخل ہوا ۔

"صبح بخیر ——"

"جب شب بخیر نہیں تو پھر صبح کیا بخیر ۔"

"مطلب"

"اسے آپ تمام رات جاگتے رہے ہیں ۔" میرے میزبان نے میرے پلنگ کا بغور جائزہ لیتے ہوا کہا ۔ "معاف کیجئے گا ۔ میرے شریر غلاموں کی یہ شیطانی ہے ۔"

"شیطانی ۔ ؟ !"

جی ہاں ! ان کم بختوں نے آپ کے پلنگ میں بند مچھر دانی کی چھت سے برف باندھ دی تھی جو تمام رات آپ کی نیند کو حرام کرتی رہی ۔" میں حیرت سے اپنے میزبان کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ "جی ہاں ! یہ غلاموں کی ذات بڑی حرامزادی ہوتی ہے ۔ دوسروں کو تنگ کرنے میں انہیں بہت مزہ آتا ہے ۔"

سورج آہستہ آہستہ میری طرف آ رہا تھا ۔ میں نے اپنے میزبان کو متشکرانہ انداز میں دیکھا اور وہ اپنے غلاموں کو گالیاں دیتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا ۔ میں اپنے بوجھل پپوٹوں کو مشکل سے سورج سے آنکھیں ملانے کی کوشش کرتا ہال سے باہر نکل گیا ۔

اور میرا سفر پھر شروع ہو گیا تھا ۔

◆ بقیہ صفحہ ۱۵ ۔ لینڈ لیڈی ◆

پہ رشک آ رہا تھا ، جو ستر اسّی برس کی عمر میں بالکل جوان لگتی تھیں ۔

اس نے کہا کہ اگر اُسے ماسٹر قربان نے نہ بتایا ہوتا کہ اس کی لینڈ لیڈی مارتھا اس قدر عمر رسیدہ عورت تھی ، تو وہ ماننے کے لئے تیار نہ ہوتی کہ مارتھا کسی طریقے سے بھی چالیس برس سے بڑی عمر کی تھی ۔



رعنا حیدری

نوحہ

ہر طرف ٹوٹے ہوئے شیشے سنگریزے ہیں
ایک ہی عکس دکھاتے ہیں
یہ دیکھو۔ تم ہو،
۔ کیا کہیں کس سے کہیں
جبر ہے یہ
یا کہ ہے مرضی کا صلہ
راستوں پر تو بھروسہ نہیں کرتا کوئی
سوچ ہے سوچ پہ اپنی نہیں پہرہ کوئی
اب کہاں جا کے کہیں ہم کو بچالے کوئی
کون اپنا ہے پرایا ہے کون ؟
کون قہار ہے جبار ہے کون ؟
کون سفاک ہے شاطر ہے کون ؟
کس سے بے رحمی کی ذلت کا سبب پوچھیں گے
سب ہی انسان نما ہیں کوئی انسان نہیں
زہری زہر ہے اب خون میں شامل اپنے

● اجنتا کلینک، جے سنگھ پورہ، اورنگ آباد (مہاراشٹر)



شمینا نازی

اندیشہ

مجھے مت چھوؤ
واقعی اتنی نازک ہوں میں
ہاتھ لگتے ہی چھن سے بکھر جاؤں گی
پھر بہت رنج ہوگا تمہیں
ایک سکتہ لگے یا کہ پھر
مجتمع کر کے اپنے حواسوں کو تم
چند کاغذ کے ٹکڑوں پہ مجھ کو اٹھانے کی کوشش کرو
اس جتن سے سمیٹو
کہ میں اپنے ریزوں کی خوش فہمیوں میں رہوں
اور تم انگلیاں اپنی کٹنے نہ دو
پر تمہیں کیا پتہ
خوش گمانی کی سرحد سے آگے کہیں
اک کٹیلا سا ذرّہ اگر رہ گیا
پاؤں میں چبھ گیا
تم توازن بنانے کی کوشش میں گرتے چلے جاؤ گے

● ۲۸ - اے، رپن لین، کلکتہ - ۱۶

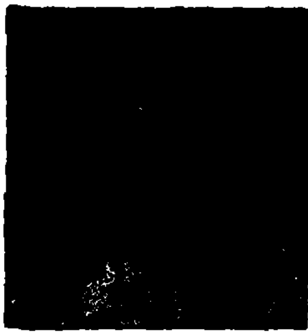


کنیز فاطمہ

پل صراط

اپنی نیکی بدی
علم و دانش، ہنر
اور
تقدسِ انا
غیرتِ ذات کی ریزہ کاری عبث
ذات سے ذات تک حدِ فاصل کا کرب
محورِ ذات پر بوجھ سا ہے سبب
فہم و ادراک کے غار میں کتنی پرتوں میں لپٹا صحیفہ
کہ جس کی سبھی نارسا آیتیں
نطق کے کوہساروں پہ خاموش ہیں
بے بسی
منتظر ہے کہ کوئی مدار
پھر انھیں کوہساروں سے آہنگ دے
محورِ ذات پر
ساری پرتوں میں لپٹے صحیفے کی سب آیتیں
یک بہ یک گونج اٹھیں
سارے کوہسار جل جائیں
محورِ ذات کی گردشیں
جسم اور روح کے پل صراط
جن سے ہر لمحہ خود کو گذرنا پڑے
ٹوٹ جائیں کہ کچھ بھی نہ باقی رہے۔

● معرفت، بشر نواز، محلہ گھاٹی، اورنگ آباد



افتخار بیگم صدیقی
ریڈر شعبۂ اردو ذاکر حسین کالج، دہلی

کہانی کی تلاش

معاف کیجئے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو کس کی تلاش ہے جو اس طرح متلاشی نگاہوں سے ہر آنے جانے والے کے چہرہ کو دیکھ رہے ہیں۔ کیا کہا؟ آپ کہانی کار ہیں اور اپنی نئی کہانی کیلئے دلچسپ مواد کی تلاش میں ہیں۔ یہ کون سا مشکل کام ہے۔ آپ میرے ساتھ آیئے میں آپ کو ایسی جگہ لے چلوں جہاں قدم قدم پر کہانیاں بکھری ملیں گی۔ دل ہلا دینے والی کہانیاں۔ نیند اڑا دینے والی کہانیاں۔ رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیاں۔ نہیں نہیں اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ نہ ہی آپ کو میرا شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت ہے۔ کون سا مجھے کسی دفتر میں ڈیوٹی دینا ہے یا کسی اسکول میں کلاس لینا ہے کہ دیر ہو جائے گی۔ میں بھی تو دن بھر سڑکیں ناپتا رہتا ہوں۔ مجھے نوکری کی تلاش ہے آپ کو کہانی کی۔ خیر چھوڑیئے اس غیر دلچسپ موضوع کو۔ آیئے آپ کو اس سامنے والی کھولی میں لے چلوں۔ معاف کیجئے آپ کو ذرا جھک کر کھڑا ہونا پڑے گا کیونکہ یہاں کی چھتیں اس گستاخی کو نہیں برداشت کر سکتیں کہ یہاں آنے والا سر اٹھا کر کھڑا ہو۔ یہاں سب کو سر ہی جھکا کر رہنا پڑتا ہے۔ پھر ہمارا مذہب ہماری روایات بھی تو ہم کو یہی سکھاتی ہیں کہ جس نے سر اٹھایا وہ کچلا گیا اس لئے سر کو ہمیشہ جھکا کر رکھو۔ آیئے سامنے دیکھئے وہ بوریئے پر پانچ نیم برہنہ بچے پڑے ہیں انہیں دیکھ رہے ہیں نا؟ جی۔ نہیں! یہ اکیلے نہیں رہتے۔ ان کے ماں باپ بھی ساتھ رہتے ہیں۔ کچھ دن پہلے تک ان کا باپ ایک مل میں مزدوری کرتا تھا۔ دال بھات کھا کر اور موٹا جھوٹا پہن کر گزر ہو جاتی تھی۔ بچے قریب کے میونسپلٹی کے اسکول میں پڑھنے جاتے تھے۔ بیوی گھر میں چولہا چوکا کرتی تھی۔ پھر ایک دن ان کی کہانی کلائمکس کو پہونچ گئی۔ باپ، جو ایک روز مشین پر کام کر رہا تھا، اچانک اس کا پیر پھسلا اور اس کی دونوں ٹانگیں مشین میں آگئیں۔ لوگ تو سمجھے کہ ختم ہی ہو گیا ہوگا مگر آپ تو کہانی کار ہیں، جانتے ہیں کہ کہانی میں کبھی کبھی کلائمکس کے بعد اینٹی کلائمکس بھی آجاتا ہے۔ وہ مرا تو نہیں بس ہمیشہ کیلئے معذور ہو گیا۔ چھ مہینے اسپتال میں رہ کر آیا تو گھر کا سارا اثاثہ بنیئے کے گھر پہنچ چکا تھا۔ اب بیوی اس کی جگہ مزدوری کرتی تھی۔ سیٹھ جی بڑے دیالو ہیں انہوں نے فوراً اسے اپنے یہاں جگہ دے دی۔ مگر آپ تو جانتے ہیں۔ عورتوں کو مردوں سے آدھی تنخواہ ملتی ہے۔ پھر ان دو سالوں میں دو بچوں کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ بچے اسکول سے اٹھا لئے گئے ہیں مانا اسکول میں کوئی فیس نہیں ہوتی مگر کتابیں اور کپڑا لتا تو چاہیئے۔ اب تو گھر میں چولہا بھی ایک وقت ہی جلتا ہے۔ بچے دن بھر گھر میں ایک دوسرے کو گالیوں گھونسوں اور لاتوں سے نوازتے رہتے ہیں کیونکہ باپ تو سویرے ہی ماں کے ساتھ ساتھ چوکیداری کرنے چلا جاتا ہے کیونکہ بیوی ذرا ناک نقشے کی تیکھی ہے اور آپ نے سنا ہی ہوگا کہ غریب کی بیوی سب کی جورو ہوتی ہے۔ کیا کہا۔ آپ کو ایسی کہانی نہیں چاہیئے؟ آپ ایسے لوگوں کی کہانی لکھنا چاہتے ہیں جن میں حسن ہو دلکشی و جاذبیت ہو۔ جنہیں دیکھ کر گھن نہ آئے۔ اچھا تو پھر اس سامنے والی کوٹھری میں چلتے ہیں۔ آپ کی ملاقات ایک ایسی لڑکی سے کراؤں گا کہ بس آپ دل تھام کر رہ جائیں گے۔ کیا کہا؟ آپ کی جیب میں دام نہیں۔ ارے صاحب یہ کسی اڈہ دار طوائف کا کوٹھا نہیں جہاں باریابی کے لئے آپ کو دل کے ساتھ ساتھ اپنا گھر بار بھی داؤ پر لگانا پڑے۔ یہ تو مزدوروں کی بستی میں رہنے

والی شاموؔ کی کوٹھری ہے جہاں روپیہ دو روپیہ میں بھی کام چل جاتا ہے۔ شاموؔ میں آپ کی کہانی کی ہیروئن بننے کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں۔ صورت ایسی کہ لاکھوں میں ایک۔ بدن جیسے سنگ مرمر سے تراشی ہوئی مورتی۔ آواز میں وہ رس جیسے گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ کیا کہا! وہ اس شکستہ کھنڈر میں اپنے حسن و جوانی کو کیوں دفن کر رہی ہے؟ کسی اونچے کوٹھے پر بیٹھ کر اپنی پوری قیمت کیوں نہیں وصول کرتی؟ میں آپ کو یہی سب بتانے کے لئے تو اس کے پاس لے جا رہا ہوں۔ شاموؔ کوئی پیشہ ور خاندانی طوائف نہیں۔ وہ گاؤں کی رہنے والی سیدھی سادھی الھڑ لڑکی تھی۔ خدا نے حسن کی دولت سے تو مالا مال کیا تھا مگر روپیہ پیسہ میں اس کی کسر نکال لی تھی۔ اس کا باپ گاؤں میں چوکیداری کا کام کرتا تھا۔ بچپن تو جیسے تیسے روکھی سوکھی کھا کر گزر گیا مگر جوانی اس کے لئے مصیبت بن کر آئی۔ گھر سے قدم نکالنا قیامت ہو گیا۔ جدھر جاتی کتنے ہی من چلے مجنوں بن کر سنیما کے ڈائیلاگ بولتے اس کے پیچھے لگ لیتے۔ اسے بھی اچھا تو لگتا جب کوئی نوجوان اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کوئی پیار بھرا گانا گانے لگتا۔ مگر ایسی باتوں سے اسے ڈر بھی بہت لگتا تھا۔ غریب کی عزت مٹی کے برتن کی طرح ہوتی ہے کہ ذرا سی ٹھیس لگی اور چکنا چور۔ شاموؔ کو اپنے ماں باپ کی عزت کا بڑا خیال تھا اس لئے وہ کبھی آنکھ اٹھا کر بھی ان لوگوں کی طرف نہ دیکھتی۔ بس من ہی من میں بھگوان سے پرارتھنا کرتی کہ کوئی دل والا ایسا بھی ملے جو اپنے اسے اپنے من مندر میں مورتی بنا کر سجا لے۔ اس کے ماں باپ سے بات کر کے ہمیشہ کے لئے اس کا ہاتھ تھام لے۔ مگر اچھی صورت دیکھ کر آہیں بھرنا اور گانے گانا اور بات ہے اور ہمیشہ کے لئے کسی کو اپنانا اور بات ہے۔ ہاتھ تو اس کا تھاما جاتا ہے جس کے ساتھ کچھ پیسوں کی جھنکار بھی سننے کو ملے۔ آج کل کے زمانہ میں ایسا کون بے وقوف ہوگا جو صرف صورت دیکھ کر ایک کنگال کی بیٹی کو اپنانے پر تیار ہو جائے۔ شاموؔ کی عمر اپنے باپ کی فکروں کی طرح بڑھتی رہی۔ اس کے باپ کو جوان بیٹی کی فکر نے دھیرے دھیرے موت کے گھاٹ پر ڈال دیا۔ اب اس میں اتنی طاقت نہ رہی کہ راتوں کو پہرہ دیتا اس لئے اسے نوکری سے جواب مل گیا اور اس کی جگہ ایک مضبوط جسم والے کو رکھ لیا گیا۔ اس حالت میں وقت کی رفتار کا سہارا بھی جاتا رہا۔ حالات سے مجبور ہو کر شاموؔ نے زمیندار کے گھر میں برتن چوکے کا کام شروع کر دیا۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا، آپ خود ہی سوچ سکتے ہیں۔ زمیندار کے دل پھینک بیٹے کی عنایت اسے گاؤں کی کٹیا سے نکال کر اس چورا ہے تک لے آئی۔ کیا یہ کہانی بھی آپ کو پسند نہیں آئی؟ کیا اس کا تھیم بہت پرانا اور گھسا پٹا ہے؟ آپ کو اوریجنل کہانی چاہیئے؟ آپ چاہیں تو اس سامنے بیٹھی ہوئی پاگل بھکارن کی کہانی بھی لکھ سکتے ہیں جو سارا دن سر جھکائے خاموش بیٹھی رہتی ہے جیسے کسی ان جانے خوف نے اس کی زبان بند کر دی ہو مگر جیسے ہی رات کا اندھیرا دھرتی پر اترتا ہے اس کا غیظ و غضب دیکھ کر اچھے اچھوں کے کلیجے دہل جاتے ہیں اور وہ کالی کا دوسرا روپ دکھائی دینے لگتی ہے۔ کہتے ہیں کچھ سال پہلے دنگوں کے دوران فسادیوں نے اس کے گھر میں گھس کر اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے شوہر اور چار جوان بیٹوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ تب ہی سے اس کا یہ حال ہو گیا ہے۔ نہیں میں نہیں جانتا کہ اس کا مذہب کیا ہے، میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ یہ ایک دکھیاری ماں ہے جو ہندو بھی ہو سکتی ہے مسلمان بھی اور کسی بھی مذہب کی ماننے والی۔ ویسے آپ چاہیں تو میری کہانی لکھ دیں لیکن اس میں بھی حقیقت تو ملے گی مگر کوئی نیا پن نہیں ہوگا یہ تو ہمارے دیس کے لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کی مشترکہ کہانی ہے۔ پھر ابھی اس کہانی کا کلائمکس بھی تو نہیں آیا ہے اور یہ ایک دھیمی اور یکساں رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے اور نہ جانے کب تک اسی طرح چلتی رہے گی۔ شاید جب میری کہانی اپنے کلائمکس کو پہنچے گی تو اسے سننے کے لئے میں اس دنیا میں موجود نہیں ہوں گا یا تو کسی ٹرین کے سامنے لیٹ کر اپنی بیوہ ماں کے حسین خوابوں کو چکنا چور کر چکا ہوں گا یا پھر رکشا پولر بن کر کسی نا معلوم منزل کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا ہوں گا۔ ویسے آپ چاہیں تو اس کہانی کو المیہ بنانے کی بجائے اس کا رخ موڑ بھی سکتے ہیں مثلاً کسی لکھ پتی کی اکلوتی بیٹی کو میری محبت میں مبتلا کرا کے مجھے جھونپڑے سے نکال کر محل میں پہونچا دیں یا کوئی لاٹری میرے نام نکلوا دیں۔ کچھ نہیں تو مجھے اسمگلروں کے گروہ میں شامل کرا کے میرے وارے نیارے کروا دیں کیونکہ یہ باتیں حقیقی زندگی میں ممکن نہ سہی کہانی میں تو بہت آسان ہے۔ ارے! لگتا ہے

باقی صفحہ ۱۰۰ پر دیکھئے

دھنک رنگ

خورشید طلب

چیختا رہتا ہے زیرِ حلقۂ گرداب وہ
چاہتا ہے توڑنا شاید سکوتِ آب وہ
ایک دن بے خوابیوں کی دھند میں کھوجائےگا
منتقل کرکے مری آنکھوں میں اپنے خواب وہ
ایک دردِ مشترک ہے میرے اُس کے درمیاں
میں کہ اک سوکھا جزیرہ ماہیِ بے آب وہ
کیا خبر تھی مِل کے بے نام و نسب کرجائےگا
خط میں تو لکھا تھا مجھکو نت نئے القاب وہ
ہم کو جس کی روح کے اندر اترنا تھا طلبؔ
جسم کے اندر بھنور میں ہوگیا غرقاب وہ

● پرسنل سیکشن۔ جی ایم آفس، سکارنگی گریڈیہہ (بہار)

سرفراز شاکر

ٹیڑھی میڑھی ڈگر کا نقشہ میں
جو بھی پڑھ لے اسی کا قصہ میں
خار، پتھر، چٹان جیسا وہ
خاک، پانی، گلاب جیسا میں
کیسے آب و ہوا شجر دیکھوں
ہوں ازل سے جھلستا صحرا میں
کون سے رُخ چلوں نہیں معلوم
ہوگیا ہوں ہوا کا جھونکا میں
دیکھ لے کوئی نیند میں شاکرؔ
ایک بھٹکا ہوا ہوں سپنا میں

● سرانجی گیٹ کے اندر منگیوں کی گلی جودھپور (راج)

شمس تبریزی

گزرے لمحات کی روشنی ڈھونڈنا
جیسے تاریکیوں میں خوشی ڈھونڈنا
ہم سے لوگوں کا ہنسنا ہنسانا بھی کیا
جلنے والا ہر دن کوئی ڈھونڈنا
خود کو کھونا زمانے کی اس بھیڑ میں
لوٹ آؤ تو پھر زندگی ڈھونڈنا
یاد آؤں اگر تم کو میں دوستو
میرے شعروں میں کوئی کمی ڈھونڈنا
دوستوں کو کبھی آزمانا نہیں
دوستی میں فقط سادگی ڈھونڈنا

● ۹۱۰، سیکٹر ۱۶، پنچکولہ ۔ ۱۳۴۱۰۰ ہریانہ

ارشاد باری

جب سے قید گھر میں ہوں۔
رات دن سفر میں ہوں!
دیکھ لی سبھی دنیا!
تیری رہگذر میں ہوں!!
کچھ نظر نہیں آتا!
جانے کس اثر میں ہوں؟
ڈوب کر ابھرنا ہے!
اس لئے بھنور میں ہوں!
آئینہ نہیں کوئی!
میں ہر اک نظر میں ہوں!

● ۴/۵۴ ۔ بدرباغ علیگڑھ ۲۰۲۰۰۲

محمد رفیع

لب تھے کسی کے حق میں تو دل تھا مری طرف
آدھا وہ اپنے ساتھ تھا آدھا مری طرف
اپنی تلاش تھی تو مجھے ڈھونڈنا کہیں
اپنا خیال تھا تو وہ آتا مری طرف
اس گھر کی سازشوں سے میں بچتا بھی کس طرح
جس کے ہر ایک در کا تھا رستہ مری طرف
کچھ دن تو اپنے خواب کی شاخوں پہ جھولتا
گرنا ہی تھا اسے تو وہ گرتا مری طرف
ساون نے میری آنکھ کے آنسو چرا لئے
پت جھڑ نے ایک خواب نہ چھوڑا مری طرف

● سونامی گیٹ، مالیرکوٹلہ ۔ ۱۴۸۰۲۳ (پنجاب)

نذیر آزاد

شعورِ موج کی تقدیر میں عذاب تو لکھ
ضمیرِ بحر کے سینے پہ انقلاب تو لکھ
یہ اور بات کہ میری خطا ہے نامعلوم
سزا ہے سخت بہ اندازۂ ثواب تو لکھ
ابھی ہیں میرے صحیفے کے کچھ ورق سادہ
حدیثِ دل نہ لکھی آیتِ عتاب تو لکھ
وہ جسکی دید ہمیں تھی متاعِ جاں سے عزیز
کتابِ شب کے کسی باب میں وہ خواب تو لکھ
جنوں کی لہر میں دستِ دعا کا کیا مطلب
نئے سرابوں کے رہبر نئے عذاب تو لکھ

● شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر (کشمیر)

نقد و نظر

صحت الفاظ

سید رالحسن نے اپنی عمر کی دہائیوں کے عمیق مطالعے اور بیش بہا تجربوں کے بعد املا اور املا کے مسائل پر ایک اہم کتاب پیش کی ہے۔ معیاری لغت اور اردو املا کے موضوع پر کتابوں کی موجودگی کے باوجود صحیح زبان لکھنے اور بولنے کے اختلافی مسائل کے ساتھ علامت نگاری کے تحت تقریر و تحریر میں تلفظ، قرأت اور تذکیر و تانیث کی غلطیاں عام طور پر موجود رہتی ہیں۔ مولف نے ان سے بحث کی ہے اور اس سلسلے میں ۱۴۰۰ الفاظ سے مرتب کئے ہیں۔ بہت جانفشانی کے ساتھ احتساب و انتخاب کا عمل اصلاح کا کام انجام دیتا ہے۔ ۱۹۷۷ء میں پہلی بار کتاب کی اشاعت کے بعد اس کی خاصی پذیرائی ہوئی تھی۔ نئے ابواب کے اضافوں کے ساتھ یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔ مگر کتاب میں اس کی صراحت کہیں نہیں ہے صرف مولف نے اپنے پیش لفظ میں سرسری اشارہ کیا ہے۔ اس کا مطالعہ طلبا کے ساتھ ہر اس شخص کے لئے بھی ضروری ہے۔ جو اردو کو اپنی زبان سمجھتے ہیں۔ ایسی دستاویزی کتاب ہر گھر میں ہونی چاہئے۔

★ ضخامت: ۲۵۲ صفحات ★ قیمت ۱۸ روپے ★ مطبوعہ جولائی ستمبر ۱۹۹۱ ★ پتہ: ترقی اردو بیورو ویسٹ بلاک ۸ آر کے پورم، نئی دہلی — ۱۱۰۰۶۶

جلسہ

فصیح اکمل صوفی مزاج قلم کار ہیں۔ اپنے اندرون میں سفر کرتے رہتے ہیں۔ اور اپنے محسوسات کو حرف و لفظ میں پروتے جاتے ہیں نہایت ہی خاموشی کے ساتھ۔ وہ نقاد بھی ہیں، ادیب، انشائیہ و افسانہ نگار بھی۔ ان کی تحریروں میں حیرتی لہجہ اپنا منطقی عمود بناتا ہے اور قاری کو اس میں شامل کر تا ہے۔ فصیح اکمل کا یہ دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں ۲۵ کہانیاں شامل ہیں۔ تقریباً کہانیاں ادبی رسائل میں شائع ہو کر قبول ہو چکی ہیں۔ ان کہانیوں میں انشائیوں کا رنگ بھی ہے۔ اور طنز و مزاح کے رنگ بھی۔ موضوعات میں جدت اور اسلوب میں تخلیقی ربط موجود ہے۔ وہ کہانی کو سوچ سوچ کر نہیں لکھتے بلکہ کہانی ان کے سوچ و ذات سے پھوٹتی چلی جاتی ہے۔ شاعری ہی کی طرح نثر بھی اپنے خواص بیان کر دیتی ہے کیوں کہ اچھی اور تخلیقی نثر لکھنا شعر کہنے سے زیادہ مشکل ہے مگر فصیح اکمل کے یہاں نثر اپنے فطری بہاؤ کے ساتھ ساتھ موضوع اور خیال کے نئے نئے زاویے دریافت کر لیتی ہے۔ ان کہانیوں کے مطالعے کے بعد لگتا ہے کہ افسانہ نگار اجتماعی لاشعور سے اپنے طور پر منکشف ہو رہا ہے۔ ★ ضخامت ۱۶۸ صفحات ★ قیمت ۱۲۵ روپے ★ مطبوعہ ۱۹۹۲ء ★ پتہ خسرو کتاب گھر ۱۵۰۰ بستی نظام الدین نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

اقدار خصوصی — سہ ماہی اشاعت

کراچی (پاکستان) سے شائع ہونے والا نہایت ہی دیدہ زیب خوش ترتیب والا نفیس ادبی رسالہ 'اقدار' اپنے ہر شمارے سے شعر و ادب سے وابستگی کی تجدید تک سیہائی محسوس کرتا ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت، نثری و شعری لطافت سرورق، اندرونی صفحات میں تصویری سطریں، قلم کاروں کے چہرے، ہوتے ہوئے اور ان سب سے ابھرنے والی سحر کاری، خوشبو ایک خوشگوار کشش کے ساتھ کردار ادا کرتی ہیں۔ ہند و پاک سے شائع ہونے والے ادبی رسائل میں 'اقدار' ایک مختلف و منفرد رسالہ ہے۔ جو شمارے میں فکر انگیز اداریہ، حرمت فنی نامی، افسانے، تراجم، غزلیں، نظمیں، خود نوشت، ادبستان پاک، لسانیات، تبصرے اور خطوط — مدیر شمیم ہمدانی

★ ضخامت: ۲۸۸ صفحات (بڑی سائز) ★ قیمت: تیس روپے (فی شمارہ) ★ زر سالانہ: ایک سو روپے (پاکستان) ۵ ڈالر (بیرون ملک) — ★ رابطہ، گلستان بلاک ٹیمپل روڈ کراچی (پاکستان)

احاطہ

جدید نسل کے نظم گو جمیل ملال کا پہلا شعری مجموعہ 'احاطہ' نثری نظم کے خدوخال کو متعارف کروانے میں معاون ثابت ہوا ہے۔ نثری نظم ہو یا آزاد، اس کا داخلی آہنگ لفظوں کی ترتیب تخلیقی سطور، وحدت تاثر، شعریت اور نظم کا گٹھاؤ، کسی بھی نظم میں ان سب کی موجودگی فن پارے کو اپنے قاری سے جوڑتی ہے۔ ایسی نظم خود کو پڑھوا لیتی ہے۔ جمیل ملال کی نظموں میں یہ عناصر واضح طور پر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ نظم تخلیق کرنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ ان کی نظمیں تہہ در تہہ معانی کی گونج سے عبارت ہیں۔ نئے تجربوں اور واردات کا منظر نامہ بناتی ہیں۔ گہری ذہنی گونج کے ساتھ انفرادی رنگ بھی اپنے شعری متن کو بھی مصلحتی ہیں۔ اور یہ وصف کسی نئے شاعر کے یہاں امکانات کو روشن تر کرتا ہے۔ جمیل ملال کے لاگ مبصر اور کھرے ناقد بھی ہیں۔ نثری نظم کے اظہاری پیرائے میں بھی مزاح کے حامل ہونے کے باوجود وہ اپنی باتوں ہی میں زیادہ ترکم رہتے ہیں۔ ورنہ احاطہ کی پذیرائی کچھ اور ہی طرح سے ہوتی۔ ★ ضخامت ۹۲ صفحات ★ قیمت ۲۵ روپے ★ اشاعت جنوری ۱۹۹۰ ★ رابطہ: ۸/۲۲ فرسٹ کراس روڈ، گلبرگہ (کرناٹک)

بھوکا استھوپیا

نئے افسانہ نگار مشرف عالم ذوقی کے ۱۴ افسانوں کا اولین مجموعہ اس سے قبل ایک ناول 'نیلام گھر' شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ ذوقی کی کہانیوں میں تخلیقی اظہار اپنے ہم عصروں سے قدرے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ لکھ ہو جانے کی تڑپ اور کچھ پا لینے کی جستجو انہیں بے چین کئے رہتی ہے۔ وہ اپنی کہانیوں کے ارادے میں کردار اور واقعات کے ساتھ بہت اندرون میں ڈوب جاتے ہیں۔ بیانیہ کا تخلیقی بہاؤ، نثر میں شعری آہنگ، سماجی، سیاسی بکھراؤ کے المیے اور دکھ کی داستانیں ان کے افسانوں کا خاصہ ہیں۔ کہانی کیا ہو اور کیا نہیں، ذوقی لفظ لفظ اور سطر سطر اس کا اظہار کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنی فکری کائنات میں رفتہ رفتہ روشن ہو رہے ہیں۔ آگے چل کر اور جلد ہی اردو کہانی کے لئے نئے ناموں کی جو بھی فہرست بنے گی مشرف عالم ذوقی اس میں شامل ہو سکیں گے۔ ★ ضخامت ۱۹۰ صفحات ★ قیمت: ایک سو دس روپے ★ سن اشاعت: ۱۹۹۳ ★ پتہ: ۳ — سی کنڈلی نگر، نزد رینک بنگلہ، دہلی ۱۱۰۰۵۱

ہجرتوں کے سفر

اردو اور سویڈش زبان میں شاعری کرنے والے پاکستانی شاعر جمیل احسن کا یہ تیسرا شعری مجموعہ ہے جسے انہوں نے اپنی شاعری کا انتخاب (۹۱ — ۱۹۶۵) بھی کہا ہے۔ ۱۹۷۶ء سے سویڈن میں مقیم جمیل احسن (اصل نام محمد جمیل احسن) نے سویڈش میں اپنا پہلا شعری مجموعہ 'تشنگی پانی میں' (۱۹۸۰) طبع کروایا اس کے بعد 'روح کا سمندر' (۱۹۸۷) اور 'لفظ ہر رکھتے ہیں' (۱۹۸۹) اردو اور سویڈش زبان میں شائع ہوئی۔ ان کی سویڈش شاعری سویڈن کے اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اور یہ ایک منفرد بات ہے۔ زیر نظر مجموعہ میں ۵۷ غزلیں، ۳۳ نظمیں اور بعض جگہ تراجم، محسن بھوپالی، احمد اسلام امجد، سید مشرف، سائیں بخش لاکھیر، اقبال اختر کی گراں قدر آراء شامل ہیں۔ مشہور پاکستانی آرٹسٹ اقبال مہدی نے نہایت ہی بامعنی سرورق بنایا ہے۔ اس طرح یہ شعری مجموعہ صوری و معنوی ہر اعتبار سے ایک قابل مطالعہ مجموعہ بن گیا ہے۔ غزل و نظم میں جمیل احسن نے اپنی فطرت کو جو شعری وژن دیا ہے۔ وہ متوجہ کرتا ہے۔ ★ ضخامت: دو سو دس صفحات ★ قیمت: دو سو روپے ★ مطبوعہ اپریل ۱۹۹۳ ★ رابطہ: گلی دوست علی — ۱۳۰۶ بلاک ۱۳ — گلشن اقبال، کراچی (پاکستان)

دانا پانی

گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ اڑیا ناول 'ماٹی مٹال' (۱۹۶۴) کے خالق گوپی ناتھ مہنتی ایک اور قابل ذکر ناول، جدید اڑیا ادب کے معماروں میں گوپی ناتھ سرفہرست ہیں۔ قومی یا سیوں اور ہریجنوں پر لکھے گئے ان کے ناول ایک اعلیٰ معیار قائم کرتے ہیں۔ اڑیا زبان کی عظیم شعری روایات کے خالقوں میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے۔ دانا پانی کا سن اشاعت ۱۹۵۵ ہے۔ حقیقت پسندانہ ناول موضوع اور پلاٹ کے اعتبار سے موجودہ زندگی کی کشاکش کو دانا پانی کی علامت کے ذریعے ابھارنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ آج کے ہندوستان اور اس میں بسنے والے شہری لوگوں کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناول نصب العین، حق، مقصد اور ذرائع کا سوال اٹھاتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار بلی دت نوکری کی خاطر اپنا ضمیر تک بیچ دیتا ہے۔ وہ اپنی شریک حیات کی پاکدامنی تک گنوا دیتا ہے۔ اپنے بڑے تصوریاتی کے ساتھ ناول اپنے قاری کو بہالے جاتا ہے۔ ایک بامقصد تخلیقی ناول جسے پڑھتے ہوئے قاری خود بھی ناول کا کوئی کردار لگنے لگتا ہے۔ ناول پڑھا نہیں جاتا بلکہ اپنے آپ کو پڑھوا جاتا ہے۔ یہی اس ناول کا بنیادی وصف بھی ہے۔ ناول کے ترجمہ میں 'جنتا منتی سیرہ' کا معلوماتی پیش لفظ اڑیا شعر و ادب خاص طور ناول اور افسانے کے متعلق تخلیقی و تنقیدی مواد فراہم کرتا ہے۔ اس کامیاب اڑیا ناول کا اردو ترجمہ ناظر احمد کمالی نے بہت سہل کر دیا ہے۔ ضخامت: تین سو دو صفحات ★ قیمت: ساٹھ روپے ★ مطبوعہ ★ رابطہ: ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا اے — ۵ گرین پارک نئی دہلی — ۱۶

★ قمر نقوی 4104 S. LIONS AVE BROKEN ARROW, OK 74011 U.S.A

"اردو کی نئی بستیاں" کے تحت آپ نے بڑی تعداد میں ادیبوں کی تخلیقات جمع کیں۔ بڑا کام ہے۔ اور بعض اچھی تخلیقات مطالعے سے گزریں۔ البتہ بعض ایسے لوگ جن کو میں وقیع جانتا تھا۔ اب ان کا کلام پڑھا تو فن کی کمزوری نمایاں معلوم ہوئی۔ اعتراض مقصود نہیں۔ آپ کی تعریف کرتا ہے کہ آپ نے کچھ کہنہ مشقوں کی حوصلہ افزائی کی۔ یقین ہے کہ یہ لوگ بالآخر آپ کی رہنمائی کے ذریعے ان کمزوریوں پر قابو پالیں گے۔ آپ ان قلمکار اور دانشور حضرات کو وسعت مطالعہ کی ترغیب دیجئے۔ الفاظ کے صحیح استعمال پر عبور اور مفہوم کی گہرائی مطالعے سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ مجھے یہ ضرور کہنا ہے کہ بعض لوگ نجانے کس جذبے کے تحت یہ گمان کر بیٹھے ہیں کہ اردو زبان مر رہی ہے۔ یا مر چکی ہے، یا سکرات موت میں گرفتار ہے۔ یہ خیالات غلط ہیں۔ یہ لوگ کیوں یہ نہیں سوچتے کہ اردو تو روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ اس کے مرنے کا قطعاً کوئی خطرہ نہیں۔ اردو زندہ زبان ہے اور کوئی زبان نہ کسی کی کوشش سے مرتی ہے نہ جیتی ہے۔ زبانیں لوگوں کی ضروریات کے سبب وجود میں آتی ہیں اور ان ہی اسباب کے تحت زندہ رہتی اور فروغ پاتی ہیں۔ اردو زندہ ہے۔ یہی کیا کم ثبوت ہے اردو کی زندگی اور ترقی کا، آپ کے رسالے میں ہی نئی نسل کے بے شمار قلمکار شامل ہیں۔ اسی طرح دوسرے رسائل بھی اردو کی مسلسل ترقی کے آئینہ دار ہیں۔ صرف اردو پر ہی سکرات کا شک کیوں، لوگ سنسکرت، فارسی، عربی وغیرہ زبانوں کی موت یا زندگی کا شکوہ کیوں نہیں کرتے۔ اگر سب زبانیں زندہ ہیں تو اردو کو خطرہ کیوں ———؟

★ عالم خلش — ہاؤس نمبر ۲، بلاک نمبر ۳، شاستری نگر، جمشید پور

مشترکہ شمارہ ۱۱ اور ۱۲ نے اردو کی نئی بستیوں کے شعراء کے بہترین انتخاب کے علاوہ اپنے دو اہم مضامین، جدید اردو افسانے کا مستقبل اور تنقید کی موجودہ صورت حال۔ ایک چیلنج، اور دو کہنہ افسانوں، فاختائیں، اور ناگزیر کی وجہ سے مجھے متوجہ کیا ہے۔ نئی بستیوں کے شعراء کو پڑھتے ہوئے ایسا نہیں لگا کہ وہ پردیسی ہیں یا ہمارے موجودہ ادب کی MAIN STREAM سے دور ہیں۔ بلکہ بعض شعراء اور شاعرات مثلاً حمیرا رحمان، عرفانہ عزیز، اکبر حیدرآبادی، ستیہ پال آنند، احمد سہیل، فہیم انظر، حنیف ترین اور دوسرے حصے میں شامل نسیم سید، محمد طارق غازی، خالد سہیل، شکیلہ رفیق، خورشید سرور اور عبدالقوی کی نگارشات میں نسبتاً کہیں زیادہ سنجیدگی اور وسعت اور نئے محسوسات کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ اور ان پر نئے ماحول کے دیرپا اثرات کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ محترمہ ممتاز شیریں کا مضمون "جدید اردو افسانے کا مستقبل" لگتا ہے کئی برس پہلے لکھا گیا تھا۔ پھر بھی موجودہ مسائل کے پیش نظر بھی کارآمد ہے۔ اردو افسانوں کے حوالے سے انہوں نے کئی اہم نکتے واشگاف کئے ہیں مثلاً یہ کہ آج کے افسانوں کے موضوعات شہری زندگی تک ہی محدود ہیں۔ ان میں دیہی معاشرے کی عکاسی علاوہ عدم ہی نظر آتی ہے اور یہ کہ ہمارے لکھنے والوں نے تدریجی عوامل کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ ان کی بات بھی دعوت عمل دیتی ہے اور بڑی امید افزا ہے کہ اگر اردو والوں میں مطالعے کا ذوق ہو تو خود ان کی تعداد اتنی بڑی ہے کہ نئی کتابوں کا دس ہزار کا ایڈیشن بھی فروخت ہو سکتا ہے۔ لیکن زیر نظر مضمون میں بعض ایسے تناقضات بھی ہیں جن سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ ایک طرف تو وہ جدید رجحانات کو، جو کہ خود ان کے قول کے مطابق مغرب سے مستعار لئے گئے، رد کرتے ہیں دوسری طرف وہ مغربی اثرات کی افادیت کو بادل ناخواستہ قبول بھی کرتے ہیں۔ کم سے کم شعور کی رو کے تکنیک کی حد تک۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "جب تک ہم اپنے قاری کے ذہن کی سطح پیش نظر نہیں رکھیں گے۔ حقیقت کا ادراک ہمیں نہیں ہوگا۔ ہم وہ ادب وہ افسانہ پیش نہیں کر سکیں گے جو قاری چاہتا ہے۔" حالانکہ اسکے مقابل ایک دوسری حقیقت بھی ہے جو کہیں زیادہ اہم اور بدرجہا تم المناک ہے اور جس کا اعتراف انہیں بھی ہے۔ "ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا قاری اتنا ترقی یافتہ ذہن نہیں رکھتا کہ ہم اسکو مغربی قاری کے برابر رکھ سکیں۔" یہاں پہنچ کر ادب کے مجھ جیسے مبتدیوں کے ذہن میں اکثر یہ سوال سر اٹھاتا ہے کہ خدانخواستہ اگر اردو کا قاری آئندہ پچاس یا سو برسوں تک اسی طرح جامد اور بدساختہ ذہن لے کر پیدا ہوتا رہا تو کیا ہمارے فکشن نگار نہ چاہتے ہوئے بھی READER-ORIENTED یا بالفاظ دیگر سستی اور تفریحی کہانیوں کے ڈھیر لگاتے رہیں؟ اس ضمن میں یہ استفسار بھی بے محل اور بے سیاق نہ ہوگا کہ دہشت ناک واقعات اور جرائم بھری سستی کہانیاں پڑھنے والا ہمارا آج کا قاری اگر فسانۂ عجائب، طلسم ہوش ربا اور نذیر احمد اور رتن ناتھ سرشار کی زبان سمجھنے سے قاصر ہے یا قصداً وہ اپنی زبان کے کلاسکس میں دلچسپی نہیں لیتا تو کیا ہمیں اپنے ان تمام تر روایتی سرمایوں کو دریابرد کر دینا چاہئے ——؟ حامدی کاشمیری کا مضمون اگرچہ ایک اجمالی جائزہ پیش کرتا ہے لیکن اس بحرانی صورت حال کا احساس دلانے میں کامیاب ہے جو آج ہمارے تنقیدی ادب کو درپیش ہے ——

★ شاہد جمیل —— سب رجسٹرار، رجسٹریشن آفس، جوگی پاٹ، ضلع ارریہ (بہار)

"اردو کی نئی بستیاں" کے تحت شاعر کے شمارے دیکھ کر ایسا لگا کہ اردو ادب کے تعلق سے غیر ملکی تہذیب و تمدن کے درمیان بھی یہ فنکار خود کو پوری طرح زندہ و آباد رکھے ہوئے ہیں۔ طرز زندگی، ماحول، زبان اور تہذیب کے زاویوں نے انہیں فکری طور پر ہم برصغیر والوں سے کچھ الگ تو ضرور کیا ہے۔ لیکن زیادہ نہیں۔ کیونکہ اردو کی جڑیں تو ہماری اور ان کی سوچ کے جسموں میں رگیں بن کر پھیلی ہوئی ہیں۔ آپ نے اتنے ڈھیر سارے لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ہمیں تو مسرت دی ہی ہے۔ انہیں بھی شاید ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے اور اس طرح کے کام تو وہی رسالہ کر سکتا ہے جو بین الاقوامی ہو جانے کا دم خم رکھتا ہو۔ مبارکباد!!! شمارہ نمبر ۱ میں ساقی فاروقی کی غزل اور تیسری غزل میری نظر سے پہلی بار گزری ہے۔ لفظ سے جادوگری اور اسکی قوت کا استعمال تو ساقی صاحب کے حصے میں آیا ہی ہے۔ اس عمر میں بھی وہ اپنی جگہ پہاڑ کی طرح اٹل ہیں۔ طبیعت سرشار ہو گئی۔ اس شمارے میں ستیہ پال آنند اور احمد سہیل کی نظمیں متاثر کرتی ہیں اور اس بار بشیر بدر (شمارہ نمبر ۲) پر مضمون آپ نے ندا فاضلی سے لکھوا کر کمال کر دیا ہے۔ ندا کے دھاردار اسلوب میں جو کاٹ اور جان ہے وہ تو بس اپنی مثال آپ ہے اور اردو میں بے مثال۔ (دیواروں کے بیچ "میں ہم یہ کرشمہ دیکھ چکے ہیں۔) پہلے بھی وہ اسی طرح کا ایک مضمون حسن نعیم پر دے چکے ہیں۔ بہرحال بشیر بدر پر یہ مضمون پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ بس پڑھئے اور عش عش کرتے رہئے۔ ندا کے پرستاروں کے لئے یہ شمارہ آپ کی جانب سے کسی تحفے سے کم نہیں۔ پھر بشیر بدر کی یک درجن غزلیں اس کو اور وقیع بناتی ہیں۔ دیگر مشمولات میں قمر فضل احمد کی کہانی "بہرام کا گھر" شاہین اور بخش لائلپوری کی غزلیں، خالد سہیل اور خورشید سرور کی نظمیں مجھے اچھی لگتی ہیں۔ اور آخر میں سب سے خاص چیز یہ ہے کہ دونوں شماروں میں فکر امروز کے تحت سہیل اکبرآبادی کے اقوال جو سنجیدہ ادب پڑھنے والوں کے لئے شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔

★ اندر موہن کیف —— ۹۴۷۶ سول لائنز مصالسی

"شاعر" کا شمارہ نمبر ۱ اور ۲ باصرہ نواز ہوئے۔ ان حالات میں بھی آپ جس باقاعدگی اور خوبصورتی سے پرچہ نکال دیتے ہیں۔ وہ قابل داد ہے۔ اس بار "اردو کی نئی بستیوں" کے عنوان سے بیرون ملک کے شعراء حضرات کا جو خوبصورت انتخاب آپ نے پیش کیا ہے وہ کئی پہلوؤں سے مستحسن ہے۔ یوں ہندوستان سے باہر کے شعراء حضرات کو ایک موقر وسیلۂ اظہار مل جاتا ہے اور یہاں ہمیں بھی ان سے ایک ذہنی قربت حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ شمارہ نمبر ۱ میں ساقی فاروقی، عابد اللہ غازی اور عرفانہ عزیز کی غزلیں اچھی ہیں۔ عرفانہ عزیز کی نظم "دہقان" بھی خوب ہے۔ شمارہ نمبر ۲ میں بخش لائلپوری کی غزلیں اور رضا سہیل کی نظمیں خوب ہیں۔ شاہین کی غزلیں بھی اچھی ہیں مگر وہ 'سیپ، دھنک اور خواب' پر پوری توجہ نہیں دے پائے۔ بشیر بدر صاحب آج کی غزل کی ایک معتبر آواز ہیں۔ بلکہ مشہور ہیں۔ خوب کہتے ہیں مگر اب ایک عرصہ سے اپنے آپ کو دہرا رہے ہیں۔ ان کے بارے میں ندا فاضلی کا مضمون بھی اچھا ہے۔ بڑی اچھی باتیں لکھی ہیں۔ مگر مضمون میں کہیں کہیں کچھ ذہنی الجھاؤ سا نظر آتا ہے جو غالباً ان کے AMBIVALENT ATTITUDE کی پرچھائیاں ہو سکتی ہیں۔ مجموعی طور پر شاعر اپنی شخصیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جوگیندر پال کا افسانہ 'فاختائیں' بہت پسند آیا۔ یہ عورتوں کی ایک مسلسل داستان ہے۔ جو 'یہاں خیریت ہے---' سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ مگر اپنے دامن میں گزشتہ زندگی کے تمام رستے ہوئے زخم سمیٹے ہوئے ہے۔ جو زندگی کے آخری لمحہ تک رستے رہیں گے۔ پھر بھی یہ خط نامکمل اور تشنہ رہے گا۔ کوئی نہیں جانتا یہاں خیریت ہے کے بعد کیا کچھ لکھنا رہ گیا ہے۔

★ نفیس فتح پوری — ۳۰۱ جے بلاک ...

"اردو کی نئی بستیاں": شعر موصول ہوا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آپ نے انفرادیت قائم رکھی ہے۔ شاعری کا اس قدر ضخیم اور ... مکمل ہونا ... صفحات ... نیا سمیٹنا کوئی بات کامل نہیں۔ میں آپ کو اس شمارے کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

★ منصور ... — ... (جدہ)

گفتگو کرتے ہوئے ندا فاضلی (ملاقاتیں) ... سناتے ہوئے ندا فاضلی (دہلی ...) کی ... اور شاعروں کی ... کرتے ہوئے ندا فاضلی کتنا زندہ ہے ... تقریر اور تحریر کے بارے میں لکھا ہے۔ ندا کو تقریر کے مقابلے تحریر کے فن میں بڑی مہارت ہے۔ مذکورہ شمارے میں ندا فاضلی نے بشیر بدر کی شخصی و شعری نفسیات کو اجاگر کر دیا ہے۔ بشیر بدر کا شعر اور سراپا شاعر سے کی گفتگو، لہجہ، ... تبسم ... مستقبل میں زندہ رہنے کا جتنی توقع ... وابستہ ... رکھے ہوئے ہے۔

★ عذرا القوی P O BOX 51178 RIYADH

"اردو کی نئی بستیاں" بہت پسند آیا۔ زیادہ تر نام اور چہرے شناسا تھے ... جب میں ... ایک محترم استاد سے (جو خود بھی ادیب اور بہت اچھی شاعر ہیں) اور دبئی میں رہنے والے اردو ادیبوں کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ مجھے اس گفتگو سے کچھ ایسا احساس ہوا کہ گویا ہندو پاک سے باہر رہنے والے اردو کے شاعر و ادیب بہت ... نہیں لئے جاتے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ امریکہ، کینیڈا، مشرق وسطیٰ ان جگہوں پر آپ نے مشاعرے کرائے ... سالوں میں اخباروں میں تصویریں ... کمال کیا ... میں مانتی ہوں کہ بیرونی ممالک میں شاعروں اور ادب کے نام پر بہت سے لوگوں نے دوسرے یا تیسرے درجے کی تخلیقات کو ادب کہہ دیا ہے۔ لیکن پھر بھی بہت سے اچھے اور ... ادیب، شاعر یہاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ہم الگ ملک سے دور، مختلف ماحول میں رہتے ہیں تو ... ہم مختلف مسائل سے ... کے بارے میں لکھیں گے ... برصغیر ... ادب کی ... جب یہاں کوئی ادبی محفل ہوتی ہے تو ... ہندوستان کا ادیب ہے اور کون پاکستان کا۔ ... پاکستانی مسائل میں بھی یکجہتی ہوں۔ ... "احساس" بہت خوبصورت ہے۔ تسنیم سید کی دونوں نظمیں اور غزل حسب معمول بہت اچھی ہیں۔ ندا فاضلی کا مضمون "بشیر بدر — نئی غزل کا ایک نام" پڑھ کر مزہ آیا۔ ... تنقیدی مضمون بہت خوب ہے اور ندا فاضلی کا ... طنز ... اس طرح کے مضمون کے لئے بہت موزوں ہے ...

"تو گر حد سے ..."

مجھے لگتا ہے میری نظم "خواب در خواب" میں آپ نے کچھ بدل دیا ہے۔ میرا مصرعہ ... یوں تھا

"کوہساروں پہ تھی برف پگھلتی ہوئی ..."

جسے بدل کر یوں لکھا ہے

"کوہساروں پہ تھی برف پگھلتی ہوئی ہر طرف"

اس کے علاوہ ... نظم کی ... تبدیلی ہوئی ہے ... 'میپل' اور ... سرخ ... "سرخ ... MAPEL کینیڈا کا مخصوص درخت ہے اسکا پتہ کینیڈا کے جھنڈے پر بھی بنا ہوا ہے۔ ... کے درخت میں نہ صرف کینیڈا اور ہندوستان کا ملاپ ہے۔ بلکہ ہجرت کی ہوئی ہماری ایک نسل اور تہذیب کا ... بھی ہے۔

★ اسرار اکبر آبادی — ... (دبئی)

"اردو کی نئی بستیاں" شائع کر کے آپ نے عملی انداز میں ان تمام لوگوں کو فیصلہ کن جواب دے دیا ہے۔ جو اردو کا ... بدلنے کا ... مذکورہ مشترکہ شمارہ اردو کے بہت سے مسائل کا بھی جواب ہے ... ہندو پاک سے باہر اردو کے روشن مستقبل کے لئے باعث تقویت ہے۔ ... (آئینہ) کا اعلان بھی بہت مبارک ہے۔

★ عتیق الظفر P.O BOX 10894 DOHA-QATAR

شاعر کے دو شمارے ... ایک ہی سرورق میں ... ہونے ... خوبصورت ہے۔ شاعری اور اس کی ... سے متعلق سیماب اکبر آبادی کے خیالات نہ صرف اچھے بلکہ شاعروں کے لئے واجب العمل ہیں۔ "اردو کی نئی بستیاں" عنوان بہت ... آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ "یہ ۳۸ شعراء کے کلام کا اولین گلدستہ ہے جسے کسی خاص معیار کے بجائے بطور تعارف پیش کیا گیا ہے۔" "اردو کی نئی بستیوں کے شعراء" کو ... آپ کی ... کی صداقت سے انکار نہیں لیکن ذاتی طور پر مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ آپ نے ۳۸ شعراء کو کسی معیار کے بجائے بطور تعارف پیش کیا ہے۔ اور یوں محسوس ہوا کہ کئی شاعروں کو آپ نے صرف اس عنوان کی رعایت سے اس خاص شمارے میں شامل کر لیا ہے۔ جبکہ شاعر کے معیار کا خیال رکھنا میں سمجھتا ہوں آپ کی پہلی خواہش ہونی چاہئے۔ اردو کی نئی بستیوں میں یقیناً دوسرے نام بھی ہیں لیکن معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ ان بڑے ناموں نے ... اللہ ... ندیم ... خاص ... تسنیم سید کی نظمیں اچھی لگیں ... دانش کی نظم "..." پسند آئی۔ سعودی عرب سے ... نے کئی اچھے شعر دیئے۔ ... کاوش، عباسی، محمد صادق ... اور عذرا القوی کی تخلیقات غنیمت ہیں۔ امریکہ سے حمیرا رحمان اور قمر ... بھی اچھے رہے۔ حنیف اختر کی ... غزلیں بھی ٹھیک ہیں۔ لندن سے اکبر حیدرآبادی ... اور باقر نقوی کا کلام ... جمشید مسرور کی ... ہے۔ ان دونوں شماروں میں شامل نثری نظموں کے خیالات پسند آئے۔ لیکن نظموں میں آہنگ کے فقدان کے سبب لطف نہیں آیا۔ نہ شاعری جیسی کوئی بات لگی۔ اس طرح کے خاص شماروں کے سلسلے میں ایک درخواست ہے کہ ان میں کسی شاعر کی کم سے کم دو تین غزلیں شامل فرمائیں تاکہ شاعر کا تعارف بھی ہو سکے۔ اور اسکی شاعری کے متعلق کوئی رائے بھی قائم کی جا سکے۔ مجموعی طور پر شمارہ "اردو کی نئی بستیاں" بہت پسند آیا۔ لیکن توقع ہے امید ہے اس کا دوسرا حصہ بہتر ہوگا۔ آپ نے اردو کی نئی بستیوں کی جانب جو خصوصی توجہ فرمائی ... ہے مجھے یقین ہے کہ اس کا نتیجہ بہتر ہوگا۔

★ جاوید اکرم — ...

شاعر کے تازہ شماروں میں "اردو کی نئی بستیاں" عنوان سے آپ نے تاریخ ادب اردو کا ایک نیا باب وا کیا ہے۔ بلاشبہ ان شعراء کے کلام میں تنوع، فکر اور تلاش کے ساتھ ساتھ ایک نیا اور منفرد آہنگ بھی ہے۔ شاعری کی قدامت، انفرادیت اور مقبولیت کے بارے میں ... جانا جاتا ہے۔ اس ادبی رسالے کی ... اجتہادی کوشش ... بن گئی۔

★ اظہر ... — ۱۵۸ ... سیکٹر ...

شمارہ ... میں بشیر بدر پر ندا فاضلی کے مضمون کو پڑھ کر مسرور ہوا۔ انہوں نے نہایت ہی خوبصورتی اور خلوص کے ساتھ بشیر بدر کے مزاج اور ان کی شاعری سے روشناس کروایا ہے۔ مگر میں بشیر بدر کو ہندوستان کا اولین شاعر تسلیم کرتا ہوں جس نے عالمی شہرت حاصل کی۔ ... آپ اردو زبان کے لئے ایک بڑا ... شاعر کے ذریعہ اردو کی نئی بستیاں کے تحت عالمی ... کو ہم لوگوں سے روشناس کروایا۔ اس کے لئے ... طرح کے شکریے کے مستحق ہیں۔ ... لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ آپ نے یہ سلسلہ جاری رکھا تو ... خوشی محسوس کر سکیں گے۔ ... باعث مسرت ہے کہ آپ اتنا متنوع اور معیاری مواد فراہم کرنے میں کامیاب ہیں۔ آپ کے خلوص اور محنتوں کا ثمر ضرور ملے گا۔

★ خالق بخشی — 60 ROMA ROAD WALTHAMSTOW, LONDON E17 6HA

"فکر امروز" از علامہ سیماب ادب سے سر جھکا کر پڑھا۔ حضرت ... کی ہدایات کو جذب دل کیا۔ خدا کرے ... ان کے کہے پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے — آمین۔ اپنی غزل کی اشاعت "شاعر" میں دیکھ کر ایسا لگا میں بھی شاعروں کی صف میں ہوں۔ البتہ شاعر کہلانے سے پہلے شاعر ہونا ضروری ہے۔ جس کے لئے ایک عمر درکار ہے۔ ... میسر ہوا ... استاد کے سر ہے۔ ...

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰

شاعر

بیادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۴ واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

12/93

جلد — ۶۴

شمارہ — ۶

فون: ۳۵۹۹۰۳

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاون

ناظر نعمان صدیقی

قیمت — روپے

زرِ سالانہ ۶۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۷۵ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

ناشر شاعر مکتبہ قصر الادب بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی

فکر امروز



ہندوستان میں ہر اس چیز کا سانچہ بنا لیا گیا ہے جو تمدن، تہذیب اور عمرانیت کی ترقی کے لئے مفید ہے لیکن ان سانچوں میں ڈھلنے والے مادے وہ نہیں ہیں جن کی ہمیں واقعی ضرورت ہے۔ ڈھلنے والی چیز کمزور اور مواد ناقص ہے تو سب سے پہلے ہم صحیح سامان اور مواد کیوں نہ پیدا کریں تاکہ ہماری درس گاہیں، لائبریریاں، مشاعرے، نصاب، غرضیکہ ہر چیز مکمل و مرتب ہو جائے۔ ہندوستان کا ہر تعلیمی و ادبی ادارہ بیش از بیش مفید ہو سکتا ہے اگر اسے ضرورتِ زمانہ کے مطابق مفید سامانوں اور مفید طرائقِ کار سے بدل دیا جائے۔

سیماب اکبرآبادی

نہ جاگتا ہے ـــــ نہ خواب میں ہے

حکومت وقت کو معلوم ہے کہ اردو والوں کے گمبھیر مسائل کو اسی طرح دبایا جاسکتا ہے کہ ہر صوبے میں اردو اکاڈمیاں قائم کر کے سالانہ لاکھوں روپے کی گرانٹ دے دی جائے۔ (دہلی اردو اکاڈمی موجودہ سالانہ بجٹ اسی لاکھ روپئے ہے) مرکزی صوبائی سطح پر اور بھی بہت سے اداروں کو سرکاری گرانٹ ملتی ہے۔ (سو لاکھ روپئے ترقی اردو بیورو کی ڈکشنری کے لئے دیئے گئے ہیں۔) اسی طرح سالانہ کروڑوں روپئے اردو کی ترویج واشاعت کے لئے سرکار سے مل جاتے ہیں۔ اور تمام اردو والے ان کروڑوں روپوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ اب جو آوازیں ابھرتی ہیں۔ وہ مطالبوں اور مراسلوں سے علاوہ نہیں ہیں۔ وہ بھی اداروں ہی کے رہ رہ۔ خانہ پری تو بہر حال ہوتی ہی ہے عمل کے نام پر بلکہ کر دکھانا بھی ہوتا ہے۔ مشترکہ کلچر میں اردو کے نام پر ہندی کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ جبکہ ہندوستانی فلمیں، فلموں کے گانے اور غزل گائکی اس سے ہندی ہی کو تقویت مل رہی ہے۔ کسی نے احتجاج نہیں کیا۔ تحریک نہیں چلائی کہ فلموں کی زبان ۹۰ فیصد اردو ہے یا اردو ہندی ہے تو اسے "ہندوستانی" سرٹیفکٹ ملنا چاہیئے۔ یا اردو ہندی کا۔ ہندوستانی زبانوں میں بننے والی فلموں کو صدر ایوارڈ دیا جاتا ہے۔ اس سال سنسکرت فلم کو بھی ایوارڈ ملا ہے۔ مگر کبھی بھی کسی اردو فلم کو ایوارڈ نہیں ملا کیوں کہ اردو میں فلمیں کہاں بنتی ہیں۔ سب کچھ ہندی کے کھاتے میں چلا جاتا ہے۔ ہندی پریس نے اپنے روزناموں اور ہفت روزہ جریدوں کی زبان اردو آمیز رکھی ہے۔ مگر قومی ٹیلی ویژن اور ریڈیو اپنے نشریوں اور خبروں کو زیادہ سے زیادہ سنسکرت بنانے کی شعوری کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اب جو تے سیریلز آرہے ہیں۔ ان کے نام اور زبان کا لہجہ ہندی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ ابھی ہوئی زبان اور بولنے والوں کا شین قاف درست نہیں۔ وہ لفظ جو مشترکہ ہندوستان کا مزاج ہیں۔ روز مرہ ہیں۔ انھیں تیزی سے تبدیل کیا جا رہا ہے۔ نئی نسل، ہندی، انگریزی اور علاقائی زبانوں سے مرتب ہو رہی ہے۔ ملک کی موجودہ بدترین سیاسی صورت حال میں انگریزی پریس اور علاقائی زبانوں کے اخبارات سے جڑنے والی نئی اردو اب ٹی وی سے بھی نہ صرف پیچھے ہو گئی ہے بلکہ بڑی شدت کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے۔ قومی ٹی وی کا میٹرو چینل، پانچ نئے چینل، سٹار ٹی وی کے پانچ چینل (مقبول ترین ــ ایم ٹی وی) ، زی ٹی وی، سی این این والے ٹی این کو اوڑ پی ٹی وی ـــ ۲ سعودی عرب، فرانس، دبئی، مصر ٹی وی، کے پروگرام ۲۴ گھنٹے بھی نا کافی ایک زبردست ہوڑ ہے۔ اور اب تو ریڈیو پر بھی ایف ایم چینل کے ساتھ ہمہ وقت پروگرام حاضر ہیں۔ ناخواندگی کی شرح اور معاشی بدحالی کے درمیان یہ بکھرے ترقی اپنے اثرات تیزی سے پھیلا رہی ہے۔ اور اب تو انٹرنیٹ ٹی وی چینل بھی شروع ہونے والے ہیں۔ اب کھیں یا کتابوں، رسالوں سے نکل رہی ہیں۔ اور اردو والے ابھی تک بھی مطالبوں اور مراسلوں سے اوپر نہیں اٹھ سکے ہیں۔ ہمارا مسئلہ شعر و ادب نہیں ہے۔ ہمارا اصل اور بنیادی مسئلہ ذریعہ تعلیم اور اردو ذریعہ معاش ہے۔ نئی نسل اردو سے بیزار ہوتی جا رہی ہے۔ غیر اردو داں طبقہ اردو کی طرف نہیں آ رہا ہے۔ ملک کی تبدیل شدہ اقتصادی پالیسیوں کے تحت فیصلے اور ہو گئے ہیں۔ اردو کو معاشی وسائل سے پوری طرح جوڑنے کا وقت ہے۔ ٹکڑوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے اردو والے اپنے اغراض اور ذاتی مسائل سے باہر آئیں اور سے ملک کے تئے تعلیمی اور سماجی سطح پر کسی عملی تحریک کو ترتیب دیں۔ اگر اردو کے یہ بنیادی مسائل، باوجود تمام کوششوں کے حل نہیں ہوتے تو ہمیں سرکاری امداد سے چلنے والی اردو اکاڈمیوں، اداروں اور انجمنوں سے باہر آجانا چاہیئے۔ ہمارا مسئلہ شعر و ادب ہے، نہ اکاڈمیاں، نہ کوئی ڈکشنری۔ تعلقات و اعزازات نہیں اور۔ ملک گیر سطح پر اردو کے لئے ایک ٹھوس ایک تحریک آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسے شروع کیجئے۔ دوسری زبانوں، قوموں، سیاسی پارٹیوں سے سبق حاصل کیجئے۔ یہ وقت عمل کا ہے۔

افتخار

[illegible]

شمارہ نمبر ـ ۶ [۱۹۹۳] جلد ـ ۶۴



دہلی
22.5.1973

بھائی اعجاز . تسلیم و نیاز .

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

آپکا

معروف افسانہ نگار، ادیب اور بڑے بھائی کرشن چندر کے دست راست مہندر ناتھ
[پ: ۲۲ رنومبر ۱۹۲۳ء پونچھ (کشمیر) - م: ۲۰ رمارچ ۱۹۷۴ء بمبئی] مدتوں شاعر کی ادارت میں شامل رہے۔
ان کے فن پر تحقیقی کام باقی ہے۔ [الف الف]



شہاب سرمدی

۹۴۴۔ دودھ پور، سول لائنز، علی گڑھ۔۱

شعر جارسیؔ میں تغزّل

نام کوئی بھی، اور تعلق کسی بھی زبان یا عزیز شہر سے، دے لیجئے، "تغزّل" چیز ہی ایسی ہے کہ سپاٹ طبیعتیں بھی اس کی زد میں آ ہی جائیں تو کیا مجال کہ جھوم جھوم نہ جائیں۔ پھر وہ "تغزّل" جسے فارسی غزل اور دیسی گیت نے "دو آتشہ" بنایا تھا۔ ایک نے سرمستی، دوسرے نے سرور کو سر چڑھا کر، جس میں تصوّف اور بھگتی کا سارا رس سمویا ہوا تھا۔ جس نے سنسکرت "بھاکاویہ" اور فارسی "رزمیہ" کے بر وزن "بزمیہ" کی صحبت میں ایک نیا لہجہ اپنایا تھا، اور پھر سب سے بڑی بات کہ جو جارسیؔ جیسے صاحب اختیار و اقتدار کے ہاتھوں "سہل ممتنع" کا فن بن سکا ہو، حتیٰ کہ اسے میرؔ و غالبؔ کے لئے بھی مثال قرار دے سکتے ہوں، اس کا کیا کہنا۔!

"تغزّل" اب شعری جمالیات کی ایک اصطلاح بن چکا ہے، نہ غزل سے مخصوص، نہ صرف اسی تک محدود۔ اس لئے کہ نہ جانے کتنی مشہور غزلیں ایسی ہیں جن میں تغزّل بھی برائے نام۔ اس کے برعکس عالمی ادب میں ان نظموں کی کمی نہیں جو تغزّل کا شہپارہ کہی جا سکتی ہیں، مثلاً رگ ویدکی کچھ "رچائیں" یا بھگوت گیتا کے "اَنش" یا مثلاً شیکسپیر کے "سانیٹ" یا عربی کے اکثر قصائد یا جے دیو کے شہرہ آفاق "پد" یا گرودیو کے "گیت"، ایسی نظموں کو پڑھ کر جو لطف آتا ہے، جو "رس" پیدا ہوتا ہے اس میں آواز سے کہیں زیادہ الفاظ کی نغمگی کو دخل ہوتا ہے سُر سے کہیں زیادہ جذبے اور خیال کا آہنگ کارفرما رہتا ہے۔ اس کی نشاندہی جتنی دشوار ہے اتنا ہی پُر لطف کام ہے۔ اہلِ مغرب تو یہ مانتے ہیں کہ سیفو کے دور میں اور اس کے اثر سے پھوٹنے والے نغمے اس کی ابتدا تھے۔ لیکن ادھر، ہمارے یہاں کسی ساز یا مخرج آواز کو مبنیٰ قرار دینے کے بجائے لفظ یا بلکہ حرف کو بانی بمانی مانا گیا ہے، چنانچہ ویدوں کی اصطلاح میں حرف کو "وزن" یعنی رنگ کہتے ہیں، حتیٰ کہ ایک پورے عروضی سلسلے کو "ورنک سچھند" بول کر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ سارے وزن و آہنگ اور لہجہ و لحن کا دار مدار اس رنگا رنگی پر ہے جو حرف کے اَنسب و احسن دروبست سے فراہم آتی ہے۔

مختصر یہ کہ حرف یعنی "ورن" کے لفظ یعنی "شبد" بننے تک جو منزلیں طے ہوئیں انھوں نے رمزیت کے ڈھیر لگا دیئے۔ "شبد" ایشور ہے۔ "شبد" ہیشوہے، اس کی بڑائی بھگ، لیکن شبد ہی علم ہے، شبد آدم ہے اور شبد اکشر یعنی لافانی ہے، پھر شبد ہی معنی ہے۔ شبد ہی لے ہے اور سب سے بڑی بات کہ شبد ہی یہ دشُوک [illegible] کا اظہار ہے جس نے لوک، پرلوک سے پرے دھوتیا لوک، ایک نئے عالم کے دروازے کھول دیئے۔ یہ نیا عالم تھا حسیات اور شعریات کا، اس ایمائیت کا جسے پرتیت، دھونی کہا، اسی لئے گیا کہ ہر لفظ جب شعر میں ڈھلتا ہے، جذبے میں خمیر ہوتا ہے تو ایک دوسرے لفظ کی ایما بن جاتا ہے، بالکل جیسے ایک رنگ سے دوسرا رنگ پھوٹ پڑے، یا ایک بات میں دوسری بات کی گونج سنائی دے۔ . . . .

ملاحظہ فرمایئے میرا کہتی ہیں:۔

اے ری!
میں تو دَرَد۔ دِوانی
میرو دَرَد نہ جانے کوئے

ایک دوسری جگہ فریاد کناں ہیں:
گھنا گھناں گھس گئیں ریکھیاں آنگریاں کی ساری
اَجہوں نہ آئے مُراری۔۔۔

یہ میرا کی "انکھیاں ترسانیاں" والی غزل کی طرح پہلے کی شاعری ہے۔ آپ اسے "پد" کہیں، "گیت" کہیں، لیکن اس کا لب و لہجہ، مزاج و کردار یہاں تک کہ

اس کی اصطلاحی زبان کا فارسی نو لیجیا ہونا قابلِ توجہ ہے، اور "تنزل" کے حیثیت غالب کا دونوں میں مشترک تھا اس سے بھی زیادہ خیال انگیز یہ "تنزل" "گفتگو گرفتہ یا زناں" اور سنگھار کرن شبابت رس کی ملی جلی اوا دیکھی جا سکتی تھا۔ اس کا بنیادی تھا پیار محبت یعنی دل کی داستان بیان کرنا، کسی کی آرزو میں دن رات مگن رہنا، خوابوں کی دنیا بسانا، امید پر مرنا جینا، آس، نراس کی منزلوں سے گذرنا، ماضی و مستقبل سب سے بے نیاز، حال کو گلے لگانا، اور ملن کا ہنر۔

تصوف نے اس تنزل پر اور معاصر دھرتی، ماورائیت کی۔ اسی طرح بھکتی نے ایک اور نشتر تیز تر کر دیا۔ پریم۔ مارگ کے روپ میں، جاہ سیؒ میرا کے ہم عصر تھے۔ وہ اپنے سدا بہار دوہا کا دیپ د طویل مثنوی، پدماوت کے تتمہ میں ایک بیت دیتے ہیں۔

محمد یہہ کب جور سنا وا شنا سو پیم پیر گا پاوا

میں نے یہ داستان نظم کر کے سنا دی۔ جو سن سکا وہ "دردِ عشق" کا بھید پا گیا۔

"پیم۔ پیر" فارسی کم تصوف کے "دردِ عشق" سے کچھ زیادہ ہی "تنزل آب" ہے۔ اس لئے کہ یہ "عملی" زیادہ اور "تجریدی" کم ہے فیا سا اُسی کم دکیف کی حد تک جو تصوف میں یہاں آکر بھکتی کے میل جول سے پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ میرا کا دَرَد (بہ فتحہ سابقین) اور دَرد (بہ سکون ثانی) "اہلِ سلوک کا" ایک نہیں، یہاں تک کہ حضرت شرف الدین یحیٰ منیریؒ جب فرماتے ہیں کہ

سُرَق پھرف ہاں کہیں، "دَرَد" کچھ، نہ بسائے "گرَد" بچھو نہیں دَر بار کی، سو "دَرَد" دور چھوٹ جائے (تصحیفِ حرف)

تو یہ "دَرد" بھی صرف بھاگتا ہی نہیں بھاگتی کی ہتکاری تحریکِ بھکتی کا بہتر ترجمان ہے، فارسی اور تصوف کا اس کے بعد، دراصل یہ حضرت عیسیٰ تصوف کے ایک وستینو تھے، مزید وضاحت کے لئے ایک مثال اور

جاں زتن بُردی و در جانی ہنوز دردہا دادی و درمانی ہنوز

یہ معروف مطلع حضرت امیر خسروؒ کا ہے جن کا مسلک اور منشا یسیر و سلوک وہی ہے جو حضرت یحیٰ منیریؒ کا! پھر بھی "درد" دونوں کا ایک نہیں اس لئے کہ مقدم الذکرؒ ایک تو کوئی ایک "درد" نہیں سمجھتے بھی "درد" ہو سکتے ہیں۔ سب کو نظر میں رکھ کر بات کرتے ہیں یا دوسرے یہ سارے "درد" (درد) ان کے نزدیک "عشق" سے شروع ہو کر سنو ریحات اور اندازہ کائنات تک جاتے تھے۔ جاہ سیؒ کا "پیم۔ پیر" بھی بہتا تھا، البتہ "انش۔" روپ ہے وہ عورت، وہ بھی ہندوستانی عورت، کی کہانی، اسی کی زبانی تھا۔ پھر ایک بات اور، جاہ سیؒ عالم ہی نہیں، "اُلَّم" تھے، صوفی باعمل تھے، اور، یہ سب ہوتے ہوئے بھی ٹھیٹھ دیہاتی اور پنڈت کسان تھے۔ روایت بالتواتر ملتی ہے کہ شیر شاہ سے ان کی ملاقات کھیت کی مینڈ پر ہی ہوئی تھی۔

ایک ہی شخصیت کے دو روپ، یہ ظاہر اصل بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں، لیکن انہیں میں جاہ سیؒ کے فکر و فن اور ان کے زبان و بیان کا ذہنی پس منظر تھا۔ وہ جتنے ٹھیٹھ دیہاتی تھے اتنی ہی ٹھیٹھ ان کی اودھی تھی۔ اور وہ جتنے پنڈت کسان تھے اتنے ہی اس زندگی کے رسیا بھی تھے جو دل کی مٹھیا سے اُبھی ہے۔ تو ریگوں اور تیسوؤں میں رنگ لاتی ہے۔ پنڈول سے بنے، گوبر سے لپے، نیچی نیچی کچی دیواروں پر کھپریل سے ڈھکے مکان، سویا سیا سا گاؤں سگڑ بیتا جاگتا جگت، دور پر ٹھاکر صاحب کی گڑھی، تو اس سے بھی دور پیر تیوں سے اس پار "میر صاحب" کی لگوائی ہوئی ہاٹ، ان کے بیچ بیچ کھیت، گہرے تالاب، اور بل کھاتی پگڈنڈیاں، ان سے ترتیب پاتا ہے وہ "تانا بانا" جو بار بار ابھر کر سامنے آتا ہے، یہی نہیں جو شاعر کو الہام ہے اسے ایما، واشارہ اور تشبیہہ و استعارہ کی ندرت بھی فراہم کرتا ہے۔

اسی باعث شعرِ جاہ سیؒ کا "تنزل" "از دل خیزد بر دل ریزد" کی اچھوتی مثال ہے، وہ زندگی ہی نہیں، زندگی کی رنگا رنگی کا ہمزبان ہے، ایک دن کی بات ہے وہ جارسی کی گلیوں سے گذر رہے تھے، بھڑ بھونجے کی بھاڑ دھک رہی تھی۔ بھنتے چنے کی خوشبو ناک میں پہونچی تو بے چین ہو کر بولے

ہس کے جرّے تو کس نہ ہکے (ایسے جلے تو کیوں نہ مہکے)

شدید سے شدید احساس کو لفظ دے سکنا، وہ بھی اس سلیقے اور سجیلے سے ساتھ کہ سننے پڑھنے والے تک پوری بات پہنچ جائے، اور اس میں جو چوٹ اور جو لطف ہے وہ اس طرح ابھر آئے جیسے ایک حسین پیکر۔ یہ ہے جاہ سیؒ۔ آرٹ، کا کرشمہ، اور تنزل اس "آرٹ" کا ایک شیوہ خاص۔ یہ الفاظ پروفیسر رشید احمد صدیقی شعورِ جاہ سیؒ اس "تنزل" کو "تازگی، توانائی اور ظرافت" بخشتا ہے، حتیٰ کہ وہ شاعری جس کا موضوعِ سخن گاؤں۔ دیہات کی

سیدھی سادی روزمرہ کی زندگی ہو، اس کا اپنا جو فاید لے یہ غزل فارسی غزل کا اتنا کو اس درجے پا لیتا کہ اساتذہ اہلِ ایران، وہ بھی خود رومی و نظامی، سعدی و جامی، سنائی و حافظ "جیسوں کے جو لانگ کے اشعار اودھی میں اوتارلیں تو اپنی بلندیوں پر قائم رہیں، بلکہ کہیں کہیں گہرے اور اونچے ہو جائیں، یہ تغزل" کی تازگی اور توانائی " کی وہ فراخی ہے جسے استعمال کے لیے ایک نئی ترازو ہاتھ میں لینی ہوگی۔

اندازہ لگائیے: خواجہ صاحب کا یہ مصرع خود تغزل " آج بھی گنگناتا ہے۔

کہ عشق آساں نمود اوّل ولے افتاد مشکلہا

جائسی اپنی ایک چوپائی میں اسی مصرعہ اور اسی " تغزل " کو اس طرح سموتے ہیں۔

پہلے وہ سکھ نیہہ جب جوڑی پُنی ہوئی کٹھن نبا ہت اوری

بات ہو بہو وہی ہے پھر چونکہ سلاست بھی ہے، مستی " تغزل " کی جان ہوا کرتی ہے، اس لئے بات دو ٹوک کی گئی ہے، کہ محبت شروع میں آسان لگی ہے، بعد میں مشکلیں آڑے آئی تھیں۔ مگر جائسی کو شاید اس کا احساس تھا کہ بات " خواجہ صاحبؒ " سے ملے تو ان کے معنوی سرخرو ہونا بھی ضروری ہے، چنانچہ کہا انہوں نے بھی وہی مگر حسبِ عادت اتنا سجا سنوار کے کہ تخلیقی فنکاری کا حق ادا ہو گیا۔

اسی طرح خواجہ صاحب ہی نے فرمایا تھا۔

آسماں بارِ امانت نہ توانست کشید قرعۂ فال بہ نامِ منِ دیوانہ زدند

جائسی نے ایک بار پھر حق ادا کیا ہے، کہتے ہیں۔

جو دکو کٹھن نہ سہا پہاڑ سو انگوا مانس سر بھار

فارسی میں کہا گیا تھا کہ جسے آسماں بھی نہ اٹھا سکا وہ " بارِ امانت " دلِ دیوانہ کے سپرد ہوا۔ اور اودھی میں اس طرح آیا کہ جو " کٹھن دکھ " پہاڑ بھی نہ سہہ سکے اسے آگے بڑھ کے انسان نے اپنے سر لے لیا۔

اس مرکزی خیال کے اردگرد گھومتے ہوئے اشعار اردو، فارسی میں ان گنت ہیں، البتہ دکھ درد غم کے ذہنی کرب کے ورثہ داروں کو "بارِ امانت" جاننا میر و غالب کو چھوڑ کر کیا ہے۔ جائسیؒ اس ذکر و فکر کے تاثر اولی تو بھی شارح اولی ضرور رہتے۔ اسی طرح اہلِ حال کے حسبِ حال اشعار، جن کی تڑپ کو وقت نے بھی عزیز رکھا ہے۔ بہتیرے ایسے ہیں کہ جائسیؒ کی اودھی میں عزیز تر ہو گئے ہیں جیسے

فارسی

رشتہ در گردنم افگندہ دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

اودھی

رنگ ناتھ ہوں جاکر، ہاتھ اوہ کے ناتھ گہے ناتھ سو کھانچے، پھیرے پھرے نہ ناتھ

دوست نے محبت کے رشتوں میں جکڑ رکھا ہے، جدھر جی میں آتا ہے لئے جا رہا ہے۔ یہی فارسی بیت اور اودھی دوہے میں کہا گیا ہے، ایک میں " رشتہ " یعنی " تاگا " " دھاگا " " رسی " یا " ڈور " کا لفظ کلیدی ہے دوسرے میں " ناتھ " کا۔ " ناتھ " ٹھیٹھ بول چال کا لفظ ہے۔ موم سے بٹی ہوئی ڈور جو بیل کی ناک میں ڈالتے ہیں کہ وہ قابو میں رہے اور رسی کے اشارے پہ چلے " ناتھ " کہلاتی ہے۔ لیکن " ناتھ " مالک و مختار اور دلبر و دلدار کو بھی کہتے ہیں اور " ناتھنا " ہوتا ہے " ناتھ ڈالنا " حلقہ بگوش کرنا۔ اس طرح " رنگ ناتھ " کی ترکیب کا مفہوم ہوا " زنجیرِ عشق میں نتھا ہوا " یا " اس کے رنگ میں رنگا ہوا "؛ پھر اسی " ناتھ " سے " نتھ " بھی ہے۔ جوانی اور کنواری ہونے کی علامت، اور سہاگ کا پیش خیمہ۔

اب دوہے پر تنقید کیجئے؛ " ہاتھ اوہ کے ناتھ " بلیغ ترجمہ ہے " رشتہ در گردنم افگند دوست " کا، اور " گہے ناتھ سو کھانچے " قریب قریب لفظی ترجمہ ہے " می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست " کا۔ لیکن " پھیرے پھرے نہ ناتھ " یہی اضافہ ہے؛ بہر صورت ایک اضافہ۔ بہر صورت اس لئے کہ ابہام کو حل کرنے کے بعد بھی ایک صورت رہ جاتی ہے، اصطلاحی محاورے " ناتھ پھرنے " کی۔ ویسے تو اودھی میں " ناتھ پھرنا " ہوتا ہے

مٹ جانا، پاگل ہو جانا، لیکن ناتھ پھرے ماتھو نہ پھرے، ایک اصطلاحی محاورہ ہے۔ "کنبھی" (کسانوں کی طرزِ زندگی) سے متعلق۔ یعنی بیل کی "ناتھ" اتنی کھلی ہوئی مضبوط ہو کہ ادھر ادھر ہو سکے لیکن بیل کا ماتھا سیدھا رہے، وہ ادھر ادھر نہ ہو سکے۔ جائسی نے حیاتِ انسانی میں جبر و اختیار کو اسی طرح سمجھا ہے، انہوں نے جینے والے کی مجبوری کو "پھرے پھرے نہ ماتھو" کہکر اردو اور فارسی دونوں محاوروں کے ذریعے عجیب چابکدستی سے درشایا ہے۔ یعنی ناتھا بیل پھر کے اپنا ماتھا نہیں پھرا سکتا۔ اسی طرح انسان اپنے ماتھے کا لکھا (نوشتۂ تقدیر) نہیں مٹا سکتا، چاہے کتنی تدبیر کر دیکھے۔

فارسی کا ایک اور شعر ہے، اسی طرح ادھر بھی وجد و کیف کا مرقع:

بہائے خویش می دانم کہ نیے جو نہ می ارزد
اگر مولا نظر سازد بہا یابے بہا گردد

تمام تر اسی مسلک کا جو شعر، پیکر بدل کے، مگر "تغزل" کو شرماکر کے جائسی نے کہا، ہر سمت ہر جہت سے نظر کا مستحق ہے، فرماتے ہیں۔

ماٹی مول نہ کچھ لہے، او ماٹی سب مول
دِسٹ جو ماٹی سوں کرے، ماٹی ہوئے اَمول

(مٹی کی کوئی قیمت نہیں، اور مٹی ہی سب کچھ ہے۔ اس کے لئے ذرا توجہ ہو جائے تو یہی مٹی انمول ہو جاتی ہے)

انسان مٹی ہے: یہ بیان واقعہ بھی ہے اور مرکز رمز و کنایہ بھی، مگر کسی کی "نظر" ہوتے ہی اسی مٹی کا انمول ہو جانا یہ ایک "منزل" ہے ایک "مقام" ہے۔ جائسی کا دوہا۔ ہمیں پر سبقت لے جاتا ہے۔ اس کے "چار" "چرن" "سب کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ" کہہ جاتے ہیں۔ اس لطف بیان اور اس کی بسیار شیوگی کو "تغزل" ہی تو کہیں گے۔:

جائسی نے یہ رچا ہوا "تغزل" فارسی سے حاصل کیا اور اس پر "گیت" کا رنگ ایسا چڑھایا کہ ان کا سارا کلام برتا غزل کی زبان ہے۔ اور بول لگتا ہے گیت کے۔ "ناگ متی" کا "بارہ ماسہ" شروع سے آخر تک یہی کرتا ہے۔ وہ کہیں غزل ہو جاتا ہے، کہیں گیت۔ اور کہیں دونوں کو اپنے اندر اس طرح سمو لیتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے "شیراز" کی بہار، "برج" بھوم میں بسنت منا رہی ہے۔

بارہ ماسہ ایک برہنی (فراق زدہ چاہنے والی) کی زبانی ہے۔ یہ خالص لوک گیت کی صنف ہے۔ اس لئے اس کی زبان اور بھی ٹھیٹھ ہے پھر بھی جائسی نے اس کے لفظ لفظ میں وہ سب کچھ بھر دیا ہے جو صرف ان کے اجتہاد کی دین ہو سکتا ہے۔ اندازہ لگائیے "طولِ شبِ غم" فارسی غزل کا جانا پہچانا موضوع ہے۔ جائسی کہتے ہیں ؎

"پل پل، برس برس برجائی
پہر پہر جگ جگ نہ سرائی"

(ایک ایک لمحہ ایک ایک سال کے برابر۔ پل سے بیت رہا ہے۔ ایک ایک پہر ایک ایک جگ پر بھاری ہے۔)

یہی "ٹیس" یہی "کسک" پورے بارہ ماسے کی پونجی ہے۔ مثالوں سے شاید آپ اکتا جائیں، اس لئے رواں دواں نثر میں وہی بات سنئے۔

- "اساڑھ چڑھ آیا، کالے سانولے بادل منڈلائے، آسمان پہ نقارے سے بجنے لگے، تمہارا کوئی سندیس نہ ملا۔۔۔ بجلی چمکی، گھٹائیں اور بھی جھک آئیں، تم اب بھی گھر نہیں آئے۔"
- "دادر، مور، پپیہا، کوئل سب دیوانہ وار چیخ رہے ہیں، یہ آوازیں مجھے جینے نہیں دیں گی۔ میں اکیلی کیا کروں، سر پہ چھاؤں کے لئے ایک چھت تھی وہ بھی ٹپکنے لگی۔"
- "ساون کے جھولے پڑنے تو لگے کیا! میرا دل تو پریتم بن ہوریسے رہا ہے۔ میں ہنڈولے پر چڑھ کر کیا کروں گی!"
- "آسمان پر بگلوں کی قطاریں! کاش میرے بھی پنکھ ہوتے تو میں اڑ کر ان کے پاس پہنچ جاتی۔"
- "بھادوں کی اندھیری راتیں! ایک ہٹی سے بیٹھ کے رات بھر جاگتی ہوں۔ دل کو اس طرح نہ دباؤں تو اس کی دھڑکنیں سینہ چیر کر باہر آجائیں۔"
- "بیر کنوار! پناہ دے! پناہ! میرے پالنے والے! اب تو کوئل بھی چپ ہوگئی۔ شاید اس کا چاہنے والا آس سے آن ملا۔"
- "کاتک کی چاندنی پھیل رہی ہے۔! کوئی اس چودھویں کے چاند سے پوچھے کہ اسے سارے سنسار کو ٹھنڈک پہنچانے والے، میرے کلیجے میں کیوں آگ لگی ہے؟"
- "اگہن بھی آگیا۔ اسے گھٹتے ہوئے دن اور بڑھتی ہوئی راتو! تم ہی بتاؤ! سب نے ہلکے ہلکے بستر نکال لئے، میں کیا کروں؟"

"پوس لاگے جاڑے اور یہ تنہائیاں! دیکھو نا! میری سیج ایسی ٹھنڈی ہے جیسے ہمالہ کی برف میں "بسی" ہو۔"

"ماگھ! یہ تو وہ مہینہ ہے جب پھولوں میں "رس" بھرنے لگتا ہے، مگر میں کیا کروں! اپنے جی کو کیسے سمجھاؤں؟"

"جاڑے بیتے، پھاگن کا ہرکارا چلنے لگا۔ پت جھڑ شروع ہوا، میں اس موسم سے سوال کرتی ہوں کہ پھل پھول والی شاخیں جو ننگی ہو گئی تھیں ان میں نئی کونپلیں پھوٹ آئیں، مگر میری جوانی کا بسنت ایسا گیا کہ اب تک نہ آیا۔"

"چیت، چتیا، ٹیسو پھولے، آم بورائے، کویل کوکی؛

"اے میرے پردیسی! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"
بس اب تم آجاؤ!!"

اور اس کے بعد جیٹھ۔ بیساکھ کی گرمیاں آئیں تو وہ ایک بار پھر اپنے پردیسی ساجن کو مخاطب کرکے کہتی ہے:

"دیکھ رہے ہو نا! اس تالاب کو کہ اس کا پانی جوں جوں گھٹتا ہے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا جا رہا ہے۔ بس اب میں تمہیں اپنا حال کیا بتاؤں ..."

یہ بارہ ماسہ اصل میں پڑھنے کی چیز ہے، بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ "بار بار" اس لیے کہ "تغزل" اور "رس - بھاؤ" کے ساتھ ساتھ "تصوف" اور "بھکتی" کا جو پکا رنگ اس پر چڑھا ہوا ہے اس کا تقاضہ یہی ہے۔ دوسرے، ایک بات اور "تصوف" کا بنیادی موضوع "فراق" اور بارہ ماسہ کا بھی تمام تر وہی، اس لیے جائسی نے:

آہ جو ماری "برہ" کی، آگ اٹھی تہہ ہانک

سے بات شروع کر کے اسے "سیر و سلوک" کی ہر منزل سے گذار دیا ہے —— فاعتبروا!!!



وحید اختر

ثباتِ سکوت

ہے کائنات سکوت، ایک بے کنار سکوت
سکوت، اتھاہ سکوت، ایک بیقرار سکوت
کبھی بھی در، کسی دل پہ بھی دیجئے دستک
جواب دینے کو آتا ہے بار بار سکوت
تھے کل تو نطق گیاہ و گل و در و دیوار
ہے آج ہر لب و چشم نگاہ دار سکوت
مکالمہ ہو تو کیسے کہ قطع ہوتی ہے بات
یہاں سوال ہزاروں، وہاں ہزار سکوت
ہزاروں میل کی دوری سمٹ بھی سکتی ہے
ہمارے گرد نہ کھینچے اگر حصار سکوت
یہ کائنات تو کل گفتگو سراپا تھی
ہر اک صدا ہے کیوں آج خندہ بار سکوت
جو تم تھے ساتھ تو ہر لمحہ تھا تکلم گل
جو تم نہیں تو ہے ہر سمت خار زار سکوت

تمہارے ہاتھوں کے پروردہ سبزۂ و گل و برگ
تمہاری آنکھوں سے روشن دریچہ و در و بام
تمہاری طرزِ خرام سبک کا شیدا گھر
تمہارے قرب کے نشے سے آشنا مے و جام
تمہارے خندۂ رخشاں کے خانہ زاد گلاب
تمہارے نطقِ خموشی کے رازداں در و بام
جو تم تھے ساتھ تو سب مجھ سے بات کرتے تھے
جو تم نہیں ہو تو کرتے نہیں ہیں مجھ سے کلام

میں چپ رہوں تو ادا سی سکوت بنتی ہے
میں لب ہلاؤں تو کرتا ہوں بات وحشت سے
قلم اٹھاؤں تو تنہائی تھام لیتی ہے ہاتھ
کتاب کھولوں تو معنی ہیں گم عبارت سے
اگر ہے نبض رواں خوں تمہیں پکارتا ہے
اگر دھڑکتا ہے دل، فاصلوں کی ہیبت سے
ہزاروں میل کی دوری سے یوں نہ یاد آؤ
سمیٹو فاصلوں کو دوریوں کی قربت سے
کہو زمان و مکاں سے، وہ مجھ سے بات کریں
کہو سکوت سے، کھولے زباں محبت سے
تمہارے نامہ و پیغام مجھ تک آتے رہیں
سکوت ٹوٹے حدیثِ وفا کی قرأت سے

یہ کائنات تو کیا، لاکھوں کائناتوں کو
کبھی تو میری صدا کے جواب دینے ہیں
یہ چند لمحے تو کیا ہیں ازل ابد کو بھی
زمانِ ہجر کے سارے حساب دینے ہیں

پکارتا ہوں تمہیں میں، مجھے پکارو تم
سرِ سکوت تمہارا جواب تو چمکے
سکوتِ تیرگیٔ شامِ ہجر ٹوٹے گا
تمہارے نطق سے مہکا گلاب تو چمکے
گرانیٔ شبِ یلدا میں خواب چمکیں گے
افق پہ، دور سہی، ماہتاب تو چمکے

● شعبۂ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی۔ علیگڑھ



مقصود الٰہی شیخ

1 81 THORNTON ROAD,
BRADFORD BD 8-8JU (U.K)

ایک سادہ سی کہانی

تیرہ نہیں، تین گھر بیچ تھے.

مرنے والی نے کہا۔

اسے بلا لاؤ ——

کسی نے نہیں پوچھا ——

کس کو؟

سب جانتے تھے، پورے محلے میں یہی دو گھر تھے جن میں بول چال یا سلام کلام نہ تھا!

کمرے میں بڑی سنگین خاموشی چھا رہی تھی۔ ہر عمر کی عورتیں وہاں موجود تھیں ثریا اتنی ہر دل عزیز تو دتھی مگر تیس سال سے ان کے بیچ رہ رہی تھی۔ پھر مرتے دم کون سا جھگڑا، کہاں کا قضیہ —— نہ لین نہ دین —— دیکھا جائے تو یہی ثریا تو تھی جو وقت بے وقت سب کے کام آجاتی تھی۔

آج وہ مر رہی تھی اور پڑوسنیں اسے الوداع کہنے کے لئے جمع تھیں !!

بے چاری ثریا !!!

وہ کوئی بری عورت نہ تھی تیس سال ایک ہی محلے میں ایک ہی گھر میں عزت سے بن مانگے تانگے گزار چکی تھی۔ بس ایک ٹھپہ لگ گیا تھا۔ ایک کرید تھی پیچھے کون ہے؟ کانا پھوسی چلی آرہی تھی کہ کسی کی رکھیل ہے۔ جوانی میں گھر سے بھاگی تھی۔ آخر وہ کون مرد تھا جس کے لئے ثریا نے جیون تج دیا۔ ساری عمر اکیلے گزار دی۔ کسی نے کسی کو اندھیرے سویرے، آتے جاتے دیکھا تک نہیں۔ نجانے کون ثریا کو اس گھر میں ڈال کر بھول گیا۔

مگر ثریا کے ہونٹوں پر کسی کی بے وفائی کی شکایت کبھی نہ آتی ——

پچھلے تین مہینوں سے وہ بیمار چلی آرہی تھی۔ کوئی منہ میں پانی ڈالنے یا دوا لاکر دینے کے لئے جھانکا تک نہ تھا۔ یہ تو ثریا کا محلے والوں کے ساتھ اپنا سلوک تھا کہ آج اسے تیمارداروں کی کمی نہ تھی۔

سچی بات ہے۔

پہلے پہلے اس کی بیماری کی خبر کسی کو نہ ہوئی۔ جب سامنے والے گھر میں بارات آئی تو اس روز سب کے تئیں پتہ چلا کہ ثریا بیمار ہے۔ مایوں پر، مہندی پر فلاں فلاں کام دھرا رہ گیا۔ حتیٰ کہ آج باراتیوں کے گلے میں ہار ڈالنے کو پھول منگوانے کسی نے یاد نہ دلائے۔ یہ سارے کام تو نیا کے ثریا ہی کرتی تھی۔ بارات، ہجوم اور رونق ایک طرف ثریا کہاں ہے۔ ثریا کہاں ہے سب کی زبان پر، اس طرح۔

ثریا کی غیر موجودگی سب کی نگاہوں میں آگئی اور یوں اس کی بیماری کا حال کھل گیا —— دوا، دارو کا سلسلہ ہوا مگر اسے صحت نہ ہوئی نصیبوں جلی نے ایسی چارپائی پکڑی کہ اٹھو کر نہ دی۔ دن بدن لاغر اور کمزور ہوتی چلی گئی مگر۔

بیماری میں بھی اس کا چلن نہ بدلا۔ پاس پڑوس سے جو عورت بھی آتی اسے یہی تاثر ملتا۔ جیسے ثریا ابھی ابھی کپڑے بدل کر لیٹی ہے۔ بال بنے ہوئے۔ مانگ کاڑھی ہوئی۔ صاف چہرہ چمکتی پیشانی۔ اداس نظریں، کسی کو ڈھونڈتی، خدانخواستہ، دو دہار، ثریا مر گئی تو اس کا حلیہ جو یادوں میں رہ جائے گا۔ وہ کچھ یوں ہوگا۔ ادھر سے گزری تھی۔ وہ آئی ثریا۔ دھلی دھلائی، نتھری ستھری، بنی سنوری۔ سب کی زیاد، اِدھر آئی، اُدھر گئی۔ اے ثریا، او ثریا ——

بیمار پرسی کرنے والیاں اسے لیٹا دیکھ اداس ہو جاتیں !!!

موت برحق ہے

سب کو آتی ہے مگر ثریا کی آج باری ہے۔

دھان، پان اڑتی ہر جگہ موجود ثریا آج دم پورے کر رہی ہے

ایک مردنی ہوتی ہے، دوسرا موت کا بھی ایک عجلا سا روپ ہوتا ہے خوبصورت، خوبصورت۔ بن بوسے سب عورتیں ہم زبان تھیں ثریا مرکر بھی اچھی لگے گی ــــــ

کیسی صاف، ستھری چارپائی پر دراز تھی!

ویسے صحیح بات تو یہی تھی کہ وہ آج تک کسی کو اچھی نہ لگی چھوڑ کر جانے والے نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ محلے والوں کا کام نکل جانے پر بلا کر دامن اور منہ سب نے رخ پھیر لیا۔ اپنے گھر ابھی تک وقت اپنا رکھی تھی۔ جیسے کھی نکال کر گھر والی مہمانوں کے سامنے مکر کر رہی ہو کہ دودھ میں ہرگز مکھی نہیں گری تھی بس اٹھی چلی آرہی تھی اس نے ہاتھ ملا یا اور پھر سے اڑادی ــــــ دور لٹکا دی!!

ثریا نے نصیب پر شکر کیے "لفافا" کی کاٹ نقد بہا طول گیا تھا۔ بس کام نکلا اور ابھی برے سے حوالے سے اسے اس کی اوقات یاد دلا کر حساب برابر کر دیا۔ اسے سایا جانا ــــــ وہ بندہ نمبر والی بھی برادری ہے بدنام سے گزر رہی تھی ــــــ ثریا کے لئے یہی کافی ہوتا، ہاتھ جوڑ کر جیب جائے اُٹھ کھڑی ہوتی۔ پھر وہ ہوتی اس کی تنہائی ہوتی، ارادہ کرتی کہ اب جھانک کے نہ دیکھوں گی۔ تنکوں کی سہی مگر سب دوسروں پر پڑی اسے بھی ایسا اکیلا پن کاٹ کھانے کو دوڑتا، ہنستی مسکراتی پہنچ جاتی، وہی گردان دہرائی جاتی ــــــ

وہ ہیں ہیں نا ــ۔

بڑا اچھا، پر نام بُرا ــ۔

ثریا پر ٹھپہ لگا ہوا وہ گھر سے بھاگی تھی

ماں باپ کا منہ کالا کر آئی تھی ــ

عاشق بھی دل بھر جانے پر چھوڑ گیا تھا

اجاڑ ــــ اس بازار سے آئی ہے ــــ

الزامات لگتے مگر، گستت یار وعمل کوئی نہ مانی... پر لگ جانے کچھ یوں تھا ــ کام نکل گیا ــ ــ وقت گزر گیا

وقت گزر گیا پر یہ بانسار چھوڑ گیا جوان بوڑھے ہو گئے، بچے بڑے ہو گئے پر جب چپ جاتے تھے نکلا تھا کہ احساس تک نہ ہوگا۔ محض تفصیلیں رہ گئی تھیں۔ کون کرایہ دار ہے، کون مالک مکان ہے کون کہاں سے کون آئے کون کس کا کفیل ہے۔ کسے فرصت ہے کہ ان بکھیڑوں میں پڑے۔ کسی کی دنیا خراب ہے تو کیا؟ کوئی اپنی عاقبت سنوارے تو کیا۔ وقتی طور پر افواہیں اُڑتی ہیں۔ اس سرے سے اس سرے تک گشت کرتی جانے کہاں گم ہو جاتی ہیں جہاں سب نے رہنا ہو وہاں تنازعہ مسائل کا ہونا ہے آپس کے رشتوں یا میل ملاپ کا لگا بندھا معیار قائم ہو کے نہیں دیتا ــــــ اس محلے میں ساتھ ساتھ رہتے سارے ہمسائے ایک دوسرے کے بارے میں ہر پل تحلیل ہوتے سایوں کی طرح اتنا کچھ جان گئے تھے کہ جاننے کا مفہوم ہی خبط ہو گیا تھا

یہ بات دم توڑ چکی تھی

ثریا کون ہے۔ کہاں سے آئی ہے اس کا والی وارث کون ہے کہاں سے کمائی ہے۔ کون سہارا دے رہا ہے ــــ

کس کو کیا ــــ ؟

وہ ہے ــــ بس ہے

یہ تو سب کو پتہ تھا ــــ

اکیلی رہتی ہے کیڑے شوق سے پہنتی ہے۔ کسی کا گھر تباہ نہیں کیا۔ کسی پر ڈورے نہیں ڈالے ــــــ تاہم سبھی محلے والیاں اپنے کاٹھ کباڑ شوہروں کی حفاظت ماؤں کی طرح کرتیں۔ ثریا کی طرف سے خصوصاً جو کسی رہتی جیسے وہ کچھ اور ہو نہ ہو آدم خور ضرور ہے۔ اس پہ پابندی کسی نے نہ لگائی۔ یہی اس کے بے ضرر ہونے اور قبول کئے جانے کا ثبوت تھی۔ وہ ہر گھر کا فرد تھی۔ ایسا فرد جو مقبول یا نامقبول نہیں ہوتا بس ہوتا ہے

آج ثریا کا دم آخر ہے۔ سب اسے وداع کرنے اکٹھے ہوئے ہیں اس نے نقاہت اور کمزوری پر قابو پا کر آنکھیں کھول کر سوالیہ انداز میں دیکھا ــــــ اس سے پہلے کہ ثریا لب کھولتی، کچھ بولتی یا پوچھتی سب جان گئے اگر سوال ہو سکتا ہے۔ محلے بھر کی خالہ اماں نے دھیمے سے پیار بھرے لہجے میں کہا "وہ اپنی ریحانہ ہے نا ــــ وہی بلانے گئی ہے اسے ــــ یہ وقت تفتیش اور پوچھ گچھ کا نہ تھا۔ سب جانتے تھے ریحانہ کس کو بلانے گئی ہے ــــ ایک وہی تو غیر حاضر تھی جس سے ثریا کی بول چال تھی نہ سلام کلام تھا۔ بس تین گھر نیچے

عورتوں نے خود ہی سوچ لیا کہ کہا سنا معاف کرانے کو بلوایا ہوگا۔ یہ ثریا کا گھر وہ اس کا تین گھروں کا فاصلہ ایسی اونچی دیوار بن گیا تھا کہ برسوں سے میل ملاپ رہا نہ دید۔ تیر تہوار پر بھی نہیں۔ جانے کس جنم سے دشمنی چلی آرہی تھی پھر بھی الوداعی رسم یہی ہے کہ کہا سنا معاف کرالو۔

نئی لڑکیاں واقف نہ ہوں تو الگ بات ہے وہاں موجود اکثر عورتوں کو خبر تھی کہ تین گھر بعد والی ہمسائی کو اس محلے میں آئے زیادہ سے

زیادہ پانچ برس کا ہونے ہوں گے اس سے یہاں پہلی لڑکی کی پیدائش پر ثریا پہنچی تھی۔ بچی پیٹ سے پیچھے نکلی پہلے وہ غرانے سے بولی۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو ؟ "

"کوئی ضرورت نہیں ہے یہاں تمہاری۔"

سب حیران پریشان ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں پر دشمن ہے ثریا۔ چپ چاپ نہایت خاموشی سے باہر نکل آئی۔ اس کے بعد سناٹا رہا۔ کسی نے پوچھا بھی نہیں آخر ثریا کا دوش کیا ہے۔ کیا قصور کیا تھا اس نے کہ یوں کوٹھے کوٹھے نکال دیا؟ سب جانتے تو تھے کہ ثریا بدنام ہے، لاوارث اکیلی اور تنہا عورت ہے۔ کئی داستانیں اس کے نام تھیں۔ اب جس کا دل چاہے اسے ملے جسے گوارا نہ ہو وہ کیوں ملے؟ اس روز کئی جوان لڑکیوں کی ماؤں نے سوچ لیا تھا کہ اسے منہ سے بُرے ہی بھلے !!

ایسی اجاڑ منحوس کا سایہ اپنی کمسن بن بیاہی بچیوں پر نہ پڑنے دیں صاف صاف کہہ دیں گے اپنے کام سے کام رکھو۔ الگ سے رہو کیا فائدہ بات نکل جائے کہ ان کے گھر کی کنواریوں سے ثریا کی صحبت رہی ہے اس کا ان کے یہاں آنا، جانا، اٹھنا بیٹھنا رہا ہے ——

وہ آگئی ——

ریحانہ کے ساتھ ——

آگے آگے ریحانہ پیچھے وہ

تین گھر بعد والی شمیم ——

" اپنے نام کی طرح جیم نہ کاف صرف میم —— شمیم

خوبصورت اُبھرے بدن کی، تین بچوں کی ماں مگر اپنے آپ میں لڑکی سی پڑھی لکھی، کسی بڑے سرکاری افسر کی گھر والی جس سے ملنے ملانے کا ڈسنگ بھی خاص تھا ایسا رعب کہ کوئی بے تکلف نہ ہو۔ منہ کو نہ آئے۔

وہ آئی —— تو

سب عورتیں چپ چاپ بس دیکھے جا رہی تھیں جیسے اس پل کا سب سے اہم کام یہی تھا ——

شمیم خود اعتمادی سے آگے بڑھی اور بیمار ثریا کی چارپائی پر پائنتی بیٹھ گئی۔ پھر اس نے ثریا کا ہاتھ پکڑ لیا جیسے تسلی دے رہی ہو۔ بولی وہ کچھ بھی نہیں۔

اب دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

اور سب عورتیں ——

ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں

ثریا نے ساری قوت جمع کر کے سنی جانے والی آواز میں کہا۔

"تم سے ایک راز کہنا ہے —————— "

"اسی لئے بلایا ہے —————— "

ثریا چپ ہو گئی !!

شمیم بھی چپ تھی،

وہاں بیٹھی سبھی عورتیں خاموش تھیں

مگر،

کان سب کے کھڑے تھے !

سب نے محسوس کیا ثریا کو سانس لینے میں دشواری ہے۔ سب سے پہلے اس کا احساس خالہ اماں کو ہوا۔ انہوں نے جس طرح آنکھیں گھمائیں اور اللہ کہا اس میں چھپا پیغام فضا پر پھیل گیا، ہر کوئی ایسے میں کر بھی کیا سکتا ہے۔ ریحانہ نے کروٹ بدلی۔ آسیہ نے دوپٹہ سر پر ٹھیک کیا۔ جمیلہ نے چادر کی پلّو کو کانوں کے پیچھے سرے سے اڑسا۔ جمیلہ ہلکے سے کھنکاری، رابعہ نے سلمیٰ کو دیکھا۔ سلمیٰ نے اپنا گھٹنا شہناز کے پیٹ پر دھر سا دیا جو بے مقصد نہ تھا۔ مطلب یہ تھا کہ بعد میں پوچھوں گی کہ ابھی ذرا بھی سے دھیان رکھو۔ چوکنی رہو۔

خالہ اماں دوبارہ اللہ کہنے کو تھیں کہ ثریا نے سانس کی دشواری پر قابو پاتے ہوئے کچھ کہا۔ خالہ اماں نے وہیں آواز روک لی۔

ثریا کہہ رہی تھی ——

"میں بُری عورت نہیں۔"

حاضر عورتوں نے اثبات میں سر ہلا دیئے

"مجھے خود نہیں معلوم میں بدنام کیوں اور کیسے ہوئی۔"

ثریا کے سینے سے آواز نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ سلمیٰ نے جگ سے پانی گلاس میں ڈال کر شمیم کو تھما دیا۔ شمیم کے ہاتھ سے ایک گھونٹ لیتے ہی ثریا کے چہرے پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ جھلکی پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور خالہ اماں کی طرف منہ کر کے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

" ۳۲ کی تھی جب یہاں آئی۔ پچھلے چاند کی چوتھی کو پورے ۲۵ سال ہوگئے یہاں رہتے۔ " —————— پھر اس نے اپنا سانس برابر کیا اور ذرا جوش سے کہا

" کوئی بتائے کون سا طوفان اٹھایا میں نے کون سی قیامت

ڈھائی؟ کیا عزت سے نہیں رہی — سب کے کام آئی — کسی سے کچھ مانگا؟ کسی کو ستایا؟ اللہ کوئی بدنام نہ ہو —— "

ثریا نے شمیم کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکال کر خود شمیم کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا ثریا کی دائیں آنکھ سے یہ موٹا سا اکیلے آنسو کا قطرہ ڈھلکا سبھی عورتیں ایکا ایکی آب دیدہ ہوگئیں۔ شمیم سکون سے بیٹھی رہی، وہاں پر ہر کوئی چشم پرنم سے ثریا کو دیکھ رہی تھی۔ سب پر آشکارا تھا کہ یہ ثریا کے آخری الفاظ ہیں۔ اب قطعی چل چلاؤ ہے ساتھ سا تو کان بہرے پر کفر سے تھے راز والی بات رہ نہ جائے۔

ثریا نے ہمت کر کے شمیم کا ہاتھ اپنی طرف اور کھینچ لیا اور کہا،

" یہ راز میرا —— تمہارے پاس امانت ہوگا " کہہ وہ شمیم سے رہی تھی۔ بات رازکی تھی مگر وہاں سبھی دوکان والی تھیں اور غور سے سن رہی تھیں

" میری ایک بیٹی ہے۔ "

ہمسائیاں حیرت میں ڈوب گئیں؟

ثریا کے سینے سے ایک سیل جیسے سرکا دی گئی ہو وہ خوش دلی سے بات جاری رکھنا چاہتی ہو۔ میں اس کا اس کے باپ کا نام نہیں بتاؤں گی۔ سارے راز کھل جائیں تو تحت الٹ جاتے ہیں۔ "

" میں نے چپ رہ کر اسے یاد رکھا ہے —— !! "

یہ سن کر ثریا دیر تک شمیم کو ایک ٹک دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں چھت سے لگ چکی تھیں سب سے پہلے شمیم آپے میں آئی۔ اس نے کلمہ پڑھتے ہوئے ثریا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور ان کو بند کر دیا۔

اتنے میں دوسری عورتیں بھی حیرت کے دریا سے ابھر آئیں

وہ سب ثریا کے لئے رو رہی تھیں

شمیم بھی رو رہی تھی، روئے چلی جا رہی تھی۔

پھر،

ثریا کا جنازہ اٹھا،

اسے دفنا دیا گیا

پھر،

کئی سوال ، ذہنوں سے اٹھے، لبوں پر آئے اور مچل کر کھلا گئے۔

ثریا کا گھر کون بند کرے گا؟

اس کی چیزوں کا کون وارث ہے؟

اس کا سوتا سوتا ہے بھی کوئی؟

اس کی بیٹی کہاں چھپی بیٹھی ہے؟

شمیم نے بیچ کیا

ثریا کے سامان سے کچھ خیرات نکالی

گھر میں تالا ڈالا

اور اپنی گھر گرہستی میں پہلے کی طرح کھو گئی

کوئی نہ بولا، کسی نے کچھ نہ کہا، کوئی آگے نہ آیا ——

چالیس سے کچھ ہی دن اوپر نکلے ہوں گے

خاموشی ارتعاش کی نذر ہو گئی

ایک روز دو ٹرک آئے —— شمیم محلے سے چلی گئی

سب نے سوچا سرکاری ملازم تھے ایک دن تبادلہ ہونا ہی تھا محلے والیوں نے گلے مل مل کے شمیم کو رخصت کیا۔

شمیم کے جانے کا پہلا اثر یہ ہوا۔

ثریا کی وفات، اس کی وراثت اس کے بارے میں سارے قصے ذرا ذرا ماند پڑ گئے —— لگتا تھا کہ ذہنوں میں ابھرے سوال، کا ذہنوں سے لبوں پر شاید آئے بھی نہیں بس فضا میں کہیں جا سوئے ہیں۔ سوالات کا براہ راست کسی سے تعلق بھی نہ تھا۔ مرنے والی مر گئی۔ وہ جو کچھ چھوڑ گئی۔ وہ پانی کی تحریر ہے۔ کبھی نقب لگے گی، عمارت گرے گی۔ بعض مسئلے خود بخود حل ہو جاتے ہیں جان بوجھ کر کوئی اپنے ہاتھ سانپ سے رہا!

پھر ایک روز

دو ٹرک آئے

انہوں نے دیکھتے دیکھتے ثریا کا مکان خالی کیا اور سامان لاد دیا۔

سارے سوتے جاگتے کسی سوال سنسنی خیز خبر کی حیثیت چنگھاڑتی سرخیاں بن کر فضا میں تن گئے۔ سارے محلے دار منڈی منڈی آنکھیں ملتے بیدار ہو کر جمع ہو گئے۔

کیا ہوا اگر یہ چلا گیا۔ اس کا قانون تو ہے۔

یہ دھاندلی نہیں چلے گی۔ اب تک چپ تھے، اب چپ نہیں رہیں گے، آوازیں۔ نعرے، دھمکیاں

ٹرک والے دب گئے ——

ہم مزدور آدمی ہیں۔ مالکوں سے پوچھو۔

وہ رہے مالک —— سڑک کے کنارے ایک کار میں کوئی بیٹھا تھا۔ لوگوں کا رخ ادھر ہوا تو وہ خود ہی باہر نکل آیا

[باقی صفحہ [illegible] پر دیکھئے]



مظفر حنفی

وہ تو بس اک اُڑان بھر نکلا
آسماں بھی گمان بھر نکلا

جب نچوڑا گیا ہمارا دل
رنج و غم دو جہان بھر نکلا

لوٹنے آئی پھر ہمیں دنیا
پھر اُجالا مکان بھر نکلا

ہم قیامت سمجھ رہے تھے جسے
آپ کا امتحان بھر نکلا

اب اُسے ڈھونڈنے کہاں جائیں
چاند پر بھی نشان بھر نکلا

پیار کا جرم کیا ہُوا ہم سے
گاؤں سے خاندان بھر نکلا

اے مظفر تری بیاضوں کا
ہر ورق داستان بھر نکلا

● اقبال چیئر پروفیسر۔ کلکتہ یونیورسٹی، کلکتہ

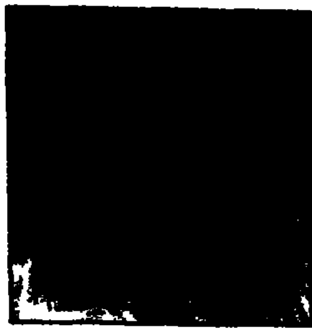


علیم اللہ حالی

میانِ رہگذر

سکوت آلودہ شب ہر سمت تاریکی کا عالم ہے
چراغِ صحن میخانہ میں تابانی بھی کم کم ہے
سبوچہ سامنے رکھا ہوا ہے رند محزوں ہیں
سبھی اب پی کے فارغ ہو چکے ہیں اپنے حصّے کی
اجڑتی بزم مے، خالی سبوچے، اونگھتا منظر
طرب گاہوں پہ ہر لمحہ اداسی چھائی جاتی ہے
یہاں سے اُٹھ کے جانا تو مقدّر مے کشوں کا ہے
مگر وہ ولولہ وہ شوق جو رندوں کے دل میں تھا
نہ جانے کون سے لمحے ہوا غرقابِ خم خانہ
قدم اُٹھتے نہیں لیکن سفر درپیش ہے پھر بھی
سکوت شب میں ہر منزل پہ یہ احساس ہوتا ہے
کہ بزم مے کی دھندلی ساعتیں کیا ہو گئیں ساقی
میانِ رہ گذر پھر بہر تسکینِ جبیں ساقی
کوئی ملتا نہیں کیا اور میخانہ کہیں ساقی

● وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱ (بہار)



حسن جمال

پتا نواس، لہار پورہ، جودھپور - ۳۴۲۰۰۱

ڈبل جی وی عرف سپن جوی

ڈبل جی۔ وی۔!

کتنا عجیب نام ہے! ہونا بھی چاہیئے، کیونکہ یہ ایک عجیب شخص کا نام ہے۔

نام نہ کہہ کر اگر شناخت کہیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ نام تو ان کا گیان ولبھ تھا لیکن ایک بار کچھ عرصہ کے لیئے ان کی زندگی میں ایک گھوڑا آیا اور وہ گیان ولبھ گھوڑے والے بن گئے۔ یعنی ڈبل جی وی۔ دراز قد۔ کھلی پیشانی اور دبنگ آواز۔ ان سب سے اس شخص کی شخصیت بنی تھی جو دو ڈھائی برس پہلے ایک اسکول میں سخت پرنسپل کے روپ میں معروف تھا۔

گزشتہ امتحانات میں وہ گھوڑے کے نشان کے ساتھ سیاست میں۔ یا یوں کہیں۔ چناؤ کے میدان میں اترے تھے۔ اور فقط پندرہ سو ووٹ حاصل کر کے اپنی ضمانت گنوا دی تھی۔ نہ جانے یہ چار اور آدھ ہزار کے ان کو پندرہ سو ووٹ کس طرح مل گئے تھے۔ یہ بڑے تعجب کی بات تھی۔ خود ان کے لیئے بھی اور ووٹ دہندگان کے لیئے بھی ان کے اپنے بیٹے، بہوؤں نے پوتے پوتیوں سے ان کے خلاف ووٹ ڈالے تھے۔ یہی اس پارٹی کے امیدوار کو ان پر اسی اعتماد تھا۔

ڈبل جی وی کو شکست کا ملال نہ تھا کیونکہ وہ ہارنے کے لیئے ہی کھڑے ہوئے تھے۔ ان سودے بازوں کی طرح نہیں جو بیٹھنے کے لیئے ہی کھڑے ہوتے ہیں۔ نئی اولاد سے وہ کچھ خاص توقع نہ رکھتے تھے بیوی پرلوک سدھار چکی تھی۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد فرصت ہی فرصت تھی۔

ارادہ تو خوب مطالعے اور لکھنے لکھانے کا تھا لیکن تبھی عام چناؤ آگئے تھے۔ جس نے ان کی سوچ کا رخ موڑ دیا تھا۔

اپنے وطن سے ان کو حقیقی لگاؤ تھا۔ کتابی یا نمائشی نہیں۔ وہ اپنے ملک کو دنیا میں ممتاز مقام پر دیکھنا چاہتے تھے۔ یہی ان کی آرزو تھی۔ ملک و قوم کی فلاح و بہبود ان کا شیوہ تھا۔ کسی مخصوص سیاسی پارٹی یا نظریے کے وہ حامی نہ تھے۔ ان کے طور طریقوں کو دیکھ کر لگتا وہ گاندھی واد سے متاثر ہیں مگر وہ عام گاندھین کی طرح بھی نمائشی نہ تھے۔ ایک سچا دل ان کے سینے میں آہ و فغاں کرتا تھا۔

قدرے سنکی اور جنونی تھے۔ انہیں چناؤ میں گھوڑا نشان ملا تو اسے علامت بنانے کی خاطر سچ مچ کا گھوڑا خرید لیا۔ بشیر میاں تانگے والے سے۔ بشیر میاں دمے کے شکار تھے ان کے اپنے علاقے میں رہنے والے۔ بشیر میاں کو جب دم اٹھتا تو سواریاں بھاگ چھوٹتی تھیں جو یوں بھی کم ہی میسر تھیں نتیجتاً بشیر میاں تانگا گھوڑا فروخت کرنے کا ذہن بنا رکھا تھا۔ ان کے لڑکے چھوٹے موٹے دھندوں میں لگ چکے تھے۔ اس لیئے گھوڑا گاڑی کی گھر میں ضرورت نہ تھی۔

ڈبل جی۔ وی نے سنا تو پہنچ گئے۔ بشیر میاں کے بالیے نی گھر میں۔

"بشیر میاں! گھوڑا بیچو گے!

"ہاں، مگر آپ کیا کریں گے!"

"چناؤ لڑوں گا۔"

بشیر میاں دیر تک بلغمی کھانسی کے ساتھ ہنستے رہے۔ آخر کار فقط گھوڑا بیچنے کے لیئے راضی ہوگئے۔ حالانکہ ان کا ارادہ تانگے کے ساتھ گھوڑا بیچنے کا تھا اور اس کے لیئے کئی ضرورت مندوں سے بات چیت بھی چل رہی تھی۔

گھوڑے پر بیٹھ کر ڈبل جی۔ وی۔ اپنی مہم پر نکلے تو

لوگوں نے ان کا خوب مذاق اڑایا۔ وہ مذاق کو راہ کی گرد سمجھ کر اسے جھاڑتے رہے اور اپنی مہم میں لگے رہے۔ ان کی بلند اور پروقار آواز میں جامع تقریر سن کر لوگوں کو لگا کہ یہ شخص نوٹنکی باز نہیں ہے چاہے اس کا طریقہ ایسا ہو۔ آدمی بات تو معرکے کی کرتا ہے اس کی باتوں میں کچھ تو وزن ہے! مگر صرف باتوں سے چناؤ نہیں لڑے جاتے۔ کچھ۔ کچھ کیا، بہت کچھ دھن بھی ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ ایک تنہا شخص یا پانچ سر کے ہجوم میں کر ہی کیا سکتا ہے۔ اس لیے تماشا بننے سے اچھا ہے کہ آدمی گھر میں بیٹھ کر ٹی وی کا تماشا دیکھا کرے۔

جیسا کہ آپ جان ہی چکے ہیں کہ ڈبل جی۔ وی۔ گھوڑے پر سوار ہونے کے باوجود "کہیں" نہ پہنچ سکے۔ پہنچے تو صرف اپنے جیسوں کے انجام تک کہ اگلے چناؤ تک اپنا دھندہ دیکھو اور جب دوبارہ چناؤ کا موسم آئے تو پھر سے میدان میں کود پڑو۔ یعنی انگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہو جاؤ۔ ہم نے بھی ایم پی۔ ایم ایل اے کا الیکشن لڑا تھا۔ صاحب ہمیں معمولی آدمی نہ سمجھو۔ گرتے ہیں شہ سوار ہی میدانِ جنگ میں۔

جب چناؤ کا بخار اتر گیا اور نئی سرکار نے اپنے گھوڑے دوڑانے شروع کر دیئے تو وہ تمام افراد جو شہر کی گلیوں سے گاؤں کی پگ ڈنڈی تک ہاتھ جوڑے، سر جھکائے اور چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ چپکائے کھادی آنا لباس اور فادما نہ انداز میں گھومتے ہوئے نظر آتے تھے، اچانک کہیں غائب ہو گئے۔ اب ان کے دیدار بھی دشوار تھے۔ وہ کب شہر میں وارد ہوتے تھے۔ کس کو کس کو اپنی جلوہ نمائی بخشتے تھے۔ سرکٹ ہاؤس یا ڈاک بنگلے میں کب قیام فرماتے تھے اور کن حضرات کو شرفِ ملاقات بخشتے تھے۔ واللہ اعلم۔

عوام ان کی تشریف آوری اور عالیشان ودائی کی خبریں مقامی اخبارات کے ذریعہ حاصل کرتے۔ بیشتر حضرات کے نزدیک یہ ایک جانا پہچانا برسوں سے کھیلا جا رہا اونچے درجے کا کھیل تھا جو دیکھنے سے زیادہ محسوس کیا جا سکتا تھا یہی وجہ تھی کہ ان خواص میں عوام کی دلچسپی روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ "یہ تو یوں ہی چلے گا۔" کا مستقل خیال عام آدمی کے دماغ میں کنڈلی مار کے بیٹھ جاتا اور انتخاب کو وہ ایک فریضہ سمجھ کر فروگزاشت کر دیتا۔

حالانکہ وہ بے شمار مسائل سے دوچار ہوتا تھا۔ اور منتخب امیدوار سے وہ یہ بھی امید رکھتا تھا کہ اس کا امیدوار اس کی امیدوں پر کھرا اترے گا مگر اکثر و بیشتر اسے مایوسی ہی ہوتی۔

اس قدر مایوس کن حالات میں بعد چناؤ کے ڈبل جی۔ وی کا گھوڑے پر سوار ہو کر شہر میں گشت کے لیے نکلنا ایک جیتا جاگتا عجوبہ ہی تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے عہد پارینہ سے کوئی انصاف پسند و فرض شناس خلیفہ نے رعایا کے دکھ درد کو دور کرنے کا بیڑا اٹھا لیا ہو۔ یہ بات لوگوں کے گلے ہی نہیں اترتی تھی کہ آج کے زمانے میں کوئی شخص بغیر غرض و غایت کے جذبۂ خدمت سے سرشار ہو کر میدانِ عمل میں کود پڑے اور اپنی بیش بہا زندگی کا قیمتی وقت ناحق لٹاتا پھرے۔ حتیٰ کہ وہ ریٹائرڈ شخص کیوں نہ ہو۔!

گھوڑا ڈبل جی۔ وی کی شناخت ضرور بن گیا تھا۔ مگر اس کی وجہ سے وہ قانونی الجھنوں میں پھنس گئے۔ الیکشن تک تو خیر کسی نے کچھ نہیں کہا لیکن اب وہ ٹریفک پولس کی آنکھ کی کرکری بن چکے تھے۔ ٹریفک انسپکٹر نے واضح الفاظ میں انہیں تنبیہ کی کہ آپ یہ نامک بند کیجئے ورنہ آپ کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔ حفاظتی اقدام کے لیے یہ سختی اشد ضروری ہے۔

آپ ان بچوں کو تو کچھ نہیں کہہ سکتے جو مزین گھوڑوں کو دن رات دندناتے ہوئے بھیڑ بھرے راستوں سے گزرتے ہیں۔

"ایسا وقتی طور پر ہوتا ہے۔ شادیوں کے موسم میں۔ ہم انہیں بھی روک سکتے ہیں۔ قانون سب کے لیے ہے۔"

"قانون؟ کہاں ہے قانون۔ ذرا مجھے بتائیے تو! آپ لوگ ہمہ وقت ٹریفک قانون کی دھجیاں بکھیرنے والے ان سٹی بسوں، ٹیمپو، تانگوں اور اسکوٹروں کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتے جن کی وجہ سے شب و روز حادثے ہوتے رہتے ہیں۔ صرف میں ہی آپ کو قانون شکن نظر آتا ہوں؟ میرے گھوڑے سے کسی کا کبھی کوئی نقصان ہوا ہے تو بتایئے! میں بھی آزاد شہری ہوں۔ مجھے بھی اپنی سہولت کے اعتبار سے چلنے کا اختیار ہے!"

"دیکھئے ہم بحث نہیں کیا کرتے ہیں۔ ہمارا کام قانون پر عمل درآمد کرنا ہے۔"

"اور قانون آپ کا موڈ ہے۔ کیوں؟"

انسپکٹر ہتھے سے اکھڑ گیا۔ آج کل براہ راست حملے کوئی برداشت

نہیں کرتا۔ اور جن کے پاس اختیارات ہیں وہ تو قطعی نہیں۔ آخر ش ڈبل جی۔ ڈی۔ کو اپنی شناخت سے محروم ہونا پڑا۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ گھوڑا واپس بشیر میاں کے پاس پہونچ گیا۔ یوں بھی اس مہنگائی کے زمانے میں گھوڑے کے لیے چنے کی دال اور سبز گھاس کا بندوبست کرنا۔ بارِ جیب اور دردِ سر تھا۔ ڈبل جی۔ ڈی نے اس کا متبادل نکالا اور ایک موپیڈ خرید لیا۔ اور اس پر گھومنے لگے۔

شروع میں لوگوں نے ان کا مذاق اڑایا مگر وہ ہراساں اور مایوس نہیں ہوئے۔ انہوں نے لوگوں کو سمجھانا شروع کیا کہ دنیا میں کوئی بھی کام ناممکن نہیں ہے۔ ضرورت ہے بس خود اعتمادی لگن اور حوصلہ مندی کی۔! دوسروں پر منحصر رہ کر آپ زندگی میں کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

منہ پر بیٹھی مکھی اڑانے کیلئے بھی ہاتھ کو جنبش دینی پڑتی ہے عوامی مسئلہ کہہ کر اسے ٹالتے رہنے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ دوسروں کا انتظار کئے بغیر پہل کرنے کا حوصلہ آپ میں ہونا چاہئے میں جانبِ منزل اکیلا چلا تھا مگر۔ لوگ آتے گئے کارواں بنتا گیا۔

اور کارواں بننے لگا۔ ڈبل جی ڈی نے کچھ ہی دنوں میں محسوس کر لیا کہ اس ملک کا باشندہ حقیقتاً اتنا ناکارہ نہیں ہے جتنا سمجھا جاتا ہے۔ اس میں بھی جوش و خروش اور کچھ کر گزرنے کا مادہ ہے۔ بس ضرورت ہے اس جذبے کو بیدار کرنے اور پرجوش قیادت کی

اس چھوٹی مگر گہری بات کو نام نہاد لیڈرانِ ملک نہیں سمجھتے یا سمجھنا نہیں چاہتے اور قفقوں لاکھوں روپیہ اپنی فوقیت ردنما کرنے کیلئے پانی کی طرح بہا دیتے ہیں اگر انکے نظریہ اور عمل میں تھوڑا بھی تخلیقی عنصر شامل ہو تو اس ملک کا کایا کلپ ہو سکتا ہے۔ یہ ایک خواب نہیں، زندہ اور ٹھوس حقیقت ہے۔ مگر جو حضرت کوپی بد منصوبہ کرے اور اپنے رشتہ داروں کو نوازنے سے ہی فرصت نہ ملی ہو وہ کیا ملک کی بنیاد کو مستحکم کرنے کا عمل کر سکتے ہیں۔ نہ وقت تو یوں لگتا ہے۔ یہ تمام چھوٹے بڑے لوگ جو ہیں جو ہی بڑے سے دھڑا جب ان کو اپنی اپنی جگہ پر تیری سے کتر ڈالنا چاہتے ہیں۔ جہاز تباہ و برباد ہو جائے گا

اس کی فکر کسے ہے!

الغرض، ڈبل جی۔ ڈی۔ کا شہر میں طوطی بولنے لگا۔ وہ جدھر نکلتے۔ ایک قافلہ سا ان کے پیچھے ہوتا۔ شہر کے حکام میں افراتفری مچ گئی۔ وہ لوگ جو بڑے مہاآشیروادوں سے بے خوف و خطر بدمست ہاتھیوں کی طرح پھرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس خوف دستے کو دیکھ کر بوکھلانے لگے۔ جو کام پہلے بڑی سفارشوں کے باوجود کبھی نہ ہوتا تھا وہ اب چٹکی بجاتے ہونے لگا۔

ڈبل۔ جی۔ ڈی۔ صوبے کی ہی نہیں۔ ملک کی راجدھانی میں بھی دن دونا ہوتے ہوئے پہونچ جاتے تھے۔ ان کو کسی کا خوف نہیں تھا۔ انہوں نے سر پر کفن باندھ لیا تھا۔ انہوں نے مکمل طور پر اپنے آپ کو سماج کے حوالے کر دیا تھا۔ نتیجتاً ان کے بچے ان سے ناراض رہنے لگے۔ انہوں نے پرواہ کرنا چھوڑ دی انہیں عجیب سا تخلیقی سکون مل رہا تھا۔ دو دہائی تک ملازمت کی قید و بند میں جکڑے رہنے کے بعد مکمل آزادی اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ انہیں راس آ رہا تھا۔

تبھی علاقائی ایم ایل اے، ایم پی، انکے درباریوں حواریوں، مختلف پارٹیوں کے خودساختہ لیڈروں کے کان کھڑے ہوئے۔ اب ان کے دربار میں ڈبل جی، ڈی کا ذکر ناگزیر ہو گیا تھا۔

ڈبل جی۔ ڈی! ڈبل جی۔ ڈی!! ہر درباری ان سے خوفزدہ لگتا تھا۔ جیسے علاقے میں کوئی اچانک راہزن مڑ پیدا ہو گیا ہو۔ برسوں کی محنت اور اسراف سے حاصل طاقت کو ہاتھ سے کھسکتا دیکھنا کوئی نہیں چاہتا تھا حالانکہ بظاہر وہ لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے تھے کہ ایسے بازیگروں سے جنادریوں کو کبھی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ پبلک جانتی ہے کہ اسمبلی کے لئے کون حقدار ہے۔ ہرا پھرا: غیر انتخوخیرا آزاد امیدوار کچھ بن سکتا ہو تو ان پارٹیوں کو پارٹیوں کی سیاست اور تھیلی شاہوں کو کون پوچھے گا۔ سماج سدھار اور سیاست میں فرق ہے بھیا!

در نہیں ایم پی صاحب! آپ خوش فہمی میں مت رہیئے۔ لوگ سختی سے آپ کی نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ دو بار جیت کر بھی آپنے اپنے حلقۂ ڈسنسی کے لئے کچھ نہیں کیا اور یہ آدمی بغیر لالچ کے بڑے بڑے کام نپٹا رہا ہے اس ایک جنونی شخص میں کئی ٹیگیٹ، کئی آئیڈیے، کئی مدر

ڑیسا کی طاقت معلول ہو چکی ہے ۔ حکم کرو تو راستے سے ہی ہٹا دیں ؟ "

" نہیں ایسا مت کرنا ۔ ہماری امیج یوں بھی خطرے میں ہے ۔ ہم اپنے دامن پر نیا داغ دیکھنا نہیں چاہتے ۔ "

" کچھ نہیں ہوگا سرکار ۔ ! جہاں سابق وزیر اعظم کو رستے سے ہٹایا جا سکتا ہے ، وہاں ایک مچھر کی کیا حقیقت ہے ۔ "

" نہیں آدمی کو مچھر مت کہو ۔ ہم سوچیں گے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں ! "

وہ سوچتے رہے ۔ ڈبل جی ۔ دی ۔ اپنی دھن میں مست آگے بڑھتے رہے حتیٰ کہ ایک روز مرکز کی طاقت سے صوبائی حکومت گر گئی ۔ جس کا اندیشہ بہت دنوں سے تھا ۔ نتیجہ ۔ نئے چناؤ !

کرسی کے لیے قومی خزانے کی بربادی سے لٹانے کی سازش برسوں سے جاری ہے ۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی ۔

ڈبل جی ۔ دی ۔ اس بار چناؤ لڑنا نہیں چاہتے تھے ۔ ان کا نصب العین بدل چکا تھا ۔

جو کام انہوں نے اپنی خوشی سے چنا ۔ اس سے وہ مطمئن تھے ۔ فلاحی دنیا میں ان کے دیرینہ خواب کی تعبیر مل رہی تھی ۔ ہنگامن کے حامیوں اور نام لیواؤں نے ان کو ایک بار پھر گھوڑے پر بٹھا دیا ۔

ڈبل جی ۔ دی نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا اسمبلی ہال میں جا کر ہی رکا ۔ نہ جیپ نہ گاڑیوں پر دھواں دھار پرچار ۔ نہ پوسٹر نہ بینر ۔ بس گھوڑوں کا ایک قافلہ ۔ مقابل تھے تین بار کے فاتح ۔ ملن سار ، میٹھی زبان والے مرلی جی جنہوں نے کوڑیوں کے دام مقامی صحافیوں کو بیش قیمت زمینیں الاٹ کی تھیں جب وہ یو آئی ٹی کے صدر تھے ۔ ان کے کارناموں سے اخبارات کے کالم بھرے رہتے تھے ۔ انہوں نے سینکڑوں کو نوازا کئی عالیشان عمارتیں ، کھیل کے میدان ، سوئمنگ پول اور پارک انکے شاہ جہانی ذوق و ددر کی یاد دلاتے تھے ۔ یہ اور بات ہے کہ لوگ ان کی اصلیت سے بھی واقف تھے ۔ سو ان کو بھی شکست کا مزا چکھنا پڑا ۔ عوام کے رجحان کا کچھ پتہ نہیں تھا ۔ وہ سرسبز شاداب درخت کو بھی آن کی آن میں ٹھنڈ بنا کے چھوڑ دے اور ڈبل جی دی جیسے غیر سیاسی کرشمہ ساز کو ایم ایل اے کے خطاب سے نواز دے ۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جنتا کو ناحق دوش دینے والے دانستہ نہیں جانتے کہ حقیقتاً جنتا چاہتی کیا ہے !

ڈبل جی دی ۔ ابھی چناؤ کی تھکان سے ابھر نہ پائے تھے

ابھی مبارکباد کا سلسلہ جاری تھا ۔ ابھی حلف لینے کی باقاعدہ اطلاع موصول نہ ہوئی تھی کہ وہ مقامی اخبارات کی سرخیوں میں چھا گئے ۔ اور شہر دم بخود ۔۔ رہ گیا ۔

کسی نامعلوم قاتل نے گولی مار کر ان کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا تھا ۔ سارا شہر غم اور اداسی کے ماحول میں ڈوب گیا ۔ تب لوگوں نے دیکھا کہ گھڑ سواروں کا ایک غول گرد و غبار چھوڑتا ہوا ایک متعین سمت کی جانب بڑھا جا رہا تھا ۔ اور کچھ لوگ بانکے میں گھرے ہوئے وحشی درندوں کی طرح گھبرا اٹھے تھے اس غول میں ڈبل جی دی کا نوجوان پوتا بھی ایک تھا جو کل تک اپنے دادا کو "شکی" اور "جھکی" کہتا پھرتا تھا ۔ !

شہر اندھیرے میں ڈوب رہا تھا اور گھوڑوں کی ٹاپ میں نمایاں ہو رہی تھیں ! !

بہ خط شاعر

کلیساؤں کے برسے شبو، مسجدوں کے ڈیرے اڑ گئے
کیسی غضب طوفان تھا، خیمے کے خیمے اڑ گئے

ریت کا ڈبہ اٹھا لیے کی آڑ سا دیس لول
گھر باھر کھیلتے بچے کے جھونکے اڑ گئے

جب آسمان سے سمندر تک دو قطرہ بھی نہ تھا
شہر میں آئے تو اس بستی کے ٹکڑے اڑ گئے

کلال سے جو دن سا جب میدان بیں رشتہ جڑا
رومال کر گھر کی منڈیروں سے پرندے اڑ گئے

[illegible]
[illegible]

دشت کے درمیاں سے چھوڑ گیا وہ کا مجھے
پیٹ کا بنے ہوئے گا، پھر راستہ دے گا مجھے

پیچھے پیچھے دھوپ دوڑائے گا اک آگ سی مرے
دشت ہے زرد زرد آگ کیوں کھیلائے گا مجھے

یادوں کی زنجیر توڑ دوں گا تو میرا رہنما
پھر نئے جنجال میں لا کر پھنسا دے گا مجھے

کبھی چڑیا اڑ کر کے میں سے کے اس میں
درد دے گا اور کیا اس کے سوا دے گا مجھے

جانتا ہوں میں کہ پہلے کی طرح اسبار بھی
کچھ ہیں رہے گا، وہ کیوں یوں دے گا مجھے

[illegible]

شمیم غزنوی

نعت

سب سے اعلیٰ، سب سے افضل، کام ترا پیغام ترا
جنت کی مٹی سے میٹھا، سب ناموں میں نام ترا

سوکھی دھرتی تیرے لیے ہے کھولی گئی سبز کی طرح
صدیوں کے ادراک پہ بھاری پل بھر کا الہام ترا

کیسا رکو کا وقت عرب میں روشنیوں کا پھول کھلا
رات میں روشن شمع ہے تیری، نور سے جگمگ شام ترا

ساری برکت ساری نعمت، ساری بلندی تیرے لیے
عالم عالم دائرہ ہے تیرا، روشن معلیٰ نام ترا

میرے لیے دلاسا کیا، میں سائل تیرے در کا ہوں
درویشی بھی سلطانی ہے، فقر بھی ہے انعام ترا

رحمت پاک لبوں پر تیرے، ختم نبوت ہے تیرے
سبق قرآن ذات میں تیرے، برحق ہے اسلام ترا

میرے آقا بخش مجھے اک قطرہ نور کی بارش کا
پیاسا بیچ سمندر میں ہے، صحرا صحرا تشنہ علم ترا

کہتے ہیں ہیرا من ہم داروں کے چکر آ ے ہوا
تو کالے سلا لی پیسہ آیا، من کی ٹھنڈک کو آ ے ہوا

گاؤں کی چوپال پر اب کی تک رہی ہے کیا؟
سر پہ پالی لیے بچوں ملی کی کا گر آ ے ہوا

رکت، برکت ہو سکوں پر کیا لہو رنگے نہیں
بارش ہے پیڑ اور لوڑا سمندر آ ے ہوا

رکت کیوں بارود جیسی لے کے آتی ہے یہاں؟
چاند کا ریشم پر لاؤں کی پاور آ ے ہوا

دیپ تھا بجھ ہی گیا، کہ دے کہ میری سانس سے
میں تو جلا اسے روشن ہوں، تو ہی [illegible] گر آ ے ہوا

ہر طرف جیون ہی جیون، لال پیلی کلیوں بھرے
یاد ہے کیا تجھ کو دستی سا گھر آ ے ہوا



نشتر خانقاہی

7

ولادت - [illegible]، عمر ۲ سال، عمر ۳ [illegible]

محلہ جاٹان بجنور۔ (یوپی)

سریندر پرکاش

۴/۴۳، یوگی راج آشرم ہنسی ہنگرا مارگ، کالینہ، بمبئی ۹۸

فسان

[قسط-۲۲]

چونکہ ناظم کشمیران دنوں میں شیخ امام الدین تھا۔ اس کے نام دربار لاہور سے بدستخط صاحب ریذیڈنٹ کے پروانہ جاری ہوا کہ علاقہ کشمیر وغیرہ جو اس کے متعلق ہے مہاراجہ گلاب سنگھ کے حوالہ کر کے خود لاہور میں حاضر ہو مگر شیخ امام الدین نے اس کے برخلاف کیا اور جو فوج راجہ گلاب سنگھ کی کشمیر کے دخل کے لئے گئی اس کو جنگ کر کے پسپا کر دیا۔ وقوع اس حال کے ایک تازہ فساد پنجاب میں شروع ہوا اور فوج معقول لاہور سے کشمیر کو شیخ امام الدین کی سزا کے لئے مامور ہوئی۔ آخر ماہ اکتوبر ۱۸۴۶ء کے شیخ امام الدین ریذیڈنٹ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور عند الاستفسار بیان کیا کہ میں ملازم و نمک خوار سرکار لاہور کا تھا دربار کے حکم کے بموجب میں نے یہ سرکشی کی کیونکہ پروانہ راجہ لال سنگھ مدار المہام کا میرے نام پر جاری ہو چکا تھا اور اس میں صاف درج تھا کہ علاقہ کشمیر کا ہرگز ہرگز راجہ گلاب سنگھ کو نہ دینا۔ صاحب ریذیڈنٹ بہادر شیخ امام الدین کو لے کر آیا اور کشمیر پر دخل مہاراجہ گلاب سنگھ کا ہو گیا۔ لاہور پہنچ کر ایک بڑا جلسہ واسطے تحقیقات مقدمہ کشمیر کے منعقد ہوا۔

راجہ لال سنگھ نے تحریر پروانجات اسمی شیخ امام الدین سے صاف انکار کر دیا مگر جب پورن چند پروانہ نویس کاتب پروانجات نے گواہی حلفاًدی کہ میں نے یہ پروانہ حسب الحکم راجہ لال سنگھ کے لکھے تھے تو لال سنگھ لاجواب ہو گیا اور جرم مفسدہ پردازی فساد انگریزی کا راجہ لال سنگھ کے ذمہ ثابت ہوا۔ جس کی پاداش میں وہ وزارت و مدار المہامی کے عہدے سے برخاست ہوا بلکہ یہ تجویز ٹھہری کہ آئندہ وزارت کا عہدہ تخفیف میں آئے اور چند اراکین کی کونسل قرار پا کر انتظام ہوا اور سردار تیجا سنگھ و دیوان دینا ناتھ و سردار شیر سنگھ اٹاری والا تینوں کو راجگی کا خطاب بااضافہ جاگیر عطا ہوا اور چوتھا ممبر کونسل کا فقیر نور الدین قرار پائے اور ہر ایک کام ان کی صوابدید و منظوری صاحب ریذیڈنٹ سے انجام پائے چنانچہ دیوان دینا ناتھ راجہ کلانور کا اور سردار تیج سنگھ راجہ سیالکوٹ کا قرار پایا۔ جب نو مہینے آخر ۱۸۴۶ء تک گزر چکے وہ وقت آگیا کہ انگریزی فوج لاہور سے رخصت ہو جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر اہالیان دربار کو اسی طرح سکھوں کی دہشت دل میں تھی اور نہ چاہتے تھے کہ صاحبان انگریز لاہور سے چلے جائیں اور اسی واسطے سب نے مل کر بحضور جناب ریذیڈنٹ بہادر التجا کی تا عین بلوغ مہاراجہ دلیپ سنگھ انگریزی فوج لاہور میں رہے اور بائیس لاکھ روپیہ سالانہ تنخواہ فوج و افسران فوج سرکار لاہور کے خزانے سے دیا جائے گا۔ ۔ ۔ ۔

اور یہ بھی تجویز ہوئی کہ سردار رنجودھ سنگھ و بھائی نرہان سنگھ و سردار عطر سنگھ کالیان والا سردار شمشیر سنگھ سندھانوالیہ نائب اہالیان دربار مقرر ہوں اور جس امر میں یہ سب لوگ تجویز قائم کریں صاحب ریذیڈنٹ بہادر کی منظوری کرا لیں۔ رانی جنداں والدہ مہاراجہ دلیپ سنگھ کو یہ انتظام پسند نہ آیا کیوں کہ وہ چاہتی تھی کہ بجائے وزیر کے میں حکمراں تصور کی جاؤں اور ہر ایک امر میرے حکم سے صورت انجام کی پائے چونکہ اس انتظام میں صاحبان انگریز نے اس کا دخل کسی طرح منظور نہیں رکھا تھا وہ نہایت ہی ناراض تھی اور پوشیدہ پوشیدہ درپے فساد و خرابی انتظام سلطنت کے ہوئی یہ امر ریذیڈنٹ اور اہالیان دربار پر واضح ہوا تو تجویز یہ ٹھہری کہ جنداں کو مہاراجہ دلیپ سنگھ سے علیحدہ کر دیا جائے بلکہ اس کو قلعہ لاہور سے قلعہ شیخوپورہ میں بھیج دیا جائے جس میں یہ قیام پذیر ہو چنانچہ فی الفور یہ امر ظہور میں آیا اور رانی نہایت ناراض اور مجبور کی حالت میں قلعہ لاہور سے نکل کر قلعہ شیخوپورہ میں سکونت پذیر ہوئی اور حکم جاری کیا گیا کہ کوئی شخص ملازمین وغیرہ ملازم سلطنت بلا اجازت صاحب بہادر ریذیڈنٹ کے مہارانی کے پاس جانے نہ پائے۔

مارچ ۱۸۴۷ء میں کرنل لارنس صاحب ریذیڈنٹ لاہور سے تبدیل ہو گیا اور مسٹر کری صاحب بہادر ریذیڈنٹ مقرر ہو کر آیا اس وقت ایک نیا فساد برپا ہوا رانی جنداں نے شیخوپورہ میں بیٹھے بیٹھے یہ ارادہ کیا کہ افسران انگریز کو زہر دے کر مار دیا جائے کہ کوئی ان میں سے باقی نہ رہے چنانچہ کاہنا سنگھ و گنگا رام ملازمان رانی جنداں کنور نے عسکرٹ کے خانساماں کے

ساتھ مل کر یہ تجویز ٹھہرائی کہ وہ جب صاحب لوگ مسکوٹ میں کھانا کھانے کے لئے آئیں تو ان کے کھانے میں زہر ڈال دیں اور اس خدمت کے عوض بڑی رقم روپیہ کی اپنے ذمہ پر قبول کی مگر اتفاقاً یہ راز کھل گیا اور اس جرم پر رانی جنداں کو جلا وطنی نصیب ہوئی اور دونوں مخبر اس کے جان سے مارے گئے۔ [۱]

دوسرا فساد چتر سنگھ اٹاری والے نے ہزارہ کی طرف برپا کر دیا اور اس نے تمام علاقہ ہزارہ و پشاور و قلعہ اٹک وغیرہ اپنے قبضہ میں کر لیا فوج ماموره پشاور و ہزارہ وغیرہ سب کی سب سرکار لاہور سے برگشتہ ہو کر اس سے مل گئے۔ جارج لارنس صاحب وغیرہ انگریز مع ان کی میم صاحب کے جو پشاور کی نظامت پر مامور تھے سب کے سب سردار چتر سنگھ کے قید میں آگئے سردار چتر سنگھ نے امیر دوست محمد خاں والئی کابل کو بھی اپنی مدد پر اس اقرار سے بلایا کہ جب صاحبان انگریز پنجاب سے نکال دیئے جائیں گے پشاور و ڈیرہ جات کا بدستور کابل کے ساتھ متعلق کر دیا جائے گا۔ اٹک کا قلعہ اور علاقہ دوابہ سندھ ساگر بھی اس نے لے لیا اور پنجاب میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ اب سکھوں کی عملداری پھر شروع ہو گئی ہے۔ یہ سن کر تمام سکھ فوج جو معزول ہو چکی تھی۔ سردار چتر سنگھ کے پاس جمع ہو گئی اور لاکھ آدمی کے قریب اس کے پاس جمع ہو گیا۔ مگر بے سر و سامانی کمال تھی ہر چند اس نے پشاور و اٹک و ہزارہ کے قلعوں سے توپیں بہت بہم پہنچائیں تھیں مگر اس کے پاس اس قدر ہتھیار نہ تھے کہ تمام فوج کو تقسیم کرتا۔ دریائے چناب تک کا علاقہ سردار چتر سنگھ کے قبضہ میں آگیا اور کمال بے انتظامی لاہور کی سلطنت میں واقع ہوئی۔

جو فوج سرکار انگریزی مفسدوں سے چار لڑائیاں لڑے۔ پہلی لڑائی تو بمقام رام نگر عرف رسول نگر عمل میں آئی۔ اس کا مجمل حال یہ ہے کہ جب سرکار انگریزی کی فوج کا مقابلہ اس کے ساتھ ہوا تو سکھوں نے پہلے مقابلہ سے پہلو تہی کی کیونکہ اس وقت راجہ شیر سنگھ سردار چتر سنگھ ان کے شریک نہ تھے ان کے آنے کا انتظار تھا۔ جب وہ آ گئے تو ادھر سے زور پڑ گیا تو ۲۲۔ نومبر ۱۸۴۸ء کو آپس میں لڑائی شروع ہوئی اور سکھ ایسی جواں مردی سے لڑے کہ کوئی دقیقہ شجاعت اور بہادری کا باقی نہ رہا اس لڑائی میں انگریزوں کا بہت نقصان ہوا اور کیورتن صاحب افسر فوج انگریزی کا کام آیا۔ دوسری لڑائی بمقام سعد اللہ پور وقوع میں آئی اور دونوں فریق ۳۔ ماہ دسمبر ۱۸۴۸ء کو دن بھر آپس میں لڑتے رہے سینکڑوں آدمی فریقین سے مارے گئے اور بعد جنگ کے شیر سنگھ اور چتر سنگھ وہاں سے ہٹ کر موضع مونگ رسول کو چلے گئے۔ تیسری لڑائی ۱۳۔ دسمبر ۱۸۴۸ء سے ۱۲ فروری ۱۸۴۹ء تک فریقین کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل میدان میں پڑی رہیں اور ہر روز مقابلے اور محاصرے ہوتے رہے اور فریقین کا نقصان ہوتا رہا آخر ۱۳ فروری ۱۸۴۹ء کو شیر سنگھ و چتر سنگھ مونگ رسول کا مقام چھوڑ کر گجرات چلے گئے۔ چوتھی لڑائی بمقام گجرات نہایت سرگرمی کے ساتھ ہوئی اور فریقین کمال جوش و خروش کے ساتھ لڑے۔ ہزاروں آدمی دو طرف سے مارے گئے۔ سکھوں نے پہلے سخت حملے انگریزی فوج پر کئے ۔۔۔۔ جب سکھ لڑتے لڑتے تھک گئے تو انگریزوں نے ان پر زور ڈالا اور وہ آگ برسائی کہ سکھوں کی آنکھوں میں زمانہ تاریک ہو گیا اور سوائے بھاگنے کے کوئی تدبیر نہ سوجھی۔ اور بے اختیار سامان توپ میگزین چھوڑ کر بھاگ گئے اور میدان خالی رہ گیا۔

اس وقت سردار چتر سنگھ و شیر سنگھ دیوان حاکم رائے وغیرہ مفسد سردار بحالت لاچاری انگریزی افسر کے روبرو از خود آکر مستدعی تقصیر کے ہوئے اور لاہور میں بحالت نظر بندی حاضر ہوئے۔ صاحب ریذیڈنٹ نے بمنظوری نواب گورنر جنرل بہادر کی ان کی نسبت یہ حکم صادر کیا کہ بڑے بڑے مفسد یعنی دیوان حاکم رائے، سردار چتر سنگھ و شیر سنگھ وغیرہ تو جلا وطن کر کے پنجاب سے نکالے جائیں اور چھوٹے رتبے کے مفسد اپنے اپنے گاؤں میں رہیں۔ سوائے اجازت سرکار انگریزی کے کہیں آنے جانے نہ پائیں اور پولیس ان کی نگران حال رہے۔

---

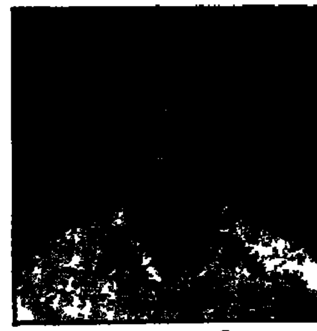
[۱] اس قدم کے پس منظر کو بیان کرتے ہوئے ہنری لارنس نے ایک اعلامیہ جاری کیا جس میں اس قدم کی مندرجہ ذیل وجوہ بیان کی گئیں۔

(۱) بھیروال کے معاہدہ کی رو سے مہارانی کو حکومت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا لیکن وہ کمپنی کے خلاف سازشوں میں مصروف رہی اور لاہور کی حکومت کی مخالفت کرتی رہی۔

(۲) چونکہ دلیپ سنگھ ابھی بچہ تھا اس کی پرورش ایسے حالات میں کرنے کی اجازت دینا کمپنی کے لئے مناسب نہیں تھا۔

(۳) مہارانی کو ہر قسم کے لوگ مل رہے تھے اور اس طرح سازش کے جال پھیلا رہے تھے۔ اس وقت پنجاب کی حکومت کمپنی کے رحم و کرم پر تھی عام لوگ سکھوں سے بے دل ہو چکے تھے اگر کمپنی چاہتی تو اسے اپنی سلطنت میں آسانی سے شامل کر سکتی تھی لیکن وہ ابھی الحاق کے لئے تیار نہ تھی۔ گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ نے ۱۱ مارچ ۱۸۴۶ء کے خط میں ایجنٹ لارنس کو اس امر کی تلقین کی کہ فوج کا استعمال بہت کم کیا جائے۔ (ایڈیٹر)

[۲] اس زمانہ میں ملتان کے گورنر مول راج نے بغاوت کر دی۔ اس پر مضمون علیحدہ شامل کیا گیا ہے۔ (ایڈیٹر) [باقی صفحہ ۲۶ پر دیکھئے]



حسن رضا

کوئی طائر شکستہ پر نہیں تھا
ہواؤں کا مگر محور نہیں تھا

نگاہیں ٹھہرتیں ہم پہ بھلا کیا
نقط منظر تھا پس منظر نہیں تھا

وطن میں بھی رہا طرفہ تماشہ۔!
جہاں ہم تھے ہمارا گھر نہیں تھا

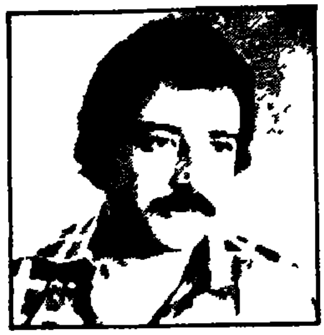
حصارِ فکر سے باہر نہ نکلے
کسی دیوار میں بھی در نہیں تھا

اُسے بھی ڈھونڈتی تھیں اپنی راہیں
امیرِ کارواں رہبر نہیں تھا

کھلی آنکھیں ہماری کس سمے پر
زمیں نیچے فلک اوپر نہیں تھا

زمیں کی گردشیں لپٹی ہوئی تھیں
رضا کے پاؤں میں چکر نہیں تھا

● ۱۶ رائے یرمرک کیمپ۔ راچور ۵۸۴۱۳۵



ساجد حمید

عریاں پیڑ پہ آنکھ جمائے بیٹھا ہے
بے بس پنچھی آس لگائے بیٹھا ہے

کٹیا آگ کے شعلوں میں ہے گھری ہوئی
بوڑھا سادھو دھونی رمائے بیٹھا ہے

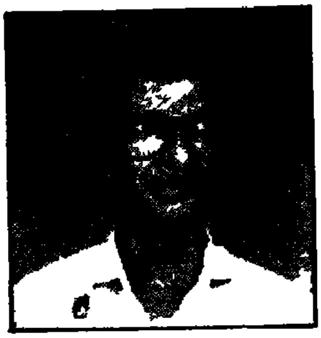
وہ ناداں ہے جھونک کے تاریکی میں ذہن
من مندر میں دیپ جلائے بیٹھا ہے

کس پہ طنز کے تیروں کی بوچھار ہوئی
رونی صورت کون بنائے بیٹھا ہے

ڈھونڈ رہے ہیں سب اپنی آنکھیں اور وہ
سورج تارے چاند چھپائے بیٹھا ہے

ایک ہی آنگن کے کھیلے تھے سب ساجد
دیوانہ دیوار اٹھائے بیٹھا ہے

● رینج فوریسٹ آفیسر، شموگا۔ ۵۷۷۲۰۱



عصمت مظفری

دل بھی اک عجب شئے ہے اس کا ساری دنیا سے جانے کیسا ناطہ ہے
موج میں جب آتا ہے پھول مسکراتے ہیں کھیت لہلہاتا ہے

میرا فن مرا کب ہے میرا فن تو تیرے ہی خال و قد چراتا ہے
میری شاعری کیا ہے میری شاعری تیرے حسن کا احاطہ ہے

تیرا نام ہے اللہ تیرا نام ہے بھگوان تو ہی سب کا داتا ہے
تو ہی دوست ہے سب کا تو ہی آڑے وقتوں میں سب کے کام آتا ہے

اس نے ماںتا کے تئیں قتل کی سزا سن کر ایک اک کو سمجھایا
بھائیو! مرا بیٹا زندگی کا خالق ہے موت بھی بناتا ہے

ہوں پہاڑ کی صورت اپنی راہ میں حائل خود یہ اس قدر مائل
اس کے باوجود عصمت وہ کبھی کبھی مجھ کو پھونک کر ہٹاتا ہے

● مکان نمبر ۷۴-۷-۱۳، شیر پورہ، ورنگل ۵۰۶۰۰۲

اظہر نیاز

ہاؤس نمبر ۳۲۳۵-۳، اسٹریٹ ۱۰، جی ۱/۹، اسلام آباد (پاکستان)

دوسرا پورٹریٹ

وہ پیدائشی اندھا نہیں تھا۔ میں نے اسے چشمہ ٹیسٹ کیا اور وہ اشیاء کو دیکھنے لگا۔ مکمل علاج میں تو کئی مہینے لگ جاتے۔ وہ یورپ جا رہا تھا۔ ایسی بینائی جو اشیاء کو صرف دیکھتی نہ ہو شناخت بھی کر سکتی ہو شاید یورپ میں مل جاتی۔

طالب علم لڑکے اور لڑکیاں آج بھی حسب معمول حیرت سے میڈم کو سن رہے تھے۔

"تم اپنے روحانی پیر سے پوچھو کیا میں ڈاکٹر کے ساتھ چلا جاؤں؟ کل پوچھوں گا۔

نہیں تم ابھی پوچھو کیوں کہ جو تمہارا پیر ہے وہ میرا پیر ہے اور اس نے مجھے کہا ہے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں۔

اچھا میں پوچھتا ہوں۔

کیا میں ڈاکٹر کے ساتھ چلا جاؤں، اس نے دائیں طرف منہ کر کے ہوا میں بات کی اور پھر خود ہی کہنے لگا۔

ہاں چلے جاؤ!

پیر صاحب کہتے ہیں تم ڈاکٹر کے ساتھ جا سکتے ہو، اور پھر میں اسے اپنے کلینک میں لے آئی۔ اب وہ پاگل آدمی نارمل ہو رہا ہے قابل علاج بیماری سے ناقابل علاج مرض تک۔ کتنا عجیب سفر ہے۔ پاگل کا علاج تو ممکن ہے لیکن یہ نارمل لوگ، کتنے ناقابل علاج ہیں یہ لوگ۔ یہ عجیب بات۔

وہ جنسی محرومی کا شکار تھا، اور کبھی کبھار تو وہ بہت مشتعل ہو جاتا تھا۔

تم سمجھتے ہو کہ میں تمہاری تنخواہ دار ہوں،

میرا اپنا کلینک ہے۔

مجھے یہاں پڑھانے کا کوئی شوق نہیں۔

میں تم لوگوں کو ایک لفظ نہیں پڑھاؤں گی

میڈم بہت سخت ہیں۔

تم لوگوں کو میری آواز سنائی نہیں دیتی۔ میں بہت آہستہ بولتی ہوں اور میں تمہیں نہیں سن سکتی تم بہت اونچا بولتے ہو۔

ہمارے درمیان لفظوں کے مفہوم خاموشیوں کی چنگھاڑ میں کھو جاتے ہیں۔

کہاں کھو جاتے ہیں؟

نہیں کس نے تلاش کیا؟

جواب طلب آنکھیں، پیشانیوں کو گھورتی رہتی ہیں۔ پیشانیاں جو تمام تحریروں سے خالی ہیں۔ نہ ماضی نہ آج نہ کل۔

دیکھو میڈم اپنے کمرے میں۔

کسی پر اسرار خاموشی کا وزن میرے کاندھے پر محسوس ہونے لگا۔

مجھے کیا ہو رہا ہے؟

میں صبح سویرے اتنی جلدی نہیں جاگ سکتی۔ ڈیپارٹمنٹ میں ٹیلیفون کر دو آج میں کلاس نہیں لوں گی۔ میری طبیعت خراب ہے۔

میڈم ٹیلیفون پر کوئی صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

کون ہے؟

کوئی مریض ہے

میرے اسٹوڈنٹس کو اجازت نہیں کہ وہ تعلیمی کام کے لئے میرے کلینک آئیں۔

کیا کہا؟

اسے کہہ دو کہ وہ کلینک ٹائم پر ملے یا ٹیلیفون کرے، اور میرے بھائی کے گھر ٹیلیفون کر دو۔ اس جمعہ کو وہ اپنے بچوں کو میرے گھر بھیج دیں شام کو میں خود چھوڑ آؤں گی۔

آئینے میں اس کے بال پھیلے ہوئے تھے۔

اس نے اپنے جسم کو خود ہی زور زور سے دبانا شروع کر دیا

مجھے اور زور سے بھینچو۔

مجھے اور زور سے بھینچو۔
ابھی میرے ساتھ کون تھا؟
اسے اس سے چھین لو۔ سرگوشی میں بڑی بے چینی تھی۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ پتہ نہیں میں کہاں سے آ رہی ہوں۔ مجھے کہاں جانا ہے شاید کوئی میرے ساتھ بھی تھا۔
کیا عمر ہو گی اس کی؟
نوجوان تھا!
نہیں بوڑھا تھا!
اس کا میرے ساتھ کیا رشتہ تھا؟
کون تھا وہ؟
صرف میں اپنے ساتھ تھی۔
کرسچین لڑکا!
مجھے خاموش دیکھتا رہتا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے "ہیلو" بھی کہا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ ہیلو کے بعد کیا کہنا چاہیے۔
ڈاکٹر!
مجھے کہتا میں تم سے شادی کر دوں گا۔ اور۔ اس رات کے بعد مجھے ڈاکٹر بنا کر خود امریکہ کی کسی دوسری ریاست میں چلا گیا۔
میڈم!
لیکن وہ تم نہیں ہو۔
میڈم! لڑکیاں معافی مانگنے آئی ہیں۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو میڈم آئینے کے سامنے کھڑی تھیں۔
لیکن وہ تم نہیں ہو!
کیا کہا میڈم؟
لڑکیوں سے کہو کہ معافی لکھ کر سب اس پر دستخط کر دیں۔
کلاس کل لوں گی۔
ابھی میں نے لفظ "ماسٹربیشن" استعمال کیا تھا تم جانتی ہو ماسٹربیشن کیا ہے؟
تم؟
تم؟
تم مجھ سے پوچھتے کیوں نہیں۔ مجھے روکتے کیوں نہیں اور پھر آواز نہیں کہ چلی گئی۔ شاید وہ خود لذتی کے بارے میں کچھ بتا رہی تھیں۔

مجھ تک جو لفظ پہنچا وہ "تحلیل نفسی" تھا۔
یا پھر!
وہ لڑکی جسے فونٹین پین سے خوف آتا تھا،
وہ بچپن میں ایک مرتبہ ایسے غسل خانے میں داخل ہو گئی تھی۔
جہاں ایک عریاں مرد غسل کر رہا تھا۔
وہ تمام لڑکیاں جنہوں نے قلم منہ میں لے رکھے تھے نکال لئے۔
میڈم شائد کچھ بول رہی تھیں لیکن مجھے صرف گہری لپ اسٹک لگے ہونٹ کھلتے اور بند ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔
گولی چلنے والی ہے،
لڑکوں کی دو ٹولیاں آپس میں لڑ پڑیں گی،
تمام لڑکیوں کو کمرے میں بند کر دو باہر سے تالا لگا دو۔
لڑکے فوراً شعبہ خالی کر دیں،
چلے جائیں۔ ابھی چلے جائیں۔
معلوم نہیں میڈم اتنی ڈرپوک کیوں ہیں۔
تحفظ نہ ہونے کا احساس۔
تو پھر شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔ خواہ مخواہ ہمارے لئے مصیبت بنی ہوئی ہیں ہائے! فرائیڈ اگر ہوتا تو میڈم ضرور شادی کر لیتیں۔
تو ٹھیک ہے کوئی آئیڈیل ہوتا ہے شادی کے لئے۔ کیا کسی گدھے سے شادی کر لیں!
وہ کہتی ہیں شادی نہیں کروں گی، میں تو نفسیات سے شادی کر چکی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ۔
دیکھو میڈم آ رہی ہیں، کمرے کے اندر آ جاؤ۔ وہ لڑکے لڑکیوں کا اس طرح کھڑے رہنا پسند نہیں کرتیں۔
پھر اس نے اپنے غیر معمولی سینے پر دوپٹے کو اس طرح کھینچا جیسے کتوں سے بچانے کے لئے قصائی نے گوشت ڈھانپا ہو۔
میں اس کے بدن کو چھونا چاہتا تھا؟
کیا میں یہ کتاب دیکھ سکتا ہوں؟
سینے کے ساتھ لگائی ہوئی کتاب کی طرف میں نے اس طرح ہاتھ بڑھایا کہ میرے ہاتھ کا زیادہ سے زیادہ حصہ اس کے جسم کے زیادہ سے زیادہ حصے سے مس ہو جائے۔
وہ مسلسل گھورتی ہوئی بے شرم آنکھیں۔
کچھ تو کرو نا۔ سرگوشی کانپ رہی تھی۔

میں کتاب واپس کرنا چاہتی تو حیران رہ گیا کیوں کہ وہ لڑکی ۔ ؟

چائے کی پیالی!

نہیں، کم از کم ایک کوک ۔

اور وہ دونوں ایک سمت کو نکل گئے ۔

چند لڑکے اور لڑکیاں مل کر زور سے اسی طرح ہنسے تھے کہ تقریباً ایک دوسرے کے گلے مل گئے ۔ میڈم کے کمرے کا دروازہ بڑی غصیلی آواز میں بند ہوا تھا

وہ لڑکی جب میرے پاس آئی تو اس کی جوانی الیکٹرک شاک کی نذر ہو چکی تھی اور شہر کے معروف ڈاکٹر نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ اسے آوازیں آتی ہیں اور بہت ہی شدید قسم کا مہلیریسی نیشن ہے ۔

میں نے جب اسے پوچھا کہ تمہیں آوازیں سنائی دیتی ہیں؟ تو اس نے کہا کہ مجھے بہت سی آوازیں سنائی دیتی ہیں میں نے دروازے کھڑکیاں بند کر دیں اور پوچھا کہ کیا تمہیں اب بھی آوازیں آتی ہیں تو کہنے لگی،

”میں کوئی پاگل ہوں؟

جب لڑکی جوان ہوتی ہے تو اسے آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن شاک سے یہ آوازیں قتل نہیں کی جا سکیں ۔

لڑکی رو رہی تھی اور میں مزید اداس ہو گیا ۔

اس کی بہن اور محبوبہ کا نام ایک ہی تھا اور وہ پاگل خانے کے لان میں بڑے اطمینان سے بیٹھا تھا ۔ اس کی ماں گھر سے کھانا لے کر آئی تھی ۔

میرا جی ہے کہ وہ بھی واپس نہیں جا سکتا کیوں کہ پاگل خانے کا ڈاکٹر اسے دوائیاں دے رہا ہے اور فرائیڈ ۔

وہ تھکا تھکا سا آئینہ ۔

میڈم نے سینے والوں کو دونوں ہاتھوں سے جکڑ رکھا تھا ۔

بڑھی ۔ ؟

پھر کوڑ ۔ ؟

پھر ۔ ؟

میڈم نے سینے کو سختی سے پکڑ رکھا تھا ۔ تھوک دی تھی تو زور سے سینہ کا بٹن ٹوٹا تھا وہ بار بار اسے ٹیلے کو کھینچ رہی تھیں ۔

ذہن میرے کاندھے پر ٹکی ہوئی سرگوشی سے رستے ہوئے کہہ دو سرا مگر خالی ہے ۔

بقیہ صفحہ ۱۴ ایک سادہ سی کہانی

شمیم کا گھر والا ———

راجہ صاحب ——— سرکاری افسر

کوئی ملا ۔ کوئی نہ ملا ۔ زیادہ لوگ حیران کھڑے رہے ۔

راجہ صاحب نے گلا صاف کر کے پوچھا ———

کسی کا حق شفع تو نہیں ؟

کوئی نہ بولا ۔

راجہ صاحب نے توقف کیا ۔ دوبارہ کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا

” مرحومہ سب سامان اور مکان ۔ “

میری بیوی کے نام

چھوڑ گئی ہے ——— !

مکان برائے فروخت ہے جس کا دل چاہے قیمت ادا کرے

اور خرید لے ——— “

بقیہ صفحہ ۲۲ فسان

چونکہ سکھ سلطنت کی بے انتظامی اور سکھوں کی سرکشی سے صاحبان انگریز کمال تنگ آ گئے ہیں ۔ بحالت مجبوری نواب بہادر گورنر جنرل ہند نے اس ریاست کے ضبطی کا حکم نافذ فرمایا[1]“

---

[1] ماخذ کنہیا لال ۔ تاریخ پنجاب ۔ لاہور ۔ ۱۸۸۱ء صفحہ نمبر ۲۹ ۔ ۳۲۲

بقیہ صفحہ ۲۸ مختصر کہانیاں

” اس میں لفظوں کے معنی بدل گئے ہیں “

” وہ کیسے “

” مثال کے طور پر ” قلع قمع “ کے معنی ہیں خاتمہ کرنا ۔ اس ڈکشنری میں لکھا ہے ” پھولنے پھلنے کا موقع دینا ۔ ہم اگر کہیں کہ سماج دشمن عناصر کا قلع قمع کر دیں گے تو اس کا مطلب ہو گا ہم ان کو پھولنے پھلنے کا موقع دیں گے ،، اس طرح ایک لفظ ہے ” نہیں “ اس کا مطلب اس ڈکشنری میں ” ہاں “ لکھا ہے ۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم قیمتوں کو بڑھنے نہیں دیں گے ۔ اس ڈکشنری کی رو سے کہیں گے ” بڑھنے دیں گے “

اس طرح کے اور ہزاروں الفاظ “

” یہ ڈکشنری کس نے لکھی ہے ؟ “

” سیاست دانوں نے “



رفیق راز

کئی منظر ہیں لیکن چشم بینا ہی نہیں ہے
کسی جانب رواں حیرت کا دریا ہی نہیں ہے

ہمارے درمیاں ہے چپ کا سناٹا بھی حائل
فقط اتنی ہوئی دیوار سایا ہی نہیں ہے

ترے نقشے میں آوازوں کے قلزم تو بہت ہیں
مری چپ کا وہ دہشتناک صحرا ہی نہیں ہے

عجب پُر کیف خاموشی میں ڈوبا جا رہا ہوں
درِ گنجینۂ اسرار کھلتا ہی نہیں ہے

میں خود ماضی ہوں یا ماضی مرا ہے ساتھ میرے
لگا ہے داغ اک ایسا کہ مٹتا ہی نہیں ہے

خود اپنے دھیان میں گم صم بیٹھے تنہا یہ ہیرو
ادائے خودکشی تو ہے خود آگاہی نہیں ہے

● ریڈیو کشمیر۔ سری نگر (کشمیر)



خالد سعید

چاند نکلے گا تو ہم پوچھیں گے

چاند نکلے گا تو ہم پوچھیں گے
کون سے سینے سے ہوتے ہو طلوع؟
کون سی آنکھ میں جا ڈوبتے ہو؟

چاند نکلے گا تو ہم پوچھیں گے
کتنے دروازے ہیں
کتنے دروازوں، دریچوں کے عوض خالی ہیں؟
کتنی دیواریں ہیں
کتنی دیواروں پہ چھت قائم ہے؟
کتنی آنکھیں ہیں
کتنی آنکھیں ہیں دھوئیں سے آلودہ؟
کتنی آنکھوں میں ابھی خواب دا تر باقی ہے؟
کتنی آنکھوں میں ابھی رنگِ سحر باقی ہے؟
کون سی آنکھ میں جا ڈوبتے ہو؟

چاند نکلے گا تو ہم پوچھیں گے
تم کو معلوم بھی ہے؟!
اب کے نئی کاشت ہوئی

کھیت میں، دشت میں... بدن بوئے گئے۔
سر کہیں بوئے گئے، جسم کہیں،
ہاتھ کہیں بوئے گئے، پاؤں کہیں،
کھیتیاں خون سے سینچی گئیں
سینوں میں رچائی گئی ویرانی سی ویرانی۔

چاند نکلے گا تو ہم بولیں گے
چاند نکلے کہ نہ نکلے، یہ کہیں گے ہم تو
بیج کی، خاک کی فطرت یہ ہے
ایک لوٹاتی ہے اور دوسرا لوٹ آتا ہے
جسم ہوں آنکھیں ہوں، سر ہوں کہ دل و بازو ہوں
چیر کے سینۂ کھیتی کو نکل آئیں گے
کاسۂ سر سے نکل آئیں گے سر اور کئی
ایک اک شاخ پہ بازو کئی لہرائیں گے
خون سے سینچی ہوئی فصل ہے یہ، ابر کی محتاج نہیں
کسی مہتاب، کسی مہر کی محتاج نہیں
دیکھتے دیکھتے کھلیانوں پہ چھا جائے گی
آپ بازار میں بکنے کے لئے آئے گی
اپنی قیمت کا تعین بھی کرے گی خود ہی
دیکھنا۔ دام کھرے اپنے کرے گی خود ہی

● ۴۱۲-۲-۶، فورٹ روڈ، مینار تعلیم، بیدر - ۵۸۵۴۰۱



عباس خان

معرفت کاروان بک سینٹر، صدر لقمان کینٹ (پاکستان)

مختصر کہانیاں

سچی محبت

"دنیا میں سچی محبت کی بڑی بڑی مثالیں موجود ہیں۔"

"کونسی ہیں وہ مثالیں؟"

"مجنوں کو لیلیٰ سے محبت۔"

"غلط۔"

"ہٹلر کو اپنی قوم سے۔"

"غلط۔"

"ہمارے محلے کی مسجد کا مولوی اکثر یادِ الٰہی میں مصروف رہتا ہے مجھے یقین ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ سے سچی محبت ہے۔"

"غلط۔"

"اگر یہ سب غلط ہیں تو پھر دنیا میں سچی محبت کا وجود ہی نہیں۔"

"وجود ہے۔"

"تو پھر آپ بتائیں کہ سچی محبت کہاں ہے؟"

"اپنے آپ سے محبت۔"

آزادی

"ہمیں یقین تھا کہ قومی سطح پر آزادی حاصل کرکے اجتماعی جدوجہد سے ہم ملک کو جنت نظیر بنا دیں گے لیکن الٹا ہم پریشانی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اگر یہی ہے آزادی تو آزادی کی خاطر اتنی قربانیاں کیوں دی جاتی ہیں؟"

"آپ نے آزادی کا مطلب سمجھا نہیں۔ آزادی قومی سطح پر اس لئے حاصل کی جاتی ہے تاکہ ذاتی اغراض کی خاطر مقابلہ کم آدمیوں سے ہو۔"

تاریخ کے مصنف

"آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟"

"تاریخِ اقوامِ عالم پڑھ رہا ہوں۔"

"کس کی لکھی ہوئی ہے؟"

"اس کے لکھنے والے دو ہیں اور ان کے نام خوف و لالچ ہیں۔"

مرتبہ

پہلا مقرر: ابدان ایک عظیم ادیب ہے، اس کی تحریروں نے معاشرے میں مستقبل کے ساتھ رشتوں کو استوار کیا ہے۔

دوسرا مقرر: ابدان صاحب نے ادب کو نئی جہتیں بخشی ہیں۔

تیسرا مقرر: ابدان صاحب کا سماجی شعور بہت گہرا ہے۔

"یہ ابدان صاحب کیا لکھا کرتے ہیں؟"

"مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ چیک بک لکھا کرتے ہیں۔"

نئی ڈکشنری

"آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟"

"ایک نئی ڈکشنری پڑھ رہا ہوں۔"

"نئی سے کیا مراد ہے؟"

[باقی صفحہ ۲۶ پر دیکھیے]

مٹھی بھر نظمیں



افتخار امام صدیقی

چار دن
صرف چار دن
تمہاری آواز سے بچھڑ جانے والے
یہ دن
مجھ میں
خدا بھر تنہائی
آسمان بھر خامشی
بکھیر گئے
مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے
بے شمار نوری سال
تمہارے
میرے
درمیان آ گئے ہیں

میں سوچتا ہوں
یہ چند دن
کچھ اور طویل ہو گئے تو؟!۔

خود کو بہت ضائع کر لیا
تنہا
تو کبھی کسی کے ساتھ

اور اب!
ماہ و سال سے ٹوٹتے ہوئے جسم کے اندر
بھری ہوئی خواہشوں کی ڈوبتی سطح سے
خطرناک حد تک
کم ہوتے ہوئے جذبوں سے
کمزور ہوتی ہوئی شدتوں سے
خوف زدہ ہوں۔

مجھے معلوم ہے!
تمہارے پاس
اپنے جذبات کے اظہار کے لئے
ایک ہی اسلوب ہے۔
تم!
چند لمحوں کی شدتوں میں
جیتے ہو
مر جاتے ہو۔
ان چند لمحوں میں
تمہارے اندر کا
ہمیشہ کا، بھوکا، پیاسا، قیدی درندہ
ایک ہی جست میں
باہر آ جاتا ہے۔
پل بھر میں
اپنے سامنے پھیلے ہوئے جسم میں
بنا کسی تیاری کے
بغیر کسی ترتیب کے
اتر جاتا ہے

جسم سے جسم کے تماشے میں
اسلوب رہ جاتا ہے
تہذیب مر جاتی ہے۔

زمیں کی تہوں میں اتر جانا چاہتا ہوں
تہوں کی حدوں سے آگے،
بہت آگے
دیکھنا چاہتا ہوں کہ
پل پل ریزہ ہوتی ہوئی دنیا
کہاں ذخیرہ ہو رہی ہے۔

موت سے مکالمہ

میں تجھے جانتا ہوں
میری روح میں کہیں
چھپی ہوئی ہے تو

ماہ و سال کی سان پر
رکھے میرے جسم کو
پل پل کھرچتی رہتی ہے

میں نے تیری خامشی کو پڑھا ہے
تیری گفتگو کو لکھا ہے
تیرے لفظوں کو سنا ہے
تجھے حرف حرف سوچا ہے
تجھے لفظ لفظ پرکھا ہے

اپنی روح میں تیرے
قہقہوں کو بھرتے ہوئے
آنسوؤں سے کبھی
شور کرتے ہوئے
کبھی روح کی روشنی میں
کبھی اپنے جسم کے باہر

تیرے سارے رنگ
سارے ذائقے
میرا احساس ہیں

شب و روز کے تسلسل کا
ایک لمحہ میں ہوں
دوسرا لمحہ تو ہے

میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں

روح کائنات کے نام

خدا نے
ایک پیکر میں
اپنا تمام تخلیقی نور بھر دینے کے بعد
اس سے،
ساتوں آسمان
سورج
چاند
ستارے
سیارے
معلوم نامعلوم انسان
فرشتے
حور،
ملائک
اور بے شمار
مختلف ہیئتیں تخلیق کر دیں
تاکہ
اس نور پیکر کی عظمتوں
اور اس کی توصیف کے لئے
چاروں دشاؤں سے
درود و سلام کی
بارشیں ہوتی رہیں۔

خدا کا
تخلیقی عمل ابھی جاری ہے۔

نقد و نظر

معاصر تنقید ایک نئے تناظر میں

شاعر و نقاد پروفیسر حامدی کاشمیری کا نیا تنقیدی کارنامہ جس میں ان کے مخصوص نظریاتی موقف یعنی تنقید کے اکتشافی تفاعل کے تحت معاصر اردو تنقید کے نظریات و رجحانات کے امکانات اور حدود کا بسرو فنی جائزہ لیا گیا ہے۔ معاصر تنقید کا کوئی تجزیاتی اور تقابلی جائزہ نہیں ہے اور نہ ہی اس میں تنقید نگاروں کا کوئی تفصیلی مطالعہ۔ مگر اپنے موضوع پر یہ ایک بحث طلب تنقیدی کتاب قابل مطالعہ ہے۔ ★ مطبوعہ ۱۹۹۳ ★ ضخامت ۲۷۹ صفحات ★ قیمت ۱۰۰ روپے ★ رابطہ: دائرہ ادب، مسعود منزل، شالیمار سری نگر (کشمیر)

اجنبی شہر

نقاد، محقق، ادیب اور مدرس پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی یہ مختصر سی کتاب اپنے آپ میں ایک منفرد سی تخلیق، رپورتاژ، انقلاب انسانی اور حیات ہے جو سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو سے مدرس و صدر بنے کی ایک لمحے کی داستان ہے اور ہجرت کے (دسنے سے بھوپال تک) اپنے تجربات سے اپنی شخصیت کی تعمیر کی۔ اپنے کام کو عبادت کا درجہ دینے والے بہت کم خوش نصیب لوگوں سے درس لینے کیلئے مذکورہ کتاب کا مطالعہ زندگی کی تگ و دو میں معاون ہوگا۔ کتاب کی ترتیب و تہذیب کی نفاست اور سلیقگی متاثر کرتی ہے ★ ضخامت اسی صفحات ★ قیمت ۱۵ روپے ★ مطبوعہ ۱۹۹۳ ★ پتہ: مدرس بھوپالی لعت اور، عبدالقوی بھوپال — ۴۶۲۰۰۱

سرسبز

شاعر اور ادیب کرشن کمار طور کی ادارت میں شائع ہونے والا معیاری ادبی جریدہ جس نے اپنی اشاعت کے ۹ سال مکمل کرنے لئے ہیں۔ موجودہ شمارہ اپریل ۱۹۹۲ تا مارچ ۱۹۹۳ ایک خصوصی شعری اشاعت ہے جس میں عصر حاضر کے ۳۱ منتخب شعرا کے تیس تیس منتخب اشعار دیئے گئے ہیں۔ جو شعرا نے خود دیے ہیں۔ عصری اردو غزل کے عمومی جائزے اور تجزیے کی ایک بھرپور کوشش ہے۔ اس پورے انتخاب پر ڈاکٹر بشیر بدر نے ایک بحث طلب تنقیدی مضمون بھی لکھا ہے۔ ★ ضخامت ۷۵ صفحات ★ قیمت درج نہیں ہے ★ رابطہ: سرسوتی، ۳۴۴ کمہارا روڈ، دھرم شالہ ۱۷۶۲۱۵ (ہماچل)

نئے بھائی (سجاد ظہیر)

پروفیسر عتیق احمد (پاکستان) نے سید سجاد ظہیر پر مختلف ہونے والے بہت سارے مضامین کو تلاش بسیار کے بعد کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ کل ۲۸ مضامین جنہیں نئے بھائی کے ہم عصروں نے ان کی حیات میں اور بعد مرگ تحریر کیا تھا۔ کتاب میں ۹ تاثراتی مضامین بھی شامل ہیں جو سے لوگوں کو پانچ حصوں میں سہولت کی سلیقگی کے ساتھ سجا دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب ایک شخصیت کے حوالے سے ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادب کا جائزہ بن گئی ہے ★ مطبوعہ نومبر ۱۹۹۱ ★

ضخامت ۸۰ صفحات ★ قیمت درج نہیں ★ رابطہ: عتیق احمد — آر ۱۴۵ بلاک ۱۵ عزیز سوسائٹی — کراچی (پاکستان)

پرندے کیوں نہیں اڑتے

مشہور ادیب، نقاد اور افسانہ نگار دیوندر اسر کا نیا افسانوی مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ (ایک اور لنگڑے، شیشوں کا مسیحا اور کینوس کا صحرا) کتاب میں شامل ۱۷ افسانے اپنے عنوانات اور موضوعات کے تنوع میں تخلیقی دانشوری کا خوب صورت اظہار ہیں۔ ان افسانوں کا اسلوب، تکنیک، زبان اور بیانیہ سب کچھ اپنے فطری بہاؤ میں تدریج کو ساتھ ساتھ لے چلتے ہیں۔ افسانہ نگار اپنے شعور کی صاف ستھری، روشنی بکھیرتا ہوا اپنے عصر کے تضادات کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہے۔ ایک دانشور فنکار کے اپنے محسوسات کا نچوڑ، پرندے کیوں نہیں اڑتے عصری اردو افسانے کو مزید وقار عطا کرتا ہے۔ ایک قابل مطالعہ کتاب۔ ★ ضخامت: ۱۴۰ صفحات ★ قیمت ۷۰ روپے ★ مطبوعہ ۱۹۹۳ ★ تقسیم کار: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز بی — ۲/۱۶ کرشن نگر، دہلی ۱۱۰۰۵۱

ریزہ ریزہ کائنات

عباس خان (پاکستان) کا افسانوی مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ (دھرتی ماتا، آواز، کسان، قلم، کرسی، وردی، اس عدالت میں) تخلیق کار عباس خان پیشے کے اعتبار سے سرکاری جج ہیں۔ لہٰذا ان کی تحریروں میں شہری زندگی کے تمام تضادات نکھرے نظر آتے ہیں۔ جملوں میں طنز کی زبردست کاٹ، لہجے میں سچائی اور حقائق کا بہت روشن اظہار قدری کو بڑھاتا ہے۔ کتاب میں شامل ۱۷ مختصر افسانے معاشی اور ڈرامائی ہو کر رہ گئے ہیں۔ زندگی کی کہانیاں ہماری زندگی کو خوشنما بھی کرتی ہیں اور ہمارے احساسات کو مزید تہہ داریاں بھی دیتی ہیں ★ مطبوعہ ستمبر ۱۹۹۲ ★ ضخامت ۱۸۰ صفحات ★ قیمت ساٹھ روپے ★ تقسیم کار: بلدوان بک سینٹر، صدر، ملتان کینٹ (پاکستان)

جزیرہ (ادبی سماہی)

ہارٹ شایر (انگلستان) سے اردو کا ایک سماہی ادبی جریدہ اپنے شمارہ اولین ہی سے متوجہ کرتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ رسالہ ٹونو اسمیتھ سے شائع ہوا ہے۔ رسالے میں مقامی قلمکاروں کے علاوہ برصغیر کے معروف لکھنے والوں کی معیاری تخلیقات سلیقے سے سجائی گئی ہیں۔ اس رسالے کی پذیرائی ہونی چاہیئے کہ یہ ایک ایسے علاقے سے شائع ہو رہا ہے جہاں وسائل کم ہوں، جو دیگر علاقوں سے الگ ہو، اردو پر بس کی سہولتیں ہوں اور جہاں اردو لکھنے، پڑھنے اور بولنے والے کم ہوں — مگر مدیران کے حوصلے بلند ہوں اور وہ زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے کوشاں ہوں۔ ★ شمارہ: اپریل ۱۹۹۳ ★ ضخامت ۴۴ صفحات ★ قیمت ۱۵ روپے — زر سالانہ ۶۰ روپے ★ سرپرست الیاس احمد خان ★ مدیر: شعیب قیس ★ معاونین: رئیس اندرابی، مقصود احمد انصاری ★ پتہ: دائرہ اردو ادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۸ ہارٹ شایر (انگلستان) ۱۹۹۴ء

منشا یاد کے بہترین افسانے

زیر تعارف مجموعہ جسے احمد اسلام امجد نے مرتب کیا ہے پاکستان کے معروف افسانہ نگار منشا یاد کے ۲۵ افسانوں پر مشتمل ہے۔ یہ افسانے ان کے ۵ افسانوی مجموعے بند مٹھی میں جگنو (۱۹۷۵)، ماس اور مٹی (۱۹۸۰)، خلا اندر خلا (۱۹۸۳)، وقت سمندر (۱۹۸۶) اور وغیرہ وغیرہ (۱۹۹۰) سے ہیں۔ منشا یاد کا تعلق انتظار حسین کی بعد کی نسل سے ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ نئے افسانے کی عمومی علامتی اور تجریدی رو سے ایک گریز ملتا ہے۔ انہوں نے حقیقت بیانی اور فینٹسی کے بیچ ایک الگ راہ نکالی ہے۔ جو شہروں سے الگ دیہات کے نیم کہانیوں کی روایت سے ملتی جلتی ہے لیکن منشا یاد کا بیانیہ خارجی نہیں گہرائی میں بھی جاتا ہے (اکوبی حد تک) منشا یاد کے افسانے ہندوستان کے اردو قارئین کے لئے نئے تو نہیں۔ یہ مجموعہ ان کا کوئی مجموعہ یہاں شائع ہوا اور نہ ہی دستیاب ہے۔ نئے اشاعتی ادارے، ادب پبلی کیشنز (نئی دہلی) نے اردو کتابوں کی اشاعتی سیریز کے تحت یہ ایک خوبصورت کتاب شائع کی ہے۔ ★ ضخامت ۲۲۸ صفحات ★ قیمت ایک سو پچاس روپے ★ مطبوعہ ۱۹۹۳ ★ پتہ: ۱۳۳۰۳ سے ۳۸ سے، مرانی دہلی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۵

ارتقا (کتابی سلسلہ)

کراچی (پاکستان) سے شائع ہونے والا علمی و ادبی کتابی سلسلہ "ارتقا" نے اپنے شمارہ اولین سے تازہ شمارے تک (مئی ۱۹۹۳) ۲ تو بین الاقوامی اہمیت کے موضوعات پر خصوصی گوشے شائع کئے ہیں جو ساٹھ سے زیادہ دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کے طبع زاد تخلیقات، تراجم، شعری تخلیقات اور تبصروں پر مشتمل ہیں۔ پاکستان کو درپیش مسائل کی تفہیم اور بدلتی ہوئی عالمی صورت حال اور اس کے نئے تقاضوں کے یہ گوشے خود علمی اہمیت کے حامل ہیں۔ آزادی سے موجودہ پاکستان میں جمہوریت، آزادی اظہار، لسانیت، تناظر و تجزیہ، اشتراکیت کا مرتبہ (نظریہ و عمل) اور تازہ شمارہ، سندھ مسائل، تناظر اور تجزیہ۔ ہر شمارے میں فکر انگیز اداریہ، ہمارا موقف (پاکستان میں جمہوریت اور بدلتے رجحانات از راحت سعید) سید کے، تازہ بحث طلب مقالے، سائنس، سماجیات کے تحت ۳ تراجم، نثری ادب کے تحت یادداشتیں (خلیق اور ابراہیم خلیق) اور افسانے — ۴ شعرا کی نظمیں، ۳ شعرا کی چار غزلیں اور آخر میں گوشہ حبیب جالب میں ۵ مضامین، منظوم خراج عقیدت اور منتخب کلام دیا گیا ہے۔ ارتقا علم و دانشوری کے نت نئے عمودے ہونے ہوتا ہے۔ ادارہ حسن عابد، واحد بشیر، راحت سعید ★ ضخامت ۲۴۸ صفحات (کمپیوٹرائزڈ) ★ قیمت ۳۰ روپے (پاکستان) ★ بیرونی ممالک ۵ امریکی ڈالر ★ سالانہ پاکستان سو روپے ★ بیرونی ممالک ۱۵ امریکی ڈالر ★ پتہ: اے ولایت آباد نمبر ۲ منگھوپیر روڈ کراچی — ۱۶ (پاکستان)

*

★ **حامدی کاشمیری** — مسرو منزل شالیمار سرینگر (کشمیر)
شاعر کا عمر شمارہ دیدہ زیب ہی نہیں فکر انگیز بھی ہوتا ہے۔ آپ کی محنت رنگ لا رہی ہے۔ یہ ایک مستحسن قدم ہے کہ آپ دیگروں کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے باصلاحیت فنکاروں کی برابر حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں آپ نے شعر اور افسانہ کے تعلق سے کئی قلمکاروں کو متعارف کروایا ہے اور ساتھ ہی ان اصناف میں تازہ تر رجحانات کے پنپنے کے لئے راستہ ہموار کیا ہے۔

★ **تنویر احمد علوی** — ۲۹۱۷ مہوری والان دہلی — ۶
نئے مشترکہ شمارے میں نئے قلمکاروں کی پیش کش تمہارا ایک مستحسن قدم ہے۔ مہ وش راجہ اور عفت زریں کی غزلیں اچھی تھیں۔ ان میں فکر کی تازگی اور اسلوب کی شگفتگی دونوں موجود ہیں۔ مدیر اختر کے دوہے بھی اچھے لگے۔ ایسے فنکاروں کو روشناس کراتے رہو۔ اور تم تو اپنے ہر شمارے کے ساتھ اچھے لگتے ہی ہو۔

★ **بلراج کومل** — ای ۱۹۳۹ کالکاجی نئی دہلی — ۱۹
نئی آوازوں کی تلاش 'شاعر' کی خصوصیت ہے۔ تازہ ترین شمارے اس سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ میں نے تمام تحریریں بغور پڑھیں کچھ تحریریں صرف منتشر خیالات کا نمونہ ہیں۔ ... کسی ... کا اہتمام کرتی ہیں۔ غیر ... کی آہنگ ہے۔ اس لئے نیر ہموار محسوس ... کی گئی ہیں کچھ نظمیں البتہ وحدت تاثر حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔ (آہنگ کی کمزوریوں کے باوجود) ان میں اشہر ہاشمی (اشہری) ساز ینہ (ان کا اسلوب و لہجہ اور طریق کار نئے ہندی شاعروں سے کسی حد تک ملتا جلتا ہے) اور عزیزہ مریم کی نظمیں شامل ہیں۔ بیشتر غزلیں انفرادی تشخص سے عاری ہیں۔ شاعر کی طرف سے کی جانے والی نئی صلاحیتوں اور نئی آوازوں کی تلاش کی کوشش بہر حال مبارک ہے۔

★ **والی آسی** — مکتبہ دین و ادب امین آباد، لکھنو
اس بار شاعر کے دو شماروں کا ایک شمارہ (نئی نفسیات نئی شعری کائنات) اس قدر بار آور ہے کہ داد دئیے بغیر چارہ نہیں ... سے اور تازہ کار، جواں طرز شاعروں کی تخلیقات باوجود اپنی ... کے، بے حد متاثر کرنے والی ہیں۔ آپ اور یہ شاعر ... مبارکباد کے مستحق ہیں۔ آپ اس لئے کہ آپ نے ٹیلنٹ ... الفاظ دیگر ڈھیروں کے حساب سے ڈراک آتی ہے۔ ... سو فیصد شاعری ہوتی ہے۔ آپ نے تمام لوے فیصد ... پڑھی اور پھر اسی کو پڑھکر چھانا اور تولا۔ تب کہیں یہ شمارہ آپ ... دے سکے۔ مبارک ہیں آپ اور شاعر۔ دونوں کہ ہندوستانی شاعری کے نئے ٹیلنٹ کو بروئے کار لا کر آپ نے بعض ... کرنے والوں کی زبان بند کر دی جو کہ ہر وقت ایک ... میں مبتلا رہ کر پاکستانی شاعری کو ہندوستانی اردو ... پر ترجیح دیتے رہتے ہیں۔ ان دونوں شماروں کے ... کو بھی میری مبارک باد پہنچا دیجئے جو اسی کساد ... میں بھی جگر کاوی کر رہے ہیں۔ وہ ماشاءاللہ اول ... تخلیق کار نیز ... کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ میں تو آپ سے ... ہوں کہ اگر موقع ملتا تو ممبئی آتا اور آپ کو گلے لگاتا۔

اس سلسلے میں بہت سی باتیں کرتا۔ مگر خیر اشکوہ ہے بہت سوں کو میری باتیں اچھی نہ لگیں۔ ہو سکا تو اس شمارے کے شاعر فنکاروں کو فرداً فرداً مبارکباد دوں گا اور ایک سے کہوں گا کہ یہ آگ بجھنے نہ پائے اور ٹھٹھرتے ہوئے انسانوں کو گرمی فراہم کرنے کا کام کبھی بند نہ ہو (آمین)

★ **رفعت اختر** — کمال ہاؤس مگھیر کما تیان ٹونک (راجستھان)
نئی نفسیات نئی شعری کائنات موضوع پر آپ کا اداریہ بے پناہ ہے۔ چند سطور میں جہان معنی پوشیدہ ہے۔ میری گزارش ہے کہ شاعر کے اداریوں کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے یا شاعری کا کوئی 'اداریہ نمبر' ترتیب دیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ قارئین و ناقدین بیسویں صدی کی پانچ دہائی کا محاسبہ شاعر کے اداریوں سے بآسانی کر سکتے ہیں۔ اداریئے میں آپ کا یہ پیغام فکر و عمل کی دعوت دیتا ہے کہ کچھ بڑے نام یا کوئی ادبی گروہ یا حلقوں میں بٹے ہوئے ادبی رسائل اپنے منتخب ناموں کی گردان میں اتنے محو ہو گئے ہیں کہ آس پاس کی سچائیاں پس منظر ہوتی جا رہی ہیں۔ کاش اگر وہ بند تخلیق کاروں کے سکہ بند قوانین کھلی فضا سے دوچار ہوں۔

★ **شاہد عزیز** — ۹۱۸ اصلاح تقانی باڑہ — بہار
شاعر کی تازہ ترین پیش کش 'نئی نفسیات نئی شعری کائنات' پسند آئی۔ شاعر ہمیشہ ہی سے تازگی کا کارنامہ انجام دیتا رہا ہے۔ یہ شمارہ بھی ایک اور تازگی کا کارنامہ ہے۔ مگر مجھے ایک کمی جو لگی وہ یہ کہ اس شعری کائنات میں کچھ مضامین بھی ہوتے۔

★ **ملکہ نسیم** — اے ۲۲ فاریسٹ کالونی پہاڑ اعلی بھوپال
'نئی نفسیات — نئی شعری کائنات' بہت خوب ہے۔ سازینہ کی نظمیں بے حد پسند آئیں۔ ویسے تو دونوں ہی شمارے اچھے لگے لیکن سازینہ کی نظموں میں نسوانیت بھرپور انداز سے ابھر کر آئی ہے۔ اس لئے کچھ زیادہ ہی اچھی لگیں۔ آپ کے جربات کا ایک پیرا لکھنے کو جی چاہ رہا ہے۔ "فن پارہ اور قاری، فن پارہ اور سامع، فن پارہ اور وقت۔ مگر یہ بچے اور گھر سے رشتے، سماجی منصب داریوں اور وسیلوں نے تقریباً ختم کر دیئے ہیں —"

★ **رخ زماں انصاری** — نیشنل ڈیفنس اکاڈمی، کھڑک واسلا، پونہ
آپ کی خوب سے خوب تر کی سعی بہت ہر شمارے سے عیاں رہتی ہے۔ اب تو شاعر اپنی نوعیت اور مزاج کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہو کر ادب کی شاہراہ پر سرخرو ہو رہا ہے۔ آپ نے پچھلے شماروں میں (بشمول تازہ شمارے کے) تازہ کار شعرا کا کلام اتنا اور اس طرح یکجا کر دیا ہے کہ ۶۰ اور ۷۰ کے بعد کی شاعری کا فرق واضح طور پر سمجھ میں آنے لگا ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ۱۹۸۰ کے بعد کی غزل کی سمت و رفتار کا جائزہ تفصیل سے لیا جائے۔ تازہ شمارہ بجا طور پر داد و تحسین کا مستحق ہے۔

★ **عطاء الرحمان طارق** — ۹۱۲۳ ٹاٹا بلڈنگ، چکلہ سرکل ممبئی — ۱
شاعر کے نئے شمارے دیکھ رہا ہوں۔ بلاشبہ کر اسی طمانیت کا احساس ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی کوئی ادبی کورس مکمل کر لیا ہو۔ اور بھی دل بڑھتا ہے کہ یہ ہمارے درمیان سے نکل رہا ہے۔ یہ آپ کا حسن ادارت ہے۔

★ **انور حسین انور** — ۷۸ — ۶ م جی روڈ، بڈگلہ ۴۰۰۵۶۷ (ممبئی)
'نئی نفسیات۔ نئی شعری کائنات' کے تحت دونوں شمارے بہت معیاری ترتیب دیئے گئے ہیں۔ شعری انتخاب نئے قلمکاروں کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ شمارہ نمبر ۲ میں فکر امروز میں شعر کی اہمیت کے بارے میں علامہ سیماب اکبر آبادی نے جو کچھ فرمایا ہے بس وہی حقیقت ہے۔

★ **فیاض فیض** — ۱۷۸۲ نیا پورہ، گھڑی والی مسجد، اندور
'نئی نفسیات۔ نئی شعری کائنات' اول تا آخر بہت خوب ہے۔ علامتی سرورق کے کیا کہنے۔ آپ کی تجریدی ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ محمود ہاشمی کا مضمون، 'مجاز کے بارے میں' اچھا لگا۔ مضمون اس بات پر بھی دال ہے کہ وقتی طور پر شہرت اور حقیقی ادبی قدر دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ غلام الہندی کی کہانی 'جواب مل گیا' دے گئی۔ کہانی کا آخری ٹکڑا بہت ہی بلیغ اور معنی خیز ہے۔ اس ٹکڑے میں انہوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جسے وہ پوری کہانی میں کہنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ نظموں میں احمد مسعود کی نظم ہو کی بدلتوں کا پیش لفظ اور اشہر ہاشمی کی نظم 'پرندہ' اچھی لگیں۔ سازینہ کو ابھی اور بہت کچھ تخلیق کرنا ہے۔ اتنے سبک انہا کی سعادت بھی بڑی چیز ہے۔ غزلوں میں احمد منظور، عالم خورشید، ارشد عبد الحمید، اور شکیل جمالی نے متاثر کیا۔ مکتوبات کے باب میں نامی انصاری نے اکبر حمیدی کے مضمون (جدید غزل میں جعلسازیاں) کے تحت بہت مناسب گرفت کی ہے۔ دوسرا خود نریندر سنگھ ساتیہ کا ہے۔ انکی رائے سے مجھے اتفاق نہیں۔ جلد ۶۴ شمارہ نمبر ۲ میں فکر امروز کے تحت حضرت سیماب اکبر آبادی کے نام تو سوائے شعر کی بھرپور اور جامع تعریف پڑھنے کو ملی۔ اسلم حنیف کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف تنقیدی ادب کا خاصہ مطالعہ رکھتے ہیں۔ تاہم حوالوں اور اقتباسات سے بات نہیں بنتی۔ ایسے ہی مضموں میں وہ خود بہت کم نظر آئے۔ حامد اکمل کی نظمیں اچھی لگیں۔ غزلوں میں شارق کیفی، عفت زریں، احمد محفوظ اور بطور خاص ... نے متاثر کیا۔

★ **قیصر اقبال** — شاہ فیصل کمپس، دلاور پور، مونگیر (بہار)
تازہ شماروں میں (شمارہ نمبر ۱،۲ اور جلد ۶۴) سب سے زیادہ نوٹس لینے والی چیز "حربات" کے تحت پیش کی گئی آپ کی باتیں ہیں۔ آپ نے لکھا ہے 'نیا تخلیقی ذہن ختم ہوتی ہوئی صلیب صدی کو اپنے آپ میں جذب کرتے ہوئے ایک نئی صدی کی دھمک کو محسوس کر رہا ہے۔' آپ کے اس بیان سے اگر یہ مراد لیا جائے کہ مظلوم انسانوں اور ارینیوں پر گورے صلیبی وانشت نظام کا زور ٹوٹنے کو ہے۔ اور اب ایک ایسی نئی صدی شروع ہونے والی ہے۔ جس میں ایشیائی اپنے وجود کو باوقار اور باوزن دیکھ سکیں گے تو یہ خیال بیجا نہ ہوگا۔ اس لئے کہ ظالم کی عمر کوتاہ مصداق روسی اشتراکیت کا شیرازہ بکھر نے کے بعد اب امریکی اور یوروپی غنڈہ

گروپ بھی تو پیدا ہو، دونوں تک قائم نہیں رہ سکی گی۔ اور نئی صدی اس کا استقبال کرے گی۔ ایسی صورت حال میں قلمکاروں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس انقلاب کے تئیں ذہن کو قوت عطا کریں اور اتفاق اس عمل میں "شاعر" کی مانند کئی رسائل نیک سلامت ہوگی کیوں کہ شاعر کسی مخصوص ادبی گروہ یا حلقوں میں بٹے ہوئے رسائل کی طرح محدود نہیں ہے بلکہ پھر اس قلم کو نیک کہتا ہے جو وقت کی چاپوں کو لے کر سامنے آتا ہے۔ شمارہ نمبر ۱ میں "نئی نفسیات نئی شعری کائنات" کے تحت مختصر نظمیں اچھی ہیں۔ مگر اظہر ہاشمی کی نظم "مردہ دل" کو چھو گئی۔ اسی طرح عالم خورشید کی غزلوں کا لہجہ بھی بڑا اسکیپ دار پیدا لگا۔ کہانیوں میں نیر مسعود کی "نمبر"، "ظلمات میں اٹھا گئی اور "تجھ سے" میں راشد روی شادین خلوص دل کے ساتھ۔ تو بتائیے کہ تجھ سے ہو پاؤ گفتگو کر مر ساتھ رہ لیجئے۔ اور تمام خوشیوں کو بھی برابر بانٹ لیتے ہیں۔ لیکن یہ بد نصیبوں کا کیا ہو۔ جو صدیوں سے ساتھ رہ کر بھی ناشاد زندگی جیتے ہیں اور پھر خوشی یوں مناتے ہیں کہ جیسے اس میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو۔ شمارہ نمبر ۲ میں نظمیں متاثر نہیں کر سکیں۔ البتہ خورشید اکبر اور پروین راجہ کی غزلیں تھیں جن میں نئی فنی تراکیب کا آمیزہ تھیں۔ باقی غزلیں بھی اپنے عہد کے نغمہ آہنگ سے مزین ہیں۔ عصری افسانے سے متعلق جو مذاکرہ ہے شاید اپنے مضمون میں کوئی نئی بات نہیں پیش کر سکے۔ ہاں اسلم حنیف کا مقالہ "تنقید" (سرو خلق، کائنات اور حقیقت) بہت نیک اور رواں ہے۔ حسین الحق کی "مردہ راہ" میں بہت دنوں بعد کہانی پن اور مقصدیت کا امتزاج نظر آیا۔ "تسلسل" اور "قربان" سے طبیعت مسرت ہو گئی ہے۔

★صغرا عالم — عالم ہاؤس، شاہ زار، گلبرگہ

شاعر (شمارہ ۱، ۲) کے سرورق کے آرٹ نے مسحور کر دیا۔ صادقین کی مصوری میں 'زندگی' نام کے آرٹ میں ہر انسان کی شبیہ دی گئی ہے۔ جو کہ درست کے گھونٹے سے بدلی گئی ہے۔ شاعر کے سرورق سے ہو کر ٹکڑوں میں انسان کی شبیہ میں سر، ہاتھ اور پیر کے نقش، مصور کا کمال ہے۔ جو قابل صد تحسین ہے۔ شاعری نام ہے۔ اس تصویر میں جان ڈالنے کا جو نقاش فطرت، شاعر کے دماغ پر مرتسم کرتا ہے۔ (فکر امروز اور سیماب) اور گلبرگہ کے ایک مصور کی قدر اور ہم کو یہ تسلیم کرنا ہے کہ ہمیں ایک نام کی تصویر میں کر رہنا ہے یا ایک سا سنڈ میں "خیالات کے مندر و مخمور کی سو روپیں ترجمانی ہے۔ احمد محفوظ کی غزل کے مطلعے میں ابہام ہے۔ شارق کیفی کی غزل کے مطلع میں بھی ابہام کا عیب ہے۔ شفق سوپوری کی نظم "سال" قابل تحسین ہے۔ ارشد عبدالحمید (شمارہ صفحہ ۲۱) کی غزل کا مطلع ہے: جا، بدن کی ماش ہو رہی ہے

رات اپنی جوانی کھو رہی ہے

اس کا ثانی مصرع 'رات اپنی رعب کھو رہی ہے'۔ کہتے تو حسن کی ماش ہوتی۔ کم از کم جوانی کی 'ی' ساقط ہونے سے بچ جاتی۔ شعری تمر، الفاظ کے تخلیقی و جمالیاتی اظہار سے پہچانا جاتا ہے۔ شاعری کم و بیش تکرار ہی ہے بیشتر رہی اور پروین راجہ کی غزلیں متوجہ کر لیتی ہیں۔ "شاعر" ہمیشہ ہی شعور کے ساتھ رواج متعلق کے ساتھ وہ جان کا قائل ہے۔ ایسا اسلوب اس کا پہناوا ہے۔

★جمال اویسی — محلہ نفیس قریش [?] (بہار)

شاعر کے شمارے ذرے اچھے نکل رہے ہیں۔ افسانہ نمبر اور اس کے بعد کے شمارے "پھول رنگ لیجے" اور "اردو کی نئی بستیوں" مخصوص شمارہ پچاسہ انفرادی شان رکھتے ہیں۔ آپ میں نئے نئے کام کرنے کی بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ میرے خیال میں آپ نے شاعر کو پہلے سے زیادہ معیاری اور با معنی بنا دیا ہے۔ اب اس کے تیوروں میں نکھار رہتا ہے۔ اور ہر شمارہ کسی اور یافت تحقیق اور فکر کو پیش کرتا ہے۔ ہندوستان سے شائع ہونے والے کسی اور رسالے کا مزاج ایسا نہیں ہے جو جدید ذہن کو اپنا کر معاصر ادب کی تخلیقی قوتوں کو اجاگر کرے۔ اردو شاعروں اور ادیبوں کی جدید تر نسل کو متحرک کرنے میں شاعر اپنی انفرادی شان رکھتا ہے۔ شب خون اور ذہن جدید میں بھی کبھی کبھی جدید نسل کے قلم کار نظر آجاتے ہیں۔ لیکن ان کی شناخت رسالے کے معیار و مزاج تلے دب جاتی ہے۔ انھیں سب باتوں سے شاعر کا معیار و مزاج بھی متعین ہوتا ہے۔

★منظم عزم — راحت وڈ کرم کھک، مظفر پور (بہار)

میرے خیال میں اردو کے موجودہ تمام رسائل میں شاعر کا مقام بلند ہے کیوں کہ اس کی نثری و شعری تخلیقات اعلیٰ حد تک معیاری ہیں۔ ادب کے نئے رجحانات اور میلانات اور جدید اقدار کی معیاری پیش کش 'شاعر' کا خاصہ ہے۔ "جدید غزل" میں نئے دعوے قوافی "انھوں نے موضوعات اور لہجے طرز بیان شاعری کی نئی راہیں ہموار کرتی ہیں لیکن یہ بسی شاعری صرف 'دماغ' تک اگر رہ جاتی ہے۔ اور قاری کے جذبات و احساسات' اس کے وجدان کو سرشار کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ غزل کی اس نئی روایت میں تھوڑی سی اصلاح کی ضرورت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ یہ کام قدرے بہتر انداز میں کر رہے ہیں۔ نئے قلمکاروں کے یہاں جو امکانات ہیں نہیں چاہئے کہ اپنی شاعری کو جدید غزل کو دل سائنس اور وحدت تاثر سے بچائیں۔

★شکیل احمد — بس اسٹینڈ، پوسٹ آفس شاہی، ضلع بریلی

شاعر کے مشترکہ شمارے میں پروین راجہ کی غزلیں کشمیر کے موجودہ حالات کا بھرپور تیر ہیں اظہار ہیں۔ شاعری اب اپنے پرانے لباس سے نکل کر نئے پیرہن میں اپنی بات پوری قدرت کے ساتھ کہنے کی صلاحیت کے ساتھ ابھر رہی ہے۔ شاعر کا ہر شمارہ شاعری کے نئے اسلوب کو نمایاں کر رہا ہے۔

★گیان چند جین — ۵۹/۲ اندرا نگر، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۶

شاعر کے پرچے اپنی روایت کو قائم کئے ہوئے ہیں۔ اور معیار میں کوئی کمی نہیں آنے دیتے۔ غیر سرکاری پرچوں میں شاعر کے علاوہ کوئی اور مستند رسالہ نظر ہی نہیں آتا۔ ممبئی کے ان بدحست شکن حالات میں آپ ادبی پرچوں کے لئے کس طرح طبیعت کو تیار کر لیتے ہیں؟

★شاداب رضی — شعبہ اردو مگدھ یونیورسٹی، بھاگلپور

مشترکہ شمارہ ۱ اور ۲—۳ میں اس بار جہات قارئین کو نئی سائنٹفک اور جدید شعری مزاج کی طرف متوجہ تو کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ مشمولات کی معیار پوری قسم میں بھی سامان ہیں۔ جس نئی نکتے کو آپ نے نہایت ہی خوبی کے ساتھ چند سطروں میں بیان کیا ہے۔ وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ شمارہ نمبر ۲ کے فکر امروز میں مرحوم سیماب اکبرآبادی کی تحقیقی نئی الاوں کے لئے لت کی سب اور غور و فکر کی دعوت بھی۔ ڈاکٹر سدی کامیاب غزلوں، چند اچھی نظموں اور بعض اچھی کہانیوں کے اس حسین مجموعہ کے لئے مبارکباد قبول کیجئے۔ مقالات کا حصہ مزید جاندار ہو جاتا اگر نئی نفسہ شعری مزاج اور انسانی نفسیات کے بدلتے تیوروں سے متعلق مضامین بھی اس میں شامل ہوتے۔ ہر ماہ شاعر کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔

★منیر سیفی — ۶ سرکلر روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۸

سیفی نفسیات — نئی شعری کائنات "ایک مرصع رنگ مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ مضامین نثر و نظم متاثر کن ہیں۔ منظومات میں احمد منظور، محسن رضا رضوی، شکیل جمالی، عشرت ظفر اور پروین راجہ کے کئی اشعار پسند آئے۔ مطلع مصرعے ہائے سہو کتابت کا نتیجہ ہیں۔ بالآخر جا فی تفسینی اب کے حصے میں آئی ہے (شعر ہاشمی) یوں تو ہر اک قید سے آزاد تھا مگر (اکرم نقاش) دیکھ لی بے نیازی عشق (شفق سوپوری) جس نے خیال میں سنبھال رکھا گیا آگ (پروین احمد) معصوم نظر نے شہر ظاہر شہر بیدار کو روز شہر نظر باندھا ہے۔ موصوف کا یہ مصرع ہے: رقم چمکتا رہتا تھا کہاں اب بے بہار [?] احمد محفوظ کا یہ مصرع کہیں سے ٹوٹا ہے۔ کوئی عکس تہہ آب دیکھتا ہوں میں۔

★بدر نظیری — غفار منزل، ایکسٹینشن جامعہ نگر، نئی دہلی

نئی نفسیات — نئی شعری کائنات میں غزلوں کا انتخاب ہی شاندار انتخاب ہے۔ افسانے بھی خوب ہیں۔ کہیں کہیں سہو کتابت سے مصرعے ناموزوں رہ گئے ہیں۔ احمد محفوظ کی غزل کا ایک شعر نمبر ۳، مصرع ثانی اور مقطع کا مصرع اولیٰ پروین راجہ کی تیسری غزل 'پاس اپنے بھی رہا کیا جس سے گھر گھر جاؤں' میں سے کی جگہ جیسے ہونا چاہئے۔ بقول کسی جریدے کے ورنہ مصرعے ناموزوں نہیں کہا جا سکتا۔

★آفتاب احمد صدیقی — پوسٹ آفس بندرہ، ضلع مئو (یوپی)

شاعر کے مشترکہ میں شمارے میں اکیسویں صدی کی کہانی نمبر "دوبارہ بڑھا ہی محض یہ سمجھنے کے لئے کہ افسانہ نگار کیا کہنا چاہتا ہے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا شاعر جیسے موقر جریدے میں کسی کہانی کو شائع کرنے سے قبل آپ خود پڑھتے نہیں اور قابل اشاعت سمجھتے ہیں؟ دوسرے یہ کہ آپ تصاویر کی اشاعت بند کر دیں یہ میرا مشورہ ہے۔ بعض اوقات کسی شاعر کا فوٹو دیکھ لینے کے بعد اچھی سے اچھی غزل بے مزہ ہو جاتی ہے۔ اس کے نام کی اہمیت گھٹ جاتی ہے۔ عورتوں اور لڑکیوں کے فوٹو کی اشاعت تو غیر ضروری بات ہے کہ آپ کا رسالہ ممبئی والا ہے لیکن فلمی تو نہیں ہے۔ 'شاعر' کو جیسا اس کا نام ہے ویسا ہی رہنے دیں۔ عصری کہ مضامین اور غزلیں شامل کر کے رسالہ ہے جسے ہندوستانی خانہ بدری کی گئی ہو

فکر امروز



تغزل سے اس رنگ اور اسلوب بیان کو کہتے ہیں جو غزل میں استعمال کیا جاتا ہے۔ تغزل کا تعلق انسان کی لطیف ترین روحانیت اور نفسیات سے ہے۔ حسن و عشق، یاس و امید، وصل و فراق، انتظار و ناکامی اور اسی قسم کی مختلف فطری حالتوں کو گہرے تاثرات کے ساتھ مصور کرنے کا نام تغزل ہے۔ غزل کی تعریف میں "با معشوق سخن گفتن" اور تغزل کی تعریف میں "معاملہ بندی" کہہ کر خاموش ہو جانا غزل اور تغزل دونوں کی توہین ہے — تغزل کو قدرتی طور پر نفسانیت سے پاک اور روحانیت سے لبریز ہونا چاہیئے۔ تغزل کے مختلف اسکول ہیں لیکن حقیقی تغزل وہی ہے جس کی بنیادیں جذبات لطیفہ پر قائم کی گئی ہوں اور جس میں ابتذال و رکاکت کا شائبہ تک نہ ہو۔

[۲۹ نومبر ۱۹۳۰ء — امراؤتی]

سیماب اکبرآبادی

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۴واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر

جلد — ۶۴

شمارہ — ۷

فون: ۳۵۹۹۰۴

مدیر

افتخار امام صدیقی

معاون

ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۸ روپے

زرِ سالانہ ۶۰ روپے — لائبریریوں سے ۷۵ روپے

تاحیات خریداری ۱۰۰۰ روپے — معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے ۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

[illegible] ۵۵۲۶ [illegible]

دو شمارے — ایک اشاعتِ خاص

شاعر (شمارہ نمبر ۱ — ۱۹۹۱ء) میں ایران کی خاتون افسانہ نگار فریدہ رازی کی کہانی کا ترجمہ "نلی کا خون" شائع ہوئی تھی۔ مترجم تھے نیر مسعود۔ کہانی کو پسند کیا گیا تھا لیکن قارئین نے ایرانی کہانیوں کے تراجم کا مشورہ دیا تھا۔ بعض لوگوں نے فلسطینی کہانیوں کی بات کی۔ اس ضمن میں اور بھی مشورے تھے۔ قارئین شاعر کے بہت اچھے مشورے ہمیں موصول ہوتے رہتے ہیں۔ ڈھیروں خطوط، "مکتوبات" میں نہیں سما پاتے مگر ہماری یادداشتوں میں محفوظ ہوتے رہتے ہیں۔ شاعر میں ملکی و غیر ملکی زبانوں کا ادب پیش کیا جاتا رہا ہے۔ شاعر کو مزید بہتر بنانے کے منصوبوں میں عصری عالمی شعر و ادب کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ فی الفور ایک خاکہ بنا کہ کیوں نہ تمام اسلامی ممالک کے ہم عصر شعر و ادب کا خصوصی مطالعہ پیش کیا جائے۔ خاکہ اپنے آپ میں کئی سو صفحات کا ایک خاص نمبر بن گیا ہمارے ساتھ ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جب تک کسی موضوع کو تمام پہلوؤں سے مکمل نہیں کر لیتے اور خود مطمئن نہیں ہو جاتے کوئی خاص نمبر شائع نہیں کرتے۔ کاتا اور لے دوڑی ہمارا مزاج نہیں۔ اسلامی ممالک کے شعر و ادب پر کسی خصوصی شمارے کی اشاعت یوں بھی ممکن نہیں تھی کہ پہلے ہی ایک نہایت ضخیم "ہم عصر اردو ادب نمبر" "کا ہر دو جلد" پیش کر چکے تھے اور بڑے پیمانے پر کام کا آغاز کر دیا تھا۔ خیال تھا کہ ایسے کسی خاص نمبر پر ذرا تفصیل سے خصوصی اشاعت کے طور پر کام کیا جائے۔

تمام اسلامی ممالک کے شعر و ادب کا خاکہ ابھی زیرِ تحریر ہی تھا کہ اسلام آباد (پاکستان) سے سہ ماہی "ادبیات" (شمارہ ۲۱، جلد ۵، خزاں ۱۹۹۲ء) موصول ہوا۔ ۵۰۴ صفحات کے اس ضخیم شمارے کے مندرجات دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی کہ مذکورہ شمارہ اسلامی ممالک کی کہانیوں پر مشتمل تھا۔ شاعر کے لئے تراجم و طبع زاد کہانیوں کی کمی نہیں رہتی اور ہمارے معزز افسانہ نگاروں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ منتخب کئے جانے کے باوجود کہانی کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو جاتی ہے۔ اس ناگزیر مسئلے کے بہت سے وجوہ ہیں۔ "ادبیات" کا خاص نمبر ہمارے مجوزہ خاکے کا ایک طرح سے تعارف ہی ہے اور اپنے آپ میں ایک قابلِ قدر کام بھی۔ چونکہ ہندو پاک کے ادبی رسائل سرحدوں کے ادھر بہت محدود تعداد میں پہنچ پاتے ہیں بعض ادبی رسائل یا تو ملنے والے تک ہی رہتے ہیں یا صرف ان کے آس پاس ہی گردش کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ فی الحال اس کا کوئی حل نہیں اور آئندہ کے لئے بھی امید کم ہے۔

ہندوستان میں رسالہ "ادبیات" جن لوگوں کو موصول ہوتا ہے اس کا ہمیں کچھ اندازہ ہے۔ اردو میں کوئی بھی نیا، اچھا اور بڑا کام دنیا کے کسی بھی حصے میں ہوتا ہے اور ہم تک پہنچتا ہے تو ہم اسے سراہتے ضرور ہیں۔ "ادبیات" کے خاص نمبر میں ۱۸ اسلامی ممالک کی ۴۹ کہانیاں شامل ہیں۔ ایران سے ۴ کہانیاں لی گئی ہیں۔ (فریدہ رازی کی کہانی بھی شامل ہے) فارسی افسانے کے بانی سید محمد علی جمال زادہ کی شخصیت اور فن پر محمد ریاض کا مضمون اور جمال زادہ سے لیا گیا ایک انٹرویو شامل ہے۔ یہ انٹرویو مجلہ کیہان فرہنگی (تہران) کے دو نمائندوں نے کیا تھا اور فروری ۱۹۸۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ نوبل انعام یافتہ مصری ادیب نجیب محفوظ کے کارہائے نمایاں پر ڈاکٹر خورشید رضوی کا مضمون شامل ہے۔ اس کے علاوہ بعض کہانیوں کے ساتھ افسانہ نگاروں کا تعارف بھی دیا گیا ہے۔ پاکستان سے دس کہانیاں اور ۶ علاقائی زبانوں کی کہانیاں لی گئی ہیں۔ ترکی کی دس کہانیاں دی گئی ہیں۔ بنگلہ دیش اور مصر سے تین تین کہانیاں انتخاب کی گئی ہیں۔ دیگر ممالک میں ملائشیا (۲) عراق (۲) شام (۲) مراکش (۲) ازبکستان (۲) اور آذربائیجان سے ۲ کہانیاں لی گئی ہیں۔ انڈونیشیا، کویت، سوڈان، الجزائر، فلسطین، ترکیہ، تاجکستان اور ترکمانستان سے ایک ایک کہانی کا ترجمہ دیا گیا ہے —————— (جاری)

ترتیب

اسلامی ممالک کی کہانیاں

شمارہ نمبر ۔ ۷ [۱۹۹۳ء] جلد ۔ ۶۴

شمارہ ۲



راغب مرادآبادی

نہ اختیار کبھی مصلحت کا جادہ کیا
گلہ کیا بھی جو ان سے، تو بالارادہ کیا

یہ سوز و ساز کہ جانِ غزل ہے اس کے لئے
بفیضِ دل، غمِ جاناں سے استفادہ کیا

ہمارے نقشِ قدم ہیں چراغِ راہِ حیات
سفرِ حیات کا طے ہم نے پاپیادہ کیا

ہے اعتراف ہمیں اپنی ناسپاسی کا
کرم تو اس نے توقع سے بھی زیادہ کیا

تمام عمر، ندامت رہی ہے دامن گیر
کبھی نہ ہم نے غلط بات کا اعادہ کیا

گلہ نہ ہو، غمِ دوراں کو، تنگیٔ جا کا
ہمارے دل کو، اس احساس نے کشادہ کیا

یہی، کہ ہم سے خفا ہو تو بے سبب کیوں ہو
سوال ان سے کیا اور بہت ہی سادہ کیا

فرارِ غم سے ہے توہینِ عقل اے راغبؔ!
کریں گے تم، نہ کبھی ہم نے شغلِ بادہ کیا

● ۱۰۶/۱۶ ۔ ت، فیڈرل بی ایریا کراچی (پاکستان)

ایران

مرسا علی زادہ

معین نظامی

مرثیۂ آب

گھر سے نکلتے ہی میں نے کہا: "خدا کرے ہو جائے!"

"کیا؟" میں نے کہا: "بارش۔" اس کے ہاتھ سے چھتری لے کر میں نے اپنے بیگ میں رکھ لی۔

مطلع ابر آلود تھا۔ بے پناہ بارش ہوئی۔ احمد نے کہا:

"ٹھنڈ لگ گئی تو۔۔۔؟" اور میں نے اسی رات خواب میں دیکھا کہ وہ الٹی سیدھی باتیں کئے جاتا تھا اور اپنے جلتے پھکتے ہاتھوں سے میری چادر کے کونے پکڑ پکڑ کر کہتا تھا: "پانی۔۔۔ مری جان! پانی۔۔۔"

مجھے اس پر ترس آگیا۔ میں اس کے لئے تھوڑا سا پانی لینے گئی۔ میں نے پانی سے بھری ہوئی شیشے کی صراحی ہاتھ میں لی تو اس میں برف کے ٹکڑے رقص کرنے لگے۔ ان کی آوازوں کے سوا مجھے اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ "عجیب پانی ہے۔ کتنا ٹھنڈا ہے۔۔۔ میں کتنی پیاسی ہوں میرا حلق سوکھ گیا ہے۔ یہ خشک سالی مجھے مارے دیتی ہے۔ بہتر ہے پہلے خود تھوڑا سا پی لوں۔۔۔"

میں جتیری کوشش کرتی ہوں مگر پانی میرے ہونٹوں تک نہیں پہنچ پاتا۔ برف کے ٹکڑوں کا کھیل جاری ہے۔ صراحی سخت بھاری ہے اور سخت خوشگوار حد تک ٹھنڈی ہے۔ میں اسی طرح جل رہی ہوں۔ صراحی میں ہاتھ ڈالتی ہوں۔ برف کے ٹکڑے میری انگلیوں سے منتشر ہو جاتے ہیں۔ "پانی۔۔۔ پانی!" میں ہاتھ کھینچنا چاہتی ہوں مگر ایسا نہیں کر سکتی ایسا نہیں ہوتا۔ ہاتھ صراحی میں پھنس گیا ہے۔ برف کے ٹکڑے آہستہ آہستہ پگھل رہے ہیں۔ میں چیخ پڑتی ہوں: "نہیں۔۔۔ نہیں!" اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ ریرو کے بلب کی سرخ روشنی میرے چہرے پر چمکتی ہے۔ میں مزید سنگ اٹھتی ہوں۔ احمد کے رونے کی آواز میرے کانوں میں ڈیرے ڈال دیتی ہے۔ میں اپنا سر پھیرتی ہوں۔ وہ زیرِ لب کچھ منمناتا ہے۔ میں اپنے آپ کو ہلانا جلانا چاہتی ہوں۔ کامیابی نہیں ہوتی۔ میرے بال دوپر سندھے ہوئے ہیں۔ ہڈیوں میں ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔ جسم انگیٹھی کی طرح تپ رہا ہے میں جل رہی ہوں۔ احمد میری طرف رخ کرتا ہے: "کچھ کرو۔۔۔ مری میرے لئے کچھ کرو۔ میں جل رہا ہوں!"

میں کہتی ہوں: "مجھے پتہ ہے۔۔۔ تمہیں بخار ہے۔۔۔ میں تمہارے لئے پانی لینے گئی تھی۔ ہمارے کیسے شیشے کی صراحی ٹوٹ گئی! ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی احمد۔۔۔ ٹکڑے ٹکڑے! میں تمہاری پیاس نہ بجھا سکی۔ اب کچھ صبر کرو۔ میں کچھ کرتی ہوں۔۔۔ صبر کرو احمد۔ دیکھو میں اٹھ رہی ہوں!"

مجھے پسینہ آیا ہوا ہے۔ سارا جسم بھیگا بھیگا ہے۔ میں لحاف ایک طرف کرتی ہوں۔ میرے کندھوں کو ہوا لگتے ہی ایک خیالی سی بلی مجھ پر جھپٹتی ہے۔ میں ڈر کر لحاف میں چہرہ چھپا لیتی ہوں۔ تھوڑی ہی دیر میں احمد کی نالہ و زاری بڑھ جاتی ہے۔ میں چہرہ باہر نکالتی ہوں۔ خیالی بلی کا کہیں نام و نشان بھی نہیں۔ میں اٹھنا ہی چاہتی ہوں کہ سامنے کی دیوار مجھ پر چڑھ دوڑتی ہے اور اسی طرح لحہ بہ لحہ قریب سے قریب تر ہوتی جاتی ہے۔ دور سے کوئی اجنبی میرے ہاتھ تھام کر التماس کرتا ہے: "مت جاؤ۔ لیٹ رہو۔۔۔ تمہیں بھی تو بخار ہے۔۔۔ احمد ہی کی طرح۔۔۔ تم دونوں اکٹھے بارش میں بھیگتے رہے ہو۔۔۔"

میں کہتی ہوں: "کوئی بات نہیں۔۔۔ مجھے جانے دو۔۔۔ دیکھ نہیں رہے ہو کہ وہ کتنی اذیت میں ہے۔۔۔ پیاسا۔۔۔" اور بے اختیار دوبارہ بستر میں گھس جاتی ہوں۔ بہت بوجھل اور کمزور ہو گئی ہوں۔

میرے گھر والے آتے ہیں۔ ایک ایک کر کے سب میری پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہیں اور چلے جاتے

ہیں۔ میں پکارتی ہوں: "کہاں جارہے ہو۔۔۔ لوٹ آؤ۔۔۔ میں مری ہوں۔۔۔ تم نے مجھے پہچانا کیوں نہیں؟۔۔۔ میں تمہاری بیٹی ہوں۔۔۔ م۔۔۔ مـ۔۔۔ ری!"

سورج بڑی شدت سے چمکتا ہے' میں اور احمر اس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں: "نہیں! میں نہیں آتا! میرا امتحان ہے اور مجھے تیاری کرنی ہے۔" میں چپکے سے رو پڑتی ہوں' احمر کا ہاتھ پکڑ کر زور سے بھینچتی ہوں: "احمر تمہیں آنا پڑے گا۔۔۔ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔" ہم احمر کے باپ کے گھر میں ہیں اس کی امی کدو کا مربا بناتی ہیں' احمر مربے کا ایک چمچ میرے منہ کے قریب کرکے کہتا ہے "تھوڑا سا کھا لو۔۔۔ بہت مزے دار ہے۔"

میری امی دسترخوان پر بیٹھی ہیں۔ اس کی نظریں صراحی میں پڑے برف کے ٹکڑوں پر جمی ہوئی ہیں۔۔۔ گھنٹی بجتی ہے۔ میں دروازہ کھولتی ہوں تو چوکھٹے میں ابو دکھائی دیتے ہیں۔ نارنگی کے شگوفوں کی ایک شاخ لئے! میں کہتی ہوں: "آپ نے احمر کو تو نہیں دیکھا۔۔۔" اور اچانک نارنگی کی خوشبو چھا جاتی ہے۔ میں دیکھتی ہوں۔ شگوفوں پر پھل لگتا ہے۔

میں اپنے بھائی سے کہتی ہوں: "اگر اپنی بہن سے ملنے آؤ۔۔۔ تو اس کے لئے پانی لانا۔۔۔ پانی۔۔۔۔۔"

اور میرا بھائی احمر کے پیروں کو دوائی سے دھونے آتا ہے۔ میں کہتی ہوں: "کیا بات ہے بھیا' اتنے دن کہاں رہے۔۔۔" میں چپکے سے رو پڑتی ہوں۔ میرے آنسوؤں سے برف کا پہاڑ پگھل جاتا ہے۔

احمر مجھے آواز دیتا ہے: "مری جان۔۔۔ میرے پاؤں! میرے۔۔۔ پاؤں گئے۔۔۔ کٹ گئے۔۔۔۔" کہتا ہے: "پانی!" اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ میں بڑی مشکل سے اٹھتی ہوں۔ جوڑ جوڑ دکھتا ہے۔ ٹانگیں لڑکھڑاتی ہیں۔ ایک ٹانگ بیڈ سے نیچے رکھتی ہوں۔ میرا جسم' سر کو سہار نہیں سکتا۔ احمر باورچی خانے سے چلاتا ہے: "مری آؤ۔۔۔ میری امی نے تمہارے لئے شہد بھیجا ہے۔۔۔ کچھ اور چیزیں بھی آئی ہیں۔۔۔"

میں تھکی ہوئی ہوں۔ گذشتہ تین دنوں سے میں نے کمر سیدھی نہیں کی۔ میں جواب دیتی ہوں: "اچھا احمر۔۔۔۔ میں جاگ رہی ہوں" اور پھر بستر میں گھس جاتی ہوں۔

احمر کا ہاتھ سامنے آتا ہے۔ اس میں میرے لئے برف کے پھولوں سے لدی ایک ٹہنی کا تحفہ ہے: "لو مری۔۔۔ برف کے پھولوں کی یہ شاخ لے لو اور میرے لئے تھوڑا سا پانی لاؤ۔۔۔"

میرا گلا رندھ جاتا ہے: "بہت اچھا احمر۔۔۔ بارش تو ہونے دو۔۔۔ سیلاب آگیا تو میں شیشے کی صراحی لے چشمے پر جاؤں گی۔۔۔"

اب پھر خود مجھے شدید پیاس لگتی ہے۔ میرا منہ خشک ہوگیا ہے۔ سانس لیتی ہوں تو ناک جلنے لگتی ہے۔ دیوے کے بلب کی روشنی لو ہے لو زیادہ سرخ ہوتی جاتی ہے۔ میں اس کی حدت سے جل جاؤں گی۔۔۔ میں رخ بدلتی ہوں تو برف کے پھولوں میں مجھے اپنی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ میرا چہرہ لہو کی طرح سرخ ہے۔ میرے گالوں سے شعلے برس رہے ہیں۔

میرے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئی ہیں اور میرا سارا علم اور تجربہ ان سے ہلکا پڑتا ہے۔

میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ اب میرے ساتھ احمر بھی برف کے پھولوں میں نظر آرہا ہے۔ میرے چہرے کی طرح اس کے چہرے کو بھی آگ لگی ہوئی ہے۔ ہم دونوں پگھل رہے ہیں' دونوں ایک سانجھے مقدر میں مبتلا ہیں۔ میں روتے روتے کہتی ہوں: "احمر تمہیں میری وجہ سے بخار ہوا ہے۔۔۔ تم میری خواہش پر بارش میں بھیگتے رہے۔۔۔ مجھے معاف کر دو احمر۔۔۔"

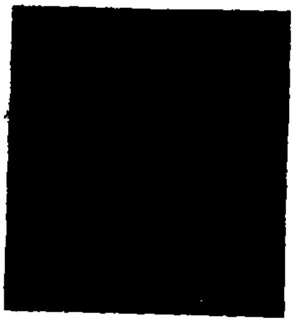
وہ کچھ نہیں کہتا۔ اس کی پتھرائی آنکھوں میں محبت اور بخار ایک دوسرے سے گھل مل گئے ہیں۔ اس کی نظروں میں بے پناہ تکلیف کے آثار ہیں: "پانی۔۔۔ مری جان پانی۔۔۔"

میں رو دیتی ہوں اور اپنے بال نوچتی ہوں: "احمر۔۔۔ میں اٹھ نہیں سکتی۔۔۔"

سمندر چند قدم دور ہے۔ میں بہت کوشش کرتی ہوں مگر میرے ریت میں دھنسے ہوئے پاؤں اٹھ ہی نہیں سکے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں ساحل کی ریت میں اگ آئی ہوں۔ میں وہیں کھڑے کھڑے صراحی پانی میں

---

۵ شاعر



شہاب سرمدی

ساقہ حالات ہیں جذبات ہیں خاموشی ہے
پھر بھی تنہا ہوں تو احسان فراموشی ہے

میں وہی ہوں، سحر و شام وہی ہیں، لیکن
چاندنی رات اُجالوں کی سیہ پوشی ہے

ایسا لگتا ہے کہ تکلیف سے خوگر ہونا
جیسے یہ بھی مری بڑھتی ہوئی کم کوشی ہے

زندگی کے انہیں ہنگاموں میں چلتے پھرتے
کوئی آنسو نکل آئے تو شبک دوشی ہے

مطمئن ہوں کہ فقط دوست کی یادوں سے نہیں
اُس سے اور اُس کی محبت سے ہم آغوشی ہے

● ۹۴۴۔ دودھپور سول لائنز علیگڑھ

٩



محسن بھوپالی

لگتا ہے جیسے کنجِ وحشت اثر میں آئے
ہم اجنبی کی صورت اپنے ہی گھر میں آئے

فکرِ معاش کیا ہے جُز دائرہ نوردی
دیوار و در سے نکلے دیوار و در میں آئے

سنگِ اجل کی زد پر جب زندگی کھڑی تھی
کیا کیا بدلتے منظر میری نظر میں آئے

سو سو طرح سے یادوں نے رنگ بھر کے دیکھا
بیتے دنوں کے خاکے جب چشمِ تر میں آئے

کیفیت آج اپنی ایسی ہے جیسے کوئی
شعلوں سے جاں بچانے کاغذ کے گھر میں آئے

جو بھی روش ہو محسن، اب تو چلے چلو تم
فکرِ کلاہ کیسی، جب رہ گذر میں آئے

● ۲/۵ اے ناظم آباد — کراچی۔

پھینک دیتی ہوں۔ سمندر اچانک ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔ طوفان صراحی کو ساتھ لے جاتا ہے۔ میں چلاتی ہوں: "صراحی مجھے واپس کر دو۔۔۔ اسے کہاں لئے جاتے ہو؟ میں اور احمد تمہارے پیاسے ہیں۔۔۔ تمہارے لئے جاں لب ہیں اور تم ہو کہ ہماری صراحی بھی لے جاتے ہو ہمیں ساتھ لے جاؤ۔۔۔ ہمیں!"

میں سمندر کے پیچھے دوڑنا چاہتی ہوں۔۔۔ میں اس کا پیچھا کرکے پانی حاصل کر لینا چاہتی ہوں۔۔۔ پانی' میں کوشش کرتی ہوں کہ میرے پاؤں ساحل سے خلاصی پالیں' پسینے میں شرابور ہو جاتی ہوں۔ مٹی کی طرح سلگ رہی ہوتی ہوں' مجھے دیکھ کر احمد کی امی کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ان کی جھولی تازہ اخروٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ وہ انہیں کمرے کے فرش پر ڈال دیتی ہیں اور آسمانی کبوتروں کے لئے مٹھی بھر چوگا پھینکتی ہیں: "تم دونوں کو کیسے بخار ہو گیا؟ یہ سب بے احتیاطی کی وجہ سے ہے۔۔۔ مجھے کیوں اطلاع نہیں دی؟" وہ روتی ہے اور میری اور احمد کی پیاس ہے کہ بڑھتی جاتی ہے۔

صراحی میں سرخ سرخ مچھلیاں ہیں۔ انہوں نے اپنے منہ برف کے ٹکڑوں سے چپکائے ہوئے ہیں۔ اب ہر جگہ خشکی ہی خشکی ہوگی: "احمد۔۔۔ میں جانتی تھی۔۔۔ میں جانتی تھی کہ لعنتی مچھلیاں آخر کار تمام پانیوں کو۔۔۔ اب سیلاب کا انتظار کرو۔۔۔ بارش نہیں ہوگی۔۔۔"

پانی ختم ہو گیا ہے۔ زمین و زماں پیاسے ہیں۔ احمد کروٹیں بدلتا ہے۔ کمرے میں پردوں کے پھول اسے دیکھتے ہیں۔

احمد ہمسائے کی نیلوفر کے پیاسے ہاتھوں میں دم توڑ رہا ہے: "مجھے پیاس لگی ہے۔۔۔ پانی!" وہ بستر الٹ پلٹ کرتا ہے۔۔۔ روتا ہے۔۔۔۔ گاتا ہے۔

میں اشکبار آنکھیں لئے اس کی عیادت کو جاتی ہوں۔ اپنے کان اس کے ہونٹوں کے قریب لے جاتی ہوں: "کہاں ہو میری کہاں۔۔۔۔۔؟" میں رو پڑتی ہوں: "میں یہیں ہوں۔۔۔ یہیں کہیں صبح کے پاس۔۔۔ باتیں کرو احمد کچھ بولو!"

وہ کہتا ہے: "پانی۔۔۔ خدا کے لئے پانی۔۔۔" وہ بے حال ہو جاتا ہے۔ میرے حلق میں کانٹے پڑنے لگتے ہیں۔ سر چکراتا ہے: "کوئی اور بات کرو احمد کوئی اور بات۔۔۔۔" احمد کی کوئی آواز نہیں آتی۔ میں لحاف جھٹک کر اچانک اٹھ کھڑی ہوتی ہوں۔ جیسے میری ٹانگیں کسی اور کی ہوں! میں کوئی اور بن گئی ہوں۔ برف کے پھول میری آواز سن کر سرہانے سے سر اٹھاتے ہیں' ہماری نظریں ملتی ہیں' ہوا چلتی ہے' کھڑکی کھل جاتی ہے۔ آسمان دکھائی دیتا ہے۔ مجھے اپنے قدموں کے نیچے ٹوٹتے ہوئے اخروٹوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ستارے کھڑکی کے سامنے سے صف بہ صف گزرتے ہیں: "احمد میں یہاں ہوں۔۔۔ صبح کے قرب و جوار میں۔۔۔۔"

چاند کی لمبی لمبی زلفیں زمین پر جھاڑو دیتی ہیں۔ موسم ٹھنڈا اور برفانی ہے۔۔۔ میں چلاتی ہوں۔۔ "احمد! مشکل آسان ہو گئی۔۔۔ دیکھ رہے ہو برفانی پرندہ سفر سے لوٹ آیا ہے۔۔۔ اب تم سیراب ہو جاؤ گے۔ رو پڑو۔۔۔ احمد۔۔۔ باتیں کرو۔۔۔ پھر کہو "پانی" پھر لکھو "پانی" پھر پڑھاؤ "پانی" پھر پڑھو "پانی۔۔۔ پانی"

میں اپنے ہاتھ آسمان کی طرف برفانی پرندے کی سمت اٹھاتی ہوں۔ وہ میرے ہاتھوں کی گرمی سے پگھل جاتا ہے۔ میں منہ کھولتی ہوں۔ قطرہ قطرہ پانی میرے منہ میں ٹپکتا ہے۔ میں سراپا یخ ہو جاتی ہوں۔ ۔۔۔ کی طرح سرسبز ہو جاتی ہوں۔۔۔ درختوں سے بھرپور باغ کی طرح! میں پانی کی بوندیں منہ میں ذخیرہ کرلیتی ہوں۔ برفانی پرندہ اسی طرح مجھ پر برس رہا ہے۔۔۔

دنیا کے تمام پانی میری طرف آنے لگتے ہیں۔ آخری بوند میرے منہ میں ٹپکتی ہے تو میرے ۔۔۔ سیپ کی طرح بند ہو جاتے ہیں۔ ان میں تالا پڑ جاتا ہے۔

میں خوشی خوشی احمد کی طرف لوٹتی ہوں: "آؤ احمد۔۔۔ میری جان آؤ۔۔۔ دیکھو تمہارے لئے کتنا ۔۔۔ لائی ہوں۔۔۔ تمام سمندروں کا پانی۔۔۔"

میں اپنا منہ احمد کے منہ کے قریب کرلیتی ہوں! ✱

پاکستان

محمد منشا یاد

زائد المیعاد نیکی

کچھ دنوں میں جب میری ان سے بے تکلفی ہو گئی اور وہ مجھے عزیز جاننے لگے تو میں نے ایک روز پوچھ ہی لیا۔

"استاد۔ آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔"

"ضرور کہو۔"

"نجیب صاحب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

استاد نے عینک کے شیشوں کے اوپر سے میری طرف نہایت غور سے دیکھا پھر پتہ نہیں کس خیال سے ان کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ پھر سنجیدہ ہو گئے اور قلم سے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولے:

"نجیب صاحب بہت پڑھے لکھے اور اہم نقاد ہیں۔"

"سنا ہے ان کے آپ پر بہت احسانات ہیں؟"

"اس میں شک نہیں۔"

"میں نے یہ بھی سنا ہے کہ آپ کی شہرت اور شناخت کا اصل آغاز اس صدارتی مقالے سے ہوا جو انہوں نے آپ کے دوسرے مجموعہ کلام کی تعارفی تقریب میں پڑھا تھا۔"

"صرف پڑھا ہی نہیں ملک کے سب سے اہم رسالے میں شائع بھی کرایا تھا۔"

"پھر آپ نے ان سے قطع تعلق کیوں کر لیا؟"

"اس سوال کا جواب میرے لیے بہت مشکل ہے۔"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے اور دوسرے ادیبوں سے بھی سنا ہے نجیب صاحب نے آپ سے کبھی کسی طرح کی مدد نہیں لی بلکہ شاید آپ کو ادبی جرائد کے مدیروں سے متعارف کرانے اور بعد ازاں پبلشرز سے آپ کے معاملات طے کرانے میں مدد دیتے رہے ہیں۔"

"ہاں"

"میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ جب وہ آپ کی تقریب میں شرکت کے لیے دوسرے شہر گئے تھے انہوں نے آپ پر کوئی بوجھ نہیں ڈالا تھا بلکہ جس کار میں آپ لوگ گئے تھے اس کا انتظام بھی انہوں نے ہی کیا تھا۔ ہاں شاید راستے میں پٹرول وغیرہ آپ نے ڈلوایا ہو؟"

"نہیں پٹرول بھی انہوں نے خود ہی ڈلوایا تھا بلکہ راستے میں ایک جگہ ہم نے کھانا کھایا اس کا بل بھی میرے منع کرنے کے باوجود انہوں نے ہی ادا کیا۔ کاش وہ ایسا نہ کرتے۔"

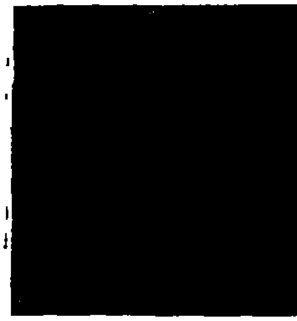
"تو کیا مقالہ آپ کو پسند نہیں آیا تھا کیونکہ سنا یہی ہے کہ مقالہ سننے کے بعد آپ خوش نہیں تھے اور آپ نے واپسی پر بھی الگ سفر کیا تھا؟"

"تم نے وہ مقالہ پڑھا ہے؟"

"جی ہاں۔۔ مجھے تو بہت اچھا لگا آپ کے فن کی دل کھول کر تعریف کی گئی ہے مگر ایک دانا دوست کی طرح' نہایت شائستہ مدلل انداز میں۔"

"ہاں۔ اپنے بارے میں میں اس سے بہتر رائے کا تصور نہیں کر سکتا۔"

"پھر کیا وجہ ہوئی کہ آپ کے ان سے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور لوگوں کو طرح طرح کی باتیں کرنے



محسن زیدی

ہے یہی بہتر کہ چلئے اپنا اپنا راستا
ورنہ روکیں گے کبھی اک دوسرے کا راستا
تھے حصولِ مدّعا کے مختصر بھی راستے
منتخب ہم نے کیا خود ہی تو لمبا راستا
گھر سے ہم نکلے تھے جن راہوں کی لے کر آرزو
بھول بیٹھے ہیں انھیں راہوں میں گھر کا راستہ
آب کے پھر منہ دیکھ کر رہ جائے گی موجِ بلا
پھر نکل آئے گا کوئی عینِ دریا راستہ
منزلیں مثلِ غبارِ کارواں اڑتی ہوئی
کیسا انجانا سفر ہے کیسا اندھا راستہ
زندگی کیا تھی ہماری، تھا مسلسل اک سفر
راستے میں ہم کہیں ٹھہرے نہ ٹھہرا راستہ
وہ تو کہئے کام آئی میری وضع احتیاط
ورنہ مجھکو ساتھ لے کر ڈوب جاتا راستہ
چلتے چلتے ہو چلی ہے شام محسن اور ابھی
طے کیا ہوگا بہ مشکل ہم نے آدھا راستہ

۱۷۷، راؤز ایونیو۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

اسلامی ممالک کی کہانیاں

د موقع مل گیا؟ کل ٹی ہاؤس میں شمیم صاحب سے میرا اسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ اس نے آپ کی شان میں گستاخی کی' کہنے لگا بزرگوں نے کیا ہی کہا ہے کہ جس سے نیکی کی جائے اس کے شر سے بچنا چاہئے۔"

"اس نے ٹھیک کہا کیونکہ نیکی کر کے کنوئیں میں کوئی نہیں ڈالتا اور نیکی اس شخص کو جس کے ساتھ کی جاتی ہے مسلسل زچ کرتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ شر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس لیے نیکی کرنے والے کو اس کے شر سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے جس کے ساتھ نیکی کی گئی ہو۔"

"اچھا تو نجیب صاحب احسان جتاتے رہے؟"

"یہ میں نے کب کہا؟"

"استاد۔ آپ مجھے کچھ بتائیے پلیز قصور کس کا ہے۔ خرابی کہاں ہے؟"

"خرابی شاید میرے اپنے دماغ میں ہے۔"

"میں نہیں مانتا۔ آپ جیسا شائستہ اور معقول آدمی بلاوجہ کسی کے خلاف ہو جائے۔ آخر کوئی تو سبب ہو گا؟"

"سبب تو ہے لیکن شاید میں ٹھیک سے بیان نہ کر پاؤں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے آپ جیسا قادرالکلام شاعر دقیق اور مشکل مضامین کو اس خوبی اور نفاست سے اپنے فن کی گرفت میں لے لیتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کسی سے اپنی ناراضی کا سبب بیان نہ کر پائے۔"

"واقعی میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ قصور نجیب صاحب کا تھا یا میری سوچ کا؟ شاید اس میں میری نازک مزاجی یا انانیت کا دخل ہو۔ نجیب صاحب کے خلاف میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت یا کوئی وزنی دلیل نہیں ہے کہ ان کا اتنا اچھا مقالہ سن کر مجھے خوشی کیوں نہیں ہوئی تھی۔ بس اس روز کے بعد میں نے ان سے ملنا جلنا کم کر دیا اور آہستہ آہستہ مزید غلط فہمیاں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ حاسدوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ہم ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے دور ہو گئے"۔ "معاف کیجئے گا استاد۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قصور آپ کا ہے۔ لوگوں کا بھی یہی خیال ہے کہ آپ کو شہرت اور مقبولیت مل گئی تو آپ اپنے محسن کو بھول گئے لیکن مجھے یقین نہیں آتا۔"

"ممکن ہے لوگوں کا خیال درست ہو بڑی معمولی اور فضول سی بات تھی۔"

"جیسی بھی ہے میں جاننا چاہوں گا۔"

"اچھا ضد کرتے ہو تو پہلے ایک واقعہ سنو۔ یہ میرے مرحوم والد صاحب کے ساتھ پیش آیا تھا۔"

"فرمائیے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"میرے ابا گاؤں کے ایک معمولی کسان تھے' پڑھے لکھے اور سفید پوش آدمی تھے' کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ تھوڑی سی چاہی زمین تھی گزارا ہو رہا تھا۔ میں ان دنوں نیا نیا کالج میں داخل ہوا تھا اور شہر ہی میں رہتا تھا۔ ایک روز اچانک ابا پر ایک مصیبت آن پڑی۔ وہ منہ اندھیرے بیل لے کر کنوئیں پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جوان عورت کنوئیں کے پاس کھڑی ہے۔ ابھی وہ یہ فیصلہ بھی نہ کر پائے تھے کہ وہ کوئی عورت ہے یا آسیب کہ اس نے ان کے دیکھتے دیکھتے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ انہوں نے اسے بڑی مشکلوں سے باہر نکالا مگر وہ جانبر نہ ہوئی۔ پتہ چلا کہ وہ گاؤں کے ایک کمہار کی کنواری بیٹی ہے جو اپنے گناہ کا سامنا نہ کر سکی تھی اور پھر سارا الزام ابا پر آ گیا۔ کمہاروں نے ابا کے خلاف پرچہ دے دیا۔ ابا سے اور تو کچھ نہ ہو سکا گھر سے فرار ہو کر ساتھ والے گاؤں چلے گئے اور نمبردار کرم الٰہی کے پاس پناہ لی جو ان کا آٹھویں جماعت تک کلاس فیلو اور دوست رہا تھا۔ کرم الٰہی نے انہیں تسلی دی اور اس وقت تک اپنے ڈیرے میں چھپے رہنے کا مشورہ دیا جب تک وہ پولیس سے مل کر معاملہ نہ سلجھا لے۔ ابا کئی روز تک کرم الٰہی کے ڈیرے میں چھپے رہے اور کرم الٰہی پولیس سے مل کر اصل مجرم کو پکڑوانے اور ابا کو بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس دوران میں وہ جب بھی واپس آتا ابا کو اپنی کارگزاری اور بھاگ دوڑ کی تفصیل بتاتا اور تھکاوٹ اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے ان سے پاؤں دبواتا اور چھوٹے موٹے دوسرے کام کراتا۔ اگر کبھی ملازم موجود نہ ہوتا تو ابا کو حقہ تازہ کرنے کو کہتا۔ ابا تمباکو نہیں پیتے تھے مگر انہیں کرم الٰہی کے لیے چلم بھرنا پڑتی۔ ابا کو یہ سب کچھ



شبنم رومانی

مجھ کو ہے یہ مان، لکھ رہا ہوں
میں خود کو ہر آن، لکھ رہا ہوں

کم ذائقہ آشنا ہیں جس سے
ایک ایسی زبان لکھ رہا ہوں

پتھر ہیں تمام لفظ، لیکن
میں پھول سمان لکھ رہا ہوں!

روشن ہے یقیں کی روشنائی
یا اپنے گمان لکھ رہا ہوں

میں نے ہی کیا ہے قتل خود کو
خود اپنا بیان لکھ رہا ہوں

دیوار چیخ رہی ہے مجھ میں
صحرا کو مکان لکھ رہا ہوں

ان دست بریدہ موسموں میں
اللہ کی شان لکھ رہا ہوں!

یہ معرفت غزل تو دیکھو
انسان کو "ستان" لکھ رہا ہوں!

● ۲۰۷ گھڑیالی بلڈنگ، صدر کراچی۔

اسلامی ممالک کی کہانیاں

ست ناگوار گزرتا کیونکہ طالب علمی کے زمانے میں ابا پڑھائی میں بہت ہوشیار تھے اور کلاس مانیٹر تھے اور کرم الٰہی نہ صرف پڑھائی میں ان سے مدد لیتا تھا بلکہ بڑے بھائیوں کی طرح ان کی عزت کرتا تھا۔ آخرکار کچھ روز بعد اصل مجرم پکڑا گیا اور اس نے اقبال جرم کر لیا لیکن پھر بھی تھانیدار نے ابا کو مقدمے سے نکالنے کے لیے ایک معقول رقم رشوت کے طور پر طلب کی۔ ابا یہ رقم ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ بہت پریشان ہوئے لیکن کرم الٰہی نے یہ رقم بھی اپنے پلے سے ادا کر دی۔ بعد میں ابا نے یہ قرض چکانا چاہا مگر کرم الٰہی نہ مانا اس کا کہنا تھا کہ دوستی میں حساب کتاب نہیں ہوتا۔ ابا زندگی بھر یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ کرم الٰہی نے جو احسانات کیے تھے ان کا پلڑا بھاری تھا یا اس خدمت گزاری کا جو وہ چلمیں بھروانے اور پاؤں دبوانے کی صورت میں ان سے لیتا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ کہتے اس سے اچھا تھا وہ تھانے میں پیش ہو جاتے چالان ہوتا اور وہ عدالت سے بری ہوتے۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ نمبردار کرم الٰہی سے ملنے سے کتراتے کہیں وہ ان کو کوئی بیگار نہ ڈال دے۔ انہیں اپنے لیے چلم بھرنے یا جوتا پالش کرنے کے لیے نہ کہہ دے۔ کیونکہ وہ اسے انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔"

"تو کیا۔ نجیب صاحب نے بھی آپ سے ایسی ہی کوئی بیگار لینے کی کوشش کی تھی؟"

"نہیں"

"پھر اس واقعے کا آپ کے اور ان کے درمیان کشیدگی سے کیا تعلق؟"

"بات اتنی سی ہے کہ جب ہم نجیب صاحب کے دوست کی کار میں تقریب کے لیے دوسرے شہر جا رہے تھے میرے ساتھ اخبار کا ایک رپورٹر' پروفیسر ہم اور میرا ایک بھانجا بھی تھے۔ تم جانتے ہو نجیب صاحب کو گپ شپ اور فقرے بازی کی عادت ہے لیکن اس روز ان کی طبیعت خوب زوروں پر تھی۔ مجھے پہلے بھی اس بات کا تجربہ تھا کہ وہ اکیلے میں میرے ساتھ سنجیدگی اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے' مگر جونہی کوئی تیسرا شخص آ جاتا ان کا رویہ تبدیل ہو جاتا اور وہ زیادہ تر مجھے ہدف بنا لیتے۔ لیکن اس روز اپنے دوستوں اور خاص طور پر اپنے بھانجے کی موجودگی میں مجھے اپنا ہدف بننا بہت ناگوار گزرا مگر میں سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ گلے گلے تک ان کے احسانات میں دبا ہوا تھا۔ میرا بھانجا مجھے اپنا آئیڈیل سمجھتا ہے اور دوسرے دوست بھی میرے بڑے مداح تھے لیکن نجیب صاحب ایسے رواں تھے کہ میرے احتجاج کے باوجود کھلتے ہی چلے گئے۔ انہوں نے دنیا جہان کے شاعروں کے لطیفے جن میں توہین اور پھبتی کے پہلو نکلتے تھے مجھ سے منسوب کر کے میری خوب بھد اڑائی' اور جس طرح کسی افسانے کو پڑھتے ہوئے اس کے انجام کا پہلے سے اندازہ ہو جائے تو سارا لطف جاتا رہتا ہے' اسی طرح پتہ نہیں کیسے مجھے قبل از وقت اندازہ ہو گیا کہ وہ میرے بارے میں تعریفی مضمون پڑھنے والے ہیں۔ چنانچہ جب میں نے ان کا خطبہ صدارت سنا جس میں میری تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے تھے مجھے قطعاً لطف نہیں آیا' بلکہ یہ سوچ کر میں اداس ہو گیا کہ دوران سفر وہ ایسا کیوں کر رہے تھے' انہیں تو معلوم ہی تھا کہ مقالے میں وہ میری کتنی تعریف کرنے والے ہیں اور یہ نیکی ان سے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ بالکل کرم الٰہی نمبردار کی طرح جس نے بے شک بہت بڑی نیکی اور احسان کیا مگر ابا کی انا کو مجروح کر کے اپنی تسکین کرتا رہا۔ مجھے نجیب صاحب اور نمبردار کرم الٰہی میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔ اور میں نجیب صاحب سے ملنے سے کترانے لگا بالکل ویسے ہی جیسے ابا نمبردار کرم الٰہی سے ملنے سے کتراتے تھے۔" *

بقیہ ص ۱۵ شناخت

شام کے اندھیرے میں بڑھیا اور زلیخا آپس میں کچھ باتیں کر رہی تھیں کہ اتنے میں گاؤں کے نوجوان اور دونے لاش کو دفنا کر بڑھیا کے پاس آئے۔ ان میں سے ایک نے بڑھیا سے پوچھا'

"تم نے آخر کیسے پہچان لیا کہ لاش تمہارے بیٹے مزمل کی ہے؟" بڑھیا کچھ دیر تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے لوگوں کو دیکھتی رہی پھر بولی۔ "انسان کی لاش کو کب تک آخر یونہی پڑا رہنے دیا جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک لمبی سانس لی۔ "میں نہ کہتی تو شاید لاش کو دفنایا بھی نہیں جاتا۔" *

شاعر ۹



صدیق مجیبی

سنبھال اے مری مٹی بدل نہ جاؤں کہیں
مجھے رُلا دے کہ پتھر میں ڈھل نہ جاؤں کہیں

کمانِ جاں میں ہوں اک آخری نفس کا تیر
میں دسترس سے بھی اپنی نکل نہ جاؤں کہیں

سمیٹ لے مرے مہتاب مجھ کو سینے میں
جھلس رہی ہے کوئی شئے میں جل نہ جاؤں کہیں

اسی خیال نے تنہائیاں مقدر کیں
کہ بزمِ غیر میں جاؤں تو کھل نہ جاؤں کہیں

یہ میرا شہر، میرے دوستوں کا شہر ہے یہ
مگر بغیر ترے اے اجل، نہ جاؤں کہیں

وفا کے نام پہ دے، جو فریب دے مجھ کو
تباہ ہونے سے پہلے سنبھل نہ جاؤں کہیں

غریبِ شہرِ سخن اپنی قدر و قیمت کیا
بہت ہے بھیڑ مجیبی کچل نہ جاؤں کہیں

سنٹرل اسٹریٹ، ہندپیڑھی، رانچی (بہار)



عبدالقوی ضیاء

دل تو کیا، جہاں سے گذرنا آیا
جی اُٹھے لوگ جو مرنا آیا
ہوگئے سارے سمندر پایاب
جب ہمیں پار اترنا آیا
جو تنفّس تھا، وہ رہا گرمِ سفر
کب مسافر کو ٹھہرنا آیا
اک گلِ تر کی محبّت میں ہمیں
کتنے کانٹوں سے گذرنا آیا
فصلِ گل آئی تو ہر غنچے کو
زخم کی طرح بکھرنا آیا
وہ ادب عشق نے بخشا کہ ہمیں
مدّتوں بات نہ کرنا آیا
صَرف جب تک نہ ہوا دل کا لہو
حرف میں رنگ نہ بھرنا آیا
دل پہ اپنے جو لگی چوٹ ضیا
ٹوٹ کر ہم کو بکھرنا آیا

961,AUGAR AVF. SUDBURY
ONTARIO P3A 4A7 CANADA

ترکی

اورخان کمال

مسعود اختر شیخ

ویگن میں

سولہ سواریوں کی ویگن میں پوری پچیس سواریاں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ جگہ جگہ چڑھائی چڑھتے اور موڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ عبور کرتے کرتے ویگن کے ہر نٹ بولٹ سے کراہت قسم کی چرخ چوں' چرچ چوں سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ریڈی ایٹر کا پانی گرم ہو کر ابل رہا تھا۔

موسلادھار بارشوں کے بعد مئی کے مہینے کی بے حدت سورج نے سرخ مٹی والی چتور اووا وادی کو پوری طرح اپنے شکنجوں میں دبوچ رکھا تھا۔ اس کے نتیجے میں سڑک کے ساتھ ساتھ پھیلی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اور تازہ گھاس' ہمارے بائیں ہاتھ سست رفتار دریا' نیلے آسمان میں اڑتے پھرتے چوڑے چوڑے پروں والے پرندے' غرضیکہ ہر شے تھکی تھکی سی دکھائی دیتی تھی۔

ویگن میں میرے اور درمیان والی سیٹ پر بیٹھے ایک کمیشن ایجنٹ کے سوا کسی کے گلے میں ٹائی نہیں تھی۔ باقی سب مسافر یا چھوٹے چھوٹے زمیندار تھے یا بٹائی پر کام کرنے والے کسان تھے جو صوبائی دارالحکومت کی جانب عازم سفر تھے۔ کوئی اپنے بیٹے کا رشتہ خریدنے جا رہا تھا تو کوئی اپنے کھیتوں کی کٹائی کے لیے مزدوروں کا بندوبست کرنے۔

ویگن کے اندر سگرٹوں کے دھوئیں اور سڑے ہوئے پنیر کی سڑاند میں اس کمیشن ایجنٹ کی آواز تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ وہ تڑاق تڑاق کر کے دانتوں سے فندق توڑ توڑ کر کھا رہا تھا۔ فندق چباتے چباتے وہ زوردار قہقہے بھی لگاتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اپنے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی ایک چھوٹی سی دیہاتی لڑکی کے پیچھے پڑ گیا۔

"ہاں تو تم میری بیٹی ہو گی نا؟ میری بیٹی بن جاؤ تو میں تمہیں نئی اسکرٹ سلوا دوں گا۔ بالوں میں لگانے کے لیے کلپ لے دوں گا۔ تمہیں اپنے ساتھ سینما لے جایا کروں گا۔"

یہ دس بارہ برس کی لڑکی جس نے کانوں میں ٹین کے کانٹے پہن رکھے تھے اور ان کانٹوں میں سرخ رنگ کے عام موتی جڑے ہوئے تھے' اس کی باتیں سن سن کر بڑے ادب سے ہنستی رہی اور پھر یکدم سنجیدہ ہو گئی۔ کمیشن ایجنٹ بولا:

"کہو کہو' میری بیٹی ہو گی؟ میری بیٹی بنو تو میں تمہیں اپنے محل میں لے چلوں گا۔ میرا ایک بڑا عالیشان محل ہے۔ میری بیٹیاں تمہاری ہی عمر کی ہیں۔ تم ان کے ساتھ مل کر کھیلو گی' رسی ٹاپا کرو گی' بارہ گوٹ کھیلا کرو گی' جھولا جھولا کرو گی......"

لڑکی کے پہلو میں ایک سانولا سا' پتلا سوکھا نوجوان بیٹھا تھا۔ کہنے لگا:

"صاحب جی' کیوں مغز کھپا رہے ہو۔ آپ کو معلوم ہی ہے نا دیہاتی لوگوں کا شہری روٹی سے پیٹ کہاں بھرتا ہے۔ پیسے کے پانی میں کائی کی بو نہ ہو تو ان کی پیاس نہیں بجھتی۔ آپ سے کوئی بات چھپی ہوئی تو نہیں نا۔"

ساتھ کی سیٹ پر بیٹھا ایک اور دیہاتی بول اٹھا: "ارے تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ خدا جھوٹ نہ بلوائے شہری تو تم بھی نہیں لگتے۔"

نوجوان نے جواب دیا: "نہیں' نہیں' میں بھی دیہاتی ہی ہوں۔"

"تو پھر کیوں کہتے ہو ان لوگوں کی یہ عادت ہے اور وہ عادت ہے' کیا تمہاری بھی یہی عادت نہیں ہے؟"



امجد اسلام امجد

جو اتر کے زینۂ شام سے تری چشم خوش میں سما گئے
وہی جلتے بجھتے چراغ سے مرے بام و در کو سجا گئے

یہ عجیب کھیل ہے عشق کا، میں نے آپ دیکھا یہ معجزہ
وہ جو لفظ میرے گماں میں تھے وہ تری زبان پہ آ گئے

وہ جو گیت تم نے سنا نہیں، مری عمر بھر کا ریاض تھا
مرے درد کی تھی وہ داستاں، جسے تم ہنسی میں اڑا گئے

وہ چراغِ جاں کبھی جس کی لو نہ کسی ہوا سے نگوں ہوئی
تری بیوفائی کے وسوسے اسے چپکے چپکے بجھا گئے

مری عمر سے نہ سمٹ سکے مرے دل میں اتنے سوال تھے
ترے پاس جتنے جواب تھے تری اک نگاہ میں آ گئے

۲۲۔ ممتاز اسٹریٹ، گڑھی شاہو۔ لاہور

اسلامی ممالک کی کہانیاں

"بے تو' مگر میں تو ویسے ہی بات کر رہا تھا۔"

دوسرا دیہاتی غصے میں بولتا چلا گیا: "ہمیں بھی دنیا کی اچھی چیزوں کا پتہ ہے۔ بس ہاتھ آنے کی بات ہے۔ صاف پانی میسر ہو تو گدھا بھی کائی والے پانی میں منہ نہیں مارتا۔۔۔۔ واہ برخوردار واہ۔۔۔۔ خوب بات کی تم نے۔۔۔۔!

کیشن ایجنٹ نے نوجوان سے پوچھا: "کیا یہ لڑکی تمہاری بہن ہے؟"

"نہیں صاحب جی' بہن تو نہیں ہمارے ہمسائے میں رہتی ہے۔"

"کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟"

"شہر جا رہے ہیں۔ وہ کونے میں اس کی ماں بھی ہے جو ساتھ جا رہی ہے۔"

ویگن میں۔ سرخ کپڑوں والی اس لڑکی کے علاوہ کوئی عورت دکھائی نہ دیتی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر اس کونے کی طرف دیکھا جدھر نوجوان نے اشارہ کیا تھا لیکن وہاں کوئی عورت دکھائی نہ دی۔ البتہ پیوند لگے کپڑے سے ایک کپڑے کی گٹھڑی ضرور نظر آئی۔ کیشن ایجنٹ نے نوجوان سے کہا: "کسی اس کونے میں تو کوئی عورت نظر نہیں آئی؟"

نوجوان نے منہ سے تو کچھ جواب نہ دیا البتہ پیچھے ہٹ کر کونے میں پڑی گٹھڑی سے کپڑا اٹھایا تو نیچے سے ایک چھوٹا سا سر نمودار ہوا۔ پھر کھال اور ہڈیوں پر مشتمل ایک ڈھانچہ دکھائی دیا جس کے رخساروں پر پسینے کی وجہ سے سر کے بال چپک رہے تھے۔ ڈھانچے کا سر تو سیٹ پر تھا مگر دھڑ گاڑی کے فرش پر ڈھیر ہو رہا تھا۔ آنکھوں کی جگہ دو لال سرخ گڑھے تھے جن میں سیاہ رنگ کی منجمد گول گول سی کوئی شے بڑے بھیانک طریقے سے جڑ دی گئی تھی۔ گردن کی ابھری ہوئی گرے کی ہڈی' نوکدار ناک' جھریوں سے اٹی جلد اور پیلا زرد چہرہ دیکھ کر جھرجھری آ گئی تھی۔ کیشن ایجنٹ نے آہستہ سے پوچھا: "کیا ہوا ہے اسے؟"

"دق ہے۔" نوجوان نے جواب دیا۔ "اگلے روز بھی میں اسے شہر لے گیا تھا۔ انہوں نے ایکسرے لیا تھا۔ آج پھر لے جا رہا ہوں صاحب جی' مگر امید کم ہی ہے۔ انہوں نے دوائیں تو لکھ دی تھیں مگر آج کس کی ہمت پڑتی ہے کہ دوائیں خرید سکے۔ تب دق کی انجمن والوں کے پاس گئے تو سو قسم کی درخواستیں' فارم' الابلا۔۔۔۔!

یہ کہتے ہوئے اس نے عورت کو دوبارہ کپڑے سے ڈھانک دیا اور بولا:

"اس کا گھر والا پچھلے سال انہی دنوں اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ اب خدا کے سوا اس کا کوئی نہیں ہے' اب اگر میں بھی اس کا ساتھ نہ دوں صاحب جی تو پھر۔۔۔۔؟"

کیشن ایجنٹ بولا: "اس بچی کی ماں تو بس ختم ہی سمجھو۔ اس کے لیے اب وہ کچھ نہیں کر سکتی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جھک کر نوجوان کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی۔ نوجوان کندھے چڑھاتے ہوئے بولا:

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں صاحب۔۔۔ بس یہ اور اس کی ماں راضی ہو جائیں تو۔۔۔۔"

کیشن ایجنٹ نے بچی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا: "کیا نام ہے تمہارا بھلا؟"

"سلوی" لڑکی نے جواب دیا۔

"بتاؤ بھئی سلوی۔ میری بچی سو گئی کیا؟ دیکھو تمہاری اماں تو بس آج کل کی مہماں ہے۔۔۔۔ اللہ اسے لمبی عمر دے لیکن۔۔۔۔ میں تمہیں پیارے پیارے کپڑے سلوا کر دوں گا۔ کلپ لے کر دوں گا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا' بجائے دربدر ذلیل و خوار ہونے کے ایچ میں لٹکتے رہنے کا کیا فائدہ؟"

لڑکی اپنے معصوم چہرے کی مسکراہٹ سے سب باتیں سنتی رہی اور پھر سنجیدہ ہو گئی۔ کیشن ایجنٹ نے نوجوان سے کہا: کہو نا اسے' تم بھی کہو۔ شاید اسے عقل آ جائے۔ دیکھو' اسکی ماں آج کل کی مہمان ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ غلط ہاتھوں میں پڑ کر بری راہ اختیار کر جائے۔۔۔ میرے تمام رشتہ دار بڑے لوگ ہیں۔۔۔ معزز انسان۔ کوئی جج ہے کوئی ڈاکٹر اور کوئی انجینئر' میں اسے کسی اچھے سے گھرانے میں آباد کرا دوں گا۔ آرام سے رہے گی۔ بیگم بن جائے گی۔۔۔۔!"

"قسم ہے رب پاک کی' صاحب جی۔۔۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں تو یہ سب کچھ اللہ کی رضا کے

لے کر رہا ہوں۔ اس کی ماں آج ہے کل نہیں ہو گی۔۔۔ آپ کے ساتھ چلی جائے تو اسی کا فائدہ ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا سلوی؟۔۔۔ صاحب جی کے ساتھ جاؤ گی؟"

لڑکی نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ سر جھکا لیا۔ بھویں چڑھا لیں۔ کیشن ایجنٹ اب سنجیدگی سے اس کے پیچھے پڑ چکا تھا۔ بولا: "پوچھ لے اپنی ماں سے۔ جا پوچھ لے۔"

نوجوان اٹھا اور اس نے کونے میں پڑی بچی کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا:

"ٹھیک ہے نا شریفاں؟۔۔۔ صاحب جی کی بات سن لی ہے نا تم نے؟۔۔۔ کہتے ہیں سلوی مجھے دے دو۔ میں اسے صرف ثواب کی خاطر کسی اچھے گھرانے میں رکھوا دوں گا۔ تم کیا کہتی ہو بھلا؟ تمہاری زندگی تو بس ایک دو روز اور ہو گی۔۔۔"

چیتھڑوں کی گٹھڑی میں حرکت ہوئی۔ نوجوان نے کپڑا اٹھایا تو نیچے سے وہی پہلے والا سر نمودار ہوا۔ گڑھوں میں گڑی دو سیاہ آنکھیں دیر تک سلوی کو دیکھتی رہیں۔ پھر دو موٹے موٹے آنسو اس کے سلوٹوں بھرے موم جیسے چہرے سے نیچے ڈھلک گئے۔

"کیا کہتی ہو شریفاں؟" نوجوان نے پھر پوچھا۔ "راضی ہو؟" وہ اپنا کان شریفاں کے قریب لے گیا اور پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کیشن ایجنٹ نے بے تابی سے پوچھا: "کیا کہتی ہے؟"

"یہ کیا کہے گی بیچاری۔۔۔ کہتی ہے دے دو۔۔۔" نوجوان نے یہ کہہ کر پھر اس پر کپڑا ڈال دیا۔

شہر کی سڑکوں سے گزرتی ہوئی ماروہ ویگن ٹیکسی سٹینڈ پر جا کر رکی تو سب مسافر اتر گئے۔ ہمارے جسم گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ تھکن بھی بہت محسوس ہو رہی تھی۔ سلوی کے ہمراہ سفر کرنے والے نوجوان نے اس کی ماں کو جو سوکھ کر ایک بچے جتنی ہو چکی تھی، اپنی گود میں اٹھا کر ویگن سے اتارا۔ کیشن ایجنٹ اپنی کامیابی پر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ سلوی کے قریب جا کر اس نے لڑکی کو کلائی سے پکڑ لیا اور ایک دس لیرے کا نوٹ جو اس نے پہلے ہی ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا، نوجوان کو تھما دیا۔ نوجوان نے نوٹ پکڑا ہی تھا کہ لڑکی نے ایک زوردار جھٹکے سے اپنا بازو کیشن ایجنٹ کی گرفت سے چھڑایا اور بھاگ کر اپنی ماں کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ کیشن ایجنٹ نے گدار چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ لڑکی کے قریب گیا تو لڑکی بھاگ کر دوسری طرف جا کھڑی ہوئی۔ نوجوان ہکا بکا سا ہو رہا تھا۔ دس لیرے کا نوٹ ہاتھ میں لیے کبھی کیشن ایجنٹ کی طرف دیکھتا کبھی لڑکی کی طرف۔ ادھر کیشن ایجنٹ نے بڑی پھرتی سے لڑکی کو دوبارہ کلائی سے پکڑ لیا۔ اسے غصے سے اپنی جانب کھینچتے ہوئے بولا: "تیری اماں نے ہاں کر دی ہے تو پھر بھلا۔۔۔ واہ جی واہ۔۔۔ دیکھو ذرا۔"

لڑکی نے پھر ہاتھ چھڑا لیا اور چلا کر بولی: "میں نہیں جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی بس۔"

"لیکن کیوں؟" کیشن ایجنٹ نے پوچھا۔

"میری مرضی۔ نہیں جاؤں گی۔"

"دیکھو میں تمہیں نئے کپڑے سلوا کر دوں گا، کلپ۔۔۔ میرے پاس بڑے آرام میں رہو گی۔ عام ۔۔۔"

اب اس نے نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا: "ذرا اس سے پوچھو تو سہی، آخر کیوں جانا نہیں چاہتی۔" نوجوان نے چند بار اصرار کیا تو لڑکی نے اسے کچھ کہا۔ اس نے کیشن ایجنٹ کو نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا:

"صاحب! یہ اپنی رقم واپس لے لو۔ سلوی کہتی ہے میں نہیں جاؤں گی۔ خواہ مخواہ۔۔۔ دیکھا جائے تو اس میں فائدہ اسی کا تھا۔ لیکن کھوپڑی میں عقل نہ ہو تو کوئی کیا کرے صاحب جی۔"

"اچھا، لیکن کہتی کیا ہے؟ نہ جانے کی کوئی وجہ تو ہو گی نا آخر، اس کی ماں تو آج کل کی مہمان ہے۔۔۔"

"وہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں صاحب جی، مگر عقل نہ ہو تو۔۔۔؟"

"کیوں جانا نہیں چاہتی؟"

"یہی بات تو یہ ہے صاحب جی کہ آخر وہ اپنی ماں کے جگر کا ٹکڑا ہے۔ کہتی ہے میں چلی گئی تو اماں

[باقی صفحہ ۲۹ پر دیکھیں]



پرکاش فکری

ہر ٹیس پہ روتے نہیں شکوہ نہیں کرتے
ہم دل کی تباہی کا تماشہ نہیں کرتے

ہوتا ہے سفر شوق کا ان کے لیے آساں
روٹھے ہوئے خوابوں کا جو پیچھا نہیں کرتے

پھولوں کے بھی موسم میں سلگتی ہے اکیلی
پنچھی کبھی جس شاخ پہ اترا نہیں کرتے

دنیا کو سمجھنا ہے تو کھلنا ہے ضروری
یوں سب سے الگ رہ کے اچھا تو نہیں کرتے

پیاسوں کے لیے اب بھی وہی دشت ہے فکری
بھولے سے بھی دریا جسے ڈھونڈا نہیں کرتے

● پراس ٹولی، ڈورنڈہ۔ رانچی۔ (بہار)

بنگلہ دیش

نجم العالم

یونس احمر

شناخت

ندی کے ایک کنارے پڑی ہوئی لاش کو سبھی نے دیکھا اور یہ سوال ان کے ذہن میں ابھرے کہ یہ لاش ہے کس کی؟ کس نے اس کو ہلاک کیا ہے اور کب؟ لیکن ان سوالوں کے جواب کسی کے پاس نہ تھے۔

سبھی نے یک زبان کہا کہ یہ لاش شنج پور گاؤں کی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس گاؤں کا کوئی بھی ہلاک نہیں ہوا۔

تو پھر یہ لاش ہے کس کی؟

اور لاش کو کس نے یہاں لا کر پھینک دیا ہے؟

لاش کی یہ خبر سارے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی لیکن جس نے بھی دیکھا اس کو شناخت نہ کر سکا کیونکہ اس کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ جسم کے بعض حصوں پر ضربات کے نشان بھی تھے۔

گاؤں کے بڑے بوڑھے سر جوڑ کر ایک جگہ بیٹھ گئے اور یہ معمہ حل کرنے لگے۔ لیکن جو نوجوان تھے انہوں نے اس بارے میں کوئی توجہ نہ دی۔ سب نے اپنی اپنی راہ لی۔ البتہ ایک نے کہا کہ "لاش کو اس طرح یہاں چھوڑ دینا مناسب نہیں۔ کسی نہ کسی کو کوئی قدم اٹھانا پڑے گا۔ سب سے پہلے تھانے میں رپٹ درج کرانی چاہیے۔" گاؤں کے دو ایک معمر لوگ آگے آئے اور بولے:

"لاش جس کی بھی ہو۔ اسے دفن کر دینا چاہیے۔ اگر دفنائی نہ گئی تو گل سڑ جائے گی۔"

دوسرے نے کہا "پولیس جب تک نہیں آجاتی لاش کو یہاں سے ہٹانا بھی ٹھیک نہیں کیونکہ اس کی شناخت کے بغیر اس کو دفنانے سے ہم مشکلات میں پڑ جائیں گے۔"

مسجد کے امام کاظم اللہ صاحب نے کہا۔ "لاش دفنائی نہیں جا سکتی۔ کیونکہ یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا تعلق کس ذات پات سے ہے اور اس کا مذہب کیا ہے۔ جب تک اس کی شناخت نہیں ہو جاتی کسی کو کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔"

کسی نے کہا: "یہ لاش سکھی بڑھیا کے بیٹے کی ہے۔ اس کا نام مزمل ہے جس نے اپنی ماں اور بیوی کو رسی کرکے راہ فرار اختیار کی تھی۔ وہ پچھلی رات کو بڑی خاموشی سے گاؤں بھی آگیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے اس کے کسی دشمن نے اس کو ہلاک کرکے اس کی لاش یہاں پھینک دی ہو۔" ایک مفروضہ یہ بھی بیان کیا گیا کہ روپے پیسے کے لالچ میں آکر کوئی یہ لاش یہاں پھینک گیا ہو۔ ایک اور شخص بولا "میرے خیال میں یہ لاش چھدام پال کی ہے۔ باگری کی بیٹی کالی کے ساتھ چیئرمین ملوث تھا جس نے کسی غنڈے کی مدد سے چھدام پال کو ہلاک کرکے لاش یہاں پھینک دی ہے۔"

مگر چھدام پال کے بارے میں تو گاؤں کے سارے لوگ واقف ہیں۔ اس گاؤں کے بھی اور دوسرے گاؤں کے بھی۔ چھدام پال کے بارے میں شک و شبہ اس لئے اور بھی راسخ ہوگیا کہ وہ گذشتہ شب گاؤں سے فرار ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ کالی بھی نظر نہیں آئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ چھدام کو ہلاک کروا کے چیئرمین نے کالی کو کہیں چھپا دیا ہو لیکن کوئی وثوق سے یہ نہیں کہہ سکا کہ یہ لاش چھدام پال ہی کی ہے کیونکہ لاش کا چہرہ بالکل مسخ ہو چکا ہے ناک، منہ اور پیشانی پر زخم کے نشان بھی ہیں۔ نہ اس کے جسم پر دھوتی ہے اور نہ تہمد۔ اس لاش کی شناخت بہت مشکل ہے۔ اور جب تک اس کی شناخت نہیں ہو جاتی اس کو دفنانا بھی



ظفر صہبائی

ہمارا دل بھی جو دلّی سا بے وفا ہوتا
نہ جانے کب کا یہ برباد بن گیا ہوتا

جو بارِ منصب و دستار لے لیا ہوتا
ہمارا سر بھی ترے سامنے جھکا ہوتا

بلا رہے تھے مجھے چاروں اور سے رستے
اگر گریز نہ کرتا تو نقشِ پا ہوتا

جو آنسو داغِ ندامت تھے خود ہمارے لئے
ان آنسوؤں سے زمانے کا کیا بھلا ہوتا

اڑان بھرتے فضاؤں میں پنکھ پھیلاتے
یہ آسماں جو ذرا سا کھلا کھلا ہوتا

ستم خلافِ توقع نہیں ہوئے ہم پر
کرم جو تم نے کئے ہوتے معجزہ ہوتا

ہماری طرح اڑاتے نہ پھر پتنگ کبھی
جو لڑتے لڑتے کوئی پیچ کٹ گیا ہوتا

● صوفیہ ہاؤس۔ موتیا پارک، بھوپال۔

ممکن نہیں۔

اور یوں شفیع پور گاؤں کے لوگ مشکلات میں مبتلا ہو گئے۔

کسی نے آکر کہا کہ یہ لاش ہو بہو عکسی بڑھیا کے بیٹے مزمل ہی کی ہے۔

عکسی یا سکینہ بیگم کا شوہر لطافت الدین دس سال پہلے مر گیا تھا۔ اس سے سکینہ بیگم کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ورید اور مریم پیدا ہوئیں۔ مریم کی شادی اسی گاؤں میں ہو چکی تھی اور بیٹے مزمل کا تین سال پہلے زلیخا سے بیاہ رچایا تھا۔ اس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ سکینہ کو اس بات کا غم تھا۔ بینائی بھی کم ہو گئی تھی۔ کہیں آنا جانا ہوا تو لاٹھی کا سہارا لیتی ہے۔ گاؤں کے سارے لوگ اس کو سکینہ بیگم کی بجائے عکسی بڑھیا کہہ کر ہی پکارتے ہیں۔ اور یوں مصائب میں اس کے دن گزرتے رہے۔ بہو زلیخا کے پاس پہننے کے لئے اچھی سی ساڑھی تک نہیں تھی۔ زیور کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صرف ناک میں ایک لونگ تھا۔ اس کے باوجود اس نے کبھی شکایت نہیں کی۔ اس کا شوہر زیادہ تر باہر سیر سپاٹے میں گزارتا۔ جب وہ اس سے پوچھتی ہے تو جواب میں یہی کہتا ہے "تلاش روزگار میں مارا مارا پھرتا ہوں" یا پھر وہ یہی کہتا کہ "کہیں کاروبار کرتا ہوں۔" لیکن تعجب ہے اس نے اب تک بیوی یا ماں کو ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔

ماں اپنے بیٹے مزمل سے کہتی ہے۔ "میرے لال کہیں ملازمت کر لے۔ گھر کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ نہ چاول ہیں نہ دال۔ ایک وقت پکتا ہے تو دوسرا وقت فاقہ میں کٹتا ہے۔" لیکن مزمل ماں کی ان باتوں پر دھیان ہی نہ دیتا۔

بڑھیا کو فکر لاحق ہے کہ زلیخا کی گود اب تک خالی ہے۔ مزمل کو بیوی سے ذرا بھی محبت نہیں۔ اس کی نگاہ صرف گھر سے باہر کی دنیا پر رہتی ہے۔ بے چاری زلیخا شوہر کی گالیاں سنتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ تو کسی صاحب کے کاروبار کا پھیرا لگاتا ہے۔ یہ بھی اس کے بارے میں مشہور ہے کہ آدھی رات کی پچھلی طرف جو گلی نکلتی ہے وہاں اندھیرے میں چھپ چھپ کر وہ گانجا اور بھنگ پیتا ہے اور منچلی عورتوں کے ساتھ راتیں گزارتا ہے۔ اس کے علاوہ صاحب مزمل سے برے برے کام کرواتا ہے۔

ایک دن مزمل یکایک کئی روز کے بعد گھر آیا گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے چیخ پکار شروع کر دی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔

اس نے غصے میں لال پیلا ہو کر کہا "اے زلیخا جلدی کھانے کو کچھ لا۔"

زلیخا کمرے سے باہر نکلی ہی تھی کہ مزمل نے اس کے سر کے بالوں کو مٹھی میں پکڑ کر مارنا شروع کر دیا اور اسی طرح غصے میں بولا۔ "میری بات کان میں پہنچی نہیں ہے۔ بڑے آرام سے سوتی رہتی ہے حرامخور۔" زلیخا نے مزمل کی گرفت سے خود کو آزاد کرا کر کہا۔ "دیکھ مجھے گالی نہ دو۔ کھانا کہاں سے لاؤں۔ گھر میں نہ چاول ہیں نہ دال۔"

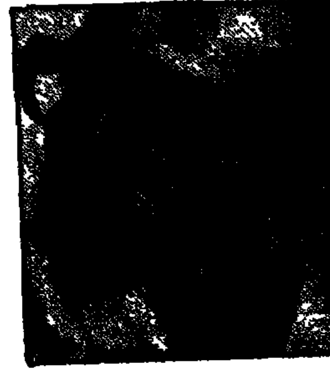
یہ سن کر مزمل کو اور طیش آگیا اور چیخ کر بولا۔ "بڑھیا کہاں ہے؟"

مزمل کی یہ چیخ و پکار سن کر بڑھیا کمرے سے باہر آئی اور بولی۔ "کیا ہوا ہے تجھ کو ایسی چیخ پکار کیوں؟"

اس نے ماں کو بھی گالیاں دیں۔ زلیخا کو اس کی اس حرکت پر غصہ آگیا۔ اس نے بھی چیخ کر کہا "اماں کو اس طرح گالیاں نہ دو۔ شرم نہیں آتی تمہیں۔ کیا ہم کو اطلاع نہیں ہے کہ تم دن رات کیا کرتے ہو۔ گانجا بھنگ اور تاڑی میں مست رہتے ہو منچلی عورتوں کے ساتھ رات گزارتے ہو۔"

یہ سن کر مزمل زلیخا کی طرف طیش میں آکر لپکا اور چیخ کر بولا' پکڑ کر اس کو صحن کی طرف لایا اور اس کی پٹائی شروع کر دی۔ یہ سن کر بڑھیا بھی آگئی۔ مزمل نے ماں کو بھی نہیں چھوڑا' اس کے بعد زلیخا جو زمین پر گری پڑی تھی' مزمل نے اس کا گلا دبانا شروع کیا۔ زلیخا بے سدھ ہو گئی' اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ مزمل نے اس کے جسم کو چھوا تو اس کا سارا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ وہ سانس بھی نہیں لے رہی تھی۔

بڑھیا زمین پر پڑی چلا کر کہہ رہی تھی۔ "مزمل آخر تیرے من میں ہے کیا۔ تو کیا چاہتا ہے کیا تو ہم دونوں کو ہلاک کرنا چاہتا ہے۔"



رشیدا عجاز

نمکیں پردوں میں شیرینی کیا معنی!
بیرنگی من پہ خود بینی کیا معنی!
رنگ و نظر کی تیرہ دردی کافی ہے'
درد بستے میں بے دینی کیا معنی!
دیدہ نموں میں اپنے تاج کا عکس نہ دیکھ
بیچ سمندر تخت نشینی کیا معنی
حکم لگا ہے آہ ہنک پر بار نہ ہو!
چیخ فکر میں شر آگینی کیا معنی!
شہپر ہی جب غیر کے ٹھہریں، کیا پرواز
گدھ رعبی، بسمل شاہینی کیا معنی
پھولوں کے تختوں پر جنگی تصویریں!
پتھر پہ پھر کارِ مہینی کیا معنی!
اپنی سوچ کا جینا سچا جینا ہے
لیکن یہ معمول مشینی کیا معنی!
صحن کو بیٹھک کے کمرے کا جوڑ نہ دے
ہر جا یک رنگی قالینی، کیا معنی!

۹۸۳، بھوانی پیٹھ، پونہ ۴۲ (مہاراشٹر)

اسلامی ممالک کی کہانیاں

اب مزمل کو ہوش آیا اور اس نے سوچا زلیخا مر گئی ہے۔ گاؤں کے لوگ ہاک شور و غل سن کر مزمل کو پکڑنے آئے' اپنی جان کے خوف سے وہ بھاگ کھڑا ہوا جنگل کی طرف' وہ بھاگتا بھاگتا بانس کے جنگل میں آگیا۔

اس دن کے بعد مزمل گھر نہیں لوٹا۔ تین چار ماہ سے کسی نے اس کو دیکھا بھی نہیں۔ زلیخا مزمل کی مارپیٹ سے بے ہوش ہو گئی تھی' جب اس کو ہوش آیا تو وہ ساس سے لپٹ کر بین کرنے لگی۔

گاہے گاہے چیئرمین دیہہ تعلقدار کے ساتھ مزمل کی بیوی زلیخا کی خیریت دریافت کرنے اس کے گھر آتا۔ وہ سوچتا کہ چیئرمین ہونے کی وجہ سے مزمل کے خاندان کی خیر و عافیت معلوم کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔ بلتو حجام کے ذریعے وہ زلیخا کی روپے پیسے سے بھی مدد کرتا ہے۔

گاؤں کے سارے نوجوانوں کو اندیشہ ہوا کہ ہو نہ ہو چیئرمین نے مزمل کو کہیں اغوا کروا دیا ہے لہٰذا یہ لاش اسی کی ہے۔ لیکن اس کی شناخت کون کرے گا اور گاؤں کے لوگ بڑے وثوق سے کہنے لگے کہ لاش چھدام پال کی ہے۔ کالی کے مکان میں کبھی کبھی دیہہ تعلقدار شراب پینے کے لئے آجاتے ہیں۔ لیکن گاؤں کے ساری خبر رکھنے کے باوجود کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کالی دراصل چھدام پال کی لڑکی ہے۔

ایک روز نصف شب کو چیئرمین کو چھدام پال نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ وہ کالی کے گھر سے نشے میں سرشار ہوا تعلقدار کے ساتھ باہر آیا۔ چیئرمین نے چھدام پال کو چپ رہنے کی تلقین کی مگر وہ نہ مانا۔ اس نے شور مچانا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے کہ گاؤں کے لوگ اکٹھا ہوتے بلتو نے چیئرمین کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔

چھدام پال اس گاؤں کو چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا۔ اپنے ساتھ وہ کالی کو بھی لے گیا۔ لیکن کیا چھدام پال فرار ہونے میں کامیاب ہو سکا۔ فرار ہونے سے پہلے ہی چیئرمین کے وفاداروں نے اس کو پکڑ لیا لیکن وہ ان سے بچ نکلا۔

گاؤں کی ایک طرف صبح سے لاوارث لاش پڑی ہوئی ہے۔

یہ خبر عکسی بڑھیا اور زلیخا کے کانوں میں بھی پہنچی۔

زلیخا کو ذرا بھی شک نہ ہوا کہ لاش مزمل کی ہے۔ البتہ بڑھیا زار و قطار رونے لگی' زلیخا نے بڑھیا کو لاش کے قریب نہ جانے دیا۔

گاؤں کے لوگ مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے پولیس کو اطلاع دی مگر وہاں سے کوئی نہ آیا۔ لاش پڑی پڑی پھول گئی۔ اور اس پر مکھیاں بھنبھنانے لگیں۔ بدبو چاروں طرف پھیل رہی تھی اب شام ہو چکی تھی۔ اب تو لاش کو دفنانے کے علاوہ کوئی چارہ بھی باقی نہ تھا۔ لیکن امام صاحب کا حکم تھا کہ جب تک اس کی شناخت نہیں ہو جاتی دفنانا نہیں چاہئے۔

نوجوان بڑھیا کے پاس آئے اور گویا ہوئے۔ خالہ ہم مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہیں کیونکہ جب تک لاش کی شناخت نہیں ہو جاتی اس کو دفنانا مشکل ہے۔

ماں کا دل تڑپنے لگا اور بولی۔ "نہ جانے کون ماں کا لال یہاں آکر ہلاک ہوا ہے۔ کیا اس کو مٹی دینے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔"

بہت دیر تک چپ چاپ نہ جانے کیا سوچتی رہی اور پھر اپنی لاٹھی کے سہارے اٹھ کھڑی ہوئی چلو چل کر دیکھیں وہ لاش کس ماں کے لال کی ہے؟"

لاٹھی کے سہارے چل کر وہ لاش کے نزدیک پہنچ گئی۔ لاش کا چہرہ بالکل مسخ ہو چکا تھا اور پیٹ بھی پھول گیا تھا۔ اس کی شناخت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن غور سے دیکھنے کے بعد یکایک وہ چیخ کر رونے لگی۔ "ارے میرے لال مزمل"

گاؤں کے لوگ امام صاحب کے پاس گئے اور بولے "وہ لاش عکسی بڑھیا کے بیٹے مزمل کی ہے۔ اس نے اس کی شناخت کر لی ہے۔"

سب کی باتیں سن کر امام صاحب نے لاش کو دفنانے کا حکم جاری کیا۔ [باقی صفحہ ۹۳ پر دیکھئے]



شمیم فاروقی

خود کو اپنے آپ سے ہر دم خفا رکھتا ہوں میں
ایک عالم سارے عالم سے جدا رکھتا ہوں میں

بند کر ڈالا تھا جن کو عمر بھر کے واسطے
ذہن و دل کے ان دریچوں کو کھلا رکھتا ہوں میں

ایک کربِ ذات اور اس پر یہ کربِ آگہی
غم بھی اکثر دیکھئے حد سے سوا رکھتا ہوں میں

مشکلوں کے وقت کی ساری دعائیں یاد تھیں
کب مجھے احساس تھا دستِ دعا رکھتا ہوں میں

قربتیں حد سے بڑھیں گی دوریاں بن جائیں گی
ہر سے ملنے میں ہمیشہ فاصلہ رکھتا ہوں میں

دشمنوں یا دوستوں کی کیا خبر مجھ کو شمیم
کب کسی سے دور کا بھی واسطہ رکھتا ہوں میں

آل انڈیا ریڈیو، رانچی ۸۳۴۰۰۱ (بہار)



مصحف اقبال توصیفی

رخصت اک عہد جوانی ہی نہیں
کیا کہیں کوئی کہانی ہی نہیں

خواب اک آنکھوں کو میری دے دیا
میں نے روکا بھی، وہ مانی ہی نہیں

جیسے شبنم ہو رگِ گل میں رواں
میں ترا آنسو ہوں پانی ہی نہیں

یہ عجب بازار ہے ۔ شوکیس میں
لفظ اتنے ہیں معانی ہی نہیں

سن رہا ہوں ہاتھ میں ٹھوڑی لئے
جیسے یہ میری کہانی ہی نہیں

مصحفؔ اپنے من میں کچھ اپنا ہو
خاک کو سے میری وفانی ہی نہیں

● ۲۰۴ مغل مانٹ اپارٹمنٹس نمبر ۲/۸۴۲-۲-۱۲
مہدی پٹنم، حیدرآباد - ۲۸

انڈونیشیا

آشدائت کارتا ہارا جا

محمود احمد قاضی

وان بیورن اور دیہاتی لڑکی

یہ واقعہ ایمسٹرڈم کی ایک تند ہواؤں سے لدی خزاں زدہ شام کو پیش آیا۔ میں راستہ بھول گیا تھا اور مجھے والیرس سٹریٹ کا پتہ پوچھنا پڑا۔ میں اس شخص کے جواب پر حیران رہ گیا کیونکہ اس نے میرے سوال کا جواب انڈونیشین زبان ہی میں دیا تھا۔

"اس طرف جناب" ---- وہ اتنا مہذب شخص ثابت ہوا کہ اس گلی کا راستہ بتاتے ہوئے وہ اخلاقاً میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ وہ جگہ اس جگہ سے جہاں ہماری ملاقات ہوئی تھی قریب ہی تھی۔

وہ تھا تو دراز مگر اس کا قد قدرے جھکا ہوا تھا۔ تند ہوا کے تھپیڑوں سے بچانے کے لیے بار بار اس کے ہاتھ اپنے ہیٹ کی طرف بڑھتے تھے۔ اس کے ہیٹ کی طرح اس کا اوورکوٹ بھی خاصا گندا اور پرانا تھا۔ اگرچہ میں اسکا چہرہ واضح طور پر دیکھ نہیں پا رہا تھا لیکن اس کے دھیمے لہجے اور آواز کی نرمی نے میرے دل کے گوشے میں اس کے لیے پسندیدگی کا تاثر پیدا کر دیا تھا۔

میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے بتایا کہ انقلاب کے زمانے میں وہ انڈونیشیا ہی میں تھا۔ اس نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت بھی دے ڈالی اور یوں ہم نے آئندہ ملاقات کا وقت طے کر لیا۔

تین دن بعد ایک سہ پہر کو کہ یہی ہماری ملاقات کا طے شدہ وقت تھا میں نے اس کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ اس نے خود آکر دروازہ کھولا اور پھر ہم اوپر ہی تیسرے فلور پر جانے کے لیے بوسیدہ سی سیڑھیاں طے کرنے لگے جہاں وہ ایک ایسے کمرے میں رہتا تھا جو ایک تنہا شخص کی ضروریات زندگی کے لیے کافی تھا۔ اور یقیناً یہ ایک نہایت سادہ سا کمرہ تھا، مفلسی کی بہترین تصویر، جس میں صرف تین کرسیاں ایک میز، ایک ڈریسر اور ایک دیوان تھا جو شاید بیٹھنے اور سونے کے مقاصد بیک وقت پورے کرتا تھا۔ یہ سب چیزیں نہایت خستہ حالت میں تھیں۔ کمرے کا سارا ماحول بے ترتیبی کا مظہر تھا۔ کتابیں یہاں وہاں بکھری پڑی تھیں۔ شطرنج کے مہرے اسی حالت میں میز پر پڑے تھے جس حالت میں انہیں پچھلی ختم ہونے والی بازی کے وقت چھوڑا گیا تھا۔ کھڑکی کے قریب ایزل پر ایک نامکمل تصویر موجود تھی اور نیچے فرش پر پینٹ کی ٹیوبیں اور برش وغیرہ بکھرے پڑے تھے۔

"اچھا تو آپ مصوری کرتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بس وقت گزارنے کا ایک مشغلہ ہے۔" اس نے کونے میں پڑی کرسی کو کھینچتے ہوئے مجھے بیٹھنے کو کہا۔

اب اس کمرے کی روشنی میں میں نے اسے دیکھا تو اس کے متعلق پہلی ہی ملاقات پر قائم ہونے والا میرا تاثر بالکل صحیح ثابت ہو رہا تھا بے شک وہ عام لوگوں سے ہٹ کر دوستانہ اور بہت غیرروایتی رویے کا حامل ایک شخص تھا۔ وہ ایزل کے ایک طرف پڑی اپنی مکمل کی گئی پینٹنگز کے ڈھیر میں سے ایک ایک کر کے مجھے تصویریں دکھاتا رہا اس کی تصویروں کا سٹائل خاص متنوع تھا یوں معلوم ہوتا تھا کہ تصویروں کے ذریعے اپنی شخصیت کے اظہار کو پانے کے لیے وہ ابھی تک مختلف قسم کے تجربات میں لگا ہوا تھا۔ ایزل پر موجود تصویر میں ایک پہاڑ کے دامن میں دھان کے کھیتوں کا لینڈ سکیپ نظر آ رہا تھا۔

"ایک خوبصورت ملک ---" اس نے تقریباً خالی ہوئی ایک پینٹ ٹیوب اٹھاتے ہوئے کہا۔ اور پھر نہایت گلوگیر آواز میں اس نے بتایا کہ وہ ابھی تک مغربی جاوا کے خوبصورت پہاڑی ماحول کو نہیں بھولا۔

"اے کاش میں پھر ایک بار وہاں جا سکوں --- کیا میں پھر کبھی ان اونچے خوبصورت پہاڑوں کی

ڈھلانوں پر موجود چائے کے باغات میں گھوم پھر سکوں گا؟ کیا میں دوبارہ اپنے مخصوص رنگین لباس پہنے ہوئے ان سادہ دیہاتی لڑکیوں کے گیت اور قہقہے سن سکوں گا؟ کیا میں انہیں چائے کی پتیاں چنتے ہوئے دیکھ سکوں گا اور کیا وہاں کے جنگلوں کی فرحت بخش ٹھنڈی ہوا میں ایک بار پھر سانس لے سکوں گا؟"

وہ پرانی یادوں کی شدت سے مغلوب ہو کر جذبات کے سمندر میں بہتا چلا جا رہا تھا۔

"کیوں نہیں۔۔ ایسا ہو سکتا ہے۔"

وہ ٹانگ پہ ٹانگ دھرے بیٹھا کسی قدر اداس لگ رہا تھا۔

"میں اس خوبصورت دیہی علاقے کو اس طرح پسند کرتا ہوں جیسے کہ وہ میری جنم بھومی ہو۔۔۔ یہ بات ہے تو عجیب لیکن میں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

"اچھا۔۔ وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ سب کچھ محض اس لیے نہیں کہ وہاں کے پہاڑی سلسلے بہت شاندار ہیں کیونکہ آپ جانتے ہی ہیں کہ سوئٹزرلینڈ کے پہاڑی مناظر بھی غیر معمولی طور پر خوبصورت ہیں مگر پھر بھی ان میں وہ خاص بات کہاں جو انڈونیشیا کے پہاڑی علاقے میں ہے۔"

میں مسکرایا کہ شاید وہ مجھے بنانے کے لیے یہ سب کچھ کہہ رہا ہے۔

"سچی بات یہ ہے" وہ کہتا چلا گیا۔ "اصل میں مجھے وہاں کے سادہ اور مخلص لوگوں سے محبت ہے۔۔ یہ وہ احساس ہے جو وہاں کی ہر چیز کو خوبصورت بنا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک صحرا ہی کو لے لیں۔۔ کیا یہ بنجر، ویران اور فضول سی جگہ محبت میں بھیگے ہوئے شخص کے لیے ایک نخلستان کی طرح نہیں ہو سکتی؟"

اس نے اپنے بیٹھنے کا انداز بدلتے ہوئے اپنی کہانی جاری رکھی اور مجھے بتایا کہ "انقلاب کے وقت وہ نیدرلینڈ کی امپیریل آرمی میں ایک سارجنٹ تھا اور اسے ایک خاص عرصے کی قید کی سزا بھی ہوئی تھی اور پھر بعد میں وہ اپنے ملک لوٹ آیا تھا' وہ اس لیے کہ اس نے ان معصوم لوگوں پر خواہ مخواہ گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا جن کا جرم محض یہ تھا کہ وہ آزادی سے جینے کی خواہش رکھتے تھے۔"

"سگریٹ لیں" اس نے اپنا بیان منقطع کرتے ہوئے کہا "میں خود تو سگریٹ نہیں پیتا' میں تو بس اس کا عادی ہوں" اس نے اپنی پتلون کی پچھلی جیب سے ایک پائپ نکالتے ہوئے کہا' وہ ایش ٹرے لانے کے لیے ڈریسر کے پاس گیا اور پھر گویا ہوا "میں اس ایک واقعہ کو تو بالکل ہی برداشت نہ کر سکا وہ بے حد تکلیف دہ تھا۔ بنڈونگ کی ڈاگو سٹریٹ میں ایک شام کو میں نے سپاہیوں کو سائیکل پر وہاں سے گزرتے ہوئے ایک لڑکے کو روکتے دیکھا۔ بغیر کسی وجہ کے انہوں نے اس بے چارے کو پکڑ کر سڑک کے کنارے پر گرا دیا اور پھر اسے بجلی کے کھمبے کے ساتھ سیدھا کھڑا ہونے کا حکم دیا اور پھر اچانک سپاہیوں میں سے ایک نے اپنی تلوار نکالی اور اس لڑکے کے جسم کو اس بے دردی اور شدت سے چیر کر رکھ دیا کہ تلوار کے کھمبے کے ساتھ ٹکرانے سے چنگاریاں سی برآمد ہوئیں۔ ذرا سوچو بغیر کسی وجہ سے اس بے چارے لڑکے کو صرف اس لیے مار دیا گیا کہ اس کا تعلق اس قوم کے ساتھ تھا جو آزادی کے ساتھ جینا چاہتی تھی۔ صرف چند لمحوں میں وہ لڑکا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا اور کسی نے اس کا نوٹس نہ لیا۔"

وان ہیورن (کہ یہی اس کا نام تھا) نے یہ کہانی خاص دردمندی مگر نہایت سکون سے سنائی تھی۔ وقفے وقفے سے وہ پائپ کے تمباکو کی راکھ فرش پر گراتا رہا۔ پھر گھنٹی بج اٹھی۔۔ وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا اور ایک لمحے بعد ایک اجنبی اندر آ گیا۔ وہ گہرے نیلے رنگ کے نہایت عمدہ سوٹ میں ملبوس ایک انڈونیشین تھا۔ وہ ایک چھوٹے قد کا چھوٹی سی ناک اور ایسی پھٹی پھٹی آنکھوں والا شخص تھا جو بڑی بے چینی سے مسلسل حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کا سر آدھا گنجا تھا جس سے اس کی پیشانی کی اونچائی غیر معمولی دکھائی دیتی تھی' وہ اپنی حرکات و سکنات سے بدوس اور جعلی سا دکھائی دیتا تھا جیسے وہ اپنے آپ کو کسی شک و شبے سے بالاتر رکھنے کی کوشش میں نہایت بھونڈی اداکاری کر رہا ہو۔ اس نے وان ہیورن کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا اور مجھ سے علیک سلیک کیے بغیر جتنی تیزی سے آیا تھا اتنی ہی تیزی سے واپس چلا گیا۔ ●



اکبر حمیدی

میں اپنے ساتھ رہنے لگ گیا ہوں
کسی سے کچھ نہ کہنے لگ گیا ہوں

نئی تعمیر اب ممکن ہوئی ہے
کہ میں اندر سے ڈھنے لگ گیا ہوں

کسی بھی روز تجھ سے آ ملوں گا
ترے خوابوں میں رہنے لگ گیا ہوں

ترے ہونٹوں پہ آ کر رک گیا تھا
تری آنکھوں سے بہنے لگ گیا ہوں

کسی دن گونج اٹھوں گا ترے دل میں
کہ خاموشی کو سہنے لگ گیا ہوں

پہاڑوں سے اتر آیا ہوں اک بار
کسی دامن پہ بہنے لگ گیا ہوں

● ۱۸ ارڈی گلی ۲۲، جی ۔ ۲/۶ اسلام آباد

"ایک پرانا ملاقاتی"۔۔ وان ہیورن نے مجھے دوبارہ بیٹھنے کے لیے کہتے ہوئے بتایا "وہ صرف دو دن پہلے انڈونیشیا سے آیا ہے اصل میں میں اسے زیادہ پسند نہیں کرتا۔"

اس وقت سے لے کر میں نے اس شخص کو وان ہیورن کے گھر پر کئی موقعوں پر دیکھا۔ میں حیران ہوتا تھا کہ اس شخص کا رویہ اتنا عجیب اور پراسرار کیوں تھا۔ اس کا انداز دوستانہ نہیں تھا۔

ایک سہ پہر کو وان ہیورن نے یہ کہہ کر ایک بار پھر مجھے اپنے گھر پر بلایا کہ اس کے پاس عمدہ شیری کی ایک بوتل بھی ہے جو کہ مجھے بہت پسند تھی۔ اس کی بنائی ہوئی نئی تصویر بہت اچھی تھی حالانکہ یہ وان گاگ کی محض نقل تھی۔

اس نے شیری کے گلاس بھرتے ہوئے کہا "آپ اس علاقے کو جانتے ہیں؟"

"بے شک" میں نے جواب دیا" یہ "تنی پانار" ضلع ہے بہت بڑے گیدمی آتش فشاں کے پیچھے۔"

"ہاں میں بھی اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میرے عزیز آپ کی صحت کے لیے" اس نے اپنا شیری کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

بالکل یہی الفاظ آپ کے لیے" میں نے جواب دیا۔ ہم پینے لگے۔

"آپ یقیناً یہاں کے رہنے والوں کے بارے میں ضرور جانتے ہوں گے؟"

"نہیں۔۔ میں نے تو بس یا کار کے ذریعے سڑک جاتے ہوئے ایک نظر اس علاقے کو دیکھا ہے۔ لیکن ہاں یہ ممکن ہے کہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں۔"

"آزادی کے بعد اب ان لوگوں کی زندگی کیسی ہے؟"

"بہت اچھی" میں نے جواب دیا۔

"اگر ایسا ہے تو خدا کا شکرگزار ہونا چاہیے"۔۔۔ ایک لمحے اس نے کچھ سوچا اور پھر پوچھا۔

"اچھی' سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

میں نے فوراً جواب نہ دیا تو اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں وہاں کے کچھ لوگوں کو جانتا ہوں۔۔۔۔ مثلاً کسان' مزدور اور چائے چننے والے۔ کیا آپ کے خیال میں وہاں کے درخت اگانے والے کارکنوں کی تنخواہیں ان کی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی ہیں؟ میں نے سنا ہے کہ ان میں سے بہت سے خدا کی کمی کا شکار ہیں۔ اس طرح کی خبر تو آدمی کو خاموش نہیں رہنے دیتی۔۔ ہے نا؟"

میں ابھی جواب دینے ہی۔ پایا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔

"ارے یہ اس وقت کون آن مرا" وان ہیورن نے کسی قدر ناراضگی سے کہا۔

اس نے دروازہ کھولا اور کسی کو اندر آنے کے لیے نہ کہا بلکہ خود دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا اور پھر سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے اس کے قدموں کی آواز بتدریج کم ہوتی گئی اور تھوڑی دیر بعد خاموشی سی چھا گئی اور پھر سیڑھیوں کے نیچے سے تند و تیز آوازیں سنائی دینے لگیں۔

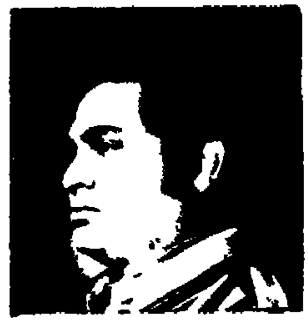
میں حیرت زدہ رہ گیا۔۔ کیا معاملہ ہو سکتا ہے؟

"وہ بہت بے شرم ہے" وان ہیورن کمرے میں داخل ہوتے وقت بڑبڑا رہا تھا۔ ایک شخص جس کا اخلاق سے کوئی واسطہ نہیں۔ جو بے کردار اور بے اصول ہے۔"

میں نے اسے بھڑاس نکالنے دی۔ یہ واضح تھا کہ جس شخص کے متعلق وہ ایسے کلمات ادا کر رہا تھا وہ اس کا وہی عمدہ لباس پہنے والا مشکوک انڈونیشین ملاقاتی تھا۔

"دیکھیں آپ ایسے شخص کے بارے میں کیا کہیں گے"۔۔۔ میں ۱۹۴۷ء میں انڈونیشیا میں پہلے نام نہاد پولیس ایکشن کے تھوڑی دیر بعد اسے جوبی نینش ضلع میں ملا تھا۔ انہی دنوں ایک ہفتے پہلے' میں اسے بھول نہیں۔ ہاں ایک ہفتے پیشتر جب مجھے جیل میں ڈالا گیا تھا وہ مجھے کسی "خدمت" کے بارے میں بتانے آیا تھا جو کہ اس نے اپنے لوگوں کے لیے سرانجام دی تھی۔"

۔۔ اس نے اپنی بات ختم کی تو صرف اسی وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ لفظ "خدمت" طنزیہ طور پر ادا



رشید افروز

پل دو پل موسم کی گل افشانی ہے
پھر منظر، پس منظر، سب ویرانی ہے

اک لایعنی ہنگامہ، اک خالی ضد
جس لمحہ تک سانسوں کی ارزانی ہے

جب مرکز سے اپنا رشتہ ٹوٹ گیا
حدِ نظر تک گرد ہے سب ویرانی ہے

ارض و سما کس حیرت سے منہ تکتے ہیں
کیا میں ایسا نقش ہوں جو لاثانی ہے

بیچ بھنور تک جا کر ہم نے دیکھ لیا
موت نہ ہو تو گھٹنوں تک سب پانی ہے

اے شہرِ امید! بتا اس بستی میں
کیا کوئی صورت جانی پہچانی ہے

آج میں اپنا عکس منور دیکھوں گا
آج تمہاری آنکھوں میں کچھ پانی ہے

۵۵۔ براہیما سوسائٹی، سرکھیز روڈ۔ احمد آباد

اسلامی ممالک کی کہانیاں

کر رہا تھا۔

"ایک پورا گاؤں راکھ کا ڈھیر بن گیا تھا۔ اور وہ تمام کے تمام پندرہ گوریلا سپاہی جو کہ ایک لانگ مارچ کے بعد کسی تانگے میں جتے ہوئے گھوڑے کی طرح تھک کر چور ہو چکے تھے زیج آرمی کا ہدف والے بن گئے۔ گھاؤ بہت گہرا تھا اور حملہ بالکل اچانک ہوا تھا۔ کوئی بھی نہ بچ سکا تمام کے تمام مارے گئے۔ یہ تھی اس آدمی کی "خدمت" جو اس نے اپنے ہم وطنوں کے لیے سرانجام دی۔"

یہ سب کچھ کہتے ہوئے وان بیورن سکون سے میں بیٹھ رہا وہ کھڑکی کی طرف گیا پائپ کو اس کھڑکی کی سل پر خالی کر کے وہ شیری کے گلاس بھرنے کے لیے دریسر کی طرف بڑھا اور پھر اپنی کرسی کی طرف واپس آ کر وہ اس کی سیٹ پر اپنا دایاں پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اور کیا آپ کو معلوم ہے" اس نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا "ایک اور موقع پر وہ مجھے یہ بتانے آیا کہ اسے اس کی "خدمت" کے عوض انعام کے طور پر ایک اچھی پوزیشن دلانے کا وعدہ کیا گیا تھا' میں مشکل ہی اس کی باتوں کا یقین کرتا تھا مگر اس کی کمائیاں مجھے بری لگتی تھیں" اور ان الفاظ کے ساتھ ہی وان بیورن نے نہایت شدت سے پائپ پینا شروع کر دیا حالانکہ اپنی باتوں کے دوران اس نے بہت کم پائپ اپنے ہونٹوں سے لگایا تھا۔

میں نے اس سے آج کے تازہ واقعے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

"کل اتفاق سے لیڈز پلین کے نزدیک ایک چھوٹے سے کیفے میں میری اس کی ملاقات ہو گئی تھی۔ معمول کے مطابق وہ اپنے کارناموں خصوصاً عورتوں کے بارے میں اپنے تعلقات کے افسانے سنا سنا کر بور کرتا رہا۔ میں اس حد تک اس سے نالاں ہو گیا کہ میں نے برملا اس سے کہہ دیا کہ میرے نزدیک اس کی وقعت ایک پیسہ جتنی بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ناراض ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج وہ مجھے یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ اگرچہ میں اسے بہت معمولی اور گھٹیا آدمی سمجھتا ہوں لیکن دوسرے لوگوں کے نزدیک وہ ایک معزز اور قابل فخر شخصیت تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے مجھے ایک ٹیلی گرام دکھایا جو کہ اس نے ابھی ابھی ڈاکخانے سے وصول کیا تھا۔ کتنی بدقسمتی کی بات ہے!"

وہ کس بات پر فخر کر رہا تھا؟" میں نے کسی قدر محظوظ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"اسے اس ٹیلی گرام کا فخر تھا جو اسے ملا تھا۔" "لیکن کیوں؟"

"آپ یقین نہیں کریں گے۔۔ یہ ٹیلی گرام اس کی سیاسی پارٹی کی طرف سے بھیجا گیا تھا جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ آئندہ ہونے والے الیکشن میں اسے پارلیمنٹ کی سیٹ کے لیے امیدوار نامزد کیا گیا۔"

"کیا؟" ———— "کیا آپ یقین کر سکتے ہیں؟"

میں نے حیرت زدہ ہو کر اپنا سر ہلایا۔ کچھ دیر اپنے خیالات میں گم رہ کر وان بیورن پھر بولا۔

"ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ ہمارا ملک ان جیسے لوگوں کی وجہ سے آنے والی تباہی سے محفوظ رہے گا۔۔ آپ کے ہم وطنوں کی مسرتوں کی خاطر.... اور" اس نے اپنے خیالات میں ایک بار پھر کھونے کے بعد کہا "خاص طور پر میرے ننھے بچے کے لیے"

میں یہ سن کر ششدر رہ گیا۔

"آپ کا لڑکا؟ کیا مطلب ہے آپ کا۔" ———— "ہاں میرا "کا۔۔ میرا بچہ!"

"آپ کا مطلب ہے کہ آپ ایک بچے کے باپ ہیں؟"

"ہاں میں ننھے جوزف کا باپ ہوں۔ وہاں اسے یوسف کہہ کر بلایا جاتا تھا۔ میری دعا ہے کہ وہ زندہ رہے۔۔" اور جب وہ پھر دریسر کی جانب گلاس بھرنے کے لیے گیا تو میں ابھی تک حیران تھا ——— وہ کہنے لگا۔

"اس کی ماں کا نام ستی تھا۔۔ نہایت اچھی دیہاتی لڑکی۔۔ اپنے گاؤں میں نہایت سادہ اور مخلص ——— اور اپنی معصومیت کے لحاظ سے نہایت خوش باش جیسے اس کی طرح کی اکثر پہاڑوں میں ہوتی ہیں یعنی ان پڑھ نوجوان عورتیں۔ وہ چائے کے باغ میں کام کر کے اپنی روزی کماتی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے جب میں اسے جیل میں پڑا تھا وہ ایک بم کا شکار ہو گئی۔" ——— "مار دی گئی؟"

[باقی صفحہ ۲۹ پر دیکھیے]

گلزار بخاری

درد بھی تجھ سے بہم ہو تو دوا جانتی ہے
خلقتِ شہر نجانے تجھے کیا جانتی ہے

تجھ سے ہم دادِ طلب کیا ہوں کہ شوخی تیری
سُرخیٔ خونِ تمنا کو حنا جانتی ہے

کیوں نہ آئے ترے کوچے سے معطر ہو کر
ہم ہیں خوشبو کے پرستار ہوا جانتی ہے

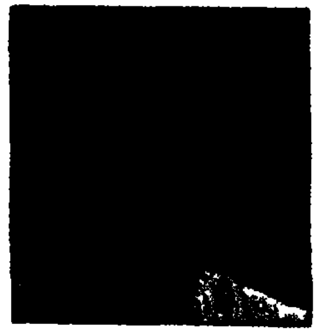
آئینے سے کوئی پوشیدہ نہیں رہ سکتا
کون کیا ہے تری محفل کی فضا جانتی ہے

ڈھونڈنے لگی ہیں رستہ نہ دکھا تو اس کو
شامِ غم ہجر نصیبوں کا پتہ جانتی ہے

ہم ہیں معتوب مگر یہ تو بتایا جائے
کون سی شرعِ محبت کو خطا جانتی ہے

اس کا انجام ہے ظاہر کہ یہ امت گلہ
چوبِ فرعون کو موسیٰ کا عصا جانتی ہے

۱۱۵۔ ڈی، انگوری باغ ——— لاہور



شبنم شکیل

جسم و جاں کی روشنی تو میری دشمن بن گئی
دوست ہو کر زندگی تو میری دشمن بن گئی

ایک پل میں مجھ سے مانگا لمحے لمحے کا حساب
ساعتِ خود آگہی تو میری دشمن بن گئی

زندگی بھر تو نے اپنے سحر میں رکھا اسیر
حسرت کی نیلم پری تو میری دشمن بن گئی

چھین لی اک چھب دکھا کر مجھ سے بینائی مری
عشق کی تابندگی تو میری دشمن بن گئی

دہر کی آسائشیں بے رنگ ہو کر رہ گئیں
روح کی آسودگی تو میری دشمن بن گئی

دوسروں کے واسطے کتنا لہو املا کیا
شاعری اے شاعری تو میری دشمن بن گئی

۹، اسٹریٹ نمبر ۲۱، الیف - ۳/۷، اسلام آباد، پاکستان

عراق

فواد تکرلی

محمود احمد قاضی

تنور

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ شروع میں میں نے سچ نہیں بولا۔ اگرچہ میں زیرِ حراست تھا مگر میں نے ایک ماہ سے زیادہ اسے چھپائے رکھا۔ عزت بڑی قیمتی چیز ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ کب سچ کو ظاہر کر دینا چاہیے۔

جناب والا! میں بے گناہ ہوں۔۔۔ میں نے اپنے بھائی عدل حمرہ کی بیوی فرح کو قتل کر دیا کیونکہ وہ بدکار تھی۔ میں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا اور پھر میں اپنی عرب روایت سے مغلوب ہو کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ پاک دامنی بہت قیمتی چیز ہے اور اس پر لگے دھبے کو خون ہی سے دھونے کا رواج ہے۔ اس لیے میں نے اپنی شکاری بندوق لوڈ کی جس کو آپ ملاحظہ کر چکے ہیں' اور اسے فوراً گولی مار دی۔ اگر آپ اس کے آشنا کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو مجھے شروع سے اس کہانی کو بیان کرنے کی اجازت دی جائے۔؟

جیسے کہ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں میں نے ان دونوں کو اکٹھے نہیں دیکھا۔ وہ صبح سویرے سرخ اور سفید رنگ کا جوڑا پہنے ہوئے ہمارا ناشتہ تیار کرنے کے لیے اپنے کمرے سے برآمد ہوئی تھی۔ وہ روٹی پکانے کی غرض سے تنور کو آگ دکھانے کے لیے اس کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے اطلاعاً" مجھے کہا کہ چونکہ وہ بدکاری کی مرتکب ہوئی ہے اس لیے وہ خود کو مار دینا چاہتی ہے۔ اس نے تنور میں آگ جلانی شروع کی اور یہ خودکشی کرنے کے لیے اس نے اس میں چند گولیاں پھینکنے کی تیاری کی۔ خون میری رگوں میں جوش مارنے لگا' میں نے رائفل اٹھائی' اس کا نشانہ لیا اور فائر کر کے اسے مار دیا۔ عزت بہت اصول ہوتی ہے۔ ہم سچے عرب ہیں اور ہم نے شرم کا داغ اپنے اوپر نہیں لگنے دیتے۔ بدکاروں کو عموماً" قتل کر دیا جاتا ہے کیونکہ گناہ گار ایک گندگی ہوتا ہے اس لیے اس گندگی کو دور کرنا ہی چاہیے۔ فرح نے خود تسلیم کیا تھا کہ اس نے اپنے شوہر کی گرفتاری کے بعد' اس کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رات کی تاریکی میں اپنے آشنا کو اپنے ساتھ سونے کے لیے کہا تھا۔ میں نے صرف اپنے خاندان کے ناموس کی حفاظت کی تھی۔ اس کا شوہر میرا بھائی ہے اور وہ میرا ہی عاصی ہے۔ اس نے اس برے کام کے لیے اپنے آشنا کو وقت دے کر اپنی جوانی اور خوبصورتی کا ناجائز استعمال کیا تھا۔ اس لیے کہ وہ شہد رنگ آنکھوں اور خوبصورت چہرے والی صرف بیس سال عورت ہے۔ اس طرح ہر چیز ختم ہو گئی۔

میری ماں حلیمہ نے کچھ نہیں دیکھا۔ میں خدا کی مقدس کتاب کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں۔۔۔۔ کہ وہ اس وقت میرے ساتھ تھی اور شریک جرم نہیں تھی۔ وہ گھر کے ایک دوسرے حصے میں تھی۔ میں اس معزز عدالت کی وضاحت کے لیے اپنے خاندانی معیار کے متعلق یہ کہنا چاہوں گا کہ ہم غریب لوگ ہیں اور کئی کمروں پر مشتمل ایک کچے مکان میں اکٹھے رہتے ہیں۔ میرے بھائی عدل حمرہ کا کمرہ مشرقی حصے میں ہے اور اس سے ملحق میری والدہ اور خاندان کے دوسرے لوگوں کے کمرے ہیں۔ میری شادی کو ہوئے دس سال ہو چکے ہیں۔ اور میں چار بچوں کا باپ ہوں۔ میں فوج میں تھا اور وہاں میں نے سرجنٹ کے عہدے تک ترقی پائی۔ میرے خلاف کبھی کوئی مقدمہ درج نہیں ہوا۔ تنور میری بہن حلیمہ کے کچے کمرے کے بالکل ساتھ صحن کے وسط میں واقع ہے۔ میں عدالت کے سامنے اس چیز کی وضاحت کرنا بھول گیا تھا۔

وقوعہ کے روز صبح کے وقت میری بہن نے مجھے جگایا۔ میں قطعی طور پر جاگا ہوا تھا اور مجھے اس بات



مہتاب حیدر نقوی

دنیا نہ سہی مجھ سے بغاوت ہو تمہاری
یہ کیا ہے کہ ہر ایک سے الفت ہو تمہاری

دل کہتا ہے دیکھو کوئی تصویر بناؤ
لیکن یہ ضروری نہیں صورت ہو تمہاری

ہم چاہتے ہیں رنج سفر کھینچنا اک بار
پھر اب نہ کسی موڑ پہ شرکت ہو تمہاری

اب ملنے بچھڑنے میں نہ راحت ہو نہ غم ہو
وہ دن بھی نہیں ہوں کہ ضرورت ہو تمہاری

آزاد ہوں ہم قید محبت سے کسی دن
لیکن یہ بھی ہو تو بدولت ہو تمہاری

● ۲۱۴/۴ حسن دالا صاحب باغ ۔ علی گڑھ

اسلامی ممالک کی کہانیاں

پر بھی یقین ہے کہ میری خالہ ثوریا نے جو میرے بھائی کی بیوی کے پاس تھی گولیوں کے چلنے کی وجہ دریافت کی تھی۔ میں معلوم کرنے گیا تو میں نے فرح کو تنور کے پاس گرے ہوئے پایا اور گولیاں آتش دان میں دھماکے سے پھٹ رہی تھیں۔ جناب والا یہ میرے اس شادی بیان کی مختصر سی روداد ہے جو آپ خود محسوس کر رہے ہیں کہ سچائی سے بہت دور ہے۔ میں نے ایسا بولنے سے کیا ہے جناب' معافی کر کے مجھے معاف کر دیجئے۔ ہم نے اپنے حواس کھو دیئے تھے اس لیے ہر طرح سے چشم پوشی برتی۔ بدقسمتی سے سچائی کو چھپایا یا دبایا نہیں جا سکتا۔ اس رات جب میں سویا ہوا تھا تو چار پانچ بجے کے قریب جب صبح ہونے والی تھی تو میری سن حلیمہ نے میرے کان میں یہ سرگوشی کرتے ہوئے مجھے جگا دیا کہ اس نے صحن میں کسی کو تیزی سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں اٹھ بیٹھا اور اپنے والدین کے کمرے کی طرف گیا' وہ ابھی سو رہے تھے پھر میں فرح کے کمرے کی جانب گیا' میں نے اسے اکیلی پایا۔ یہ بات بعد میں سامنے آئی کہ حلیمہ جو کہ سترہ سال کی ایک بے حد حساس لڑکی ہے' نے آپ کے سامنے حلف اٹھا کر کہا کہ اس نے فرح کو ایک اجنبی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے دیکھا تھا اور اس لیے وہ مجھے جگانے آئی تھی اور میں معاملے کی چھان بین کے لیے چل پڑا تھا۔ اس لمحے میں نے فرح کو تنور روشن کرتے ہوئے پایا تھا۔ یہ وہ حقائق ہیں۔ آسمان روشن ہو رہا تھا اور تنور سرخ بھڑے ہوئے شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ فرح نے میری طرف مڑے بغیر مجھے مخاطب کرتے ہوئے گناہ' عزت اور خودکشی کے بارے میں بات کی۔ میں الجھن میں مبتلا ہو گیا اور سخت طیش میں آ گیا۔ تیزی کے ساتھ میں نے رائفل حلیمہ کے ہاتھ سے چھینی اس کا رخ فرح کی طرف کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ اس کی لاش کے قریب پڑی پائی گئی اس شکاری رائفل سے صرف ایک فائر کیا گیا تھا۔ رائفل میں صرف ایک ہی گولی بھری تھی اور یہی وجہ ہے کہ یہی ایک گولی اس کے سر میں جا گھسی تھی' میں نے یہ محض خاندانی حرمت کو بچانے کے لیے کیا تھا۔ جناب والا میری درخواست ہے کہ' میری صورت حال کو سمجھتے ہوئے میرے خاندان کی حالت پر رحم کیا جائے۔ میں ایک کم پڑھا لکھا مسکین شخص ہوں اور ایک سابقہ سرجنٹ ہوں۔ میں نے اسے صرف اس لیے قتل کیا کہ وہ وفادار نہیں رہی تھی۔ آپ نے جان لیا ہے کہ اپنے اس گناہ کا اس نے میرے سامنے اعتراف کر لیا تھا' وہ تنور کے سامنے کھڑی اس کا اعلان کر رہی تھی اور ہم سب کی عزت پامال کر رہی تھی۔ ثوریا کا یہ بیان کہ وہ ساری رات اسی کمرے میں فرح کے ساتھ رہی تھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ غیرمتوازن شخصیت کی حامل ایک عورت ہے۔ اور پھر یہ کہ مرنے والی نے اپنے گناہ کا اعتراف میرے سامنے کر لیا تھا۔ مزید یہ کہ میری بہن حلیمہ نے اسے ایسی شرمناک حالت میں دیکھ لیا تھا جو قانون اور وقار کے منافی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کی غیرحاضری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس رات اپنے آشنا کے ساتھ یہ قبیح فعل سرانجام دیا۔ اس رات جب کہ ہم سب اپنے بھائی عدنان حمزہ کی طبعیت کے متعلق متفکر تھے اس نے اس مجرم کے ساتھ ملاقات کرنے کا منصوبہ بنانے کی جرات کی۔ میں کوئی اتنا زیادہ مذہب شخص نہیں ہوں بلکہ کسی حد تک ایک کھردرا رویہ رکھنے والا آدمی ہوں۔ میں اپنے مقام سے اچھی طرح واقف ہوں حالانکہ میں صرف تیس سال کا ہوں۔ میں نے فرح سے اچھی طرح سے اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ ایسی بدکاری کا یہ جرم ہمارے اہل خانہ میں سے کسی سے سرزد نہیں ہو سکتا۔ ہم قابل عزت اور قدامت پسند مرد ہیں' جو اس بے عزتی کو کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ میں نے ہر طرح سے اسے باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے خیالات اور تصورات سے دور رہتے ہوئے ایسی گھناؤنی تہمتیں لگانے سے باز رہے۔ لیکن وہ ایک دیوانے شخص کی طرح بے حس ہو چکی تھی۔ میں نے اسے اس امید کے ساتھ اس کے کمرے میں جانے دیا کہ شاید وہ اپنے رویے میں نرمی پیدا کر لے گی۔ جو کچھ ہوا تھا میں نے اس کے متعلق حلیمہ کو بتا دیا اور اس واقعے کو اپنے ذہن سے مٹا دیا۔ ابھی میں نے اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ میں نے ایک گولی چلنے کی آواز سنی۔ میں مدھم روشنی میں نہائے ہوئے صحن کی طرف گیا جہاں آتش دان سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ خالہ ثوریا نے مجھ سے گولی کی آواز اور فرح کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے بڑبڑاتے ہوئے اسے ایک طرف دھکیلا اور بھاگ کر اپنے بھائی کے کمرے کی طرف گیا جہاں میں نے ان دونوں کو اکٹھے دیکھا۔ وہ یا تو قتل کر دی گئی تھی یا اس نے خودکشی کر لی تھی۔ میں نے ریوالور لیا اور حلیمہ کے ساتھ اس کے کمرے میں



پنہاں

یہ کون مرے دل میں یہ کہتا ہے کہ میں ہوں
محسوس کروں اس کو تو لگتا ہے کہ میں ہوں

رستے کا مجھے ہوش نہ منزل کی خبر کچھ
طوفان میں اڑتا ہوا پتّا ہے کہ میں ہوں

طوفاں کوئی برباد کرے یوں نہ کسی کو
سیلاب میں ڈوبا ہوا رستہ ہے کہ میں ہوں

یادیں ہیں کہ رہ رہ کے سلگ اٹھتی ہیں اکثر
بادل کوئی تھم تھم کے برستا ہے کہ میں ہوں

آنسو کے سوا کچھ نہیں دامن کو میسّر
بچّہ کوئی غربت میں ترستا ہے کہ میں ہوں

● ڈی / ۲ بھایانی دلیوا اپارٹمنٹ بلاک ایم، نورتھ ناظم آباد ۔ کراچی

اسلامی ممالک کی کہانیاں

واپس آیا۔ میں ایک بار پھر سچائی سے ہٹ رہا ہوں۔ جناب والا یہ ہماری فطرت ہے ایسی فطرت جس کے آپ عادی نہیں اور نہ ہی اسے برداشت کر سکتے ہیں۔ ہم ایک نقطے پر مرتکز رہنے کے اہل ہی نہیں ہیں۔ ہم ایک موضوع کو شروع کرتے ہیں اور پھر درمیان ہی میں ہم کسی اور دلچسپ اور پرجوش واقع کی طرف ہو لیتے ہیں' اور پھر کسی ایسے تیسرے موضوع کی طرف رجوع کر لیتے ہیں' جو ہمارے دل کو بھاتا ہو۔ ہم تفاخر اور کھرد رے پن کے حامل ایسے لوگ ہیں جو امن کے ساتھ رہنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ہمارے متعلق بیان کی جانے والی اکثر کہانیاں بے بنیاد ہوتی ہیں۔ مزید یہ کہ میں ایسا بے گناہ شخص ہوں جیسا کہ میں نے کئی بار دہرایا ہے۔ میں نے کسی ایسے عزت دار شخص کی طرح اپنے وقار کو بچایا جس کے کہ میری طرح چار بچے ہوں اور اس پر ایک بڑے خاندان کا بوجھ ہو۔ وقار ناقابل تقسیم ہے چاہے اس کا تعلق مکاری سے ہو یا کسی سکینڈل سے۔ اپنی پاک دامنی کو برقرار رکھنا ہی ہمارا مقصد ہے اور ہم اپنے خون سے بھی اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ میں نے ایسا ہی کیا ہے۔ آپ کے سامنے اس پیچیدہ صورتحال کی وضاحت کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ میں ایک عام مرد ہوں۔ بہرحال یہ سب کچھ بہت سادہ ہے اور میں آپ کے سامنے حقیقت بیان کروں گا۔

ہمارا ایک خاندان ہے۔ میرا بھائی عبدل حمزہ اور اس کی مرحومہ بیوی گھر کے ایک حصے میں رہتے ہیں۔ اس سے اگلے حصے میں' میری ماں باپ' میں خود' میری بیوی اور چار بچے رہتے ہیں اور پھر کنوئیں کے ساتھ والے کمرے میں میری ماں کی بیٹی علیمہ رہتی ہے۔ تنور صحن کے درمیان میں واقع ہے۔ اس حادثے کے روز میرا بھائی گرفتار ہو گیا تھا۔ اس نے میری نصیحت کے برعکس زرعی اصلاحات کے قوانین کی خلاف ورزی کی تھی جس کے نتیجے میں وہ گرفتار ہو گیا تھا۔ خالہ ثوریا میری بھابھی کے ساتھ سونے کے لیے آئی....
سادہ اور واضح حقائق۔ یہ مرنے والی عورت کا آشنا چوری چھپے گھر میں داخل ہوا۔ صحیح وقت کا تو ہمیں علم نہیں شاید آدھی رات کے وقت یا اس سے کچھ بعد میں' بہرحال خاندانی وقار داؤ پر لگا دیا گیا۔ صبح ناشتے کے لیے روٹی وغیرہ پکانے تک حالات نارمل تھے۔ پھر وہ شرمناک حقائق اچانک سامنے آ گئے۔ فرح نے رات کو اپنے شوہر سے دھوکہ کیا تھا۔ صبح اٹھنے پر اس نے دوسروں کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے اپنے آپ کو یوں ظاہر کیا جیسے کہ کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن وہ اپنے جرم کو چھپا نہ سکی اور اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں اور بکھرے ہوئے بالوں کے ذریعے عمداً یہ ظاہر کیا کہ وہ اس گھر کی عزت کو بچانے کے لیے اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر لے گی۔ علیمہ نے سماعت حاضر حواسی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ اس نے اسے اپنے آشنا کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے بالکل برہنہ حالت میں دیکھا تھا۔ تلخ سچائی کو سامنے پا کر اور گھبراہٹ سے مغلوب ہو کر وہ اپنے منہ کو اپنے ہاتھ سے بند کئے ہوئے تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ میرے لیے اس بے عزتی کے داغ کو اس کے خون سے دھونے کے علاوہ چارۂ کار نہ تھا۔ جناب والا ہم ایسی حالتوں میں یہی کچھ کرتے ہیں۔ میں نے لباس پہنا اپنی شکاری رائفل اٹھائی اور اس کے پیچھے چلا آیا۔ جیسے کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ابھی صبح ہوئی ہی تھی اور وہ تنور میں آگ جلا رہی تھی۔ ہم وہاں اکیلے تھے اور اس نے واضح طور پر اپنے آپ کو ہلاک کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا کیونکہ وہ اس مکاری کی سزا سے بچنے کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ میرے پاس اسے اس رائفل سے قتل کرنے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا۔ بعد میں علیمہ نے نہایت عیاری سے کچھ گولیاں (رائفل کی گولیاں) تنور میں ڈال دیں جن کے پے در پے دھماکوں نے سارے گھر کو جگا دیا۔ جناب والا' یہی سچائی ہے۔ علیمہ کے خلاف لگائے گئے الزامات غلط اور بے بنیاد ہیں۔

ثوریا نے ساری رات فرح کے ساتھ رہنے سے متعلق جھوٹ بولا تھا اور یہ بھی جھوٹ کہا تھا کہ اس رات گھر میں کوئی داخل نہیں ہوا تھا اور کسی نے فرح کے ساتھ محبت بھرے لمحات نہیں گزارے تھے۔ اس سے پوچھا جائے کہ پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ اس نے صبح سویرے فرح کو بیدار ہوتے اور پاک دامن لوگوں کی طرف اسے بغور دیکھتے ہوئے پایا؟ کس نے اسے ناشتہ تیار کرنے' روٹی پکانے یا تنور گرم کرنے کو کہا تھا؟ اگر اس نے کسی درپردہ محرک کے بغیر اپنے شوہر کی غیرحاضری میں اپنے آپ یہ سب کچھ کیا تو پھر وہ

[باقی صفحہ ۲۹ پر دیکھئے]



اختر ضیائی

چہرے کی دھوپ زلف کے سائے سمٹ گئے
پل کی جھپک میں وصل کے ایام کٹ گئے

او مصلحت شناس تیرا کھل گیا بھرم!
لے ہم ہی تیری یاد کے رستے سے ہٹ گئے

پاسِ ادب کہ پاسِ مروت کہیں اسے،
اکثر لبوں تک آئے گلے اور پلٹ گئے

پائی نہ پھر بتوں نے وہ یکتائیِ الست
شکلوں میں بٹ گئے کبھی رنگوں میں بٹ گئے

گلشن میں چل گیا ہے بدلتی رُتوں کا سحر
نغمے اُبل پڑے کہیں ملبوس پھٹ گئے

گذری چمن سے موجِ صبا ناچتی ہوئی
کانٹے مچل کے دامنِ گل سے لپٹ گئے

اختر وہ شوقِ دید کی لذت وہ بے کلی!
آ کر گئے وہاں کبھی جا کر پلٹ گئے

13 E, HOS STREET
LONDON /17, 4SD (U.K)

مراکش

طاہر بن جلون

محمد عمر میمن

میں عرب ہوں یا میں مشتبہ ہوں

میرا نام محمد بوسعید (Bouchaid) ہے۔ میں کھڑکیوں کی صفائی کا کام کرتا ہوں۔ مراکش کا باشندہ ہوں، پولینڈ کا نہیں۔ ادھر ایک مدت سے بعض لوگ مجھے "محا" کہہ کر پکارتے ہیں، لیکن بعض دوسرے دلچسپ "بوش" کہہ کر ہنستے ہیں، اور مجھے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کیوں یہ میرے نام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ میرے نام میں کوئی بات مذاق کے قابل بھی ہو سکتی ہے۔ میں اوسط قد کا آدمی ہوں، رنگ سانولا ہے، بلکہ سیاہی مائل، اور میری داڑھی بھی ہے جس کے بال گھونگھریالے ہیں۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں، خود کو ہمیشہ فروتن بنا کر پیش کرتا ہوں جو عین حسب معمول ہے۔ میں عرب جو ٹھہرا، ایک نادار عرب، جو اپنے وطن سے دور ہے۔

میں ٹھیک ٹکسالی قسم کا بھی ہوں۔ میٹرو کے ہر آنے اور جانے والے دروازے پر میری باقاعدہ تلاشی لی جاتی ہے۔ بھیڑ میں میری شناخت کے واسطے ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی ہاتھ موجود ہوتا ہے، جیسے میرا ہر جگہ انتظار ہو رہا ہو۔ میں اس بات کا اس درجہ عادی ہو چلا ہوں کہ پولیس کے سامنے خود آپ اپنی نشاندہی کر دیتا ہوں، تاکہ وہ میری تلاشی لے لیں۔ میں سپاہیوں سے کہتا ہوں، "میں یہ رہا" اس پر بعضے بعضے مسکرا دیتے ہیں، بعض دوسرے وقان ہو جانے کا اشارہ کرتے ہیں۔ تلاشی کسی قسم کی ہو، شبہ ہمیشہ مجھی پر کیا جاتا ہے۔ اذیت ساری اس بات سے ہوتی ہے کہ تلاشی کے دوران میرے پاس سے کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہیں ہوتی، جس سے سپاہی اور جھنجھلا جاتے ہیں۔ انہیں اس بات پر تاؤ آتا ہے کہ وہ اپنا فرض بجا لا رہے ہیں، لیکن بے نتیجہ اور مجھے ان کی بیچارگی پر افسوس ہوتا ہے۔ تاہم میں صرف ان کو صحیح ثابت کرنے اور ان کی حمایت کی خاطر اب کوئی بم یا پستول لیے لیے پھرنے سے رہا کہ شام کو گھر لوٹیں تو یہ کہہ سکیں، "آخر کار پکڑ ہی لیا اس سور کا بچہ سوپر مارکیٹ میں بم لگانے جا رہا تھا اور راستے میں اسکول کے پھاٹک کے سامنے ہمارے بچوں کے ہاتھوں منشیات فروخت کرنے کی نیت بھی تھی۔ نا صاحب، نا۔ میں ان کا کھیل کھیلنے سے رہا، یہ مجھے نہیں بھاتا۔

خیر یہ سب ٹھیک، تاہم میرے معصوم ہونے کا کوئی مصرف بھی تو نہیں، نہ صاف ضمیر ہونے کا کوئی فائدہ۔ بعض اوقات مختلف شبہات مجھے چپ چپاتے آلیتے ہیں۔ میں اپنے آپ پر شک کرنے لگتا ہوں، اپنے گھر والوں، اپنے دوستوں، اور اپنے کاغذات پر۔ باہر جانے سے پہلے میں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی تلاشی لیتا ہوں افسوس! کوئی قابل گرفت چیز برآمد نہیں ہوتی۔ بس میٹرو کے چند استعمال شدہ ٹکٹ نکلتے ہیں، ایک رومال، اور کچھ سکے۔ میں اپنے گھنے بالوں میں انگلیاں پھراتا ہوں، بالکل جس طرح لوگ پھراتے ہیں۔ مجھے وہاں نہ کوئی چاقو ملتا ہے، نہ حشیش کا کوئی ڈلا۔ اس کے باوجود میں خود کو غیر مطمئن محسوس کرتا ہوں۔ چلتا ہوں تو یوں جیسے خود اپنے پر اعتماد نہ ہو۔ میں اپنے پر جتنا زیادہ شک کرتا ہوں، اتنا ہی زیادہ سپاہی اس سے آگے ہو جاتے ہیں، اور میرے شناختی کارڈ کی جانچ پڑتال کے لیے مجھے بار بار روکتے ہیں میرے سارے کاغذات درست نکلتے ہیں، اور نہیں تو کیا۔ مجھے ان کاغذات کو باقاعدہ اوپر نیچے پلاسٹک میں جڑوانا پڑا (laminate) کیونکہ کثرت استعمال سے ان کے پارہ پارہ ہو جانے کا خطرہ تھا۔ توبہ کیجیے! میں بیمار وبیمار ہرگز نہیں، میں تو بس ایک مثالی مشتبہ آدمی ہوں۔ ہر چیز میرے خلاف جاتی ہے۔ سارا دن کام کرنے کی وجہ سے مجھ پر کالک پت جاتی ہے۔ پیرس کی عمارتوں کی کھڑکیاں، سچ پوچھیے تو، نہایت گندی ہیں۔ آپ کو گمان گزر

اسلامی ممالک کی کہانیاں

لگتا ہے گویا میں سیدھا کسی کوڑے کے ڈھیر سے چلا آرہا ہوں، میرے کام کے کپڑوں کا ستیاناس ہوگیا ہے۔ میرا چہرہ بگڑا ہوا ہے اور میری آنکھیں تھکی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ، وہ داڑھی جو میں نے برسوں سے صرف کاہلی کے مارے بڑھا رکھی ہے، دیکھنے میں مجھے بیچ میں ایک، جیسا کہ وہ کہتی ہیں، "فنڈا مینٹلسٹ" بنا دیتی ہے۔ لوگ اکثر مجھ سے پوچھتے ہیں، "کیا تم فنڈا مینٹلسٹ ہو؟" یوں جیسے یہ کسی نسل یا قوم کا نام ہو۔ میں ان سے کہتا ہوں، "آپ کا مطلب ہے کہ مسلمان ہوں؟ جی ہاں، میں مسلمان ہوں۔" تاہم یار دوستوں کے ساتھ کبھی کبھار ایک آدھ جام شراب بھی چڑھا لیتا ہوں۔ سور نہیں کھاتا اور نماز پڑھنے بمشکل ہی کبھی مسجد جاتا ہوں۔ رمضان، بہرحال، ضرور مناتا ہوں، یہ دینی کام ہے۔ حتیٰ کہ میرے بچے بھی روزے رکھتے ہیں، کیونکہ اتنے بڑے ہوگئے ہیں کہ رکھ سکیں۔ روزے رکھنا فرض ہے، یہ ہمارا مذہب ہے، اس سے کسی کا کچھ بگڑ نہیں جاتا۔ میں روز نماز نہیں پڑھتا، لیکن رمضان میں روزے ضرور رکھتا ہوں۔ فرانس آنے سے پہلے مجھے معلوم تک نہ تھا کہ "فنڈا مینٹلسٹ" نام کا بھی کوئی لفظ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے، میں نے یہ لفظ سب سے پہلی بار ٹیلی ویژن پر سنا تھا۔"

تو کیا یہ لوگ مجھے اس لئے مشتبہ سمجھتے ہیں کہ میں مسلمان ہوں، یا اس لئے کہ میں دیکھنے میں اچھا نہیں لگتا؟ یہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ صرف انہیں خوف زدہ کرنے کے لئے ہی داڑھی رکھتے ہیں۔ کیا میرا چہرہ ڈراؤنا ہے؟ شاید ڈراؤنا ہی ہے، عجیب بات ہے، میں اپنا خاصا خیال رکھتا ہوں، اپنے حلیئے کو بہتر بنانے پر جتنی توجہ صرف کرتا ہوں، اتنا ہی پولیس والوں کے شک و شبہ کو ہوا دیتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں، "یہ آدمی دیکھنے میں اچھا نہیں لگتا۔" تو انہیں کس قسم کا آدمی دیکھنے میں اچھا لگتا ہے؟ خوش لباس سفید فام؟ اچھا نظر آنے کیلئے آدمی کی آنکھوں کو کس رنگ کا ہونا چاہیے؟

جب سے میرے ہم کاروں نے مجھے "موش" کہنا شروع کیا ہے، مجھے صرف اذیتوں ہی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ پرسوں ترسوں کی بات ہے، ایک سپاہی نے مجھ سے پوچھا، "کیوں بھئی، تم صدام کے فوجیوں دوجیوں میں سے تو نہیں ہو؟" میں نے جواب دیا کہ صدام اور میرے درمیان بس ایک مونچھ ہی تو مشترک ہے۔ اس پر ہم دونوں ہنس پڑے، لیکن بعد میں میں نے اس کے بارے میں غور سے سوچا۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد ہی جنگ چھڑ گئی۔ اب تو جناب میں واقعی خوف زدہ ہوگیا۔ بہت سے لوگوں کی طرح، میرا خیال بھی یہی تھا کہ جنگ ٹیلی ویژن پر واقع ہوگی۔ لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ جنگ تو جہاں ہم کام کرتے تھے، ٹھیک وہاں تک پہنچنے والی تھی۔ جس دن یہ شروع ہوئی، میں اس ٹولی میں شامل ہونے والا تھا جس کے ذمے مون پارناس (Montparnasse) کے ٹاور کی کھڑکیوں کی صفائی تھی۔ یہ کام بہت پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ ٹولی میں ہم آدمی شمالی افریقہ سے تھے، اور دو یورپی تھے ایک پرتگالی اور دوسرا فرانسیسی۔ فورمین نے مجھ سے اور میرے الجزائری ہم کار سے کہا، "نہیں، اس بار نہیں۔ اس بار دفتر پر ہی رہو۔ یہاں کرنے کو بہتیرا کام پڑا ہے۔ شاید ٹائیلٹ کی صفائی۔" میں ہونقا رہ گیا۔ خاص طور پر اس لئے کہ مارٹن (Martin) خاصا بھلا آدمی ہے لیکن اس صبح، اس کے انداز میں دور دور تک اچھائی کا نام نہیں تھا۔ یقیناً کوئی بات تھی جو وہ ہماری بہتری کر رہا تھا۔ لیکن ہم نے تو کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ میرے الجزائری جوڑی دار نے کہا، "دیکھا! جنگ تو بس اب شروع ہو رہی ہے۔"

وہ دن ہم دونوں نے یونہی بے مقصد گھومتے پھرتے گزارا، جنگ کے باعث ہماری روزی جاتی رہی تھی۔ میں تو یہ سوچے بیٹھا تھا کہ جنگ خلیج فارس میں ہو رہی ہے، لیکن یہاں ہمیں صدام حسین اور اسلام کے مخالف سمجھا جا رہا تھا، ہمارے ساتھ سرد مہری برتی جا رہی تھی، ہم پر جانے کس جرم کے ارتکاب کا شبہ کیا جا رہا تھا۔ شاید ہم دہشت پسند (Terrorist) ہیں اور اس سے آگاہ نہیں۔ شاید ہمیں کسی مہم پر بھیجا گیا ہے لیکن بعد یہ بات ہمارے علم میں لائے ہوئے۔

سرگردانی اور افسردگی کے ان لمحوں میں مجھے اپنے گاؤں کا خیال آیا۔ میرے تصور میں وہاں دھوپ نکلی ہوئی تھی، ہر طرف پھول کھلے ہوئے تھے اور شادابی لہلہا رہی تھی۔ سچ پوچھئے تو میرے گاؤں کا دھوپ سے سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ یہ ایک بنجر سے آب و گیاہ سی جگہ ہے۔ اسی لئے میں نے اسے چھوڑ



نیّر جہاں

مُدت بچھڑنے کی تھی اور نہ مِلاقات کا تھا
سانحہ یہ بھی عجب گردشِ حالات کا تھا

میرے پلنگ ہوں لہو اور ہوں ریزہ ریزہ
آئینہ اب کے جو ٹوٹا وہ مری ذات کا تھا

ہم تو ہر چال بہت سوچ سمجھ کر چلتے
دل کا پہلے سے ارادہ ہی مگر مات کا تھا

چھوڑ کر ہم کو چلا جانا کوئی بات نہ تھی
فیصلہ کا ہوکے رہا رنج اُسی بات کا تھا

ٹوٹ کر چھائی گھٹا پھوٹ کے روئے ہم بھی
لوگ سمجھے کہ تقاضا یہی برسات کا تھا

دستخط تھے مری بینائی پہ اُس کے نیّر
میں کیسے جانچتی ہر رنگ اُسی ذات کا تھا

721-HILL STREET, SUITE 111
SANTAMONICA, CA 90405 (U.S.A)

اسلامی ممالک کی کہانیاں

رہا ہے۔ تاہم اس کا بانداز دگر تصور کرنے میں مجھے فرحت کا احساس ہوا۔ ہر شے میں اپنا اندرونی حسن ہوتا ہے حتیٰ کہ پتھر بھی خوبصورت ہوتے ہیں۔ گاؤں دور ہے۔ بوس (boss) بیٹھا ٹیلی ویژن دیکھ رہا ہے۔ تصویر نہیں دکھائی دے رہی' بس آواز آرہی ہے' جو کہہ رہی ہے کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک طویل جنگ شروع ہو چکی ہے۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ برسرپیکار ہوں' لیکن یہ نہیں کہ کس کے خلاف۔ خوش قسمتی سے میری ہدایت کے لئے ٹیلی ویژن موجود ہے۔ مجھ سے کہا جاتا ہے کہ یہ حملہ ہے' غیر مومنوں پر اسلام کی فتح ہوگی...... پھر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ بعض عرب' بعض دوسرے عربوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ یہ سب دماغ چکرا دینے والی باتیں ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ معاہدے کی رو سے مجھے مون پارناس کے برج کی صفائی کرنی تھی' اور اب یوں سمجھیے گویا اصطلاحی معنوں میں بے روزگار ہوا بیٹھا ہوں۔

تو میں اپنے بچوں کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں۔ آج شام ان سے کیا کہوں گا؟ مثال کے طور پر' میں ان سے کہہ سکتا ہوں عربوں کا بھی اپنا زریں دور رہ چکا ہے کہ انہوں نے صفر کا تصور اور الجبرا ایجاد کیا' کہ انہوں نے یونانی فلسفے اور عظیم طبی دریافتوں سے عیسائی یورپ کو متعارف کرایا...... میں ان کے سامنے ایسے ہزاروں فرانسیسی لفظ دہراؤں گا جو عربی الاصل ہیں...... میں انہیں زریں ماضی' پھر شکست' مزید شکستوں' آزادی کی جنگوں کے بارے میں بتاؤں گا' اور پھر پسماندگی کے بارے میں' جو جونک کی طرح ہماری کھال سے چپک گئی ہے' اور یہ ناہنجار حال' یہ اتنا ناہنجار ہے کہ اسے خوابوں کا مواد فراہم کرنے سے بھی عاجز ہے...... وہ یقین نہیں کرنے کے' یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ یہ خیال کریں گے کہ میں محض ان کی تسلی کے لئے ایک عرب زریں دور ایجاد کر رہا ہوں۔ وہ اس کا مذاق اڑائیں گے۔

میرے بچے بالغ ہیں۔ کل تین ہیں' عمریں پندرہ سے بیس سال کے درمیان۔ میں جب ان سے عربی میں بات کرتا ہوں تو وہ فرانسیسی میں جواب دیتے ہیں۔ انہیں اپنے باپ پر فخر نہیں اور مجھے اس کی وجہ بھی معلوم ہے۔ وہ منہ سے تو کچھ نہیں کہتے' لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اگر باپ ایک کھڑکیاں صاف کرنے والا مزدور ہو' تو ایسے باپ پر بھلا کوئی کیسے فخر کر سکتا ہے۔ ہم آپس میں زیادہ بات چیت نہیں کرتے۔ جن دنوں وہ خالی ہوتے ہیں' اپنے یار دوستوں کے ساتھ نکل جاتے ہیں۔ میرا بمشکل ہی ان سے آمنا سامنا ہوتا ہے۔ آج شام وہ بیٹھے ٹیلی ویژن دیکھ رہے ہوں گے۔ مجھ میں گھر لوٹنے کا ذرا حوصلہ نہیں۔ یقیناً انہیں یہ بات بری لگتی ہوگی کہ میں' میں ہوں' اور وہ جو ہیں' اس کا ذمے دار۔ ایک دن سب سے چھوٹے بیٹے رشید نے بتایا کہ ایک بار کچھ عرب طالب علموں میں دنگا فساد ہوگیا تو اسکول کے منتظمین میں سے ایک نے کہا' تم کیڑے کوڑوں سے ہم جلد ہی اپنا پیچھا چھڑا لیں گے!" تو ہم کیڑے کوڑے ہیں؟ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ ہمارے لئے یہ فقرہ استعمال کرتے ہیں' گو مجھے معلوم ہے کہ ایک عرب کو "چھوٹا چوہا" کہہ کر پکارنے اور کسی عرب پر دھاوا بولنے کے لئے "چوہے کا شکار" کی اصطلاح استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ ہم نے خدا اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کیا برائی کی ہے جس کے بدلے میں ہمیں اس قسم کی زیادتیوں کا مستحق قرار دیا گیا ہے؟ شاید یہ ہماری قسمت کا لکھا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے ہم پیدا ہی ہجرت کرنے کے لئے ہوئے ہوں۔ کیا ہمارے رسول' محمدؐ سب سے پہلے اسلامی مہاجر نہیں تھے؟ مجھے پتا ہے کہ سنہ ۶۲۲ھ میں انہیں مکے سے نکل کر مدینے میں پناہ ڈھونڈنی پڑی تھی۔

اور اب کہ جنگ شروع ہو چکی ہے' ہماری کیا درگت بننے والی ہے؟ میں جانتا ہوں کہ لوگ مجھے اور زیادہ مشتبہ خیال کرنے لگیں گے' دن میں کئی کئی بار میری تلاشی لی جائے گی' اور میں بے چوں و چرا اس تلاشی کے لئے سرتسلیم خم کر دیا کروں گا' چلتے وقت اپنی نظریں نیچی رکھوں گا' اور کسی کے لئے ناگوار خاطر نہیں ہوں گا' میں اپنے کو معمول سے بھی زیادہ حقیر بنا لوں گا' اتنا حقیر کہ ایک بالکل ہی ناقابل لحاظ اور بمشکل ہی نظر میں آنے والی شے بن جاؤں گا' تاکہ پسپا کیا جاؤں' خاموش رہوں' ہر قسم کی ذلت برداشت کروں' اور نوبہ نو شکستوں کو قبول......

میں انہیں دل شکن خیالوں میں غرق بیٹھا تھا کہ مارتیں نے مجھ سے نوتردام (notre Dame) والی جماعت میں شامل ہونے کے لئے کہا۔ ہماری فرم مہینے میں ایک بار پیرس کے بڑے گرجا گھر نوتردام کی رنگین



انور ندیم

آنسو پونچھو، بات کرو، یہ کیسا رونا دھونا ہے
دنیا ایک کھلونا ہے اور پیار کا جادو ٹونا ہے

دیکھو پیارے! دنیا کو تم اپنی جیسی کرنے دو
لیکن اتنی بات سمجھ لو، کیا گذرا، کیا ہونا ہے

بوجھل زخمی روحیں شاید گذریں پھر ان راہوں سے
جن کا سایا جلدی پھیلے' ایسی فصلیں بونا ہے

جیون کے اس پار لگا ہے خوشیوں کا اک میلہ سا
کس نے کل یہ بات کہی تھی' جیون کو بس ڈھونا ہے

کس کی خاطر دوڑے بھاگے' تن پر ڈالی اتنی دھول
اس کو قسمت کہتے ہیں اب تیرا ساتھی ہونا ہے

آج یہاں تک کیسے پہنچے' دیر سے ہم کیوں بیٹھے ہیں
قسمت میں کیا لکھا ہے جو مسجد کا یہ کونا ہے

آدھی کچی عقلوں والے ہم سے اکثر کہتے ہیں
پیار سمجھ میں آتا کب ہے، جیون بھر کا رونا ہے

۲۹۱-۵ ویلی لین، نشاط گنج لکھنؤ ۲۲۶۰۰۰

بیٹھنے والی (stained glass) کھڑکیوں کی صفائی کرتی ہے۔ میں حیرت میں پڑ گیا' خیال آیا کہ جنگ ختم ہو چکی ہے؟ لیکن اس کے بارے میں بات کرنے کو میرا دل نہ چاہا' ظاہر ہے' فتح عیسائیوں ہی کی ہوئی ہوگی۔ مارتھیں نے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا' "تم اچھے آدمی ہو' میں تم پر بھروسہ کر سکتا ہوں۔ میں تمہیں جانتا ہوں تم اتنا پسندوں میں سے نہیں' تم بدمعاش نہیں!" میں ان کنڈ اور گول مول ستائشی فقروں کو لیا اور ندامت میں' جس میں صرف میں ہی اکیلا عرب تھا' بازار بھر سے شامل ہو گیا۔ راستے میں میں نے اپنے سے کہا' میں اچھا آدمی ہوں' کیونکہ یوں ایسا کہتا ہے۔ لیکن اگر میرے سر میں ہر چیز کو پاش پاش کر دینے کی سما جائے تو؟ اور اگر میں اپنے پر قابو نہ رکھ سکوں اور واقعی خرابی پر اتر آؤں تو؟ اور ہاں' یہ اچھا آدمی کیا ہوتا ہے؟ وہ جو اپنا سر جھکا کر چلتا ہے' اور دوسروں کو یہ اختیار دے دیتا ہے کہ جس طرح چاہیں اسے پامال کریں؟

ریڈیو کے مطابق—— میں ہمیشہ اپنے ساتھ ایک چھوٹے سائز کا ٹرانزسٹر رکھتا ہوں—— امریکی طیاروں سے کوئی اٹھارہ ہزار ٹن بم عراق پر گرائے۔ لیکن کتنی موتیں؟ اٹھارہ ہزار ٹن بم کتنوں کا قصہ پاک کرتے ہیں؟ یہ سب حال' انہوں نے ریڈیو پر نہیں بتایا۔ یقیناً اتنی بھاری تعداد ماری گئی ہوگی کہ انہوں نے انکشاف نہ کرنے میں ہی عافیت سمجھی ہو۔ میں عراقی نہیں' پھر بھی اس کا کچھ نہ کچھ اثر مجھ پر ضرور ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے میرے پیٹ میں کوئی درد یا کوئی بوجھ ہو۔ وہ جو بم کی زد میں آئے تھے عرب تھے' میرے جیسے مسلمان۔ حتیٰ کہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر کہا جاتا ہے کہ ہم جیت رہے ہیں۔ یہ امریکی بڑے زبردست واقع ہوئے ہیں۔ اوپر اپنے طیاروں میں بیٹھے بیٹھے ہی نیچے مینیکس کو تاڑ لیتے ہیں اور پھر انہیں ہم عمری مبارک سلامت بھیجتے ہیں۔ کیا تہذیب اسی کا نام ہے یہ ہمیں دکھاتے ہیں کہ جنگ کیسے لڑی جاتی ہے' کس طرح موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔

اس دن نوتردام میں بڑی زبردست بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ مرد اور عورت چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں سے مصروف عبادت تھے۔ وہ مکمل خاموشی میں جمع کھڑے تھے' اور خدا سے رحمت اور درگزر کی التجا کر رہے تھے۔ یہ منظر بڑا دلگداز تھا۔ میرا بھی دعا مانگنے کو جی چاہا لیکن مجھے اپنے کام پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ ریڈیو پر میزائلز اور اسرائیل کے بارے میں بہت کچھ کہا جا رہا تھا۔

اوپر اپنی مچان پر معلق میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ میں نے خدا اور اس کے رسول' محمدؐ کی دہائی دے کر التجا کی کہ وہ زمین پر امن و آشتی کی بادشاہت قائم کریں' کہ ہم عربوں کے ساتھ کچھ تو التفات کیا جائے' کہ ہمیں کچھ کم شک و شبہے کی نظر سے دیکھا جائے' اور محبت نہ سہی' کم از کم ہماری عزت تو کی جائے۔

چند دن بعد' میرا خیال ہے یہ یکم فروری تھی' میں ایک عدیم المثال سٹینڈ گلاس کھڑکی کی کسی صفائی کے مسالے سے جھاڑ پونچھ کر رہا تھا' اس تمام اثنا میرے کان ٹرانزسٹر پر لگے ہوئے تھے کہ میں نے یہ خبر سنی "صدر فرانسوا میتراں نے جمعرات' ۳۱ جنوری کو' ٹیلیفون پر Kfar - Hanan کی kibbutz کے ایک کاشتکار خاندان سے گفتگو کی۔ انہوں نے ملک کی حالت کے بارے میں پوچھا' اور اس آزمائش کے وقت میں یہودیوں کے ساتھ اپنی حمایت کا اظہار کیا۔" کھڑکی پر کام ختم کیے بغیر ہی' میں بڑی تیزی سے اپنی مچان سے اترا' اپنے ہم کاروں سے معذرت کی اور دیوانہ وار گھر دوڑا۔ ڈرائینگ روم میں آکر ٹھیک ٹیلیفون کے برابر بیٹھ گیا اور صدر (میتراں) کی کال کا انتظار کرنے لگا۔ *

بقیہ صفحہ ۱۹ وان بیورن اور دیہاتی لڑکی

"ہاں اسے ایک کتے کی طرح مار دیا گیا۔ اس کو دشمن کا ساتھی ہونے اور جاسوسی کرنے کے الزام میں یہ سزا دی گئی۔"

وان بیورن نے اپنا گلاس ختم کیا اور غالباً ایک بار پھر ان میٹھی اور تلخ یادوں میں کچھ لمحوں کے لیے کھو گیا' "لیکن حقیقت میں' اس کی آواز اب غم اور جذبات سے بھاری ہو چلی تھی۔ "کیا اس دیہاتی عورت کو انقلاب اور سیاست کے معنی آتے تھے؟ وہ اتنی سادہ تھی کہ وہ کسی جرم میں شریک ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ پارلیمنٹ کی سیٹ کی امیدوار بھی نہیں تھی۔ کیا وہ تھی؟ لیکن ہاں۔ میں بھول رہا ہوں' میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں۔ اس کا ایک بچہ تھا اور وہ میرا بچہ تھا۔ ایک دشمن کا بچہ——" *



دل نواز صدیقی

خیال سے تو ابتدا ہوئی ہے کائنات کی
عمل کی دسترس میں ہیں حدیں تخیلات کی

فقط عمل کی ایک بات کہ ہزار بات کی
رخِ حیات سے اٹھا رہا تو قعات کی

یہی تو اک دلیل ہے مریضِ نفسیات کی
عدو پہ ذمہ داریاں ہیں اپنی واجبات کی

سزا ہے کس گناہ کی کہ ایسے پاسباں ملے
جو دشمنوں سے مانگتے ہیں بھیک التفات کی

ہزار راستے ہیں یوں تو گمرہی کے واسطے
مگر صراطِ مستقیم ایک ہے نجات کی

510-RIDGEWOOD RD.
SHIPPINVILLE, PA 16254 (U.S.A)

شام

عارف الخوری

احمد صغیر صدیقی

کوہ زادہ

"مبایا" ایک چھوٹے سے خوبصورت شہر کا نام ہے جو ماؤنٹ ہرمون اور بحیرہ روم کے درمیان واقع تمام چھوٹے شہروں میں سب سے بڑا ہے۔ یہ شہر دریا کے ساحل کی دونوں ڈھلوانوں پر بسا ہوا ہے۔ یہاں کے مکانات سپید اور سرمئی پتھروں کے بنے ہوئے ہیں اور ان کی چھتیں اہراموں کی مانند ہیں۔ ہرے بھرے درختوں کے درمیان سے یہ جھانکتے مکانات بڑا ہی دل فریب منظر پیش کرتے ہیں۔ مبایا میں' قدیم صلیبی مجاہدوں کے قلعے کے بعد سب سے اہم عمارت یہاں کے کورٹ ہاؤس کی ہے' جسے ترکوں نے تعمیر کیا تھا۔ یہ شہر دوسری جنگ عظیم کے بعد عربوں کے قبضے میں اس وقت آیا جب شاہ فیصل کو شامی حکومت کا سربراہ بنایا گیا۔ ان دنوں یہ لبنانی حکومت کے پاس ہے۔

وہ ایک خوشگوار صبح تھی۔ دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور ہوا نیلے پہاڑوں میں سسک رہی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا جس کا نام قاصد تھا ایک نوعمر لڑکی' ہند نامی کے ساتھ اس کورٹ ہاؤس کے اونچے محرابی دروازے میں داخل ہوتا نظر آیا۔ دروازے کے دونوں جانب دو لبنانی سپاہی اپنے پیروں کو تھامے پتھریلے مجسموں کی مانند کھڑے ہوئے تھے۔

یہ دونوں گھریلو کھڈیوں پر بنے ہوئے کپڑے میں ملبوس تھے ان کے پیروں میں مقامی بناوٹ کے جوتے تھے جن کا رنگ سیاہ تھا۔ لڑکے کے بدن پر پڑی ہوئی سرخ عبا کے نیچے کالے کپڑے کی ایک کالردار صدری تھی اور سفید رنگ کی قمیض' اس نے اپنے سر سے بکرے کے بالوں سے بنی ہوئی GHOL باندھ رکھی تھی۔ اس نے ایک گھیردار پاجامہ پہن رکھا تھا جو پتلا تھا۔ ہند نامی لڑکی نے آنکھوں میں کاجل لگا رکھا تھا اور اس کے ہاتھ مہندی سے رنگے ہوئے تھے' سر سے پیر تک اس نے ایک سفید رنگ کی چادر بدن پر ڈال رکھی تھی جس کے نیچے اس نے ایک سیاہ کوٹ اور پتلا لباس پہن رکھا تھا۔

جیسے جیسے یہ نوجوان جوڑا آگے بڑھ رہا تھا ان کی آنکھیں اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کا جائزہ نظروں سے مشاہدہ کرتی جا رہی تھیں۔ خاموشی سے وہ کورٹ کے صحن کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں متعدد سپاہی دھوپ میں بیٹھے لطف اٹھا رہے تھے۔ جان بوجھ کر انھوں نے' ان کی طرف سے نگاہیں دوسری طرف گھما لیں کیونکہ وہ لوگ انھیں انسان کم اور جن زیادہ لگ رہے تھے۔ ان دونوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ دیوار پر انھوں نے ایک تختے سے پر لگی ایک اشتہار چسپاں دیکھے۔ قاصد نے بڑھ کر انہیں پڑھا اور پھر ہند کے پاس پلٹ آیا۔ پھر اس نے لڑکی کو اپنے پیچھے آنے کے لیے کہا۔ وہ دونوں راہداری کی طرف گئے۔ راہداری کے اختتام پر قاصد نے دائیں جانب چند دروازے دیکھے۔ اس نے ان پر لکھی عبارتیں پڑھیں۔ اسے پتہ چلا کہ ان میں سے کوئی بھی وہ آفس نہیں ہے جس کی اسے تلاش ہے۔ پھر وہ ان پیچ دار سیڑھیوں کی سمت بڑھا جو دوسری منزل کے لیے تھیں۔

قاصد نے حیرت سے ان بلند دیواروں کو دیکھا پھر سیڑھیوں کے قریب ٹھٹک گیا۔ بالآخر اسے پھر لڑکی کو پیچھے آنے کا اشارہ دیا اور بے چینی کی کیفیت میں اس نے پہلے زینے پر اپنا پیر رکھ کر چڑھنا شروع کیا۔ اس کے انداز سے دیہاتی پن نمایاں تھا۔ یہ جگہ اس کے لیے خاصی عجیب تھی۔ ہند اس کے پیچھے خاموشی سے چل رہی تھی۔ قاصد کبھی دیواروں کو دیکھتا تھا اور کبھی اِدھر اُدھر' اور کبھی عقب میں آتی ہند کو۔ بالآخر وہ ایک ایسے دروازے کے سامنے جا پہنچے جس پر کلرک کی تختی لگی ہوئی تھی۔ اس جگہ وہ دونوں رک گئے۔۔۔



حامد اقبال صدّیقی

کہا تھا کب رُخِ خاور مجھے عطا کردے
دعا تھی، میرا ہی پیکر مجھے عطا کردے

مرے نصیب کے موسم نہ دے مگر معبود
مرے مزاج کے منظر مجھے عطا کردے

میں کیسے مان لوں مرکز کسی بھی سورج کو
مرے ہی قلب کا محور مجھے عطا کردے

جسے بھی چاہا اسے پا نہیں سکا لیکن
اِک آس تجھ سے ہے تو گھر مجھے عطا کردے

ترے جہان کی وسعت سے کیا علاقہ مجھے
یہی بہت ہے کہ اک گھر مجھے عطا کردے

ترے ہی بس میں سب کچھ ہنر، خیال، نظر
تو ان دعاؤں سے بڑھ کر مجھے عطا کردے

حصارِ لفظ و معانی میں قید ہے دنیا
سخن کا اک نیا تیور مجھے عطا کردے

۲۰۲ - ۲۲۸ دیناناتھ بلڈنگ تیسرا منزلہ روم ۱۲ الائیڈ

ان کی آنکھیں کسی بلی کی آنکھوں کی طرح دروازے پر مرتکز تھیں جیسے شکار نظر آگیا ہو۔

"اندر چلو" قاصد نے ہاتھ کے اشارے سے ہند سے کہا۔

"تم چلو۔ تمہارے پاس ایک خنجر بھی ہے" ہند نے کہا۔

قاصد اپنی جگہ کھڑا رہا۔ ہند نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر بچوں کی طرح مسکرانے لگی۔ قاصد نے سر اس کے نزدیک کر لیا۔ تب لڑکی نے آواز نکالی۔ "اب کیا کیا جائے؟"

"پتا۔ مجھے نہیں معلوم" قاصد نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بے چارگی سے دیکھا۔ قاصد نے کلرک کے دروازے کی سمت ایک قدم بڑھایا۔ ہند نے بھی اس کے پیچھے حرکت کی۔ اس کے سرخ لبوں پر ایک مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ یکایک قاصد رک گیا۔ تھوڑا سا اس نے سوچا پھر وہیں زینے پر بیٹھ گیا۔ ہند بھی اسی کی طرح نزدیک ہی بیٹھ گئی۔ دونوں وہاں اس طرح بیٹھ گئے جیسے یہ زینہ ان کے اپنے گھر کا ہو۔

"آخر تم اندر کیوں نہیں جاتیں؟" قاصد نے اس سے پوچھا۔

"..... تم کیوں نہیں جاتے؟" لڑکی نے جواب دیا۔

قاصد نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اسی لمحے انہوں نے کسی کی چاپ سنی۔ کوئی سیڑھیوں کے اوپری حصے سے نیچے اتر رہا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ اس کی سمت دیکھا۔ ایک شخص، جس کے جسم پر یورپی انداز کا لباس تھا، نیچے آگیا۔ انہوں نے جلدی سے اس کی سمت سے گردن گھما لی۔

"تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟" آدمی نے دریافت کیا۔

انہوں نے جواب نہیں دیا بلکہ خوامخواہ مسکرا دیے۔ "میں پوچھ رہا ہوں تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" آدمی نے بے صبری سے پوچھا، تب وہ دونوں اٹھ پڑے۔

"ہم کمرے میں جانا چاہتے ہیں۔" قاصد نے کلرک کے دروازے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آؤ" آدمی نے مسکرا کر کہا۔ "میں ہی کلرک ہوں۔" اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ قاصد اور ہند اس کے پیچھے تھے۔

اندر پہنچ کر کلرک ایک بڑی سی میز کے پیچھے جا بیٹھا اور بولا "ہاں..... کیا کام ہے؟" اس نے کاروباری لہجے میں پوچھا۔

"ہمیں شادی کا اجازت نامہ چاہیے۔" قاصد نے اعلان کیا، اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا، ہند آہستہ سے کھکھلائی۔

کلرک مسکرانے لگا۔ اس نے دراز کھینچی وہاں سے اس نے ایک فارم برآمد کیا اور قاصد کو ہاتھ بڑھا کر تھماتے ہوئے اس نے کہا۔ "بھر دو اسے۔"

قاصد نے لرزتے ہاتھوں سے اسے لے لیا اور ہند کی طرف دیکھا۔ اس نے اسے آنے کا اشارہ کیا اور وہیں ایک دوسری میز کے قریب پڑی کرسی پر جا بیٹھا۔ وہیں قلمدان بھی رکھا ہوا تھا۔ قاصد نے فارم کو پڑھا پھر ہند سے کچھ پوچھے بغیر اسے بھرنے لگا۔ ہند اسے دیکھے جا رہی تھی اور مسکرائے جا رہی تھی۔ بالآخر فارغ ہو کر اٹھا، اس نے ہند کو پھر آنے کا اشارہ کیا اور کلرک کی سمت بڑھا۔ اس نے بھرا ہوا فارم کلرک کو دے دیا۔ کلرک، قاصد کا بھرا ہوا فارم پڑھنے لگا جو بھدی سی بچگانہ تحریر میں پر کیا گیا تھا۔ اس نے ان کے نام پتے، عمریں، شرائط، جائے پیدائش، ان کے والدین کے نام، ان کے پیشے، ان کے پتے اور تاریخ وغیرہ دیکھی، پھر اس نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"میرے بچے" کلرک نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "تم دونوں کی عمریں ابھی شادی کی نہیں ہوئی ہیں۔"

"اللہ اکبر" قاصد اور ہند دونوں نے ایک ساتھ کہا "کتنی عمر ہونی چاہیے ہماری؟" قاصد نے پوچھا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں اور بھنویں سکڑ گئی تھیں۔

کلرک نے اسے قانونی عمر سے آگاہ کیا۔



مشتاق شاد

رہ جاتا ہوں، میں بھول کے آتا نہیں خود کو
اٹھتا ہوں کہیں سے تو اٹھاتا نہیں خود کو
کھلتا ہوں تو ہر شخص کو لگ جاتی ہیں آنکھیں
چھپتا ہوں تو برسوں نظر آتا نہیں خود کو
کھڑکی میں کھڑا دیکھتا رہتا ہوں تماشا
میں گھر میں کئی روز بلاتا نہیں خود کو
رک کر مری آنکھوں میں جسے لوگ نہ دیکھیں
ایسا کوئی منظر ہی دکھاتا نہیں خود کو
حد یہ ہے کہ خود میں ہوں مری راہ میں حائل
اور اپنی ہی ٹھوکر سے بچاتا نہیں خود کو
پھیلا ہوں وہاں، خاک جہاں پھوٹ رہی ہو
زرخیز زمینوں میں اگاتا نہیں خود کو
ہوں اپنے ہی دروازے پہ زنجیر کی صورت
مشکل مری یہ ہے کہ ہلاتا نہیں خود کو
جتنا بھی ہوں، جیسا بھی ہوں، جو بھی ہوں، جہاں ہوں
اپنے قد و قامت سے بڑھاتا نہیں خود کو

POST BOX NO. 17246
RIYADH-11484 (SAUDI ARABIA)



مسرور عابدی

دیارِ یار کا برسوں طواف میں نے کیا
گناہ دل سے ہوا، اعتراف میں نے کیا

قرارداد پہ مجھکو بھی رائے کا حق تھا
برا نہ مانئے گر اختلاف میں نے کیا

وہ میرے قتل کی سازش میں ہو گیا ہے شریک
بڑے خلوص سے جس کو معاف میں نے کیا

رکاوٹوں ہی سے ہوتا ہے حوصلہ پیدا
فصیلِ تم نے بنائی شگاف میں نے کیا

برا میں کیسے ہوا، کون سی برائی کی
برائیوں سے اگر انحراف میں نے کیا

ستم رسیدہ وہاں کیوں زباں نہیں کھولی
جب احتجاج ستم کے خلاف میں نے کیا

لہولہان مرے پاؤں تو ہوئے لیکن
خوشی ہے راہ کو کانٹوں سے صاف میں نے کیا

POST BOX NO. 24327, SAFAT
ZIP-13104, KUWAIT (A.G)

"مانا ہماری عمر ابھی اتنی نہیں ہے مگر ہم لوگ شادی کرنا چاہتے ہیں۔" قاصد نے بحث کے انداز میں کہا۔

"اس صورت میں، تمہیں اپنے والدین سے فارم پر دستخط کرانے ہوں گے تبھی تمہیں اجازت نامہ مل سکے گا۔" کلرک نے اسے فارم تھماتے ہوئے کہا۔

"لیکن ہم لوگ یتیم ہیں ہمارے والدین فرانس کے خلاف بغاوت میں مارے جا چکے ہیں" قاصد نے دکھ بھرے لہجے میں اطلاع دی۔

"مجھے افسوس ہے۔" کلرک نے کہا۔ "پھر تو تمہیں انتظار کرنا ہو گا قانونی عمر ہونے تک۔"

قاصد کا چہرہ بگڑ گیا۔ اس نے ہند کی سمت بجھے ہوئے انداز سے دیکھا۔ لٹکے ہوئے چہرے کے ساتھ اس نے عجلت سے ہاتھ میں دبا فارم کلرک کو دے دیا، پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ خنجر کے دستے پر رکھا اور بائیں ہاتھ سے ہند کا بازو تھامتے ہوئے وہ کمرے سے باہر کی طرف چل دیا۔ چلتے ہوئے اس نے لڑکی کے کان میں آہستہ سے کہا۔ "اللہ نے تو اپنی کتاب میں ایسی کوئی بات نہیں کہی۔" *

بقیہ صفحہ ۱۲ ویگن میں

کو پانی کون پلائے گا۔ اس کا پیشاب پاخانہ کون صاف کرے گا۔ کہتی ہے اس بے چاری کو کیڑے پڑ جائیں گے۔"

کیشن ایجنٹ مٹھیاں بھینچ کر، ہاتھ کمر پر رکھے غصے سے لڑکی کی طرف گھورتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر نوجوان کے ہاتھ سے نوٹ اچک لیا۔ اپنے آپ سے بولا،

"انسان نہیں گوبر ہیں یہ لوگ... بھلے کی بات انہیں کہاں سمجھ آئے گی"

ایک دیہاتی مسافر جس کے ہاتھ میں بری طرح ٹھسا ہوا ایک بیگ پکڑا تھا، مٹی سے لت پت، تھکا ماندہ، سونڈی سی چال چلتا ہم سے رخصت ہوتے ہوئے بولا:

"درست بات ہے جناب، بھلے کی بات سمجھنا، دس لیرے دے کر گائے کے پہلو سے اس کی بچھڑی جدا کرو، پھر جا کر اسے کسی دوست اقربا کے ہاتھ بیچ دو کہ وہ اسے جیسے چاہیں استعمال کرتے رہیں، آفریں ہے بس تم پر سلوی بیٹی"

یوں لگتا تھا جیسے سلوی کے نین کے کانوں میں جڑے سرخ موتی حدت بھرے سورج کی دھوپ میں مسکرا رہے ہوں۔ *

بقیہ صفحہ ۲۲ تنور

علیمہ کے کمرے میں کیوں داخل ہوئی؟ حکہ ہمیشہ ہی ناشتہ تیار کرنے میں اس کی مدد کیا کرتی تھی۔

ثوریا کا یہ الزام کہ اس نے فرح کو ہماری طرف میری طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔۔۔ جھوٹ ہے۔۔۔ اور یہ کہ اس نے مرتے وقت کچھ غیرواضح سے لفظ بھی ادا کئے تھے۔۔۔ جھوٹ ہے۔۔۔ یہ دونوں باتیں جھوٹی ہیں۔ یہ سب کچھ نہایت احمقانہ ہے۔ میں نے فرح کو تنور کے پاس سے جہاں اس نے آپ کو ہلاک کیا تھا گھسیٹا، اسے گھسیٹ کر اس کے کمرے میں لایا اور اس کے بعد اس کے ساتھ والی پوزیشن پر واپس آ گیا۔ یہ صرف میں ہی جانتا ہوں کہ وہ کہاں گری تھی اور کہاں مری تھی۔

میڈیکل رپورٹ میں جو یہ کہا گیا ہے کہ فرح ریوالور کی ایک گولی سے مری تھی غلط ہے۔ میں نے زہر دیا تھا اور اس لیے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہتھیار کے بارے میں میں پوری طرح آگاہ تھا۔

علیمہ اس واقعے میں ملوث نہیں ہے... جو کچھ اس کے بارے میں کہا گیا ہے غلط ہے۔ میں استدعا کرتا ہوں کہ اسے اس جرم سے علیحدہ رکھا جائے۔ وہ کسی چیز کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ مجرم میں ہوں... اگر آپ جاننا چاہیں تو یہ میں ہوں جس نے اپنی عزت بچانے کے لیے اس بدکار کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا تھا۔ جناب والا، میں بے گناہ ہوں۔ آپ اپنا فیصلہ سناتے ہوئے مجھ پر رحم کریں۔ میں نے یہ قدم ایک نیک اور شاندار مقصد کے تحت کیا ہے۔ اس لیے انصاف سے کام لیں اور میری سزا کو نرم کر دیں۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو میری غیرحاضری پر افسوس کریں گے۔ یقین کریں... یہ میری شامت اعمال ہے یہ حق ہے اور سچ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے!!" *

ورقِ تازہ (ادبی سہ ماہی)

بھمنی (مہاراشٹر) سے شائع ہونے والا یہ سہ ماہی ادبی کتابی سلسلہ۔ اپنے دوسرے شمارے سے ہی تب روشن خرام نے ہونے والے رسالے کے مرتب محمد قمر ہیں

"مثبت فکر جدید کا عہد نامہ" اور رسالے کے مدیران نے کوشش کی ہے کہ غیر جانب دار ہو کر تمام اہم قلمکاروں کے ذریعے جو لکھا جاتا ہے وہ پیش کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ رسالے کو صرف شعر و ادب تک محدود نہیں رکھا گیا ہے بلکہ اسے سیاسی، سماجی، تہذیبی، مذہبی اور دیگر فنون سے بھی سجانے کی سعی کی گئی ہے۔ رسالے کے مقالات ۲ باب ۶ مضامین سے مرتب ہے اور اس میں سیاست، مذہب اور فلسفہ بھی مضامین ہیں۔ ۴ افسانے ۳ شعرا کی منظومات، تبصرے اور خطوط۔ کسی بھی نئے ادبی رسالے کی اشاعت ہو اسکے اچھے مستقبل کے خواب بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ جتنے اچھے اور زیادہ ادبی رسائل شائع ہوں گے اتنی ہی زبان و ادب کو فروغ حاصل ہوگا۔ ورقِ تازہ سے بھی امیدیں کی جا سکتی ہیں۔ مدیر: ادیب اختر (افسانہ نگار) ترتیب: عبدالسلام ادریس بقیمی اور منیجنگ ایڈیٹر محمد قمر سال اول شمارہ نمبر ۲ جولائی ۱۹۹۳

★ ضخامت ۸۰ صفحات ★ فی شمارہ ۱۲ روپے، سالانہ چالیس روپے ★ رابطہ: فسانہ منزل، یوسف کالونی، دوانگی روڈ، بھمنی ۴۲۱۳۰۲ (مہاراشٹر)

خرام (کرم ہواسر)

شاعر کے خصوصی شمارے "ہوا، کھنگ لہجے" کے بعد ادبی جریدہ "خرام (کانپور)" نے اپنا ضخیم نمبر اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اپنے موضوع پر یہ ایک دستاویزی دستخط ہے جو ہندوستان میں فرقہ واریت کے خلاف بطور احتجاج اردو قلمکاروں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ سانحہ بابری مسجد اور اسکے بعد ملک میں پھوٹ پڑنے والے فسادات نے ہندوستانی ذہن کو بے طرح جھنجھوڑ دیا جس کا حوالہ کسی بھی ملک سے وابستہ ہوں، بیچ پڑے، خرام کا کرم ہواسر ایک بروقت تخلیقی پیش ہے۔ جس میں احتجاج ہے احتجاج ہے۔ سب ملا کرب ہے مگر خواہ آپ میں ایک قوت بھی ملتی ہے اسکی بھی۔ حسن ہونے والی کوئی تسلسل ہے اور تیز تر ہے۔ مذکورہ خاص نمبر میں ۳۲ افسانے، ۴۴ غزلیں، ستر (۷۰) نظمیں اور ۷۵ قلمکاروں کی تعداد شامل ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں پیش آنے والے اندوہناک واقعہ سے نسلوں نسلوں یاد رہے گا اس واقعے کی اہم روایات کے ذیل میں جب بھی شعر و ادب کے کردار کی بات ہوگی۔ خرام کا کرم ہواسر موضوع بحث بنے گا۔ یہ ایک اہم پیش رفت ہے

ضخامت ۲۴۴ صفحات ★ قیمت ۵۰ روپے ★ مطبوعہ مئی ۱۹۹۳ ★

پتہ: ماہنامہ خرام، ۸۸/۲۸۸، ابراہیم آباد، پوسٹ بکس نمبر ۲۴۳، کانپور (یوپی)

دوپہر کا سفر

معروف شاعرہ ملک نسیم کا یہ اولیں شعری مجموعہ ہے۔ اس میں ۲۱ غزلیں، ۱۷ نظمیں اور ۲۸ متفرق شعر شامل ہیں۔ تین مختصر آرا (سردار جعفری، قمر سعیدی اور مجروح سلطانپوری) پیش لفظ (اختر سعید خاں) اور مصنفہ کی شاعرانہ تحریر "دام ہر موج" میں ہے، شامل ہے۔ ملک نسیم ادبی رسائل میں کم ہی شائع ہوتی ہیں۔ لیکن نہیں مشاعروں کے ذریعے یا وہ شہرت ملی مگر ان ۲ شعرا میں مشاعرات میں نہیں ہوتا جو دلی زدہ اردو مشاعروں میں ملک اور بیرون ملک نظر آتی ہیں۔ ملک نسیم کا تمام شعری اور دس سال کا اثاثہ ہے لیکن انتخاب میں کیا شعری قد بنتا ہے اس کا تعین ہونا باقی ہے۔ مگر یہ طے ہے کہ ہندوستان میں اردو شاعرات کی تاریخ اور ہمی شاعری کے ذیل میں ملک نسیم کا نام ضرور لیا جائے گا۔ اور وہ ہر اچھے اور معیاری انتخابات میں شامل رہیں گی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ شعر گوئی کے ساتھ عصری ادب اور اس کے مسائل پر نگاہ بھی رکھتی ہیں۔ گفتگو کرتی ہیں۔ بحث میں حصہ لیتی ہیں اور برملا تنقیدی اظہار بھی کرتی ہیں۔ "دوپہر کا سفر" میں شاعرہ کی خود کلامی بھی ہے اور مکالمہ بھی۔ خواب بھی خواب "زندگی کی تیسرا سلسلہ" کی خوبصورت شعر تخلیق کر دیا گیا ہے اور متاثر کرتا ہے۔ ملک نسیم کے یہاں فکری افق بتدریج روشن ہے۔

★ ضخامت ۱۳۶ صفحات ★ قیمت ساٹھ روپے ★ مطبوعہ ۱۹۹۳ ★

پتہ: ایف ۳۰ ٹورسٹ کالونی چار املی بھوپال ۴۶۲۰۱۶

محرابیں (کتابی سلسلہ)

منتخب غیر مطبوعہ ادبی تحریروں کو سہیل احمد خاں نے ترتیب دیا ہے۔ اس کتابی سلسلے کے مندرجات معیاری مضامین نثر و نظم سے مزین ہوتے ہیں۔ ممتاز شیریں کے خطوط، شاہد حمید کے نام، محمد سلیم الرحمان۔ انتظار حسین کا افسانہ، یاسر جواد، مظفر علی سید کا فکر انگیز مضمون "انتظار ستاں" انتظار حسین کے فکر و فن پر انکے کلیات "خیمہ کہانیاں" کے حوالے سے ہے۔ ممتاز نقاد اور دانشور مظفر علی سید کا دوسرا مضمون "رقص بلک میں مصوری" پاکستان کے معروف مصور اعجاز الحسن کی انگریزی کتاب PAINTING IN PAKISTAN پر تفصیلی تبصرہ ہے۔ اپنے موضوع پر یہ گرانقدر تحقیقی کتاب ہے۔ ناصر کاظمی کے شعری مجموعے "پہلی بارش" پر محمد سلیم الرحمان کا خوب صورت تبصرہ و تجزیہ اور سعر کی ۳ طویل مختصر نظمیں۔ صلاح الدین محمود کی پانچ نظمیں، جاوید شاہین کی تین نظمیں، عبدالرشید، غلام حسین ساجد، سید سجاد احمد بخاری، اور ڈاکٹر طارق فرید کی نظمیں قابل توجہ ہیں۔ حسن منظر کا افسانہ، مظفر اقبال کے ناول کا باب، غلام جیلانی کا ڈرامہ۔ نیز مسعود کے افسانوں کا مجموعہ عطر کافور پر سہیل احمد خاں کا معنی خیز طویل تبصرہ نما مضمون۔ نیر مسعود سے آصف فرخی کا بے حد دلچسپ اور بحث طلب طویل انٹرویو، فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں کے متعلق تحقیقی نوٹ ہے۔ آصف فرخی کا ایک دلچسپ تجزیاتی مضمون، ناصر کاظمی، اکرم رومانی، احمد مشتاق، جاوید شاہین، سلیم شاہد، اسلم انصاری، غلام حسین ساجد، محمد بخاری، آفتاب حسین جیسے شاہد اور عباس تابش کی غزلیں۔ یورپ کے شاعروں کی نظموں کا ترجمہ اور تعارف آصف فرخی کا گلبرٹ کی کتاب "شعر و پارہ" دس نظموں کا ترجمہ سعادت سعید نے عمدگی سے کیا ہے۔

★ ضخامت ۲۸۴ صفحات، کمپیوٹر کمپوزنگ ★ قیمت ۹۰ روپے

★ مطبوعہ ۱۹۹۳ ★ رابطہ: پولیمر پبلی کیشنز، راحت مارکیٹ، اردو بازار لاہور (پاکستان)

علم و ادب (ششماہی)

بہار کے ایک دور افتادہ علاقے سے ایک معیاری رسالے کا دوسرا شمارہ شائع ہو گیا ہے۔ کتابی سائز کے اس رسالے کی کثرت طباعت نثری و شعری ادب اور ترتیب ہر میں ایک سلیقہ ہے۔ ترتیبی حسن ہے۔ کسی اچھی کتاب یا رسالے کی خوشبو ہے۔ اور رسالہ ان تمام اوصاف کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ زیر نظر شمارے میں مہمان اداریہ (عبدالمغنی) تیرہ تنقیدی مضامین، ۹ شعرا کی ۲ نظمیں، ۳ افسانے، ۲۰ شعرا کی غزلیں، ایک انشائیہ، ۲ کتابوں پر تفصیلی تبصرے، اور مکتوبات کے تحت ۳ خطوط۔ ۹۶ صفحات میں ان سب کی سمائی ۶۰ روپے فی شمارہ مناسب ہے۔ ★ زر سالانہ دس روپے ★ سو روپے شمارہ، جنوری جولائی ۱۹۹۳ شمارہ نمبر ۲ ★ چیف ایڈیٹر: چودھری حسان الرسال ★ ایڈیٹر: طارق متین ★ رابطہ: علم و ادب، ڈاکخانہ ٹکھیا، سینکو سرائے (بہار) ۸۵۴۳۳۸

آہنگِ کیف

کیف بھوپالی (پ ۲۰ فروری ۱۹۱۷ء — م ۲۴ جولائی ۱۹۹۱ء) اردو مشاعروں کے مقبول ترین شاعر تھے۔ مگر محض مشاعروں ہی سے ان کی شہرت نہیں تھی۔ بلکہ فطری شاعر کی حیثیت سے ان کا کلام ادبی رسائل و جرائد میں بھی شائع ہوتا رہا ہے۔ دراصل مرحوم سراپا شاعر تھے جہاں رہے، جن لوگوں میں رہے گرمی محفل رہے، بے حد حساس طبیعت، چھوٹوں سے شفقت اور بزرگوں کا احترام کرنے والے۔ عمر بھر کے لوگوں کو اپنا گرویدہ کیا اور بے نیاز رہے۔ زیر نظر مجموعہ ان کی نظموں اور غزلوں کا کلیات ہے۔ اس خوبصورت کلیات کو اردو زبان و ادب کے درد مند اور خادم سلیم جعفری (دبئی عرب امارات) کے تعاون سے نانی انیس دہلوی نے شائع کیا ہے۔ کتاب کا پیش لفظ اختر سعید خاں نے تحریر کیا ہے اور کیف مرحوم کی شخصیت و فن پر عبدالحی نے لکھا ہے کتابت، طباعت، کاغذ، گٹ اپ، معصوم خوبصورت سرورق سب کے اعلیٰ درجے کا۔

★ ضخامت ۴۸۲ صفحات ★ قیمت سو روپے ★ مطبوعہ ۱۹۹۳ء ★

تقسیم کار: ملک نیوز ایجنسی (امارات) پوسٹ بکس نمبر ۵۳۳۹ دبئی یو اے ای؛ آفاقات دہلوی، دریا گنج، ۲۸۹۶۰۶ ترکمان گیٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ — ہوم ریزن کیف بھوپالی ۷۸، محلہ بڈر شاہجہاں آباد بھوپال (ایم پی) — انٹرنیشنل پبلشنگ ہاؤس — ۲۸۰۸ کوچہ چیلان کھاری باؤلی دہلی — ۱۱۰۰۰۶

مکتوبات

★ **آغا افضال مرزا** ـــــ ۱۳/۱۴ اکبر پیلس، مکری بخشی روڈ، ناگپور

آپ شاعر کے ہر شمارے کو نئی جہتوں کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ اس سے آپ کے ذہنی آفاق اور وسیع تر وژن کا پتہ چلتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ آپ کی تحریروں، شاعری اور 'شاعر' کے انداز پیش کش سے تو نمایاں ہے۔ مگر مندرجات و اوراق سے کم ہے۔ 'شاعر' ہو یا دیگر ادبی رسائل، ادبی رفتار زندگی اور عالمی سطح پر ہونے والے ہمہ وقت تغیر و تبدل کے مظہر نہیں۔ عمومی طور پر اردو میں دانشوری نہیں کے برابر ہے۔ جو ہیں وہ مغربی ادب اور مغربی تنقید کی جگالی میں مصروف ہیں بغیر کسی سیاق و سباق کے اپنے مفید مطلب تبدیلیوں کے ساتھ۔ مجھے آپ کی تڑپ، جس کا احساس 'شاعر' اور آپ کے خطوں سے ہوتا رہتا ہے آپ اپنے رسالے میں جن تبدیلیوں کے خواہاں ہیں اور اسے زیادہ سے زیادہ LIVELY بنانے کے لئے میرے ساتھ مکالمہ کر رہے ہیں۔ اس نے مجھے بھی بہت کچھ سوچنے اور لکھنے کا حوصلہ دیا ہے۔ تحریک دی ہے۔ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ادبا، شعرا، دانشوروں، خصوصاً انگریزی اخبارات و رسائل کے صحافی اور اہل قلم دانشوروں سے رابطہ ہونے میں مجھے بھی ذریعہ بنا رہے ہیں۔ اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے اپنی کوششوں کو شاعر کے لئے وقف کروں گا۔ کیوں کہ 'شاعر' ایک پوری روایت کا نام ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کا ایک باب ہے۔ ابھی اردو والوں نے اپنی اس عظیم روایت کا احساس نہیں کیا ہے اور بہت سارے غیر ضروری کاموں میں مصروف ہیں۔ شخصی اور اجتماعی، دونوں سطحوں پر۔ میں شاعر کے بارے میں اور اس کے خاص نمبروں کے متعلق انگریزی اخبارات میں لکھوں گا۔ 'اسٹیٹسمین' کے منیجنگ ڈائرکٹر سے میری گفتگو ہو چکی ہے۔ وہ خود بہت شاندار لکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں SATIRE سے بھرپور ہوتی ہیں۔ اردو کے مسائل پر آپ کے اداریے بلا مبالغہ بنیادی اور ضروری ہوتے ہیں۔ مگر اردو والے جب خود ہی سنجیدہ نہ ہوں تو کیا کیا جائے۔ اردو ہندی پر میں ایک تفصیلی مضمون 'شاعر' کے لئے لکھنا چاہتا ہوں۔ بالکل نئے انداز سے UNIQUE اور NOVEL بالکل نئے تناظر، نئے APPROACHES اور اردو کی حق تلفیوں کو قطعی سرد مہری اور غیر جذباتی طور پر پیش کیا جائے گا۔ نئے انکشافات کے ساتھ CONSTITUENT ASSAMBLY میں حسرت موہانی نے بھری اسمبلی میں [illegible] کے نور [illegible] نہرو اور امبیڈکر کے سامنے یہ کہا کہ یو پی گورنمنٹ یہ کہتی ہے کہ WE WILL WIPE OUT URDU FROM THE FACE OF EARTH میں [illegible] حوالوں کے ساتھ لکھوں گا۔ اردو کے متعلق آپ کے [illegible] کے بہت سارے خدشات کو اجاگر کروں گا۔ اردو والوں کی [illegible] کمزوریوں کی نشاندہی کروں گا۔ یہ [illegible] اہم ترین ماخذ [illegible] میں آپ کے اس خیال سے متفق ہوں کہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے دانشور اہل قلم کے انٹرویوز شاعر میں دیئے جائیں۔ انگریزی میں لئے انٹرویوز کو اردو میں منتقل کیا جائے۔ انگریزی و بنگالی کے لئے میری خدمات آپ کے لئے ہیں۔ کسی بھی زبان کا شعر و ادب اس زبان کے کلچر سے نمو پاتا ہے۔ زبان کا کلچر، جغرافیائی اور تہذیبی کلچر سے تشکیل پاتا ہے۔ ایک عمومی عصری سماج کی وہ حرکتیں اپنی نئی تفہیم کے ساتھ فنی پیکروں میں خلق ہوتی رہتی ہیں۔ ادب سیاست سے الگ ہے مگر اسی کے نفوذ سے بھی الگ نہیں۔ [illegible] ایک الگ مگر اہم پہلو فنی زمان بحث طلب موضوع ہے۔ آپ اس کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ گفتگو کر رہے ہیں۔ آپ کے اداریے آپ کی سوچ کی غمازی کر رہے ہیں۔ نئی نفسیات، نئی شعری کائنات میں آپ نے بہت سارے سلجھانے والے مباحث کو جس اختصار کے ساتھ سمو دیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ نیاز فتح پوری کا نگار اسکی فہرست مضامین ان کے اپنے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ موضوعات بالکل مختلف۔ آپ نئی اچھی نثر اور نظم دونوں لکھ لیتے ہیں۔ اگر معیاری مواد نہ ملے تو ساری فہرست مضامین نظم اور غزل کے حصے کو نگار کی طرح اختر امام صدیقی کے نام و انکار سے بھر دیجئے۔ نگار میں کبھی کسی باہر کا ایک بھی نام نہیں ہوتا تھا۔ لیکن موضوعات و مضامین میں تنوع ہوتا تھا۔ خود آپ کے دادا مرحوم سیماب اکبرآبادی کا رسالہ شاعر اسکی روشن مثال ہے۔

نگار اور شاعر میں یہ صورت تھی کہ سیاست، سائنس، آرٹ، کلچر، مذہب، موسیقی، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ پر مضامین آتے تھے۔ آپ تو خود بھی موسیقی، فلسفہ اور آرٹ کے آدمی ہیں۔ شاعر کی انفرادیت کو اور نمایاں کیجئے۔ اردو میں لکھنے والوں کی کمی ہے۔ خصوصی عنوانات پر لکھنے والے تو برائے نام ہیں۔ آپ کا سوچنا بالکل صحیح ہے۔ دوسری زبانوں کے لکھنے والوں کے تعاون سے نئے موضوعات پر نیا مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال باتیں اور مسائل بے شمار ہیں۔ آپ کے 'معاصر اردو ادب نمبر' سے خاصی توقعات ہیں۔ ادبی رسائل میں شاعر میں بھی تازہ کاری ہے۔ جسے آپ مزید تازہ کار بنانا چاہتے ہیں۔ میرا ہر ممکنہ تعاون آپ کے ساتھ ہے۔ نئی نسل میں آپ اپنی سی تخلیقی تحرک، ایک نیا عصری شعور پیدا کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ یہ بہت غیر جانبدار ہو کر کھلے ذہن کے ساتھ۔ اس کی مثالیں اردو میں کم کم ہیں۔ آپ شاعر کو اردو کا عالمی معیاری ادبی جریدہ بنانے کے جو خواب بن رہے ہیں۔ اس کی تعبیریں ضرور ملیں گی۔

★ **سلیم شہزاد** ـــــ ۳۴۴ سنگم اردو وارڈ، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳

شاعر کا تازہ شمارہ نیر مسعود کے افسانے 'بربہ' کی اشاعت سے وقیع تر ہو گیا ہے۔ اس میں افسانہ نگار کی مخصوص انفرادیت ان کے دوسرے افسانوں کی طرح پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ جدید افسانے کی تکرار زدہ صورت حال میں نیر مسعود کا دم غنیمت ہے کہ انہوں نے اپنے مخصوص افسانوی بیانیہ اسلوب کو اس مقام تک پہنچا دیا ہے۔ جہاں مقلدین کے پاؤں یقینی ہے کہ ڈگمگا جائیں گے۔ اگرچہ نیر مسعود کی تمام تخلیقات کا مطالعہ خود انہیں کے یہاں اسلوب اور طریق کار کی تکرار کی مثال پیش کرتا ہے۔ (اس کی دوسری مثالیں افسانے کا قاری انتظار حسین کے یہاں بھی دیکھ سکتا ہے۔ اور جوگندر پال کے یہاں بھی) مگر چوں کہ وہ کم لکھتے ہیں اور مدتوں بعد چھپتے ہیں۔ اسلئے ان کے طریق کار میں تکرار کی یہ صفت کھلتی نہیں۔ ویسے ذاتی طور پر میں ان سے (اور ہر افسانہ نگار سے) یہ توقع رکھتا ہوں کہ ان کی ہر تحریر ان کی انفرادیت کی [illegible] ہو اور تمام تخلیقات ویسی ہی متوجہ کن اور افسانوی ہوں جیسی کہ نیر مسعود پیش کر چکے ہیں اور کرتے ہیں۔

شاعر کا اداریہ 'نئی نفسیات اور نئی شعری کائنات' شاعر کے موجودہ دونوں شماروں کی نظموں اور غزلوں کے مطالعے کے بعد واضح کرتا ہے کہ اپنے اندر کوئی نئی نفسیات اور نئی شعری کائنات نہیں رکھتا۔ سزاوار یہ کہ اس میں آپ کی منطق عالی اور اہم [illegible] فلسفیانہ (بلکہ ماہر نفسیات کے) انداز میں کہنے کی [illegible] کرتی ہے۔ اداریے کا پہلا اقتباس:

"شاعری سے کچھ وقوع پذیر نہیں ہوتا" محض ایک مفروضہ ہے جس کی بنیاد پر آپ نے ایک [illegible] صدی میں ہزار لکھی گئی باتیں دوہرادی ہیں۔ اس مفروضے کے بعد آپ کا جملہ 'شاید' سے شروع ہوتا ہے:

"شاید اس جملے کا مفہوم یہ نہ ہو ــــــــ" 'شاید' کی بجائے 'لیکن' لکھنا چاہئے تھا۔ اسی تمہید میں آپ نے [illegible] سے تحریروں کو ـــ جبکہ 'تحریروں' کی مناسبت سے ضمیر جمع 'ان' استعمال کرنی ضروری تھی۔ یا 'اس' کی مناسبت سے 'تحریر' لکھنا چاہئے تھا۔ اس کے بعد اداریے کا دوسرا پیراگراف کی شعر کی تکنیک میں جمالیاتی معانی کھنک ہے۔ بعد حد تخلیقی ذہن (یعنی فنکار) کے ذہن و فکر پر ہزار بار کی گئی تکرار سامنے لاتا ہے اور یہ محض خیالات کا مجموعہ ہے۔ آپ کی بصیرتیں تو کچھ میں آتی ہیں۔ لیکن 'نئے سماجی لہجے' کسی نئی کائنات ہی کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔ اداریے کا دوسرا حصہ دوسرے شمارے میں شامل پہلے حصے سے مختلف نہیں۔ آپ نے نئی شعری کائنات تخلیق کرنے والے جن فنکاروں کی تخلیقات اس عنوان سے دونوں شماروں میں شامل کی ہیں۔ گزشتہ دو تین برسوں میں کی جانے والی تیسرے اور چوتھے درجے کی شاعری سے اوپر نہیں اٹھتیں۔ مختصر یہ کہ میرے نزدیک اداریے سارے لکھی روایت کی تکمیل کے سوا کچھ نہیں۔ محمود ہاشمی نے اپنے مختصر مضمون میں نگار کے فن کے متعلق جو سوالات اٹھائے ہیں ان کا لب و لہجہ بتاتا ہے کہ جوابات نفی میں ہیں کیوں کہ فاضل مضمون نگار نے رویہ ہی ایسا اختیار کیا ہے کہ ان کے مفروضہ منفی جوابات ان سوالوں سے واضح ہو جاتے ہیں۔ [illegible] شایاں کا افسانے پر مضمون جدید افسانے پر لکھے گئے کئی مضامین کی یاد تازہ کرتا ہے۔ موصوف نے اس میں یکجا افسانے کی زبان کا مسئلہ بھی اٹھایا ہے لیکن افسانے میں آہنگ اور اسلوب کی بات کر کے رہ گئے ہیں۔ زبان کے تعلق سے افسانے میں اسلوب پر تو بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ (ویسے کسی نے اب تک کہا نہیں) لیکن آہنگ کو افسانے کی بوطیقا میں شامل نہیں کیا۔

★ **عزیز بہری یار** ـــ ج-۱۴۷۶ [illegible] سنگم [illegible] کالونی [illegible]

شاعر کے گزشتہ شماروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اردو کی [illegible] جہات اور رجحانات کی جستجو میں اردو ادب کا ایک سنہری منظر نامہ پیش کرنے میں کوشاں ہیں۔ نئی نفسیات، نئی شعری کائنات انہیں کاوشوں کا ایک روپ ہے۔ مبارکباد قبول کیجئے۔

★ شہپر ہاشمی ——— ڈی۔ ۱۰ ، ۱۳ ای، کلکشی نگر دہلی۔ ۲
نئی نفسیات نئی شعری کائنات، میں میری نظم کا عنوان 'بڑی' مدیر صاحب نے 'بچی' کر دیا ہے۔ بڑی کی جگہ 'بچی' ہے۔ مزید، شمارے میں آپ کا اداریہ اب کے، پڑھ کر ہونے نہ دو سے آپ کی مکمل واقفیت کا اظہار ہے۔ جو ادبی ماحول کے عہد میں نئی نسل سکے لئے بہتر ہو سکتا ہے۔

★ حیدر جعفری سید ——— پوسٹ بکس ۳۴۹۸ ، ۱۰ نو(یو پی)
بمبئی کے حالات سے متاثر ہونے کے باوجود آپ 'شاعر' کو جس سلیقے اور حتی الامکان پابندی سے شائع کر رہے ہیں اس کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ آپ کس قدر خون جگر صرف کر رہے ہوں گے۔ دل سے دعائیں نکلتی ہیں آپ کے لئے۔ آپ جو رسائل کے باوجود 'شاعر' اب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ کاش! اردو میں کا حلقہ وسیع ہوتا۔ ایسے قدر شناسوں کی ہندوستان کی خصوصیت ہے۔ عام آدمی کے پاس پیسے نہیں اور پیسے والے ادب کے مطالعے کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔ آج کل صورت حال یہ ہے کہ لوگ مفت پڑھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ فرصت کہاں، تفریح، ٹی وی اور کیبل کی وجہ سے جاتے ہیں۔

★ خورشید اکرم ——— آج کل، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی
ادھر آپ نے کئی اچھے شمارے نکالے ہیں۔ 'اردو کی نئی نسل' اور اس کے بعد 'نئی نفسیات۔ شعری کائنات' آپ کا حوصلہ اور حسن انتظام قابل تعریف ہے۔ آخر الذکر شمارے کے تحت جن نئے شعرا کو آپ نے شامل اشاعت کیا ہے۔ انہیں سے کچھ تو سے ملک مکاتبات چھپے ہیں۔ مگر سب نہیں۔ لیکن نہیں ایک بھی ایسا نہیں ہے جسے نظر انداز کیا جا سکے۔ عہد ہی ^{MEDIO CRE} کا ہے کہ جہاں ادب اور خالق تخلیق کی بہتات ہو، ہر طرف ایک خالی پن ہے۔ ایسا قطری بھی ہے۔ بہت سے لوگ اور بالخصوص اس عہد کی کتاب کے اصل بہانے میں ہاتھ کر رہے ہیں۔ شکر کی بات ابھی اس نئی پود نے زندگی کے صفات سے یکسر خارج نہیں کر دیئے گئے ہیں۔ ایسے میں جو شمع کی طرح لوگ اپنے وجود اور ادب کے اثبات کی جنگ لڑ رہے ہیں، قوت سے کمزور کی طاقت سے مشغول ہیں۔

★ منصور امجد ——— لوٹ گل (مہاراشٹر)
'شاعر' کا تازہ شمارہ 'نئی نفسیات — نئی شعری کائنات' کے ساتھ موصول ہوا۔ ہر لحاظ سے یہ شمارہ نئی پرانی نسل کے شاعر کی نمائندگی کرتا ہے۔ شعر شمارے کے سرورق نے ایک تصویر دیا اور تصویر سے عکس مکمل کر اس نے مجھے متاثر کیا کہ بچپن کی حد ہی ختم ہو گئی۔ اب پتہ نہیں کیوں؟
میں کر کے مرد بچے بھی شکلیں لے کر آگے دو کر رہے ہیں۔ ادب کی فراغت ہے۔ اس خیال کو نظم کا روپ دے کر آپ کی نذر کر رہا ہوں۔

ہماری بوڑھی بزرگ آنکھیں
دیکھ پائیں گی ایسے منظر
ہمارے بالوں کو دیکھتا ہے
یا اصاف لہجے میں بولتا ہے
کہ ظلم اب حد سے بڑھ چکا ہے
رکوا ———
رکو، نہیں تو سب اس کے آگے
نہ ظلم ہوگا نہ تم رہو گے

پچھلے دنوں 'اور، تم لوگ' کے عنوان سے جو شعری تخلیقات 'شاعر' میں شائع ہوئی تھیں۔ اس کا رد عمل خطوط کی شکل میں شاعر میں دکھائی دیا۔ ان لوگوں پر تنقید کرنے والوں کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے 'مرد نادان پر کلام نرم و نازک بے اثر' ہندوستان میں اقلیتوں کے معیار، اکثریت لیڈروں اور افسروں کے ظلم کا سبب تیار ہو رہا ہے۔ کسی جسم کو آگ لگا دینے کے بعد جلتے ہوئے شخص کو یہ نصیحت کی جائے کہ چیخ پکار مت کرو۔ سر بال میں سر ملی آواز میں اظہار کرو۔ یہ کیسے ممکن ہے؟؟

★ لطیف شاہد ——— موسی پور، مدھوبن پور ——— ۲۳۳۴۵۰
شاعر کے حالیہ شمارے 'اور، تم لوگ' اور 'اردو کی نئی بستیاں' اور اب 'نئی نفسیات — نئی شعری کائنات' آپ کی تخلیقی ذہن کے مظاہر ہیں۔ ان شماروں میں بڑا تنوع اور جدت کاری ہے۔ اس پر آشوب دور میں جس ہوش اور لسری سے آپ اردو کی وکالت کر رہے ہیں۔ اور اردو ادب کو بین الاقوامی ادب کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ اور دو سالے رہے ہیں۔ آنے والا مورخ آپ کی ان خدمات کو فراموش نہ کر پائے گا۔

★ راز انڈمانی ——— ا۔ سڈل پوائنٹ، پورٹ بلیر ۱۰۱ ۷۴۴
بہت کتابیں چھپی جاتی ہیں۔ بہت چھپائی اور بہت شعر کہی جاتی ہیں۔ میری نظر میں 'شاعر' مو حرا در ک دمرے میں آتا ہے۔ اور اس کا ایک ایک لفظ مقدس رہبر کہ کر بڑا عتاب عادت سی بن گئی ہے۔ لیکن جب اردو زبان کے محو کی بات ہو، تو ایک سوال بار بار ذہن میں ابھرتا ہے کہ ہم ادب میں چاہے شعری ہو یا نثری، کرتے ہوئے سمجھ سے تو جاہ رہے شامل ہیں۔ لیکن اس سوال سے صرف نظر کر جاتے ہیں کہ اگر ہمارے جریدوں اور کتابوں کی تعداد اشاعت اسی طرح سے گرتی رہی تو ہمارا ادب تو دور، زبان کے مستقبل پر بھی ایک سوالیہ نشان لگ جائے گا۔ اور اکیسویں صدی کی دھمک 'شاعر' کے ہر شمارے میں سنائی دیتی ہے (شعوریات میں کم از کم میں نہیں سن پا رہا ہوں) اس کے ہوتے ہوئے آنے والے دور میں اردو زبان خود کس حالت میں ہوگی۔ ہر زندہ زبان کی مقبولیت صحت کا پیمانہ اس زبان میں شائع ہونے والی کتابوں (مشمول جرائد) کی تعداد سے زیادہ تعداد اشاعت ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جرائد میں اکثر کی تعداد اشاعت دو، تین ہزار اور کتابوں میں ایک ہزار سے آگے نہیں بڑھ پاتی۔ اگر یہ حقیقت ہے تو سوال کا سلسلہ براہ راست اس کمائی سے جڑ جاتا ہے جسے تخلیقی دو پائیوں میں زبان و ادب کے ہر فیصلے میں نظر انداز کیا گیا ہے۔ اور وہ ہے عام قاری۔ ہر زبان میں قلم کار اشاعتی ادارے اور قارئین کا ایک مثلث ہوتا ہے۔ قلم کار تخلیق کرتا ہے۔ ادارہ شائع کرتا ہے اور قاری پذیرائی اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ لیکن ادھر کچھ ایسی ہوائیں چلیں کہ چند لوگوں نے کسی مفادات کے تحت قاری کی جگہ نقاد کو رکھ دیا ہے۔ اور من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو کے مصداق ایک دوسرے میں ڈوب گئے اور ایسی ایسی چیزیں نہ صرف کتابوں میں بلکہ جریدوں میں بھی در آئیں کہ جن کا ہمارے معاشرے، ماحول اور فکر سے، ہماری حسیات سے کوئی تعلق نہیں۔ حیرت نہیں کہ مقالات تعدد و نظر کو جریدوں میں تخلیقی ادب پر فوقیت دی جانے لگی۔ خاکسار اردو کے علاوہ ہندی اور بنگلہ ادب پر بھی نظر رکھتا ہے۔ لیکن فنی تنقید و لسانیات پر مغربی مفکرین کی کتابوں پر مبنی خشک مضامین صرف اردو کے قارئین ہی کو جھیلنا پڑتے ہیں۔ دیگر زبانوں کے قارئین کو ایسے مضامین سے پالا کم ہی پڑتا ہے۔ بہت ہوتا ہے تو شائع شدہ کتابوں پر عملی تنقید ہوتی ہے۔ جس سے قاری اور قلم کار دونوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ ان تنقیدی تحریروں کو پڑھنے کے بعد قاری اپنی رائے قائم کرتا ہے اور کتاب خریدی جاتی یا نہیں۔ ایسی تنقید ہمارے ادبی جرائد میں شائع ہوتے ہیں خشک علم اور اصطلاحات تحریروں سے زیادہ صحت مند اور مفید ہوتی ہے۔ اردو جرائد میں تنقیدی مضامین عموماً علمی نوعیت کے ہوتے ہیں جن سے سوائے طلبا کے زبان اردو، کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی اب یہ طلبا یا تو اپنے موضوع پر کتابیں خرید سکتے ہیں یا محض کتب خانوں یا یونیورسٹی کی لائبریری سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ سب ہمارے قاری کو سزا کیوں دی جائے ——— یہ ایک تصور سا ذاتی تجربہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ جو امید ہے کہ اس مضمون بے جا نہیں ہوگا۔ اسکول کے زمانے میں میرے دو بنگالی دوست تھے۔ گرمی کی تعطیلات میں ہمارا یہ مشغلہ تھا کہ میں نہیں اردو کے اچھے اچھے افسانے سنایا کرتا تھا۔ اور وہ مجھے بنگلہ زبان کے چیدہ چیدہ افسانوں کا اردو ہندی میں ترجمہ کرکے سناتے تھے۔ قدیم بنگال سے متعلق شرت چندر چٹرجی کا ایک افسانہ 'مہیش' سننے کے بعد محسوس ہوا کہ میرو غفور کے دل میں اٹھنے والی لہروں کو میرے احساسات کے ساحل تک لانے میں ناکام رہے ہیں۔ میں نے اسی دن تہیہ کیا کہ اصل بنگلہ افسانہ ہی پڑھنا ہوگا۔ تیرہ ہوا کہ میں بنگلہ ادب کا بھی ایک قاری ہو گیا (مجھے یقین ہے کہ یہ دنیا کی پہلی مثال نہیں ہوگی) اردو زبان کو بھی کوئی ایسی مقبولیت بہ ترین کہا کر نہیں بیچے گا۔ بلکہ اسکے فائدہ اٹھانے والے سے متاثر ہو کر ہی اردو کی طرف آنے لگا۔ اسی لئے میری ناقص رائے ہے کہ اردو ادب شاعری، افسانہ یا تنقید کو چھوڑ کر شاعر کے ستیر تنیجہ قاری کو لایا جائے۔ اس کی پسند ناپسند کا اندازہ کیا جائے۔ اور یہ معلوم کیا جائے کہ اردو کے قاری نے کس بنا پر اپنی زبان کی کتابوں اور رسائل سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو ایک سوالنامہ مرتب کر کے شائع کیا جائے۔ جس سے قاری اپنے دل کی بات کہہ سکے۔ اس سے صرف اشاعتی اداروں کو فائدہ پہنچے گا بلکہ ہمارے ادبا و شعرا کو بھی یا تجربیات کے محلوں سے نکل کر آئینے میں، انکی روشنی میں اپنا چہرہ دیکھنے کا موقع ملے گا۔ دو تین مکتوبات میرے خیال میں سوائی حد تک تحسین کا عالم ہے۔ لیکن دیکھا جاتا ہے کہ تقریباً ہر رسالے میں ادبا و شعرا نے اس عالم پر بھی قبضہ کر رکھا ہے۔ کوئی بھی قاری دو، تین خط لکھنے کے بعد قلم رکھ دیتا ہے۔ بد دل ہو جائے گا اور اس طرح جریدے اور قاری کا رشتہ منقطع ہو جائے گا۔ جریدے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اسے فیڈبیک نہیں ملتا اور قاری کی نبض ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ جہاں تک قلم کاروں کے خطوط کا سوال ہے وہ تو مدیر کی تعریفوں کے پل باندھیں گے ہی، اگر اس میں ان کا مفاد شامل ہو جاتا ہے۔ اس لئے مکتوبات جو قاری کا عالم ہے۔ قاری کو لوٹا دیجئے اور قلم کاروں کے خطوں کا اضافی تبصرہ لگا دیجئے۔ میرے خیال میں شاعر کے نئے سوسنت کا مختصر شمارہ 'نئی نفسیات — نئی شعری کائنات' میں مجھے نیا کچھ نہیں ملا۔ آپ کے اداریہ کے علاوہ جانے آپ میری حسی کا یہ لیجئے لیکن شمارہ کا ہے جس میں شرکت ہی نہیں کی۔ جدید اردو افسانے کا مستقبل 'بیروں میں پڑ گئے' کہانی تھا اور کسی حد تک اس طویل خط کا شکریہ ہی

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم
جاری شدہ ۱۹۳۰

بیادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۴ واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر

جلد — ۶۴
شمارہ — ۸

فون: ۳۵۹۹۰۳

9/12/93

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت روپے

زرِ سالانہ ۶۰ روپے
لائبریریوں سے ۷۵ روپے

تاحیات خریداری ۱۰۰۰ روپے
معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

ماہنامہ شاعر مکتبہ قصر الادب ممبئی سنٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ ممبئی

فکرِ امروز



اُردو اور ہندی کے غیر ضروری مباحث و مسائل کے سلسلے میں صایبِ رائے نے، مدّت ہوئی یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔ میں اس اردو ہندی کے مسئلے سے بہت خائف ہوں اس لیے کہ اس قسم کا مقابلہ مجادلہ ملک کی زبانوں کو کمزور کر دینے کا خطرہ پیدا کرتا ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ اُردو کا نام ہندوستانی رکھ کر اس لسانی نزاع کو قطعاً ختم کر دیا جائے۔

[۲۸ فروری ۱۹۳۴ء — گوالیار]

— سیماب اکبرآبادی



رباب صحرا کی رونمائی کے موقع پر حاضرین کا ایک منظر ۔ بائیں سے دائیں نعیم احمد قاسمی ، اشرف علی ، حنیف ترین خواجہ رحمت اللہ جری اور خالد پرویز۔

حنیف ترین کے شعری مجموعے رباب صحرا کی رسم اجراء

۹ ستمبر ۱۹۹۳ء "بزم احباب سخن" عرعر شمال [سعودی عربیہ] کے زیر اہتمام حنیف ترین کے شعری مجموعے "رباب صحرا" کی رسم اجراء معروف پاکستانی شاعر ، خواجہ رحمت اللہ جری (مقیم عرعر) کے دست مبارک ، عمل میں آئی ۔ اس پورے منطقے میں مقیم ہند و پاک کے اردو داں طبقے نے بہت بڑی تعداد میں ذوق و شوق کے ساتھ حصہ لیا ۔ صدارت کے فرائض شہر عرعر کی معزز شخصیت جناب اشرف علی نے انجام دئے ۔ نظامت کے فرائض نعیم احمد قاسمی نے نہایت ہی خوبصورتی سے نبھائے ۔ رحمت اللہ جری اور حافظ محمد یوسف نے منظوم خراج تحسین پیش کیا ۔ رحمت اللہ جری، نعیم احمد قاسمی، ظل الرحمٰن قاسمی، عبدالملک ذاکر اور قمر حید رقمر (ریاض) نے حنیف ترین کے فکر و فن پر مقالے پڑھے ۔ انیا زاعظمی اور مرزا امتیاز بیگ نے اپنے دل پذیر ترنم سے حنیف ترین کی غزلیں پیش کیں ۔ خالد پرویز اور سراج الدین قادری نے محفل کے تمام امور بحسن و خوبی انجام دئے ۔ بزم احباب سخن کے کارکنان غلام نبی شاکر، نعیم احمد قاسمی، ظل الرحمٰن قاسمی، حافظ محمد یوسف، قدیر احمد قاسمی، غوث محی الدین، عبدالرزاق ، محمد سلک ذاکر اور پیر محمد نے اس جلسے کو کامیاب بنانے کی بھر پور کوشش کی ۔ صدر محترم اشرف علی صاحب نے شب کے آخری پہر میں حاضرین بزم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جلسے کے اختتام کا اعلان کیا ۔ [نعیم احمد قاسمی]

رباب صحرا

وہ خوب صورت شعری مجموعہ جسے شاعری کے قارئین و سامعین اور نقادوں نے پسند کیا اور سراہا

صفحات : ۱۱۲ ❁ قیمت : پچاس روپے

رابطہ:
- فرینڈز بک ہاؤس ، شمشاد مارکیٹ ، مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ (یوپی)
- اخبار نو ۔ ۱۷۲۴ کوچہ دکھنی سرائے ، پٹودی ہاؤس ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
- ڈاکٹر حنیف شاہ خان ۔ متوصف الجدیدہ ، عرعر (شمالی) ، سعودی عربیہ

جاری کردہ : بزم احباب سخن عرعر (سعودی عربیہ)

محفل اپنی

دو شمارے — ایک اشاعت خاص

جی بہت چاہا کہ تمام ۹۹ کہانیوں 'شاعر' کے صفحات میں سمو دی جائیں۔ مگر ہمارے پاس وسائل ہی نہیں ہیں۔ "ہم عصر اردو ادب نمبر" شائع ہو گیا ہوتا تو شاید حوصلہ کر بھی لیتے۔ مگر موجودہ حالات میں۔ قطعی ممکن ہی نہیں تھا۔ ہم عصر نمبر میں تمام کچھ لگا دیا گیا ہے اور تہی دامن ہو گئے ہیں۔ بہت غور کرنے کے بعد طے کیا گیا کہ قارئین شاعر کو اپنی مسرتوں میں شامل کرنے اور اکادمی ادبیات پاکستان کو مبارکباد دینے کے لئے شاعر کے محدود صفحات ہی میں کچھ کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے 'ادبیات' سے شاعر کے لئے ۱۵ ممالک کی ایک ایک کہانی منتخب کی۔ چند اسلامی ممالک صرف اس لئے انتخاب میں نہ آ سکے کہ طویل کہانیوں کی گنجائش کسی طور ممکن نہ ہو سکی۔ مثلاً کویت کی کہانی 'مجھے نکالو اس سمندر سے (احسان عبداللہ وس)' ادبیات کے ساڑھے پینتیس صفحات تو شاعر کے تیس صفحات۔ اسی طرح الجزائر، تریر۔ اور ترکمانستان کی کہانیاں طوالت کی وجہ سے شامل نہیں ہو سکیں۔

اب شاعر کے ان دونوں شماروں کے متعلق چند معروضات اور۔ تمام امور پر غور کرنے کے بعد (صفحات میں اضافہ بھی) رسالے کے صفحات کا تعین کیا گیا۔ پھر کوشش کی گئی کہ بیشتر ممالک کی نمائندگی ہو۔ جو کہانیاں منتخب کی جائیں۔ قارئین کی پسند کے مطابق ہوں۔ ایران۔ پاکستان اور ترکی کی کہانیوں سے انتخاب کرنا بے حد دشوار ہوا۔ دل کو چھو لینے والی بعض طویل کہانیاں شامل نہ کی جا سکیں۔ پھر یہ بھی کوشش رہی کہ 'ادبیات' کی ترتیب کے مطابق نئے افسانہ نگاروں کو ترجیح دی جائے۔ تکنیکی دشواریاں بھی مانع رہیں۔ 'ادبیات' کا سائز ۲۰×۳۰/۸، پانچ ۲۳ سطری کمپیوٹر کمپوزنگ۔ شاعر کے حجم میں تمام مواد کو کس تناسب سے سمویا جائے کہ بہت زیادہ خفی نہ ہو اور پڑھنے میں آ سکے۔ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ ہمارے قارئین صرف کہانیاں، صرف شاعری صرف تنقید پسند نہیں کرتے۔ شاعر کی موجودہ معنوی ترتیب ہی میں تحریروں کو پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا شاعری بھی شامل کی گئی۔ صرف غزلوں کا انتخاب معیاری اور مختصر نظموں کی کمی کا باعث ہوا۔ پابند نظموں کا رواج تو ختم ہو گیا۔ اب اچھی مختصر نظمیں بھی کم کم آ رہی ہیں۔ غزل کے ساتھ بھی کم و بیش یہی مسئلہ ہے پھر بھی کچھ بہتر، معیاری اور تازہ کار غزلوں کا انتخاب کر لیا گیا۔ شاعر کو موصول بے شمار غزلوں کو پڑھنا آسان نہیں۔ شاعر کے مستقل کالم بھی شامل شمارہ ہیں۔ بہر حال ہم نے اپنی سی کوشش کی ہے اور ایک اشاعت خاص اپنے قارئین کی نذر کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔

ہم شکر گزار ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان اور غلام ربانی آگرو، افتخار عارف۔ ماہی 'ادبیات' کے مدیر اعلیٰ خالد اقبال یاسر کے کہ اکادمی نے ایک منتخب سیرت موضوعی خاص نمبر شائع کیا۔ انتخاب اور اس کے معیار کے متعلق ہم نے کوئی مضمون شامل نہیں کیا ہے۔ محدود صفحات کی وجہ سے ایسا کرنا ضروری تھا۔ اکادمی ادبیات پاکستان ایک معتبر سرکاری ادارہ ہے۔ لہٰذا امید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل میں تمام اسلامی ممالک کی معیاری، تازہ کار منتخب کہانیوں پر مشتمل ایک اور خاص نمبر شائع کرے اور ایسے اہم ترین موضوعی شمارے کو تنقیدی و تحقیقی اور سوانحی بنایا جائے جیسا کہ مذکورہ خاص نمبر میں چند ایک افسانہ نگاروں کا تعارف دیا گیا ہے۔ اور اب قارئین بتائیں کہ اس اشاعت خاص کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے ———؟

اسلامی ممالک کی کہانیاں

غزلیں

نقد و نظر

محفل اپنی

مکتوبات

شمارہ نمبر۔ ۸ [۱۹۹۳ء] جلد ۶۴



بشیر بدر

غزل کو ماں کی طرح باوقار کرتا ہوں
میں ماںمتا کے کٹوروں میں دودھ بھرتا ہوں

تو آئینہ ہے تجھے دیکھ کر سنورتا ہوں
کہاں کہاں ترا چہرہ تلاش کرتا ہوں

بدن سمیٹ کے لے جائے جیسے شام کی دھوپ
تمہارے شہر سے میں اس طرح گزرتا ہوں

یہ دیکھ ہجر ترا کتنا خوبصورت ہے
عجیب مرد ہوں سولہ سنگھار کرتا ہوں

تمام دن کا سفر کر کے روز شام کے بعد
پہاڑیوں سے گھری قبر میں اترتا ہوں

مجھے سکون گھنے جنگلوں میں ملتا ہے
میں راستوں سے نہیں منزلوں سے ڈرتا ہوں

ٹے۔ ا، بادشاہ اپارٹمنٹ کوہ فضا بھوپال

ملائشیا

لی کاک لیانگ

عطا صدیقی

ذرا سی لڑکی

جب وہ پاس سے نکلی تو سندریا نے اپنی زنجیر کھڑکھڑائی۔

وہ صبور بے حسنہ کے جھونپڑے کے قریب ہو گی۔ تو اب ندی بھی زیادہ دور نہیں ہو گی۔ زمین سخت لگ رہی تھی اور کنکر اس کے ننگے تلووں میں چبھ رہے تھے اور وہ اپنے گالوں پر پسینہ بہتا محسوس کر سکتی تھی۔ ہوا چولہے میں سے نکلی لپٹوں کی طرح گرم گرم اور روکھی روکھی تھی اور جب وہ دبے پاؤں آگے بڑھی تو اس کو یوں لگا جیسے وہ اپنے ان خوابوں میں سے کسی میں ہو جس میں وہ بال بکھرائے ابلتے پانیوں پر تیرتی دکھائی دیتی۔ آس پاس کوئی بھی نہ ہوتا بس ابلتے پانی اور اس میں بجتے گرتے ملبوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی ہوتی اور وہ چلائے جا رہی ہوتی' پکارے جا رہی ہوتی۔ پھر ماں جاگ پڑتی' اٹھ کر اس کے پاس آتی اور اس کو ہلا ہلا کر چلاتی اور جھڑکتی۔ "چل جاگ... خاک دور... اللہ ہم کو اپنی اماں میں رکھیو۔"

وہ سیدھے راستے ہی جا رہی تھی۔ اچانک راستہ ٹھنڈا ٹھنڈا لگا تو اس نے انکل لگائی کہ اب وہ ندی کے پاس والے بڑے بڑے پیڑوں کی چھاؤں میں تھی اور جیسے ہی گھاٹ کے پاس راستہ تنگ ہونا شروع ہوا تو ٹہنیاں اس کے سارونگ سے الجھیں۔ اس نے اپنا ہاتھ ان کو ہٹانے کے لیے بڑھایا۔ جھاڑ نیچے تھے اور ان پر نرم نرم اور گول گول چیزیں لگی تھیں۔ یہ پھول تھے۔ اس نے ایک توڑ لیا اور اپنے بالوں میں اڑس لیا۔ گھاٹ اب کہیں آس پاس ہی ہونا چاہیے۔ کس طرف ہو گا بھلا؟ ہاں' اسے یاد آیا۔ اس پیڑ سے کوئی بارہ ڈگ آگے جس کا تنا مرغے کی کلغی کی طرح کھلا تھا۔

جس وقت وہ وہاں پر بیٹھی اس کے پیر ٹھنڈے ٹھنڈے تختوں کو چھونے لگے۔ اس نے گھاٹ کے نیچے پانی کو' رات میں چلنے والی تیز ہوا کی طرح بہتے سنا اور پھر جھک کر ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کو چھوا۔ چھینٹے اڑانے کے لیے اس نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈبویا اور اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور من ہی منہ میں جی بھر کھول کر اس لیے ہنسی کہ کہیں کوئی سن نہ لے۔ جب ابا اور اماں سو جاتے وہ سر اوپر اٹھا کر چاند دیکھنے کی کوشش کیا کرتی۔

ہر کوئی یہی کہتا تھا کہ "چندا بڑا پیارا۔" اس لیے وہ آسمان کی طرف منہ اٹھاتی اور چاند کو کھوجتی۔ وہ ہوا کی سرسراہٹ' بکریوں اور مرغیوں کی ہل چل' جھینگروں کی صاف کر کر اور مچھروں کی باریک بھنبھناہٹ سا کرتی' پھر وہ مطمئن ہو کر کہ اس نے چاند کو پا لیا' اندر چلی جاتی کیونکہ ہر کوئی یہی تو کہتا تھا کہ چاند آسمان میں ہوتا ہے۔

ایک ننھی چیخی۔ اس نے اچانک اپنا ہاتھ روک لیا۔ "یہ کیا؟" پیڑ کی پتیاں نئے سارونگ کی طرح سرسرائیں' پھر ہنسی سنائی دی۔

"میں نے تم کو پکڑ لیا' نٹ کھٹ لڑکی... کیا کر رہی ہو یہاں؟ کیا ڈوب مرنا چاہتی ہو؟ اللہ! چلو ادھر آؤ۔"

اس نے بے حسنہ کی آواز پہچان لی۔ بے حسنہ بوڑھی تھی مگر بہت اچھی۔

"بڑی گرمی ہے نا بے حسنہ' میں ذرا ٹھنڈک کے لیے آئی تھی۔"

"تمہیں اکیلا چھوڑ کر تمہاری ماں کدھر نکل گئی؟ اللہ! اگر سندریا ابھی اپنی زنجیر نہ ہلائی ہوتی تو پتہ نہیں تم پر کیا بیت جاتی۔"

اسلامی ممالک کی کہانیاں

"اماں' ابا کے ساتھ بازار گئی ہیں۔ آج سے وہ بھی مچھلی اور سبزی بیچنے میں ان کا ہاتھ بٹائیں گی۔ تم مانو میرا بھیا ابا سے بچھڑ کر نکل گیا ہے نا۔"

"چلو آؤ' دیکھو اب ندی کے پاس کبھی نہ آنا۔ گھڑیال ہی تم کو ہڑپ کر سکتا ہے۔ سمجھیں۔"

"اچھا بے حسنہ' اب نہیں آؤں گی۔"

وہ آپس میں باتیں کرتی رہیں' بے حسنہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں تیز تیز چل رہی تھیں۔ وہ پہلے کبھی اتنا تیز نہیں چلی تھی۔ سارا وقت زمین پیروں تلے کبھی اونچی اور کبھی نیچے لگتی رہی۔

"ہم کدھر جا رہے ہیں؟ اتنا تیز مت چلو۔"

"میں تم کو ایک چیز دکھانا چاہتی ہوں۔"

"کیا؟ کوئی نیا پھول؟"

"نہیں— یہ رہا۔"

ایک ننھی سی چیز اس کے ہاتھ میں جھول گئی اور ہلکی ہلکی آوازیں نکالتی رہی اور اس کی انگلیوں کو کس کر پکڑ لیا' پھر وہ گھومی اور اس کے دوسرے ہاتھ پر چڑھ گئی اور سارا وقت کوں کوں کرتی رہی۔ وہ بالکل مخمل کی طرح نرم نرم سی تھی۔

"جانتی ہو یہ کیا ہے؟"

اس نے انکار میں گردن ہلا دی اور بے حسنہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ اتنی ہی زور زور سے کھانسنے لگی۔

جب کھانسی تھمی تو اس نے بے حسنہ کو کہتے سنا "بچی تم نے نہیں پہچانا؟ چھو کر بھی نہیں؟ ارے یہ بندریا کا بچہ ہے۔ میری بندریا کا۔ لے لو۔ جب بھی اس کے لیے کیلوں کی ضرورت ہو مجھ سے مانگ لیا کرنا۔ میں تم کو کچھا دے دیا کروں گی۔"

"بے حسنہ کیا بندروں کے بھی بچے ہوتے ہیں؟ مجھے پتہ نہیں تھا' ہاں آوازیں کچھ جانی مانی سی لگتی تھیں۔ تمہاری اس مہربانی پر اللہ تمہیں خوش رکھے۔"

"لے جاؤ بچی' رہی اللہ کے خوش رکھنے کی بات تو اس نے مجھے بہت خوش رکھ لیا' آؤ واپس چلیں' ادھر اس طرف۔"

وہ چیز اس کے ہاتھ میں تڑپنے لگی' تب اچانک اس کو خیال آیا'

"اگر یہ چھوٹ بھاگا تو میں کیا کروں گی بے حسنہ؟ کیا یہ مر جائے گا؟"

"میرے گھر پر تمہارے کام کی ایک چھوٹی زنجیر ہے۔ تم اس کو روز میرے گھر لے آیا کرنا تاکہ یہ کچھ دیر اپنی ماں کے ساتھ کھیل لے۔"

"تم بڑی ہوشیار ہو' شکریہ۔"

جب وہ گھر کے قریب پہنچے تو بندریا نے اپنی زنجیر کھڑکھڑائی اور وہ ننھی سی جان ہمکنے لگی اور پھر زور سے نکل بھاگنے کے لیے زور کرنے لگی۔ وہ بے حسنہ کے پیچھے پیچھے دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھتی رہی۔ ممٹی میں بڑی ٹھنڈک تھی۔ اس نے بالوں سے پھول نکال کر اس ننھی سی جان کو پکڑا دیا۔

"ذرا دیر ستا لو' میں تم کو زنجیر اور کیلے لا کر دیتی ہوں' پھر میں تم کو گھر پہنچا دوں گی۔"

بے حسنہ کے پہنچا جانے کے بعد اس نے ننھی سی جان کو دروازے کے پاس ایک کھمبے سے باندھ دیا اور ایک کیلا پکڑا دیا' حالانکہ بے حسنہ بتا چکی تھی کہ آج کے لیے وہ پیٹ بھر کھا چکا۔

وہ باہر ہی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اور جب ذرا ٹھنڈک سی ہونے لگی تو اس نے جان لیا کہ اب ابا اماں آنے ہی والے ہوں گے۔ وہ بکریوں' مرغیوں اور لوگوں کی آوازیں ہر طرف سے آتی سن سکتی تھی۔ کبھی کبھار کوئی پکار کر اس سے بات کر لیتا اور وہ بھی چلا چلا کر جواب دے دیتی۔ ننھی سی جان اس کے سارونگ پر چپ چاپ لیٹی ہوئی تھی اور وہ اس کو آہستہ آہستہ سہلا رہی تھی۔

قدموں کی چرچراہٹ سن کر وہ جان گئی کہ وہ ابا تھا۔



شہزاد احمد

دل آنکھیں بند کر کے بھی وہ چہرہ دیکھ سکتا ہے
تماشائی نہیں، پھر بھی تماشا دیکھ سکتا ہے

وہ جس کو پوری دنیا ایک ذرّہ بھی نہیں لگتی
اگر چاہے تو ہر ذرّے میں دنیا دیکھ سکتا ہے

اگر سب کھڑکیاں بھی بند کر لو پھر بھی کیا ہو گا!
وہ سورج ہے اسے سارا زمانہ دیکھ سکتا ہے

پلٹ آتے ہیں اک آواز پر گزرے ہوئے لمحے
یہ دل چاہے تو ہر منظر دوبارہ دیکھ سکتا ہے

ہمیشہ ہی مرے گھر کی طرف رہتا ہے رُخ اس کا
یقیں اب آ گیا مجھ کو اندھیرا دیکھ سکتا ہے

میں تجھ کو اور اونچا اور اونچا دیکھنا چاہوں!
تو ارضِ خاک پہ میرا تڑپنا دیکھ سکتا ہے

کسی کو اس قدر فرصت میسّر ہی نہیں آتی
کوئی ایسا نہیں جو سارا میلہ دیکھ سکتا ہے

بس اک لمحے میں اس کی سب امیدیں ٹوٹ جاتی ہیں
وگرنہ دل تو صدیوں تک بھی رستہ دیکھ سکتا ہے

۱۳۱- ڈی آفیسرز کالونی - غازی روڈ - لاہور کینٹ

"کتنی گرمی ہے آج' اس پولیس والے نے تو آج مجھے دھر ہی لیا تھا۔ نہ جانے کس نے شکایت لگا دی کہ میرے باٹ کھوٹے ہیں۔"

"ابھی ایماندار بن جاؤ' اب کبھی یہ دھوکا دہی مت کرنا۔ کیا سنے گا جو وہ تم کو پکڑ لے گئے؟ اب تو بیٹا بھی ہم کو چھوڑ جائے گا۔"

"اللہ رحم۔ اب جبکہ ہر چیز مہنگی ہو گئی ہے میں تین جنوں کا پیٹ کیسے بھروں؟ اب تو میں جوان بھی نہیں رہا' اب مجھ سے اتنی محنت نہیں ہوتی' جلدی تھک جاتا ہوں۔ لعنت بھیجو جی اپنے اس بدمعاش بیٹے پر۔"

"اچھا' چلو اندر چلو۔ بچی یہ کیا ہے تیرے پاس؟"

"اماں نے جس نے مجھے یہ ننھا سا بچہ دیا ہے۔"

"وہ کھاک بوڑھی چڑیل" اس کا باپ غصے سے چیخا۔ "وہ چاہتی ہے کہ اس کو کھلائیں پلائیں ہم لوگ اور جب وہ بڑا ہو جائے تو اس کو واپس لے جائے۔ اتنا کیسی ہے وہ۔ لے جا کے مارو اس کے سر پر' چلو واپس کرو۔"

اس ننھی سی جان نے اس کا ساروتگ گھسوٹا اور اس نے اس کے ننھے ننھے پنجے اپنے دل پر محسوس کئے۔ اس نے اس کو کس کر پکڑ لیا۔

"ابا' جس نے کہا ہے کہ وہ مجھ کو اس کیلئے کیلے دیا کرے گی' اور اس روز اس کو اس کی ماں کے پاس لے جانے کی اجازت بھی دے دی۔ اس کو میرے پاس ہی رہنے دو ابا۔۔۔ اماں' ابا سے کہو نا۔ میں اس کو پالوں گی۔ اماں' اچھی اماں۔"

"ابھی چھوڑو اس کو اس کے حال پر' آج بڑی گرمی ہے اور تم ہر چیز پر گرمی کھا رہے ہو۔ آؤ' اندر چلو۔۔۔ بچی میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ اور اس بچے کو ادھر ہی چھوڑ دو۔"

وہ چٹائی پر بیٹھ گئی اور دیوار سے ٹیک لگا لی۔

ماں پھر چاولوں کے خراب ہونے اور کمر کی نس بری طرح کھنچ جانے کی شکایت کرنے لگی۔ باپ پانی بھر لایا۔ وہ لوٹے میں پانی انڈیلے جانے کی آواز سن سکتی تھی۔ وہ اٹھ کر گئی اور چاولوں کے چمچے میں ماں کی مدد کرنا چاہی۔ اس سے کہا گیا کہ وہ پھکنی سے چولہے میں پھونکیں مارے' جلد ہی اس کے گال تمتما گئے اور وہ جان گئی کہ آگ خوب دہک چکی۔

وہ سب چٹائی پر آ بیٹھے اور ماں نے اس کے والے کیلے کے پتے پر تھوڑی مچھلی اور تھوڑی ساگ ملا دی اور اس نے ترنت چاول اپنے منہ میں بھر لیے' جب وہ سب کھا پی چکے تو باپ لوٹا لے کر آیا اور اس کے ہاتھوں پر پانی ڈالا۔ اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس کی انگلیوں سے سرسراتی ہوئی نکل جا رہی ہو۔ اس نے جلدی جلدی ہاتھوں کو مل کر دھویا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ابا اس رات بہت اکھڑا ہوا تھا۔

جب ماں برتن دھو دھلا چکی تو ابا نے اس سے کہا کہ وہ جا کر سو جائے۔ اپنے کونے میں جانے سے پہلے وہ دروازے تک گئی اور وہ ننھی سی جان لپک کر اس کی ساروتگ پر چڑھ گئی۔ اس نے جھک کر اسے پکڑا' تھوڑی دیر لئے رہی اور پھر اس کو اتار دیا۔ وہ چھوٹی سی زنجیر کی کھنک سن سکتی تھی۔

وہ اپنے کونے میں جا کر پسر گئی لیکن اس کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے کروٹ لی اور اس چھوٹے آئینے کو چھوا جو ماں کے بچھونے کے اوپر لٹکا تھا۔ اور اس کو بہت آہستہ سے اتار کر اپنے اپنے ہاتھوں میں کس کے پکڑ لیا۔

وہ ناریل کی طرح سخت تھا۔ ایک دن جب ماں نے وہ اس کے ہاتھ میں دیکھ لیا تھا تو منع کیا تھا کہ اتنا کس کر نہ دبائے' کہیں ٹوٹ ٹاٹ نہ جائے اور اس کے ہاتھوں کو زخمی کر دے۔ اس کو تعجب ہوا کیونکہ وہ یہ امید کر رہی تھی کہ اب ماں آئینہ اس کے ہاتھ سے چھین لے گی۔

لوگ کہتے تھے کہ آئینہ بڑے بڑے کام کر سکتا ہے اور بستی کا سیانا کرامت بچوں کو بتاتا کہ آئینے میں



وزیر آغا

نازک غنچے، آس بھرے
لب بستہ، بوباس بھرے

آنکھیں، میٹھی آگ بنا
کاکل سوکھی گھاس بھرے

شکر سنڈی چاٹ گئی
جلے کھیت کپاس بھرے

ہم شہروں کے عطر گلال
ہم سورکھ بن باس بھرے

سینہ سونے کے سکوں کا
در دامن افلاس بھرے

رنگوں کی برسات میں بھی
نین تمھارے پیاس بھرے

کیسا ہے انصاف ترا
کرے مَلَک اور داس بھرے

سول لائنز، سرگودھا (پاکستان)

شاعر



ندا فاضلی

بیسن کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہے، چوکا، باسن، چمٹا، پھکنی جیسی ماں

بان کی کھرّی چرپائی پر، ہر آہٹ پہ کان دھرے
آدھی سوئی، آدھی جاگی، تھکی دوپہری جیسی ماں

چڑیوں کی چہکار میں گونجے، کبھی محمدؐ، کبھی علی
مرغے کی آواز سے کھلتی، گھر کی کنڈی جیسی ماں

بیوی، بیٹی، بہن، پڑوسن، تھوڑی تھوڑی سی سب میں
دن بھر اک رسّی کے اوپر، چلتی نٹنی جیسی ماں

بانٹ کے اپنا چہرہ، ماتھا، آنکھیں، جانے کہاں گئی
پھٹے پرانے اک البم میں چنچل لڑکی جیسی ماں

۱۰۳، امر اپارٹمنٹ ڈانڈ پاڑہ۔ کھار
ممبئی - ۵۲

وسطی ممالک کی کہانیاں

کیسی کیسی جادوگری ہوتی ہے۔ اگر کسی کو کبھی جنگل میں شیرمانس مل جائے تو اس کے سامنے آئینہ لا رکھنا چاہیے۔ شیرمانس ایک دم ایک بابا کی جون میں آ جائے گا اور اپنے سارے کے سارے خزانے دکھا دے گا اور اس کی کھو میں بہت سارے ستارے ہیں' کیونکہ اس نے ان تمام ستاروں کو سمیٹ سمیٹ کر رکھا ہوا ہے جو اب تک آسمان سے اترتے رہے ہیں۔ یہ بتانے کے بعد بابا کرامت زور سے ٹھٹھے لگاتا۔ نہ جانے کیوں وہ ٹھٹھے اس کو فضول سے لگتے۔ اس کو تو چھ حسنہ کے ٹھٹھے سننا اچھا لگتا۔ وہ بڑے کھلے کھلے ہوتے۔

اس نے آئینے کو اپنے ہاتھوں میں گھمایا۔ وہ ایک طرف سے موٹا اور دوسری طرف سے بہت پتلا تھا بالکل چاقو کے پھل کی طرح۔

کوئی کھسر پھسر کر رہا تھا۔ اب اس کو اونگھ آنے لگی تھی۔ آواز بہت دھیمی تھی اور پڑے پڑے ہی اس نے جان لیا کہ اس کی ہم زاد جاگ اٹھی ہے اور اس سے الگ ہو گئی ہے۔ ہر رات وہ اس کو یونہی محسوس ہوتے ہوئے اور اس کو اپنے کان کے پاس چپ چاپ چلتے ہوئے سنتی' جس وقت خود اپنے بچھونے سے اٹھ بیٹھنے کی کوشش کرتی تو اس کی گدی میں زوردار درد ہونے لگتا اور اس کی رگ پھڑکنے لگتی۔ کوئی بھاری چیز ہمیشہ اس کو دبائے رہتی' وہ جتنا زیادہ اٹھنے کے لیے زور لگاتی ہمی کمی تیز ہو جاتی۔ اس بار وہ الگ ہو ہی گئی اور گھر میں گھوم پھر کر اس آواز کو تلاش کرنے لگی جو کبھی اونچی ہو جاتی اور کبھی بالکل نیچی۔ آواز کیا کہہ رہی تھی؟ اس نے کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا اور پھر ہم زاد گھوم پھر کر لوٹ آئی اور آ کر اس میں سما گئی۔ درد جاتا رہا۔ اس کو بالکل چین آ گیا اور اب اس نے آواز صاف سنی۔ "توموہ نے آج مجھ سے کہا تھا کہ ہم کو چاہیے کہ اس کو شہر والے بڑے گھر میں بھجوا دیں۔"

"اللہ معاف کرے' ہم سے آخر ایسی کیا غلطی ہو گئی جو ہم پر یہ بپتا پڑی ہے؟ بیٹا ہمارا بھاگ گیا اور اب ہماری اکیلی رہی سہی یہ بھی چلی جائے۔"

"پر یہ ٹھیک ہی ہو گا' میں ہو رہا ہوں بوڑھا اور زیادہ کما دھا نہیں سکتا۔ اپنی بستی میں تو کوئی اس کو اپنانے کا نہیں۔"

"میں راتوں کو دعاؤں پر دعائیں مانگتی ہوں۔ گرم چشموں کے پاس والے بڑ پر جاتی ہوں۔ وہاں دعائیں کرتی ہوں کہ اللہ اپنے کرم سے بچی کو ٹھیک کر دے مگر زندگی کے ڈھنگ کیسے نیارے ہیں۔ اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔"

"اللہ کی مرضی یونہی ہے' جو میں جوان اور جاندار ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی' لیکن تم جانو ہم کو تو پیٹ بھر چاول بھی نہیں جڑ پاتے اور اس وقت بھی سیٹھوں کا پانچ کنچا چاول کا دین دار ہوں۔"

"جانتی ہوں۔ پریوں اس کو چھوڑ آنا کوئی اچھی بات ہو گی کیا؟ ایسا مت کرو۔ ایسا کچھ کرو کہ یہ اپنے پاس ہی رہے۔ اب یہی تو ایک ہماری رہ گئی۔"

"اللہ مجھے معاف کرے جو میں بدی کروں۔ میں نے تو کتنے سالوں سے اس کو اپنے پاس ہی رکھے رکھا۔ پہلے میں سوچتا تھا کہ کوئی نہ کوئی اس کو قبول کر لے گا۔ مگر بستی میں تو کوئی اس کو اپنانے کا نہیں۔"

"سچ حسنہ کو دے دو۔ بس اسی کو دے دو۔"

"پھٹکار ہو اس پر' بڈھی چڑیل۔ جانتی ہو جب میں نے اس کے بدلے تم کو اپنا لیا تھا تو اس نے مجھ پر کالا ٹونا کر دیا۔ ارے اللہ جو میرا بیٹا لوٹ آئے تو میں اس کا سارا کیا دھرا معاف کر دوں۔ کالی بلا۔ کالی بلا۔"

اس کی اونچی آواز گونجنے لگی۔

اس کا درد پھر پلٹ پڑا۔ اس نے اپنی ہم زاد کو پھر سے اٹھتے اور گھر سے باہر جاتے محسوس کیا۔ اس نے اس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی۔ تھک ہار کر وہ پڑ رہی اور اپنی ہم زاد پر رات کی ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے محسوس کرتی رہی۔

اس کی ہم زاد ندی کی طرف چل دی۔ بندریا نے اپنی زنجیر کھڑکھڑائی اور جب اس نے آگے بڑھنے کے لیے پیر اٹھائے تو اس نے جھونپڑے میں سے اپنے بھائی کی آواز سنی۔



بشر نواز

سراب و خواب ہوئیں کل کی چاہتیں کتنی
ری ٹوٹتی ہیں رشتوں کی بھی حدیں کیسی

بس اپنی روح کی تنہائیوں کو رقتا ہوں
سبھی ہیں ویسے تو اطراف محفلیں کتنی

شریک معرکہ حق سبھی نہیں ہوتے
مرے بھی ساتھ تھیں احباب کی صفیں کتنی

نظر تھی سطح پہ گرداب کس نے دیکھے تھے
بڑی ہیں سادہ سی باتوں میں الجھنیں کتنی

جہاں زمیں کی، وہاں آسماں کی سرحد ہے
قدم قدم پہ ہیں محدود وسعتیں کتنی

ٹ صوتی اعتبار سے قوافی برتے گئے ہیں۔
● محلہ گھاٹی۔ اورنگ آباد۔ (مہاراشٹر)

اسلامی ممالک کی کہانیاں

دو دو دار قہقہے لگ رہے تھے۔ ایک اچھا اور ایک برا' بے حسنہ نے اس کو پکارا۔
"اندر آ جاؤ بچی۔ اندر آ جاؤ۔"
ایک قہقہا اور لگا جو عجیب قہقہوں سا معلوم دیا۔ اس کا بھائی پھر سے بولنا شروع ہو گیا۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی تو بندریا اس کے چاروں طرف چند لگا کر اپنی زنجیر سے اس کی ٹانگیں جکڑنے لگی۔
"تو بچی' ہم بڑی مصیبت میں وقت گزار رہے ہیں۔ تمہارا میاں لوہے میں اور ایک حنا اور۔ ہا۔ ہا۔"
"آ جاؤ بہن' سیانا کرامت تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔"
کوئی جھکا اور زنجیر ڈھیلی کر دی اور پھر بہت سارے ہاتھ اس کی ہم زاد کو ہر طرف سے جھونپڑے کے اندر کی طرف کھینچنے لگے۔
"یہاں بیٹھو بہن' ادھر سیانے کرامت اور بے حسنہ سے ملو۔ اس کی شادی جلدی ہونے والی ہے۔ ہا — ہا۔"
بے حسنہ پھر کھسکتی اس کے پاس آئی اور اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔
"یہ تمہارے لیے ہے بچی — ہا — ہا۔"
"کیا ہے؟"
"یہ میرا اور سیانے کرامت کا ہے۔"
پچکی سی چھوٹی سی چیز اس کے ہاتھ میں رینگی اور پھر پتلی سی آواز میں بلبلانے لگی' سیانا کرامت قہقہے پہ قہقہے لگاتا رہا۔ بے حسنہ نے ڈوری جیسی چیز اس کے ہاتھ میں دی اور بولی۔
"اس کو باندھ لو۔"
اور سیانے کرامت نے کہا "جب جنگل میں شیرانس سے تمہارا آمنا سامنا ہو جائے تو یہ اس کو دینا نہ بھولنا۔ وہ تم کو ساری دنیا کے خزانے دکھا دے گا۔ آئینوں کی بھی ضرورت نہیں' کیونکہ شیرانس دیکھ نہیں سکتا۔ وہ تو اندھا ہے۔ نرا اندھا۔ لیکن وہ تم کو دنیا بھر کے خزانے دکھائے گا — ہاہ — وہی خزانے۔"
"وہ تم کو تمہارا ابا دکھائے گا" بے حسنہ نے پھر سے قہقہا مارا۔ "وہ پہلے کیسا کڑیل تھا اور اب کتنا مریل ہو گیا ہے۔ اب تو سیانا کرامت ہی اس کو ٹھوک پیٹ کر شیرانس کے سامنے ڈال سکتا ہے — ہا — اور اس کے بعد تمہاری اماں کو — ہا — ہا — ہا۔"
اس کے بھائی نے بھی قہقہے لگائے۔
جھونپڑے میں شور بہت بڑھ گیا اور اچھا والا قہقہا اور برا والا قہقہا آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ اس کی گود والی چیز روئی اور کسی نے اس کے کان میں کوک ماری — بعد میں وہ یہ جان گئی کہ وہ اس کا اپنا بھائی تھا۔ پھر ایک لمبی سی رسی اس کی گردن میں ڈال دی گئی اور دھیرے دھیرے وہ چھوٹی سے چھوٹی ہونا شروع ہو گئی۔ جس وقت رسی کسی جا رہی تھی تو وہ پانی کے ریلے کی آواز سن سکتی تھی۔ اس کو گال تھتھاتے ہوئے لگے اور ناک پھولوں کی مہک سے بسی ہوئی لگی' قہقہوں کی گونج جاری رہی۔ اچھے والے بھی اور برے والے بھی۔ وہ خود بھی قہقہے مارنے لگی — ہا — ہا۔
جس وقت اس کی ہم زاد لوٹ کر آئی وہ اپنے کونے میں پڑی زور زور سے کسمسا رہی تھی۔ اس نے کروٹ بدلی اور جاگ اٹھی۔ اس نے اپنی ماں کو کمرے کے دوسرے سرے پر دبکے دبکے خراٹے لیتے سنا۔ اس نے اس کی قمیص ڈھونڈنے کے لیے ماں کا کپکپاتا اور بوڑھا منہ ٹٹولا۔ اچانک اس پر کھلا کہ وہ کئی راتوں سے جاگتی کیا تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اسی طرح اٹھی کہ ماں کی آنکھ نہ کھل جائے۔
جب وہ سیڑھیوں سے اتری تو چھپر کے نیچے بکریاں اور مرغیاں غل چل مچا رہی تھیں۔ اس نے بندریا کے بچے کو کھول دیا اور جس وقت وہ بے حسنہ کے جھونپڑے کی طرف چلی تو وہ اس کے بازو سے چمٹا رہا اور جب بے حسنہ کے جھونپڑے پر پہنچ کر بچے کو اس کی ماں کے پاس چھوڑا تو بندریا نے اپنی زنجیر کھڑکھڑائی۔
رات گرم تھی۔ وہ ندی کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ لوگ بتاتے کہ اگر وہ ندی پر جائے تو چاند اس کے ہاتھ لگ سکتا ہے۔ اس نے آسمان میں تو چاند ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن جب بھی سر اٹھاتی وہاں

[باقی صفحہ ۲۴۲ پر دیکھئے]

مصر

نجیب محفوظ

محمود احمد قاضی

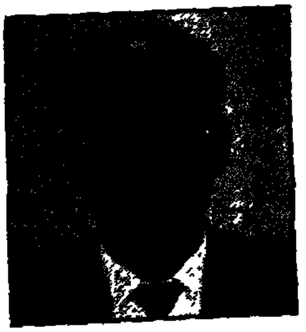
پلیس واک

وہ آدھی رات کے وقت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ ہمیشہ کسی گھڑی کے الارم پر انحصار کئے بغیر ہی اٹھ بیٹھتی تھی۔ ایک ایسی خواہش نے جس نے اس کے اندر جڑ پکڑ لی تھی بالکل صحیح وقت پر اسے دھکا دیا تھا۔ چند لمحوں تک اسے یقین نہ آیا کہ وہ جاگ چکی ہے۔ خواب اور تخیل کا ملا جلا تاثر اس کے ذہن میں موجود تھا۔ آنکھیں کھولنے سے پہلے وہ کسی قدر پریشان سی تھی اس ڈر سے کہ شاید نیند نے اسے دھوکا دیا ہے۔ آہستہ سے سر کو ہلاتے ہوئے اس نے کمرے میں موجود مکمل تاریکی کو دیکھنے کی کوشش کی۔ کوئی پتہ نہیں کہ اس وقت کیا بجا تھا۔ اس کے کمرے سے باہر گلی کا شور صبح ہونے تک جاری رہتا تھا۔ چاہے یہ شام ہو' آدھی رات ہو یا صبح ہونے سے پہلے کا وقت ہو وہ کافی ہاؤسوں اور شراب کی دکانوں سے اٹھتی آوازوں کی تک بک سن سکتی تھی۔ وقت کے تعین کے لئے اس کے پاس ایک حساس گھڑی جیسا اندرونی احساس اور گھر کو چاروں طرف گھیرنے والی خاموشی ہی تھی' جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے شوہر نے ابھی تک دروازے پر دستک نہیں دی اور یہ کہ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے ابھی تک اس کی چھڑی کے ٹکرانے سے آواز پیدا نہیں ہوئی۔

ٹھیک اس وقت اسے جاگ پڑنے کی عادت ہو گئی تھی۔ یہ ایک پرانی عادت تھی جسے اس نے اپنی جوانی کے زمانے سے اپنا لیا تھا اور اب جب کہ وہ پختہ عمر کی ہو چکی تھی' پھر بھی یہ عادت برقرار تھی۔ ایسا کرنا اس نے شادی شدہ زندگی کے دوسرے لوازمات کے ساتھ ساتھ ہی سیکھا تھا۔ وہ اپنے شوہر کی شام کی تفریحات سے واپس گھر لوٹنے کا انتظار کرنے کے لیے آدھی رات کو جاگ پڑتی تھی۔ پھر وہ اس کے سو جانے تک اس کی خاطر مدارات میں لگی رہتی۔ وہ نیند کے غلبے پر قابو پانے کے لیے پورے ہوش و حواس کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ وہ بسم اللہ پڑھ کر بستر سے باہر آئی اور فرش پر کھڑی ہو گئی۔ اس نے پہلے اپنی چارپائی اور پھر ایک کھڑکی کی چوکھٹ کے سہارے دروازے تک کا راستہ تلاش کیا۔ جب اس نے دروازہ کھولا تو بیٹھک میں پڑی ایک شیلف پر رکھے لیمپ کی مدھم روشنی کمرے میں در آئی۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے آگے بڑھی اور اندھیرے میں اس کے شیشے سے منعکس ہو کر اس کی پیلی روشنی کا دائرہ سا چھت پر لہرانے لگا اس نے صوفے کے ساتھ پڑی میز پر لیمپ کو رکھ دیا۔ روشنی ہر طرف پھیل گئی جس سے اس بڑے چوکور کمرے کی اونچی دیواریں' چھت اور اس کے متوازی شہتیر وغیرہ سب کچھ واضح طور پر نظر آنے لگا۔ سجاوٹ کا معیار بالکل عیاں تھا۔ شیرازی قالین' بہت بڑا پیتل سے بنا بیڈ' ایک بڑی الماری' مختلف رنگوں اور اشکال کے ڈیزائین سے مزین کپڑے سے ڈھکا ایک لمبا صوفہ۔

عورت اپنے سراپا پر ایک نظر ڈالنے کے لیے آئینے کی طرف بڑھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا براؤن سکارف شکنوں سے پر ہے اور کسی قدر پیچھے کی طرف کھسک گیا ہے۔ اس کے بھورے بال بکھر کر اس کے ماتھے پر پھیل گئے تھے۔ اس نے اپنی انگلیوں سے سکارف کی گرہ کو ٹٹولا اور اسے کھول دیا۔ اس نے سکارف کو اپنے بالوں کے گرد صحیح طور پر جمایا اور آہستگی اور احتیاط کے ساتھ اس کے دونوں سروں کو دوبارہ باندھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے چہرے کے اطراف کو یوں صاف کیا جیسے وہ نیند کی باقیات کو وہاں سے مٹانے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ چالیس سال کی ایک درمیانی جسامت کی عورت تھی مگر پتلی دبلی لگتی تھی حالانکہ اس کے بدن کی نرم جلد بے ڈھب نہ تھی بلکہ ایک نہایت ہی خوبصورت توازن کی حامل تھی۔ اس کا

شاعر



غلام حسین ساجد

الگ ہے میرے بدن سے نیام زر میری
بہت سکون سے ہوتی ہے اب بسر میری

کمند ڈالتا رہتا ہوں میں ستاروں پر
نہیں گرفت مگر اپنی خاک پر میری

شعاعِ مہر سے پیوست ہے مری شمشیر
وجودِ ماہ میں ضم ہو چکی سپر میری

خبر نہیں تھی مجھے فتح کی دعا کے وقت
مری شکست سے جھک جائے گی کمر میری

دھرا ہے بارِ دگر تخت اس کے قدموں میں
وہ رو دیا ہے مگر تیغ چوم کر میری

وہ ہو چکا ہے مری سلطنت کا اب حقدار
کہ فوج اس کے جلو میں ہے بیشتر میری

پلٹ سکوں گا میں کیا اس کے واسطے ساجد
جو منتظر ہے صفِ خواب سے ادھر میری

شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج بوسن روڈ۔ ملتان



عبداللہ کمال

وعدۂ وصل ہے، لذتِ انتظار اُٹھا
اور پھر، عمر بھر اک غمِ اعتبار اُٹھا

اس کا غم میرے دل میں ہے اب بانسری کی طرح
نغمۂ درد سے زخمۂ اختیار اٹھا

میں اٹھا، تو فلک سے بہت چاند تارے گرے
اور صحرائے جاں میں بہت غم غبار اٹھا

کچھ رہا میرے دل میں تو اک اضطراب رہا
میں سدا اپنی ہی خاک سے بے قرار اٹھا

اے خدا، رزقِ پرواز دے شہپروں کو مرے
میرے اطراف سے آسماں کا حصار اٹھا

تو مجھے آسماں دے، نہ دے، بے زمین نہ کر
دشتِ جاں سے مرے موسمِ نابکار اٹھا

یا مری آنکھ سے چھین لے سب خزانہ خواب
یا مرے خون سے خوف کا یہ فشار اٹھا

پوسٹ بکس ۴۷۳۶۳-اندھیری ویسٹ بمبئی ۵۸

اسلامی ممالک کی کہانیاں

ماتھا اونچا تھا اور قدرے لمبوترا چہرہ بے حد خوبصورت تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بہت حسین تھیں جو ہر وقت خوابیدہ سی لگتی تھیں۔ اس کی ناک بہت پتلی سی اور چھوٹی سی تھی جو نتھنوں پر آ کر قدرے پھیل گئی تھی۔ اس کے نازک ہونٹوں کے نیچے اس کی ٹھوڑی ذرا نوکیلی تھی۔ اس کے گورے چٹے گال پر ایک خوبصورت کالا سیاہ تل تھا۔ اپنے آپ کو ایک چادر میں لپیٹتے ہوئے بالکونی تک جانے کے لیے جب وہ دروازے کی طرف بڑھی تو کسی قدر جلدی میں لگتی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور لکڑی سے بنی جعفری سے چاروں طرف سے بند جگہ پر پہنچ کر کھڑی ہو گئی اور اپنے چہرے کو دائیں بائیں گھماتے ہوئے وہ جعفری کے ان چھوٹے چھوٹے گول سوراخوں سے لگ کر باہر جھانکنے لگی۔ جن کی وجہ سے اس کا سراپا باہر گلی میں سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ بالکونی پر سے قدیم رہائشی مکانوں پر بنے پانی کے حوضوں کے نیچے اترتی سیڑھیاں اور ایک اسکول کی اوپر کی طرف جاتی سیڑھیاں دکھائی دیتی تھیں۔ یہ علاقہ پیلس واک یا بین القصریاں کے درمیان واقع تھا۔ دو سڑکیں یہاں آ کر آپس میں مل جاتی تھیں۔ ال ساحین یا کاپر سمتھ سٹریٹ جو جنوب کی طرف جاتی تھی اور دوسری پیلس واک جو شمال کی طرف جاتی تھی۔ اس کے بائیں طرف گلی تنگ ہوتی اور موڑ مڑتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ یہ گلی اداسی میں لپٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور وہاں سے ماحول اور بھی زیادہ غم زدہ ہو جاتا تھا جہاں سے نیند میں ڈوبے گھروں کی کھڑکیاں نیچی دکھائی دیتی تھیں جو کہ صبح کے وقت تک کھلی رہنے والی دکانوں اور کافی ہاؤسوں کے دھندلے لیمپوں اور چھکڑوں سے برآمد ہونے والی مدھم روشنی میں گلی کی سطح سے زیادہ واضح نہیں دکھائی دیتی تھیں۔ اس کے دائیں طرف گلی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس طرف کوئی قالی ہاؤس نہیں تھا صرف بڑے بڑے سٹور تھے جو بہت جلدی بند ہو جاتے تھے۔ وہاں اس طرف دلچسپی کی والی خاص چیز نہ تھی سوائے قلاؤن اور برقوق کی درگاہوں کے ان میناروں کے جو روشن ستاروں کی روشنی میں رات کو سوگشت پر نکلے ہوئے بڑے بڑے دیوؤں کی طرح منڈلاتے ہوئے لگ رہے تھے۔ یہ وہ سارا منظر تھا جو پچھلے پچیس سالوں سے اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ وہ اس سے قطعاً بیزار نہ ہوئی تھی۔ اس یکسانیت کے مارے ماحول میں وہ رہ رہی تھی اس کے لیے شاید بیزاری یا دل لگی کا تاثر کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ یہ اردگرد کا ماحول ہی اس کی تنہائی کا ساتھی تھا اور ایک لمبے عرصے سے اس کے اکیلے پن کا واحد دوست تھا جب وہ اپنے بچوں کی پیدائش سے پہلے اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے محروم کر دی گئی تھی جب وہ ایک کمرے کے مکین گرد آلود صحن اور بڑے بڑے کمروں کی اونچی چھتوں والے اس دو منزلہ بہت بڑے مکان کی واحد مکین کی صورت میں اپنے دن رات گزارا کرتی تھی۔

ابھی وہ چودہ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کی شادی ہو گئی تھی اور پھر جلد ہی اپنے شوہر کے والدین کی موت کے بعد اس نے اپنے آپ کو اس بڑے گھر کی مالکن کے طور پر پایا۔ ایک بوڑھی عورت اس گھر کی دیکھ بھال کے لیے اس کی مدد کرتی تھی، لیکن وہ سرشام ہی، صحن میں بنے اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلی جاتی تھی اور یوں وہ بدروحوں اور بلاؤں سے بھری سیاہ راتوں میں اکیلی رہ جاتی تھی۔ وہ ایک گھنٹے تک اونگھتی رہتی اور دوسرے گھنٹے میں جاگتی رہتی، یہ جاگنے اور سونے کا عمل جاری رہتا حتیٰ کہ اس کا مشکوک شوہر اپنی رات کی لمبی سیر و تفریح کے بعد واپس پہنچ جاتا۔ اپنے ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے اس نے اپنی ملازمہ کے ساتھ، جس نے ہاتھ میں لیمپ پکڑا ہوتا تھا ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گھومنے پھرنے کی عادت اپنا لی تھی وہ ان کمروں میں گھومتے ہوئے ڈری، سہمی ہوئی نظروں سے کچھ تلاش کرتی رہتی تھی۔ وہ پہلی منزل سے شروع کرتی اور اوپر والی منزل تک جاتی، اس دوران وہ بدروحوں کو بھگانے کے لیے قرآن کی سورتیں پڑھتی رہتی۔ وہ اس کام کو اپنے کمرے پر پہنچ کر ختم کرتی اپنے کمرے کے دروازے کو تالا لگاتی اور پھر بستر پر چلی جاتی مگر گہری نیند میں جانے سے پہلے تک وہ قرآنی آیات کی تلاوت جاری رکھتی۔

پہلے پہل وہ اس گھر میں رہتے ہوئے رات سے بہت خوفزدہ رہتی تھی۔ وہ انسانوں سے زیادہ جنات کی دنیا سے بہتر طور پر واقف تھی، اور اس کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ اس بڑے مکان میں اکیلی نہیں رہتی۔ ایک عرصے سے بالکل خالی رہنے والے اس مکان کے بڑے بڑے کمروں سے جنات بھلا کیسے دور رہ سکتے تھے۔ شاید انہوں نے اس کے اس گھر میں آنے سے پہلے حتیٰ کہ اس کے دن کی روشنی دیکھنے سے پہلے



عرفان صدیقی

پرندنامہ بری میں کہاں سے آتے ہیں
سخن یہ بے خبری میں کہاں سے آتے ہیں

ہمیں بھی یاد نہیں ہے کہ ہم شرر کی طرح
ہوا کی ہم سفری میں کہاں سے آتے ہیں

دروں میں آنکھیں، گھروں میں چراغ جلتے ہوئے
یہ خواب دربدری میں کہاں سے آتے ہیں

مسافتیں کوئی دیکھے کہ ہم سرابوں تک
گمانِ خوش نظری میں کہاں سے آتے ہیں

یہ کون جادۂ گم گشتگاں اجالتا ہے
فرشتے دشت وتری میں کہاں سے آتے ہیں

اگر تراوشِ خونِ جگر نہیں کوئی چیز
تو رنگ بے ہنری میں کہاں سے آتے ہیں

عظمت منزل، حیدر مرزا روڈ گولہ گنج، لکھنؤ

ہی یہاں سکونت اختیار کرلی تھی۔ وہ اکثر اوقات ان کی سرگوشیاں سنتی تھی۔ کئی بار وہ سوتے ہوئے ان کے گرم سانسوں کے احساس سے جاگ پڑتی تھی۔ جب وہ بالکل اکیلی رہ جاتی تو وہ قرآنی آیات کی تلاوت ہی میں اپنے آپ کو محفوظ پاتی، زیادہ تر اس کی ایک سو بارہویں سورۃ کی تلاوت میں، جس میں خدا کی مطلق حاکمیت کو بیان کیا گیا ہے یا پھر وہ جھنری کے چھوٹے سوراخوں سے گلی بڑی بے چینی سے کافی ہاؤسوں اور جھگڑوں کی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے نہایت احتیاط سے کسی کی کھانسی یا ہنسی کی آواز کو سننے کی کوشش کرتی تاکہ اس طرح وہ اپنے حواس بحال کر سکے۔

پھر ایک کے بعد ایک بچے پیدا ہوتے گئے۔ اپنے ابتدائی دنوں میں جب بچے ابھی نوخیز ہی تھے وہ اس کے خوف کو دور کرنے یا اس کو ڈھارس بندھانے میں ممد معاون ثابت نہ ہوئے۔ اس کے برعکس، ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری کے احساس، اور اس ڈر فکر سے کہ کہیں ان کو نقصان نہ پہنچ جائے اس کا خوف کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ وہ منتروں، ٹونے ٹوٹکوں، تعویذ اور قرآنی سورتوں کی حفاظت میں سوتے جاگتے ان کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے، ان کے اردگرد رہتے ہوئے، ان پر اپنی محبت نچھاور کرتے ہوئے وقت گزارتی تھی۔ جب تک کہ اس کا شوہر اپنی شام کی تفریحات سے واپس نہ آ جاتا اس وقت تک اسے مکمل ذہنی سکون حاصل نہ ہوتا۔

اکثر ایسا ہوتا کہ جب وہ اپنے کسی شیرخوار بچے کو سلانے کے لیے جھولا جھلا رہی ہوتی تو اچانک وہ اسے اپنے ساتھ چمٹاتے ہوئے اپنے سینے سے لگا لیتی۔ وہ نہایت غور سے کچھ سنتے ہوئے خوفزدگی کے عالم میں کسی خطرے کو بھانپ کر کمرے میں موجود کسی ذی روح کو مخاطب کر کے اونچی آواز میں کہتی "ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔ تمہارا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں بنتا ہم مسلمان ہیں اور ایک خدا پر یقین رکھتے ہیں۔" اور پھر وہ جلدی سے نہایت خشوع و خضوع سے قرآن کی ایک سو بارہویں سورت پڑھتی، جس میں خدا کے بے مثل ہونے کی دلیل دی گئی ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اس نے روحوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا تجربہ حاصل کر لیا تو اس کا خوف کافی حد تک کم ہو گیا۔ اب وہ بغیر ڈرے ہوئے نہایت خاموشی سے ان کے ساتھ معاملات کرنے لگی۔ اگر وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنے قریب دبے پاؤں چلتا ہوا محسوس کرتی تو وہ تقریباً ایک مانوس لہجے میں کہتی "کیا تمہارے پاس ان لوگوں کے لیے کوئی عزت نہیں جو اپنے مہرباں خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ وہی ہماری حفاظت کرنے والا ہے، اس لیے مہربانی کر کے یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔" لیکن اس کا ذہن اپنے شوہر کی واپسی تک کبھی بھی مطمئن نہ ہوتا۔ بے شک سوتے ہوئے یا جاگتے ہوئے، اس کے شوہر کی گھر میں موجودگی ہی اس کے تحفظ کے احساس کے لیے کافی تھی۔ اس وقت اس بات کی کوئی وقعت نہ ہوتی کہ آیا دروازے کھلے ہیں یا بند ہیں، لیمپ جل رہا ہے یا کہ بجھا ہوا ہے۔

اپنے شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے، پہلے سال کے دوران متواتر راتوں کو باہر رہنے پر جب اس نے نرم لہجے میں کمزور سا احتجاج کیا تو اس کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا۔ اس کے جواب نے اسے دہلا کر رکھ دیا تھا، اس نے نہایت تحکمانہ لہجے میں اونچی آواز سے کہا تھا "میں ایک مرد ہوں۔ میرا کام حکم دینا اور ممانعت کرنا ہے۔ میں اپنے کسی رویے پر تنقید کو قبول نہیں کروں گا۔ جو میں تم سے چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ تم میرا حکم مانو۔ مجھے سختی برتنے پر مجبور نہ کرو۔"

اس واقعے سے اس نے سبق لیا اور دوسرے سبق جو اس نے حاصل کیے وہ یہ تھے کہ وہ ماحول سے مطابقت کر لے، حتیٰ کہ اس کی غضبناک آنکھ کی چمک سے بچنے کے لیے اسے جنوں کے ساتھ بھی زندگی بسر کرنا پڑے گی۔ بغیر کسی شرط یا استحقاق کے اپنے شوہر کا حکم ماننا اس کا فرض تھا۔ وہ اس حد تک مغلوب ہو چکی تھی کہ تنہائی میں بھی وہ یوں راتوں کو اس کے باہر رہنے پر کوئی الزام نہ دھرپاتی۔ اس نے اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ صحیح مردانہ پن، جبر اور آدھی رات کے بعد بھی گھر سے باہر رہنا دراصل کسی ایک شخص کی عام خصوصیات تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، چاہے وہ خوش تھی یا ناخوش اس نے اپنی سزا کو بہ رضا و رغبت قبول کر لیا تھا۔ کچھ ہی کیوں نہ ہو جاتا، وہ ہمیشہ ایک محبت کرنے والی، تابعدار اور مطیع بیوی کی طرح رہتی۔ شکست پر مبنی تحفظ کے اس انداز سے سمجھوتہ کرنے پر اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔

جب بھی اس نے اپنی پچھلی زندگی کو یاد کرنے کی کوشش کی تو ہمیشہ اچھائی اور خوشی کا تاثر ہی اس کے ذہن میں آیا۔ خوف اور غم اس کے نزدیک بے معنی ہو چکے تھے ایک رحم بھری مسکراہٹ سے زیادہ ان کی وقعت نہ تھی۔ اگر وہ اپنے اس شوہر کے ساتھ نہ رہ رہی ہوتی' اور اس نے پچیس سال پر محیط محرومیاں نہ سہی ہوتیں' تو وہ ان بچوں کی ماں نہ بن پاتی جو کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے اور زندگی کے تمام تر لوازمات اور آسائشات سے پر یہ گھر بھی اسے نہ ملتا اور یہ خوش کن باشعور زندگی بھی اس کا مقدر نہ بن پاتی؟ یقیناً اس کے پاس یہ سب کچھ تھا۔ ایک جن کے ساتھ زندگی بسر کرنا قابل برداشت بات تھی اور اسی طرح ہر شام بھی قابل برداشت تھی۔ جنوں میں سے کسی نے بھی اسے یا اس کے بچوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔ انہوں نے اسے تنگ کرنے کے لیے چند ایک ضرور سی شرارتیں ہی کی تھیں۔ "خدا کی تعریف بیان کی جانی چاہیے کہ تمام اچھائیاں اسی سے منسوب ہیں۔"

گرچہ اس طرح اس کی خوشگوار نیند خراب ہوتی تھی اور وہ گھریلو کام کاج' جسے کہ دن کے وقت ہی ختم ہو جانا چاہیے تھا' اس وقت تک اسے کرنا پڑتا تھا مگر پھر بھی اس طرح اس کے آنے کے وقت کا انتظار اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ انتظار اس کی بہت سی یادوں سے وابستہ زندگی کا ایک لازمی عنصر بن چکا تھا' بلکہ وہ ہر آنے والی رات کو اپنے اس انتظار کے حوالے سے اپنے مرد کے ساتھ اپنی بے پناہ محبت' دلی اپنایت اور اسے خوش رکھنے کی ایک زندہ علامت کے طور پر اپنی تابع فرمانی کا اظہار کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ بالکونی میں کھڑی وہاں سے پیلس واک اور النحو حش کے مناروں اور یا پھر جامع السلطان یا مت کے میناروں کا نظارہ کرتی تو اس کی رات صبر و شکر و قناعت کا ایک سنہری نمونہ ہی ہوتی۔

وہ سب کے دو رویہ سے بنے دکھتے ہیں سے آپس میں پیوست مکانوں پر نگاہیں ڈالتی جو سکوں کی حالت میں لیٹے ان سپاہیوں کی قطار کی طرح لگتے تھے' جیسے کہ وہ سخت قسم کے نظم وضبط سے آزاد ہو کر آرام کر رہے ہوں۔ وہ سڑک کے اس بیہودہ نظارے سے محظوظ ہوتی ہوئی مسکراتی جو صبح ہونے تک جاتی رہتا تھا' مکان' مینار اور گلیاں اس وقت نیند میں ڈوبی ہوتی تھیں۔ یہ منظر نیند کی طرف سے اس کی توجہ ہٹا دیتا اور اس کے خوف کو دور کیے ہوئے اس کی تنہائی کا ساتھی بنا رہتا۔ رات اردگرد کے ماحول کو ایک ایسی گہری خاموشی کے سپرد کر دیتی جس میں گلی میں سے برآمد ہونے والی ہر آواز یوں واضح ہو جاتی جیسے کسی پینٹنگ کے کناروں پر موجود Shades اس کے کام کو گہرائی اور وضاحت بخشتے ہیں۔ کسی قہقہے کی آواز یوں گونجتی جیسے کہ کوئی اس کے کمرے میں قہقہے لگا رہا ہو' اور ایک دھیمے لہجے میں کی گئی بات بھی بالکل واضح طور پر سنائی دیتی تھی۔ وہ کسی شخص کی کھانسی کی کھرکھراہٹ کو آخر میں ایک کراہ میں تبدیل ہوتے ہوئے بھی سن سکتی تھی۔ یہاں سے کسی ریسٹورنٹ کے ویٹر کی آواز ایک موذن کی پکار کی طرح لگتی تھی۔ "پائپ کے لیے تھوڑا اور مسالہ لاؤ بھئی" اور یہ سن کر وہ اپنے آپ سے کہتی "خدا کی پناہ۔ یہ لوگ رات کے اس پہر کو مزید تماکو مرے کا آرڈر دے رہے ہیں؟"

وہ اسے اپنے غیرحاضر شوہر کی یاد دلاتے تھے۔ وہ فکرمند ہو کر سوچتی۔ "بھلا اس وقت وہ کہاں ہو گا' کیا کر رہا ہو گا؟ بہرحال جہاں کہیں بھی وہ ہے اور جو کچھ بھی کر رہا ہو اسے صحیح سلامت ہونا چاہیے۔"

ایک بار اسے باور کرایا گیا تھا کہ مسٹر احمد عبدالجواد جیسے دولت مند' منجھا اور خوبصورت مرد جو اپنی راتیں باہر گزارنے کے عادی ہوں' کسی دوسری عورت کی زلف کے اسیر ہوتے ہیں۔ اس وقت اس کی زندگی حسد کے زہر سے آلودہ ہو گئی تھی اور وہ ایک گہرے غم میں گھر گئی تھی۔ اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ اس سے اس بارے میں کچھ پوچھ سکے' لیکن اس نے اپنے اس دکھ کا اظہار جب اپنی ماں سے کیا تو اس نے رحم لیجے میں بھرپور طریقے سے اس کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا "اس نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد تم سے شادی کی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو اسے بھی اپنی بیوی کے طور پر رکھ سکتا تھا۔ یا دو تین چار بیویاں بھی رکھ سکتا تھا۔ اس کے باپ کی کئی بیویاں تھیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تم اس کی واحد بیوی ہو۔"

اگرچہ اس کی ماں کے ان الفاظ نے اس کی کوئی خاص ڈھارس نہ بندھائی تاہم آخرکار اس نے ان کی صداقت' اور معقولیت کو تسلیم کر لیا۔ اگر اس افواہ میں کوئی صداقت بھی تھی تو شاید راتوں کو دیر سے



مصوّر سبزواری

❀

ہوئی ہیں مدتیں اس گرد بے خبر کو گئے
نہ جانے کون مسافر تھے کس سفر کو گئے!

سفر کے بیچ وہ افسردگی کا حملہ تھا
سفر کے ذائقے سب تلخیٔ سفر کو گئے

تو حرفِ حق کی طرح آخری بیان تو دے
رہا ضمیر جو چپ دونوں عمر بھر کو گئے

عجیب تھی رسم کہ خوشبو کے قافلے بھی وہاں
طواف کرنے کسی شاخ بے ثمر کو گئے

ملا نصیب سے آشوب وقت آنکھوں کو
شبوں کو رت جگے اور خواب سب سحر کو گئے

بہت شدید تھے الزام زندگی آخر
سزائیں کاٹ کے ہم لوگ اپنے گھر کو گئے

● نوح ضلع گڑگاؤں ــــ (ہریانہ)



خالد اقبال یاسر

شورِ دنیا سے توجہ منقسم ہونے لگی
کیا عمارت تھی جو آخر منہدم ہونے لگی

پھر سے تو دینے لگا سینے میں خواہش کا دیا
وہ جو طے ہونے کو تھی لا مختتم ہونے لگی

کیا ہوئی میری وہ عفو و درگذر کرنے کی خُو
کیوں طبیعت رفتہ رفتہ منقسم ہونے لگی

جاں کے ایواں سے شکوہِ دردہی جاتا رہا
چشمِ فیض آسا مری نا مختتم ہونے لگی

منتشر ہونے لگی یاسر نگاہِ مرتکز
چھوٹی چھوٹی بات دل پہ مرتسم ہونے لگی

● اکادمی ادبیاتِ پاکستان ایچ ۸/۱ اسلام آباد

انے اور جبر کرنے کی طرح یہ بھی مہوانہ پن کی ایک اور خصوصیت تھی۔ سرطور ست سی برائیوں کے مقابلے میں صرف ایک برائی تو پھر بھی اچھی تھی۔ محض ایک شک کی بنیاد پر اپنی یہ دوستیں اور راحت بھری دنیا تباہ کرنا ایک غلطی ہی ہوتی۔ مزید یہ کہ ہر چیز کے باوجود شاید یہ افواہ محض ایک تصور یا ایک جھوٹ ہی تھی۔ اس نے جانا کہ حسد اس کی زندگی میں پہلے سے موجود دکھوں اور تکلیفوں سے کچھ زیادہ مختلف چیز نہیں تھا۔ ان دکھوں اور تکلیفوں کی حقیقت کو تسلیم کرنا ایک اٹل اور حتمی بات تھی۔ ناقابلِ قبول حالات کے خلاف جدوجہد کا ایک بڑا ذریعہ اس نے اپنی روحانی طاقت اور صبر سے کام لینے کو قرار دیا۔ حسد اور اس کے محرک کو اس نے اپنے شوہر کی دوسری دکھ دینے والی خصوصیات یا جن کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے مترادف پایا۔

وہ بدستور سڑک کی طرف دیکھتی رہی اور لوگوں کی گپ شپ سنتی رہی' حتیٰ کہ اس نے گھوڑے کے سموں کی آواز سنی۔ اس نے اپنا سر اٹھا کر سڑک کی طرف گھمایا اور اندھیرے میں روشن لیمپوں کے ساتھ ایک بگھی کو آہستہ آہستہ قریب آتے دیکھا۔ وہ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے بڑبڑائی "آخرکار۔۔۔" یہ اس کے شوہر کے ایک دوست کی بگھی تھی اور وہ بگی اور دوستوں کے ساتھ جو یہاں انگو مغش ہی میں رہتے تھے شام کی اس معمول کی سیر و تفریح کے بعد اس بگھی کے مالک کی وساطت سے اپنے گھر واپس لوٹ رہا تھا۔ بگھی گھر کے بالکل سامنے آ کر رک گئی اس کے شوہر کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی "فی امان اللہ"

جب اس کے شوہر نے اپنے دوستوں کو خدا حافظ کہا تو اس کی آواز کو اس نے ایک حیرت آمیز محبت کے ساتھ سنا۔ اگر اس نے اس کی آواز کو یوں ہر رات نہ سنا ہوتا تو اسے اس کا کبھی یقین نہ آتا۔ وہ اور اس کے بچے اس کی سنجیدگی' وقار اور ہوشمندی ہی کے عادی تھے۔ اس وقت نہ جانے کس طرح وہ ایک کھلنڈرے اور چنچل اطوار کے حامل شخص میں ڈھل گیا تھا؟ بگھی کے مالک نے اس کے شوہر کو یہ کہتے ہوئے چھیڑا "جب تم بگھی سے اتر رہے تھے تو کیا تم نے سنا کہ گھوڑا اپنے آپ سے کیا کہہ رہا تھا؟ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ کتنی قابلِ رحم بات ہے کہ میں جس شخص کو ہر رات گھر واپس لاتا ہوں وہ تو ایک گدھے پر سواری کرنے کے لائق ہے۔"

بگھی میں موجود تمام لوگوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ اس کے شوہر نے ان کے خاموش ہونے کا انتظار کیا اور پھر جواب دیا "کیا تم نے جواب نہیں سنا۔۔۔ میں نے کہا تھا کہ اس صورت میں "تم" پر سوار ہونا پسند کروں گا۔"

سب لوگ ایک بار پھر ہنس پڑے۔ بگھی کے مالک نے کہا "باقی لطیفے ہم کل رات کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔"

بگھی پیلس واک کی طرف بڑھ گئی اور اس کا شوہر اپنے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے بیڈ روم میں جانے کے لیے بالکنی چھوڑ دی۔ لیمپ اٹھا کر وہ بیٹھک میں آ گئی اور پھر ہال میں آ کر سیڑھیوں کے اوپری سرے پر کھڑی ہو گئی۔ وہ باہر کے دروازے کے کھلنے بند ہونے اور چٹخنی لگانے کی آواز سن سکتی تھی۔ پھر اس نے تصور میں' اس لمبے قد کے آدمی کو صحن عبور کرتے دیکھا جس نے اپنی سنجیدگی اور متانت کو تکلیف دہ سی مذاق میں ڈبو دیا تھا' اگر اس نے اوپر سے سب کچھ سن نہ لیا ہوتا تو وہ کبھی ایسی کسی بات پر یقین نہ کر پاتی۔ سیڑھیوں پر اس کی چھڑی کی نوک کی آواز کو سنتے ہوئے اس نے اسے راستہ دکھانے کی خاطر جنگلے کے اوپر سے لیمپ کو اونچا کر کے اٹھا لیا۔۔۔۔" ✽

بقیہ صفحہ ۸ ذرا سی لڑکی

کچھ بھی نہ پاتی۔ ہو سکتا ہے اب کے بار وہ ہاتھ لگ سکتا ہے۔ ندی کے اندر۔

اس نے اپنے آگے سے شنیاں اور پتیاں ہٹائیں اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی گھاٹ تک پہنچ گئی۔ گھاٹ پر دھرنا دے کر اس نے اپنا سر جھکایا۔ وہ شہر والے اس بڑے گھر جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ یہیں رہنا چاہتی تھی اور ندی میں چاند کو کھوجنا چاہتی تھی۔

جب وہ گھاٹ سے نیچے اتری تو پانی اس کو ٹھنڈا لگا۔ ✽



رشید منظر

بگڑا مزاجِ اہلِ زمانہ دکھائی دے
آشفتہ سر مری بھی تمنا دکھائی دے

رنگوں کا امتزاج سنورتا دکھائی دے
کوئی حسین نقش ابھرتا دکھائی دے

گرداب رنج و غم میں سسکتی ہے نبضِ زیست
آنکھیں مگر ہیں وا کہ مسیحا دکھائی دے

فرصت کہاں کہ اپنا محاسب بنے کوئی
آئینہ سامنے ہو تو چہرہ دکھائی دے

بیٹھا ہوں انتظامِ بہاراں کیے ہوئے
تاریکیاں چھٹیں تو سویرا دکھائی دے

سمجھائے کون رازِ دروں حیات کو
یہ کارگاہِ زیست تماشہ دکھائی دے

جب چشمِ انتظار ہو در سے لگی ہوئی
سایہ ہو غیر کا بھی تو تیرا دکھائی دے

174-WHITTINGTON WAY
PINNER MIDDX HA5 5JY LONDON.

سوڈان

عبداللہ حامد الامین
ستار طاہر

آخری سوچ

وہ اپنی بپتا ہر کسی کو سنانے بیٹھ جاتا۔ سننے والا کون ہوتا؟ اسے اس سے کچھ غرض نہ تھی اپنی بپتا سناتے ہوئے وہ کبھی نہ تھکتا۔ اسے کسی موقع اور اشارے کی ضرورت رہتی اور وہ شروع ہو جاتا۔ اس کے باوجود وہ اپنی سوچ کو ہوا لگنے نہیں دے رہا تھا، جس نے اس کے پورے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

فوج سے سبکدوش ہونے کے بعد اس نے زرعی آلات بنانے والی ایک بڑی فرم میں چوکیدارے کا کام سنبھال لیا تھا۔ اس کا کام مال بردار ڈبوں کی نگرانی کرنا تھا ریل کے یہ ڈبے پورے ملک میں اس زرعی فرم کی مصنوعات کو پہنچاتے تھے۔ بعض اوقات رات کی شفٹ میں وہ اونگھنے لگتا تھا۔ وہ کسی ایسے ڈبے کے پاس بوریاں بچھا کر لیٹ جاتا جسوں نے اگلی صبح مال لے کر روانہ ہونا تھا۔ وہ اس واقعہ کو اپنی بدقسمتی کے سوا کیا نام دے سکتا تھا کہ ایک رات ایک مال گاڑی اس گاڑی سے ٹکرا گئی جس میں وہ سو رہا تھا، گاڑی تیز رفتار تھی یا قسمت نامہرباں کہ وہ اچھلا، اور پٹڑی پر گر گیا، وہ بھی ایسے کہ پہیوں کے نیچے آگیا۔

یہ سب کچھ ایک منٹ میں ہو گیا تھا۔

مزدور بھاگ کر اس کے پاس پہنچے۔ حیرت سے گم سم وہ اس شخص کو دیکھ رہے تھے جو چند گھنٹے پہلے ان کے ساتھ کھا پی رہا تھا۔ اب اس کی بدقسمتی نے اسے ریل کے پہیوں کے نیچے لا پھینکا تھا۔ مزدوروں کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ان کی آنکھیں کچھ اور دیکھ رہی تھیں اور کان کچھ اور ہی سن رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "میرے پاس کیوں کھڑے ہو بھائیو۔ جاؤ اپنا کام کرو، اوہ میری ٹانگیں۔!"

اسے وقت کا احساس نہیں رہا تھا۔ کب بے ہوش ہوا اور کیا ہوا، جب اس نے بڑی مشکل سے اپنی آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو ایک صاف ستھرے پلنگ پر پایا کمرہ بھی صاف ستھرا تھا، آہستہ آہستہ اس نے یاد کرنا شروع کیا، جیسے وہ کسی دھندلے خواب کی یاد تازہ کر رہا ہو، پھر اس نے اپنا ہاتھ پھیلایا اور اسے اپنے کولہے تک لے گیا، اس نے اپنی داہنی ٹانگ کو موجود نہ پایا۔ اس پر بجلی سی گری، وہ دم بخود رہ گیا اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ بائیں طرف پھیلایا۔ اس کی بائیں ٹانگ بھی موجود نہ تھی۔ اس کے باوجود اپنی ٹانگوں کی موجودگی کے احساس سے اس کا ذہن خالی نہ ہوا تھا۔ ہاں ایک درد تھا جو کولہے کے نیچے پھیل رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی ٹانگوں کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ پٹیوں کے لمس کے سوا اس کے ہاتھوں نے کچھ محسوس نہ کیا۔ تب اس پر انکشاف ہوا کہ اس کی ٹانگیں کٹ چکی ہیں۔

دن گزرتے گئے، ہسپتال میں بھی اس کا جی لگ گیا۔ اب اسے مصنوعی اعضا استعمال کرنے کیلئے مختلف قسم کے مراحل اور ورزشوں کا کورس پورا کرنا پڑا تھا۔

طلعت کی کہانی جب اختتام کے قریب ہوتی تو اپنی ٹھوڑی کھجانے لگتا۔ ایک عرصے سے اس نے شیو کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی مونچھیں بڑی بڑی اور سفید تھیں۔ مونچھوں کے سرے تمباکو نوشی کی کثرت سے بھورے ہو چکے تھے۔ ایسا شاذ و نادر ہی دکھائی دیتا کہ وہ اپنی بپتا سنا رہا ہو اور سگریٹ اس نے ہونٹوں میں ٹھونسا ہوا نہ ہو۔ وہ بہت سستے سگریٹ پیتا تھا اور کھانستا بھی رہتا تھا۔ بدبودار تمباکو کا دھواں اس کے پاس بیٹھنے اور کہانی سننے والوں کو ناگوار گزرتا۔

اسے ایک وہیل چیئر دیدی گئی، جو پرانی تھی اور استعمال شدہ۔ وہ اس پر بیٹھا یوں دکھائی دیتا جیسے اس نے اپنی ٹانگوں کو کمبل سے ڈھانپ رکھا ہے۔ اس کے وہ ہاتھ جن پر رگیں ابھری ہوئی تھیں، پہیوں کو



جعفر شیرازی

بس اِک خیال ہے اور میرے بس سے باہر ہے
ترا وصال مری دسترس سے باہر ہے

نہیں ہے ایک سا عالم چمن کے اندر بھی
صبا کا شور حدودِ قفس سے باہر ہے

اب آ کے دیکھ ترے بعد گلشنِ جاں سے
قدم بہار کا کتنے برس سے باہر ہے

ہوا کے ساتھ نہ رہ ہمرہِ غبار کہ تو
صبا ہے اور زدِ خار و خس سے باہر ہے

ابھی تو وہ بھی نہیں میں نے طے کیا جعفر
وہ فاصلہ جو صدائے جرس سے باہر ہے

● ۵۵۴-کے شیراز کاٹیج، نزد ٹاؤن ہال
(پاکستان)

بکھر دیتے اور گھماتے جاتے۔ بعض اوقات طحہٰ اپنی وہیل چیئر کو حرکت دینے کی زحمت سے بچ جاتا۔ ایسا تب ہوتا جب اس کا دوست احمد اس کے پاس ہوتا۔

احمد آٹھ نو برس کا بچہ تھا۔ وہ کسی ایسے مرض میں مبتلا تھا' جس نے اسے گونگا اور بہرہ بنا دیا تھا۔ اس کا جسم دبلا پتلا تھا اور وہ دائیں طرف جھک کر چلتا تھا۔ طحہٰ کو دیکھ کر وہ ناقابل فہم آوازیں نکالتا اور اس کی وہیل چیئر کو دھکیلنے لگتا۔

احمد کو اپنی طرف آتے دیکھ کر طحہٰ کا چہرہ مسرور اور روشن ہو جاتا۔ ایسی خوشدلی اور مسرت سے اس نے کسی کا استقبال نہ کیا تھا۔ اس کی اب سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ بھی کسی بچے کا باپ ہوتا۔ یہ خواہش اب اتنی شدت اختیار کر چکی تھی کہ وہ یہاں تک سوچنے لگا تھا کہ اس کا بیٹا ضرور ہونا چاہئے خواہ وہ احمد کی طرح گونگا اور بہرہ ہی کیوں نہ ہو احمد کی آنکھیں بڑی بڑی اور روشن تھیں یہی ذہین آنکھیں تھیں جو ہر بات سمجھ لیتی تھیں۔

طحہٰ نے اپنی زندگی کے مختلف اوقات میں چار شادیاں کی تھیں اور یکے بعد دیگرے سب کو طلاق دیدی تھی۔ ان میں سے کسی کے ساتھ اس کی نبھ نہ سکی تھی اور کوئی اسے اولاد نہ دے سکی تھی۔ وہ اسے اللہ کی رضا سمجھتا تھا' لیکن اب بیٹے کی آرزو شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے دوست احمد کو سستی میٹھی گولیاں خرید کر دیتا تو احمد خوشی سے پھولے نہ سماتا اور خود وہ بھی بہت خوش ہوتا۔

ٹانگیں کھو دینے کے بعد اس نے صرف احمد ہی سے دوستی نہ کی تھی' بلکہ ایک مرجھلی' بدوضع بلی کو بھی اپنے دوستوں کے زمرے میں شامل کر لیا تھا۔ جب اس نے اس کو پہلی بار دیکھا تھا وہ بھوک سے بلبلا رہی تھی۔ طحہٰ نے اپنے کھانے سے ایک بوٹی اٹھا کر اس کے سامنے ڈال دی اور یوں اس کی اور بلی کی دوستی پکی ہو گئی۔ وہ اپنا بیشتر وقت طحہٰ کے پاس گزارتی' کھانے کے وقت وہ اس کا حصہ بھی اس کے سامنے ڈال دیتا تھا۔ وہ اسے اشارہ کرتا تو وہ بھاگتی چلی آتی۔ ساتھی مریضوں سے وہ بڑے فخر کے ساتھ بلی سے اپنی دوستی کا ذکر کیا کرتا تھا۔ یقیناً وہ منظر بہت دلچسپ اور مضحکہ خیز ہوتا' ایک آدمی وہیل چیئر پر بیٹھا ہے۔ ایک گونگا بہرہ بچہ دائیں طرف کو جھکا' وہیل چیئر کو دھکیل رہا ہے اور ایک بدوضع مرجھلی بلی' کبھی وہیل چیئر کے ساتھ ساتھ اور کبھی آگے آگے چل رہی ہے۔ مریض اس منظر سے بہت محظوظ ہوتے۔

طحہٰ سمجھنے لگا تھا کہ احمد اور بلی نے اس کی تنہائیوں کو ختم کر دیا ہے۔ وہ سوچتا' "یہ دونوں ایسی روح ہیں جو معصوم ہیں۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔" وہ خدا کا شکر ادا کرتا اور اپنے دل میں کہتا "ایسے بے ریا اور بے ضرر دوست بھلا دنیا میں کب کسی کو ملتے ہیں۔"

پھر آہستہ آہستہ وہ اس ماحول سے ناخوش ہونے لگا۔ ساتھی مریض بھی اسے اب اچھے نہ لگتے تھے۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ لوگ بدل گئے ہیں۔ نوجوان بیمار اور اپاہج لڑکیوں اور عورتوں کو زچ کرتے ہیں اور جو پختہ عمر مریض تھے وہ اسے متکبر اور مغرور لگتے۔ ان میں سے صرف ایک شخص ایسا تھا جسے مل کر وہ ناگواری محسوس نہ کرتا تھا۔ الشیخ سید' پنجگانہ نماز ادا کرتا' ایسے لحن سے تلاوت کرتا کہ وہ آنکھیں بند کر لیتا اسے یوں لگتا جیسے یہ آواز اس کے کانوں سے ہوتی ہوئی دل میں اتر رہی ہے۔ مغرب کے بعد عشا سے پہلے تک الشیخ سید' پیغمبر اعظمؐ کی بصیرت پر گفتگو کرتا تو طحہٰ کا رواں رواں عقیدت سے بھیگ جاتا' لیکن جانے کیا بات تھی کہ الشیخ سید کے اصرار کے باوجود وہ نماز نہیں پڑھتا تھا' وہ اپنے آپ سے عہد کرتا' رمضان شروع ہو جائے تو میں نماز بھی شروع کروں گا اور روزے بھی رکھوں گا۔

الشیخ سید کسی صبح اس کو کافی کی دعوت بھی دے دیتے۔ گرم گرم کافی کی چسکیاں لیتے وہ گفتگو شروع کر دیتے۔ طحہٰ بتاتا کہ دیہات میں اب بھی کافی بڑی مہارت سے بنائی جاتی ہے۔ شہر کے لوگ تو کافی بنانے اور پینے کے آداب ہی بھول گئے ہیں' کافی کی بجائے چائے جیسی فضول چیز کو ترجیح دینے لگے ہیں' الشیخ سید اس کی تائید کرتے اور کہتے کہ واقعی دنیا بدل چکی ہے۔ برائیاں بڑھ گئی ہیں' اور جب برائیوں کا ذکر ہوتا تو عورت موضوع بن جاتی۔ طحہٰ کہتا "اب تو دور افتادہ دیہات میں ہی نیک عورتوں کا وجود باقی رہ گیا ہے۔ شہر کی عورتیں اگرچہ لباس پہنتی ہیں لیکن عریاں دکھائی دیتی ہیں۔"

اسلامی ممالک کی کہانیاں

صبح طعمہ کو جمنازیم میں جاکر اپنی مصنوعی ٹانگوں کے استعمال کی ورزش کرنی ہوتی تھی۔ مصنوعی ٹانگیں لگائے' بیساکھیوں کو بغل میں دبائے چلتا خاصا تکلیف دہ عمل ہوتا۔ وہ بار بار اپنے پاجامے کو اوپر اٹھا لیتا تاکہ دیکھ سکے کہ نقلی ٹانگیں اس کی رانوں پر کہاں فٹ کی گئی ہیں۔

یہ نقلی ٹانگیں اگرچہ لکڑی کی بنی ہوئی تھیں' لیکن دیکھنے میں بالکل اصلی اور زندہ ٹانگیں دکھائی دیتی تھیں۔ ان کا رنگ اصلی جلد سے ہو بہو ملتا تھا۔ وہ اپنے ہونٹوں کو زبان سے گیلا کرکے ان ٹانگوں کے پیروں کو بوٹوں کے اندر داخل کرتا۔ یہ بوٹ بھوری ایڑھی والے تھیں اور قیمتی تھے تے مصنوعی ٹانگوں کے پیروں پر عمدہ اور نفیس جرابیں بھی چڑھی ہوئی تھیں۔ جب وہ اپاہج نہیں تھا اس کی تنخواہ اتنی کم تھی کہ پیٹ بھرنے کے بعد کچھ بچتا ہی نہ تھا۔ ایسی نفیس اور عمدہ جرابیں وہ خرید ہی نہیں سکتا تھا۔

چند قدموں کا فاصلہ طے کرتے ہی وہ ہانپنے لگتا' ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو جاتے مشق جاری رہتی لیکن رانوں میں شدید درد شروع ہو جاتا۔

وہ اپنے آپ سے کہتا مصنوعی ٹانگیں بے کار ہیں۔ اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ وہ میری رانوں کے ساتھ پہیئے فٹ کر دیتے تاکہ میں درد کے بغیر آسانی سے حرکت تو کر سکتا۔

وہ اپنے گھر' اپنے گاؤں جانا چاہتا تھا۔ ان مصنوعی ٹانگوں کے ساتھ کیا وہ گاؤں جا سکے گا؟ آہستہ آہستہ مرجلی لی اور احمد کی رفاقت بھی اسے ناگوار گزرنے لگی۔ ایک عجیب طرح کی بیزاری اس پر مسلط ہوگئی اور اس بیزاری نے ایک عجیب خواہش اور سوچ کو جنم دیا۔

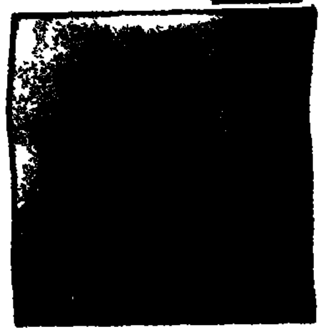
وہ ڈاکٹروں سے الجھنے لگا۔ وہ نقلی ٹانگوں کو کوستا' ڈاکٹر اسے تسلی دیتے' کہتے کہ جلد ہی مشق کے بعد کسی تکلیف اور درد کے بغیر آسانی سے چلنے پھرنے کا عادی ہو جائے گا۔ وہ ڈاکٹر سے الجھنے لگتا کہ جو مصنوعی ٹانگیں اسے فراہم کی گئی ہیں وہ اس کی ان ٹانگوں سے چھوٹی ہیں۔ جب اس کی ٹانگیں سلامت تھیں تو اس کی قمیض اس کے قدموں تک نیچی تھی اب وہی قمیض قدموں سے اونچی ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر ہنس دیتا اور اسے سمجھاتا کہ یہ ٹانگیں اس کی اسی ٹانگوں کی لمبائی کے عین مطابق ہیں ایک انچ چھوٹی نہ بڑی' اس کی تمنش سکرتی ہے مگر اس کی تسلی نہ ہوتی۔

وہ جو باتیں کرتے تھکتا نہ تھا' اب خاموش رہنے لگا۔ الشیخ سید کی باتوں سے بھی اس کا جی نہ بہلتا۔ لی اور احمد کا استقبال کرتا' لیکن یہ استقبال منافقانہ ہوتا۔ وہ سوچتا جب میں اپنے گاؤں جاؤں گا تو یار دوستوں کی محفل میں کس طرح فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھوں گا' وہاں مجھے بیٹھنے کے لئے کرسی کون دے گا۔ یہ ڈاکٹر احمق ہیں ہم دیہاتیوں کی ضرورتوں کو سمجھتے ہی نہیں!

وہ زیادہ تمباکو نوشی کرنے لگا۔ سوچتا رہتا' سگریٹ کے کش کھینچتا' کھانستا اور جب نرس سکینہ آتی تو سنبھل جاتا۔ ایک ٹرالی پر اس کا کھانا رکھا ہوتا' اب وہ کھانے کو دیکھنے کی بجائے سکینہ پر زیادہ توجہ دیتا۔ وہ پچاس ایک برس کی صحت مند عورت تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی جھری نہ تھی۔ سکینہ کو دیکھ کر اس کی سوچ میں گہرائی پیدا ہو جاتی۔ سکینہ اس کا حال پوچھتی تو اسے بہت اچھا لگتا۔ اسے تسلی دیتی تو اس کی سوچ کا دائرہ پھیلنے لگتا۔ وہ اس سے اس کے بچوں کے بارے میں استفسار کرتا' سکینہ اس کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اس کے بستر پر اچھی طرح آرام دہ حالت میں بیٹھنے کے لئے مدد دیتی کھانے کی ٹرے اس کی رانوں پر رکھتی' اس دوران میں کئی بار اس کا ہاتھ اس کے جسم کو چھوتا اور اس کی سوچ توانا ہو جاتی' احمد اور مرجلی لی کا تصور تک اس کے ذہن سے محو ہو جاتا۔

اسے اب اپنی تنہا سوچوں کو ختم کرنے کے لئے ایک عورت' ایک بیوی کی ضرورت تھی۔ یہی اس کی زندگی کی سب سے آخری سوچ تھی!!

اردو ہندوستان سے
ہندوستان اردو سے



آشفتہ چنگیزی

ہنگامۂ اغیار گذر جائے تو جانیں
یہ حادثہ اس بار گذر جائے تو جانیں

اب تک تو بہت خود کو سنبھالے ہوئے رکھا
یہ مصر کا بازار گذر جائے تو جانیں

دعویٰ تو ہمیں بھی ہے بہت در گذری کا
اک لمحۂ انکار گذر جائے تو جانیں

اس رات کی کرب سے یہ ابھی اور نظر ہے
یہ آخری بیمار گذر جائے تو جانیں

آثار نظر آتے ہیں پھر سیل رواں کے
بہتا ہوا گھر بار گذر جائے تو جانیں

یوں کہنے کو کل رات بہت امن سے گذری
ہاں! آج کا اخبار گذر جائے تو جانیں

شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲



صادق

ازل سے دل ہے صداقت پسند کیا کرتا
مرض قبول تھا کس چیز کی دوا کرتا

جو ہوتا شبہ تری بخشش و کرم پہ مجھے
قدم قدم پہ نہ ہر گز نئی خطا کرتا

جب آپڑے تھے کبھی غم کا سئہ مقدر میں
گلی میں اس کی فقیرانہ کیوں صدا کرتا

متاع جاں کے سوا کیا تھی کائنات مری
تری نظر کے عوض نقد جو ادا کرتا

۵۸

میں جانتا ہوں زمانے کے دست و بازو میں
نہیں وہ زور جو مجھ سے تجھے جدا کرتا

لے۔ بی ۱/ ۱۰۹ ، ٹیلیگراف کالونی ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۸

فلسطین

زین العابدین الحسینی

محمود احمد قاضی

ہمیں پہلے مرجاتا ہے

تعاقب

وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گلی میں مڑا اور عین اسی وقت گولیوں کی بوچھاڑ سے وہ بمشکل بچا اور اسی لمحے اس سے ذرا دور خشک مٹی کا ایک مرغولہ سا بن گیا۔

صرف پانچ سیکنڈ ۔۔۔ اسے بس اتنی ہی مہلت چاہیے۔۔۔ ایک قدم۔۔۔ دو۔۔۔"

اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ گلی ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہی تھی۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اس بار وہ اپنے تعاقب میں آنے والوں کی زد سے نکل کر سنگتروں کے اس باغ میں پہنچ جائے؟

جب اس نے تیسرا قدم اٹھایا تو اسی وقت اسے ایک کچی مٹی سے بنی کھڑکی کے فریم سے لگ کر کھڑی ایک نوجوان لڑکی کے چہرے کی جھلک دکھائی دی' اس کو لڑکی کی آنکھوں میں صاف ایسی جھلک نظر آئی جیسے وہ بھی اسے تعاقب کرنے والوں کی گولیوں سے بچ کر نکل آنے کے لیے اکسا رہی ہو۔ ان کی آواز اب کم سنائی دے رہی تھی اور یہ تالیوں اور واہ واہ کی گونج میں گم ہو رہی تھی۔ زمین کا یہ ٹکڑا بھی اس کی حفاظت میں اتر آیا تھا۔ اس کو محفوظ جگہ تک پہنچنے کے لیے صرف چھوٹی سی دو چھلانگوں کی ضرورت تھی۔

اس کے اسکول کے ہمجولیوں کے چہرے قطار بنا کر ایک دیوار کی شکل میں اس کے سامنے آ گئے تھے۔ وہ ان کی پرواہ کیے بغیر اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے بھاگا۔

چوتھے قدم پر اس نے زیاد کا چہرہ دیکھا جس کے دونوں طرف زخم کا سوراخ تھا۔ "انقلابیوں کو کبھی ایک ساتھ یوں اکٹھے نہیں مرنا چاہیے۔" اس کو ایک دم دکھ اور شرم کے احساس نے گھیر لیا کہ ابھی تک وہ موت کا یہ دریا پار نہیں کر سکا تھا۔ آخری قدم اٹھانے سے پہلے جو قدم اس نے اٹھایا تو اس کے ساتھیوں کی آنکھوں نے اس کو آخر تک پہنچنے میں مدد دی۔ اس کو اپنی ماں کا چہرہ نظر آیا جو سیاہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ اسے صحرا کی جانب بڑھتی ہوئی ٹرین کی وسل سنائی دی۔ ہر سوئی ہوئی چیز جاگ اٹھی تھی' لیکن کیا وہ موت کو اس بار شکست دے سکے گا؟ جب اس نے آخری قدم اٹھایا (آغاز اور اختتام کے درمیان) تو وہ اپنے پیاروں کی آنکھوں کے نرغے میں آ گیا۔ اس نے تیزی سے کیمپوں کا جائزہ لیا۔ پرانی ہدایات کالعدم قرار دی جا چکی تھیں۔ اسے اپنے تعاقب میں آنے والوں اور اپنے ساتھیوں دونوں سے نبرد آزما ہونا تھا۔ آخری قدم کے درمیان میں (وسط اور اختتام کے درمیان) اس نے تعاقب کرنے والوں کی کار کا شور سنا۔ بندوقوں کی گولیاں مٹی کے ذرات کی طرح اس کے اردگرد اڑیں۔ حملہ کے شور میں بہت سے رنگوں کا انعکاس ہو رہا تھا جیسے کہ سبز وغیرہ۔ زیاد کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا (اس کی آنکھیں ایک بھاری غم سے دھندلا سی گئیں کیونکہ وہ نامعلوم لوگوں کے ہاتھوں مارا جا چکا تھا) بہت سے رنگ اس کے ہمراہ تھے اور زیاد کا خون بہہ رہا تھا۔۔۔ اور اکیلا سبز رنگ اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتا رہا۔ زمین کا رنگ! زمین اس کے سامنے نئے درخت لے آئی تھی۔ اس نے درختوں کی باہیں اپنی طرف پھیلی ہوئی محسوس کیں وہ اسے چھونا چاہتے تھے۔ اس لیے اس نے اپنے بازو جہاں تک وہ انہیں پھیلا سکتا تھا پھیلا دیئے اس وقت اس کی اڑان ایک پرندے جیسی تھی۔

۲۔ چوراہا

اس نے درخت کے ساتھ ٹیک لگائی اور کچھ سننے کی کوشش کی۔ اس نے بہت غور سے سنا اور



ابرار احمد

دیا یہ کبر و ریا میں کمال میں نے کیا
کہ اعتبارِ رہِ دل بحال میں نے کیا

وہ خوش ہوا کہ مرے زخم بھر گئے آخر
یہ ایک میں، کہ غمِ اندمال میں نے کیا

ترے لیے دلِ بے داغ کیسے لاتا میں؟
گریز تجھ سے سوائے خوش خصال میں نے کیا

وہ جوش و وحشت و بیگانگی کا عالم تھا
خجل بہت ہوں، کہ اس کا یہ حال میں نے کیا

کسے نصیب ہے آخر دوام مہلتِ دید۔ ! ؟
شبیہِ خوابِ ازل سے سوال میں نے کیا

وہ شام، شامِ الم تھی، سوا پنی آنکھوں میں
چراغِ خواب جلائے، ملال میں نے کیا !

۲۹۴۔ ای گلشن راوی، لاہور (پاکستان)

درختوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے (درختوں نے) حرکت کی تو اسے کہا تو بھی اب تمہاری باری بھی آگئی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ درخت انسانوں کی طرح ایسی مخلوق ہیں جو محسوس کرتے ہیں سنتے ہیں، روتے ہیں اور بات کا جواب دیتے ہیں لیکن وہ دھوکہ نہیں دیتے۔ درخت درختوں کو دھوکہ نہیں دیتے۔ اس نے گھاس کو روندتے ہوئے اپنا پیچھا کرنے والوں کے قدموں کی آواز سنی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ان کی تعداد کے بارے میں جان گیا ہے۔ وہ نیمے میں تھے اور ان کا ایک ساتھی چھوٹے وائرلیس سیٹ پر جھکا جا رہا تھا۔ وہ اب نزدیک ہو رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اب وہ اسے ڈھونڈ نہیں رہے بلکہ ایک دوسرے سے اسے ڈھونڈنے کا بہانہ کر رہے تھے۔ اسے اس بات کا یقین گولیوں کی مسلسل بوچھاڑ سے ہوا۔ گولیاں وحشیانہ انداز میں چلائی جا رہی تھیں۔ اس نے ایک لمحے کے لیے انتظار کیا اور پھر بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ وہ درخت کے ساتھ بہت شدت سے چمٹ گیا۔ اس نے اپنے اندر ایک تپاک سا جنم لیتا محسوس کیا اور درخت کو اس نے گوشت پوست کا ایک وجود سمجھا۔

بندوقوں کی تیز آوازیں اس کے قریب ہی سے آ رہی تھیں اور اس کے سامنے ہی اپنی دو آنکھوں سمیت ایک چہرہ موجود تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ چڑیں اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔ اگر اس کے سامنے موجود اس چہرے کے منہ سے ذرا سی بھی آواز نکل پڑتی جو ایک درخت کی طرح ایستادہ تھا تو اس کا بچ نکلنا بالکل محال ہو جاتا۔

وہ اس کے سامنے اپنی گول گول آنکھوں کے ساتھ یوں کھڑی تھی کہ اس کے ذہن سے اس کا خوف محو ہونے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اس آہ کو نہیں روک سکے گا جو ابھی فضا میں ابھرنے والی تھی۔ تاہم ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ ایک کے بعد ایک کیسے واقعات رونما ہو رہے تھے اور اس کے خوف کی شدت کو یہ تمام سچائیاں کیسے اوکھے انداز میں کم کر رہی تھیں۔ اس سب کچھ کو جو اس کے ساتھ پیش آ رہا تھا اتنی تیزی کے ساتھ کیسے سمجھا جا سکتا تھا۔ بہرحال ایسے ہی ماحول میں لڑکی نے بے ترتیب سے رازدارانہ لہجے میں آہستہ سے اسے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔

۳۔ مکالمہ

"میں جانتی ہوں تم ان میں سے ایک ہو۔"

یہ سن کر اس کی آنکھیں بچوں جیسی خوشی سے چمک گئیں۔ لڑکی کے چہرے پر کئی طرح کے رنگ لہرا لینے لگے تھے۔

"میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ میں ایک مدت سے تمہاری منتظر تھی۔"

یہ سنتے ہوئے اس کی آنکھیں آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوب چلی تھیں۔

"انہوں نے نزار کو مار دیا ہے۔ انہوں نے اسے مرتے ہوئے مار دیا۔"

"درخت تمہارے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ اس لیے تمہیں آنا ہی تھا۔"

۴۔ سیلہ قیس سے محبت کرتی ہے

جیسے سیپی اپنے اندر قطرے کو چھپا لیتی ہے ایسے ہی سیلہ نے قیس کو چھپا لیا وہ اسے ایک کیمو فلیج خندق میں لے گئی۔ وہ یہ خندق دیکھ کر حیران رہ گیا مگر اس نے اسے بتایا کہ اس نے اسے اس کے آنے سے پہلے تیار کر لیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس نے آنا ہے۔ وہ خاموش ہو رہی اور اس کی آنکھوں میں در آنے والے آنسوؤں نے اس کی آنکھوں کے رنگ تبدیل کر دیے۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں تمہارے انتظار میں روتی رہتی تھی۔"

وہ دونوں دو مختلف پتھروں پر بیٹھ گئے۔ قیس نے سیلہ سے پوچھا۔

"اس سنگتروں کے باغ کا مالک کون ہے؟"

اس نے بتایا:

"میرا باپ ایک مالی ہے۔" پھر ہنستے ہوئے کہنے لگی "اور میں اس کی بیٹی ہوں۔"

اس نے انتظار کیا کہ شاید وہ کچھ جواب میں کہے لیکن جب وہ خاموش رہا تو وہ کہنے لگی۔

"میں درختوں کو اپنے دل کی گہرائی سے جانتی ہوں۔ میں ان کی عمریں بھی جانتی ہوں۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ مالک گرمیوں کے موسم میں اپنے خاندان کے ساتھ یہاں تفریح کرنے اور گھوڑوں پر سواری کرنے کے لیے آتا ہے۔ لیکن جب وہ یہاں آتے ہیں تو میں سمجھتی ہوں کہ وہ میرے اور میرے باپ کے مہمانوں کی طرح ہوتے ہیں۔"

اس نے قیس کی آنکھوں میں جھانکا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

"یقین جانو زمیندار کی بیٹی یہ بھی نہیں جانتی کہ درخت چوتھے سال پھل دینے لگتے ہیں۔"

قیس مسکرایا اور بولا:

"کیا واقعی؟" پھر اس نے اسے بتایا کہ وہ اس پر اتنا ہی اعتبار کرتا ہے جتنا کہ پتے اپنی جڑوں پر کرتے ہیں۔ اس پر سہیلہ نے اس سے کہا "تو پھر تم مجھے قبضے کے وقت کے حالات سے آگاہ کرو۔"

اس نے دروازے پر دوبار دستک دی اور رک گئی۔ اس نے اس عمل کو دہرایا۔ دروازہ کھل گیا اور ایک بوڑھے فلسطینی کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے کی جانب دیکھا پھر آہستہ سے اس کا بازو کھینچتے ہوئے اس نے دروازہ مضبوطی سے بند کر دیا۔ اس نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے پوچھا:

"وہ کیسا ہے؟"

اس نے اپنے سیاہ لباس میں سے ایک تہہ کیا ہوا خط برآمد کر کے اسے دیا۔ اس کے واپس جانے سے پہلے اس کے باپ نے اس کا سفید ماتھا چوما۔

اس نے ایک نئی بندوق وہاں سے لی اور کہا "مجھے بتاؤ کہ میں کس طرح۔۔۔"

وہ چند لمحوں کے لیے ہچکچایا لیکن بالآخر اس نے اسے بندوق کا استعمال سمجھایا۔

بڑی گلی کے بالکل درمیان میں خون کا ایک دھبہ موجود تھا اور ہوا میں بارود کی بو رچی ہوئی تھی۔

وہاں جنوبی سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ان میں سے ایک خون کا دھبہ صاف کر رہا تھا اور دوسرا لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اعلان کر رہا تھا۔ "کرفیو" کسی کو معلوم نہ تھا کہ جب بم پھٹا تو سہیلہ وہاں موجود تھی۔

اس نے اپنے ناراض باپ کو بتایا "میں جانتی ہوں کہ مجھے اپنے آپ کو ان سے کیسے بچانا ہے۔" اور اس نے قیس کو بتایا "میں نے تمہیں اپنا شوہر تسلیم کر لیا ہے۔"

۵۔ عہد و پیمان

وطن کے لیے زندگی کے آخری لمحے تک ایک دوسرے سے محبت کرنا۔

۶۔ جنگ

افق نیلا ہو رہا تھا۔ مغرب میں ختم ہوتی رات کے جلو میں آہستہ آہستہ صبح نمودار ہو رہی تھی۔

قیس سویا نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں خندق کے داخلے کے راستے پر لگی ہوئی تھیں۔

قیس نے اس کے ہموار سانس کی آواز سنی۔ اس نے اس کے بچوں جیسے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "ملک پر قبضے کے وقت بچے اتنی جلدی بڑے کیوں ہو جاتے ہیں؟"

سہیلہ کی نیند اور محبت میں ڈوبی ہوئی آواز اس کے کانوں میں پڑی "قیس"

وہ اس کے نزدیک آتے ہوئے بولا "سو جاؤ۔۔۔ ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔"

وہ بولی "اب نگرانی کرنے کی باری میری ہے۔"

وہ ہنسا اور اس کے گھنے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگا "کمانڈر تمہیں اس ڈیوٹی سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے۔"

وہ اٹھی اور اس نے گن اٹھاتے ہوئے کہا "کمانڈر کی بیوی کو کوئی رعایت حاصل نہیں ہوتی۔"

کافی دیر تک وہاں خاموشی چھائی رہی پھر وہ بولی۔

"کیا تمہیں صبح سے پہلے کچھ ہونے کی توقع ہے؟"



سوہن راہی

پرانی زندگی اب بھی نئی ہے
یہ میری ہے مگر مانگی ہوئی ہے

میں اب زندہ ہوں خود کو یاد کر کے
بنا تیرے بھی میری زندگی ہے

وفاؤں کا جفاؤں سے ہے رشتہ
محبت کی سزا کتنی کڑی ہے

یہ کیا صبحِ بہاراں ہے چمن میں
اندھیروں سے الجھتی روشنی ہے

زمانے بھر کی تہمت مجھ پہ رکھ دو
ابھی تو میری تم سے دوستی ہے

ابھی تجھ میں ترا ہونا ہے زندہ
ترے شعروں میں راہیؔ تازگی ہے

TOLWORTH CORNER CTN
146 THE BROADWAY TOLWORTH,
SURREY KT6 7HT ENGLAND

قیس نے ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کیں اور کہا۔
"کیا میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں نے اپنی ماں کو پچھلے تین سال سے نہیں دیکھا حالانکہ وہ کیمپ ہی میں رہتی ہے۔"

سیلہ نے قیس کے ہاتھ کو اس وقت آہستہ سے چھوڑا جب وہ مشین گن پکڑ رہا تھا۔ قیس نے درختوں کی زندگی بخش گرمی کو اپنے اندر محسوس کیا' اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کے لیے اندھیرے کی دیوار کو عبور کرنا چاہا۔ وہ باہر کی طرف کھلنے والے راستے کی طرف گیا۔ اس کی آواز میں دکھ بھرا ہوا تھا۔

"ہمیں ہم سے زیادہ تیزی کے ساتھ حرکت نہیں کرنی چاہیے۔۔۔ انہوں نے اسلحے کے کئی ڈپو دیکھ لیے ہیں اور "انہیں" مار دیا ہے وہ ہر روز معمولی سے شبے پر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔"

پیار کی ٹھنڈک اس کے رگ و پے میں سرایت کرتی چلی گئی۔ وہ اسے اعتماد کے ساتھ کھڑے ہوئے پا کر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پہلی بار انہوں نے ایک ہی قسم کے خطرے کو اکٹھے محسوس کیا۔ اس نے خواہش کی کہ کاش وہ دونوں اس لمحے ایک وجود میں سما جائیں۔ اس کے اندر قیس کے لیے بے پناہ محبت کا جذبہ امڈ پڑا۔

قیس کی آواز میں سخت تلخی تھی جب اس نے یہ کہا کہ "ہم جنگ کرنے جا رہے ہیں۔"

سیلہ کو محسوس ہوا کہ اگرچہ موت ان کے سروں پر منڈلا رہی تھی لیکن اسے اس بات کی کوئی فکر نہ تھی۔ البتہ اس کی خواہش تھی کہ ان دونوں کو اکٹھے موت آئے۔ اس نے بندوق کی نالی ایک دوسرے کھلے مقام پر رکھ دی۔

قیس کی آواز سینکڑوں بوسوں کے اثر سے لبریز تھی جب اس نے کہا "سیلہ ہم اکٹھے لڑنے جا رہے ہیں۔۔۔" وہ رک گیا اور سیلہ نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنے والا تھا سیلہ نے اسے کہتے ہوئے سنا۔

"لیکن۔۔۔۔؟"

سیلہ کی خواہش تھی کہ وہ آگے کچھ نہ کہے بس یہ کہے کہ "ہم اکٹھے لڑ رہے ہیں۔" بس یہی وہ سننا چاہتی تھی۔ سوائے اس کے کچھ نہیں سننا چاہتی تھی۔

قیس اس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہتا تھا۔ کیا وہ سیلہ کے چہرے کو خاک میں لتھڑا ہوا یا کسی گولی کے سوراخ سے مسخ شدہ حالت میں دیکھنے کی جرات کر سکے گا؟"

قیس نے اس کی دھیمی آواز سنی۔ "میں انہیں دیکھ رہی ہوں۔"

ایک پریشان کن خیال قیس کے ذہن میں آیا "کیا وہ یہاں اس کی موجودگی کے بارے میں جان گئے ہیں یا وہ کچھ اور تلاش کر رہے ہیں؟" سیلہ کی فیصلہ کن آواز اس کے کانوں میں پڑی "وہ جانتے ہیں کہ ہم یہاں ہیں۔"

اس کی گفتگو میں اس لاؤڈ سپیکر کی آواز سے خلل پڑ گیا جو قیس کو ہتھیار پھینکنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

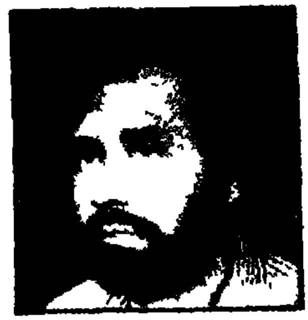
قیس نے سیلہ کی طرف دیکھا۔ سیلہ نے بھی اس کی بات کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے اپنے دل میں جنم لینے والے اس خیال کو جھٹکنے کے لیے اپنی نگاہیں اس کی طرف سے ہٹا لیں۔ کیا میری موجودگی اس کے ہتھیار۔ پھینکنے کے جذبے کو متاثر کر سکتی ہے؟"

ہر چیز تباہ ہو جائے گی اگر قیس نے کہا کہ میں تمہاری ذات کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتا۔۔۔ اس الم ناک صورتحال کے ڈر سے آنسو اس کی آنکھوں سے امڈ پڑے۔

قیس کی محبت بھری آواز اس کو سنائی دی "کیا تم رو رہی ہو؟"

اس نے جواب دیا "میں تمہارے قریب رہنا چاہتی ہوں۔ تمہاری قربت مجھے بہت عزیز ہے۔"

لاؤڈ سپیکر کی آواز اس کی آواز پر حاوی ہوتی چلی گئی اور وہ اس کے ادا کیے گئے الفاظ پوری طرح۔ کہتے ہوئے بولا "تم اگر یہاں سے چلی جاؤ تو تمہاری جان بچ سکتی ہے۔" قیس نے مزید کہا۔



عبدالاحد ساز

نہ مقامات، نہ ترتیبِ زمانی اپنی
تفاقات پہ مبنی ہے کہانی اپنی

جم سی جاتی ہے تہہِ حرف کسی کرب کی موج
تھم کے رہ جاتی ہے لفظوں کی روانی اپنی

پھیل جاتی تھی سماعت کی زمینوں میں نمی
تھی کبھی تر سخنی، آب رسانی اپنی

بالکھ تم مجھ کو دباؤ میں ابھر آؤں گا
سطح ہموار کیے رہتا ہے پانی اپنی

ماجرا روح کی وحشت کا بھی ہے لے ساز
تگے روداد نہیں ہم کو سنانی اپنی

"وہ نہیں جانتے کہ تم یہاں ہو۔۔۔ انہیں صرف میں درکار ہوں۔"

وہ چلائی'

"نہیں ہم اکٹھے ہیں۔۔۔ ہم اکٹھے ہیں۔"

وہ اسلحے کے صندوق کی طرف بڑھا اور اس نے بندوق کے لیے گولیوں کے دو زائد بکس اٹھا لیے۔ اسی طرح وہ بھی اسلحے کی طرف بڑھی اور اسی لمحے لاؤڈ سپیکر چنگھاڑا۔ "ہم تمہیں صرف دو منٹ کی مہلت دیتے ہیں۔"

وہ اس سخت وارننگ کو سن کر سخت برہم ہوا۔ وہ فائر کھولنے ہی والا تھا۔ اس نے سیلہ کو گولیوں کے دو بکس اور ایک بم ہاتھ میں پکڑے ہوئے دیکھا۔

وہ سینہ تان کر کھڑی ہو گئی۔

"کمانڈر۔۔۔ کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ کسی کو کوئی رعایت حاصل نہیں ہوتی؟"

خمیس نے محسوس کیا کہ ایسا کہتے ہوئے اس کے لہجے میں ہچکچاہٹ پن نمایاں تھا۔ وہ تقریباً سسکیاں لیتی ہوئی کہتی رہی۔

"کیا تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ تم مجھ پر ایسے ہی اعتماد کرتے ہو جیسے پتے اپنی جڑوں پر کرتے ہیں؟"

وہ فائر کرنے والی دوسری جگہ پر آ گئی۔ اس نے بہت پرجوش انداز میں پوچھا۔

"کمانڈر۔۔۔ پہلی گولی کون چلائے گا؟"

خمیس نے اس کے وجود کو دور بہت دور اپنے اندر اترتے ہوئے محسوس کیا۔ جب سیلہ نے پہلی گولی چلائی تو وہ یہ سوچ کر دکھی ہو گیا کہ اس سارے وقت میں وہ اس کے اور اپنے بارے میں سوچنے کے بجائے اپنے سر پر منڈلانے والی موت کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اس لیے وہ سیلہ سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اسی وقت باہر سے گولیوں کی ایک بوچھاڑ ہوئی۔

۷۔ خمیس پہلے مرجاتا ہے

جب خمیس کو پہلی گولی لگی تو سیلہ کو اس کا علم نہیں ہوا۔ اس لیے اس نے خمیس کو صرف یہ کہتے ہوئے سنا "وہ درختوں کو بھی مار دیتے ہیں۔"

لیکن سیلہ نے اس کی آواز میں کوئی گڑبڑ ضرور محسوس کر لی تھی۔ (خمیس نے خود اس بات کو محسوس نہیں کیا تھا) سیلہ نے خمیس کی طرف دیکھنے سے پہلے بہت ساری گولیاں چلا دیں۔ اس نے خمیس کے کندھے پر خون کا ایک گول دھبہ دیکھ کر کچھ کہنے (یا سوچنے) کی جرات نہ کی بلکہ یہ خواہش کی کہ کاش وہ اس کے جسم میں سما جائے اور خون بہنے کے احساس یا مرنے کی خوشی کو اکٹھے اس کے ساتھ محسوس کرے۔ اس نے اپنے سینے میں کوئی چیز رینگتی ہوئی محسوس کی۔

وہ اس بات پر یقین کرنے پر تیار نہ تھی کہ گولیاں کوئی تکلیف نہیں پہنچاتیں۔

"اس وقت خمیس کیا سوچ رہا ہو گا؟" اس نے اس کی طرف مڑنے سے پیشتر کئی اور گولیاں چلائیں۔ خمیس کا جسم کئی سرخ سوراخوں سے بھر چکا تھا۔ بہرحال اس کے مرنے سے پہلے تک اسے کسی قسم کا کوئی خوف نہیں تھا۔

وہ تو بس اس بات پر ضرور حیران تھی: "کہ کیا بہادروں کو ہمیشہ ایک سے زیادہ گولیاں لگنے کے بعد مرنا ہوتا ہے؟"

خمیس مر رہا ہے۔۔۔ خمیس کے ہاتھ نے اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا ہے۔ اب اس کا ہاتھ اس کا حکم نہیں مان رہا۔ اس نے اپنی شہادت کی انگلی ٹرائیگر پر جمانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس نے اپنے ہاتھ پر تھوک دیا' گیت گانے والوں کی آوازیں خمیس کے چاروں طرف پھیل گئیں "ہم سچائی پر ہیں" آوازیں اور رنگ ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

خالی کارتوس کی تمام گولیاں اسکے دھڑ میں دور تک دھنس گئیں۔ "درختوں کو اب اس کا ساتھ نہیں

رفیق سندیلوی

ازل کے ساتھ ہی راہِ ابد بنا دی ہے
لکیر کھینچی ہے اور ایک حد بنا دی ہے

کیا ہے آخری سانسوں سے اک ستارہ خلق
اور اس ستارے پہ اپنی لحد بنا دی ہے

ہم آگ پھانکنے والوں نے اپنے گرد اگرد
بدن سے اونچی فصیلِ حسد بنا دی ہے

طلسمِ موجِ نظر نے بنا دیا ہے چاند
اور ایک کیفیتِ جزر و مد بنا دی ہے

دیا ہے میں نے اندھیرے میں خود کو پھر ترتیب
عجیب شکل پسِ خال و خد بنا دی ہے

● ۲۵۷، گلی ۷۰، جی۔ ۳/۸ اسلام آباد (پاکستان)

اسلامی ممالک کی کہانیاں

چھوڑنا چاہیے۔" اس وقت جب قیس نے پہلی بار اسے اپنے سامنے پایا تھا تو اسے ایک درخت ہی سمجھا تھا۔ قیس نے سیلہ کی طرف اپنی نگاہیں گھمائیں۔ وہ اپنی گود پر جھکی ہوئی بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کے دل میں خواہش جاگی کہ کاش وہ اس کی طرف صرف ایک بار ایک لمحے کے لیے مڑے تاکہ وہ درد، غم اور موت سے بے نیاز تاثرات کے حامل اس کے چہرے کو دیکھ سکے۔

"آپ دلہن پر جھکنے کے وقت بچے اتنی تیزی سے کیوں جوان ہو جاتے ہیں؟"

قیس نے اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کی مگر اس نے محسوس کیا کہ کوئی انہیں بند کیے جا رہا ہے۔ سیلہ کے ہاتھ اس کی آنکھوں کو آہستہ سے بند کر رہے تھے۔ اب وہ سنتا ہے۔ اب تو وہ پہلے سے بھی زیادہ بہتر طور پر سن سکتا ہے۔ وہ سیلہ کے لباس کی سرسراہٹ، اس کے دامن کے بٹنے اور زنجیر پر اس کی انگلیوں کے دباؤ کو بھی سن سکتا ہے۔ وہ حیران تھا کہ اندر کی یہ چھوٹی چھوٹی آوازیں باہر کے شور پر کیسے غالب آ رہی تھیں۔ زیاد کا چہرہ ایک بار پھر اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ وہ اپنی بند آنکھوں سے بھی زیاد کو اپنے سامنے پا کر حیران ہو رہا تھا۔

اس نے دو ہونٹوں کو اپنے گال پر چپکتے ہوئے محسوس کیا اور یوں وہ سبزے کے ایک بے کنار سمندر میں تیرنے لگا۔

سیلہ کے سینے میں بہت چھوٹی چھوٹی اور عجیب سی چیزیں سمائی ہوئی تھیں۔ وہ جانتی ہے کہ وہ ابھی مری نہیں لیکن وہ زندہ بھی تو نہیں۔ اس کی آنکھوں نے بہت سے زخموں کے سوراخ دیکھے تو وہ چلائی۔

"دیوار پر بے شمار گولیاں چلاؤ۔ جب کل بارش ہو گی تو ہمارا کمرہ پورے کا پورا ڈھ جائے گا۔۔۔ تم میری بات سن رہے ہو نا؟"

اس نے اپنا چہرہ نیچے جھکایا۔ اس کا سر قیس کے کان کے قریب آیا۔

"کیا تم میری بات سن رہے ہو؟۔۔۔ ہمیں ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔"

سیلہ نے اس کا ہاتھ دبانے کی کوشش کی۔ "کیا میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں تمہاری ماں سے ملنے کیمپ گئی تھی؟"

سیلہ کی انگلی قیس کے سینے کے ایک گہرے شگاف سے ٹکرائی۔ سیلہ نے اس زخم کے کنارے پر بڑی محبت سے اپنی انگلیاں پھیریں۔

سیلہ نے دوسرے شگاف تلاش کرنے شروع کیے۔ دو، تین، چار۔۔۔ یہ چار ہیں قیس۔" سیلہ نے قیس کا ہاتھ اٹھا کر اپنے سینے پر بھی رکھنے کی کوشش کی۔۔۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔۔۔!!

*



خالد بشیر

ہو لہو تھے مناظر، گھروں سے آگے بھی
لٹا چکے تھے بہت کچھ سروں سے آگے بھی

کہانی کار! مرے شہر کے حوالے سے
نظر اٹھا کے شفق منظروں سے آگے بھی

ہوا کا رخ بھی مخالف، گھنیرے بادل بھی
پرندے! سوچ لے اپنے پروں سے آگے بھی

تمام رنج تجھی سے، مسرتیں بھی تری
گیا نہیں میں ترے محوروں سے آگے بھی

جہاں کی حد کوئی یہ بحرِ ریگ دخار نہیں
گلاب کھلتے ہیں ان بنجروں سے آگے بھی

● سونا دار، سرینگر۔ ۴ ۔۔ ۱۹۰



عذرا پروین

مرا فلک مری اڑانوں کی وسعت ہے لاپتہ
پرندوں میں جس فضا کی وہ فضا ہے لاپتہ
مرا سفر خلا میں ہے نہ اب کے مجھ کو ڈھونڈنا
مری طرح مرے سفر کا مدعا ہے لاپتہ
شبیں تھیں جتنی ڈھیر ڈھیر سب وصول ہو گئیں
مگر ابھی وہ اک شبِ سحر نما ہے لاپتہ
ترا طلسم اب مری شناخت ہی نہ چھین لے
ترے ہی لفظ لب پہ ہیں مری نوا ہے لاپتہ
سنہری اک لہر تجھے بہا کے لے گئی کہاں؟
وہ بے پناہ والہانہ پن ترا ہے لاپتہ
اس آب و تاب ہجر نے کچھ ایسے رنگ چکھا دیئے
کہ دیر کی خوشی میں بھی وہ ذائقہ ہے لاپتہ
میں گھٹ رہی ہوں گھٹ رہی ہوں دم بدم چیخ اٹھا
لگا ہے قفل روح پر کھلی ہوا ہے لاپتہ

۱۴/۲۰۱ عبدالعزیز روڈ، چوک، لکھنؤ ۔ ۲۲۶۰۰۳

ازبکستان

رشید شروت

ستار طاہر

چڑیا کی کہانی

جیسی باتیں اور کہانیاں میری ماں کو آتی تھیں اور وہ مجھے میرے بچپن میں سنایا کرتی تھی' ویسی باتیں اور کہانیاں نہ تو مجھے آتی ہیں اور نہ میں نے اپنے بچوں کو سنائی ہیں۔ وقت بہت بدل چکا ہے اس کے باوجود ماں کی سنائی ہوئی بہت سی باتیں اور کہانیاں اچانک' کسی ذہنی کاوش کے بغیر ہی یاد آ جاتی ہیں۔ جب مجھے یہ خیال آتا ہے کہ ان باتوں اور کہانیوں میں بڑی گہری معنویت پوشیدہ ہے تو میں یہ بھی تسلیم کر لیتا ہوں کہ اس زمانے میں' جب ماں نے مجھے یہ کہانیاں اور باتیں سنائی تھیں' میں ان کے باطنی معنوں سے ناواقف تھا۔

بہت تیز بارش ہو رہی تھی۔ بارشیں تو اب بھی بہت ہوتی ہیں اور تیز بھی لیکن جانے کیوں مجھے کئی بار ایسا محسوس ہوا ہے کہ اب ویسی بارشیں نہیں ہوتیں۔ عجیب طرح کی بارش تھی' بہت تیز ہوتی اور اچانک رک جاتی' تھوڑے سے وقفے کے بعد پھر پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے ہونے لگتی۔ میں بار بار گھر سے بھاگنے کا ارادہ کرتا تھا لیکن ادھر بارش رکتی' میں صحن پار کے دروازے تک پہنچتا تو پھر تیز بارش ہونے لگتی۔ ایسے ہی بارش رکنے کے مختصر سے وقفے میں ایک چڑیا کو میں نے اپنے دالان کے ایک کونے میں سر جھکائے دیکھا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ اپنے طور پر چھپ کر وہاں بیٹھی ہے۔

میں نے قریب جا کر اسے پکڑنا چاہا تو اچانک ماں کی آواز سنائی دی' "اسے ہاتھ نہ لگانا' بے چاری پہلے ہی بے بس ہو چکی ہے" ماں تیز تیز چلتی ہوئی میرے قریب آئی اور مجھے بازو سے پکڑ کر باورچی خانے میں لے گئی۔ مجھے چھوٹے سے سٹول پر بٹھا کر اس نے اپنے مخصوص میٹھے' دھیمے لہجے میں کہا تھا "جب چڑیا بارش میں بھیگ جائے تو اس کے پر بھاری ہو جاتے ہیں اور بے چاری اڑ نہیں سکتی۔ جب تک اس کے پر خشک اور ہلکے نہ ہو جائیں' وہ کوئی ایسی جگہ ڈھونڈتی ہے' جہاں کوئی اسے تنگ نہ کرے۔ کہیں کوئی بلی نہ جھپٹ پڑے' جب اس کے پر ہلکے اور خشک ہو جائیں تو وہ اڑ جائے گی' اب وہ ہمارے دالان میں پناہ لے کر اپنے پروں کے خشک ہونے کا انتظار کرے گی۔' تم اس کے قریب نہ جانا۔ وہ پہلے ہی ڈری اور سہمی ہوئی ہے' اپنے گھر سے دور۔۔۔"

اور ماں کچھ سوچنے لگی تھی۔ میں نے ماں کی بات دلچسپی سے سنی تھی لیکن یہ دلچسپی عارضی تھی۔ جب بارش رکی اور میں اپنے سنگی ساتھیوں کے ساتھ کھیل کر واپس آیا تو وہ چڑیا دالان میں نہیں تھی۔ میں نے سوچا اس کے پر خشک ہو گئے ہوں گے اور اڑ گئی ہوگی۔

ان دنوں چڑیاں بھی بہت ہوتی تھیں اور بارشیں بھی بہت ہوتی تھیں۔ شہر میں بارشیں تو بہت ہوتی ہیں لیکن ویسی نہیں جیسی گاؤں میں میرے بچپن کے دنوں میں ہوتی تھیں اور چڑیاں تو شہر میں شاذو نادر ہی دکھائی دیتی ہیں۔

مجھے شہر آنا پڑا تھا' پھر شہر میں ہی زندگی بسر ہونے لگی۔ گاؤں اب کم ہی جانا ہوتا تھا ماں سے خط و کتابت رہنے لگی۔ ماں کے خط مختصر ہوتے تھے۔ ہر خط میں تاکید ہوتی کہ میں گاؤں جلدی آؤں۔ جب ماں نے اپنے دو تین خطوں میں اپنی بیماری کا ذکر کیا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے فیکٹری سے چھٹی لی اور گاؤں روانہ ہو گیا۔ ماں پر نظر پڑتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بہت بیمار ہے۔ میں دو دنوں سے زیادہ گاؤں میں ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ ماں میرے ساتھ شہر جانے پر رضامند نہیں تھی۔ لیکن میرے اصرار کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال دئے۔ جب ہم شہر پہنچے تو ماں کی طبیعت زیادہ خراب ہو چکی تھی۔

اسلامی ممالک کی کہانیاں

ماں نے ایک دن کہا "میں شہر میں مرنا نہیں چاہتی۔"

میں نے ماں سے کہا "ابھی مرنے کی بات نہ کرو۔ تم بھلی چنگی ہو جاؤ گی۔ اس وقت تم گیلی چڑیا کی طرح ہو۔ بیماری نے تمہارے پر بوجھل کر دیے ہیں۔ ٹھیک ہو جاؤ گی تو تم گاؤں اڑ جانا"۔

ماں کا زرد بیمار چہرہ میری بات سن کر کھل اٹھا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

"اچھا تو تمہیں یاد ہے وہ گیلی چڑیا؟"۔

مجھے تو کچھ یاد نہیں تھا۔ یہ بات تو اچانک' بے اختیار جانے کیسے میری زبان پر آ گئی تھی' ماں کی سنائی ہوئی بات دل میں کہیں چھپ گئی تھی اور اب کسی انجانی قوت نے اسے میرے ہونٹوں تک پہنچا دیا تھا۔ میں خود حیران ہو گیا تھا لیکن میں نے ماں سے کہا تھا'

"ہاں ماں مجھے یاد ہے تم نے مجھے گیلی چڑیا کے پاس جانے سے روک لیا تھا اور بتایا تھا کہ گیلی چڑیا کے قریب نہ جانا وہ گھر سے دور ہے سہمی ہوئی ہے' اڑ نہیں سکتی اپنے پروں کے خشک ہونے کا انتظار کر رہی ہے۔"

"اصل میں یہ سب کچھ ماں کو بتانے سے زیادہ' خود کو یاد دلا رہا تھا۔ ماں کا کھلا ہوا چہرہ یک دم بجھ گیا' بیماری اور تکلیف کا کرب نمایاں ہونے لگا۔

"ہاں میں بھی گھر سے دور ہوں۔ میرے پر اب کبھی خشک نہیں ہوں گے۔"

"نہیں ماں' تم تندرست ہو جاؤ گی۔ تمہارا گھر محفوظ ہے۔ اور میں تمہارا بیٹا تمہاری دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ تم اتنی اداس کیوں ہو۔"

بہت دیر تک وہ چپ چاپ لیٹی رہی پھر اس نے سر اوپر اٹھایا اور کہنے لگی۔

"اگر میں شہر میں مر جاؤں تو مجھے گاؤں لے جا کر دفن کرنا۔"

میں خاموش رہا۔ ماں بولتی رہی۔

"ایک دن ایسا آتا ہے جب چڑیا بوڑھی ہو جاتی ہے۔ موسموں کے شدائد' عمر کے مسائل' اس کے پروں کی ساری طاقت چوس لیتے ہیں۔ چڑیا اڑ نہیں سکتی۔ حالانکہ اس کے پر گیلے نہیں ہوتے۔ اس وقت دراصل چڑیا اپنی آخری اڑان کی تیاری کر رہی ہوتی ہے۔ میں اس چڑیا کی طرح نہیں ہوں جس کے پر گیلے ہو گئے ہوں اور وہ کہیں چھپ اور رک کر انتظار کرتی ہے کہ پر خشک ہوں تو اڑ کر اپنے گھونسلے تک چلی جائے۔ میں اس چڑیا کی طرح ہوں جس کے پر ٹوٹ چکے ہیں۔ جن میں اب طاقت پرواز نہیں رہی۔"

چار دنوں کے بعد میری ماں شہر میں مر گئی۔ جب میں نے اسے گاؤں جا کر دفن کیا تو تیز بارش ہو رہی تھی۔ درختوں کے پتوں میں گیلی چڑیاں چھپی ہوئی تھیں۔ جب میں رات بسر کرنے کے لیے اپنے گاؤں والے گھر پہنچا تو بارش ہو رہی تھی اور میں نے نیم تاریک دالان کے ایک کونے میں ایک گیلی چڑیا کو سر جھکائے بیٹھے دیکھا۔ ہو سکتا ہے یہ میرا واہمہ ہوا

شہر میں نہ تو ایسی بارشیں ہوتی ہیں نہ چڑیاں دکھائی دیتی ہیں۔ مائیں بھی اپنے بچوں کو چڑیا کی باتیں نہیں سناتی ہیں کیونکہ انہوں نے خود چڑیاں نہیں دیکھی ہیں' میں اپنے بچوں کو چڑیا کہانی نہیں سنا سکتا۔ وہ اسے کچھ ہی نہیں سکتے۔ نہ ہی میں انسان کی آخری اڑان کی بات کر سکتا ہوں۔ کیونکہ ہم موت کو اس طرح قبول کرنا بھول گئے ہیں جس طرح ہماری مائیں اسے قبول کرتی تھیں! ✻



اطہر راز

اجل تو کیا کہ ہمیں زندگی نے مار دیا
یہ آدمی ہے جسے آگہی نے مار دیا

تمام عمر لٹاتے رہے متاعِ سکوں
ہجومِ شوق کی حیلہ گری نے مار دیا

یہ زندگی کا تقاضہ تھا جرم تھا کیا تھا
تعلقات کی سوداگری نے مار دیا

سکوں کے ساتھ اندھیرے میں لوگ زندہ تھے
سحر ہوئی تو انہیں روشنی نے مار دیا

وہ ابتدا تھی کہ تیرِ نظر کے زخم کھلے
یہ انتہا ہے تری بے رخی نے مار دیا

میں دشمنوں کی عنایت سے راز واقف تھا
یہ اب کھلا کہ مجھے دوستی نے مار دیا

21 COLWOOD GARDENS
COLLIERS WOOD LONDON SW 19 2DS

آذربائیجان

انور محمد خان لی
منظر سلیم

برف کا مجسمہ

۱۹۹۰ء کا موسم سرما۔ انتہائی سرد رات۔ قرب و جوار کی زندہ یا مردہ ہر شے لگتا تھا کہ منجمد ہو کر اکڑ گئی ہے۔ ہوائیں سانپ کی طرح ڈستی تھیں اور رگوں میں خون جم جاتا تھا۔

ایسی ہی ایک رات کو ایک تنہا سایہ یوکرین کے ایک بے کراں برف پوش میدان کو پار کر رہا تھا۔

ایک نوجوان ماں اپنا گاؤں چھوڑ کر بھاگ رہی تھی' تیزی سے آگے' مشرق کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ اپنے گاؤں سے بھاگ رہی تھی کیونکہ اس پر فسطائیوں نے قبضہ کر لیا تھا' بھاگ رہی تھی اپنی خود داری اور اپنے بچے کو بچانے کے لئے۔

سامنے دریا تھا جس کے کنارے کنارے محاذ جنگ پھیلا ہوا تھا۔ دریا کے اس پار سے ابھرتی ہوئی سوویت توپوں کی چنگھاڑ اسے سنائی دے رہی تھی۔

نوجوان ماں دوڑتی بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ اسے ہر قیمت پر اپنے لوگوں کے درمیان پہنچنا ہی تھا۔ اسے بہرصورت اپنے بچے کو دریا کے اس پار عظیم' آزاد سرزمین تک لے ہی جانا تھا۔ شدید برف باری کی یہ رات اس کی جان ہی کیوں نہ لے لیتی' اسے ایک مقدس فریضہ بہرحال انجام دینا تھا' اپنی اولین محبت کی اس علامت کو بہرحال زندہ رکھنا تھا۔

ماں سخت محنت کے ساتھ بہ دقت چلتی جا رہی تھی' آگے' کچھ اور آگے بڑھتی جا رہی تھی لیکن برف پوش میدان تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ وہ نڈھال ہو چکی تھی' برف اس کے جسم میں خنجر کی طرح چبھتی جا رہی تھی۔ اچانک اسے ایسا لگا کہ اس کا بچہ اس کی گود میں منجمد ہوا جا رہا ہے۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور اس کی پریشان نگاہیں کسی ایسے گوشے کو' ایسی جائے پناہ کو تلاش کرنے لگیں جہاں وہ اپنے بچے کو گرمی پہنچانے کے لئے اور زیادہ اوڑھا لپیٹ سکے۔ دو کالی کالی پرچھائیاں اس کے سامنے نمودار ہوئیں۔ یہ دو درخت تھے جو پہلو بہ پہلو ایک دوسرے سے لگے کھڑے تھے۔ وہ ذرا دم لینے کے لئے ان کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔

اس کی قوت جواب دے چکی تھی۔ برف اس کے چہرے کو اپنی نہایت ہی سرد' جلا دینے والی زبان سے چاٹ رہی تھی۔ ماں کے سینے میں مہیب الفاظ تڑپنے لگے۔ "بچہ منجمد ہوتا جا رہا ہے وہ اس برف کی تاب نہ لا سکے گا!"

لیکن ماں نے اس مہیب خیال کو دل سے نکال دیا۔

نہیں! نہیں! جس بچے کو وہ دشمن کے چنگل سے چھین لائی ہے اسے برف کی جما دینے والی آغوش کے سپرد نہ کرے گی۔ چاہے ساری دنیا ہی برف میں کیوں نہ بدل جائے' چاہے دنیا کی ساری زندگی ہی منجمد کیوں نہ ہو جائے' وہ اپنے سینے سے ماں کا دل نکال کر اس کی گرمی سے بچے کو حرارت عطا کرے گی۔۔۔

اس نے اپنی اونی جیکٹ اتار کے بچے کو اس میں لپیٹ لیا۔۔۔ چند لمحات گزرے لیکن اسے یہ لمحات مہینوں نہیں' برسوں نہیں' دوام جیسے معلوم ہوئے۔ برفیلی ہوا اس کے جسم کو دہکتے ہوئے لوہے کی طرح جلاتی چلی جا رہی تھی۔۔۔

اور ایک بار پھر اسے محسوس ہوا کہ وہ خود نہیں بلکہ اس کا بچہ' اس کا لخت جگر کانپ رہا ہے' منجمد ہوا جا رہا ہے۔



نذیر قیصر

مجھے پریاں دیکھتی ہیں مہتاب دیکھتا ہے
کوئی مجھ سے دور جا کر مرے خواب دیکھتا ہے

شاخِ وصال اس کے ہونٹوں کو چھو رہی ہے
مجھے شعلہ چومتا ہے وہ گلاب دیکھتا ہے

کوئی آئینہ ہے جس میں دو عکس جل رہے ہیں
میں خواب دیکھتا ہوں مجھے خواب دیکھتا ہے

کسی رات کا سمندر مرے ساتھ بہہ رہا ہے
کسی صبح کا ستارہ تہہِ آب دیکھتا ہے

کسی صفحے میں پڑا ہوں گلِ ہجر کی طرح میں
کسی شام کی ہوا میں وہ کتاب دیکھتا ہے

ابھی دن کے راستے میں کئی اور منزلیں ہیں
ابھی دھوپ کے پروں پر وہ سحاب دیکھتا ہے

کوئی ڈوبتا کنارا، کوئی جاگتا ستارہ
مرے پاؤں دیکھتا ہے، گرداب دیکھتا ہے

● ۱۱/ک، ماڈرن کالونی، ہیکو روڈ، لاہور (پاکستان)

اسلامی ممالک کی کہانیاں

اس نے اپنی اونی شال اپنے سر سے اتار کے بچے کے گرد لپیٹ دی۔ اب ماں کا کھلا ہوا جسم برف کے مقابلے میں بالکل بے بس ہو گیا اس نے موت کی قربت کو محسوس کیا' سمجھ گئی کہ وہ خود منجمد ہوتی جا رہی ہے۔ اب اس میں ذرا بھی سکت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

اس نے اپنا بلاؤز اتارا اور بچے کو کچھ اور زیادہ گرمی پہنچانے کے لئے اس سے ڈھک دیا۔ وہ تو ویسے بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونے کو تھی لیکن بچے کو بہرحال زندہ رہنا چاہیے! ماں اپنے بچے کی جان بچاتی ہی ہے' اس نے اپنی بچی کچی قوت سے بچے کو ساری مادری محبت کے ساتھ اپنے برہنہ سینے سے لگا لیا اور چپکے چپکے کہا:

"میرے لاڈلے' اب تمہیں گرمی پہنچانے کے لئے میرے پاس شاید میرے دل کے سوا اور کچھ بھی تو نہیں۔ اس دل کی آخری دھڑکن تک تمہاری ہے!"

ماں خاموش ہو گئی لیکن اس کے کانوں میں تانبے کی تویاں ٹن ٹن کر رہی تھیں' دانے اکڑاکڑ کے پھٹ رہے تھے۔ ماں اب نہ کچھ دیکھ سکتی تھی نہ کچھ سن سکتی تھی۔۔۔ وہ درخت سے زیادہ سے زیادہ سختی چلی گئی۔ سردیوں کی ظالم رات نے اسے ایک نئے لباس سے ڈھک دیا' پالے کی برفیلی انگلیوں نے اس کے جسم پر نازک' بلوریں گل بوٹے بن دیئے۔۔۔

صبح آئی' شفاف اور برفیلی صبح' فضا میں چمکتی ہوئی تیز' برہنہ تلوار جیسی صبح۔

درختوں کے سامنے تین افراد دشمن کو دھوکا دینے والے سفید لباس پہنے کھڑے تھے۔ یہ اسکاؤٹ تھے جو سروں کو برہنہ کئے ہوئے تھے' خاموش اور بے حس و حرکت ان کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسا سماں تھا جسے وہ اپنی زندگیوں میں کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ منجمد ہو جانے والی عورت کا برف کا مجسمہ۔

وہ تینوں اس مقدس قربان گاہ کے سامنے دیر تک یوں ہی بے حس و حرکت کھڑے رہے۔

آخرکار ان میں سے ایک درختوں اور برف کے مجسمے کے پاس گیا۔ اس نے کسی مبہم سی امید میں اس بنڈل کے اندر جھانکا جسے منجمد عورت اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے تھی۔ اس نے جذبات کی شدت سے کانپتی ہوئی انگلیوں سے کپڑے کو اوپر سے ہٹایا اور۔۔۔ دیکھا کہ اندر سے ایک بچے کی آنکھیں اسے تک رہی ہیں۔۔۔ نوجوان سپاہی' ششدر ہو کے غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹ آیا۔

"وہ زندہ ہے' وہ منجمد نہیں ہوا" اس نے جذبات کی شدت سے نحیف ہو جانے والی آواز میں کہا۔

بچہ صبح کی دھوپ سے آنکھیں میچ کر مسکرایا۔

سپاہی جو آگ' پانی کی طرح طرح کی محرومیوں سے گزر چکے تھے' اپنے مسرت کے آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکے۔ انہوں نے اپنے سر اٹھا کر ماں کے اس شاندار مجسمے کو ایک بار پھر دیکھا اور دعا مانگنے کی سی سرگوشی میں بے رحمی کے ساتھ بدلہ لینے کی قسم کھائی۔

بچے کو گود میں لئے کر وہ لوگ وہاں سے چلے آئے لیکن برف کا وہ مجسمہ' مادری محبت اور ایثار کی عظمت و قوت کا وہ پیکر ان کے دلوں میں کانٹے کی ایسی یادگار کی شکل اختیار کر گیا جو سنگین انتقام کے لئے مسلسل اکساتی رہتی تھی۔ *



گلشن کھنہ

روشن کئے ہوئے ہیں چراغ خودی کو ہم
بہلا رہے ہیں غم سے ترے زندگی کو ہم

جو تلخیٔ حیات کے سانچوں میں ڈھل سکے
لائیں کہاں سے ڈھونڈ کے اس دوستی کو ہم

شام و سحر اداس ہیں کلیوں کی دھڑکنیں
اب زہر جانتے ہیں گلوں کی ہنسی کو ہم

اس عالم وجود کے ہر ایک موڑ پر
محسوس کر رہے ہیں تمہاری کمی کو ہم

حدِ نگاہِ شوق کی وسعت کے نور میں
تکتے ہیں روز و شب تری جادوگری کو ہم

گلشن میں رقص کرتی ہیں صحرا کی آندھیاں
لے جائیں اب یہاں سے کہاں بے کلی کو ہم

92-GROVE ROAD, HOUNSLOW,
MIDDX TW3 3PT (U.K)

ساربان

منظر سلیم

چڑی مار

وہ زمانہ جس کا کافی دنوں سے انتظار تھا' آگیا تھا' بچے گھونسلوں کو خیرباد کہہ رہے تھے۔ انہوں نے ماں باپ کی چوکس نگاہوں کے سامنے اڑنا شروع کر دیا تھا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب وہ پہاڑوں پر جاکر چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑتا' گھر لاتا اور پنجروں میں بند کر دیا کرتا تھا۔ وہ پکا چڑی مار تھا۔ لیکن شکار صرف تیتروں کا ہی کرتا تھا۔ یہ پرندے اپنے ہلکے رنگ کے لیکن نفیس بال و پر اور اپنی خوش الحانی کے لئے اسے خاص طور سے بہت پسند تھے۔

سال کے اس زمانے میں اس کے گھر کا احاطہ چڑیا بازار جیسا لگتا تھا۔ سرخ چونچ والے بچوں کے پنجرے قطاروں میں رکھے رہتے تھے جن کے گرد وہ بڑے اطمینان کے ساتھ گھوم پھر کر ان کی احتیاط کے ساتھ دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ وہ ان کے لئے پہاڑیوں کی ہری بھری ڈھلانوں پر سے ٹڈے بھی پکڑ لاتا تھا۔ کیڑوں کو پنجروں کے اندر ڈالتا تو تیتر کے بھوکے بچے اپنے منہ پوری طرح کھول دیتے اور ہر ایک متمنی ہوتا کہ ذائقے دار شکار کا کوئی ٹکڑا اسے بھی نصیب ہو جائے۔ جنہیں خوش بختی سے کوئی بڑا ٹکڑا مل جاتا وہ اپنے سروں کو پیچھے کی طرف جھکا دیتے اور ضد کے ساتھ کوشاں رہتے تھے کہ ان کے مال غنیمت پر دوسرے بچے چونچ نہ مار سکیں۔ بچے روز بروز بڑے ہوتے رہتے تھے' اکثر ایک دوسرے سے خفا بھی ہو جاتے تھے اور نوبت لڑائی تک پہنچ جاتی تھی۔ وہ اتنے بڑے بڑے ہو جاتے تھے کہ ان کے پنجروں میں سب کے لئے بہت کم گنجائش رہ جاتی تھی۔ اس مرحلے پر چڑی مار سب سے زیادہ طاقتور اور لڑاکو تیتروں کو الگ الگ پنجروں میں بند کر دیتا اور کمزوروں کو اپنے عزیزوں اور احباب کو دے دیا کرتا تھا۔

چڑی مار ایک دلیر تیتر کو خاص طور پر بہت پسند کرتا تھا' جس کی خاردار ٹانگیں عقاب کی ٹانگوں کی طرح چھوٹی چھوٹی' گٹھیلی سی تھیں اور چونچ بالکل سیدھی اور مضبوط۔ تیتر کا کسا ہوا جسم اسے دریا کے چکنے پتھر کی یاد دلاتا تھا۔ یہ بہت عمدہ تیتر تھا جو آخری دم تک لڑتا رہ سکتا تھا۔ تھک جانے پر یہ چونچ کھول کے زور زور سے سانس لینے لگتا تھا۔ یہاں تک کہ مالک اسے دوبارہ پنجرے کے اندر بھگا دیتا تھا۔ "باقا" جیسا کہ چڑی مار نے بڑی محبت اور قدرے طنز کے ساتھ اس کا نام رکھا تھا' یوں تو دن بھر بولتا رہ سکتا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ وہ اکیلا' دوسری چڑیوں کو پھانسنے والے پرندے کے کردار میں کس حد تک مفید ثابت ہوگا؟

وہ نوروز کی تقریبات سے کوئی ہفتے بھر قبل شکار کے لئے جال لگانے کا آغاز کر دیتا تھا۔ شام ہونے لگتی تو وہ پہاڑیوں کا رخ اس حالت میں کرتا کہ پیٹھ پر تسمے سے بندھے ہوئے پنجرے میں کوئی تیتر ہوتا' چوغے کے دامن پٹکے میں ٹھنسے ہوتے اور پھندوں کے لئے ڈوری کا ایک گولا' ایک چاقو اور چوبی کھونٹیوں کا بنڈل ہاتھوں میں۔

صبح ہی صبح وہ تیتروں کے لئے جال بچھانے میں مصروف ہو جاتا۔ پنجرا رکھنے کی کسی مناسب جگہ کا انتخاب کرکے وہ پنجرے کے پاس ہی زمین میں ایک کھونٹی گاڑ دیتا' پھر ڈوری کا سرا اس کھونٹی میں باندھ کر پورے گولے کو کھولتے ہوئے ڈوری کو پھندوں کی شکل دیتا جاتا تھا۔ ایسے پھندوں کو جو ڈوری کے کھنچنے پر تنگ ہو کے کس جاتے تھے' وہ زمین پر کھونٹیاں گاڑ گاڑ کے ان سے باندھ دیتا تھا۔ اس کا یہ جال تیار ہو جاتا تو اس کی شکل بہت بڑے دائرے کی سی ہو جاتی تھی۔ کھنچاؤ سے کس جانے والے پھندوں کے اوپر سیکڑوں سے گھاس اور نیچی نیچی جھاڑیوں سے ذرا اوپر ابھرے رہتے تھے۔ چڑی مار پھندوں کے اس دائرے کے وسط



ریاض لطیف

بانجھ لمحوں کی صدا ہے تیرے میرے درمیاں
اک تمدّن کھو گیا ہے تیرے میرے درمیاں

ساعتِ اوّل کی ویرانی سے لے کر آج تک
بس! نفی کا سلسلہ ہے تیرے میرے درمیاں

آ! کہ اس کو گھول دیں ان منظروں کے لمس میں
اک جہاں تنہا پڑا ہے تیرے میرے درمیاں

ہر نفس تخلیق اور تخریب میں ڈوبا ہوا
ایک الجھا سا خدا ہے تیرے میرے درمیاں

آندھیاں چلتی ہیں ہر دم آتی جاتی سانس میں
اب ہوا بھی مرحلہ ہے تیرے میرے درمیاں

کیوں ملوں، بتلا ریاض انجان جنموں میں تجھے
بول! اب ایسا بھی کیا ہے، تیرے میرے درمیاں

● ۴۰- ڈاندھی کر ناگی کیبل کا لونی پورا احمد آباد (گجرات)



نعیمہ ضیاء الدین

دیرینہ مراسم ختم ہوئے بس رسم نبھانا باقی ہے
وہ ڈور کچھ ایسے اُلجھی ہے اب توڑ کے جانا باقی ہے

گو ہم بھی وہی ہیں اور تم بھی پر وقت نہیں اب وہ جاناں
دی موڑ نیا اس قصے کو اب کیا دہرانا باقی ہے

آنکھوں کے دریچوں پر اترے اک عمر ہوئی اُن کو لیکن
ان یادوں کے ہر منظر میں وہی آنا جانا باقی ہے

گو ترکِ تعلق سہل نہیں سب لیکن بھول ہی جاتے ہیں
پھر اپنے دل کے ریشوں میں کیوں درد پرانا باقی ہے

دل والوں کی تحریروں میں تو واعظ کی تصویر نہیں
پھر دل کی سنیں یا واعظ کی جھگڑا یہ چکانا باقی ہے

AM-KALBSKOPF -1,
63263-NEU-ISENBURG GERMANY.

میں رکھے ہوئے تیتر کے پنجرے کو گھاس اور پتوں وغیرہ سے ڈھک کر خود جھاڑیوں میں چھپ جاتا تھا۔ دوسرے تیتروں کو پھانسنے والا تیتر اگر خاموش ہوتا تھا تو وہ اس کو بولنے پر اکسانے لگتا تھا: "مجھے کوئی گیت سناؤ نا' میرے پیارے شکاری! ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں' اب تم اپنے یاروں کو مدعو کر سکتے ہو۔ ذرا زندہ دلی کے ساتھ گاؤ نا! ذرا مستعدی دکھاؤ' میری جان!"

توقعات کے میٹھے درد میں کھویا ہوا چڑی مار غیر شعوری طور پر زبان کو تالو سے لگا کر تیتری کی بولی بولنے لگتا یا پھر زبان کی نوک کو ذرا بائیں جانب موڑ کر تیتر کی بولی کی نقل اتارتا۔ پنجرے میں بند قیدی جواب دیتا اور پھر دھواں دھار بولنے لگتا تھا۔

لیکن اس بار اس نے شکار کا سلسلہ اپنے مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی شروع کر دیا تھا۔ اس نے بانکے کو خاموش کرنے کے لئے ہلکی سی آواز منہ سے نکالی اور تیتر نے گانا بند کر دیا۔ ذرا ہی دیر بعد گھاٹی سے کسی تیتر کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ نشیب میں تیز رفتار دریا کے بائیں جانب کسی جگہ سے واضح جواب سنائی دیا۔ کہیں قریب ہی کوئی دوسرا تیتر بھی موجود تھا۔

آفتاب کوہسار کی چوٹیوں پر طلوع ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی چڑیوں کے نغمات بھی ابھر رہے تھے جو ایک دوسرے میں ضم ہو کر جوڑے کہلانے والے پرندوں کے بہت ہی زوردار اور پر مسرت کورس میں ڈھلتے جا رہے تھے۔ مادائیں نروں کی پکار پر ان کی جانب کچھ یوں زور زور سے کڑکڑاتی ہوئی بے تحاشا دوڑتی تھیں کہ بازگشت دور تک سنائی دیتی تھی۔ کبھی کبھی چڑی مار دیکھتا کہ بانکے کی پکار پر کوئی تیتری سب کچھ بھول کے' ساری احتیاط کو بالائے طاق رکھ کے اس کی طرف دوڑتی آ رہی ہے۔ تیتری کسی پھندے میں پھنس کے بے تابی کے ساتھ اپنے بازوؤں کو پھڑپھڑانے لگتی۔ چڑی مار پہلے کھانس کر' تاکہ بانکا خوف زدہ نہ ہو جائے' چھپنے کی جگہ سے دبے پاؤں باہر آتا اور چڑیا کو پھندے سے رہا کر کے اپنی قمیض کے نیچے رکھ لیتا تھا۔ پھر وہ پھندے کو درست کر کے دوبارہ چھپ جاتا۔

لیکن جب انڈے سینے کا زمانہ آتا تو چڑی مار شکار پھانسنے والی چڑیا کے طور پر کسی تیتری کو اپنے ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ ان ایام میں نر بہت زیادہ اشتعال پذیر اور لڑاکو ہوتے تھے۔ وہ مادہ کی پکار پر سروں کو جھکا کے تیزی سے اس کی طرف دوڑ پڑتے تھے اور مرتعش گردنوں کے بال کھڑے ہو جاتے تھے۔ ان کی آنکھیں خیرہ اور دھندلی ہو جاتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر چڑی مار کو صرف یہی خیال رکھنا ہوتا تھا کہ پھندے الجھنے نہ پائیں۔

اس سب کے باوجود چڑی مار شکار کے "بانکے" کو جسے انتہائی محتاط چڑیوں کو بھی لبھا کر جال کے اندر بلا لینے کا فن خوب آتا تھا' ساتھ لے جانے کو ترجیح دیتا تھا۔ موسم سرما میں وہ تیتر کو کشمش' بھیگی مٹر اور اخروٹ کے ٹکڑے کھلاتا اور تازہ پانی پلاتا تھا۔ بہار آتی تو وہ پہاڑوں پر جا کے ان پودوں کے ڈنٹھل توڑ لاتا جو انسان کے لئے زہریلے ہونے کے باوجود جانے کیوں تیتروں کی محبوب غذا ہیں۔ وہ اپنے تیتر کے لئے ٹڈیاں پکڑتا اور پہاڑی ڈھلانوں پر سے اوائل بہار کے سفید پھول اور گرونڈے کی جڑیں بھی لے آتا تھا۔

اس نے اپنے چہیتے کی آواز ٹیپ بھی کر لی تھی۔ اسے وہ حصہ خاص طور سے پسند تھا' جس میں بانکے نے کوے کی طرح کاؤں کاؤں کی تھی۔ تیتر اس قسم کی بولی دوسرے تیتروں کو خاموش کرنے کے لئے بولا کرتا تھا۔ چڑی مار کے ہاں مہمان آتے تو وہ کیسٹ پلیئر کو کسی نظر نہ آنے والی جگہ پر رکھ کے چالو کر دیتا تھا اور اس کے گھر میں تیتر کی آوازیں گونجنے لگتی تھیں۔

اگلے موسم میں چڑی مار نے' جو بانکے کو بندوق کی آواز سے خائف نہ ہونا سکھا چکا تھا' پھندوں کے ذریعے شکار کھیلنا ترک کر دیا۔ اس کا نشانہ بہت اچھا تھا اور کبھی کبھی وہ اپنی بندوق سے دو غاروں والے کمیاب تیتروں کو بھی گرا لیا کرتا تھا۔

ایک روز چڑی مار بانکے کا پنجرا صنوبر کی ایک شاخ میں لٹکا کر خود قریب ہی ایک درخت کے تنے کے کھوکھلے حصے میں چھپ گیا۔ رات کی بارشوں کے بعد آسمان سے بادل چھٹ چکے تھے لیکن بڑی بڑی بوندیں شاخوں سے اب بھی ٹپک رہی تھیں۔ بانکا سر اٹھا کے ذرا دیر تک سنتا رہا پھر اس نے دھیرے دھیرے بولنا



افتخار امام صدّیقی

ہے جنگلوں کا سفر اور مچان سر پہ ہے
خدا نہیں ہے، خدا کا گمان سر پہ ہے

عجب گھٹن سی ہے مجھ میں، کہاں یہ قید ہوں میں
زمین پاؤں تلے، آسمان سر پہ ہے

ہزار کوششیں کرلیں، وہ بولتا ہی نہیں
خموشیوں کا یہ کیسا جہان سر پہ ہے

ہوائیں گونجتی رہتی ہیں، شور کرتی ہیں
فلک ہے یا کوئی خالی مکان سر پہ ہے

میں بہہ رہا ہوں کدھر کو، مجھے نہیں معلوم
سراب و خواب کا اک بادبان سر پہ ہے

سفر تضاد میں قدموں کا راستہ کیا ہے
عروج پاؤں کے نیچے، ڈھلان سر پہ ہے

میں اپنی جنگ میں اپنا ہی خود مخالف ہوں
یہیں تیر اپنی طرف اور کمان سر پہ ہے

شروع کر دیا۔ اسے فوراً ہی جواب ملا' کوئی موٹی سی تیتری اوپر اڑی اور ایک بھاری پتھر پر بیٹھ گئی۔ چڑی مار نے نشانہ لگایا لیکن تیتری اب بھی بہت دور تھی۔

بانکا بڑی مستی کے ساتھ بول رہا تھا' بار بار پنجرے میں اچھل رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے ساری شاخوں' سارے اشجار' بلکہ خود صبح تک نے نغمے چھیڑ دیے ہوں۔ تیتری اڑ کے کچھ اور قریب آئی لیکن جنگلی گلاب کی ایک جھاڑی نے اسے آڑ میں کر رکھا تھا۔

اچانک ایک فائر ہوا۔ تیتری اڑ گئی اور شکاری بدحواسی کے ساتھ اپنی بندوق کو تکنے لگا۔ پھر اس نے ہکا بکا ہوکر دیکھا کہ پنجرے میں لہو لہان بانکا تڑپ رہا ہے۔ وہ تیزی سے پنجرے کی طرف دوڑا لیکن اچانک اسے جھاڑیوں سے آتے ہوئے کسی شخص کی چاپ سنائی دی۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنی رائفل بلند کرکے قریب آتے ہوئے اجنبی کے سر کا نشانہ لگایا لیکن ہاتھوں کے مرتعش ہو جانے سے نال اوپر اٹھ گئی۔ فائر ہوا اور اجنبی اچانک چیختا ہوا ٹھہر گیا۔

"جہنم میں جاؤ!" چڑی مار جھاڑیوں سے باہر نکلتے ہوئے غصے سے چلایا "تم کہاں سے ٹپک پڑے؟"

تیتر کو گولی مارنے والا گھبراہٹ کے مارے زمین پر پیر رگڑنے لگا۔

"وہ... بات یہ ہوئی...... دراصل میں پنجرے کو نہ دیکھ سکا۔"

"آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟ آنکھیں پھوٹ گئی ہیں کیا؟"

"دور سے پنجرے کے تار کہاں دکھائی دیتے ہیں" بدبخت نشانے باز نے اپنی صفائی پیش کی۔ "میں آپ کو دوسرا تیتر دے دوں گا جو اس سے پرانا ہوگا!"

"بھاڑ میں جائیں تمہارے تیتر! ایسا تیتر اور کہاں ہے...."

چڑی مار نے پنجرے کو شاخ سے اتار کے کھولا اور احتیاط سے بانکے کو باہر نکالا۔ طائر کا جسم سرد پڑ چکا تھا۔ وہ مرے ہوئے تیتر کو ہتھیلی پر رکھ کے اداسی کے ساتھ دھیرے دھیرے سہلاتا رہا پھر اچانک بڑی جھلاہٹ سے اسے اجنبی کے قدموں میں پھینک دیا۔

"لو' اٹھا لو اپنی کامیابی کی اس یادگار کو!"

"نہیں' نہیں۔ میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں.... میں تو اس کا تصور تک نہیں کر سکتا.... قسم کھاتا ہوں!"

لیکن شکاری نے اور کچھ کہے بغیر پنجرے کو جھاڑیوں میں اچھال دیا اور دھیرے دھیرے گاؤں کی طرف چلنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ خالی ہاتھ واپس لوٹ رہا تھا۔

گھر پہنچ کے اس نے کیسٹ پلیئر چالو کر دیا۔ بانکے کی آواز ایک بار پھر اسے سنائی دی' وہ بلند آواز سے اپنے شیریں نغمات فضا میں بکھیر رہا تھا۔ چڑی مار کے رخساروں پر آنسو بہہ نکلے۔

اس نے سات دنوں تک سوگ منایا پھر کیسٹ پلیئر کو لے کر پہاڑوں پر چلا گیا۔ وہاں اس نے صنوبر کے ایک درخت کے نیچے تھوڑی سی جگہ صاف کرکے کیسٹ پلیئر کو رکھا اور چالو کر دیا۔ اس کے محبوب تیتر نے اپنا ختم نہ ہونے والا نغمہ چھیڑ دیا لیکن اس مشینی آواز کے درمیانی وقفوں کی خاموشی بڑی مہیب معلوم ہو رہی تھی۔ *

نقد و نظر

شمارہ ۳۰۰۰

برنداون

ادیب و شاعر محمد عبد القادر ادیب کا دوسرا شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ اس سے قبل "نور کا سایہ" شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ "برنداون" موضوعاتی نظموں کا ایک فکر انگیز مجموعہ ہے۔ جس میں ۱۴۴ پابند نظمیں شامل ہیں۔ یہ دور پابند یا موضوعاتی شاعری کا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اردو میں تہواروں، موسموں، تاریخی عمارتوں پر کم کم نظمیں ملتی ہیں۔ سیاسی، سماجی، اور مذہبی شخصیتوں پر بھی نظمیں نہیں کہی جا رہی ہیں۔ فی زمانہ نظم کا جو تصور ہے اس نے اردو کی اعلیٰ شاعری کو روایتی شاعری کی تاریخ بنا دیا ہے۔ ورنہ محمد عبد القادر ادیب کو چونکہ شعری اظہار پر قدرت ہے۔ اور وہ رواں دواں بحروں میں لفظ و خیال کو برتنا جانتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے برگزیدہ اشخاص، تاریخی عمارتوں، بعض شہروں پر بہت اچھی اور پُر تاثیر نظمیں تخلیق کی ہیں۔ وہ بجا طور پر داد کے مستحق ہیں۔ امیر خسرو، سرسید احمد خاں، علامہ اقبال، سورداس، مہاتما گاندھی جی، جواہر لال نہرو، مولانا آزاد، ذاکر حسین، فخر الدین علی احمد، لال بہادر شاستری، بہادر یار جنگ، مخدوم محی الدین، مقصود علی خان پر نامی گرامی اور نظمیں ہیں۔

★ ضخامت: ۱۴۴ صفحات ★ قیمت: پچاس روپئے ★ مطبوعہ: ۱۹۹۲ء ★ رابطہ: محمد عبد القادر ادیب — نمبر ۴۹ سی ایم ایچ روڈ، نزد پاپا شو روم اندرا نگر بنگلور — ۵۶۰۰۳۸

انداز بیاں اور

عروضیوں نے رباعی کے ۲۴ اوزان میں ۱۲ نئے اوزان کا اضافہ کر کے انہیں ۳۶ تک پہنچا دیا ہے۔ بعض تو اس سے بھی آگے کی کہہ رہے ہیں۔ یہاں یہ بحث مقصود نہیں کہ رباعی کے ۲۴ اوزان ہیں، ۳۶ ہیں یا اس سے زیادہ۔ ۲۴ اوزان بھی مکمل طور پر عملی سطح پر برتے گئے ہیں کہ نہیں۔ یہ بھی ایک بحث طلب موضوع ہے۔ کتنے شعرا رباعی کو پورے فنی اہتمام کے ساتھ تخلیقی اور سکے ہیں۔ یہ ایک موضوع الگ۔ ناوک حمزہ پوری، عروض داں ہیں۔ انہوں نے مروجہ ۲۴ اوزان میں ۳۹۶ رباعیاں پیش کی ہیں اور ہر مصرعے کے پہلو میں وزن کا نمبر اور نمبر شمار دے دئے گئے ہیں۔ رباعیوں میں ایسے لفظوں کا بھی استعمال کیا ہے جن کو شاعری بنانا آسان نہیں اور وہ بھی رباعی میں۔ جب تک کسی لفظ کی پوری قرأت کا شعور نہ ہو وہ وزن و آہنگ کا حصہ نہیں بن سکتے۔ انداز بیاں اور ——— مسئلہ رباعی اور اس کے لوازمات کو جاننے کے لئے شاعری اور عروض کے طلباء کے لئے بس مفید رہے گا ★ ضخامت: ۲۰۰ صفحات ★ قیمت ۱۵ روپئے ★ مطبوعہ جون ۱۹۹۲ء ★ رابطہ نوس اردو لائبریری، حمزہ پور، پوسٹ شیر گھاٹی ضلع گیا — ۸۲۴۲۱۱

دیر اسلوب

مرزا محمد یسین بیگ کا اولین مجموعہ شاعری ہوبر کے تلے (۱۹۸۰ء) شائع ہوا تھا تو کوئی خاص پذیرائی نہیں ہوئی تھی مگر یہ ضرور ہوا تھا کہ کم گو یسین بیگ کی شاعری کو پسند کیا گیا تھا۔ بارہ سال بعد ان کی مثنوی بڑی ۲۹ نظموں کے پاس مجموعے نے خوشگوار حیرت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کیا۔ یسین بیگ غزل کے ایک بہت اچھے اور سچے شاعر ہیں۔ مشاعروں میں ان کی معیاری غزلیں اپنا تخلیقی جادو جگاتی ہیں۔ اس مجموعے میں ایک بھی غزل شامل نہیں ہے۔ چنانچہ نظموں کی تخلیقی فضا اول تا آخر عجب جہانوں میں لے جاتی ہے۔ مختصر نظموں میں موضوع، خیال اور شعری تلازمے اپنی ڈرافٹنگ میں صرف شاعری نہیں کرتے بلکہ قاری کے عزیز محسوسات میں نہایت ہی ملائمت کے ساتھ جذب بھی ہوتے جاتے ہیں۔ مرزا بیگ غزل میں تو سانسیں لیتے ہی ہیں مگر اپنی پوری صحت مند سانسوں کے ساتھ وہ نظموں میں بھی مرعوب کرنے والا شعری قد رکھتے ہیں۔ یہ شعری مجموعہ بجا طور پر پذیرائی کا مستحق ہے کہ اکہری نظموں کی بھیڑ میں یہ نظمیں ہر اعتبار سے مسرت و بصیرت عطا کرتی ہیں۔ مجموعے میں سے ایک نظم "انبوہ آوارگاں" تعارف کے طور پر اور "اپنے مطالعے" کے لئے پیش ہے "کہ اک دن، رستے پیڑ، سڑکیں، مکان، بجلی کے کھمبے، آئینے، چھتریاں، ٹین، ڈبے، پھول، پھل، کھیت، کھلیان، سر قدوں پر جڑے گرد آلود کتبے، رکو، پھر جندرے، صدف، آہنی سیف، سب کے سب پنجوں پیروں سے چلنے لگے، اور کینوس پر منجمد نقش پیکر اٹھانے ہونے رقص قطرہ سر کرنے لگے، ایک انبوہ آوارگاں ہو۔"

★ ضخامت: ۱۰۳ صفحات ★ قیمت: سو روپئے ★ مطبوعہ: جنوری ۱۹۹۱ء ★ پتہ: محمد یسین بیگ — ۴۰۹ — اسپ بحتہ، جموں (جموں کشمیر)

مستقبل (سہ ماہی)

۱۹۹۳ء کی پہلی سہ ماہی کا شمارہ اولین ایک خوب سیرت ادبی رسالہ جو مشہور ادیبہ اور شاعرہ ثمینہ راجہ کی ادارت میں شائع ہوا ہے۔ مندرجات میں:

شاعری کا مسئلہ (جمیل جالبی)، محمود درویش کا تعارف اور دو نظموں کا ترجمہ (انور زاہدی)، آفتاب اقبال شمیم کی چار نظمیں اور چار غزلیں۔ سرمد صہبائی کی ۷ نظمیں، امریکہ کی شاعرہ لارا گلکمن کی ۲ نظموں کا ترجمہ اور تعارف (آصف فرخی)، ثروت حسین کی ۹ نظمیں اور ۲ غزلیں، زبان ملک کی ۹ نظمیں ایک غزل اور ایک کالی منتر مختی کی ہندیا ترا اور رشید امجد کا تبصرہ "ہندیا ترا" کے دو ابواب۔ وقار بن الٰہی کا افسانہ "دوشیزہ صدی الٹکر دل پر" حیدر جعفری سید کے دو افسانے (تامل اور روسی کہانیوں کا ترجمہ) ثمینہ راجہ کی کہانی "تا گفتنی (۱۹۷۶ء)" احمد ندیم قاسمی "صبا" چاند عمری، ظفر اقبال، توصیف تبسم، جلیل عالی، جاوید احمد اور ثمینہ راجہ کی غزلیں۔ امجد اسلام امجد، نسرین انجم بھٹی، جاوید انور اور صدر صدیقی رضی کی نظمیں اور آخر میں سپین کے مشہور ادیب اور فلسفی آرٹیگا وائی گاسے کی شخصیت و فن پر قاضی قیصر الاسلام کا طویل مضمون پورے رسالے کو ایک معیاری علمی جہت عطا کرتا ہے۔ مدیرہ ثمینہ راجہ نے ابتدائیے میں تحریر کیا ہے: "مستقبل، عہد نامہ ہے روفا کا اپنے مذہب سے راہنمائی زمین سے اپنے لوگوں سے اپنے شعر و ادب اور علم و فن سے، ہم روایت کی قدامت اور روایت کی جدت پر یقین رکھتے ہیں، ہم محبت کا اقرار اور نفرت سے انکار کرتے ہیں، ہم فقط متعصب لوگوں سے متعصب رکھتے ہیں۔" مستقبل کو جاری رکھنے اور مزید بہتر بنانے میں لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کے تعاون کی یکساں ضرورت ہے۔ ★ ضخامت: ۲۰۶ صفحات جہازی سائز ★ قیمت فی شمارہ: تیس روپئے — سالانہ خریداری رجسٹری سے ۱۵۰ ★ رابطہ مستقبل — ۲۲ — II — رستاسد اسلام آباد (پاکستان)

دست گرداں

شکیب غوثی اردو شاعری کا کوئی معروف نام نہیں ہے۔ اردو اس کی مادری زبان نہیں۔ مراٹھی ذریعہ تعلیم رہا۔ اس نے اردو کی روایتی یا کلاسیکی شاعری نہیں پڑھی اور نہ ہی اپنی شاعری پر کسی سے اصلاح لی۔ مگر ۱۹۹۵ کے بعد ان کے شعری سفر میں بعض محرومیاں، خوبیاں بن کر ابھریں۔ نفسیات سے دلچسپی اور جنسیات کا مطالعہ اور زندگی کو اپنے طور پر دیکھنے اور محسوس کرنے کا عمل ان سب کو شاعری کا لوازمہ بنایا۔ فرائڈ سے متاثر شکیب غوثی نے غزل و نظم میں جنسی موضوعات اور تلازموں کو تخلیقی روپ دینے کی کوشش کی ہے۔ مروجہ مستعمل بحروں کے علاوہ کم معروف بحروں میں بھی انہوں نے غزلیں کہی ہیں۔ غزل کا باب "دشت آوارگی" کے عنوان سے ہے۔ اس میں ایک سو پندرہ غزلیں شامل ہیں۔ اور اشعار کی تعداد سات سے زائد ہے۔ سخت ترین انتخاب سے یہ غزلیں اور بچ سکتیں۔ "شیشۂ بے ترتیل" کے تحت تیس نظمیں شامل ہیں۔ اپنے عنوانات، موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے متوجہ کرتی ہیں۔ مجموعی طور پر شاعری کے اس پورے تخلیقی لوازمے سے روشن امکانات کا پتہ چلتا ہے۔

★ ضخامت: ۲۲۴ صفحات ★ قیمت: ۷۵ روپئے ★ مطبوعہ ۱۹۹۲ء ★ رابطہ: سید مکرم حسین، جہانیہانی سکول، متوری رسالے اسٹیشن روڈ، دہی بازار، ناگپور — ۴۴۰۰۰۸

چاندنی کے خطوط

نوجوان شاعر پروین کمار اشک کا دوسرا شعری مجموعہ (۱۹۸۰ء - ۱۹۹۰ء) نہایت ہی خوبصورت گٹ اپ کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ اشک کی شعری کائنات اسکے اپنے وجدان اور تجربے سے متشکل ہوئی ہے۔ اپنی ذات کی تہوں میں عوامی عمل شعری آہنگ میں روشنی بن کر لفظ لفظ منور ہوتا ہے۔ اسکے اپنے احساسات کی تہیں، تجربوں اور مشاہدوں سے جتنی منور تی جب شعر میں ترقی پذیر تو جدید ہمدردی کا احساس جگاتی ہیں۔ ایک گوشہ نشین سوچ تفسیر، پروین کمار اشک آپ سے مکالمہ کرتا ہے ★ مطبوعہ ۱۹۹۲ ★ ضخامت: ۲۰ صفحات ★ قیمت: ۵۰ روپئے ★ رابطہ گرشا اسٹریٹ پٹھان کوٹ ۱۴۵۰۰۱ (پنجاب)

مکتوبات

★ رفیق عالم — فقد تمن پورہ، اولڈ صافولی حیدرآباد ۵۰۰۰۲۳
شاعر کا شمارہ 'نئی نفسیات' آپ کی باقاعدہ جرأت مندانہ علمی، وسیع النظری اور پختہ تنقیدی شعور کا مظہر ہے۔ نئے تخلیقی ذہن کو شاندار طریقے سے اجاگر کرنے اور ایک تناظر (PERSPECTIVE) دینے کے لئے دلی مبارکباد قبول کیجئے۔ 'جرأت' کے تحت آپ کی گرانقدر تاثرات نہ صرف قابل غور و فکر ہے۔ اس میں پیش گوئی بھی شامل ہے اور ایک نئی سمت کی نشاندہی بھی۔ اس سے آپ کی گہری تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ آپ نے جو بھی لکھا ہے وہ نئی شاعری کے لئے BLUE PRINT ہے۔ آپ نے صد فی صد صحیح کہا ہے کہ 'نیا تخلیقی ذہن ہر طرح کے امر کی نفی پر آمادہ ہے ————— بہت ساری جانبوں کے باوجود فکری سطح پر آدمی جیسے کہ سایا ہے۔ مذاہب عالم اور مکمل تہذیبی شعور کے باوجود، یعنی کہ نئی شاعری بدشکستگی کی شاعری ہے۔ علیحدگی کی شاعری ہے۔ خود کو دریافت کرنے کا ایک عمل ہے۔ ساتھ ساتھ UNIQUE بھی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ اور امریکہ میں اس نوع کی شاعری نے ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی اور اس کو اینٹی پوئٹری کا نام دیا گیا۔ مغرب میں اس نئی شاعری کے علمبردار بعض مشہور شعرا میں PARRA ZHIGINIEW JAMES SABINES، MARK STRAND CHARLESSIMIC، W M BROWN، MARVIN BELL وغیرہ ہیں۔ یہ لوگ اپنی شاعری کو اینٹی پوئٹری کہتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی شاعری بھی ہر طرح کے امر کی نفی پر آمادہ ہے۔ انکے مطابق ان کی شاعری NON-PROGRAMMATIC ہے۔ یعنی یک سانچی نظم یا جیسی نظم ہے۔ خواہ اسے کسی طرح لکھا جائے۔

★ جاوید دانش 119-601, DUNDAS ST. E. WHITBY ONTARIO L1N 7B8 CANADA.
گزشتہ شمارہ خاصہ معیاری رہا۔ نئی شعری رجحانات کے تحت دی گئی اور منتخبہ نظمیں یکجا ہو گئی ہیں۔ مگر اس میں نئی نفسیات کا تنہا سا ہے۔ آپ کا اداریہ مگر فکر انگیز ہے۔ تبسم مسعود کی کہانی 'مذہب' پڑھا۔ میں اسے 'سونات' یا عصر کسی پاکستانی رسالے میں پڑھ چکا ہوں۔ مگر مجھے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں۔

★ مدالوار — نواز لاج، توپل، پلوامہ (کشمیر)
نئی نسل سے تعلق رکھنے والے اردو قلم کاروں اور دستاروں کی حوصلہ افزائی کے لئے شکریہ۔ حالیہ شمارے میں ساحر کی نظمیں بہت پسند آئیں۔ خاص طور پر نظم "بے بسی"۔ نئے لکھنے والوں میں تخلیقی تحرک ہے۔ افسانے پر ڈاکٹر اویس شاہان کا مضمون، کئی اہم بنیادی مسائل ابھارتا ہے اور متعارف بھی کرواتا ہے۔ 'شاعر' کے گزشتہ شمارے 'اور نگ نیلے' اور اردو کی نئی بستیاں 'بہت اہم' اور مختلف تھے۔

★ محمود ہاشمی 46-HOBMOOR ROAD BIRMINGHAM B10 9BU (U K)
آپ کا ارسال کردہ شاعر بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ سب سے پہلے مکتوبات پڑھے۔ قلم بہت بلیک تھا۔ اور میری نظر خاصی کمزور ہے۔ انھیں انھیں پڑھتے ہوئے متواتر احتجاج کرتی رہیں لیکن میں نے انہیں پڑھ ہی لیا۔ اس طرح کے مکتوبات سے رسالے کے مزاج کا پتہ چل جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ادیبوں اور شاعروں کے لئے بھی مفید ہیں۔ انکی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور انھیں بڑے سیدھے سبھاؤ یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہیں اور ان کی اوقات کیا ہے۔ ان کے قدر شناس انکی رسائی بھی کرتے ہیں اور اگر وہ پر خود غلط نہ ہوں تو انھیں اپنے آپ کو بہتر بنانے کا موقع میسر آجاتا ہے۔ ان سے لکھنے اور پڑھنے والوں کے درمیان ایک ایسا رشتہ بھی قائم ہو جاتا ہے جو اپنائیت کا رشتہ ہے اور اس رشتے سے کہیں بہتر ہے جو لکھنے والوں اور انکے اصل نسل قاریوں کا رشتہ ہے۔ (گو اس رشتے کی بھی اپنی اہمیت ہے) اردو کی نئی بستیوں کی طرف آپ کی توجہ قابل قدر ہے۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کی محنتوں کی دل سے داد دیتا ہوں۔ امید ہے کہ شاعر نہ صرف یہاں نئی بستیوں کے لئے ایک منصبہ اظہار کو مہیا کرے گا بلکہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو توانا کرنے میں بھی مدد ثابت ہوگا۔ اردو ادب کے لئے شاعر کا یہ اقدام ایک بہت نئی نوعیت کا اقدام ہے۔

★ بشیر بدر — بادشاہ پارٹمنٹ کوہ فضا، بھوپال
شاعر کے مشترکہ شمارے (۳ اور ۴) قابل مطالعہ ہیں۔ وہ محبت کرنے والے جب بے تعلق کی پاکیزگی میں نڈھال ہو جاتے ہیں اور ان پر آسودگی کی روحانی سرمستی کا جو نشہ طاری ہوتا ہے۔ وہی صورت میری روح کو گلزار کی کہانی 'کس کی کہانی' پڑھ کر میسر ہوئی۔ انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا اپنا تکبر ہوتا ہے۔ گلزار کا ایک شعر میری دلی کیفیت کو ظاہر کرنے میں مدد دے رہا ہے:

لفظ کاغذ پہ بیٹھتے ہی نہیں
اڑتے پھرتے ہیں تتلیوں کی طرح

★ حمید الماس — ۲۷۴۳۳ اے مین ۹۸ بلاک جہانگیر۔ جہانگر
شاعر کے شماروں کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پرانے راستوں کو چھوڑ کر نئی راہوں پر نئے سفر کا آغاز کیا ہے۔ ان دنوں شاعر کے ہر صفحہ پر ایک سادہ 'دل' سوچنے والے ذہن اور نئی منزلوں کی تلاش کرنے والی نظر کی کارفرمائیاں ملتی ہیں۔ خدا کرے کہ آپ کا یہ سفر کامیاب ہو۔

★ راہی فدائی — ۲۸/۱۸ مہان الدین اسٹریٹ کرپہ — ۵۱۶۰۰۱
فی الوقت آپ اردو کے لئے جس طرح کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ تو اظہر من الشمس ہے۔ بالخصوص ہمارے شاعروں ادیبوں اور نقادوں کی بیجا عقیدہ بندیوں کو توڑنے اور انھیں ایک پلیٹ فارم پر لانے کی سعی قابل صد تحسین ہے۔ آپ نے غزل میں مضامین کی یکسانیت کو ختم کرنے کی جو ترغیب دی ہے۔ وہ واقعتاً نہ صرف شاعروں کے لئے بلکہ اردو زبان کے لئے بھی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔ خدا کرے کہ آپ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ہمارے شعرا غزل کو نئی زندگی بخشیں گے۔

★ رونق شہری — شسد دو تہ ایس پی کالج، جعفر
شمارہ نمبر ۳ اور ۴ گوناگوں خوبیوں کا حامل ہے۔ مظہر امام کی آزاد غزلیں ان کی مخصوص طبیعت کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی غزلیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ اب تک آزاد غزل کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوئے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ آزاد غزل اب لوگوں کے ذہن سے اتر چکی ہے۔ علیم صبا نویدی اس میدان کے تنہا شہسوار رہ گئے ہیں۔ پرویز رحمانی نے کیپٹل کا دامن تھام لیا اور یوسف جمال پابند غزل کے علمبرداروں میں دیکھے جاتے ہیں۔ اس بار مکتوبات کا کالم خاصہ فکر انگیز اور دلچسپ ہے۔ بین الاقوامی رسائل میں خطوط کی بھی اہمیت ہے۔ خطوط کے ذریعہ میں ادبی جھگڑوں کی تلاش و جستجو میں شاعر کے باذوق قارئین کے لئے مشرف عالم ذوقی اور ارشد عبدالحمید کے ارشادات ذہن اور ان نظریہ سازی کے لئے لو فکر رہے ہیں۔ اوم کرشن راحت کی کہانی 'کمزوری' ہر لحاظ سے ایک خاموش تخلیق ہے۔ نٹ پا کسی زندگی کس طرح مکروہ چہروں پر طمانچہ لگاتی ہے۔ اسے بہت ہی موثر پیرائے میں کہانی بنایا گیا ہے۔

★ یوسف جمال — راج کا ٹنگ پور ۱۷۰۰۷۷ (اڑیسہ)
شاعر ۳ — ۴ کے مشترکہ شمارے میں "کہانیاں کیوں لکھتے ہو اور کس کے لئے" حاصل مطالعہ ہے۔ سید محمد عقیل۔ موجودہ افسانوی ادب کا حقیقت پر مبنی تجزیہ کیا ہے۔ نئی کہانیاں آج جس ڈگر پر ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ آج کی کہانیوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ قاری کے دسترس سے باہر ہیں۔ انکے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ کیونکہ وہ ابہامی علامتوں کی بیساکھیوں پر چلنے والی کہانیاں ہیں۔ خود افسانہ نگاروں سے ان کی وضاحت طلب کی جائے تو وہ بغلیں جھانکتے نظر آئیں گے۔ لہذا شمارے میں کنور سین کا 'مریض' بھی اس مرض میں مبتلا ہے۔ ایسی کہانیاں چھاپ کر آپ شاعر کے قیمتی صفحات برباد کر رہے ہیں۔ گلزار، فاروق راہب اور شاہد اختر کامیاب ہیں۔ غزل پر ایک مکالمہ 'جدید تر نسل' چند سوالوں اور آج کی اردو کہانیاں تینوں قلمکاروں نے اٹھایا کیا ہے۔ نظمیں اور غزلیں شاعر کے معیار پر ہیں۔ مظہر امام اور پرویز رحمانی کی آزاد غزلیں دلپسند ہیں۔ مکتوبات کے کالم میں شمو ئیل احمد نے 'تصور' کو واحد میں استعمال کیا ہے۔ جو غلط ہے۔ اردو میں چند الفاظ ایسے ہیں۔ جو صرف جمع میں آتے ہیں مثلاً دستخط، اور معنی وغیرہ۔ منیر الدین احمد نے سرشند پر کاش کی پوری وکالت کر کے حق دوستی ادا کر دیا ہے۔ اردو کی نئی بستیوں کا سلسلہ جاری رکھئے۔ یہ انوکھا باب ہے اور جس کی انفرادیت سے انحراف ممکن نہیں ہے۔ سرورق میں نمایاں تبدیلی سے آپ کی کاوشوں کی عکاسی ہوتی ہے کہ خوب سے خوب تر کو آپ نے شعار بنا رکھا ہے۔

★ صغیر رحمانی — بکھ پور، مکرولا (بہار)
'شاعر' کے دونوں شمارے بہت اچھے ترتیب دئے گئے ہیں۔ تقریباً ساری ہی کہانیاں دلچسپ ہیں۔ مکتوبات میں شامل خطوط اور تین خطباتیں پیرزادہ کے تحت جو تین خطوط شامل ہیں وہ بھی کافی اہم ہیں۔ دیگر ادبی رسائل کی طرح آپ میں ادارہ حوصلے کا فقدان نہیں ہے۔ مدیر کے لئے وہ اپنے ساتھ ہی میر زمانہ اور ہو، یہ شرط اولین ہے۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کا مسلسل اعلان شائع کر کے آپ نے قاری کی شدرگ کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ یا ایک کامیاب مدیر کی پہچان ہے کہ وہ اپنے قاری کے

کس کی شدت کو کتنا بڑھا رہا ہے۔ نمبر کیا ہوگا؟ کیسا ہوگا؟ اس تجزیے کا استقلال اردو شعر و ادب بالخصوص قاری کی نہایت ہی بے صبری کے ساتھ کر رہا ہے۔ آخر وہ دن آئے گا کب۔۔۔؟

★ مشتاق مہدی ۔۔۔ سورنینگ، مشتاق اوی سرینگر (کشمیر)

شاعر کے مشترکہ شمارے (۳ اور ۴) کا سرورق بےحد جاذب نظر ہے۔ گلزار کی کہانی "کس کی کہانی" بہت پسند آئی۔ انہوں نے اپنی کہانی میں کہانی کے متعلق کئی اہم باتیں کہی ہیں۔ مثلاً کہانی صرف پلاٹ کے واقعات کی تشکیل اور اس سے پیدا ہونے والے کرداروں کے تعلقات ہی کا نام نہیں ہے بلکہ ذہنی حالات کے اثرات بھی اپنے آپ میں ایک کہانی کو جنم دیتے ہیں۔ اور اس کے معانی اثرات کو۔ اسی افسانے میں ایک اور جگہ داخل کار کو یہ جانے کے منہ سے کہانی کے متعلق ایک اور نکتہ بیان کرتے ہیں۔ نئی کہانی کا سب سے بڑا مسئلہ حقیقت کا بدلتا ہوا تصور ہے۔ حقیقت صرف وہ نہیں جو دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ اصل حقیقت وہ ہے جو آنکھ سے نظر نہیں آتی ہے۔ یقیناً گلزار ایسی عمدہ تی کہانی کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

★ قیصر جمال ۔۔۔ سب ڈویژنل آفس واپڈا، ورکینٹ پٹنہ

شاعر کے حالیہ شمارے میں ارشد عبدالحمید کا خط ترقی پسندی اور جدیدیت سے منحرف ہونے والی نئی نسل کی شناخت کا مواد فراہم کرتا ہے۔ نئی نسل کا انحراف اردو ادب کے لئے نیک فال ہے یا نہیں؟ اس مسئلے پر ہمارے بزرگان ادب کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ میں ارشد کی اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ ہم نے مکمل جدیدیت پسند افسانے کو رد نہیں کیا ہے۔ یہ سچائی سے منہ موڑنا ہے۔ دراصل نئی نسل نے ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کو مکمل طور پر رد کر دیا ہے۔ اگر نئی نسل کے افسانے یا اشعار میں جدیدیت یا ترقی پسندی کی کوئی خوبی ملتی ہے تو وہ شعوری طور پر نہیں بلکہ لاشعوری طور پر ملے گی۔ نئی نسل صاف گوئی اور حق پسندی کو اپنا ایمان سمجھتی ہے۔ یہ نسل اتنی باشعور ہے کہ یہ کسی طرح کسی قسم کے ناقدوں کے جھانسے میں آنے والی نہیں۔ یوں کہ ان کے نظریات کی قلعی ہمارے سامنے کھل چکی ہے۔ اب وہ رہ گئے اپنے بدو دو، جمالیات کی مدافعت میں باقی سپہ ہی رہ گئیں پڑ رہے ہیں۔ نہ جانے کس مصلحت پسندی کی وجہ سے ارشد نے سعد بدایونی کو جدید تر نسل کے شاعر کے طور پر پیش کیا ہے۔ یا سعد بدایونی نئی نسل کے شاعر نہیں ہیں۔ شاید یہ بات وہ بھی چاہتے ہوں گے۔ مشرف عالم ذوقی نے اپنے خط میں نئی نسل کے بعد والی نسل کا بھی تعین کر دیا ہے۔ جبکہ ابھی نئی نسل کے بھی خد و خال نمایاں نہیں ہیں۔ بہرحال ارشد عبدالحمید، مشرف عالم ذوقی کے ساتھ ساتھ آپ بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کیوں کہ تنقیدی اجارہ داری کے خلاف، نئی راہیں ہموار کرنے میں آپ بھی نئی نسل کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔

★ شاہد عزیز ۔۔۔ ۹۱/ اصلاح ٹانی، اودے پور، ۳۱۳۰۰۱

شاعر کا تازہ شمارہ اپنے گزشتہ شماروں کی طرح ادبی آب و تاب لئے ہوئے ہے۔ تین خط ۔ باتیں ہزار کے تحت جو خطوط شائع کئے گئے ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ آپ نے غزل پر گزشتہ بحث کو عصر سے جوڑ کر دیا جبکہ ان فضول باتوں سے کوئی خاص کہیں وہ گیا ہے۔ اگر پال صاحب نے شعوری طور پر بھی اپنی نظمیں ترجمے کو دھیان میں رکھ کر کہیں ہیں ورنہ ان کا ترجمہ بھی انگریزی میں ہوا ہے۔ تو کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ نظمیں اس قابل نہیں ہو سکتیں کہ وہ مالی مدد اردو کی نمائندگی کر سکیں۔ روایات غزل کی تو وہ چاہے کہ کہیں غزل پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جدید تر نسل کیا ہے؟ اب تک کتنی نسلیں اردو ادب میں آ چکی ہیں؟ ادب میں تو دور چلا کرتے ہیں۔ نسلیں نہیں۔ ایک دور ترقی پسندوں کا تھا۔ ایک دور جدیدیوں کا آیا۔ مگر نسل کے نام سے ادب کی پہچان کیسے ہو سکتی ہے۔۔۔؟ ابتدا ہی غلط تو پھر انجام کیا ہوگا؟ باتیں تو بہت کہی جا سکتی ہیں مگر ابھی وقت نہیں آیا ان کا اظہار کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ ایک دور اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ ایک اور امید کسی ایک بڑے فنکار کے نام سے جانا نہیں جاتا۔ ایسا ابھی تک بھی نہیں ہوا۔ یہی خط مشرف عالم ذوقی کا ہے۔ انہوں نے بھی دس بیس برس سے لکھنے والوں سے ضرورت سے زیادہ امیدیں وابستہ کر لی ہیں۔ کسی بھی ادب میں دس بیس سال کوئی معنی نہیں رکھتے۔ تسلیم فسادات، مسجد کی توڑ پھوڑ کرانا ادب نہیں۔ شعر و ادب میں یہ چیز بہت گھٹن کراتی ہے۔ ادب تو زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کی چیز ہے۔ اسلئے مشرف عالم ذوقی کی پریشانی بھی بے معنی ہے۔ یہ آپ کا بڑا حق ہے کہ شاعر ہمیشہ ہی لکھے نئے کو نیا رنگ دینے میں کامیاب رہتا ہے۔

★ محمد حامد ۔۔۔ دربھنگہ (بہار)

شاعر کا تازہ شمارہ دیکھنے سے پڑھنے تک مسرت و بصیرت آمیز لگا۔ کنور سین کی کہانی مجھے بغیر چٹنی کی چاٹ کی طرح لگی۔ لگتا ہے کہ آپ نے کہانی محض ان کی خوشی کرنے کے لئے شائع کر دی ہے۔ دیگر تینوں کہانیاں رس دار اور ذہن کا بوجھ ہلکا کرنے والی ہیں۔ سید محمد عقیل کا مقالہ صرف انہیں لکھنے والوں پر اثر کر سکتا ہے۔ جو اپنے قاری کے ذہنی نفسی کے پودے کی ہریالی اور ترواٹ کے فلسفے سے بہ حسن و خوبی واقف ہیں۔ دوسرے گروپ کے کہانی پڑھنے والوں پر کوئی اثر نہیں پڑنے والا کیوں کہ وہ تو صرف اپنے خاندان والوں کے لئے لکھے گئے ہیں۔ دوسرے شمارے کی تینوں کہانیاں اپنے تخلیق کاروں کے فنی خلوص اور احساس و اظہار کے دور اندیش کش کی بھرپور وکالت کرتی ہیں۔ یہ کہانیاں تعریفی جملوں کی محتاج نہیں۔ مشرف عالم ذوقی نے آج کی کہانی کو بنیاد بنا کر بہت ساری باتیں کی ہیں۔ چند اہم سوال بھی بنائے ہیں۔ لیکن انہوں نے جس پیرائے میں آج کی اردو کہانی کے دفتروں کو شمار کیا ہے۔ وہ مناسب نہیں۔ گزشتہ دس برسوں میں اردو میں جو کہانیاں تخلیق ہوئی ہیں ان کے مزاج و معیار سے وہ قطعی مطمئن نہیں ہیں تو کیا وہ یہ پسند کریں گے کہ کہانی کے گرتے ہوئے معیار اور کھسکتے ہوئے سرے کو سنبھالنے کے لئے بہ حیثیت کہانی کار وہ کیا کر رہے ہیں؟

★ حمید اختر سردھنوی ۔۔۔ اسلام آباد، میرٹھ (یوپی)

شاعر کے تازہ شمارے میں ڈاکٹر سید محمد عقیل کا مضمون: کہانیاں کیوں لکھے ہو اور کس کیلئے؟ نام کی چیز ہے۔ عقیل صاحب کے ذہن کی فکری تلاش ہے۔ انہوں نے نئے پرانے لکھنے والوں کو ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ کہ وہ کیسے اپنے راستے متعین کریں اور نئے تقاضوں کو اپنائیں۔ دیگر مشمولات میں ۳ خط باتیں ہزار بھی فکر انگیز ہیں اور مختلف نئے ادبی مسائل کو ابھارتے ہیں۔ براج کومل کی نظم "روشنی روشنی" اور "گم شدہ کی تلاش" پسند آئیں۔ شعری حصہ غنیمت ہے۔ مگر مکتوبات کا کالم شاعر کی روح ہے۔ یہ ایک خالص ادبی کالم ہے۔ اس میں ادبی نوک جھونک بھی اور تیر و نشتر بھی۔ زبان و ادب پر علمی بحثیں بھی۔ فنی محاسن و معائب پر اظہار خیال بھی۔ ہم ایسے مبتدیوں کے لئے بہت اہم کالم ہے۔ اسے اور زیادہ متنوع بنانے اس کے صفحات میں اضافہ کیجئے۔ قارئین کو زیادہ سے زیادہ اظہار رائے کا موقع دیجئے۔

★ بسمل عارفی ۔۔۔ بشیر رحیم آباد، مستی کالار (بہار)

شعری حصہ کافی جاندار ہے۔ شاہد اختر کی کہانی "دہشت گرد" مشترکہ شمارے کی جان ہے۔ حالانکہ موضوع اچھوتا نہیں۔ اس سے قبل غضنفر کی ایک کہانی "اصلاح الوحشیان" کے عنوان سے جون ۹۳ کے آجکل میں چھپ چکی ہے۔ مگر جو بہاؤ اور شدت شاہد کے یہاں ہے وہ غضنفر کے یہاں نہیں۔ شاہد اچھی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ ابھی "تعلقات ادب" کی یاد تازہ ہی تھی کہ "دہشت گرد" پڑھنے کو ملی۔ گلزار کی کہانی سید عقیل کا مقالہ اور مشرف عالم ذوقی کا خط قیمتی مشمولات ہیں۔ انہیں سنجیدگی سے لینے کی ضرورت ہے۔ خلاف توقع حصہ منظومات نے مایوس کیا۔ فاروق شفق اور جاوید باصر کے شعروں میں کچھ تازگی ہے۔

★ خالد جمال ۔۔۔ ۱۷ بی ۔۔۔ سی / ۲۳۳ تل بھنڈے شوار، وارانسی ۔ ۱

"نئی نفسیات ۔۔۔ نئی شعری کائنات" واقعی ایک قابل ستائش پیش کش ہے۔ ایسی کوششیں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں اس بات کی تائید کرتا ہوں کہ جہاں ایک دوسرے ادبی رسائل اپنے حلقوں میں گم ہو کر نت نئی پہچانوں سے الجھیں پڑ رہے ہیں۔ وہیں "شاعر" نئی کہکشاں کو سجا رہا ہے۔ اس کی یہی تلاش و جستجو اس کی انفرادیت کا ثبوت ہے۔

★ اختر یوسف ۔۔۔ نیو ہمایوں ٹولی، ٹھوہا، عدالت گنج (بہار)

شمارہ نمبر ۳ میں گلزار کی کہانی بہت بیباک ہے۔ مسئلہ یہ مگر ضرور ہے کہ کہانی کا ادب کبھی ابھی بھی تابانی شک میں پڑا ہوا ہے اور گھسیٹا ہوا محسوس ہوتی ہے۔ لیکن کہانی آج کی ان سے آگے بڑھنے کا دعویٰ بھی کر رہی ہے۔ کیونکہ دنیا کی تیز رفتاری اور اپنے ملک کی سست رفتاری سے تو ایسا نہیں ہوا۔۔۔؟ یا ہمارے سیاست دانوں نے کوئی زبردست کھیل کھیلا۔۔۔؟ شمارہ نمبر ۴ میں تین خط باتیں ہزار کے تحت ستیہ پال آنند نے غزل کی بابت بہت قابل قدر باتیں کہی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ دونوں شمارے بہت عمدہ ہیں۔

فکر امروز



[شعراء] کی ایک عمر پیروی میں گزر جاتی ہے، اور وہ ایک مصنوعی جہانِ خیال میں عمر کا کافی حصہ گزارنے اور ایک طویل مشق کے بعد انھیں فرسودہ موضوعات کو کسی قدر پختگی کے ساتھ ظاہر کرنے لگتا ہے۔ یہ گویا اس کی معراج ہوتی ہے۔ اس معراج کے بعد جو اکثر تیس یا چالیس برس کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اختصارِ عمر اور قربتِ فنا کے تخیل سے اس کے قلب میں مذہبی یا صوفیانہ یا روحانی قسم کا ایک جذبہ فطرتاً پیدا ہوتا ہے۔ یہ جذبہ حقیقی غزل گوئی کا جذبہ ہوتا ہے جس کی تکمیل کے بعد اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ حالاں کہ یہ آخری منزل، شاعر کی پہلی منزل ہونی چاہیئے تھی۔ یعنی ایک شاعر کے لئے پہلی منزل، منزلِ احساس، دوسری منزل، منزلِ تاثر اور تیسری منزل، منزلِ تفکر ہوتی ہے۔ ان منازل سے گزر جانے کے بعد وہ جو کچھ کہتا ہے، وہ اتنا موثر اور دل دوز ہوتا ہے کہ کائنات اس کے استقبال کے لئے دل بدست نظر آتی ہے۔ غالب اس مقام کی تفسیر اس طرح کرتا ہے:

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

[۲۹ نومبر ۱۹۳۰ء امراؤتی (مہاراشٹر)]

سیماب اکبرآبادی

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

شاعر

اشاعت کا ۶۳واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد — ۶۳
شمارہ — ۹

فون: ۳۵۹۹۰۴

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۸ روپے

زرِ سالانہ ۶۰ روپے
لائبریریوں سے ۷۵ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے
معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۸

اردو تھیٹر ٹرسٹ بنگلور [illegible] لئے انعامات

اردو تھیٹر ٹرسٹ بنگلور نے اردو ڈرامے کے فروغ کے لئے دو انعامات قائم کئے ہیں۔ پہلا انعام جو مبلغ دس ہزار روپیوں پر مشتمل ہوگا بہترین طبع زاد ڈرامے کو دیا جائے گا۔ دوسرا انعام جو مبلغ پانچ ہزار روپیوں پر مشتمل ہوگا کسی بھی ناول یا افسانے سے ماخوذ ڈرامے کو دیا جائے گا۔ مقابلے میں شامل ہونے والے ڈرامے مندرجہ ذیل شرائط پر پورے اترنے چاہئیں۔

شرائط

① — منتخب ڈرامے کے جملہ حقوق تیس سال کے لئے اردو تھیٹر ٹرسٹ کے حق میں محفوظ رہیں گے۔

② — ڈرامہ چاہے طبع زاد ہو یا ماخوذ نوّے منٹ کا ہونا چاہئے۔

③ — ڈرامہ اردو میں کاغذ کے ایک طرف لکھا ہونا چاہئے۔

④ — ڈرامہ کسی بھی موضوع پر ہو سکتا ہے۔

⑤ — ہر ڈرامہ کے ساتھ تحریری یقین دہانی آنی چاہیئے کہ ڈرامہ طبع زاد ہے۔

⑥ — ماخوذ ڈرامے کے ساتھ اصل ناول نگار، افسانہ نگار کی تحریری اجازت بھیجنا ضروری ہے۔

⑦ — ڈراموں کے انتخاب کے سلسلے میں اردو تھیٹر ٹرسٹ کا فیصلہ قطعی ہوگا اور اس سلسلے میں کوئی خط و کتابت نہیں ہوگی۔

⑧ — ڈراموں کی وصول یابی کی آخری تاریخ ۱۵ فروری ۱۹۹۴ء ہوگی۔ اس تاریخ کے بعد وصول ہونے والے ڈرامے قبول نہیں کئے جائیں گے۔ غیر منتخبہ مسودات کی واپسی کے لئے پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضروری ہے

⑨ — ڈرامے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اسٹیج پر پیش ہونے کی تمام ضروریات کو پورا کرتا ہو۔

⑩ — کسی بھی طرح کے قانونی تنازعات کا فیصلہ بنگلور کی عدالت میں ہوگا۔

URDU THEATRE TRUST (Regd)

No. 47, III Main, I Cross, Domalur II Stage, Bangalore–560 071

محفل اپنی

مکتوبات، نقد و نظر، اور ——————

گزشتہ شماروں میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ "شاعر" کے قارئین و قدردانوں کے خطوں کی تعداد میں اضافہ تیز تر ہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ "شاعر" کسی خاص گروہ، ادارے، علاقے یا اشخاص سے بالاتر پوری اردو دنیا کے لئے ایک اہم ادبی جریدہ بن گیا ہے۔ ایک ایسا رسالہ جو سب کی یکساں ضرورت ہوتے ہوئے 'عادت' بن جائے۔ ایک غیر معمولی بات ہے۔ خطوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد میں بعض باتیں بہت ضروری ہو گئی ہیں۔ جن کا اظہار ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ شاعر کے بہت سے قارئین ان امور کا لحاظ نہیں کر رہے ہیں۔ جس سے دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ قارئین کے خطوط کسی بھی ادبی رسالے کے لئے ترتیب و تہذیب کا بنیادی ماخذ ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اپنی پسند نا پسند کا اظہار ضرور کریں۔ اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازیں۔ لیکن تحریر مختصر، جامع اور بامعنی ہو۔ ذاتیات سے ہٹ کر، عصری ادبی مسائل پر اشاروں میں اظہار خیال کیا جائے۔ علیحدہ سے، مکتوبات کے لئے خط لکھا جائے۔ شخصی یا دوسرے امور کا اندراج اس میں نہ ہو۔ صاف، خوش خط اور صفحے کے ایک طرف لکھا جائے۔ سرنامے پر نام اور مکمل پتہ درج کیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم ایسے خطوط بھی شائع کر رہے ہیں۔ جن میں کسی تعمیری تنقید کے بجائے محض شاعر اور مدیر شاعر کو ہدف بنایا جاتا ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مکتوب نگار کی تخلیقات یا تو شاعر میں شائع نہیں ہو رہی ہیں یا مدت مدید سے شائع نہیں ہوئیں۔ یا پھر اس کی کتاب پر تبصرہ نہیں آیا۔ یا پھر دیگر ادبی رسائل اور ان کے مدیران کے عمومی رویوں میں 'شاعر' کو بھی دیکھا جاتا ہے۔ مگر کبھی کبھی ایسے ہی خطوط شامل اشاعت کر کے فیصلہ ہم اپنے باشعور قارئین و قلمکاروں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اب رہا یہ کہ تخلیقات کی اشاعت، کتابوں پر تبصرے، یا تو کسی بڑے ادبی رسالے کے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔ یکمشت ہزاروں کتابوں پر تبصرے ہو جائیں اور ہزاروں قلمکاروں کی تخلیقات بھی شائع ہو جائیں۔ اگرچہ ہم سوانح تراشے اور کاشتے بچتے ہیں۔ ہم عصر اردو ادب نمبر سے بہت ساری شکایتیں ختم ہو جائیں گی اور علاوہ خاص نمبر کوشش کی جائے گی کہ صفحات بڑھائے جائیں، مکتوبات، نقد و نظر کے صفحات میں اضافہ ہو، شاعر کا مقبول کالم 'رفتار' (علمی، ادبی و تہذیبی خبریں) دوبارہ شروع کیا جائے۔ اس طرح کہ شاعر ماہی جریدہ بنتا جا رہا ہے۔ لہٰذا ہر شمارے کو زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کی سعی کی جا رہی ہے۔ شاعر کا قاری ہر تیسرے شمارے سے اردو دنیا کی علمی و ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں سے واقف ہو۔ یہی ہمارا بنیادی مقصد ہے۔ ہم اپنے قارئین کی مجموعی پسند اور اپنے وجدان کو رہنما بناتے ہیں۔ ہم عصر اردو ادب نمبر کے بعد صفحات میں اضافہ، اور بہت ساری صوری و معنوی تبدیلیاں ممکن ہیں۔ کئی دیگر پروجیکٹ جو زیر ترتیب ہیں۔ خصوصی شماروں اور خاص نمبروں کے روپ میں پیش کئے جائیں گے۔

شاعر کا سالانہ زر رفاقت ارسال کیجئے

کیا آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے۔ کیا آپ پر شاعر کے واجبات ہیں؟ کیا آپ شاعر کی توسیع اشاعت کا کام انجام دے رہے ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو ازراہ شاعر نوازی اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیجئے اور جلد دیجئے۔ ایک غیر تجارتی بڑے ادبی رسالے کے لئے آپ کی بھرپور توجہ اور عملی تعاون بے حد ضروری ہے۔ 'شاعر' اپنی عمر کے ۶۵ سال مکمل کر رہا ہے۔ ۷۵ سال بھی مکمل ہوں گے اور ایک پوری صدی بھی۔ کیا آپ 'شاعر' کی یک صدی کے خواب کو تعبیر نہیں دیں گے؟ ہمیں آپ کے سالانہ زر رفاقت کا انتظار رہے گا۔

فہرست

جلد ۶۴ [۱۹۹۳] شمارہ نمبر ۵

سرورق

خشک تار و خشک مغز و خشک پوست
از کجا می آمد ایں آواز دوست [رومی]

عمل

علام الہندی [بنارس]

(۲)

PHONE : 24-4051

CALCUTTA CENTRAL PRESS

CCP

(ESTD 1939)

PHOTO-OFFSET & ART PRINTERS

BANKERS
UNITED BANK OF INDIA LTD
CALCUTTA

BRABOURNE COURT
1, CHANDNI CHAWK STREET
CALCUTTA-13

اللہ

Ref. :-

۱۰ر نومبر ۵۶ء

برخوردار اعجاز۔ سلام اور دعائیں

ابھی حشمت صاحب تشریف لائے۔ انکا کارڈ دکھایا۔ آغا حشر مرحوم کے خاندان والوں سے کسی توقع ہی عبث ہے کہ ان لوگوں کی محبت آغا کی رہی ہو کہ آغا کے نام کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہاں اگر خرید و فروخت کی بات ہوتی تو آپکو بہت کچھ جواب ملتا۔ آغا صاحب کی تصاویر کا جو ذخیرہ تھا ہی نہیں ہے۔ مگر پھر بھی ایک ایسی بات ہوگئی کہ ایک تصویر ممکن ہو سکی جو میں آپکے پاس بھیج رہا ہوں۔ اسے واپس کر دیجئیگا۔

بات یہ ہوئی کہ کلکتہ میں کچھ لوگوں نے آغا محمود صاحب سے کچھ معاملہ کر کے مرحوم کے چند ڈرامے حاصل کئے جو ہندی میں چھپ رہے ہیں اب ہندی ایک تصویر کی بھی ضرورت لاحق ہوئی۔ آغا محمود کے پاس انکے ابا مرحوم حشر کے گروپ سے ایک تصویر کے نگیٹیو سے میں کا بیان تیار کرائیں۔ ایک ہندی والوں کو بھیجی۔ جو ابھی تک ان کے پاس ہیں بھی نہیں کیونکہ آغا محمود بیمار ہیں۔ دوسری کاپی آغا محمود نے اور میری میں نے اپنے پاس رکھ لی۔ جو حاضر ہے۔

آغا صاحب کے متعلق اگر کچھ دریافت کرنا ہو تو مجھ کو لکھئے کم از کم جواب تو آپکو ملیگا۔ الحمد للہ بفضلہ اب خیریت سے ہوں۔

والسلام و الدعا

دعا گو
محمود طرزی

محمود طرزی
بنام
اعجاز صدیقی

● محمود طرزی [سید محمود علی تلمیذ وحشت کلکتوی] ولادت: ۲۴؍ستمبر ۱۸۹۰ء ۔ باغپت ضلع میرٹھ یوپی ۔ وفات: ۹؍اپریل ۱۹۶۲ء ۔ کلکتہ

قیصر ضحی عالم

۲۱۳۔بی، روڈ نمبر-۳-اشوک نگر- رانچی ۸۳۴۰۰۲ (بہار)



کچھ محاوروں کے متعلق

میں نے اپنے ایک مضمون بعنوان "اردو میں انگریزی" [مطبوعہ شب خون، جنوری فروری ۱۹۹۳ء] میں کئی تراکیب اور لفظوں کا مطالعہ کیا ہے، جن کے متعلق میرا مفروضہ یا اندازہ یہ ہے کہ وہ انگریزی سے ترجمے کی شکل میں اردو میں استعمال ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر "میں ایک مشکل لڑکی ہوں" (بستی، انتظار حسین، صفحہ ۱۱۹)۔ ان میں کئی تو اب اردو میں بکثرت استعمال ہونے لگے ہیں۔ موجودہ مطالعے کو میرے خیال میں مذکورہ مضمون کی توسیع سمجھا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ حالانکہ یہاں میری خصوصی توجہ، محاوروں اور فقروں پر ہے۔ میرے پہلے مطالعے سے یہ بات کافی حد تک واضح ہو چکی ہے کہ اردو میں اپنی زبان کے ذخیرے میں اضافہ کرنے کا رجحان ہے اور اس سلسلے میں اکثر انگریزی کی مدد بھی لی جاتی ہے۔ اردو میں لکھنے والے کبھی کبھی انگریزی کے محاوروں اور فقروں کے تراجم پورے کے پورے استعمال کر جاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے ناول "چاندنی بیگم" (۱۹۹۰) میں مسز ملک ڈھونڈی نے اپنی اردو داں سسرال کی خاطر اتنی رعایت کی تھی کہ انگلش فقروں، ترکیبوں اور محاوروں کا لفظی ترجمہ کر کے مسلسل اردو بولتی تھیں۔ نتیجتاً جو زبان ظہور پذیر ہوتی ہے وہ بڑی نرالی اور دلچسپ ہے اور قرۃ العین کے مطابق "لاجواب ہے"۔ جب دل بہلانے کے لئے جانے کی کشتی لاکر ایک میز پر رکھ گئیں تو مالک بائی نے صفیہ کو مخاطب کیا۔ "فتی قلیپا تم عزت کرو"۔ صفیہ سلطانہ مسز ڈھونڈی کی اردو کی عادی تھیں لیکن اس وقت چکرا گئیں۔ ادھر۔ یہ DOING THE HONOURS کا لفظی ترجمہ تھا۔ مسز ڈھونڈی نے مزید کہا "میں امید کرتی ہوں ڈنکی بچے کہ تم پاکستان میں بہت اچھا کرتے ہوگے"۔ یعنی DOING WELL وہ پھر کہتی ہیں "بے چارے بوبی کی پہلی شادی چٹانوں پر گئی۔ دوسری بھی بہت کچھ آرزو کے لئے چھوڑتی ہے۔ بٹ تمہارا انکل وکی کی سکنڈ میریج بہت اچھی جا رہی ہے"۔ مسز ڈھونڈی کا یہ بیان بھی جاذب توجہ ہے "وہ تم کو کئی بار رنگ کیا۔ جاکر پہلے اپنا منہ کرو۔ تم زمین پر کسی چیز کی طرح نہیں لگ رہی ہو۔ منہاز سمجھ گئیں" DO YOUR FACE FIRST. YOU ARE ___ LOOKING LIKE NOTHING ON EARTH

مسز ڈھونڈی ایک جگہ کہتی ہے "اب تم کوئی بہار کے موسم کی مرغی کا بچہ نہیں ہو"۔ یعنی اسپرنگ چکن کا ترجمہ۔ انہوں نے ناول میں تین کنٹری ہاؤس کو ہمیشہ کپ ہاؤس ہی کہا۔ اسی ناول میں یہ استعمال بھی ہے "وہ ایک کالا گھوڑا ہے" (یعنی ڈارک ہارس!)۔ عبدالمغنی نے چاندنی بیگم پر تبصرہ (ایوان اردو، دہلی، اگست ۱۹۹۱ء صفحہ ۱۰) میں زبان منہ میں دبا کر بات کرنے کا فقرہ دیا ہے لیکن قوسین میں TONGUE-IN-CHEEK لکھنا ضروری سمجھا۔ فاؤلر نے اس محاورے کو CLICHE میں شمار کیا ہے

یہ سب حالانکہ بہت دلچسپ مثالیں ہیں لیکن شعوری طور پر استعمال ہوئی ہیں اور اکثر ان کے انگریزی مترادف بھی دے دیئے گئے ہیں اس مضمون میں ہماری اصل دلچسپی اس نوع کے جملوں فقروں میں ہے جو عموماً غیر شعوری طور پر تحریروں میں آتے ہیں اور جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ زبان میں نئے محاورے اور فقرے کس طرح در آتے ہیں اور تعلیم یافتہ طبقہ انہیں کس طرح قبول کر لیتا ہے۔ حالانکہ یہ بات بھی کسی قدر درست ہے کہ بہت سارے قاری ایسے جملوں، فقروں یا محاوروں کو آسانی سے سمجھ نہیں پاتے ہوں گے اگر ان کی گرفت دونوں زبانوں پر یکساں مضبوط نہیں ہوتی۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ انگریزی میں ان میں سے کئی کثرتِ استعمال کی وجہ سے محض فرسودہ فقرے CLICHE بن کر رہ گئے ہیں۔ جو بہت مستعمل ہو جاتے ہیں وہ بعد میں اکثر اس زبان کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جب شاعر کہتا ہے ؎
نظر آتا ہے مجھے ایسیں تماشائے جہاں- اس کو لے تنگ نظر جانے کی چالی نہ کچھ

تو قاری کے ذہن میں یہ بات آجاتی ہے کہ شاعر کی سوچ کا پس منظر دراصل انگریزی محاورہ STORM IN THE TEA CUP رہا ہوگا۔

کشتیاں جلا دینا، بھی ایسا ہی ایک فقرہ ہے جو دراصل مشرق سے ہی مغرب گیا تھا۔ لیکن اب یہ پھر اُردو میں اکثر استعمال ہونے لگا ہے اور یہ بات شاید کسی قدر صحیح ہے کہ یہ محاورہ اُردو میں اب کی بار شاید انگریزی کے ہی ذریعہ آیا ہے۔ تقریباً نویں صدی عیسوی میں جب طارق نے اسپین میں داخل ہونے کے بعد اپنی کشتیاں جلا ڈالی تھیں یہ محاورہ دراصل اسی واقعہ کے ساتھ منسلک ہے۔ اقبال اور شبلی وغیرہ نے بھی اس محاورے کو استعمال کیا ہے۔ ملوبر شلو کرنے اپنے ناول SPY IN AMBER میں لکھا ہے۔

YOU BURNT YOUR BRIDGES THE MOMENT YOU BEGAN BEHAVING LIKE A CHEAP LITTLE WHORE.

انگریزی میں یہی مفہوم کبھی کبھی پُل جلانے سے بھی نکالا جاتا ہے جیسا کہ سانتالا مارلا نے اپنے ناول THE ADVENTURESS میں کیا ہے۔ جب کے مارشس سے کہتی ہے I REALLY DON'T KNOW WHAT TO DO NEXT

مارشس کا استفہامیہ جواب ہوتا ہے BURNT YOUR BRIDGES

حالانکہ اُردو کے لئے کشتیاں جلا دینے کا استعمال نیا نہیں ہے لیکن یہاں دنوں کچھ زیادہ ہی دیکھنے میں آنے لگا ہے۔ مثلاً:

— چند سال بعد (احسن فاروقی) واپس آئے تو پاکستان سے بہت خفا تھے مگر یہاں اپنی کشتیاں جلا چکے تھے اس لئے پھر انہیں واپس جانا پڑا۔ (خواب باقی ہیں" آل احمد سرور، صفحہ ۱۴۶)

یعنی یہاں احسن فاروقی کے لئے ساری راہیں مسدود ہو چکی تھیں، سارے ذرائع ختم ہو چکے تھے۔ اس محاورے کے استعمال کی قرۃ العین حیدر کی نگارشات سے چند مثالیں یہ ہیں:

— تب واحد اُسے بڑے پیار سے سمجھاتا۔ تم اپنی کشتیاں جلا چکی ہو اب قاسم سے لڑائی جھگڑے شروع نہ کر دینا۔ [چائے کے باغ ص۳۵]

— اُسے واحد کی بات یاد آئی تھی کہ وہ اپنی کشتیاں جلا چکی ہے [ایضاً]

— تم تو جیسا تم نے بتایا ہے پورے میں اپنی کشتیاں جلا آئیں [گردش رنگ چمن ص۳۴۷]

عبدالصمد نے "دو گز زمین" میں اس فقرے کا استعمال کئی بار کیا ہے:

— انہوں نے اصغر حسین کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ تو اپنی کشتیاں جلا چکے تھے۔ بھاگنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ (صفحہ ۴۵)

— بہت سے لوگ تو زیادہ پیسوں کے وعدے پر آئے لیکن تو قع سے کم پیسے انہیں مل رہے ہیں، لیکن وہ اپنی کشتیاں جلا چکے ہیں (صفحہ ۲۸۵)

تاریخی پس منظر سے لاعلمی کی صورت میں یہ محاورہ کسی قدر وضاحت طلب سمجھا جاتا ہوگا اور کچھ قارئین کے لئے مشکلات پیدا کرتا ہوگا یہی بات مندرجہ ذیل استعمال کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔:

— نئی پیڑھی کی چھوکری بھاؤ تڑے کو بھاؤ تڑا پکارنے والی [چاندنی بیگم ص۳۱۵]

آل احمد سرور نے خواب باقی ہیں (صفحہ ۲۵۲) میں لکھا ہے۔

بیرے نے پوچھا کہ آپ فرنچ کافی پسند کریں گے یا ترکی کافی۔ میں نے سوچا اردو نائیں ہو تو اردو مائی سی کر دو، چنانچہ ترکش کافی کا آرڈر دے دیا۔

یہ انگریزی فقرے سے براہ راست ترجمہ کی ایک صاف مثال ہے حالانکہ اردو میں اس کا مرادف "جیسا دیش ویسا بھیس" موجود ہے جنگل کبوتر (صفحہ ۹۴) میں عصمت چغتائی کی یہ ترکیب بھی اردو کے لئے کوئی نئی نہیں "ابھی لوہا گرم ہے"۔

قرۃ العین حیدر کا یہ جملہ بھی سیدھا ترجمہ ہی ہے:

— وہ دونوں فلمی دنیا میں اس طرح داخل ہو گئی ہیں جس طرح بطخ پانی میں تیرنے لگتی ہے۔ [چائے کے باغ ص۳۱۵]

عبدالصمد نے دو گز زمین میں جب لکھا:

محمد یونس خط پاکر خوش تو بہت ہوئے کہ چلو برف تو پگھلی لیکن تو ظاہر ہے انگریزی محاورہ اُن کے ذہن میں فرو در رہا ہوگا۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل استعمال بھی اسی نوعیت کا ہے لیکن اب کافی عام فہم ہے:

دراصل حامد کو یہ تعجب تھا کہ اختر حسین نے اتنی آسانی کے ساتھ اسے سبز جھنڈی کیسے دکھا دی تھی [دو گز زمین ص۳۱۳] میں نے اپنے مضمون (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) میں "آج کل" سے یہ حوالہ دیا ہے۔

— کون سی آئیٹم کو لال قندیل دکھائی جائے۔

اس تناظر میں سبز جھنڈی کا استعمال معنی خیز اور لائق توجہ ہے

عبدالصمد کے ناول دو گز زمین میں یہ استعمال بھی خالص BORROWING کی ایک اچھی مثال ہے:

— باہر کی فضا اور رنگ میں رتی برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ پہلا جیسے ہی بہہ رہی تھی اور ندیوں میں حسب معمول بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔ [۲۴۰]

یہ محاورہ ابھی سبز جھنڈی کی طرح عام نہیں ہوا اس لئے ترسیل کے معاملے میں کچھ سوالیہ نشان ضرور بنتا ہوگا۔ عبدالصمد کا یہ جملہ بھی محاورہ زدہ ہے لیکن نسبتاً صاف ہے۔

— افسوس اس کا ہوا کہ اس تنظیم کو خاک چاٹنی پڑی جو کبھی ہندوستانی عوام کے دل کی دھڑکن تھی ص ۱۴۷

قرۃ العین نے یہاں بھی انگریزی محاورہ گم دیپش جوں کا توں رکھ دیا ہے:

— بیگم صاحبہ آج ظفر پور تشریف لے جا رہی ہیں، کسی غریب لڑکی کی تلاش میں۔

یہاں کچھ کم ہے۔

فرماتی ہیں چیرٹی گھر سے شروع کرنی چاہئے۔ [چاندنی بیگم]

حسین الحق نے اپنے ناول "بولو مت چپ رہو" میں بے ریڑھ کی قوم کی اصطلاح کا استعمال کیا ہے لیکن اس سے انگریزی فقرہ SPINELESS والی بات پیدا نہیں ہوتی۔

شرف عالم ذوقی نے بھی ایک انگریزی محاورے کا سیدھا سیدھا ترجمہ کر دیا ہے۔

— "کچھ دیر کے لئے بڑی بی کا سر چکرا گیا۔ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے"۔

[زنا نخانہ، زبان و ادب، جلد ۱۸۔ شمارہ ۱-۲]

مشتاق احمد یوسفی کے یہاں انگریزی کے ایک محاورے کا استعمال بھی دلچسپ ہے۔

مرزا عبدالودود بیگ کو غبارے پنکچر کرنے کی بڑی بری عادت ہے [آب گم ص۹۹]

نظام صدیقی نے اپنے مضمون "نئے عہد کی تخلیقیت" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

[باقی صفحہ ۲۷ پر دیکھیے]

بدن کی پانچ پینٹنگس



محمد صلاح الدین پرویز

۱

ابابیلوں کا نغمہ

زلف کی شب میں
جبیں کی ناؤ میں
چشمِ سیہ کے گاؤں میں
ہونٹوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں
سینے کے مخفی طاق میں
کیا بجھ رہا ہے
اک چراغ لاسہ سا بجھ رہا ہے
رونمائی کے لئے جاتا ہوں:
اس کی زلفِ شب، اس کی جبیں
چشمِ سیہ، پھر ہونٹ،
پھر سینہ...
میں اس کو چومتا ہوں
وہ چراغِ لاسہ جو بجھ رہا تھا،
جلنے لگتا ہے۔
ابابیلیں جو پردے میں چھپی تھیں
پھر پھڑاتی ہیں
قفس در کھول کے سینے کا،
رنجیدہ ابابیلیں، میں اپنے دونوں ہاتھوں میں سمو کے
نیل آنکھوں کے گگن میں چھوڑ دیتا ہوں
ابابیلیں بدن کے راز پہ حمد و ثنا ہیں
ابابیلیں ہوا کے ساز پہ نغمہ سرا ہیں:
جبرئیل اے جبرئیل! جبرئیل اے جبرئیل!! ■

۲

پنچھیوں کا گیت

دُکھے دُکھے جب کیس ہوائیں اُڑتے ہیں
جنگل میں بارش ہوتی ہے
دل میں دھوپ چمکتی ہے
ہونٹوں کے اسپرش کی سُرخی
جب چہرے سے سجتی ہے
برف پہاڑوں پہ گرتی ہے
دل میں آگ دہکتی ہے
ناک کو جب سیکی کا ٹکڑا
دُکھ دینے لگتا ہے
دھرتی ساگر بن جاتی ہے
دل میں جگنو جلتے ہیں
ماتھے کو جب اس کی بندیا
تپ دینے لگتی ہے
شام اترتی ہے شہروں میں
دل میں سورج جلتے ہیں
موئی موٹی آنکھیں اس کی
جب ہنسنے لگتی ہیں
ندی رات میں گھل جاتی ہے
دل میں چاند نکلتے ہیں...
ململ کی جالی میں بندی
گیانی دھیانی، دودھ سے اجلے اجلے پنچھی
چاند رات میں،
اس کے ساتھ میں،
سہمے سہمے بات بات میں
میرے دل کے دوار تلک آتے ہیں
موہن من موہن، موہن
پنجرے کا دروازہ توڑو
موہن، منموہن، موہن
مندر کا دروازہ کھولو
موہن، منموہن، موہن! ■

۳

پرندوں کی دعا

وہ دکھانا نہیں چاہتی ہے، ہوا کھول دیتی ہے کاکل کے در
وہ سجانا نہیں چاہتی ہے، ہوا چھیڑ دیتی ہے ماتھے پہ لٹ
وہ لبھانا نہیں چاہتی ہے، ہوا چھین لیتی ہے آنکھوں سے سُر
وہ بہکنا نہیں چاہتی ہے، ہوا چوم لیتی ہے ہونٹوں کے گل
اے ہوا، اے ہوا، اے معطر ہوا
مت اڑا، موسمے کی ردا
اس ردا کے حجابوں میں زخمی پرندوں کے گھر ہیں
ہوسے جو پُر ہیں بہت ایسے پَر ہیں
نہیں میں بدن نہیں چاہتی تھی
دلِ نار کے عہد نامے سے حرفِ مقدس، مگر وہ مصر تھا
او میرے پرندے، میرے قلب کے گنبدوں کے مکیں
مجھ سے ناراض ہو گئے، ہو گئے اپنی چونچوں سے زخمی
نہیں، میں نہیں، میں نہیں ہوں
نہیں میں پرندوں کی دشمن نہیں ہوں
خداوند
تو ہو نہی تا ستم رہے
بھیج ایسا مسیحا، پرندوں کے زخموں کو جو
اپنے اشکوں کا، ہونٹوں کا، لمسوں کا مرہم لگا کے،
عبا میں چھپا لے۔
خداوند...! ■

۴

کبوتروں کا رقص

کالے پھولوں سے لپٹی ہوئی بیل ہے زلف اس کی،
الجھتی تو بہت ہے
کالے پھولوں سے لپٹی ہوئی آنکھ ہے جھیل اس کی،
ڈبوتی بہت ہے
کالے پھولوں سے لپٹے ہوئے عطر ہیں ہونٹ اس کے،
دہکتے بہت ہیں
کالے پھولوں سے لپٹی ہوئی اس کی گردن صراحی ہے نشّہ دہ،
کساتی بہت ہے
کالے پھولوں سے لپٹی ہوئی اس کی قامت ہے ناگن زدہ،
سرسراتی بہت ہے
کالے پھولوں سے لپٹے ہوئے اس کے مخمل کبوتر
سلامت رہیں! وہ نہیں چاہتی اور میں بھی نہیں چاہتا...
دونوں لمسوں کے سچے تصادم سے پھر...
کالے پھولوں کے اس باغ کی ہر کلی، پنکھڑی، اور گل
اجلا اجلا منور ہوا
اور میں! میں جو اجلا تھا، بے عطر تھا
کالا کالا معطر ہوا...
شب کے تاروں پہ مخمل سے کالے کبوتر مرقص ہوئے:
اے خدا
نغمۂ عطر تو ایک ہے،
پھول ابیض ہوں، اسود ہوں۔
میرے خدا
نغمۂ امن تو ایک ہے،
پر کبوتر کے گورے ہوں کالے ہوں
میرے خدا...! ■

۵

بلبلوں کا زمزمہ

کلیسا میں نن بھی ہے، راہب بھی ہے، پادری
اور وہ بھی جو کنفیس کرتی ہے:
"قادر"
غلط ہو گیا سب غلط ہو گیا
میں گئی تھی پتہ پوچھنے اپنے دل کا
کئی دن سے جو کھو گیا ہے...
اکیلا تھا وہ اور میں بھی اکیلی تھی
دونوں کے دل بھر گئے تھے
اچانک وہ آگے بڑھا...
زلف بھی اس نے چومی تھی، ماتھا بھی
آنکھیں بھی، گردن بھی اور ہونٹ بھی...
شام، جب رات میں تھوڑی تھوڑی سی داخل ہوئی
میں نے دیکھا...
کلیسا میں بیٹھی ہوئی بلبلیں رونے والی ہیں
آواز دیتی رہیں "آؤ"
مجھے گھونسلوں کی پناہوں سے کوئی لیے جا رہا ہے
یکا یک میں سنبھلی، سنبھلتی ہوئی، بھاگی بھاگی
بلبلوں کو بچانے کلیسا میں، میں آگئی ہوں
قادر،
غلط ہو گیا، سب غلط ہو گیا ہے..."
تبھی بلبلیں زمزمہ چھیڑتی ہیں:
پیاری نہ رو، اے دلاری نہ رو، غم کی ماری نہ رو
بے قراری نہ رو، شاہزادی نہ رو..
تو اگر روئے گی، آسمان کے نشیمن سے مریم نکل آئیں گی
وہ بھی روئے گی، ہم بھی بہت روئیں گے
یہ کلیسا سمندر میں بہہ جائے گا،
آنسوؤں کے سمندر میں بہہ جائے گا۔ ■



مشتاق مومن

۲۹۸/۱۹ موج مینشن شاستری نگر کرلا ممبئی ۴۰۰۰۷۰

جنازہ

بمبئی میں دن رات ڈامر کی سڑکوں پر گاڑیاں دوڑتی بھاگتی نظر آتی ہیں۔ جانی ان جانی منزلوں کی طرف، رواں دواں، گاڑیاں چلتی رہتی ہیں چھوٹی اور بڑی کاریں، لاریاں، اسٹیشن ویگن اور ٹیکسی وہیلر، میں ان گاڑیوں کو رواں دواں دیکھتا ہوں تو بڑا عجیب سا سوال ذہن کے تہہ خانے میں پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ آنکھوں کے فریم میں جڑا ہوا یہ منظر پل بھر کو ساکت ہو جائے تمام چیزیں فریز ہو جائیں پل بھر کو کوچہ و بازار کی نبض رک جائے اور ہم ان لوگوں سے جو گاڑیوں میں بیٹھے ہیں جن کی نگاہیں ہیڈ لائٹس پر اور ہاتھ اسٹیرنگ پر، یہ معلوم کریں کہ وہ کہاں سے آرہے ہیں اور کہاں جارہے ہیں دائیں سے بائیں، مشرق سے مغرب کی طرف یا مغرب سے مشرق کی طرف تو جتنے سوال ہوں گے اتنے ہی جواب اور ہم اس نتیجے پر پہونچیں گے کسی کو پتہ نہیں وہ کہاں جارہا ہے اور ممکن ہے کہ وہ ہم سے ہی پوچھ بیٹھیں کہ تم کہاں جارہے ہو؟ تو ہم انہیں کیا جواب دیں گے؟

ہستی کا یہ سفر نہ جانے کب سے جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے۔ اور اس پر ستم یہ دھوکا صحیح سمت جانے کا ہے۔ حال سے ماضی کی طرف یا ماضی سے حال کی طرف نئے بھارت سے پرانے ہندوستان کی طرف عجیب گھال میل ہے۔

ایسا ہی ایک خیال میرے ذہن میں اس وقت پیدا ہوا جب میں نے منترالیہ کے انیسویں منزلے سے نیچے رینگتی ہوئی کاروں کو دیکھا اور میرے خیال کو تقویت اس وقت ملی جب میں خود ایک کار میں بیٹھا ہوا تھا نہیں کار میں نہیں بلکہ کستوربا ہاسپٹل کی ایک ایمبولینس میں کستوربا ہاسپٹل جو آرتھر روڈ ہسپتال کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ تو ہسپتال کے عقبی دروازے سے جو اچانک ایمبولینس سڑک پر آگئی اور ہم سب جو اس میں بیٹھے ہوئے تھے سڑک پر کاروں کے کارواں میں مل گئے تو پیچھے سے میں نے سوچنا شروع کیا کہ کہانی کہاں سے شروع ہوئی تھی۔؟ بھیونڈی کا پرائیویٹ ہسپتال، ملنگے ہسپتال

وہاں سے گھر، گھر سے دوبارہ پرائیویٹ ہاسپٹل اور پھر وہاں سے بمبئی کے سرکاری ہاسپٹل، موت اور زندگی آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ کستوربا ہاسپٹل میں پہلے وارڈ نمبر ۱۹ اور پھر وارڈ نمبر انیس سے وارڈ نمبر بارہ میں منتقلی۔ تقریباً دس بجے ہیں ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے اسٹریچر پر تم پڑے ہو اور وارڈ بوائے تمہیں لے جا رہے ہیں۔ تمہارے ہاتھوں میں گلوکوز کی نلی لگی ہوئی ہے اور میں گلوکوز کی بوتل تھامے تمہارے دونوں وارڈ بوائے کے قدم سے قدم ملا کر چل رہا ہوں۔ وارڈ نمبر ۱۲ کے سامنے ہی وارڈ نمبر ۱۹ کے وارڈ بوائے اور وارڈ نمبر ۱۲ کے وارڈ بوائے آپس میں بحث کر رہے ہیں۔ مریض کو اسٹریچر پر سے بیڈ پر اتارنے کی ذمہ داری کس کی ہے۔ یہ کس کا کام ہے وارڈ نمبر ۱۹ کے وارڈ بوائے کا یا ۱۲ نمبر کے وارڈ کے وارڈ بوائے کا۔ وقت جیسے رک سا گیا ہے گلوکوز قطرہ قطرہ تمہاری رگوں میں اترتا جا رہا ہے، قطرہ قطرہ زندگی لمحہ لمحہ قریب آتی ہوئی موت، ہیڈ نرس اپنے کمرے سے نکلتی ہے اسے ڈانٹتی ہے اور پھر وارڈ نمبر ۱۹ کے وارڈ بوائے اپنے وارڈ کا سامان لے کر چلے جاتے ہیں۔ تمہیں بیڈ پر لٹا دیا گیا ہے۔ فوراً ہی دو ڈاکٹر دستانے پہنے تمہاری طرف بڑھتے ہیں تمہارے بیڈ کے اردگرد پردہ لگا دیا جاتا ہے ڈاکٹر تمہاری نبض دیکھ رہے ہیں انہیں شاید تمہارا خون چاہیے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تمہاری ناف کے دائیں بائیں سے خون نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ خون سے بھرا ہوا ٹیوب تھامے وہ دونوں آگے بڑھ جاتے ہیں فوراً ہی ایک وارڈ بوائے آگے بڑھتا ہے اور تمہارے دونوں ہاتھ کپڑے سے باندھ دیتا ہے تاکہ تم ناک میں لگی ہوئی نلی نہ نکال لو جس کا دوسرا سرا تمہارے معدے میں ہے۔

یعنی اگر اس طرح ایک ایمبولینس اور ایمبولینس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی بھی ایک کہانی ہو سکتی ہے تو ہر گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی بھی ایک کہانی ہو سکتی ہے یعنی اس حساب سے ہمارے اطراف کہانیاں ہی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔

کہانیاں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی، ایک دوسرے کو اوورٹیک کرتی ہوئی کہانیاں چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں۔ آج میں اسی ایمبولنس میں بیٹھے ہوئے افراد کی کہانی آپ کو سنا رہا ہوں ـــــ ۔ وہ ایمبولنس جو ابھی ابھی کستوربا ہاسپٹل سے نکلی ہے۔ اور موٹر گاڑیوں کے ہجوم میں شامل ہو گئی ہے۔ مگر اس میں بیٹھے ہوئے لوگ اس ہجوم ہنگامہ میں شامل نہیں ہوتے ہیں۔ وہی کہانی آج میں لکھتا ہوں، ایمبولنس کولتار کی کالی سڑک پر دوڑ رہی ہے باہر نظر آتے ہوئے منظر بھی پیچھے کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ اور میں ایمبولنس میں بیٹھا ہوں اور میرے خیالات احساسات اور جذبات بھی برق رفتاری سے بھاگ رہے ہیں حال سے ماضی کی طرف، ڈرائیور جس کے ہاتھ اسٹیرنگ پر ہیں اور آنکھیں ہیڈ لائٹس، اس کے بازو میں جو شخص بیٹھا ہوا ہے وہ مجھ سے جڑا ہوا ہے۔ اس کے بعد ایمبولنس کے دروازے کے پاس جو آدمی بیٹھا ہوا ہے اور شکل و صورت سے شاعر معلوم ہوتا ہے اس کا تعلق بھی میرے خاندان سے ہے۔ اس کے بعد میرا چھوٹا بھائی بیٹھا ہوا ہے جس کی آنکھوں میں تحیر اور غم ہے۔ جو زبانِ خاموشی سے کہہ رہا ہے "یہ سب کیسے ہو گیا؟" اس کے بعد میں ہوں اور اس کے بعد میری نصف بہتر بیٹھی ہوئی ہے۔ ساڑی کا کونہ منہ میں دبائے وہ آہستہ آہستہ رو رہی ہے۔ اور ہم چاروں کے بالکل سامنے سفید کپڑوں سے لپٹی ہوئی ایک میت ہے جو ابھی ابھی ہم نے ہسپتال کے مردہ خانے سے حاصل کی ہے اور جو اب بھی ٹھنڈی ہے برف جیسی، باہر کی گرمی اس پر ابھی تک اثر انداز نہیں ہوئی ہے۔ یہ جسم کوئی اور نہیں میرا ہی جسم ہے۔ اس کا کچھ بھی نام ہو سکتا ہے جیسے بابو سیٹھ یا صرف بڑا۔ وہ شخص جو زندگی میں کبھی بیمار نہیں ہوا کبھی اس نے ہاسپٹل کا منہ نہیں دیکھا مگر اس کا انتقال ہسپتال میں ہی ہوا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ ایک لمبے سفر پر روانہ ہو جائیگا۔ شاید خود بھی اسے احساس نہیں تھا مگر موت برحق ہے۔ ہم میں سے کون کب اور کہاں موت سے گلے ملے کوئی نہیں کہہ سکتا۔ جب گاڑی کو اچانک بریک لگتا ہے یا گاڑی کسی گڑھے میں سے گزرتی ہے تو ہم سبھوں کے ہاتھ غیر ارادی طور پر میت کو تھامنے کے لئے بڑھتے ہیں۔ اور مجھے احساس ہوتا ہے لاش کا بدن جو پہلے سرد تھا لمحہ بلمحہ باہر کے ٹمپریچر سے متاثر ہوتا جا رہا ہے۔ ایمبولنس اب سائن پر رک جاتی ہے، میری بیوی اتر جاتی ہے اسے اپنے بچوں کو بھیونڈی لانا ہے تاکہ وہ اپنے بڑے ابّا کا آخری دیدار کر سکیں۔ پھر ایمبولنس برق رفتاری سے بھاگتی ہے۔ اور میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہوئے دنوں کی یاد کی فلم شروع ہو جاتی ہے۔

یادیں، بہت سی گزرے ہوئے دنوں کی جو اب کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ بھائی میرے واقعی اگر تم نہ ہوتے تو میں پڑھ نہیں سکتا تھا۔ میرے ہمجولی پتنگ اڑا رہے ہیں اور تم ہو کہ مجھے ریاضی پڑھا رہے ہو۔ بعد نماز جمعہ تمام دوست مینا اور بلبل کے گھونسلے کی تلاش میں جوتے پل تک جانے والے ہیں۔ اور تم سخت لہجے میں مجھ سے کہتے ہو۔ تم کھانے کے بعد سیدھے گھر آجانا اور انگریزی کی گردان یاد کرنا۔ میں پڑھ رہا ہوتا مگر میرا سارا دھیان باہر ہوتا۔ میں دل ہی دل میں دعا کرتا کہ جلد سے تمہارے کام پر جانے کا وقت ہو جائے، پھر تم صاف قمیص اور لنگی پہن کر توفیق ماما کے کارخانے چلے جاتے لوم چلانے۔ جیسے ہی تم موڑ پر مڑتے میں ایک قلقاری مار کر اور پتنگ لوٹنے کا لگا تھام کر باہر نکل جاتا۔ مختصر اگر تم نہ ہوتے اور اگر مومن ویلفیئر سوسائٹی کی مالی امداد نہ ہوتی تو میں کبھی تعلیم حاصل نہ کرتا۔ اور اپنے اسکول کے دوستوں کی طرح جو مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ کسی سائزنگ میں سائزر ہوتا یا کہیں بیتا گرہ کرتا ہوتا یا پھر کہیں کسی مل میں لوم چلا رہا ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا میں میٹرک کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے بمبئی آ گیا اور سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا تم چاہتے تھے۔ میں نے تعلیم مکمل کی اور وہیں بمبئی میں ملازم ہو گیا اور ایک طرح سے میں نے بمبئی بسا لیا۔ تم مہینے دو مہینے مجھ سے ملنے آتے اور سب سے پہلا جملہ جو تمہاری زبان سے ادا ہوتا وہ یہ کہ "کیوں کیسا کام چل رہا ہے۔؟" میں کہتا "بہت اچھا چل رہا ہے۔" اور تم تھیلی ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہتے "میرا بھی کاروبار اچھا چل رہا ہے۔ منافع کے پیسے سیٹھ کے پاس جمع ہو رہے ہیں۔" اور تھیلی میں کی چیزیں نکالنا شروع کر دیتے۔ باریک پرانے بھیونڈی کے چاول، کھجور کی مچھلی، گلیان والے کی دکان سے سیکریا کا مصالحہ، بھیونڈی کی میٹھی سنگھاڑے کی پھلی اور اس کے بعد اپنے ہی گھر کے لوم پر چلا ہوا کپڑا۔ "دیکھو آج کل یہ وان چلا رہا ہوں" تم کپڑے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی اپنائیت سے مجھ سے کہتے اور پھر لنگی پہن کر ذرا فرصت سے منہ دھونے کے بعد پلنگ پر بیٹھ کر اور آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوتے۔

"تو رے یہاں آج کا پکّا ہے۔؟"

اچھی باتیں اور اچھا کھانا تمہارا شوق تھا۔ موقعہ محل کی مناسبت سے تمہیں سینکڑوں شعر یاد تھے۔ وقت دبے پاؤں گزرتا رہا۔ زندگی کی گاڑی برق رفتاری سے بھاگتی رہی۔ میں جب بھی بھیونڈی آتا تم میری خاطر مدارات میں کوئی کسر باقی نہ اٹھا رکھتے۔ تمہیں معلوم تھا کہ مجھے بھیونڈی کا مخصوص ملیدا پاؤں اور محی الدین ہوٹل والے کا قیمہ

بہت پسند ہے۔ تمہارے ایک ہاتھ میں ناشتے کا سامان ہوتا اور دوسرے ہاتھ میں تھیلی اور دیہات کی دیسی مرغی تھامے جب تم آتے تو راستے میں جو بھی ملتا تم پانچ دس منٹ اس سے ضرور باتیں کرتے اور آخر میں کوئی پوچھے یا نہ پوچھے تم ضرور کہتے کہ "ایسا ہے وہ مشتاق بال بچوں کے ساتھ آیا ہوا ہے نا۔" حالانکہ میری اور تمہاری دنیا الگ تھی۔ زندگی الگ تھی، مسائل الگ تھے مگر بعض اوقات، جمعہ کے دن، عید، بقرعید کے دن ایسا لگتا جیسے مرا دل وہیں کہیں بھیونڈی میں اٹکا ہوا ہے۔ ہندوستانی مسجد سے نکلتے ہوئے نمازی، قبرستان میں فاتحہ پڑھتے لوگ، دیوان شاہ کی درگاہ، میٹھی ندی کا ناکہ، اپنی ہوٹل کے دوست، بھیونڈی کے محلے، بنگال پورہ، کوٹر گیٹ، تھانہ روڈ، درگاہ روڈ۔ کیا بتاؤں کیا کیا، کیسے کیسے یاد آتا تھا لو دیکھو۔ اب ہم لوگ دھامنکر ناکہ کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ بہت ٹریفک ہے اس لئے ایمبولنس کی رفتار دھیمی ہو گئی ہے۔ یہ ہمارا تمہارا اسکول: رحیم علی اسکول ہے۔ اس کے سامنے انا کا ایک ہوٹل تھا۔ اس کی جگہ ایک بیئر بار نے لی ہے۔ تم اکثر کہا کرتے "زمانہ بہت بدل گیا ہے پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ محلے میں کون کون شراب پیتا ہے۔ اب یہ لیل و نہار ہیں کہ سوچنا پڑتا ہے کہ محلے میں کون کون شراب نہیں پیتا۔"

سامنے دیکھو نشاط تھا، وہ کی یاد میں بنائی گئی نئی لائبریری ہے آگے کے موڑ پر ایمبولنس راہم محلہ کی طرف مڑ رہی ہے، اطراف میں دائیں بائیں لوگ بیٹھے ہیں۔ ایمبولنس کا دروازہ کھول کر میں نیچے اتر جاتا ہوں۔ پہلی نظر میونسپل کونسلر ایشار ماسٹر پر پڑتی ہے جس کے الکشن میں تم نے تقریریں کی تھیں۔ اس کے بعد نشاط گردیسے کے بچے کچھے میراث بیٹھے ہیں اداس اور مغموم ان کے ساتھی ایک ایک کرکے اللہ کو پیارے ہوتے جا رہے ہیں۔ رفت و بود کا ایک سلسلہ۔ موت ایک ایسا بھنور ہے جس میں ہر چیز ڈوب جاتی ہے۔

تمہارے دوسرے دوست بھی نظر آتے ہیں، اسلام حاجی اور اکبر جوہری، عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں آتی ہیں۔ اوٹلے پر ہی جہاں تم سوتے تھے تمہاری ہی کھاٹ پر تمہیں لٹا دیا گیا ہے۔ تمہارا بے جان چہرہ آخری دیدار کے لئے کھول دیا گیا ہے۔ مجھے معلوم ہے چونکہ میں اپنی اماں اور ابا کی موت دیکھ چکا ہوں کہ بات صرف چند گھنٹوں کی ہے، تمہارا جسد خاکی بھی کچھ دیر میں منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا جائیگا۔ یہ لو نہلا دھلا کر تمہیں آخری دیدار کے لئے رکھ دیا گیا ہے۔ سب گھر والے خاموش کھڑے ہیں اور آخری دیدار کرنے والوں کا دیدار کر رہے ہیں۔ رات کے دس بجے کا وقت ہو گیا ہے۔ میت اٹھانے کا یہی وقت مقرر کیا گیا ہے۔ لو اب چاروں بھائیوں نے تمہارے جنازے کو کاندھے پر اٹھا لیا ہے اور جنازہ لوگوں کے کاندھے پر ہلتا ڈولتا آہستہ آہستہ قبرستان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دونوں طرف میت کو کاندھا دینے والوں کی لمبی قطاریں ہیں۔ اب ہم مارکیٹ سے گذر رہے ہیں جہاں روز صبح تم سودا سلف لینے آتے تھے۔ لو تمہارا محلّہ کی مسجد بھی آ گئی۔ یہیں تمہاری نماز جنازہ پڑھائی جائے گی۔ نماز جنازہ پڑھا دی گئی ہے اور اب مسجد سے تمہارا جنازہ نکل رہا ہے۔ تازہ قبر میت کے انتظار میں ہے۔ گیس کے ہنڈولے کی روشنی میں، میں دیکھتا ہوں کہ چھوٹا بھائی پہلے ہی قبر میں تمہیں اتارنے کے لئے اتر چکا ہے۔ اس کے ساتھ وہ شخص بھی ہے جس نے تمہیں نہلایا اور کفنایا تھا۔ زندگی میں پہلی بار میں قبر میں اترا ہوں۔ میت کو لوگ اٹھاتے ہیں اور ہمارے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔ سر سے اوپر اٹھا کر میت قبر میں اتار دی جاتی ہے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہر جنازے کے ساتھ ہم محبت، رواداری، بھائی چارگی اور میل ملاپ کو بھی دفنا دیتے ہیں۔ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے قبر میں کروٹ لٹا دیتا ہوں، کچھ ریکھ ٹائیاں بزرگوں سے دبائی جا رہی ہیں اور منٹوں میں تمہاری قبر بھی تیار ہو گئی۔ لوگ آتے ہیں اور مٹھی بھر قبل کی مٹی دے کر ہٹ جاتے ہیں۔ گیس کے ہنڈولوں کی روشنی اور خاموشی سے گھرے ہوئے ہم لوگ، نوجوانوں نے اطراف سے ہری بھری ٹہنیاں توڑیں اور قبر پر اگنے کے لئے لگا دیں، ایک بالٹی پانی بھی قبر پر ڈال دیا گیا ہے پھولوں کی چادر چڑھانے کے بعد اور فاتحہ خوانی کے بعد ایک ایک کرکے قبرستان سے باہر جانے لگتے ہیں، تمہارا دوست پاپا ہاتھ کے اشارے سے مجھے رکنے کا اشارہ کرتا ہے، اب قبرستان کے دروازے پر فاتحہ خوانی ہو رہی ہے، سب کچھ کتنا جلدی ہو جاتا ہے۔ لوگ بھی اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں، میت کو دفنانے کے بعد لوگ قبرستان سے باہر آ رہے ہیں۔ تو ٹھیک اسی وقت آسمانی فرشتے اترتے ہیں، قبرستان کی مٹی مٹھی میں اٹھا کر کچھ پڑھتے ہیں اور جاتے ہوئے لوگوں کی طرف پھینکتے ہیں۔ مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ اے خدا کے بندو جاؤ اپنے کام کاج اور دنیاداری میں مصروف ہو جاؤ۔

بھائی! آج تمہیں اس رنگ و بو کی دنیا چھوڑے ہوئے چند ہی دن ہے گھر میں مسلسل اگربتی کا دھواں گشت کر رہا ہے۔ تمہاری بیٹیاں قرآن شریف کی تلاوت کر رہی ہیں۔ تمہاری بیوی پھٹی پھٹی آنکھوں سے تمہاری چیزوں کو دیکھتی ہے اور کچھ سوچنے لگتی ہے، بہت سے سوال ہیں بہت

سے کام ہیں لوم کا کاروبار کون سنبھالے گا؟ ہم دونوں بھائی تو اس دھندے کی الف بے سے بھی واقف نہیں، سود و زیاں کا حساب الگ پریشان کئے ہوئے ہے۔ اور بہت سارے مسئلوں کے ساتھ ماسٹر پلان کا بھی مسئلہ ہے جو بڑی تیزی اور بے دردی سے گھروں کو کاٹتا چھانٹتا چلا آرہا ہے بہت سے کام ہیں کس کس کا ذکر کیا جائے۔" "تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ بمبئی میں ہی شفٹ ہو جاؤ۔" میرے اندر سے آواز آتی ہے۔ دونوں میاں بیوی کو تو یہاں آسانی سے ملازمت بھی مل جائے گی۔ پھر تمہارے بھائی، بہن، رشتہ دار، عزیز و اقارب بھی تو یہاں ہیں۔ پھر یہاں کے چپے چپے پر تمہارے ہاتھوں کے لمس زندہ ہیں یہاں کی مٹی کی بو باس، مانا کہ اب اس میں پٹرول کی سوگندھ بھی آگئی ہے جو تمہاری جانی پہچانی ہے۔ میرے اندر جیسے گھمسان کا سا آوازرن پڑا ہے۔ پہلے منزلے پر جب کھڑکی کھولتا ہوا قبرستان میں سر اٹھائے درختوں کو دیکھتا ہوں جس کے نیچے تم ابدی نیند سو رہے ہو تو میرے خیالات میں اتھل پتھل شروع ہو جاتی ہے۔ اس کشمکش سے گھبرا کر میں اپنا خیال بیوی کو ظاہر کرتا ہوں تو وہ مدھم لہجے میں مجھ سے کہتی ہے "وہ تو ٹھیک ہے۔" پھر وہ چشمے کا فریم اتارتی ہے اسے صاف کر کے دوبارہ آنکھوں پر ایڈجسٹ کرتے ہوئے مجھ سے کہتی ہے "ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ ہماری چار لڑکیاں ہیں چاروں پڑھ رہی ہیں۔ بڑی بی ایس سی کے فائنل میں ہے۔ دوسری ماہم کے سینٹ زیویرس ٹیکنیکل کالج کے دوسرے سال میں ہے ذرا سوچو ان کے کیریئر کا کیا ہوگا۔ اور پھر ان چالیسوں کا کیا ہوگا کر کے ریٹائرمنٹ کی زندگی تو ہمیں یہیں گزارنی ہے اس کے لہجے سے لگتا ہے وہ خود امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا ہے۔

آج تمہیں گزرے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا ہے، لڑکیاں گو میرے ارادے سے واقف نہیں ہیں لیکن ان کی بات چیت اور برتاؤ سے لگتا ہے کہ وہ میرے ارادے سے واقف ہو گئی ہیں۔ بادر لوم کا شور، گھر گھر، ہر پل بدلتا کا شور سامنے ڈرینج سے بہتا ہوا بدبودار پانی، اطراف کی گندگی اور کوڑا کرکٹ، ہاتھ گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ، وقفے وقفے سے بادل کا چلا جانا، وہ کچھ کہتی تو نہیں مگر ان کی آنکھیں مجھ سے کہتی ہیں "ڈیڈی آپ تو کہتے تھے کہ ...." میں انہیں کیسے سمجھاؤں کہ میرا شہر ایسا نہیں تھا، چند دہائیوں میں اتنی بڑی تبدیلی ہو جائے گی میں سوچ نہیں سکتا تھا۔ سب بمبئی چلے گئے ہیں، میں اپنے ہی گھر میں اجنبی ہو گیا ہوں۔ اکیلا ہو گیا ہوں۔ سوچتا ہوں آہستہ آہستہ انہیں منا لوں گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

موت کا ذائقہ چکھے ہوئے آج تمہیں چالیس دن ہو گئے ہیں اور آج تمہارا چہلم ہے اور زندگی اپنی پوری شدت سے جاری ہے۔ چہلم میں سب پھر شریک ہوتے ہیں اور پھر اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں، بہنیں بھی پہلے شام کو آتی تھیں اب وہ بھی نہیں آتیں۔ چھوٹا بھائی اسکول میں سو کھانے کے بعد انکم ٹیکس کی فائلیں بھی دیکھتا ہے اس لئے تھکن کے مارے جلدی سو جاتا ہے، اپنے کمرے میں جاتا ہے، دروازہ بند کر لیتا ہے، اس کی بیوی دو بچے ہے۔ سب سو جاتے ہیں اور میں باہر تمہاری کھاٹ پر لیٹا لیٹا سوچا کرتا ہوں، جانے کیا کیا۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ مرحوم ماں کی اوڑھنی بھی ویسی ہی ہے۔ جسے تم سوتے ہوئے اپنی آنکھوں پر رکھا کرتے تھے۔ میں جاگ رہا ہوں۔ رات جاگ رہی ہے۔ چاروں طرف سے لوم کی لوریاں آ رہی ہیں۔ مگر مجھے نیند نہیں آتی۔ دور کہیں قبرستان کے اونچے اونچے پیڑوں کی ٹہنیاں نظر آ رہی ہیں۔ میں یوں اٹھ کر روانہ ہوتا ہوں جیسے نیند میں چل رہا ہوں، نیم غنودگی کے عالم میں، میں بس چلا جا رہا ہوں غیر ارادی طور پر بارش میں بھیگتا ہوا۔ مجھے اس وقت ہوش آتا ہے جب میں اپنے آپ کو قبرستان میں پاتا ہوں تمہاری قبر کے سامنے، بھائی دیکھو میں ننگے سر ننگے پاؤں، تمہارا ہی کرتا پہنے ہوئے اور تمہاری ہی لنگی پہنے ہوئے، تمہاری قبر کے سامنے کھڑا ہوں۔ اور تم سے مخاطب ہوں۔ سب لوگ اپنے کام دھام میں لگ گئے ہیں۔ تمہارے بچے بھی اب کبھی کبھار ہنس بول لیتے ہیں۔ دوست احباب کبھی آتے ہیں کبھی نہیں آتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیشہ تمہارا ماتم کیا جائے۔ مگر میرا مسئلہ الگ ہے۔ میرے بچے کسی طور پر یہاں رہنے کے لئے راضی نہیں ہیں یہاں کے شب و روز ان کو اچھا نہیں لگتے۔ میرے زمانے کی بھیونڈی کے بارے میں میں نے انہیں جیسا کچھ بتایا تھا وہ اب ایسا نہیں ہے۔ میں اپنوں میں رہتے ہوئے اجنبی ہو گیا ہوں۔ اکیلا ہو گیا ہوں۔ میں آج بھی یہیں رہنا چاہتا ہوں، اسی سرزمین کی مٹی میں دفن ہونا چاہتا ہوں۔ جہاں ہمارے پرکھوں کی قبریں ہیں۔

موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ سرد ہوائیں درختوں کی پتیوں سے مل کر بین کر رہی ہیں۔ قبرستان میں ملگجا اندھیرا پھیلا ہوا ہے، دور کہیں الو بول رہا ہے، یک ہو، یک ہو اور میں بارش میں بھیگتا ہوا خاموش کھڑا ہوں۔ یہ میرا مسئلہ ہے جسے میں بھوگ رہا ہوں۔ لیکن دم بھر کو ٹھہریے اور سوچیے کہ کیا صرف میں قبرستان میں کھڑا ہوں، آپ نہیں؟! کیا یہ مسئلہ صرف میرا ہے آپ کا نہیں۔؟!

جہاں جب ہماری تہذیب اور رواداری اور شرافت اور آخری سانس لیتا ہوا، ہمارا یہ قانون، یہ نیم بسمل سماج اور خون میں ڈوبی ہوئی ہماری یہ عبادت گاہیں، کیا ہم سب کا مسئلہ نہیں ہے؟ آنے والی نسلوں نے اگر

[باقی صفحہ ۳۴۴ پر دیکھیے]



افتخار نسیم

SAVE THE WHALES

تُو نے کب یہ سوچا تھا
تیرے پانی سے باہر بھی اک دنیا ہے
تیری حکومت سے باہر بھی ایک حکومت
اک تہذیب ہے
جو چھوٹی تہذیبوں کو کھا جاتی ہے
تیری شکل بھیانک
تیرا جثہ گوشت کا تودہ
پھر بھی تو کتنی معصوم سی لگتی ہے
تجھ میں دکھائی دیتا ہے قدرت کا جمال
میں کیسے ان لوگوں کو سمجھاؤں گا
یہ تو وہ تاجر ہیں جو دنیا کی ہر اک شے کو
منڈی میں لے آتے ہیں
تیری کھال سے پوشاکیں بنواتے ہیں
تیرے گوشت سے پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں
تیری ہڈی اِن کا زیور
یہ دنیا تو آدم خوروں کی بستی ہے
میں ان آدم خوروں سے کس کس
کو بچاؤں

6033 N. SHERIDAN # 40-J
CHICAGO, IL 60660



یسمین افضال

گرفت

سیاہ رات کا بادل سروں سے چھٹتے ہی
مرے دریچے کے ننگے سفید شیشے پہ
نئے یقین کے سورج نے اپنی دستک دی
ادھورے خواب مرے ٹوٹ کے بکھر سے گئے
کہ جن کے ریزوں کو بے نور جگنوؤں کی طرح
گزرتے لمحے پروں پہ اڑائے پھرتے ہیں
فضا میں چاروں طرف کرچیاں سی یادوں کی
روپہلی دھوپ میں جھلکا رہی ہیں آئینے
نظر میں سارے مناظر کے رنگ جھوٹے ہیں
مرے تخیل کی جانے گرفت کس پر ہے
ستارہ رنگ ہیں ذرات، چاندنی سے زمیں
لہو ہے رات کا سورج کے آبگینے ہیں
کہ جس کا آتشی، دن پہ چڑھا ہوا سا رنگ
سنہرا جال ہے، زرتار روشنی کا جال
عذابِ جاں کی طرح اردگرد پھیلا ہوا
جیسے کہ رنگوں کی آوارہ سرمئی تتلی
پروں میں شام کو الجھا کے اڑنے والی ہے
میں سوچتا ہوں حسین انگلیوں سے خوابوں کی
چمکتے جگنو نہ پکڑوں نگاہ میں رکھ کر
تمام رات فضاؤں میں ان کو اڑنے دوں

۱/۲-کے-۲، ناظم آباد، کراچی پاکستان۔



شاهد ماهلی

◆

صدائے دل ہے کدھر ہم کدھر کو دیکھتے ہیں
کس احتیاط سے اہلِ نظر کو دیکھتے ہیں

کہاں تلاش کریں کھوئی منزلوں کا پتہ
نہ جانے کب سے ہر اک رہگذر کو دیکھتے ہیں

یہ درد وہ ہے کہ جس کا نہیں ہے کوئی علاج
یہ کس امید پہ ہم چارہ گر کو دیکھتے ہیں

اداس اداس سا منظر بجھی بجھی سی فضا
کبھی سفر کبھی زادِ سفر کو دیکھتے ہیں

یہیں کہیں پہ امیدوں کا آشیانہ تھا
ہر ایک سبزہ و گل ہر شجر کو دیکھتے ہیں

ہماری خود نظری کھو گئی کہاں شاہد
قدم قدم پہ ہر اک ماہ جبیں کو دیکھتے ہیں

کے-۲۰، [illegible] شیخ سرائے فیس ۱۱، نئی دہلی-۱۷



شکیلہ رفیق
1 VELMA DRIVE TORONTO
ONT-CANADA M8Z-2N2

ایک شام کہیں آباد تو ہو

اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ یوں ڈھانپ لیا تھا کہ انگوٹھوں اور بقیہ انگلیوں کے درمیان سے صرف اس کی "جگمگ" آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔

چہرے کے تاثرات چھپا کر، اپنے تئیں صرف وہ اسے دیکھ رہا تھا لیکن .... شاید وہ یہ نہ جانتا تھا...... یا پھر بھول گیا تھا کہ آنکھیں انسانی وجود کا سب سے سچا حصہ ہوتی ہیں اور پھر...... اس کی آنکھیں !!! وہ !

جس کے لب جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں اور.... آنکھیں سچ!

ماہر چہرہ شناس تو یوں بھی چہرہ اور بالخصوص آنکھیں پڑھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتا......... پھر وہ تو اس ضمن میں بے حد کچی تھی۔

اس نے جو کچھ چھپانا چاہا تھا........ وہ..... وہی سب جان گئی تھی۔

پھر..... ایک لمحے کو ٹھہرو!

کیا واقعی وہ سب کچھ جان گئی تھی؟

شاید ہاں..... یا پھر...... نہیں!

اور...... جہاں لفظ شاید آجائے، وہیں یہ موڑ آجاتا ہے، اور پھر فرد...... اسی موڑ پر ٹھہر جاتا ہے تب..... سوچ اسے گھیر لیتی ہے کہ.... اسے کدھر جانا ہے؟

معلوم ہے؟

اس سے قبل اسے ایسی سوچ نے کبھی نہ گھیرا تھا! ، اسے دیکھنے.... اس سے ملنے سے پہلے تو وہ...... اس مسافر کی مانند تھی جس نے کشتی کو موجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آنکھیں موند لی ہوں۔

یہ سوال۔! تو تب سے دل و ذہن پہ دستک دے رہا تھا جب سے..... وہ ملا تھا..... جب سے اسے دیکھا تھا۔

کاش !!

وہ یوں ہی...... آنکھیں موندے رہتی اور، "وہ" اک سوال کی صورت اس کے روبرو آکر نہ کھڑا ہو جاتا تب......

تب.... سب کچھ کتنا آسان ہو جاتا!

ہے نا!

وہ...... جو کبھی بیگانہ بیگانہ سا نظر آتا ہے، کبھی بالکل اپنا اپنا سا!

وہ.... کھل کیوں نہیں جاتا؟

مسئلہ تو یہ ہے کہ..... دونوں ہی مشکل ہیں

کاش! وہی آسان ہوتا اور.......

سوال کے بجائے جواب ہوتا تھا.... تمام راہیں آپ ہی آپ کھل جاتیں۔

کیا وہ ذرا سا آسان نہیں ہو سکتا؟

شاید نہیں۔

شاید کیا..... یقیناً نہیں!

نہ وہ آسانی کا راستہ اپنائے گا نہ کلام کا۔ پھر...... اس خود کلامی سے کیا حاصل؟ اور وہ.......

وہ تو انا کی ایسی پکی پجارن ہے کہ.......

اپنی شناخت، قطار میں کھڑے ہوئے شخص کے طور پہ ہرگز نہ کرائے گی۔

رونق نعیم

◆

کوئی کنایہ نہیں کوئی استعارہ نہیں
بس حرف حرف مگر اب بھی آشکارا نہیں

مقامِ ہول سے گذرا تو یہ ہوا محسوس
کہ دور سے بھی کسی نے مجھے پکارا نہیں

مری نگاہ کی وسعت پہ روز گرتا ہے
وہ آسمان کہ جس میں کوئی ستارا نہیں

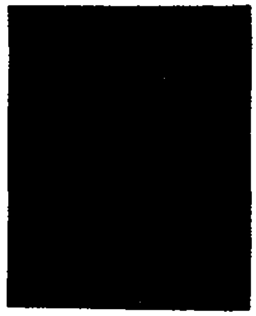
ندی بچھڑ کے سمندر سے ٹوٹ جائے گی
میں ایک بار کہوں گا اسے دوبارا نہیں

اچھالتا ہوں لہو میں بھی آسماں کی طرف
جو میرا سر بھی قلم ہو تو کچھ خسارا نہیں

یہ انکشاف ہے رونق عجیب تیشے کا
کسی بھی سنگ کے سینے میں اک شرارا نہیں

● نہرو روڈ، رانی گنج ۷۱۳۳۴۷ (مغربی بنگال)

ارشد مانکپوری



دوہا غزل

اپنے جیون کی گرہ اپنے ہاتھوں کھول
لوگوں سے کیا پائے گا لوگ دور کے ڈھول

گھر آنگن چوپال میں بول نہ اونچے بول
سب نیچا ہو جائے گا یہ دنیا ہے گول

اپنے بل کو آنک کر اکڑ رہے ہیں لوگ
رستم جیسے دیر بھی بک گئے ماٹی مول

گھری گھٹا کو دیکھ کر تو گاگر مت پھوڑ
ندی کی پیاس بجھائیں نا یہ بادل کے گول

آنے جانے کی کتھا سکھ دکھ کا سنجوگ
رہ رہ کر یاد آئیں سکھی پردیسی کے بول

کتھنی، کرنی، ایک ہو صورت، سیرت، ایک
لاکھن میں اس ایک کا ست وچن انمول

روز نئے بہروپ سے نت ہم کو للچائے
ارشد جی اب کھل گئی اس دنیا کی پول

● ۶/۲۸ پریڈ کانپور ۲۰۸۰۰۱ ــ (یوپی)

رازداں امان اللہ



دوہے

دوجا کیا سمجھے بھلا ساجن کا پیغام
کورا کاغذ ہاتھ میں پتا نہ کوئی نام

❖

جب تک ہو بازار میں لے لو نقد ادھار
چلتا ہے دو چار دن جیون کا بیوپار

❖

تھوڑی تھوڑی چھاؤں ہے ہلکی ہلکی دھوپ
کتنی کی چھپا لگے گوری تیرا روپ

❖

جب تک گھٹ سے ہے بندھی تب تک ہے سب زور
کچی ڈوری سانس کی لیکن ہے کمزور

❖

تیرے روپ سنگار کی مچی چار سو دھوم
بیٹھ سنگھاسن پر کبھی گلی گلی مت گھوم

❖

طائر سب کچھ جان کر مت بن یوں انجان
ظاہر ہے ہر موج سے آثارِ طوفان

❖

ماتھے پر الجھی لٹیں چال سانپنی چال
منظرِ زنداں کر گئی ایک پری تمثال

❖

ذہنوں کو صیقل کرے جذبوں کو مہمیز
حرفِ صد ہنگام ہے "شعرِ شور انگیز"

❖

آئینہ اٹھا لگے جنوں لگے بے ہوش
ایسی فصلِ گل ہوئی خار ہوئے گلپوش

● محلہ دریا خان، گاندھی نگر، بستی ۲۷۲۰۰۱



موجودہ عروض کی خامیاں اور عروضِ نو

دورِ حاضر کے شعرا فنِ عروض سے کس قدر واقف ہیں یہ جگ ظاہر ہے ان کا عروض سے گریزاں ہونے کا سبب ہے عروض کی دشواریاں درحقیقت زحافات کی وجہ سے عروض بے حد دشوار ہو گیا ہے جبکہ زحاف کا عروض میں کوئی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی عروض میں کچھ قواعد ایسے ہیں جن کے سبب ہمارا اردو عروض کسی حد تک غیر معتبر ثابت ہو جاتا ہے۔ عروض کے ایسے چند قواعد ذیل میں درج کیے ہیں۔

پہلا بے جا قاعدہ۔ عروض میں ایک قاعدہ ہے ساکن کو متحرک کرنا اور متحرک کو ساکن کرنا۔ اس قاعدے کے مطابق اردو کی متعدد بحور کا غلط استعمال کیا جا سکتا ہے یا دو مختلف بحور کو ایک ساتھ استعمال کر سکتے ہیں۔ جبکہ اس قاعدے کا استعمال صرف ہندی کے ماترک چھند یا بحر متدارک مقطوع میں کرنا چاہئے۔ اس قاعدے کے مطابق اردو کی درج ذیل بحور کو ایک ساتھ استعمال کر سکتے ہیں۔ جبکہ یہ مختلف اوزان ہیں۔

(الف) بحر کامل اور بحر رجز ایک ہو جائیں گی۔ ارکان بحر کامل مُتَفاعِلُن مُتَفاعِلُن (م، ت، دو زبر متحرک) ارکان بحر رجز مُستَفعِلُن مُستَفعِلُن (م متحرک س ساکن) متفاعلن کی ت کو ساکن کرنے پر مستفعلن کا وزن مل جائے گا۔

(ب) بحر رمل مشکول فَعِلاتُ فاعِلاتُن اور بحر مضارع اخرب مفعولُ فاعِلاتُن فعلات کی ع کو ساکن کر دینے پر مفعول کا وزن مل جائیگا اسی طرح [illegible] اور مفعول [illegible] ایک ساتھ استعمال کئے جا سکتے [illegible] فرق ہے۔ اس کے علاوہ بھی [illegible] ایک ساتھ استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ ایک شعر میں اس قاعدے کا استعمال دیکھئے۔

دنیا تمہارے حسنِ درخشاں پہ مر مٹی
ہم کو تمہارے دل کش انداز بھا گئے

یہ شعر بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف میں ہے اور اس کے ارکان ہیں "مفعولُ فاعلاتُ مفاعیلُ فاعلن" درج بالا بحر کے مطابق تقطیع کرنے پر شعر کے دوسرے مصرع میں "دل کش" لفظ میں "ش" ساکن ہے اور یہ شعر کی روانی کو متاثر کر رہا ہے۔ مگر اس قاعدے کے استعمال سے اس "ش" کو متحرک کرنے پر یہ شعر وزن میں شمار کیا جائیگا۔ میرے خیال سے یہ غلط ہے اور شاعری یا بحر کے آہنگ کے ساتھ زیادتی ہے۔

دراصل ہندی (درحقیقت سنسکرت) قاعدے میں کمل کو تین متحرک، چمچم کو چار متحرک یا اب کو دو متحرک شمار کیا جاتا ہے۔ یہ قاعدہ فقط سنسکرت زبان کیلئے تو ٹھیک ہے۔ کیونکہ سنسکرت میں ہر ایک حرف کو پورا وقت دے کر الگ تلفظ کیا جاتا ہے۔ مگر ہندی یا اردو دونوں زبانوں میں ایسا نہیں ہے۔ اور یہ آج کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ دراصل شاعری آواز ہے اور کسی بھی قاعدے کی اوٹ میں آواز کے ساتھ بے ایمانی کرنا غلط ہے۔ اس قاعدے کا استعمال فقط ہندی کے آٹھ ماترک چھندوں یا بحر متدارک مقطوع میں ہی کرنا ٹھیک ہے۔

۲۔ بحر کا نام طویل ہونا۔ عروض میں زحافات کے سبب بحروں کے نام اتنے طویل ہو جاتے ہیں کہ وہ بحر سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ مثلاً

(۱) بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف :- ارکان :-
مفعول مفاعلن فعولن (۲) بحر مضارع مثمن اخرب
مکفوف محذوف :- ارکان :- مفعول فاعلات مفاعیل
فاعلن - دراصل جب کسی سالم بحر میں زحاف استعمال کرتے ہیں
تو مزاحف بحر کا نام زحاف کے زیر اثر طویل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اردو
عروض میں مختلف بحر یعنی الگ الگ "لے" بننے کا سبب زحاف
کو سمجھا اور مانا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ نئی بحور زحاف
کے اثر سے نہیں بنتیں بلکہ یہ شاعر کی کیفیت اور حالات کی ایجاد
ہوتی ہیں۔ فرض کیجئے ایک شاعر کے دل میں ایک "لے" ابھرتی
ہے جس میں ساکن یا متحرک حروف یا معروف و مجہول آواز اس طرح
ترتیب میں ہیں -

~ ۱۲۱ ۲۲۱ ۲۱ ۲۲ (۱ = یعنی مجہول ، ۲ = یعنی معروف)
اب سوال یہ ہے کہ اس "لے" کے ابھرنے میں زحاف نے کیا کردار
ادا کیا؟

اردو عروض کے مطابق اس "لے" کو بحر متقارب مثمن مقبوض
اثلم کہیں گے جو بحر متقارب کی ایک مزاحف بحر ہے یعنی بحر متقارب
میں "قبض" اور "ثلم" زحاف کے آنے پر یہ وزن وجود میں آیا۔ اب
سوال یہ ہے کہ کیا زحاف نہ ہونے پر شاعر کے ذہن میں یہ "لے" نہیں
ابھرتی؟

درحقیقت نئی "لے" کا زحاف سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اب
ذرا بحر کے نام پر غور کیجئے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ بحر سے طویل اس
کا نام ہے۔ اگر ہم اس نئی "لے" کا نام رکھ دیں بحر لطیف تو کتنی آسانی
ہو جائے۔

جن بحور میں آہنگ ہے یا جو شاعری کیلئے موزوں ہیں یا جو
مختلف زبانوں کے قواعد کے مطابق کھری اترتی ہیں شاعر انھیں کو
استعمال کرتا ہے۔ مگر زحاف کی وجہ سے بے شمار ایسے اوزان
(بحور) وجود میں آ گئے جن کو استعمال کرنا کار زبردستی ہے اگر
ان کا وزن معلوم نہ ہو تو وہ کبھی کسی شاعر کے ذہن میں نہیں
ابھر سکیں۔ سمجھ ہو کہ یہ بحریں آہنگ سے بھی دور ہیں۔

درحقیقت مزاحف بحور یعنی مختلف "لے" کے بننے میں
زحاف کوئی کردار ادا نہیں کرتا کرتے اس کے برعکس زحاف کے
استعمال سے بحر کا نام طویل ہو جاتا ہے۔ اور عروض دشوار ہو جاتا

ہے۔ دور حاضر کے شعراء کا عروض سے گریزاں ہونے کا
سب سے بڑا سبب ہی زحاف کا عمل ہے۔ آج اردو میں
متعدد ہندی کے ماترک اوزان بھی مروج ہو گئے ہیں
اگر ان اوزان کا نام زحاف کے مطابق رکھیں تو بحر کا نام ایک
لطیفہ بن جائے۔ عجیب بات ہے کہ ایک "لے" کا نام بحر
رمل سالم ایک لے کا نام بحر رمل مثمن مخبون مشعث مقصور
یہ بیجا طوالت فقط زحاف کے باعث ہے۔
اس کے علاوہ یہ کہ زحاف کے عمل سے عروض محدود
ہو گیا ہے۔ متعدد اوزان ایسے بھی ہیں جو شعری ضروریات
کو پورا کرتے ہیں۔ اور آہنگ کے مطابق بھی ٹھیک ہیں بامحاورہ
اور رواں بھی ہیں۔ مگر زحاف کی گرفت سے باہر ہیں
یعنی کسی بھی بحر میں کسی بھی زحاف کے (قاعدے کے مطابق)
استعمال سے مذکورہ اوزان کو نہیں پایا جا سکتا۔ ایسے چند
اوزان یہاں درج کرتا ہوں -
(۱) مَفَاعِلُنْ فَعِلَاتُ فَعِلَاتُ فَعِلُنْ (۲) مَفْعُولُ
فَاعِلَاتُ مَفْعُولَاتُ فَاعِلُنْ (۳) فَعِلَاتُ مَفَاعِیلُنْ
(۴) فَاعِلَاتُ مَفَاعِلُنْ مَفَاعِلُنْ فَعِلُنْ
مذکورہ بالا مباحث سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ عروض میں زحاف
کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

حروفِ علت کا عمل

الف ، واو ، ی (ا ، و ، ی)
کو حروفِ علت کہتے ہیں۔ عروض کے مطابق عربی فارسی الفاظ
کے حروفِ علت گرانا جائز نہیں ہے۔ لیکن تجربہ یہی بات کہ
شاعری کا آواز ہے۔ کئی اشعار ایسے بھی نگاہ سے گزرے ہیں
کہ ان میں عربی و فارسی الفاظ کے حروفِ علت گرا دئیے گئے
ہیں۔ مگر اس سے شعر کی روانی قطعی متاثر نہیں ہوئی ؂

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
([illegible])

یہاں بحر رمل مثمن مخبون مقصور [illegible] کی یا ے
علت گر [illegible] قطعی متاثر
نہیں [illegible] مزہ دے
[illegible] کی روانی کو

[redacted]

[illegible] ہو جاتا ہے

[illegible]

زیست کو عشق کی ہر چیز مہیا کر دی

اس شعر میں بحر و عروض کے مطابق تجزیہ ہو سکتا ہے بحر کی مدد گر رہی ہے جو جانتا ہے مگر اس سے شعر کی روانی بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کسی بھی حرف کو گرایا جائے جو صرف آواز کی ضرورت رکھتا ہے تو وہ شعر کی روانی کو متاثر کرے گا خواہ اس کا گرانا جائز ہو۔ ویسے تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جب بھی کسی شعر میں عربی فارسی الفاظ آتے ہیں تو باشعور شاعر انھیں ہمیشہ ان کے پورے وزن ہی میں استعمال کرتا ہے یا یہ کہیے کہ یہ الفاظ ہمیشہ اپنا پورا وزن لے کر ہی ادا ہوتے ہیں۔ لیکن کئی بار شاعر کی مداخلت ان الفاظ کا وزن بگاڑ دیتی ہے۔ اس سلسلے میں میری تجویز یہ ہے کہ دورِ حاضر کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اب عربی و فارسی کے غیر مصدر حروفِ علت کو آواز کے ساتھ ہم آہنگی کے بغیر گرانا جائز قرار دینا چاہیے مثلاً شاعری (شاعر)، عاشقی (عاشق)، بے وفائی (بے وفا) اس بارے میں ایک اور دلیل دینا چاہوں گا کہ جب ہم عربی و فارسی الفاظ کو تراکیب کے ساتھ استعمال کرتے ہیں یعنی ۔۔۔ زندگیِ مفلس، خوشبوئے گل ..... تو ان الفاظ کے حروفِ علت کو گرانا جائز مانتے ہیں کیوں؟

دراصل اس طرح کے استعمال میں تلفظ کی مانگ یہ رہتی ہے کہ ان الفاظ کے حروفِ علت کو دبا کر پڑھا جائے۔ جب سب کچھ آواز پر ہی منحصر ہے تو کوئی بھی بے جا پابندی کیوں ہو؟۔

اس بات میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہندی کویتا کے زوال کی سب سے بڑی وجہ ہندی عروض کے سخت قواعد تھے اس بات کو ایک شعر نے یوں واضح کر دیا ہے ۔

تنہ رہے [illegible] سر عام سبب عنوانِ منظم
ہندی کویوں کو محصور میں نہیں کر سکتا

ایک وزن کے کئی نام ۔ عروض میں زحافات کی وجہ سے کئی بار ایسا ہو جاتا ہے کہ ایک ہی وزن کے کئی نام ہو جاتے ہیں [illegible] مفاعلن مفاعلن ۔ اسی وزن کو خواہ [illegible] خواہ بحر رمل مکفوف

محذوف ہے۔ اسی طرح "فعلن فعلن فعلن فعلن" اسے خواہ بحر متدارک مقطوع کہیے، خواہ بحر متقارب اثلم (فارسی میں ثلم کو عام زحاف مانا ہے)۔

پروفیسر عنوان چشتی نے اپنی کتاب "عروضی اور فنی مسائل" میں ایک شعر کو ایک سو کئی اوزان میں تقطیع کیا ہے اسی طرح سے بہت سی بحور ایسی ہیں جن کو کئی مختلف نام دیے جا سکتے ہیں۔ ایک مثال اور دیکھیے ۔۔۔ "مفاعلن مفاعلن" اس وزن کو خواہ بحر ہزج مقبوض کہیں خواہ بحر رجز مخبون کہیں۔ اور یہ سب کچھ محض زحاف کی وجہ سے ہے۔

ع کی آواز موجودہ عروض کے مطابق "ع" کو الف وصل کے طور پر استعمال نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ الف وصل کا قاعدہ لے اور روانی پر منحصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستند شعراء نے "ع" وصل کا استعمال کیا ہے۔ کیونکہ یہ لے کی روانی کو قطعی متاثر نہیں کرتا۔ مثلاً ۔۔

عالم حسن ہے عجب ۔۔ عالم
چاہیے عشق بھی اس عالم کا
(میر)

میری تجویز ہے کہ "ع" وصل کو جائز قرار دیا جانا چاہیے ورنہ مذکورہ شعر میں بحر خفیف کے مطابق دوسرے مصرعے میں اس "ع" کو سالم کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ شعاع، وداع، شروع، شجاع وغیرہ الفاظ میں "ع" کا تلفظ اب عام طور پر نہیں کیا جاتا بلکہ بہت سے شعراء یا افراد جانتے بھی نہیں ہیں کہ مذکورہ الفاظ کے آخر میں ساکن "ع" ہے۔ دورِ حاضر میں ان الفاظ کو اب ودا، شجا، شعا ..... ہی لکھا جانا چاہیے یا یہی مانا جانا چاہیے؟۔

ارکان کا تلفظ:- موجودہ عروض میں بعض ارکان کا تلفظ بڑا اٹپٹا ہے اور ان ارکان والی بحر کو روانی کے ساتھ نہیں پڑھا جا سکتا۔ ایسے ارکان ہیں ۔۔۔ مُسْتَفْعِلُنْ، مُفْتَعِلُنْ، مَفَاعِیلُنْ بلکہ سبھی ارکان ایسے حروف سے مل کر بنے ہیں کہ ان کے تلفظ میں دشواری ہی ہوتی ہے۔ اگر ان سبھی ارکان کو ایک روپ بنا دیا جائے تو بہت آسانی ہوگی اور یہ کام میں نے اپنی

تحقیق کتاب میں [illegible] گیا ہے۔

عروض نو کی [illegible] روپ ہیں۔ عروض نو کا مختصر تعارف میرے موقف کی صراحت کیلئے معاون ہوگا۔

عروض نو:- درحقیقت عروض نو ایک نیا اور نہایت آسان عروضی قاعدہ ہے۔ اس کے علاوہ میرا مجوزہ عروض نو موجودہ عروض سے کہیں زیادہ وسیع الذیل ہے۔ موجودہ عروض دراصل پنگل شاستر سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ یعنی عربی و فارسی عروض کے خالق خلیل بن احمد نے پنگل قاعدے کو آسان اور عربی زبان کے مطابق بنایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پنگل کے متعدد اوزان اردو عروض میں جوں کے توں موجود ہیں۔

چھند تارک — بحر ہزج مقبوض / چھند سرگوئی۔ بحر متدارک / چھند گیتکا۔ بحر رمل / چھند ہری گیتکا۔ بحر رجز / چھند بھجنگ پریات۔ بحر متقارب۔

کچھ چھند معمولی تغیر کے بعد اپنائے گئے۔ مثلاً چھند اندر وجرا اس کی مثال ہے۔

त्वमेव माता च पिता त्वमेव
त्वमेव बन्धुश्च सखा त्वमेव [छंद इन्द्रवज्रा]

اس چھند سے [illegible] کو نکال دیا گیا اور یہ بحر متقارب مثمن اثلم بن گئی ہے

ہزار باتیں کہے زمانہ — مری وفا پہ یقین رکھنا

عربی میں اسے بحر جمیل کہا گیا ہے۔ اب ایک مثال اور [illegible] اسی شعر ہے اور یہ شعر تب لکھا گیا جب عربی فارسی عروض بنا بھی نہیں تھا

ہزہرا گچھیاں از سطح بزی
جہاں را نگہباں از شر بزی

یہ شعر پنگل چھند بھجنگ پریات میں لکھا گیا ہے۔ یعنی پہلے فارسی میں پنگل چھندوں کا استعمال ہوتا تھا۔

عروض نو کی خصوصیات:- (۱) زحافات کو ختم کر دیا گیا ہے۔ (۲) بہت سے نئے اوزان وجود میں آئے ہیں۔ (۳) بحروں کے نام مختصر ہیں آسانی سے یاد ہونے والے ہیں۔ (۴) ارکان کا تلفظ ایک روپ ہے اور [illegible] (۵) شاعر اپنی ضرورت کے مطابق اوزان بنا سکتا ہے (۶) نثری نظم لکھنے والے بھی نظم کی طرف لوٹ آئیں گے۔



ظفر اقبال ظفر

بصارت کے عجب منظر کھلے ہیں
ہم اپنی ذات کے اندر کھلے ہیں

سبھی چہرے یہاں تو آشنا ہیں
سبھی کے ہاتھ میں خنجر کھلے ہیں

کوئی اس کے مقابل پھر نہ ٹھہرا
جب اس کی تیغ کے جوہر کھلے ہیں

ملی ہم کو وہ تہذیبِ مسافت
کوئی موسم ہو ہم پر گھر کھلے ہیں

سبھی سمتیں منوّر ہو گئی ہیں
جہانِ خواب کے وہ در کھلے ہیں

چلو آؤ نظارہ ہم بھی کر لیں
لہو کے دشت میں منظر کھلے ہیں

تو جن کو پڑھ رہا ہے مدتوں سے
ظفر چہرے وہ سب تجھ پر کھلے ہیں

● ۱۲۰ [illegible] فتح پور (۲۱۲۶۰۱ یو پی)



لطیف شاہد

نہ بھول پائیں گے تجھ کو شرارتوں کی طرح
تو یاد آئے گا ہر دم علامتوں کی طرح

اے دھڑکنوں درِ دل پہ یہ کون آیا ہے
سراپا صبحِ طرب کی بشارتوں کی طرح

رکھے ہوئے ہیں ابھی تک تمہارے سارے خطوط
ہمارے پاس مقدس امانتوں کی طرح

وہ ایک لمحۂ حاضر جو اس کے ہاتھ میں تھا
گزر گیا مرے سر پہ قیامتوں کی طرح

الٰہی اب تو کوئی پل دے رحمتوں والا!
گزر گئیں کئی صدیاں قیامتوں کی طرح

ہم اہلِ عشق کو سود و زیاں سے کیا مطلب
محبتیں نہیں ہوتیں تجارتوں کی طرح

● مومن پورہ، برہان پور ۴۵۰۳۳۱ (ایم پی)



خ زماں انصاری

بہت چھوٹی سی تھی دنیا نظر میں
بڑی ہوتی گئی پیہم سفر میں

وہی بے کیف منظر کی اداسی
وہی رخنہ حیاتِ مختصر میں

مزاجِ فن ہے جیسے ایک صحرا
ہر اک فنکار ہے لمبے سفر میں

کمالِ تخمِ رسوائی تو دیکھو
کہ آئے کیسے کیسے گل شجر میں

ہری شاخیں زماںؔ رسوائیوں کی
ثمر لائی ہیں بے موسم شجر میں

● نیشنل ڈیفنس اکیڈمی کھڑک واسلا، پونا

فرحت جہاں
مکان نمبر ۱۶/۱۱۰ عیدگاہ ہلز، بھوپال

نہ جانے کیوں

"نہ جانے کیوں"
ابھی تک آیا کیوں نہیں؟
بس آتا ہی ہوگا!
لفظوں پہ اتنا بھروسہ!!
بے شک
نہ آیا تو؟
ساری عمر لفظوں کی ڈور سے بندھے رہیں گے۔

سوچ کی منزلوں سے گزرتے گزرتے آمنہ کی نگاہیں ادھر ادھر اٹھ رہی تھیں۔ کونہ کونہ چھانتی پھر رہی تھیں۔ لیکن کوئی ہوتا تب ہی تو نظر آتا۔ اس شکستہ اور گرنے والی آثار قدیمہ کی گنبد والی عمارت کے احاطے میں جھاڑ جھنکار اور دھول خاک میں پھدکتی چڑیاں ہی دکھائی پڑ رہی تھیں۔ گھنے بڑے بڑے درختوں سے گرنے والے سوکھے پتے یہاں وہاں لڑھکتے پھر رہے تھے۔

چاروں طرف سناٹا تھا۔ بڑے چوبی دروازے کے بائیں جانب ایک چبوترے کے پیچھے اس کی جو نظر پڑی تو میلی کچیلی جینز پہ ڈھیلا ڈھالا سا شرٹ پہنے ایک دبلا پتلا گورا شخص تحقیق و تجسس سے بدحال کسی کتبے کو پڑھنے میں مشغول نظر آیا۔ کندھے سے لٹکے ہوئے تھیلے میں سے کاغذ نکال نکال کر وہ نہ جانے کیا لکھتا جا رہا تھا۔ پیروں میں پہنی چپلوں پہ سفر کی دھول جمی ہوئی تھی۔

یہ انگریز بھی خوب ہوتے ہیں اپنی ذات کو بھول بھال کر نہ جانے کس کس چیزوں کی کھوج میں دن رات لگے رہتے ہیں۔ سکھ چین کی زندگی چھوڑ چھاڑ اس خرابے میں نہ جانے کیا کر رہا ہے اوہ چھوڑو! کچھ بھی کرے۔ آمنہ نے اپنے خیالوں کو جھٹکا۔ وہ اپنے ذہن کے موجود منظر کو نہیں بدلنا چاہتی تھی۔

وہ بیٹھے بیٹھے سیڑھیوں کو گننے لگی۔

"آٹھویں سیڑھی ٹھیک جیسے ... ایسا نہ ہو میں وہاں پہنچ جاؤں اور انتظار میں سوکھتا رہوں" "وعدہ" "وہ پکا وعدہ" "وہ اس کا [illegible]

میں دیکھتا ہوا یوں اٹھا۔ کچھ ہوائی آمنہ کے دل کو اس طرح چھو گئی جیسے شبنم گرے اور پھول کھل اٹھے۔

ابھی تک آیا کیوں نہیں؟

آمنہ کی نظریں سیڑھیوں پر جم گئیں۔ اس نے سوچا نہ جانے کون کون ان پہ سے چڑھتا اترتا ہوگا۔ شہزادوں کی آؤ بھگت اور اچھال چھکا کنیزوں اور لونڈیوں کے ساتھ عشق و محبت میں ڈوبی کیسی میٹھی میٹھی سرگوشیاں ہوتی ہوں گی۔ چھم چھم ادھر ادھر دوڑتی پھرتی ہوں گی۔ ان سیڑھیوں نے سنی ہوں گی وہ باتیں بھی جو کسی تقریب میں آئی ہوئی حسین نوخیز شہزادیوں کے کان میں چپکے سے شہزادے نے کہی ہوں گی۔

اور پھر ہنسی میں کھل اٹھے ہوں گے ان کے لب یقینی۔

رومانی احساس اور بڑھ گیا۔ آج وہ بھی جمیل سے بہت باتیں کرے گی۔ دل کھول کر رکھ دے گی۔ اسے خود پہ بہت غصہ آیا۔ جب وہ سامنے ہوتا ہے تو کچھ بولتے ہی نہیں بنتا۔ دل چاہتا ہے کہ اسی کی سنتی رہوں۔ ہائے اس کے بولنے کا انداز۔ کس خوبصورتی سے لفظ لفظ ادا کرتا ہے لیکن آج اپنے خیالوں سے چونک کر جب اس نے اطراف میں دیکھا تو اسے کوئی نظر نہ آیا۔ گورا بھی جا چکا تھا۔ ویرانی اداسی اور پُراسرار خاموشی نے وقتِ رفتہ کے ہاتھوں سے ہریالی، خوشبو، آرائش اور گہما گہمی کی جگہ لے لی تھی۔ اس دھواں دھواں فضا میں مولسری کے درخت سے آہستہ آہستہ پھول گر رہے تھے۔

اس نے گھڑی بھی نہیں دیکھی وہ انتظار کی وجدانی کیفیت سے باہر نہیں آنا چاہتی تھی۔

لفظوں کی رم جھم کو محسوس کرتے ہوئے یک لخت آمنہ نے سوچا بہت وعدہ کر دیا جمیل نے۔

مجبوری!

کہیں کوئی مجبوری نہ ہو گئی ہو [illegible]

نہ ہو سکے۔ جیسے کچھ ہو رہا ہو یا کوئی بات پھر سے ستا رہی ہو۔ ایک ہی تو نہیں ہوتی کہ دوسری بھی ختم ہو جاتی ہے۔ کبھی اشتعال کی طرف سے تو کبھی قربت کی جانب سے ہو سکتا ہے کہ طوفان تیز بارش ہونے لگی ہو۔ یا موسم ہی تو آندھیاں چاروں طرف سے اٹھ آتی ہیں اور طوفان گھر سے ہو جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ گھر سے نکلا ہو اور بارش نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا ہو۔ اس وقت بھیگا بھاگا کسی چھجے یا دوکان کے کونے میں کھڑا ہو اور آنکھ، ناک، کان سے بوندیں ٹپک رہی ہوں، آنکھیں لب بھیگ بھیگ رہی ہوں۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے آسمان پر نگاہ ڈالی۔ لیکن مطلع بالکل صاف تھا بادلوں کا ہجوم کسی جانب سے اٹھتا نظر نہیں آیا۔ لیکن ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ ایک جگہ پانی برسے اور دوسری جگہ بالکل سوکھا پڑا ہو۔ زمین کے ہونٹ پیاس کی شدت سے تڑخ رہے ہوں اور قطرہ قطرہ کے لیے بے قرار ہوں۔ خدا بخشے ابا کہا کرتے تھے: "یہ سب قدرت کے کھیل ہیں بھائی ہماری سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ سوچ سوچ کے رہ جاؤ"۔ آمنہ کی نگاہوں کو قرار نہ تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھے جا رہی تھی۔ لیکن کسی بھی جانب سے اسے جمیل آتا ہوا نظر نہ پڑا۔ گھنے درختوں کی پھنگوں پہ سے سورج کی کرنیں غائب ہونے کو تھیں۔ تھوڑی بہت روشنی کسی وقت بھی معدوم ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ نقطوں کی چھاؤں میں ابھی اور رکنا چاہتی تھی۔ گھٹنوں پہ کہنیاں ٹیکے راستے کو ٹکر ٹکر دیکھے جا رہی تھی۔ جب اندھیرے نے اپنا پڑاو ڈالنا شروع کر دیا اور رستہ دھندلا دینے لگا تو ایک انجانا خوف اس کے اندر جگنے لگا۔ عورت ذات ہونے کا خوف۔ ان جھاڑیوں میں سے کہیں کوئی نکل نہ آئے۔ انسان یا حیوان انسان بھی تو حیوان بن جاتے ہیں۔ اکثر و بیشتر۔ یہ سوچتے ہی اسے لگا جیسے کتنے ہی بچھو اس کی ٹانگوں پہ رینگ رہے ہوں خوفِ خیال سے جھرجھری آ گئی۔ دل جو کانپا تو گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھی اور تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف ہو لی۔

رات کو جب بستر پر لیٹی تو جمیل کا چہرہ آنکھوں میں اتر آیا۔ اس نے سوچا اس کے بارے میں اتنا نہ سوچے، اتنا نہ سوچے لیکن دل کو اختیار ہو تب نا۔ پھر نہ جانے کب اس نے نیند کی کشتی کو خوابوں کے سمندر میں چھوڑ دیا اور اللہ کے سپرد کر دیا۔

اگر نقطوں پہ بھروسہ ہو تو کب سے وہ تیار ہو جاتی اور انتظار کے [illegible] شکست اور گھٹن والی [illegible] کی عمارت کی آنکھوں [illegible] امید کے

ٹیلے پہ بیٹھی پھر اسی جگہ آن رکی۔ اسے یقین تھا کہ سب کچھ پہلے بھول جائے لیکن [illegible] اپنی پہچان نہیں بھول سکتا۔ تخیل کی نگاہ جو اٹھی تو فاصلہ قربت میں بدلا۔ اسے لگا جیسے جمیل دبے پاؤں پیچھے سے آ رہا ہے۔ قدموں کی چاپ مٹی میں مل رہی ہے۔ غیر موجودگی میں موجودگی کو خود سے [illegible] وہ اپنے جذبے کی پھوار میں بھیگ گئی۔ گرم گرم سانسوں کو گردن پر جو محسوس کیا تو دھڑکن تیز ہونے لگی۔ پلٹ کے دیکھا تو کسی کو نہ پایا۔ گھبرا کے اپنے خیال کی اسیری سے خود کو بچانا چاہا۔ پھر نگاہ راستے کو تکنے لگی۔

اگر راستہ دیکھنے سے رستے پہ لوگ آ جاتے تو جمیل ابھی تک آ چکا ہوتا۔

آہٹ کا انتظار ختم نہیں ہوا۔

وہ خود کو سنتی رہی۔

ایک اور خیال کے آتے ہی وہ کانپ اٹھی۔ کہیں کسی فسادی نے اسے نہ روک لیا ہو۔ کمبخت ذہن میں فساد کی آگ جلتی ہی رہتی ہے۔ چلتے چلتے کچھ بھی ہو جاتا ہے۔ آناً فاناً سب کچھ تہس نہس ہو جاتا ہے۔ دیر ہی نہیں لگتی نہ جانے کون کون سے جذبے کب اور کہاں وار کر دیتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے تلواریں، بندوقیں، نیزے، تہہ زمین سے تہ تیغ کرنے کے لیے نکل آتے ہیں۔ صبح کا چہرہ کچھ ہوتا ہے تو شام کا کچھ اور۔ ہاں! آج ہی کی تو بات ہے جب اس نے صبح کی خبروں کے لیے ٹی وی کھولا تو کس شہر میں، کس جگہ، نہیں، نہیں دوسرا، کوئی اور جگہ تھی، یاد ہی نہیں!

اتنے فسادات ہونے لگے ہیں کہ یاد کا احاطہ بھی چھوٹا پڑتا جا رہا ہے۔ نیوز میں دکھایا تھا کہ اسکول کی بس میں چڑھتے ہوئے ایک بچے پہ تلوار کا وار جو پڑا تو ایک ٹانگ نیچے ایک ٹانگ اوپر، کتابوں کا بستہ خون میں لت پت۔

"آمنہ خدا کے لیے ٹی وی بند کر دے۔ دیکھ دیکھ کر میری جان ہی نکل جائے گی"

آمنہ کے کان اماں کی آواز سے چپکنے لگے۔ اے خدا میرے جمیل کی حفاظت کرنا، اس کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔ اس نے اوڑھنی سے سر کو ڈھکنا چاہا لیکن وہ بار بار پھسل جاتی۔ کمبخت یہ نائیلون بہت پریشان کرتا ہے۔ اپنی جگہ ٹھہرتا ہی نہیں۔ اس کا دل نہ جانے کتنے وسوسوں سے [illegible] لگا خوف کی انتہا [illegible] تو وہ ایک دم [illegible] سے اٹھی اور گھر کی طرف چل دی۔

راستے میں [illegible] اور [illegible] کا خوف [illegible] تھا آمنہ۔

ان کو سن مل نت چوٹا تو پر گیا گھر اتنی بڑی کہ دھنی لیکن وہ تو خوف ناک آوازوں کے شور میں گھری ہوئی تھی۔ جلدی جلدی قدم بڑھاتی، حواس باختہ سا گھر کا دروازہ کھول کر اس میں گھس گئی۔ اماں کی موتیا بھرا آنکھوں میں نہ جانے کہاں سے اتنی روشنی آجاتی تھی کہ وہ اپنی بچی کا چہرہ پڑھ لیتی تھیں

"کیا بات ہے آمنہ؟"

"کچھ نہیں اماں، کچھ بھی تو نہیں۔"

اماں چپ ہو گئیں۔ اس خاموشی میں کتنے وسوسے، خوف، اور سہمے چھپے چھپی ہوئی تھی، دعائیں ہونٹوں میں گم ہو گئیں۔

میری آمنہ کے لئے ایک اچھا سا لڑکا ملا دے میرے مولا۔

انتظار کی آہٹوں کو گنتے گنتے ایک دن جیسے ہی رفو پھوپھی کا خط ملا، اماں کی آنکھوں سے خوشی کے جھر جھر آنسو بہنے لگے۔ وہ آفتاب میاں کا رشتہ آمنہ کے سامنے کرنے کے لئے آرہی تھیں۔ دیوار پر چڑھی لوکی کی بیل جس کو وہ کئی دن کی جان سے سینچ رہی تھیں اسے توڑ کر حلوہ بنانے میں مشغول ہو گئیں۔ حلوہ بن جانے پر بادام کی ہوائیاں بھی چھڑک دی تھیں۔ اب کھانے والوں کا انتظار تھا۔

دروازے پر جیسے ہی تانگہ رکا۔ اماں دوڑی دوڑی پھولی سانسوں کے ساتھ دہلیز تک گئیں۔ خوشی میں دروازے کی کنڈی کھولنے میں ہنسی آرہی تھی۔ جیسے ہی کھلی آفتاب میاں اور رفو پھوپھی گھر میں داخل ہوئے۔

"السلام علیکم"

"جیتے رہو بیٹا" وہ اپنے خیال میں ان کو داماد بنا چکی تھیں۔ دل سے دعائیں دینا چاہتی تھیں۔ ان کو دیکھتے ہی ان کے سینے میں یک وقت بجھتی ہوئی امیدیں امنڈ آئیں اور خوشی کے ننھے ننھے چراغ جل اٹھے آفتاب میاں کی بے قرار نگاہیں آمنہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ نہ جانے کس کونے میں چھپی بیٹھی ہے۔ ارے بھئی شرمانا لجانا اچھا تو لگتا ہے لیکن اتنا بھی نہیں۔ اب ہم سے کیسا پردہ، اپنا رخ حسین دکھا بھی دو وہ مسکرا اٹھے۔ کسی فلمی گیت کا رومانی فقرہ گنگنانے ہی والے تھے کہ ان کی نظر کونے میں رکھے ٹی وی پر پڑی، فوراً بول اٹھے

"اے خالہ جان ٹی وی خرید لیا آپ نے، رنگین یا بلیک اینڈ وائٹ؟"

"رنگین تصویریں ہی جان چڑھتی ہیں" انہوں نے آنکھوں پہ پٹی کا چھجہ بنا کر ان کی طرف دیکھا اور ہاں یہ پنکھا بھی لگوا لیا ہے۔

سب کچھ آمنہ کا رشتہ ہی رہنے دے۔ خدا کے فضل سے دفتر میں [illegible] لگا ہے وہ کون پڑھ رہی تھیں۔

آفتاب میاں کی نگاہیں ایک ایک چیز کو دیکھ کر جھوم رہی تھیں وہ واقعی خوش تھے۔ لیکن ابھی اور خوش ہونا چاہتے تھے۔

"آمنہ کہاں ہے [illegible] آئی کے دن ہیں ہو چلا آئے بغیر مزہ سا کر ایسا کیوں ہے۔ [illegible] جیسے ہی گھر والے سمجھتا تو پیچھی نظروں سے ہی اماں بولیں۔

"لبس آتی ہی ہوگی۔"

جیں بل انہوں نے کہا انہیں لگا جیسے انہوں نے [illegible] کہا۔

"کب تک آئے گی؟ بہت دیر کر دی۔ آفس کا ٹائم تو کب کا ختم ہو چکا"

ابھی.... ہاں.... ہاں، ابھی....

"وہ مجوئیاں کیسی ہیں؟ بہت دنوں سے کچھ خیر خبر نہیں۔ بچی ہیں یا اللہ کو پیاری ہو گئیں؟"

سوال کو ٹالنے سے بچانے کے لئے انہوں نے جلدی سے بات بدلنا چاہی۔ لیکن ترچھی نظروں سے دروازے کو دیکھ نہ بھولیں ایک ذرا سے کھٹکے پہ چونک پڑیں۔ اضطرابی کیفیت جو بڑھی تو کھانی اٹھ آئی۔ بیچ میں بولتی جاتیں۔

"آنے ہی والی ہے"

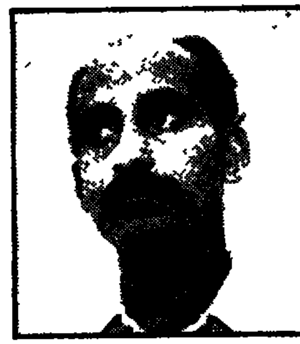
رفو پھوپھی کی استفہامیہ نظریں پہلے ہی رگ رگ میں گڑ رہی تھیں۔

"کیا روز اسی طرح آتی ہے؟" "روز" کے لفظ کو آفتاب میاں نے زور سے کھینچا۔ ایک ایک حرف میں شک اور بدگمانی کی چنگاریاں بھری ہوئی تھیں، ان کے تیور بدلنے لگے، وہ جواب کے منتظر تھے۔ سوال کی اذیت سے بچنے کے لئے اماں گھبرا دی اور بے رنگ ہونٹوں پر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگیں۔ پھر دروازے کی چوکھٹ پر ان کی نگاہ ٹھہر گئی۔

رفو پھوپھی اور آفتاب میاں خاموشی سے ان کے چہرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

◆ بقیہ صفحہ جنازہ ◆

ہم نے جواب طلب کیا تو ہم [illegible] لوگوں نے [illegible] ہمارے [illegible]



بدر عالم خلش

آنکھیں بھی میں ہوں خواب بھی میں تو نہیں ہے وہ
تاریک شب کا لمس ہے گیسو نہیں ہے وہ

ٹھہرا ہے کب سے بیچ گگن پُر نما کا چاند
پلکوں سے اشک پونچھ کہ جگنو نہیں ہے وہ

میں سوچتا تھا چھو کے کوئی نام دے سکوں
تحلیل کیسے ہو گیا خوشبو نہیں ہے وہ

یہ غم بھی بے سحر نہیں تنہائیاں نہ تول
یکجا ہیں تین تارے ترازو نہیں ہے وہ

ہے سامنے خلش وہی صد رنگ دھوپ چھاؤں
اب تم یہ کہہ رہے ہو کہ جادو نہیں ہے وہ

● مکان ۲ - بلاک ۳ - شاستری نگر، جمشید پور - ۸۳۱۰۰۵



روی ضیا

فصیلِ جسم کی حد سے ذرا گذر کے دیکھ
جو ہو سکے تو مجھے پھر تلاش کر کے دیکھ

یہیں کہیں سے سمندر پلٹ گیا ہوگا
یہ گیلی ریت ذرا مٹھیوں میں بھر کے دیکھ

دلوں کی بستیاں زندہ ہیں خاکساروں سے
انا کے زینے سے اک بار تو اتر کے دیکھ

کہاں کہاں تری خوشبو کے تذکرے ہونگے
ہوا کے ساتھ سرِ رہگذر بکھر کے دیکھ

خزاں کے بعد بھی آتی ہے پھر بہار ضیا
بدل کے زاویے دہشت زدہ نظر کے دیکھ

● ۲۳۷ - گھر تھولی محلہ، پٹھانکوٹ - ۱۴۵۰۰۱ (پنجاب)

ثمر کبیر

میرے ہاتھوں کی لکیروں سے اجالا نکلے
اپنی سرحد سے اگر پاؤں ذرا سا نکلے

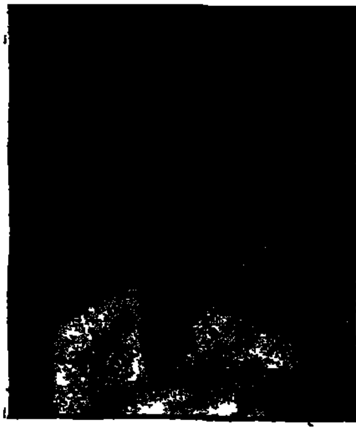
یوں میری روح میں چبھتا ہوا کانٹا نکلے
یہ تو جب ہو کہ کوئی ٹھوس نتیجہ نکلے

پھیل جاؤں گا ہر اک سمت میں پانی کی طرح
میرے اندر سے اگر کوئی جزیرہ نکلے

میرے کاندھوں سے کوئی بوجھ سرک جاتا ہے
جب بھی اسکول سے ہنستا ہوا بچہ نکلے

آج تو آنکھ کے رستے سے لہو بہتا ہے
کل یہ ممکن ہے میرے پاؤں سے دریا نکلے

● ۸ مردار گیٹ اجین - (ایم - پی)



عشرت بیتاب

ذیب کدہ، جہانگیری محلہ، آسنسول ۳۰۲ ۱۳ء

نیرنگِ پیرہن

لیلیٰ صوری اعتبار سے جیسی بھی تھی پر معنوی ہیئت سے بلند، عظیم اور نفس شخصیت کی مالک تھی۔ صورت کا کیا لینا، صورت تو خود تخلیق کی نہیں جاتی ___ تخلیق کار کا برش جہاں ذرا تھوڑی دیر کہیں رکا کہ بس رنگ پھیل گیا، کینوس پر برش کی گرفت ذرا ڈھیلی پڑی اور بس صورت بگڑ گئی۔ رنگ بکھرا ہو گیا ___ مگر رنگوں کا کیا، رنگ تو اترتے چڑھتے رہتے ہیں۔ ہاں! معنوی ہیئت پر تو اس کی بھرپور گرفت تھی اس پر وہ گہری اترتی۔ بلند اور قدآور دکھائی دیتی۔ وہ ہمیشہ اپنی انا کی قدر کرتی ___ اس کی آواز پر لبیک کہتی۔ پر آج وہ اندر سے ٹوٹ ٹوٹ سی گئی تھی ___ اداس اداس سا سیاہی مائل چہرہ اور چہرے پر زمانے کی دھول ___ وہ آئینے سے گھبرا کر بھاگی۔ آئینے کی سچائی سے آنکھ ملانے کا حوصلہ اس میں نہ تھا۔

وہ بھاگتی رہی، بھاگتی رہی ___ پر بھاگ کر جاتی کہاں ___ لے دے کے بس ایک قیس ہی رہ گیا تھا جو اس کی قدر کرتا، اس کی صورت اور عظمت کو تسلیم کرتا۔

کیوں نہ کرتا ___ پرائمری سے ہائی اور ہائی سے ڈگری تک کی تعلیم ایک ساتھ لی تھی اور قیس اپنی نوعمری سے ہی اسے پڑھ بھی رہا تھا۔ ورق ورق پڑھ گیا پر جب اس نے اس کے کسی ورق پر اپنا نام نہیں پایا تو خود کو اپنی ذات میں سمیٹ لیا۔

وہ قیس کے ڈرائنگ ہال میں اس کی منتظر تھی شاید قیس دن بھر کے کینوس پر آڑی ترچھی، بے معنی لکیروں سے اکتا کر تر و تازہ ہونے کو باتھ روم سے جا چکا تھا۔ کینوس آڑی ترچھی لکیروں سے بھرا پڑا تھا اور رنگوں کی بو پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی ___ زندگی، اور زندگی کے مختلف زاویے ___ احتجاج اور احتجاجی نعرے ___ موت، خاموشی، حکمت، رغبت ___ کینوس اپنے اندر ایک دنیا سمیٹے ہوئے تھا پر لیلیٰ کے لیے ان میں کشش کی کوئی چیز نہ تھی، اسے تو ان رنگوں کی آمیزش پر بھی تخلیق کار سے اتفاق نہ تھا۔

یہ گول گول ابھرے ابھرے سے دائرے، دائروں کے درمیان گہرے سیاہ داغ اور داغ کے نیچے، کچھ اور نیچے شرم و حیا کی باریک چادر میں لپٹی ایک دوشیزہ، اپنی کسمپرسی کی داستان لئے کہیں گم تھی۔

دو مخالف جنسوں کے بن گوشت پوست کے ڈھانچے ___ ان ڈھانچوں کے درمیان جھولتی ہوئی تیسری تخلیق ___ جس کی شناخت بھی ممکن نہیں ___ تخلیق کار کی رنگین طبیعت نے کینوس کو توے کی طرح گرم کر رکھا تھا۔

بے چہرہ لوگ، چہرے جنس زدہ ___ بے چہرگی، پشیمانی، بے راہ روی کے شکار لوگ، یہ غیر منقسم افراد ___ جیسے رنگوں کا لیپ لئے بے جان لاشیں پڑی ہوں۔

"کیوں کیا ہوا؟" ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے قیس نے کہا۔ "تم کب آئیں ___ ان تصویروں میں کیا ڈھونڈ رہی ہو؟"

"تم باتھ روم سے چپکے تھے اور میں تمہیں ان بے جان تصویروں میں ڈھونڈ رہی تھی" لیلیٰ نے وضاحت کی ___ "پر تم باتھ روم سے سیدھے ڈرائنگ روم میں کیسے چلے آئے"

"تمہاری خوشبو ___ مجھے نیم عریاں یہاں کھینچ لائی"

"تم مرد ہو ___ مرد کو پھیلنے کی اجازت ہے ___ یہ تو بس ہم عورتوں کو سمٹ کر رہنے کی تلقین کی جاتی ہے ___ ویسے تم ان تصویروں میں بھی پوری طرح پھیل گئے ہو ___ تم مردوں کی رال ٹپکانے کی عادت کبھی نہیں جائے گی"

"نہیں ایسی بات نہیں! تصویر کو من و عن دیکھنے کے لئے اس کا برہنہ رہنا لازمی ہے ___ جسے تم عریانیت کہہ رہی ہو ___ وہ حقیقت ہے اور تم حقیقت سے فرار چاہتی ہو اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتیں۔"

"نہیں بابا —— میرا مطلب تم غلط نکال رہے ہو"

"اگر یہ صحیح نہیں ہے تو پھر حقیقت سے منہ چھپائے یہاں تنہا کیوں پڑی ہو —— ان کا سامنا کیوں نہیں کرتیں —— یا پھر انہیں ہی اپنے پاس بلوالیتیں۔"

"بلانے سے جو آئے تو مزہ کیا"

"تب خود چلی جاتیں، سپردگی میں تو مزہ ہے"

"وہ تخلیق کاروں میں یہی تو خامی ہے کہ جہاں جتنا رنگ چاہا لیپ دیا سچویشن کی نزاکت ملحوظ نہیں رکھتے —— شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے کینوس پر پھیلے ان رنگوں سے سخت نفرت ہے"

"لیکن تم تو خود ایک رنگ ہو جس میں چاہو مل کر اسے اپنے رنگ میں رنگ لو"

"نہیں، مجھے اپنے رنگ میں کوئی جاذبیت دکھائی نہیں دیتی اسلئے کسی کو اپنے رنگ میں ڈالنا نہیں چاہتی"

"تو پھر خود کو دوسروں کے رنگ میں ڈھال لیتیں"

"ایک بار رنگ بکھرنے کے بعد اس میں سمٹنے کی قوت کہاں —— مگر تم ان بکھرے رنگوں سے اسٹے نیڈے خط کیوں کر کھینچ لیتے ہو وہ بھی اپنی مخروطی انگلیوں سے برش کو نچا نچا کر —— کاش! تم نے ایک خط اپنی حدود زندگی تک بھی کھینچ لیا ہوتا"

"زندگی کی حدوں سے ڈرتا ہوں"

"ڈرتے ہو یا فرار چاہتے ہو؟"

"بات ایک ہی ہے دونوں صورتوں میں نقصان خیر، چھوڑو ان باتوں کو، ان دائروں سے باہر نکلو اور کہو تمہارے ان کا کیا حال ہے؟"

"ان کا؟ —— وہ تو ماڈلنگ میں مصروف ہیں، اس وقت بھی دور کہیں اپنے نئے ماڈل کے لئے کسی اچھی صورت کی تلاش میں ہوں گے پر وہ اپنی صورت پر نہیں اترتے"

"تم دوسری صورت کیوں نہیں نکال لیتیں؟"

"دوسری صورت؟ —— اپنی اس صورت سے بہتر ہو گی؟ ممکن ہے اس سے بھی بھیانک ہو —— ہاں! اس صورت پر تم جیسے تخلیق کار کا برش چل جائے تو شاید کینوس پر ماحول کی رنگینی قائم رہ سکے"

"رنگوں کا تو مقدر ہے پھیلنا —— وہ پھیل کر ہی اپنے وجود کا ڈنکا بجاتا ہے"

"اور تم اس ڈھنگ کی جوب پر ہی بھوں کو نچاتے ہو لیکن تم بھول گئے؟

ہم عورتیں ہی تو مردوں کو ہمیشہ نچاتی آئی ہیں مردوں کو اپنی انگلیوں پر نچانا ہماری شان رہی ہے"

"شان نہیں مجبوری"

"وہ کیسے؟"

"اب مداری کو ہی لے لو —— اگر بندروں کو نہ نچائے تو کیا کھائے بھوک اس کی مجبوری ہے جو اسے بندروں کو نچانے پر مجبور کرتی ہے تم عورتوں کو بھی شاید بھوک ہی مردوں کو نچانے پر مجبور کرتی ہے"

"تم وکیل ہوتے تو شہر کا ہر مقدمہ تمہارے ہاتھ ہوتا"

"لیکن یہاں تو ایک ہی موکل کو پھانسنا مشکل ہو رہا ہے"

"تمہیں میں موکل نظر آ رہا ہوں؟ —— کاش! تم نے مجھے اپنی کسی شاہکار تخلیق کے لئے کینوس سمجھا ہوتا تو شاید رنگوں کی اجتماعیت سے ایک نیا رنگ ابھرتا۔"

اور پھر رنگ کا جزدان ادھورے کینوس پر پوری طرح پھیل گیا پھیلتا گیا —— اس طرح صورت اپنی معنوی ہیئت کو کر خلاقی سانچے میں ڈھل گئی اور اپنی اعلیٰ شناخت کھو بیٹھی۔

بقیہ صفحہ ۷ کچھ محاوروں کے متعلق

"مابعد جدیدیت نے سیاق میں نت نئے موضوعات کی کنواری برف توڑ رہی ہے" (سماجی توازن، ایگو، نمبر ۲۳، ۱۹۹۲ء)

یہاں محاورہ کنواری برف انگریزی کا ترجمہ ہے لیکن جچتا نہیں اور زبردستی استعمال کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

یہ ادیب اصل میں ذولسانین ہیں اور انگریزی میں بھی لکھتے پڑھتے ہیں ہمارے یہاں انگریزی کے نصاب میں PHRASES IDIOMS اور PROVERBS پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اس لئے اردو میں لکھتے اور بولتے وقت بھی یہ ذہن میں آ جاتے ہوں گے اور اس طرح سے کبھی کبھی ان کے تراجم کا استعمال ہوتا ہے لکھنے والے کو اپنی بات کہنے میں بھی ان سے شاید کچھ آسانی ہو جاتی ہے لیکن انہیں پڑھتے وقت ذولسانین کو اکثر اصل انگریزی محاورے تو یاد آ ہی جاتے ہیں۔

اردو ہندوستان ہے
ہندوستان اردو ہے

ترنیم

راشی فدائی کی طبعی عمر کم ہے (پ ۱۹۶۹ء) لیکن ذہن کے آفاق دور تک پھیلے ہوئے اور بہت روشن ہیں۔ وہ ماضی و حال میں الجھے ہوئے نہیں ہیں۔ بلکہ آگے بہت آگے کی طرف جست لگانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ غزل، نظم اور خصوصیت سے نعت پاک میں فنی و فکری ہر دو میں بھی کسی مقام پر خفی یا ظاہر طور پر حسن شعری اظہار میں نکھر ابھرا ہے۔ خواب در خواب تخلیقی نور، نت نئے جہان آباد کو ابھارتا ہے۔ حرف و لفظ کی نازک مدتیں ہر سمت سے وسیع تر خیال کی حیرت انگیز لطافتوں کو سہارنے میں کامیاب ہیں۔ راشی فدائی کے زیر نظر مجموعہ "ترنیم" میں شامل نعتیں، غزلیں اور آزاد نظمیں اپنے آپ میں خاصہ مختلف شعری لوازمہ رکھتی ہیں۔ اور قاری، ناقد، سامع کو اس کے حسن تو کا پتہ دیتی ہیں۔ راشی فدائی کی شاعری پر کئی پہلوؤں سے بحث ہو سکتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ شعریت یا تغزل کے باب میں کہ شاعر اپنی شعری شخصیت کے چیستاں میں الجھ گئی ہی کو سب کچھ کہتا ہے۔ یا پھر ایجاز و اختصار میں حرف و لفظ و استعارہ دار بنا دیتا ہے کہ خارج کے ہلکے سے لمس سے جھنکاریاں پھوٹ نکلیں۔ ترنیم میں شامل دس نظمیں متوجہ کرتی ہیں ایک حدیث پاک کہ "حضور کی سواری اور بدفعالی اسلام میں نہیں ہے" کو نظم "ایڈس" میں تخلیقی روپ دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید اور ظفر رضوی برق نے راشی فدائی کی شخصیت اور شاعری پر مضامین تحریر کئے ہیں۔ جو کتاب میں شامل ہیں اور کتاب کے آخر میں شعری مجموعے "ناتمام" پر مشاہیر کی آرا کو شامل کیا گیا ہے۔ رزاق افسر نے ترنیم کی اشاعت پر ایک نظم کہی تھی۔ وہ بھی کتاب میں شامل ہے۔ راشی فدائی کی شاعری مگر ان تمام تحریروں کی محتاج نہیں۔

ضخامت ۲۰۰ صفحات ★ قیمت ۲۰٫۰۰ روپئے ★ مطبوعہ ۱۹۹۰ء ★ پتہ ۶-۳-۳۳ مدینہ پان الدین اسٹریٹ کڈپہ ۵۱۶۰۰۱

علامہ اقبال (منتخب کلیات)

مقتدرۂ قومی زبان (اسلام آباد) کی طرف سے مشاہیر اردو کے عنوان سے کتابچوں کی اشاعت کا ایک سلسلہ جاری ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اردو کے ممتاز اہل قلم کے بارے میں اہم معلومات جدید تحقیقی انداز میں اختصار کے ساتھ پیش کیا جائے تاکہ ان اکابر کی، جنہوں نے اپنی ساری زندگی اردو زبان و ادب کی خدمت میں وقف کئے رکھی ہے۔ علمی و ادبی خدمات کی تفصیلات اس طرح یکجا ہو جائیں کہ زبان و ادب کے طلبا، عام قارئین اور محققین پوری طرح استفادہ کر سکیں۔ زیر نظر کتابچہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جس میں علامہ اقبال کی علمی و ادبی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اقبالیات ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صحیح معنوں میں اقبالیات کے باب میں تحقیقی اضافے کر رہے ہیں۔ ان کی کئی گرانقدر کتابیں اقبال پر کام کرنے والوں کے لئے بنیادی ماخذ بن گئی ہیں۔ اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ اقبال کے بارے میں اردو میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ ان سب کی سمائی کے لئے کئی دفتر درکار ہوں گے۔ چنانچہ اس مختصر کتابچے میں صرف منتخب اندراجات شامل کئے گئے ہیں۔ تب بھی یہ ایک خاصے کی حوالہ جاتی کتاب بن گئی ہے۔

★ ضخامت: ۵۸ صفحات ★ قیمت: درج نہیں ہے ★ مطبوعہ ۱۹۹۳ء ★ پتہ: مقتدرۂ قومی زبان، ۴۰ — ڈی (غربی) الحمرا یا ایف — ۶ اسلام آباد (پاکستان)

شیرازہ (اقبال نمبر)

۱۹۷۷ء میں اقبال صدی کے موقع پر ہند و پاک کے کئی ادبی رسائل نے اپنے اپنے "اقبال نمبر" شائع کئے تھے۔ صدی تقریبات کی گہما گہمی میں صوبہ جموں کشمیر کے سرکاری غیر سرکاری اداروں نے بھی علامہ اقبال کو پوری عقیدتوں کے ساتھ اپنا خراج پیش کیا تھا۔ کلچرل اکاڈمی جموں و کشمیر نے اپنے مختلف النوع پروگراموں کے ساتھ ادبی ترجمان 'شیرازہ' کا ضخیم 'اقبال نمبر' شائع کیا تھا۔ جس کی پذیرائی ہوئی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی دوبارہ اشاعت کا اصرار بھی تیز ہو گیا تھا۔ چنانچہ تجدید مکرر کے طور پر اقبال نمبر کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔ زیر نظر نمبر میں اشاعت اولین کی کچھ کم مفید چیزوں کو ترک کر دیا گیا ہے۔ جن میں اقبال کے متعلق منظوم خراج عقیدت شامل تھے۔ اس دوسرے ایڈیشن میں کچھ تازہ مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ جنہیں کشمیری اقبال پسندوں نے تحریر کیا ہے۔ ان میں سے بعض مضامین اقبال شناسی کے لئے بہت اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۲۴ فکر انگیز گرانقدر مضامین بہت منتخب ہیں۔ جس نادر و کمیاب تصاویر سے نمبر کو سجایا گیا ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ کوئی مضمون اس میں بھرتی کا نہیں ہے اس طرح شیرازہ کا 'اقبال نمبر' اپنے آپ میں ایک وسیع دستاویز بن گیا ہے۔ بقول محمد یوسف ٹینگ "نئے حالات و حوادث نے کشمیر سے متعلق اقبال کے افکار اور ان کی اشارتوں کو کئی نئے مفاہیم عطا کئے ہیں۔"

★ ضخامت ۳۲۰ صفحات ★ قیمت درج نہیں ★ مطبوعہ ۱۹۹۳ء (دوسرا ایڈیشن) ★ پتہ ایڈیٹر شیرازہ (اردو) جموں اینڈ کشمیر اکاڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز لال منڈی، سرینگر (کشمیر)

کپل وستو کا شہزادہ

۱۹۶۰ء کے بعد اردو افسانے کی افق پر بہت خاموشی سے ابھرنے والوں میں ایک نام اے خیام (کراچی) کا بھی ہے۔ اپنے پہلے افسانے 'آدم خور' (مطبوعہ تخلیق دہلی — ۱۹۶۳ء) سے تا حال، خیام نے بہت ٹھہر ٹھہر کر، کم کم لکھا ہے۔ تاہم ان کے ہر افسانے نے سنجیدہ قاری کو اپنی طرف متوجہ ضرور کیا ہے۔ زیر نظر مجموعہ ان کے ۱۵ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اور ان افسانوں سے مجموعی طور پر ایک خوشگوار تاثر بنتا ہے۔ کسی بھی اچھے فنکار کے لئے تخلیقی گم شدگی بہت ضروری ہوتی ہے۔ یہ ایک فطری وصف ہے۔ جو کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ مصنوعی قلمکاروں کی بھیڑ، مصنوعی تحریروں کے انبار اور بے ضرر کتابوں کے انبوہ میں اگر اے خیام جیسے تازہ کار فنکاروں کی کوئی کتاب آتی ہے۔ تو روح سرشار ہو جاتی ہے۔ حالیہ برسوں میں اے خیام کی چیستاں سیریز نے معیاری افسانے کے قاری اور ناقدین کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس سیریز کے چاروں افسانے بعض عصری مجموعی پہچانوں کو پورے فنی ادراک کے ساتھ ابھارنے میں کامیاب ہیں۔ کہانی 'کپل وستو کا شہزادہ' ہو یا 'گوتم مشکل میں' کوئی بھی افسانہ محض لکھنے کے لئے نہیں لکھا گیا بلکہ تمام افسانوں میں تخلیقی پہلو اپنی پوری جزویات کے ساتھ، مربوط اور بے حد گٹھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ افسانے چیستاں نہیں ہیں۔ موضوع و مواد کی اکائی اسلوب کو جنم دیتی ہے اور اسلوب اظہار کو۔ اے خیام کے افسانوں میں پایا جانے والا اسلوب حشو و زوائد سے تقریباً عاری ہے۔ وزیر آغا کے تعارف کے ساتھ 'میں اور میں' (علی حیدر ملک) اور 'میں اور میں' (اے خیام) فکر انگیز تحریریں ہیں۔ افسانہ نگار کی شخصیت، فن اور عصری اردو افسانے پر بہت ساری کام کی باتیں ان دو مضامین میں آگئی ہیں۔

★ ضخامت ۲۰۰ صفحات ★ قیمت ایک سو روپئے ★ مطبوعہ ۱۹۹۳ء ★ پتہ منتظر پبلی کیشنز، اے — ۳۶۰ واجد اسکوائر، بلاک ۱۳، گلشن اقبال، کراچی

دھوپ کا پیلا کفن

۲۳ سال سے برطانیہ میں مقیم پاکستانی شاعر اطہر راز کا یہ دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ (کلی اور کرن — پیش لفظ فیض احمد فیض) انہوں نے نثر میں طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور ناول لکھے ہیں۔ بچوں کا ادب بھی تخلیق کیا ہے۔ چین کے عظیم شاعر تو تو کی شاعری کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ زیر نظر شعری مجموعے کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں طویل نظم "سفر اپنی ذات کے اندر" دی گئی ہے۔ اس کے ۷۷ بند ہیں۔ اور ہر بند ۷ مصرعوں پر مشتمل ہے۔ اس طویل موضوعاتی نظم پر مصری ہر اردو ادب کے نامور شعرا اور مشہور ناقدین اظہار خیال کر چکے ہیں۔ جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، علی سردار جعفری، ظ انصاری، ممتاز حسین وغیرہ ۱۴۰ نام شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں طویل و مختصر ۵۵ نظمیں اور صرف تین غزلیں دی گئی ہیں۔ ان نظموں کے موضوعات میں تنوع بھی ہے اور شاعری بھی۔ گوئٹے، ٹی ایس ایلیٹ، شیکسپیئر، اقبال، میر تقی میر، فیض احمد فیض، کشور ناہید اور مولانا مودودی پر کہی گئی نظموں میں سرسری تاثر کے بجائے معنوی سطحوں کو تہہ در تہہ فکری ابعاد دئے گئے ہیں۔ بیشتر آزاد نظمیں، خیال اور جذبے کی اکائی میں خود کو محسوس کرواتی ہیں۔ اطہر راز کا شعری وژن وسیع تر ہے۔ وہ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو فلسفہ نہیں بناتے بلکہ انہیں شاعری بنا دیتے ہیں۔ اور شاعری میں بھی مصنوعی لفظیات و تراکیب سے گریز کرتے ہیں۔ ★ ضخامت ۱۴۲ صفحات ★ قیمت درج نہیں ★ مطبوعہ جولائی ۱۹۹۳ء

21, COL WOOD GARDENS, COLLIERS WOOD, LONDON -

★احمد سہیل — 7520 - COOK ROAD, # 2210 HOUSTON, TX 77072 (USA)

"آئینہ لفظ لفظ" کے تحت مختار صدیقی اور الم مظفر نگری کے خطوط پڑھ کر بہت سی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ الم صاحب کے متعلق محمود مستری محترم صبا متھراوی صاحب باتیں کیا کرتے تھے۔ ان کے شعر سناتے تھے۔ مختار صدیقی کے ایک مجموعہ کلام "منزلِ شب" کا ذکر کیا گیا ہے۔ حالانکہ پچھلے دنوں ان کا مجموعہ کلام "آثار" کے نام سے لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ مختار صاحب بلاشبہ نظم کے بڑے شاعر تھے۔ لیکن جس طرح ہمارے یہاں بددیانت نقادوں نے تابش الحیری، باقی صدیقی، بانی، فرید جاوید، شکیب جلالی اور سارہ شگفتہ کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ ایسی ہی بے انصافی مختار صدیقی کے ساتھ بھی ہوئی ہے۔ ن م راشد، میراجی، یوسف ظفر، تصدق حسین خالد اور مختار صدیقی نئی نظم کے عناصر خمسہ ہیں۔ آج کے بدلتے ہوئے معاشرے کے سیاق میں مختار صاحب کی شاعری کو پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نصف صدی قبل جو باتیں اپنی نظموں میں کہہ گئے وہ کتنی سچی ہیں۔ سید محمد عقیل کا مضمون "کہانیاں کیوں لکھتے ہو اور کس لئے؟" اس لئے پسند آیا کہ انھوں نے اصل موضوع کو جتلائے بغیر بہت کام کی باتیں کہی ہیں۔ میری مراد انھوں نے "سوشیالوجی آف ریڈنگ" کے موضوع کی سنجیدہ لفظوں میں تفہیم کی ہے۔ جبکہ اسی مضمون میں فکری معنویات اور رموز کی افسانوں میں موجودگی کا بھی سراغ لگاتے ہوئے انسانی ذہن کی سطحوں کی جو بات کی ہے وہی کسی افسانے کی فکری پرتیں نہیں بن جاتی ہیں۔ ارشد عبدالحمید نے "جدید تر نسل سے کچھ سوال" کے عنوان سے جدید کہانی پر جو کچھ کہا وہ اسلئے اہم ہے کہ انہوں نے "ترقی پسندی یا جدیدیت" کے نعرے سے زیادہ "انسان" کو اہمیت دی ہے۔ یہاں یہی وہ اظہار ہے جو قدیم داستانوں سے لے کر اب تک کسی نہ کسی طرح ہمارے جدید ترین افسانوں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ راشد نے افسانے کی تنقید کی جس افسوسناک صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے یہ تمام باتیں توجہ طلب ہیں۔ ان کی باتوں کی صداقت پر اس لئے بھی یقین آتا ہے کہ انہوں نے بغیر کسی خوف کے وہ باتیں لکھ دیں جو بڑے بڑے نہیں لکھ پاتے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ افسانہ کی تنقید اردو میں بہت کم ہے۔ اور جو کچھ بھی ہے وہ ادب کے "اشرافیہ" کے ہاتھوں میں ہے جہاں چھوٹے موٹے نقاد پانی بھرتے ہیں۔ انہوں نے یہ غلط نہیں لکھا "نئی نسل خود اپنا ذہن اپنا نظریہ اور اپنا ادبی رویہ رکھتی ہے۔" ہری بھٹناگر کی کہانی میں بنیادی جوہر اظہار کی بے ساختگی ہے "تلوار" کا سفاکانہ استعارہ انہوں نے خوب استعمال کیا ہے۔ شاہد اختر کا لکھا ہوا افسانہ "دہشت گرد" پاپولر میگزین افسانہ ہے۔ جسکو ادب کے حوالے سے جرنلسٹک (اسٹوری) کہا جا سکتا ہے۔ سریندر پرکاش "نسان" میں جو ماجرا بیان کر رہے ہیں۔ وہ پنجاب کی سیہ گروانہ اسانی کا المیہ ہے۔ جس میں سنسنی(?) بہت ہے اور فکشن کی شعریات کم، جس سے ناول کی جمالیات مجروح ہوتی ہے۔ بلراج کومل کی نظمیں "روشنی اروشنی" اور "گمشدہ کی تلاش" لاشعوری طور پر کھو گئے ہوئے لمحات کی بازیافت کی کوشش ہے جس میں رجائی کیفیت ابھر کے سامنے آتی ہے۔

★حقانی القاسمی — ۲۹-۱ ام حبیبہ ہال، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

آپ مشکلات و معذبات میں گھرے رہنے کے باوجود شاعر جیسا عالمی جریدہ جس تواتر و تسلسل کے ساتھ شائع کر رہے ہیں یہ بڑی جراءت و ہمت کی بات ہے۔ بمبئی جیسے شہر میں غیر یقینی ظروف و احوال میں رسالے کا استمرار معجزے سے کم نہیں ہے۔ ادبی تاجروں کی بھیڑ میں گم نہ ہو کر آپ اپنی علیحدہ شناخت برقرار رکھے ہوئے ہیں اور اردو دنیا کو بہت سی نئی چیزیں عطا کر رہے ہیں۔ اردو ادب میں جو جمود و ٹھہراؤ ہے اسے توڑنے میں آپ مستقلاً مصروف ہیں۔ گزشتہ چند شماروں کے مشتملات سے تو یہی احساس ہوتا ہے۔ شاعر میں نئے اور پرانے قلمکاروں کے قران السعدین سے دونوں طبقے کے مسائل و مشکلات پر غور و فکر کے مواقع ملتے ہیں ادب کے تعلق سے یہ بات مبنی بر حقیقت ہے کہ ادب کے نام پر مکر مسلسل(?) ہو رہا ہے۔ تنقید وادی تیہ میں بھٹک رہی ہے۔ ایسی تنقید کا بھلا کیا اعتبار جو تعصب و عصبیت کی شکار ہو جائے۔ ادبی فیصلوں پر قرابتیں، دوستیاں اور رقابتیں مسلط ہو جائیں۔ اور اب سنا ہے کہ رشوتیں لے کر تنقیدیں لکھی جا رہی ہیں۔ پرانے زمانے میں رشوتی تنقید کا تذکرہ تو ملتا ہے کہ ایک صاحب نے محمد بن عمر بن عطارد سے ۴ ہزار درہم اور ایک گھوڑا لے کر جریر کو فرزدق سے بڑا شاعر قرار دے دیا تھا۔

مشرف عالم ذوقی جذبات میں بہت سی سچی باتیں لکھ گئے ہیں۔ مٹی سے لوگوں کا رشتہ تقریباً ٹوٹ گیا ہے۔ اور آسمانوں پر کمند ڈال رہے ہیں۔ اس معروف اور تیز رفتار دنیا میں محنت و ریاضت کے لئے کسے فرصت ہے۔ فرصت ملی بھی تو تصور جاناں میں کھو گئے اور حسین دنیا میں ایسے محو ہوئے کہ پتہ بھی نہیں چلا کہ زمین کب پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ آج کا ہر ادیب عجلت میں ہے۔ ہر شخص شہرت منشور تک جلد از جلد پہنچنا چاہتا ہے۔ پرانے زمانے میں ایک زہیر بن ابی سلمی تھے جو مکمل ایک سال تک اپنی تخلیق کو دم بخت(?) کے لئے رکھ چھوڑتے تھے۔ مصر حوالان حول کے بعد ہی اسے کسی محفل میں پڑھتے تھے۔ اس درجہ حزم و احتیاط آج کے ادیبوں میں کہاں ہے؟؟ رہی بات پوری کہانی لکھنے کی تو وہ آدمی کیا لکھے گا جو خود آدھا ہو گیا ہے۔ بہت سارے ادیب تو اصحاب کہف کی طرح ہیں کہ صدیاں(?) لینے کے باوجود اپنی پرانی پونجیوں(?) کو لے کر نکلتے ہیں جنکی بازار میں اب کوئی قیمت نہیں رہی۔ ایسے میں عقیل صاحب یہ پوچھتے ہیں کہ "کہانیاں کیوں لکھتے ہو اور کس کے لئے؟" تو کون سا جرم کرتے ہیں۔ ذوقی صاحب گمشدہ کہانی کی تلاش میں نکلے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے جستجو و سفر میں کچھ لوگ ان کے ساتھ ہوں مگر جیسے حالات ہیں اور پست حوصلہ لوگ ہیں اس میں کامیابی ذرا مشکل ہی نظر آتی ہے۔ ذوقی صاحب خود ہی ایک موڑ پر پہنچ کر پراسرار(?) سی ویٹنگ کہتے ہوئے آگے بڑھ جائیں۔

ارشد عبدالحمید نے جدید تر نسل کے حوالے سے سچی بات لکھی ہے۔ نئی نسل میں نہ تو فکری تعصب ہے اور نہ ہی مخصوص نظریاتی دائروں میں بند رہنے کی خواہش۔ یہ نسل تو تنہا جہان کی سیر کرتی ہے۔ بزرگ تر نسل شاید "بانجھ ادب" کی تخلیق میں مصروف ہے۔ اس لئے عنینوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ نئی نسل تقلیدی ظلمات سے باہر نکل کر ادب کو نئی راہوں اور نئی جہات سے نکھار رہی ہے۔ اور جدید نسل کے بعض ادیبوں نے بزرگ تر نسل پر تفوق حاصل کر لیا ہے۔ "شاعر" کے بعض افسانوں کو پڑھ کر یہ احساس ہوا ہے کہ آپ نے ادب مکشوف کو شائع کرنے کی ذمہ داری لے رکھی ہے۔ بہت سی کہانیاں تو اجنتا کی گپھاؤں اور کھجوراہوں کے مندروں میں گم ہوتی جا رہی ہیں۔ ترقی کا یہی حال رہا تو ہر کہانی کار ایک "لذت النساء" لکھ کر خود کو ادب کا تیس مار خاں سمجھنے لگے گا۔ "شاعر" ہی سے پتہ چلا کہ بشیر بدر کو محسود روزگار بننے کی سعادت ملی ہوئی ہے۔ ان کی نفی کر کے بعض افراد اپنا اثبات کرنا چاہتے ہیں۔ واقعتاً اس سلسلے میں بعض عمائد ادب کے دامن بھی داغدار ہیں۔ عروض کے بارے میں انہیں مورد طعن ٹھہرانا قابل مذمت ہے۔ ادب کے بہت سے معتبر ناقدین نے روایتی عروضی اصولوں سے انحراف کرتے ہوئے اسے لغو اور بے فائدہ شے قرار دیا ہے۔ تیسری صدی ہجری کے ممتاز و معتبر ادیب جاحظ بھی علم عروض کو غیر مفید اور ادب مستبرد قرار دیتے ہیں۔ جنکی کتاب البیان والتبیین کو ابن خلدون نے ادب کے باب میں اساس و مصدری حیثیت دی ہے۔ امام حجاج بغدادی نے بھی اسے لغو اور واہیات قرار دیا ہے۔ ان کے دو شعر بطور استشہاد پیش کئے جاتے ہیں:

مستفعلن فاعلن فعولن مسائل کلہا فضول
قد کان شعر الوری صحیحا من قبل ان یخلق الخلیل

(ترجمہ: مستفعلن فاعلن فعولن بے کار کے مسائل ہیں۔ خلیل بن احمد (بانیٔ علم عروض) سے قبل ہی لوگوں کے شعر صحیح ہوا کرتے تھے۔) بشیر بدر کیسے شاعر ہیں؟ یہ تو ناقدین ادب جانیں۔ مگر عروض کے بارے میں ان کی رائے مسترد کئے جانے کے قابل نہیں ہے۔ بلا وجہ اردو کے ادیب ایک دوسرے کو دھکے دے کر آگے بڑھنے میں لگے ہوئے ہیں۔ انہیں تو ذاتی تعصبات و تحفظات سے بلند ہو کر ادب کو نکھارنا چاہئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ادب صحیح ادب کے دھندلکوں میں کھو جائے اور ادیب و ناقد ٹامک ٹوئیاں مارتے رہ جائیں۔

★خورشید ملک — مدرسین لکی، شاہجہاں پور (یوپی)

سید محمد عقیل کا تقریر نما مقالہ پسند آیا۔ کاش !! اس کو پڑھ کر سب تھکے تجربے کرنے کی غرض سے الٹی سیدھی کہانیاں (معلوم نہیں ان کو کہانیاں کہانی کیوں جانا جاتا ہے؟) لکھنے والے سدھر جائیں۔ تجربے وہی کرتے ہیں جو کہانی کے بنیادی عناصر کی الف بے سے بھی واقف نہیں ہوتے اور نقاد وہ بنتے ہیں جن کے اندر تخلیق

کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ یہ نقاد ان خرافاتی کہانیوں کے بارے میں تحسینی کلمات لکھ کر اپنی قابلیت کا ڈھول پیٹنے لگ جاتے ہیں۔ لہٰذا اس حقیقت کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ کہانی وہی ہے جس میں کہانی پن ہو، لیکن اگر ان سے کہانی پن کی وضاحت کرنے کے لئے کہا جائے تو وہ کسی طرح اپنی جان چھڑائیں گے کیوں کہ کہانی پن کی کوئی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ دراصل قصہ کیا ہے؟ لہٰذا لے دے کے چند ادبی رسائل ہی رہ گئے ہیں۔ اور ان میں بھی کبھی ہی اچھی کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ عوامی رسائل میں اکثر بہترین کہانیاں آتی ہیں۔ مگر وہ نقادوں کی نظر سے نہیں گزر پاتیں۔ مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ ناول، کہانی کار محض نقادوں کی نظر میں آنے کے لئے ہی کہانیاں لکھتے ہیں۔ یعنی ان کا قارئین سے رشتہ منقطع ہوتا جا رہا ہے۔ اور پھر قاری کو کیا پڑی کہ وہ بے معنی کہانیاں پڑھنے کے لئے ادبی رسائل خریدے؟ مقصد سے عاری ان کہانیوں کو پڑھ کر وہ اپنا ذہن کیوں بوجھل کرے؟۔ بہر حال سید محمد عقیل کو مبارکباد۔ گلزار نے اپنی کہانی میں کہانی کے سلسلے میں سب کچھ کہہ دیا ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے بھی اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے (حالانکہ وہ خود اپنی کہانیوں میں ان خیالات کی پابندی نہیں کرتے ہیں) میری ناقص رائے میں 'شاعر' کہانی پر بحث کا آغاز کرے۔ ایک سوال پوچھا جائے اور اس پر بحث کی جائے۔

'لنگوری' میں بلوم کرشن راحت نے کیا کہنے کی سعی کی ہے؟ اس میں کوئی مقصدیت بھی ہے یا صرف عرب شیخوں کی عیاشی کی تشہیر؟ مظہر امام کی 'لنگڑی غزل' (کیوں؟ کیا خیال ہے اگر 'آزاد غزل' کے بجائے 'لنگڑی غزل' کا نام دے دیا جائے؟) میں مہمل باتوں کے سوا ہے بھی کیا؟ خدا جانے پروفیسر رحمانی کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ بھی لنگڑی غزل کہنے والوں کے 'گروہ' میں شامل ہو گئے۔ 'دھنک رنگ' کے کئی اشعار دل پر ثبت ہو کر رہ گئے ہیں۔ 'نسان' میں سریندر پرکاش محض ناول کی ضخامت بڑھانے کی خاطر ایسی تفصیلات میں جانے لگے ہیں۔ جن کا ناول سے بظاہر کوئی لگاؤ نہیں نظر آتا۔

خورشید اکرم — آج کل (اردو) پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

تازہ مشترکہ شمارہ اچھا لگا۔ بالخصوص گرما گرم بحثوں کی وجہ سے۔ مگر افسانے؟۔ مجھے لگتا ہے کہ افسانے کے بارے میں اب بعض بالکل بنیادی باتیں اس طرح کرنی ہوں گی کہ نئے لکھنے والوں کے ذہن میں افسانے کا ایک واضح تصور آ سکے۔ تنقید کی مروجہ زبان یا افسانے کی نری موضوعاتی بحث نئے لکھنے والوں کی ذہنی تربیت میں ناکام رہی ہے ورنہ کیا بات ہے کہ پچھلے دس بارہ برسوں میں ابھی تک یہ صاف نہیں ہو سکا ہے کہ افسانہ ہے کیا؟ زیادہ تر تنقیدی مضامین (اور مباحث بھی) کلیشے کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ بے سمت سوال اور مہمل باتوں کے انبار سے کلیشیز ہی نکلتے ہیں۔ جگر کو خون کر کے شعر کہنے اور مغز کے لعاب میں قلم بھگو کر تنقید لکھنے والے اب ناپید ہو رہے ہیں۔ افسانے کی کچھ بحثیں ترقی پسند ناقدوں نے اور کچھ ان ترقی پسندوں کے جانشینوں نے اپنی اپنی تنقیدوں کے لئے مخصوص کر لی ہیں۔ اب افسانے پر ایک ٹوٹل تنقید کی ضرورت ہے۔ جو اس کی ظاہری سج دھج سے لے کر اس کی باطنی قوت تک کے بارے میں بات کر سکے۔ ویسے بھی اردو میں افسانے کے نقاد ہیں ہی کتنے؟ ایک وارث علوی ہیں۔ مگر وہ بہت سی باتیں زبان میں چٹخارہ پیدا کرنے کے پھیر میں کھو دیتے ہیں۔ پھر یہ کہ وہ اپنے خیال کی رو میں اپنے مرکزی نقطے پر قائم نہیں رہ پاتے۔ خیال کا ریلا انہیں جدھر بہا لے جائے وہ بہتے چلے جاتے ہیں۔ جب دم پھولنے لگتا ہے تو وہ اچانک قلم دوات سمیٹ کر منظر سے الگ ہو جاتے ہیں۔ نہیں صاحب! ہمیں افسانے کے بارے میں دوسری طرح بات کرنی ہوگی۔ ہمارے نام نہاد نقادوں نے بہت زیادہ کنفیوژن پھیلا دیا ہے۔ اور یہ کنفیوژن نئے افسانہ نگار ہی دور کر سکیں گے۔ یہ موضوع ایک طویل، دو ٹوک اور بے باک مکالمہ چاہتا ہے۔ اب ایک ایسے پلیٹ فارم کی ضرورت ہے۔ جس پر نئے افسانہ نگار ایک دوسرے سے مکالمہ کر سکیں۔

کنور سین — ای - ۶۸ ویسٹ پٹیل نگر، نئی دہلی

شاعر کا مشترکہ شمارہ (۳ اور ۴) بہت صاف شفاف شائع ہوا ہے۔ ستیہ پال آنند کا خط اردو غزل گو کے لئے نیا چیلنج ہے۔ جواب دینا ہوگا۔ ایسا بھی نہیں کہ جواب نہیں ہے۔ شاعروں کی ایک سیریز کے جواب کا انتظار ضروری ہے۔ خط پر مغز ہے اور مدلل بھی۔ ادھر سید محمد عقیل کی کہانی کاروں کو سرزنش اور ہدایت ادھر دو اور سو رساؤں کا احتجاج۔

شاہد اختر — ۴۳/۴۲ جوہی لال کالونی کانپور (یوپی)

شاعر شمارہ نمبر ۴ میں مشرف عالم ذوقی کا ایک طویل خط شائع ہوا ہے۔ ذوقی کا یہی خط، مضمون کی شکل میں ماہنامہ 'علم و ادب' میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اب ممکن ہے یہی تحریر افسانے کے روپ میں کسی رسالے میں بھی نظر آ جائے تو کوئی تعجب نہیں۔ اس خط سے انہیں یہ خوش فہمی ہو گئی ہے کہ انہوں نے عصری اردو افسانے پر بہت سنجیدہ گفتگو کر لی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ پچھلے دس برسوں میں ایک بھی نیا نام ابھر کر سامنے نہیں آیا۔ اب میں یہاں کچھ نام لکھ رہا ہوں۔ اور ذوقی مجھے بتائیں کہ یہ کہانی نگار کس عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور کب منظر عام پر آئے۔ نیر مسعود اردو فکشن کا ایک اہم اور معتبر نام۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے: 'سیمیا' اور 'عطر کافور' کب سے اشاعت کیا ہے؟۔ محسن خان کا نام ذوقی نے سنا ہوگا اور افسانوں کا مجموعہ 'خواب کہانی' بھی پڑھا ہوگا۔ سید محمد اشرف کے افسانے شاید ان کی نگاہ سے نہیں گزرے۔ افسانہ 'آدمی' اگر انہوں نے پڑھا ہوتا تو بھاگل پور اور ملیانہ کے فسادات پر شاندار کہانی کا رونا وہ ہرگز نہ روتے۔ (سریندر پرکاش کی کہانی 'بالکنی' بھی اسی موضوع پر ایک شاندار کہانی ہے) ذوقی کی خواہش اگر 'ٹھکوں دو' جیسی کہانی سے ہے تو اسکا جواب یہ ہے کہ 'منٹو' جیسا افسانہ نگار روز روز نہیں پیدا ہوتا۔ مذکورہ بالا کہانی کاروں کے علاوہ حسین الحق، سلام بن رزاق، شوکت حیات، انور قمر، خالد جاوید، طارق چھتاری، اور ایسے کئی نام ہیں جنہوں نے ۱۹۸۰ء کے بعد بے پناہ خوبصورت کہانیاں لکھی ہیں۔ آپ پہلے پڑھنے کی عادت تو ڈالئے تب آپ کو معلوم ہوگا کہ آج بھی اچھی اچھی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ ہر وہ سنجیدہ قاری جو ادب کا باقاعدہ مطالعہ کر رہا ہے۔ ان باتوں سے واقف ہے۔ یہ باتیں بھی بھلا کوئی بتانے والی ہیں۔ وعظ و تقریر کرنے میں اور خود اس پر عمل کرنے میں بڑا فرق ہے۔ گلے میں ادب کی ڈھول تک لٹکا لینے اور کہانی کہانی پیٹنے سے اچھی کہانی وجود میں نہیں آتی۔ آپ کا کیا ہے؟ غضب تو چاہتے ہیں کہ اردو فکشن کا چراغ آپ کے ہاتھ لگ جائے۔ چراغ گھسیں اور دیو حاضر ہو کر کہے حکم میرے آقا؟، جاؤ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' اور 'مہالکشمی کا پل' جیسی کہانیاں لے آؤ۔ آپ حکم دیتے رہیں اور غلام اچھی اچھی کہانیاں لاتا رہے۔ کس قدر طفلانہ اور مضحکہ خیز باتیں کی ہیں آپ نے۔ آپ ہی میں سے کوئی منٹو ہے کسی میں بیدی کی تہہ داری ہے۔ نفسیات پر شبہ ہے تو ڈھائی سو افسانے لکھنے کے بعد آپ اپنے کو کیوں نہیں ٹٹول لیتے۔ کہاں ہے مجھے یہ بھی بتانا پڑے گا کہ منٹو اور بیدی جیسی شخصیتیں ہر شہر میں جنم نہیں لیتیں۔ ڈھائی سو افسانے لکھنے کے بعد انہیں اپنا آپ کھنگالنے کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی کیوں کہ تب تک وہ سارا کام کر چکے ہوتے ہیں۔ البتہ میں آپ کے اس مشورے کی تائید کرتا ہوں کہ بھرتی کے ناموں کی ایک فہرست تیار کی جائے۔ جو افسانے کے نام پر پتہ نہیں کیا کیا قاری کے سر تھوپ رہے ہیں۔ بے شک ان سب کا بائیکاٹ ہو اور یہ حق قاری کو دیا جائے۔ مگر اس فہرست میں ایک نام ——— خیر جانے دیجئے جو مطالبے آپ نے دوسروں سے کئے ہیں۔ پہلے آپ خود ان پر عمل کریں۔ کیوں کہ آپ خود ایک کہانی کار ہیں اور یہ سارے سوال سب سے پہلے آپ سے کئے جائیں گے۔ ایک نسل کو خود اپنے نام سے منسوب کر لینے کا آئیڈیا اچھا ہے۔ میری ڈھیر ساری مبارکباد قبول کریں۔

P O BOX 51178
RIYADH-51143(S ARABIA)

عذرا نقوی —

شاعر کا مشترکہ شمارہ (۳ اور ۴) پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ افسانے، نظموں، غزلوں کے ساتھ ساتھ مقالے، مکالمے اور مکتوبات رسالے کی جان ہیں۔ سید محمد عقیل کا مقالہ 'کہانیاں کیوں لکھتے ہو اور کس کے لئے' بہت پسند آیا۔ ایک طرف علامتوں میں ڈوبی ہوئی کہانی ہے۔ جس میں کردار و واقعات اپنی جھلک بھی نہیں دکھا پاتے اور ایک بے روح سا پلاٹ اور لفاظی قاری کے پاس رہ جاتی ہے۔ اور دوسری طرف ایسی بھی کہانیاں ہیں جو بالکل اخبار کا صفحہ معلوم ہوتی ہیں۔ پہلا پیرا پڑھتے ہی کہانی کا پورا متن ذہن میں آ جاتا ہے۔ یہاں نہ کوئی تجسس باقی رہتا ہے اور نہ ہی بات کو خوبصورت بنانے والی (SUBTLETY) ہوتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ کہانی ان دو حدوں کے درمیان کہیں جیتی ہے۔ اسی شمارے میں گلزار کی کہانی 'کس کی کہانی' روح کو سرشار کر گئی۔ آسان اور سہل زبان میں وہ اپنی بات خوبصورتی سے کہہ گئے

★ قائد حسین کوثر — محلہ اطلاعات والا، ... آباد

سال رواں کا شمارہ ۳ — ۴ تبصرے کے لئے اس لئے اہم ہے کہ یہ موجودہ کہانی (یا افسانہ) پر ایک بحث کی ابتدا کر رہا ہے۔ اگرچہ بحث گھسے ہوئے نوالوں کو چبانے پر زیادہ مجبور کرے گی۔ مگر کیا کم ہے کہ اس صورت حال کا احاطہ کرنے کی ایک اچھی کوشش کی ابتدا ہے۔ شمارہ نمبر ۳ میں سید محمد عقیل (کہانیاں کیوں لکھتے ہو اور کس لئے؟) نے وہی بات کہی ہے جو شمارہ نمبر ۴ میں مشرف عالم ذوقی (آج کی اردو کہانی — ایک لمحۂ فکریہ!) کہی ہے۔ مذکورہ شمارہ پر دو حضرات کو شکایت ہے کہ آج کا افسانہ نگار اندھا ہے اور وہ سامنے کے مسائل سے بے خبر ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ بحث گھسے ہوئے نوالوں کو چبانے کے مترادف ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ سوال نئے نہیں ہیں اور پہلے بھی یہی سوال 'معدود' کا مسئلہ کھڑا کر کے اٹھائے جا چکے ہیں۔ ہم آیئے مندرجہ ذیل چارٹ کے تحت مذکورہ مشترکہ شمارہ میں شامل سات کہانیوں کا ایک عام سا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔

شمارہ نمبر ۳ (۱) کنور سین) انسانی رشتوں کے موضوع پر ایک معمولی سی کہانی۔ بیان غیر دلچسپ (۲) کس کی کہانی (گلزار) کھوئی ہوئی کہانی کو تلاش کرنے کی سمت کامیاب نشاندہی۔ بیان خوبصورت، موجودہ بحث کا شافی جواب (۳) کتاب (مقدر حمید) انسانی رشتوں کو مضبوط بنانے کے موضوع کے علاوہ حالات سے مقابلہ کرنے والی کہانی۔ بیان کامیاب (۴) دہشت گرد (فاروق راہب) مجرم ضمیروں میں جاگنے والی انسانیت کی آواز اور موجودہ دہشت گردی کے موضوع پر ایک اچھی کوشش۔ تفہیم کے لحاظ سے سہل پسند کہانی۔

شمارہ نمبر ۴ (۱) کنواری (اوم کرشن راحت) فلمی موڈ کہانی۔ جو عوامی رسائل کے معیار پر پوری اترتی ہے۔ بیان خراب نہیں (۲) تلوار (ہری بھٹناگر) معصوم ذہنوں کو پراگندہ کرنے والے اس ماحول کی عکاسی جہاں فرقہ واریت کے بیج ڈال کر نہ صرف پودا دیا جاتا ہے بلکہ کس طرح کے لوگ اسے تناور درخت بناتے ہیں۔ بیان کامیاب۔ (۳) دہشت گرد (شاہد اختر) عالمی پس منظر میں سامراجی غنڈہ گردی اور داداگیری پر گہری چوٹ۔ اگرچہ تھوڑا سا غیر ضروری بیان کہانی پر بار لگتا ہے۔ مذکورہ سات کہانیوں کے موضوعات پر کیا آج کا افسانہ نگار واقعی اندھا گونگا بہرا ہے؟ اس کا جواب صحیح طور پر جسکو کہا ہے وہ ارشد عبدالحمید (جدید تر نسل کے چند سوال) نے اور جامع طور پر کہا ہے۔ گلزار نے اگرچہ کہانی کا ذکر سید محمد عقیل اور ذوقی کی طرح آگے لا کر نہیں کیا۔ مگر یہ نشاندہی کر دی ہے کہ جدیدیت کے نام پر شمس الرحمان اینڈ کو۔ نے جو کہانی بھٹکائی اور جس طرح نئی نسل کے لکھنے والوں کو کہانی کا علامتوں اور تجرید کے حوالے کر کے عام آدمی سے دور کر دیا تھا۔ اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ مذکورہ سات کہانیوں کا جائزہ ان کو موضوع کے لحاظ سے اعتبار بخشتا ہے۔ مگر ہر اعتبار سے وہ کہانیاں کامیاب ہیں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ زبان، بیان، تکنیک کے اعتبار سے پرکھنے کے لئے دس صفحات درکار ہوں گے۔ یہ تو صرف اجمالی جائزہ ہے۔ چلتے چلتے یہ بھی بتا دوں کہ اب سے قریب دس سال پہلے ڈاکٹر جمیل جالبی نے پاکستان کے نئے لکھنے والوں کے لئے منعقدہ ایک ورکشاپ میں جو صدارتی خطبہ دیا تھا۔ اس کے چند جملوں پر ہی سید محمد عقیل کے مضمون کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اور ذوقی کا مضمون ان کا اپنا FRUST-RATION ہے۔ آپ غزل کے بعد کہانی پر بحث چلایئے اور شوق سے چلایئے۔ دیکھیں کتنے بڑے بڑے نام گھسے ہوئے نوالوں کو چبانے کی کوشش کرتے ہیں۔

★ شکیبہ رضوی — کرائسٹ چرچ کالج کانپور

سب سے بڑی خوشی یہ ہوئی کہ آپ نے مکتوبات کے کالم کمپیوٹر کے ذریعہ کتابت کرا کے قارئین پر بڑا احسان کیا ہے۔ شاعر کے مکتوبات بہت اہم ہوتے ہیں۔ جو اس بات کا جواز پیش کرتے ہیں کہ شاعر کی مقبولیت پر بنانے معقولیت ہے۔ شمارہ نمبر ۳ میں ڈاکٹر عقیل کا مضمون 'کہانیاں کیوں لکھتے ہو' تجریدی کہانی کی مدلل مخالفت میں اچھا مضمون ہے۔ مگر بھائی اگر کچھ لوگ تجریدی کہانیاں لکھ کر اور کچھ پڑھ کر خوش ہوتے ہیں تو ان کو لکھنے دیجئے اور ان کو پڑھنے دیجئے۔ آپ وہ پڑھئے جو آپ کو پسند ہے۔ نظمیں اچھی ہیں 'تنہا تماپوری کی منی شوانی' اچھی لگی۔ کہانیاں سب معیاری ہیں۔ مگر کنور سین کی 'مریض' اور فاروق راہب کی 'دہشت گرد' خاصی توجہ طلب ہیں۔ مظہر امام کی آزاد غزلوں میں جو مضامین نظم ہوئے ہیں۔ اگر وہ پابند غزل میں نظم ہوتے تو زیادہ اثر انگیز ہوتے۔ شمارہ نمبر ۴ میں '۳ خط باتیں ہزار' کے تحت شائع شدہ دو خطوط 'غزل پر ایک اور مکالمہ' اور 'آج کی اردو کہانیاں ایک لمحۂ فکریہ' یقیناً فکر کے در پر دستک دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ افسانہ اور قاری کے درمیان سے کہانی کھسک گئی تھی۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ کھسکی ہوئی کہانی پھر واپس آ رہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کھسک کر اتنی دور جا چکی ہے کہ واپس آنے میں وقت لگے گا۔ مگر اس قسم کے خطوط اور مضامین اس عرصے کو کم ضرور کر سکتے ہیں۔ ارشد عبدالحمید نے جدید تر نسل کے حوالے سے جو بات کہی ہے کہ 'یہ دنیا ایک تنگ نظریہ اور رویہ رکھتی ہے' تو اس سلسلے میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ میانہ روی تو ترقی پسندی کے دور میں بھی تھی۔ اور جدیدیت کے دور میں بھی۔ اس دور میں بھی بہت سی ایسی تخلیقات منظر عام پر آئیں جن میں ماضی قریب و بعید کے ادبی رجحانات سے استفادہ بھی ہے اور جو نہ تو ادب کو محض سماجی مقصدیت تک محدود رکھتی ہیں اور نہ فرد اور ذات کے دائرے میں قید رکھتی ہیں نہ تو ان میں مریضانہ ابہام ہے اور نہ ہی لغو تجریدیت اور نہ ہی مبہم علامت نگاری جب کہ مراسلہ نگار نے خود تسلیم کیا ہے تو پھر جدید تر نیا رجحان کیسے ہوا۔ جسکے حوالے سے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء تک کے ادب میں ملتے ہیں۔ اب آپ اگر اس پر جدید تر کا لیبل لگا کر اپناتے ہیں تو آئندہ نسل اپنی تخلیقات پر جدید ترین کا لیبل لگائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ انتشار دھیرے دھیرے ختم ہو رہا ہے۔ جو ترقی پسندی اور جدیدیت کے ٹکراؤ سے پیدا ہوئی تھی۔ اب وہ ٹھہراؤ آیا ہے۔ جو عام طور پر شکست و ریخت کے بعد آتا ہے۔

شمارہ نمبر ۴ کی غزلیں بھی خوب ہیں۔ حسن عزیز کی غزل خاص طور پر پسند آئی۔ ساجدہ عندلیب رحمان کی مختصر کہانیاں بھی خوب ہیں۔ معیاری مواد کے انتخابات پر ادارت کی داد دینی پڑتی ہے۔ کہ اتنے کم صفحات میں کس قدر اہم اور قابل قدر مواد فراہم کر دیا ہے۔ جہاں تک بات شاعر کو عالمی ادبی جریدہ بنانے کی ہے تو گیٹ اپ اور ضخامت کو چھوڑ کر شاعر میں کون سی چیز ایسی نہیں جو عالمی معیار کی نہیں۔ آپ کا دماغ بھی خوب چونکا دینے والی نئی نئی باتیں سوچتا ہے۔ اردو کی نئی بستیاں نمبر کی بات تو آج تک کسی اور کی زبان سے نہیں سنی۔ خدا آپ کی ہمت اور حوصلے میں اضافہ کرے۔ آمین کیا یہ مناسب ہوگا کہ دونوں شماروں کو ایک میں شامل کر ابتدا میں ہی دونوں نمبروں کا جو مواد ہے دیا جائے۔ اس سے کاغذ کی کفالت بھی ہوگی اور کچھ مضامین اور شامل ہو سکیں گے۔

★ اطہر سلطانہ — ریسرچ اسکالر، سینٹرل یونیورسٹی حیدرآباد

شاعر کے حالیہ مشترکہ شمارہ اپنے مشمولات سے بہت اہم ہو گیا ہے۔ شمارہ نمبر ۴ میں ستیہ پال آنند کا 'غزل پر ایک اور مکالمہ' خامے کا مضمون ہے۔ نہایت ہی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ انہوں نے غزل کو ایک بار پھر موضوع بحث بنایا ہے۔ اور اپنی ہی بحث کو اخلاقی مسائل کے ساتھ 'اختتام' کیا ہے۔ یہ مقالہ شاید عام قاری کے لئے لکھا ہو۔ ارشد عبدالحمید کا مضمون 'جدید تر نسل کے چند سوال' میں نے نہایت ہی دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ انہوں نے خدا لگتی باتیں کہی ہیں۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کی درمیانی کڑی کو عمدگی سے واضح کیا ہے۔ مجھ جیسے طالب علم کے لئے یہ مضمون ایک نعمت ہے اس پر اظہار خیال کی بڑی گنجائشیں ہیں۔

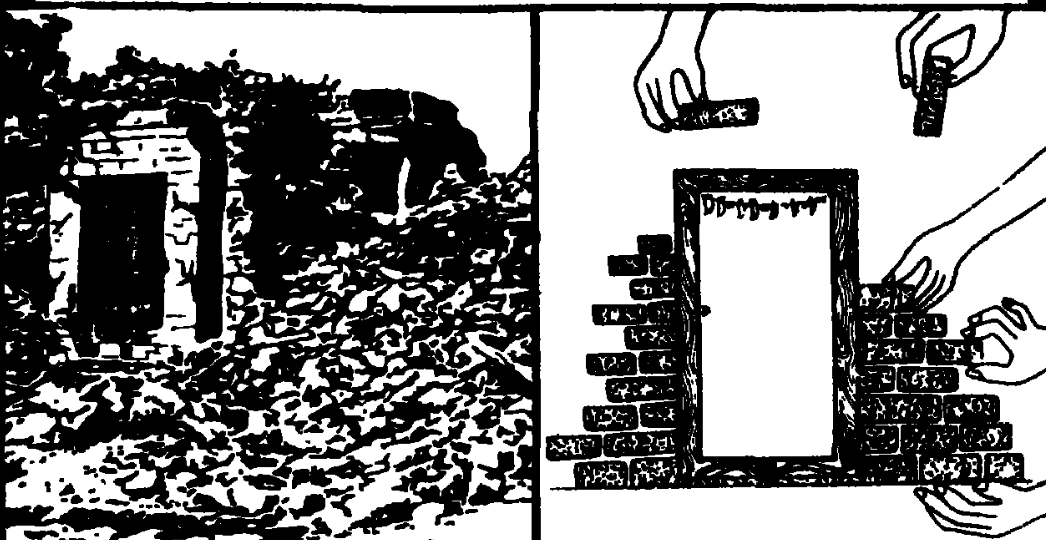
★ اسلم حنیف — گنور (ضلع بدایوں) ۲۰۲۵۲۴

شاعر شمارہ نمبر ۳ اور ۴ میں جدید تر نسل کے چند سوال کے عنوان سے ارشد عبدالحمید کا مختصر سا مضمون ان کی محدود ذہنیت اور مطالعے کی کمی سے عبارت ہے۔ جدید نسل میں انہیں اسعد بدایونی کے علاوہ اور کوئی ایسا شاعر دستیاب نہیں ہوا جو عصری حسیت کو ابھارنے میں کامیاب ہو۔ تمام تر مثالیں ایک ہی شاعر سے ماخوذ کرنا ان کے متعصبانہ ذہن کی علامت نہیں تو اور کیا ہے؟ اسعد بدایونی کے اشعار نقل کرنے سے پہلے وہ لکھتے ہیں 'جدید تر نسل کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے' مگر شعر صرف ان کے پسندیدہ شاعر کے ہیں۔ یعنی اسعد ان کی نگاہ میں "کل نسل" ہیں۔ پھر ستم یہ کہ دوسرا اسپیٹ بھی اسی شاعر کے دیوان سے نقل کر دیا گیا ہے۔ یہ اشعار اچھے ہیں۔ اور اب اسعد کا تازہ کلام بھی چھپ گیا ہے مگر افسوس کہ یہ پہلے مجموعے کی بہ نسبت بہت کمزور ہے۔ صاحب مقالہ اس کا بھی مطالعہ فرمالیں تو بہتر ہو۔

★★★★★★★★

Deepawali....

On this auspicious day - Let us remember our earthquake affected brethren.



The Government of Maharashtra

- Reached immediate relief and assistance to the earthquake-affected people
- Temporary shelter provided within no time
- Rendered immediate medical relief and completely prevented outbreak of epidemics
- Extended all other assistance to restore normalcy.
- Launched the house reconstruction work in eight Villages on the Dussera Day

This is the beginning....

DONATE GENEROUSLY TO THE CHIEF MINISTER'S EARTHQUAKE RELIEF FUND, MAHARASHTRA.

Directorate General of Information And Public Relations,
GOVERNMENT OF MAHARASHTRA.

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۴واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر

جلد — ۶۴
شمارہ — ۱۰

فون: ۳۵۹۹۰۳

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت روپے

زرِ سالانہ ۶۰ روپے — لائبریریوں سے ۷۵ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے — معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر — ۱۵ پونڈ

ماہنامہ شاعر مکتبہ قصرالادب ممبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۵۲۶۳ ممبئی

فکرِ امروز



ہمارا کوئی اصول ہونا چاہیئے، ہمارا کوئی نصب العین ہونا چاہیئے اور ہمارا کوئی نقطۂ نگاہ ہونا چاہیئے۔ صرف غزل گوئی ہمارے جادۂ عمل کو منزل رس نہیں بنا سکتی۔ قدما کی بات اور تھی ان کا شاہانہ اور رنگین ماحول ان سے وہی مطالبہ کرتا تھا جسے وہ اپنا لائحہ عمل بنائے ہوئے تھے۔ حکومت قدر شناس تھی۔ ملک میں علم و ادب کی تحصیل کا ذوق و شوق تھا۔ مگر اب زمانہ بدل چکا ہے۔ آپ کی شاعری، بغیر شاعر مگر تعلیم یافتہ طبقے میں مفید نہیں سمجھی جاتی۔ اس کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ اسے "کارِ بیکراں" کہا جاتا ہے۔ آپ کو اس کا احساس ہونا چاہیئے۔ خدا کے لئے اپنی شاعری کو کارآمد بنایئے اور اس الزام کو شاعری کے سر سے دور کر دیجئے کہ وہ ملک کے لئے مفید نہیں ہے۔

[۲۴ر دسمبر ۱۹۲۲ء ۔ گیا (بہار)]

— سیماب اکبرآبادی

ترتیب

شمارہ نمبر ۱۰ [۱۹۹۳] جلد ۶۴

محفلے اپنی

ہم عصر اردو ادب نمبر

پوری اردو دنیا کو شاعر کے ضخیم ہم عصر اردو ادب نمبر کا شدید انتظار ہے۔ نمبر کے متعلق استفسارات کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ خاص نمبر اپنی ترتیب و تکمیل کے مراحل میں ہے۔ ملکوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ جو خود ہمیں بھی چبھنے لگی ہیں۔ ہمارے دل کی دھڑکنیں اتنی تیز ہو گئی ہیں کہ اس کی دھمک دماغ میں محسوس ہونے لگی ہے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ ۶ دسمبر ۹۲ء کے بعد سے تا حال وقت ہماری گرفت میں نہیں آ رہا ہے۔ حالات کسی بھی طور سازگار نہیں ہو رہے ہیں۔ کوششیں برابر جاری ہیں اور بتدریج ہم اپنی منزل کی طرف بڑھ بھی رہے ہیں۔ دراصل شاعر کا خاص نمبر دو ہزار صفحات کا ایک بڑا اردو پروجیکٹ تھا۔ جس پر ہم پوری دیوانگی کے ساتھ کام کر رہے تھے کہ ملک کے سیاسی حالات میں ایک طوفان اٹھا اور بمبئی جیسے عظیم شہر کے سیکولر مزاج کو تباہ کر گیا اور ہم حیران و پریشان، سب کچھ دیکھتے رہ گئے۔ ہم بہت مجبور ہو گئے کہ اپنے پروجیکٹ پر نظر ثانی کریں۔ یہاں سے ذاتی الجھنوں اور پریشانیوں کا ایک اور سلسلہ شروع ہوا۔ ذہنی اور روحانی کشمکش میں اپنے پروجیکٹ پر از سر نو کام کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ بہر حال، ہم عصر اردو ادب نمبر نہ صرف یہ کہ شائع ہوگا بلکہ اپنے آپ میں ایک بالکل نیا اور انوکھا تجربہ بھی ہوگا۔ شاعر کے قارئین کے ساتھ ساتھ اس میں شامل ہونے والے قلم کاروں سے بطور خاص معذرت خواہ ہیں کہ انہیں اپنی تخلیقات کی اشاعت میں غیر معمولی انتظار کی زحمت برداشت کرنا پڑ رہی ہے۔ نمبر میں شامل ہونے والے تمام قلم کاروں سے گزارش ہے کہ وہ کچھ انتظار اور گوارہ کر لیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ انشاءاللہ اس کی ساری کوفت دور ہو جائے گی۔ وہ محسوس کریں گے کہ ان کا فن پارہ ایک نئی ادبی کائنات میں روشن اس کائنات کا ایک جز بنا ہوا ہے۔ ہمیں شاعر کے بے شمار قارئین اور قلم کاروں کے پر خلوص تعاون پر فخر ہے اور یہی فخر و اعتماد ہم عصر اردو ادب نمبر کی اشاعت کا سبب بھی ہے۔

قسطوار ناول فسان کے بارے میں

سرمندر بیدی کا ضخیم قسطوار ناول "فسان" اپنے اعلان کے ساتھ ہی ادبی خبروں میں آ گیا تھا۔ شاعر میں شائع ہونے والی ہر قسط انتظار، بحث اور پسند ناپسند کی فضا بناتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ناول ہی ایسا ہے۔ اس کا کینوس وسیع ہے۔ اور ہزاروں صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ لہٰذا کردار و واقعات کا تسلسل چھوٹی چھوٹی قسطوں میں ٹوٹتا رہا تھا۔ بھری پری تقسیم کے موضوع پر یہ ایک نہایت ہی حساس نوعیت کا ناول ہے۔ اور اپنے آپ میں بہت سارے تلخ حقائق بھی رکھتا ہے۔ جو عصری تناظر میں منفرد بھی لگے۔ ناول کو پسند کرنے والوں کا اصرار رہا کہ اس کے صفحات بڑھائے جائیں اور گزشتہ اقساط کی تلخیص بھی دی جائے۔ کم از کم دس صفحات۔ جن پڑھنے والوں کی گرفت میں کردار واقعات نہیں آ رہے تھے۔ وہ چھوٹی چھوٹی قسطوں سے الجھ رہے تھے۔ ملک کے موجودہ سیاسی صورت حال میں مذہب کو باطن میں چھو گیا ہے اور خارجی مظاہر میں جس طرح تحمل کیا ہے کہ تاریخی حقائق بھی مسئلہ بنتے لگے ہیں۔ سب کچھ اپنی جگہ لیکن ناول کی قسطوار اشاعت کا سلسلہ منقطع کرنے کی وجہ ہماری اپنی بعض دشواریاں ہیں۔ جن پر فی الحال ہماری گرفت کمزور ہے۔ ایک تو ناول کے لئے زیادہ صفحات اور گزشتہ اقساط کی تلخیص ضروری ہے۔ جبکہ شاعر کے محدود صفحات اسے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہم اپنے بے شمار قارئین اور ناول نگار سرمندر بیدی سے معذرت خواہ ہیں کہ ایک بہت مختلف اور منفرد ضخیم ناول کی مزید قسطیں آئندہ شائع نہیں کر سکیں گے۔ ہاں اب جب بھی شاعر کے حجم میں اضافہ ہوگا۔ اس اہم ناول کو دوبارہ قسطوار شائع کر سکیں گے۔ اپنے پورے اہتمام کے ساتھ۔

M. A. Akhtar Ansari,
JOURNALIST

TAJ GNAJ
KATRA UMAR KHAN

No ....   Agra 10....... 2....... 1941

برادرِ ذیشان تسلیم۔

مزاج گرامی!

"شاعر" کیلئے آپکے حسب الحکم افسانہ پہلے پیش کرچکا ہوں جو کہ آپنے یقینی طور سے ماہ مارچ کی اشاعت میں شامل
کرلیا ہوگا ایک نظم اور مارچ ۱۹۴۱ء کے شاعر کیلئے پیش کررہا ہوں ۔ امید کہ آپ یہ دونوں چیزیں ماہ مارچ کی
اشاعت میں ضرور شامل کرلیں گے اور میری کبھی ضرور عنایت فرمائیں گے۔ اور اگر شائع کرنے کا ارادہ نہ ہو
تو واپسی کی امید یقینی ہے تاکہ کسی اور رسالہ کے تقاضے کو پورا کردیا جائے — لیکن بہرحال امید تو یہی ہے کہ
شاعر ہی میں یہ دونوں چیزیں شائع ہونگی ۔ ہرچند کہ میں مبتدی ہوں لیکن شاعر و دیگر اعلیٰ ادبی جرائد
کی ہمت افزائی میرے حوصلوں کو بلند سے بلندتر بنادیگی۔

اس وقت یہ عریضہ اس امید پر تحریر کررہا ہوں کہ جب آپ بواپسی ڈاک نوازش کرنے کا موقع
دیں ۔ ایک عرصہ سے میں اپنے دوستوں کے اصرار پیہم کی وجہ سے کوشش کررہا تھا کہ اپنی نظموں اور غزلوں
کا مجموعہ اور اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع کردوں مجموعۂ کلام کی کتابت بھی میرٹھ میں شروع کرادی گئی تھی اور
دو تین مقدمے بھی لکھوائے گئے تھے لیکن پھر مجبوراً آگرہ آنا پڑا جسکی وجہ سے کتابت مزید نہ ہوسکی اور دیوان
کی مکمل ترتیب بھی نہ کرسکا ۔ اب میں ان دونوں کتابوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا ہوں اور یہ
کوشش کررہا ہوں کہ اس ماہ میں ترتیب دے کر آئندہ ماہ سے انکی کتابت شروع ہوجائے ۔ میری
خواہش یہ ہے بشرطیکہ آپ منظور فرمائیں کہ ان دونوں کتابوں پر "قصرالادب" کا ٹھپہ ہو ۔ اسکے متعلق
آپ اپنے خیال سے مطلع فرمائیں گے جناب۔ اسکو منظور فرمائیں تو اس سے بہتر کیا ہے اگر نامنظور ہے تو مجبوراً
ایڈیٹر ساقی یا ایڈیٹر خیام سے خط و کتابت کرکے انکا ٹھپہ دیدوں ۔ اب جو کچھ جناب کی رائے ہو واپسی
ڈاک نوازش کے اور افسانہ و نظم کی اشاعت اور عدم اشاعت سے بھی مطلع فرمائیے۔ سیماب صاحب قبلہ
کی خدمت میں سلام علیک

آپکا
اختر

اختر انصاری اکبرآبادی بنام اعجاز صدیقی

● اختر انصاری اکبرآبادی [محمد ایوب انصاری] ولادت: ۱۵ راگست ۱۹۲، آگرہ (یوپی) وفات: ۱۸ راگست ۱۹۸۵ء، بہاول پور (پاکستان)، مدفن: حیدرآباد [سندھ، پاکستان]

مٹھی بھر نظمیں

تیسری دنیا

یہاں جو رات ہے
عمروں سے لمبی ہے
یہاں جو خواب ہیں
آنکھوں سے اوجھل ہیں
یہاں جو زخم ہیں
باتوں سے گہرے ہیں
یہاں جو سانس ہے
اک تیز آری ہے
جو ہر دم کاٹتی رہتی ہے سینوں کو
یہاں نوزائیدہ بچوں کے چہروں پہ
بڑھاپا پھیل جاتا ہے
یہاں جو لوگ ہیں
صدیوں کے پسپائی
تھکے ہارے پیادے ہیں
جنھیں تاریخ لکھنا بھول جاتی ہے!

دشمنوں کے درمیان ایک نظم

یہاں کچھ پھول میرے ہیں
انھیں اشجار پر لکھ دو
یہاں کچھ خواب میرے ہیں
انھیں دیوار پر لکھ دو
یہاں کچھ گیت میرے ہیں
انھیں تلوار پر لکھ دو
یہاں کچھ لوگ میرے ہیں
انھیں بھی دار پر لکھ دو

گلاس ہاؤس

یہاں دھوپ آتی ہے لیکن
کسی کو جگاتی نہیں ہے
یہاں پھول کھلتے ہیں لیکن
ہوا گیت گاتی نہیں ہے
یہاں رات آتی ہے لیکن
کوئی خواب لاتی نہیں ہے

گنبدوں کے درمیاں

خواہشیں دیوارِ گریہ پر خوشی کے گیت ہیں
راستے اچھے دنوں کے خواب ہیں
لیکن ہمیشہ منزلوں سے دور رہتے ہیں
لکیریں دائروں میں قید ہیں
چلتے رہو
ریگزاروں کے سفر کا انت پانی ہے
سرابوں کے تعاقب میں کبھی جاؤ
تو آنکھوں کے سمندر ساتھ رکھنا
کا بخ خاموشی کے جنگل سے کبھی گذرو
تو آوازوں کے پتھر ساتھ رکھنا
گنبدوں کے درمیاں رہتے ہوئے
در ساتھ رکھنا!

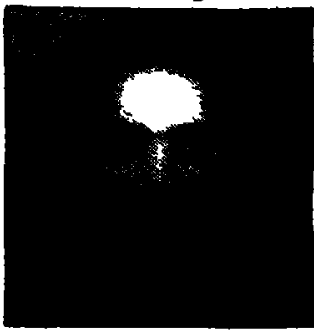


نصیر احمد ناصر

ہمیں معلوم تھا

خواہشوں اور چاہتوں کے درمیاں
اک رات تھی
اور روشنی مفقود تھی
سو ہم نے اپنے اپنے خوابوں کو سجا
وقت کی قربان گاہوں میں
امانت رکھ دیا
تا کہ آنے والے کل کو یاد ہو
خواہشوں اور چاہتوں کے درمیاں
اک بات تھی
اور بات کے اس پار اک مفہوم تھا
خود سے خود تک فاصلوں کے
اس سفر میں
کون بچھڑے گا ہمیں معلوم تھا!

ڈی ۱۱، گروپ آف نیوز پیپرز ۲۴۴ الفیصل
پلازہ بینک روڈ، صدر، راولپنڈی، پاکستان



علی احمد فاطمی

شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی۔ الہ آباد (یوپی)

نئے افسانے کے نئے مسائل

ادھر حال ہی میں لکھے گئے اردو کے نئے افسانوں نے قارئین اور ناقدین دونوں کو دوبارہ متوجہ کیا ہے اور ان پر تذکرے اور تبصرے بھی چل پڑے ہیں لیکن فی الوقت قابلِ ذکر کوئی مثبت رائے اور تنقید کی کوئی مستحکم روایت قائم نہیں ہو سکی ہے بلکہ بزرگ ناقدوں میں تو ابھی بھی بے اطمینانی ہے۔ ابھی حال میں ہوئے ایک سیمنار میں پروفیسر محمد حسن نے نئے افسانے سے متعلق اپنے تازہ ترین مقالے میں ایک جگہ کہا۔ ؎

"مانا کہ نئے افسانے کے کچھ حصے چونکاتے ہیں۔ لرزا دیتے ہیں، نئی مسرت و بصیرت دیتے ہیں، پھر بھی نیا افسانہ سکڑ رہا ہے اور سکڑتے سکڑتے چٹکلہ بن رہا ہے۔ افسانے کو محض تاثر بنا دینا انشائیہ تو ہے لیکن افسانہ نہیں۔ افسانہ صرف حجم میں ہی نہیں سکڑا بلکہ سروکار میں بھی سکڑ گیا ہے۔۔۔۔۔"

پروفیسر سید محمد عقیل نے بھی اپنے کئی مضامین نئی کہانی کدھر؟ کا سوالیہ نشان لگایا ہے لیکن ان کے یہاں جستجو ہے فیصلہ نہیں۔ پروفیسر حسن کی باتیں خاص اختلافی ہیں اور بحث طلب بھی لیکن اب جب کہ وہ تنقید سے رخصت ہونے کا باقاعدہ اعلان کر چکے ہیں۔ اس لئے میں یہاں ان کی باتوں کو نظر انداز کرتا ہوں اس کے برعکس نئے لوگوں نے نئے افسانے کو غیر جذباتی ہو کر متوازن نظروں سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر خورشید احمد جنہوں نے نئے افسانے کو تکنیک اور ہیئت کے حوالے سے بڑی سنجیدگی اور گہرائی سے دیکھنے کی کوشش۔ انہوں نے فی الحال یہ نتیجہ نکالا ؎

"نیا افسانے کا سب سے اہم رجحان رویے کی تبدیلی ہے۔ یہ رویہ نظر ثانی کا ہے۔ نیا افسانہ دونوں کو اپنا ادبی رویہ سمجھتا ہے اور نگاہ ثانی کرتا ہے اور روایت کے تسلسل کی توسیع کرتا ہے۔۔۔۔۔"

گزشتہ دنوں (جنوری ۹۲) دہلی میں عصمت چغتائی کی یاد میں نئے افسانہ پر ایک سہ روزہ سیمنار ہوا جو میرے نزدیک کئی اعتبار سے تاریخی نوعیت کا تھا۔ اس کی ایک اہمیت یہ بھی تھی کہ اس میں پہلی بار متعدد نئے افسانہ نگاروں نے نئے افسانے پر مضامین پڑھے۔ سلام بن رزاق ساجد رشید، پیغام آفاقی، سید محمد اشرف۔ انجم عثمانی، ارتضیٰ کریم وغیرہ نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے نئے افسانے کو پرکھا۔ اس جانچ پرکھ میں اس بات کی شدت زیادہ تھی کہ نیا افسانہ نہ ترقی پسند ہے نہ جدید بلکہ دونوں سے مختلف اور علیحدہ۔ تبصروں اور بحثوں میں بھی اس کا پرزور اور برملا اعلان و اظہار ہوتا رہا کہ نئے افسانے کا تعلق ترقی پسندی سے ہے نہ جدیدیت سے نہ وہ اس طرح کے کمٹمنٹ کا قائل ہے اور نہ فرد کی تنہائی کا۔ اس کی اپنی ایک الگ دنیا ہے۔ اپنا ایک الگ ماحول اور شاید گروہ بھی۔ یہ سچ ہے کہ ترقی پسندوں کی نظریاتی شدت اور بے کیف خارجیت نے اور اس کے جواب میں جدیدیوں کے تخریبی ردِّ عمل نے ادب میں خاصا انتشار و خلفشار پیدا کر دیا۔ خیمے گڑنے لگے۔ گروہ بندی کی دیواریں بلند سے بلند تر ہونے لگیں اور پھر یہ گروہ بندیاں اخلاقیات کو پار کر کے ذاتیات پر اُتر آئیں جس کے سلسلے سویت لینڈ ایوارڈ سے لے کر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اختلاف۔ اضطراب اور انتشار کی ان صورتوں سے نیا ادیب۔ نیا افسانہ نگار بھڑک سا گیا ہے اور وہ اپنے آپ کو اس طرح کے مکڑ جال

سے نکالنا ہی نہیں چاہتا ہے بلکہ کہیں کہیں احتجاج بھی کرنا چاہتا ہے۔ ایسا ضروری بھی ہے کہ بوسیدہ دیواریں توڑ کر ہی نئی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے لیکن ساتھ ہی اس تعمیر میں کچھ اپنا خون پسینہ اور رنگ و روغن بھی ہونا چاہیے کہ علیحدہ شناخت کے لئے ایسا ناگزیر ہے نئے افسانے کے سلسلے میں اور بھی فیصلے اور فتوے ہیں جن میں نقادوں کے ساتھ ساتھ خود افسانہ نگار بھی شامل ہیں۔ مثلاً یہ اعلان کہ نیا افسانہ علامت اور تجریدیت کے بھنور سے نکل آیا ہے۔ یہ خوش فہمی کہ نیا افسانہ بیانیہ کی طرف واپس آ گیا ہے اور ایک یہ بھی فیصلہ کہ نیا افسانہ واپس لوٹ آیا ہے۔ اس لوٹ آنے کے عمل کے سلسلے میں انتظار حسین نے اپنے حالیہ انٹرویو میں دل چسپ بات کہی ہے ؎

”ایک چیز میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ صاحب کہانی لوٹ آئی ہے۔ بھئی یہ کہانی جو لوٹ آئی ہے وہ کیسے لوٹ آئی ہے کس افسانہ نگار کے ذریعہ لوٹ آئی ہے یہ کوئی نہیں بتاتا ہمیں .....
کہانی اگر اسی طرح لوٹ آئی ہے جیسے وہ کرشن چندر کے یہاں تھی تو پھر کیا ہوا؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم پھر اپنے کو دہرانے لگے۔ یہ کہانی اگر لوٹ آئی ہے تو کسی نئے اسلوب کے ساتھ کسی نئے تجربے کے ساتھ لوٹ کر آئی ہے یا پھر اسی طریقے سے آئی ہے جیسے پہلے لکھی جا رہی تھی“ [آج کل فروری ۹۴]

انتظار حسین کے یہ جملے جہاں ان کی ایمانداری کا مظہر ہیں وہیں ان کی بے خبری اور معصومانہ نقد کا اظہار بھی لیکن یہاں بھی وہ ایمانداری سے اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے ہندوستان کے نئے افسانہ نگاروں میں نیر مسعود کے علاوہ کسی کو نہیں پڑھا حد یہ کہ انٹرویو لینے والے قمر احسن کو بھی نہیں پڑھا۔ انتظار حسین صرف ایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ فکشن کی اچھی خاصی پرکھ بھی رکھتے ہیں۔ علامتوں کا زوال میں ان کی معلومات اور تنقیدی کیفیات کا بہر حال اندازہ ہوتا ہے پھر وہ اتنی سی بات کیسے فراموش کر گئے کہ کوئی بھی افسانہ نگار اپنے سے پہلے اور اپنے سے بڑے افسانہ نگار کی زیادہ سے زیادہ اسلوبیاتی تقلید کی کوشش تو کر سکتا ہے، فکر و خیال کی نہیں۔ مسائل و رجحان کی بھی نہیں۔ مسائل کی سمجھ، ابہام و تفہیم امتزاج و انجذاب، رد و قبول کی انفرادی منزلیں و شکلیں ہوا کرتی ہیں۔ تخلیق کے پورے عمل میں کوئی مانے یا نہ مانے لیکن سچ یہ ہے کہ سماجی عوامل و محرکات معاشرتی و تہذیبی شکست و ریخت بہر حال اپنا کام کرتی ہے اور افسانہ نگار کی نفسیات و جمالیات پر شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہے جس کی وجہ سے کوئی بھی عہد اپنے سابقہ عہد میں من و عن کسی طرح سے واپس نہیں جا سکتا ایسا صرف ناقدانہ و فلسفیانہ قانون نہیں بلکہ قدرت اور فطرت کا بھی یہی مزاج اور قانون ہے۔ افسانے کی واپسی کا مقصد صرف یہ کہ درمیان میں ترقی پسند افسانہ نگاروں کی غیر دل چسپ بیانیہ نگاری سے بیزار ہو کر جو علامت اور تجریدیت استعمال کی جانے لگی تو اس کی بھی کثرت اور شدت نے کہانی سے کہانی پن بھی چھین لیا۔ قرأت کا وہ لطف و حظ چھین لیا وہ زبان اور اسلوب بھی چھین لیا۔ جو قصہ گوئی اور قصہ نویسی کا وقار اور معیار ہوا کرتا ہے اور افسانے کا جز و لاینفک ہے اور جس کے خود انتظار حسین بے پناہ قائل ہیں۔ نئے افسانہ نگاروں نے اس گمشدہ افسانویت کو پھر سے تلاش کیا۔ اسے جلا بخشی۔ اس کے علاوہ ان کا سب کچھ اپنا ہے۔ اپنا عہد اور اس کے مسائل اور اپنا طرز اظہار۔ بقول انجم عثمانی ”نئے افسانے کی دو اہم خصوصیات ہیں طرز اظہار اور طریقۂ احساس“

اب آئیے نئے افسانے پر چند باتیں براہ راست کریں کہ اس سے تذبذب اور کشمکش کی راہ شاید کچھ آسان ہو جائے۔ اگر ایک طرف ڈاکٹر خورشید احمد، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ نیا افسانہ دونوں نظریات کے صالح حصے کو اپنا ادبی رویہ سمجھتا ہے اور نگارشات کرتا ہے تو دوسری طرف پیغام آفاقی سید محمد اشرف۔ انجم عثمانی، ساجد رشید جیسے افسانہ نگار اپنے آپ کو سب سے الگ مانتے ہیں اپنے افسانوں پر کسی قسم کا لیبل لگانے کو تیار نہیں اور گروہ بندی سے تو نفرت کی حد تک اختلاف رکھتے ہیں۔
ظاہر ہے کہ پورا سچ نہ یہ ہے نہ وہ۔ بلکہ اصل سچائیاں ان دونوں کے درمیان اپنا کام کر رہی ہیں انہیں تلاش کرنے اور اس پر غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے اور پورے خلوص اور لگن کے ساتھ اس کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ آج کے افسانے ترقی پسند ہیں یا جدید؟ ان کے موضوعات خارجی ہیں یا داخلی کہ ہم اب ان پرانی بحثوں سے بہت دور نکل آئے ہیں اصل مسئلہ

اور غور طلب بلکہ تحقیق و تنقید طلب طلب مسئلہ یہ ہے کہ نیا اردو افسانہ اگر یہ سب نہیں ہے تو پھر کیا ہے اور کہاں ہے؟ اس کا اپنا کوئی منفرد مزاج ۔ رجحان اور کردار بن پا رہا ہے یا نہیں؟ اس کی اپنی انفرادی پہچان تشکیل پا رہی یا نہیں ۔ اپنے آپ کو بظاہر سب سے الگ تھلگ کرنے ۔ بدکنے ۔ بھڑکنے کے بجائے ان بے رحم اور برہنہ قسم کے سوالوں سے جو جھنے کی ضرورت ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر اس بات کی ضرورت ہے کہ نئے افسانے کی جانچ پرکھ اور رجحان بین کے لئے آج کے بگڑتے ہوئے سماج اور اس کی صورتوں کو۔ اس کے پیچ و خم ۔ کیف و کم کو بھی ذہن میں رکھا جائے کیونکہ نیا افسانہ اپنی ابتدائی منزلوں سے ہی موضوع و مواد اور شعور و وجدان حاصل کرتا رہا ہے ۔ سوز دروں سے لے کر درد میں بھیگے ہوئے لوگ تک ۔ سب سے چھوٹا غم سے لے کر معتبر تک ۔

نئے ہندوستان کے سیاسی اور سماجی حالات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں کہ اس کی تفصیل میں جانا قارئین کے کام و دہن کو تلخ اور مزاج و مذاق کو مکدر بنانا ہے ۔ بس اس کی ایک ہلکی سی تصویر پروفیسر محمد حسن کے ان جملوں میں دیکھتے چلئے ـــــ

" ذرا ہندوستان پر نظر ڈالیے، کشمیر میں کھلم کھلا نعرے لگائے جا رہے ہیں ۔ پنجاب میں خالصتانی سرگرم ہیں ۔ مشرق میں جھارکھنڈ والے قبائیلیوں کے نام پر ایک علیحدہ ریاست کا مطالبہ ہو رہا ہے ۔ آسام میں بوڈو تحریک چل رہی ہے اور اتر پردیش میں بابری مسجد اور رام جنم بھومی کا قضیہ آتش فشاں بنا ہوا ہے نفرتوں کے طوفان امڈ رہے ہیں، ہر طرف ملک کو توڑ دینے کی تیاری ہے اور استحصال مختلف صورتوں سے فراہم کیا جا رہا ہے ۔" (عصری ادب ۶۲)

نتیجتاً جس چیز نے اس وقت پورے ملک کو اپنی زد میں لے رکھا ہے اور جو اس وقت ملک اور سماج کی سالمیت اور انفرادیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ بنی ہوئی ہے وہ ہے فرقہ واریت اور مذہبی جنون ۔ فرقہ واریت پہلے بھی تھی تقسیم کے بعد ہونے والے فسادات نے متاثر کیا تھا لیکن وہ ایک حادثاتی فرقہ واریت تھی ۔ لیکن گزشتہ پینتالیس سال میں بالعموم اور آٹھ دس سال میں بالخصوص جس فرقہ واریت نے سر اٹھایا ہے وہ سیاسی سطح کے سیکولرزم کو تو نقصان پہنچا چکی ہے ۔ اب اس نے عوامی سطح کے ایمان و ایقان اور اتحاد کو للکارا ہے ہماری صدیوں کی وراثت کو جھنجوڑا ہے ۔ عوامی سطح کی یہ خطرناک فرقہ واریت نہ صرف موجودہ سماج کے لئے خطرہ بن کر ابھری بلکہ نئے افسانہ نگاروں کے لئے بھی چیلنج بن کر سامنے آئی اور حیرت کی بات نہیں ہے کہ ان نئے افسانہ نگاروں نے اس چیلنج کو قبول کیا اس لئے کہ اس موضوع پر لکھتے رہنا ان کی عادت رہی ہے، ضرورت بھی اور روایت بھی ۔ مسرت کی بات یہ ہے کہ اس سلگتے اور تڑپتے ہوئے موضوع کو نئے افسانہ نگاروں نے اس بار جس گہرائی اور سنجیدگی ۔ تنوع اور تازگی کے ساتھ سمجھا اور پیش کیا ہے وہ اس سے پہلے دیکھنے کو کم ملتی ہے ۔ سلام بن رزاق کے افسانے دو دو چراغ سے لے کر مشرف عالم ذوقی کے افسانے مت رو سالک رام تک کا پھیلا ہوا یہ سلسلہ اپنی شدت و جدت، باریک بینی اور ژرف نگاہی ۔ فنکارانہ تازگی ۔ اظہار و احساس کی شگفتگی کی خوب صورت کہانیاں سمیٹے ہوئے ہے ۔ درمیان میں ہیں ۔ اردون کمار کا گدھ ۔ شفیع مشہدی کا تاوان ۔ علی امام نقوی کا ڈونگر والی کے گدھ ۔ عبدالصمد کا نشہ ۔ سید محمد اشرف کا آدمی ۔ طارق چھتاری کا لکیر ۔ جیسے افسانے اس موضوع پر اور بھی افسانے لکھے گئے کچھ براہِ راست کچھ پس پردہ جو محض حادثات و واقعات کی کھتونی نہیں پیش کرتے بلکہ بدلتے ہوئے انسانی رویے ۔ انسانی نفسیات کی خطرناک اور دلآزار تبدیلی "جے بجرنگ بلی " اور "اللہ اکبر" کے درمیان سے گزرنے والے سماج اور سماجی افراد کے اس احساس و شعور و خوف و ہراس کو پیش کر رہے ہیں جو صدیوں سے پلتے ہوئے عوامی اتحاد اور اعتبار پر مسلسل چوٹیں کر رہا ہے ۔ یہ افسانے براہِ راست فسادات کا منظر تو پیش کرتے ہی ہیں ساتھ ہی بگڑتی ہوئی سماج کی نئی تصویر ۔ باطن سے چیختی ہوئی جذباتی ہم آہنگی ٹوٹتا ہوا درد کا رشتہ ۔ صدیوں کی کمائی لمحوں میں اس طرح لٹتی رہے گی ۔ یہ افسانے سوچ و فکر کی جڑوں کو ہلاتے ہیں ۔ اور ایک سوالیہ نشان کھڑا کرتے ہیں ۔ قارئین کے ذہن میں موجودہ سماج کی سمت و رفتار سے متعلق اور مجھ ایسے شائق کے ذہن میں ایک سوال یہ بھی کہ ترقی پسندی اور کمٹمنٹ سے دور بھاگنے والے یہ افسانہ نگار سماج اور انسان کے دکھ درد ۔ مسائل مصائب سے کس قدر

قریب ہیں، زندگی سے کس قدر نزدیک، ترقی پسندی کے اور کیا معنی ہوتے ہیں؟

کہنے کو تو ہندوستان میں جمہوریت ہے لیکن اس جمہوریت کی آڑ میں موجودہ سیاست جس طرح حصولِ اقتدار کے لئے طاقت اور دولت کا کھیل کھیل رہی ہے۔ تشدد کس طرح سماج میں اپنے پنجے گاڑ چکا ہے۔ ہندوستان کا شہری اب اس سے واقف ہو چکا ہے اور بولنے اور لکھنے کی پوری آزادی کے ماحول میں جس طرح احتجاج و انقلاب کی آوازیں دبائی جا رہی ہیں اردو افسانہ ان حالات کی بھی آگاہی رکھتا ہے۔ اقبال مجید کے افسانے مدافعت سے لے کر سلام بن رزاق کے افسانے معبّر اور ایک خیالی کہانی۔ قاسم خورشید کا افسانہ پوسٹر تک یہ سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ عبدالصمد نے تو براہِ راست اپنے ناول دو گز زمین میں سیاسی قدروں اور پیغام آفاقی نے مکان میں سماجی قدروں کو بے نقاب کیا۔ اسی طرح شوکت حیات، انور خان، علی امام نقوی، مشتاق مومن، حسین الحق وغیرہ کے افسانے اس گندی سیاست اور اس سے پیدا ہونے والے سماجی اثرات پر خوب صورت طنز کرتے ہیں۔ اور سماجی فلسفہ اور سیاسی عرفان کے ایسے نمونے پیش کرتے ہیں۔ جہاں ادب چھوٹے چھوٹے تنازعات سے اوپر اٹھ کر عصری مسائل کی آئینہ داری کرتے ہوئے سماجی تاریخ کا رول ادا کر جاتے ہیں۔ انور قمر کا افسانہ کابلی والے کی واپسی نئے اردو افسانے کا ایک ایسا قدم ہے جہاں تاریخ و جغرافیہ کی حدیں ٹوٹ جاتی ہیں اور بعض نقادوں کے خیال میں اردو افسانے کی محدودیت کو لامحدودیت میں بدل دیتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سماج میں افراد کا جو معیار ہوتا ہے۔ اسی طرح کا سماج تشکیل پاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اسی طرح کی سیاست رنگ پکڑتی ہے اور پھر دھیرے دھیرے وہ سیاست اس کمزور اور لڑکھڑاتے سماج کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ہندوستان کا موجودہ سماج کم و بیش ایسی ہی سیاست کی گرفت میں ہے، دانشور خاموش، عدل و انصاف اور تعلیم و تدریس کے ادارے نہایت مکروہ سیاست کی جنم بھومی بن چکے ہیں۔ امیری و غریبی اور علم و جہل کے درمیان خلیج بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اخلاقی گراوٹ۔ انسانی قدروں کی پامالی مائل بہ عروج ایسی صورت میں سماج کی جو بھری بگڑی ہوئی صورت ہونی چاہئے وہ اس وقت کے ہندوستان میں پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ سماج کی ایسی تمام برائیوں، ناہمواریوں۔ تخریب کاریوں کے بارے میں نیا اردو افسانہ اپنی پوری ہوش مندی اور چابکدستی کے ساتھ چاک دامانی کا شکار رہے اور نوحہ گری کا بھی۔ گھر ہو یا دفتر۔ اسکول ہو یا کورٹ کچہری۔ ریلوے اسٹیشن ہو یا بس اڈہ فٹ پاتھ ہو یا شاہراہ ہر جگہ لوٹ مار ہے۔ بے ایمانی اور رشوت ستانی کا بازار گرم ہے۔ پوری ایمانداری سے بے ایمانی کا ننگا ناچ کھیلا جا رہا ہے۔ اردو افسانہ نگاروں کے بیشتر افسانے ایسے سماج کے تمام گوشوں کو بے نقاب کرتے نظر آتے ہیں۔ شوکت حیات، کا مجبوری۔ سلام بن رزاق کا مراجعت ایک اور شروَن کمار، علی امام نقوی کا ایک لمبا راستہ، مشتاق مومن کا رت جگوں کا زوال۔ حسین الحق کا اندھی، غضنفر کا پہچان، سیّد محمد اشرف کے لکڑ بھگے سیریز کے افسانے غرض کہ اقبال مجید کا افسانہ حکایت ایک نیزے کی سے لے کر طارق چھتاری۔ ابن کنول۔ مشرف عالم ذوقی۔ محسن خان وغیرہ کے افسانے موجودہ سماج کی پرتیں کھولتے چلے جاتے ہیں جس سے عام انسانوں کے سامنے پورا سماج برہنہ ہو کر آ جاتا ہے۔ سماج اور سماجی احساس پر ایسی گرفت ہی افسانہ نگار کو تذبذب اور کشمکش کی دنیا سے نکال کر ذمّہ داری اور فنکاری کی دنیا میں لے جاتی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ آج اس طرح کے علامتی اور تجریدی افسانے نہیں لکھے جا رہے ہیں۔ خام مواد اور ناپختہ شعور کبھی نام نہاد علامتیت کے دروازے کھولتا ہے سماجی مسائل کا کمزور احساس اور دھندلا عرفان یاسیت اور قنوطیت کو تو پیدا کرتا ہی ہے اکثر فرار کی راہیں بھی ہموار کرتا ہے۔ شاید گزشتہ دنوں یہی ہوا آزادی اور جمہوریت کے غلط احساس نے اس مرکز و محور سے الگ کر دیا جس پر فنکار کی نگاہیں جمی رہنی چاہیئے اس شعور اور احساس سے بھی بیگانہ کر دیا۔ اور ہم کچھ دیر کے لئے آزادی کی اس فضا اور خاموشی میں ڈوب سے گئے جو اکثر طوفان کے بعد طاری ہوتی ہے اور منزل اور مقصد سے دور کر دیتی ہے۔ لیکن آزاد اور رنگارنگ سماج میں یہ وقفہ مختصر ہی ہوا کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ علامتی اور تجریدی افسانوں کا دور بلبلے کی طرح اٹھا اور بیٹھ گیا۔ اور نئے افسانہ نگار تیزی سے ایک بار پھر شعور و احساس کی دنیا میں آ گئے جو

ہمارے افسانوی ادب کی روایت ہے ۔ اور آج کے ادب کی ضرورت بھی ۔ اب اس بحث میں کون پڑے کہ اس پر کس رجحان و مزاج کا غلبہ ہے اور نئے افسانوں کا غالب عنصر اپنی کس روایت سے کتنا وابستہ ہے ۔ اور کتنا غیر وابستہ ؟ یہ فیصلہ تو خود افسانے ہی کئے دے رہے ہیں ۔

نئے افسانے نے کچھ موضوعات اور چھوئے ہیں جو غالباً اردو افسانوی ادب کے لئے نئے ہیں ۔ مثلاً ستی پرتھا ۔ جہیز ۔ ریزرویشن ۔ جیسے مسائل پر اردو میں نہیں کے برابر افسانے لکھے گئے ۔ شاید اب تک یہ اردو والوں کے مسئلے نہ تھے ۔ لیکن سلام بن رزاق کے افسانے ستی ۔ ایک تو یہ اور ابن کنول کا افسانہ ہستکچھیپ اردو افسانے کا نیا باب کھولتے نظر آتے ہیں ۔ اور ساتھ ہی ہندو مذہب کے تاریخی کرداروں کو لے کر جس علامتی انداز سے یہ افسانے لکھے گئے ہیں وہ اپنے آپ میں اچھوتے ہیں ۔ اسی طرح کام دھینو میں سلام بن رزاق نے جس طرح الیکشن کے نظام کا مذاق اڑایا ہے ایسے بے مثال افسانے تو ہندی میں بھی مشکل سے ملیں گے ۔ یہ صحیح ہے کہ یہ افسانے اچھے ہیں اور اردو افسانے کے قارئین کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کراتے ہیں لیکن اردو میں اس طرح کے افسانوں کی تعداد اتنی کم ہے اور عام قارئین تک ان کی رسائی اس سے بھی کم ، چنانچہ عام طور پر افسانوں کے بارے میں خیال یہ ہے کہ اس میں صرف وہی مسائل نظر آتے ہیں ۔ جو اقلیت کے مسائل ہیں بقول شاعر ؎

دریدہ دامنوں خستہ گریبانوں کی باتیں ہیں
غزل میں جتنی باتیں ہیں مسلمانوں کی باتیں ہیں

اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اردو افسانے کا نیا منظر نامہ آتنک واد ۔ علیحدگی پسندی ۔ ریزرویشن ۔ ستی جہیز وغیرہ کے مسائل سے اس قدر بیگانہ کیوں ہے جب کہ ہندوستان کی دوسری زبان کے ادب بالخصوص مراٹھی ۔ گجراتی ۔ سندھی اور ہندی کے ادب میں ان موضوعات پر خوب خوب افسانے لکھے جا رہے ہیں اور حد درجہ حیرت یہ ہے کہ ان زبانوں میں ستی اور جہیز کے مسائل نے جتنی اہمیت اختیار کر لی ہے اردو کے نئے افسانوں کے منظر نامے سے عورت بالکل غائب ہو گئی ہے ۔ عورت ۔ عورت کے مسائل اور خود عورت کا کردار تک غائب ۔ آیئے اس امر پر بھی غور کرتے چلیں ۔

آج کے سماج کے جو مسائل ہیں اس میں عورت برابر کی شریک ہے اور ماضی کے مقابلے وہ زندگی کے تمام شعبوں میں شامل ہے ۔ اور برابر کی حصہ دار ہے زندگی کے ہر مقام پر موجود ۔ گھر ہو یا باہر ، دفتر ہو یا کالج ، اسپتال ہو یا ریلوے اسٹیشن عورت ہر جگہ ہے ۔ کل عورت گھر میں تھی تو ایک مسئلہ تھا آج گھر سے باہر ہے تو ہزار مسئلے پیدا ہو گئے ہیں ۔ آج وہ ہر جگہ موجود تو ہے لیکن ہر مقام پر مرد سے زیادہ غیر محفوظ ۔ کمزور اور استحصال سے لبریز ۔ کچھ تو اس کی اپنی ذات کے مسئلے ہیں جو کل بھی تھے ۔ اور آج بھی ہیں ۔ کچھ آج کے موجودہ سماج کے مسئلے ہیں جن سے مرد دوچار ہے اور اس سے زیادہ عورت ، اس لئے کہ اکثر وہ اپنے محافظ مجازی کی قہر آلود نگاہوں کا شکار رہتی ہے جو سماج کی کڑواہٹ کی شکل میں رد عمل کے طور پر بیوی بہن بیٹی پر ظاہر ہوتی ہے ۔ عورت کل تک قیدی تھی مگر آج آزاد ہو کر کچھ کم لاچار اور بے بس نہیں ۔ غرض کہ سماج کے تازہ ترین اسکرین پر عورت مرد کے برابر اور مسائل میں اس سے زیادہ نہیں تو اس سے کم بھی شریک نہیں ۔

کہا جاتا ہے کہ ہر عہد کا اپنا ایک معاشرہ ہوتا ہے اور ہر معاشرے کا اپنا ایک مخصوص مزاج و مذاق اور اسی کے عکس آئینۂ ادب میں اترتے ہیں ان دنوں معاشرے کی جو بے ترتیبیاں اور ناہمواریاں ہیں اس نے رومان پرور کیفیات کو بہت دور کر دیا ہے ۔ مسائل اتنے سنگین اور زندگی اتنی جٹل ہو گئی ہے کہ غالب کی طرح تصور جاناں کے لئے فرصت کس کے پاس ہے ۔ خود اردو شاعری سے معشوق رد ٹھ گیا ہے کہ وہ بھی اپنے آنچل کو پرچم بنا کر زندگی کے احتجاجی و انتقامی رویے میں برابر سے شریک ہے ۔ آج کی عورت بقول پروفیسر محمد حسن رفاقت ۔ اور عام انسانی زندگی کے درد و داغ اور جستجو و آرزو سے عبارت ہے ۔ وہ بھی نمرہ ہو سکتی ہے تاہم بھی مصائب کے پہاڑ ٹوٹ سکتے ہیں اور ان مقامات پر بھی اُسے دوسرے انسانوں کی طرح دیکھا اور سمجھا جا

چاہیے لیکن کیا اردو کا نیا افسانہ اُسے یہ رفاقت اور اہمیت دے رہا ہے۔؟ شاید نہیں!

اس کا ایک مختصر سا جواب تو شاید یہ ہو سکتا ہے کہ آج کے نفرت اور تشدد بھرے بارودی ماحول۔ فرقہ وارانہ جنون اور طوفانی زندگی میں جب عام انسان کیڑے مکوڑے کی طرح مارا جا رہا ہے تو ایسے میں کیا مرد اور کیا عورت بات بڑی حد تک درست بھی ہے لیکن جب مسئلہ عام انسان اور انسانیت کا ہے تو اس میں مرد اور عورت دونوں ہی آتے ہیں۔ کیڑے مکوڑوں کی طرح مرنے والوں میں مرد ہیں تو عورتیں اور بچے بھی۔ عورت جس طرح زندگی میں برابر کی شریک ہے تو موت میں بھی اتنی حصہ دار ——— مرد کی تو ایک مصیبت، لیکن عورت عناد اور آتنگ سے بچی تو جلا دی گئی۔ اس سے بچی تو عصمت لوٹ لی گئی۔ گھر میں شوہر کا غصہ۔ دفتر میں باس کا عتاب۔ سڑک پر ریل بس وغیرہ پر شریف زادوں کی نظروں کا قہر غرض کہ مسئلے ہی مسئلے۔

اگر یہ بات پورے طور پر سچ ہوتی تو ہندوستان کی دیگر زبان و ادب میں بھی کم و بیش یہی صورت ہوتی۔ اردو کی ہمشیر زبان ہندی کے افسانوی ادب میں کم از کم یہی حال ہوتا لیکن یہاں صورتِ حال مختلف ہے، ہندی افسانوی ادب میں خواتین ان دنوں کچھ زیادہ ہی لکھ پڑھ رہی ہیں منو بھنڈاری۔ کرشنا سوبتی۔ منجل بھگت۔ مردلا گرگ۔ ممتا کالیہ۔ راجی سیٹھ پدما سچدیو۔ ناصرہ شرما۔ مرنال پانڈے وغیرہ نے ان دنوں ہندی کہانی میں تہلکہ مچا رکھا ہے۔ اور مرد افسانہ نگاروں کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ عورتیں صرف عورتوں کے ہی مسائل پر لکھ رہی ہیں بلکہ آگے بہت آگے جا کر ہندوستان کے مختلف آندولن۔ الگاؤ واد ریزرویشن جیسے موضوعات پر کہانیاں لکھ کر اپنی بیداری اور ہوش مندی کا ثبوت پیش کر رہی ہیں۔

ابھی حال ہی میں پدما سچدیوا کی کشمیر کے مسئلہ پر لکھی گئی کہانی۔ ناصرہ شرما کی سینے کے چالیس چور۔ منجل بھگت کی ایک بستی ہوئی نسل اور ممتا کالیہ کی بعض کہانیاں بہت آگے کی کہانیاں ہیں۔ اور بھی کہانیاں ہیں۔ ہندی کہانی کا معاشرہ تقریباً وہی ہے جو اردو افسانے کا ہے۔ وہی سماج۔ وہی مسائل۔ وہی مرد و عورت کی رفاقت اور نفرت۔ سب کچھ وہی عورتیں لکھ بھی رہی ہیں۔

لیکن برائے نام۔ سلام بن رزاق سے لے کر طارق چھتاری اور ابن کنول کے درمیان ایک بھی ممتاز اور مشہور نام نہیں ——— ایک بھی بڑا افسانہ نہیں۔ ایک بھی بڑا کردار نہیں۔ جب زندگی کے نشیب و فراز میں عورت کل بھی شریک تھی اور آج کچھ زیادہ تو کیا وجہ ہے کہ اردو افسانے کی دھوپ چھاؤں میں۔ عورت کا سایہ تک نظر نہیں آ رہا ہے۔ وہ گمشدگی کا شکار ہے کیا یہ لمحۂ فکریہ نہیں؟ عورتوں کے لئے تو ہے ہی اس سے زیادہ مردوں کے لئے کہ اردو افسانے کی روایت بتاتی ہے کہ عورتوں کے مسائل عورتوں نے تو لکھے ہی، اس سے زیادہ مردوں نے لکھے، اردو افسانے میں لافانی نسوانی کردار مرد افسانہ نگاروں نے زیادہ دیئے۔ ایسا فطری ہے لیکن نئے افسانے سے تخلیق کا یہ فطری عمل کہاں اور کیوں رخصت ہو گیا اردو افسانے سے دھنیا۔ لاجونتی۔ سوگندھی۔ آپا۔ شمی کی تائی۔ اصو باجی وغیرہ کہاں روٹھ گئیں۔؟ کیا انہیں منانے اور تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ یا سب کچھ یوں ہی چلنے دینے کی۔ زندگی کی بساط جیسی بچھی ہے اسے بچھا رہنے دیا جائے ——— یا کھوئی ہوئی عظمتوں، رفعتوں اور جہتوں پر بھی غور کیا جائے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اردو افسانے کی کامیابیوں اور بلندیوں پر صرف خوش ہوتے رہنے کی ضرورت ہے یا اس کی گم شدہ جہتوں پر بھی غور و فکر کی ضرورت ہے اگر ضرورت ہے تو تھوڑی دیر کے لئے جرمن۔ فرنچ۔ امریکی افسانوں کی طرف دیکھنے سے قبل اپنے ملک کی ہمشیر زبانوں کے افسانوی ادب کی طرف بھی دیکھا جائے بہت سارے سوالوں کے جواب اپنے آپ مل جائیں گے۔ باتیں اور بھی کی جا سکتی ہیں۔ نئے افسانے کے اسلوب کی۔ ہیئت کی۔ تکنیک کی۔ نظریہ و عمل کی بھی۔ لیکن اس مضمون میں میں نے صرف مسائل کی طرف چند اشارے کئے ہیں۔ کچھ سوال اٹھائے ہیں اور ان کے ذریعہ نئے افسانے کی جو ایک اکائی تشکیل پا رہی ہے اس کو سمجھنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ آخر میں یہی عرض کروں گا کہ اپنی متعدد کمزوریوں اور محرومیوں کے باوجود اگر آج افسانے کے میدان میں کچھ ہلچل ہے۔ کچھ سرگرمی ہے تو عین ممکن ہے کہ اردو افسانے کا کوئی نیا عہد کروٹیں لے رہا ہو کہ بقول بریخت "نئے عہد اچانک تو شروع نہیں ہو جاتے۔"

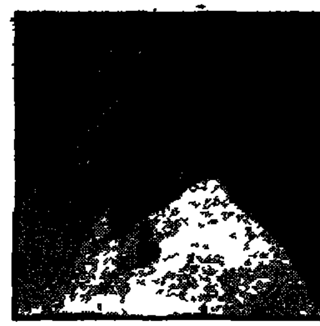
بحیثیت مجموعی پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے ایک قاری کی حیثیت سے نئے افسانے کا مطالعہ کیا تو بے ساختہ کہہ اٹھے —

"آج کی اردو کہانی آزاد ہے لیکن کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک نئی چھتر چھایا کی تلاش میں ہے۔ آج کل کی کہانی کے لئے یہ اہم نہیں ہے کہ اسے کس خانے میں رکھا جائے بلکہ اس کی صفات و رجحانات کی تلاش کی ضرورت ہے۔ جو آج کی ہوں۔"

تلاش کی ضرورت کی بات بہت اہم ہے اور اس تلاش کو پورے سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کی عمر اس کے تجربات و مشاہدات کو بھی ذہن میں رکھئے اور آج کے سماج پر ڈھائے جانے والے جبر و قہر کو بھی ذہن میں رکھنے کی شدید ضرورت ہے۔ پھر اپنے آپ کو افسانے سے منٹو، بیدی، کرشن جیسی توقعات ناممکن سی لگیں گی مگر اس سے اس کی طرح کی توقعات کرنا پورے افسانوی ادب کی بقا اور ارتقا کے لئے خطرناک بات ہوگی۔ سریندر پرکاش نے اچھی بات کہی ہے۔ —

"آج کے دور میں کوئی واحد افسانہ نگار بڑی شخصیت نہیں بن پاتا۔ کیا افسانہ نگار کا ادبی قد چھوٹا ہو گیا ہے۔ جی نہیں لوگوں کا وژن بدل گیا ہے۔ علم کی حدود پھیل گئی ہیں۔"

علم کے ساتھ ساتھ مسائل پھیل گئے ہیں پھر یہ بھی ہے کہ کسی ایک مسئلہ پر مسلسل لکھ کر اور اچھا لکھ کر اپنی علیحدہ پہچان بنانا الگ بات ہے اور طرح طرح کے مسائل پر الگ الگ ڈھنگ سے لکھ کر اپنی شخصیت کو پس منظر میں ڈال کر محض سماج اور ریاست کی پہچان بنانا ایک دوسری شکل۔ یہ سچ ہے کہ نئے افسانہ نگاروں میں کوئی پریم چند، بیدی، منٹو وغیرہ نہیں ہے لیکن سچ یہ بھی ہے کہ مسائل کی جو رنگارنگی اور بوالعجبی آج کے نئے افسانوں میں ہے شاید پرانے افسانوں میں نہیں اس میں قصور فنکار کا نہیں بلکہ سماج کا ہے جس نے انسان کی اور فنکار کی ذاتی شخصیت کو مسخ کر کے صرف مسائل ہی مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ اس کے باوجود نیا افسانہ نگار اپنے ہوش و حواس کھوئے بغیر پوری دردمندی، خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ اپنے تخلیقی سفر میں مصروف ہے۔ ❀



خلیل تنویر

جب آنکھ کھلی تو ....

جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا
میرے چاروں طرف
رات ہی رات ہے
یہ میری خطا تھی کہ میں نے
اُسے چھُو لیا تھا
میں اس خوابِ گم شدہ کی تلاش میں ہوں
لہو کے عذاب میں ہوں۔

گیان کا کرب

اس نے
ان کی طرف
آخری بار دیکھا
اور چل پڑا
پھر احساس کے بدلتے ہوئے منظر تھے
گیان کا کرب تھا۔

ماضی ایک عذاب

اس نے شاید ٹھیک کہا تھا
پیچھے مڑ کر دیکھو گے تو۔
پتھر کے بن جاؤ گے!
میں نے!
پیچھے مڑ کر دیکھ لیا ہے۔

● گورنمنٹ میوزیم اودے پور (راجستھان)

جبّار جمیل

نامہ بر کے جواب میں

چلو میں نے مانا
ادھر کچھ دنوں سے وہ مجھ سے خفا ہے
بہت ہی خفا ہے
میری کوئی بات
کوئی عمل
کوئی فکر
اُس کو گوارا نہیں ہے
میرے پھول قصّے
اس کے لئے خار ہی خار ہیں
میرا شبنم رویّہ
اس کے لئے شعلہ آسا ہے لیکن
باوجود ان حقائق کے
اِس کلیہ پہ مجھ کو یقیں ہے،
بے انتہا دھوپ بے انتہا بارشوں کی امیں ہے

مہاجر

مجھے مہاجر تو کہہ رہے ہو
مگر یہ کیوں بھولنے لگے ہو
تمہارے میرے بزرگ جو تھے
وہی تو تھے اولیں مہاجر
جو آسماں سے
تمہاری میری زمیں پہ آ بسے تھے اک دن
اور پھر یہ بھی بھولتے ہو
تمہاری میری حیات جس دن تمام ہوگی
زمیں سے ہجرت کریں گے دونوں

مجھے مہاجر تو کہہ رہے ہو
تم کون ہو؟

● ۱/۵۷۲-۴ سنگرا اش دارڈی، گلبرگہ (کرناٹک)



خالد سہیل
PENT HOUSE NO.6 100 WHITE OAKS CRT
WHITBY ONTARIO CANADA L1P 1B7

کچّے دھاگے

میں ہر روز شام کو جورج سے ملنے ہسپتال چلا جاتا، گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا رہتا اور پھر دل شکستہ گھر لوٹ آتا۔ بعض دفعہ تو تھکان اتنا نڈھال کر دیتی کہ سر میں درد ہونے لگتا گھر میں شمسہ میرے سر کو دباتی۔ مجھے دودھ کے ساتھ اسپرین کی دو گولیاں دیتی اور میں سو جاتا۔ لیکن پھر آدھی رات کو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا اور پھر بقیہ رات کروٹیں بدلتے گزار دیتا۔

"جورج کی بیماری تمہیں بھی بیمار کر دے گی"، شمسہ مجھے سمجھاتی لیکن میں اس کی باتوں کو نظر انداز کر دیتا۔ ان تین مہینوں میں جس کی ہر شام میں نے جورج کے کمرے میں گزاری تھی۔ اس کا نہ کوئی دوست نہ رشتے دار اور نہ ہی رفیقِ کار اس کی تیمار داری کرنے آیا تھا۔ جورج کی بیماری اسے گھن کی طرح کھا گئی تھی۔ اور اسے بسترِ مرگ پر گھسیٹ لائی تھی۔

"کہیں میرا تو یہ حشر نہ ہوگا؟" اس خیال کے آتے ہی میرے پورے بدن میں بجلی دوڑ جاتی۔

میں نے جورج کو زینہ بہ زینہ زندگی کی قبر میں اترتے دیکھا تھا — اس کے من کے سورج کو، جو ابھی پوری طرح چمکا بھی نہ تھا۔ گرہن لگ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں جو ہر لمحہ مسکراتی رہتی تھیں، روٹھ گئی تھیں۔

اس کے گال، جو شرارت سے سرخ رہتے تھے۔ اندر کو دھنس گئے تھے۔ اس کے ہونٹ جو بوسوں سے شاداب رہتے تھے، ویران ہو گئے تھے۔

اس کی گردن، جو خمدار تھی، سوکھی شاخ بن گئی تھی۔

اس کا سراپا، جو خوبصورتی اور وجاہت کی زندہ مثال ہوا کرتا تھا ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔

اس کی زندگی کا درخت پھلوں، پھولوں اور پتیوں سے محروم ہو گیا تھا۔ اور اپنی عریانی اور بے بسی پہ نادم تھا۔

اس کی سانسیں اکھڑی اکھڑی رہتیں۔

موت اپنا دامن پھیلائے اس کا انتظار کر رہی تھی، اور وہ ہسپتال کے کمرے میں لیٹا زندگی کو الوداع کہنے کی کوشش کر رہا تھا

میں جب پہلی دفعہ جورج سے ملا تھا۔ تو اس کی ذہانت اور حسِ ظرافت سے متاثر ہوا تھا۔ ہم کچھ دوست ایک پارٹی میں لطیفے سنا رہے تھے۔ جب کسی نے کہا "سنا ہے جورج بھی اس محفل میں آیا ہے، اس سے ملے عرصہ بیت گیا ہے اس کے قہقہے دور سے پہچانے جاتے تھے" تو اچانک جورج آ گیا

"THIK OF THE DEVIL AND THERE HE BLOWS"

جورج نے اپنا مخصوص قہقہہ لگایا اور سب سے ہاتھ ملانے لگا۔

"میں DEVIL ہوں لوگ بھی مجھے جورج کہتے، ہیں"

"میں پیغمبر ہوں اور لوگ مجھے شعیب کہتے ہیں" میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا"

"پھر تو ہم دونوں کی خوب نبھے گی۔"

وہ دراز قد انسان تھا۔ قدرے فربہ جسم، گھنگھریالے سنہرے بال، چہرے پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شرارت۔

"انگریزی زبان بہت متعصب ہے" وہ پھر بولا۔

"وہ کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

"اسے مردوں نے اور وہ بھی اسٹریٹ STRAIGHT مردوں نے وضع کیا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔؟"

"انگریزی میں جب HE کہتے ہیں تو اس میں عورتیں شامل ہوتی ہیں۔ لیکن جب SHE کہتے ہیں تو اس میں مرد شامل نہیں ہوتے۔"

"اور اسٹریٹ مردوں کا کس طرح؟"

"اگر انگریزی 'گے' GAY بنائی ہوتی تو اس میں BEHIND اور BACK SEAT DRIVER BACKWARD جیسے MY BACK EXPRESSIONS کے مفہوم مختلف ہوتے"

"لیکن اردو کا بھی یہی حال ہے۔"

"وہ کس طرح؟" جورج متوجہ ہوا۔

"اس میں بھی مردانہ وار مقابلہ اور پیٹھ پیچھے برائی جیسے EXPRESSIONS ہیں۔"

اور ہم دونوں ہنس دیے جیسے ہم دونوں کا ویولینتھ WAVELENGTH ایک جیسا ہو۔

اس کے بعد جورج مجھ سے بات چیت کرنے لگا۔ گفتگو کے دوران پوچھنے لگا۔

"آپ کون سا کھیل کھیلتے ہیں؟"

"ٹینس!"

"میرے پاس ایک ٹی شرٹ ہے۔ میں وہ آپ کو دوں گا"

"اس کی کیا خصوصیت ہے؟"

اس پر لکھا ہے: LOVE MEANS NOTHING FOR TENNIS PLAYERS

اور ہم دونوں مسکرا دیے۔ جورج کہنے لگا کہ وہ بھی ٹینس کھیلتا ہے اور اسے ایک اور ساتھی کی تلاش ہے۔ چنانچہ ہم نے اکٹھے کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے اس وقت اندازہ نہ تھا کہ میں انسانی رشتوں کی کس پگڈنڈی پر چل نکلا ہوں۔ اگلے چند مہینے ہم ہر ہفتے ٹینس کھیلنے لگے ایک ہفتہ وہ میرے گھر آجاتا اور دوسرے ہفتے میں اس کے گھر چلا جاتا۔ جورج نہایت دلچسپ آدمی تھا۔ وہ ہر ہفتے کوئی نیا شوشہ ضرور چھوڑتا۔ ایک دن کہنے لگا۔

"انگریزی زبان گوروں نے بنائی ہے۔"

"وہ کس طرح؟"

"وہ ناپسندیدہ چیز کو کالا بنا دیتے ہیں۔"

"مثلاً۔"

"بلیک مارکیٹ BLACK MARKET بلیک منی BLACK MONEY اور بلیک شیپ BLACK SHEEP"

"ہندوستان میں کالی بلی کا راستہ کاٹ جانا بدشگونی سمجھا جاتا ہے۔ اور صدقہ دیتے وقت کالا بکرا ذبح کیا جاتا ہے۔"

جورج کو اقلیتوں کا بڑا خیال رہتا۔ چاہے وہ عورتیں ہوں، کالے ہوں یا "گے" GAY لوگ ان سب کے لئے اس کا ہمدردانہ دل دھڑکتا اس کی رنگا رنگی مذاق کے نیچے ایک نہایت ہی مخلص اور سنجیدہ دوست چھپا ہوا تھا۔

وہ ایک دفعہ مجھ سے ملنے آیا تو میں نے اسے سیخ کباب کھلائے جو اسے بہت پسند آئے۔ وہ انہیں پاکستانی ہاٹ ڈاگ کہا کرتا تھا۔ پھر میں نے اسے لسی پیش کی، وہ بھی اسے بہت پسند آئی، میں نے چینی ڈال کر اور اس نے نمک ڈال کر پی۔

ایک دفعہ میری والدہ نے مجھے دو ململ کے کرتے بھیجے تو ان میں سے ایک میں نے تحفتاً جورج کو پیش کر دیا۔ وہ اسے لے کر کافی دیر تک ناچتا رہا پھر بولا۔

"پاکستانی عورتیں، مردوں کو بھائی بنا لیتی ہیں تم بھی کہیں یہ حماقت نہ کر لینا۔"

"وہ تو عزت کی بات ہے!"

"عزت کی نہیں منافقت کی بات ہے۔"

اور ہم دونوں ہنس دیے۔

ایک دن جب ہم ٹینس کھیل رہے تھے تو میں فرش پر پھسل گیا اور میرے پاؤں میں موچ آگئی۔ میری کمر کے پٹھے بھی کھنچ گئے۔

اس نے فوراً مجھے اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور کار میں ڈال کر اپنے گھر لے گیا۔ پہلے اس نے میرے جوتے اور موزے اتارے میرے پاؤں پر مرہم لگایا، پھر میری ٹانگ پر مالش کی اور آخر میں مجھے بستر پر لٹا کر میرے سارے بدن کا مساج MASSAGE کیا۔

نہ جانے وہ میری تھکان تھی، اس کا لمس تھا یا ہمارے رشتے کی حدت کہ نہ صرف میرے جسم کا درد دور ہو گیا بلکہ میرے سراپا میں ایک بے نام سی لہر دوڑ گئی۔ ہماری قربتوں نے نیا موڑ

لیا اور جب اس نے میرے سراپا کو اپنے بوسوں سے چھوا تو میں ایک نئی لذت سے سرشار ہوا، ایسی لذت جو عورتوں کی قربت کی لذت سے مشابہ بھی تھی اور مختلف بھی۔

جورج کہنے لگا کہ ایک وہ دور ہوا کرتا تھا جب انسان آدھا مرد تھا اور آدھی عورت یونانی دیومالا میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اور پھر انسان پر خداوند زیوس کا قہر نازل ہوا اور وہ دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اسی دن سے عورت، مرد کی اور مرد عورت کی تلاش میں ہے لیکن جورج کا خیال تھا کہ ہر عورت میں مرد اور ہر مرد میں عورت پوشیدہ ہے۔

اس شام جورج کے لمس سے میرے اندر کی عورت انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی تھی۔ جس سے مجھے حیرانی بھی ہوئی تھی۔ اور پریشانی بھی مجھے یوں لگا تھا جیسے میرے گھر کے تہہ خانے سے ایک خزانہ نکل آیا ہو لیکن ایسا خزانہ جس کے چاروں طرف سانپ پھنکار رہے ہوں۔

اس واقعے کے بعد کئی دفعہ جورج میرے ہاں اور میں اس کے ہاں رات رکا۔ ہمارے رشتے میں دوستی اور محبت آپس میں بغل گیر ہو گئے تھے۔

اور پھر ایک دن جذبات کا شیش محل چکنا چور ہو گیا۔

جورج نے مجھے ایک ایسی محفل میں جانے کی دعوت دی جس میں صرف گیز GAYS اور لیسبینز مدعو تھے میں نے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ شخص جو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رہتا تھا۔ سیخ پا ہو گیا۔

"آخر تم کیوں نہیں جانا چاہتے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"میرا جی نہیں چاہتا، تمہارا اور میرا رشتہ ذاتی ہے۔ ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت ہے!

"کیا تم اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ پارٹیوں میں جاتے تھے یا نہیں؟"

"ہاں جاتا تھا!"

"تو میرے ساتھ جانے میں کیا حرج ہے!"

"تم ہمارے تعلقات کو مشتہر کرنا چاہتے ہو!"

"شعیب!"

وہ ایک بپھرتے ہوئے شیر کی طرح کمرے میں تیز تیز چل رہا تھا۔

"خلوص کسی سے نہیں ڈرتا!"

عشق بے خوف ہوتا ہے

انسانی رشتے قربانیوں سے پنپتے ہیں

اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہ عشق نہیں، ہوس ہے، ہوس۔"

"تم میرے خلوص کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہو۔ میں اس موضوع پر مزید گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔"

اور میں اٹھ کر چلا آیا۔

اس واقعہ کے بعد نہ میں جورج کے ہاں ٹھہرا اور نہ ہی جورج نے میرے ہاں رات گزاری۔

ہمارے تعلقات جو دوستی سے شروع ہوئے تھے، دوستی ہی پر آ کر رک گئے۔

جورج کا خیال تھا کہ میں مغربی دنیا کے لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ملا کر دیکھنے سے گھبراتا ہوں اسے کیا خبر تھی کہ میرے دل میں ابھی مشرقی دنیا کے بیسیوں بت چھپے بیٹھے ہیں۔

کئی مہینے گزر گئے۔ اس دوران جورج کو بل BILL مل گیا اور میری شمہ سے ملاقات ہوئی۔

شمہ اگرچہ ایک مذہبی گھرانے میں پلی تھی۔ لیکن اس کی یونیورسٹی کی تعلیم، زندگی کے تجربات اور دنیا کی سیر نے اسے ایک وسیع النظر انسان بنا دیا تھا۔

ایک دن میں نے شمہ سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں تم میرے دوست جورج سے ملو"

"اس کے بارے میں کچھ بتاؤ"

"وہ نہایت نفیس انسان ہے، مخلص دوست ہے، اسکول ٹیچر ہے۔"

اور گے GAY ہے۔"

"کیا اکیلا رہتا ہے؟"

"نہیں اپنے لوور LOVER بل کے ساتھ۔" میں چاہتا ہوں کسی دن جورج کو ڈنر پر بلاؤں"

"ضرور! جورج کو اکیلے کیوں بلاتے ہو۔ بل کو بھی بلا لو"

میں شمہ کے اس جواب سے حیران ہوا تھا میں نے شمہ کو

UNDER STIMATE کیا تھا۔ وہ میری توقعات سے زیادہ فراخ دل تھی۔

شمسہ، جورزح اور بل سے ملی۔ اس نے دونوں کو کھلے دل سے خوش آمدید کہا۔ ان کی پزیرائی کی بلکہ جب میں جورزح سے تبادلہ خیال کر رہا تھا، وہ بل سے گپ لگا رہی تھی۔ دونوں شمسہ سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے جاتے ہوئے اسے کھانے پر بھی بلایا تھا۔

ویسے تو میں جورزح سے اکثر ملتا رہتا، لیکن کبھی کبھار ہم چاروں بھی اکٹھے ہو جاتے اور کافی گپ شپ رہتی۔

آخر ایک دن جورزح نے مجھے اپنے گھر بلایا۔ وہ اکیلا بیٹھا رو رہا تھا۔ میں نے جورزح کو کبھی اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔

"خیریت تو ہے؟" میں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا"

"ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ مجھے ایڈز۔ AIDS ہو گیا ہے"

"کب بتایا — ؟"

"آج ہی!"

مجھ پر جیسے بجلی گری۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے تسلی دینے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن مجھے جورزح کے ساتھ ساتھ اپنی اور شمسہ کی فکر بھی دامن گیر ہوگئی۔

"ابھی کسی کو بتانا نہیں"، جورزح نے درخواست کی

"اچھا!"

"بل کو بھی نہیں"

"اچھا"

مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ جورزح مجھ پہ بل سے زیادہ اعتبار کر رہا تھا۔ ایک لحاظ سے دوست محبوب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں" میں نے سوچا۔

میں اگلے دن اپنے ڈاکٹر کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ میں ایک ایسے شخص کے ساتھ سو چکا ہوں جسے ایڈز ہو گیا ہے

میں چند دن تک گم سم رہا۔ شمسہ نے کئی بار پوچھا بھی لیکن میں نے طبیعت کی خرابی اور سر درد کا بہانہ کر دیا۔ وہ بھی تھک ہار کر چپ ہو گئی۔

چند مہینوں کے بعد جورزح کو ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ اور پھر اس کا راز سورج بن کر سب کے سروں پر چمکا۔ لیکن وہ سورج، عذاب کا سورج تھا، جس نے سب رشتے جلا کر راکھ کر ڈالے۔

سب سے پہلے اسکول والوں کو پتہ چلا کہ جورزح کو ایڈز ہو گیا ہے اور اسے اسکول سے نکال دیا گیا اس نے لاکھ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کسی کو چھونے سے ایڈز نہیں پھیلتا لیکن اس کی بات کوئی سننے والا نہیں تھا۔ بچوں کے والدین نے احتجاج کیا اخبار میں خبریں چھپیں اور اسے برطرف کر دیا گیا۔

خبر کا چھپنا تھا کہ جورزح کے خاندان کو پتہ چلا اور اس کے والدین نے اسے عاق کر دیا۔ اس کے والد کا خط آیا، جس میں لکھا تھا: "ہمیں امید نہ تھی کہ ایک دن تم شہر میں ہمیں یوں بدنام کر دو گے۔"

آہستہ آہستہ اس کے دوست اس سے کنارہ کش ہو گئے اور آخر بل بھی اسے چھوڑ کر چلا گیا۔

میں نے شمسہ کو بتایا تو وہ بولی "بیچارہ بھری دنیا میں اکیلا رہ گیا ہے"

شمسہ کی ہمدردی سے مجھے ایک بار پھر حیرانگی ہوئی، وہ میری توقعات سے زیادہ رحمدل تھی۔

جورزح کو جس دن ہسپتال جانا تھا وہ ایک سوگوار دن تھا میں اور جورزح کافی دیر تک ہسپتال کے ویٹنگ روم میں بیٹھے رہے پہلے تو ڈاکٹر اور نرس بڑی ہمدردی سے ملے لیکن جوں ہی انہیں پتہ چلا کہ جورزح ایڈز کا مریض ہے، ان کے چہروں پر سرد مہری کا غلاف چڑھ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے انہوں نے اپنے چاروں طرف دیواریں کھڑی کر لی ہوں۔

پہلے جارزح کو دوسری منزل کے ایک علیحدہ کمرے میں رکھا گیا لیکن جب انہیں اندازہ ہوا کہ اس کی طبیعت روز بروز دگرگوں ہوتی جا رہی ہے تو اسے چوتھی منزل پر ایڈز AIDS وارڈ میں داخل کر دیا گیا

میں ہر شام اس سے ملنے جاتا لیکن اکثر اوقات وہ یا تو سو رہا ہوتا یا بے ہوش ہوتا میں اس سے زیادہ اس کی نرس سنتھیا سے بات چیت کرتا جو بہت ہمدرد عورت تھی اور اس کا خاص خیال رکھتی تھی۔

سنتھیا نے مجھے بتایا کہ جورج بہت چڑچڑا ہوگیا ہے
اور بات بات پر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ لیکن پھر کہنے لگی
وہ تمہیں بہت عزیز رکھتا ہے۔

"۔۔ تم کیسے جانتی ہو؟"

"تمہارا نام لیتا ہے تو اس کے بیمار چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے"

میں سنتھیا کے رویئے سے بہت متاثر ہوا تھا میں اس سے پوچھنے لگا۔

"تمہیں یہاں کتنا عرصہ ہوگیا ہے؟"

"ہسپتال میں تو پندرہ سال ہوگئے ہیں لیکن ایڈز وارڈ میں پانچ سال۔"

میں اس دن سے یہاں کام کر رہی ہوں جس دن سے یہ وارڈ کھلا تھا۔"

"ان پانچ سالوں میں کیا کوئی فرق آیا ہے؟"

"بہت فرق۔ مریضوں میں بھی، نرسوں میں بھی۔ مریضوں کے خاندانوں میں بھی اور عوام میں بھی۔"

"کس قسم کا فرق؟"

"پہلے لوگ سمجھتے تھے کہ یہ گے GAY لوگوں کی بیماری ہے اور افریقہ سے آئی ہے اور جنسی تعلقات سے پھیلتی ہے۔
آہستہ آہستہ انہیں اندازہ ہوا کہ وہ امریکہ میں بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ افریقہ میں اور یہ صرف جنسی تعلقات ہی سے نہیں جسم کی کسی رطوبت BODY FLUID سے بھی پھیل سکتی ہے۔
اس وقت ہمارے وارڈ میں پانچ بچے داخل ہیں۔ ان میں سے دو ہیموفیلیا HEMOPHILIA مریض ہیں جنہیں خون سے یہ بیماری ملی ہے اور تین بچے تو ماں کے پیٹ ہی سے یہ بیماری لے کر آئے ہیں۔"

"لوگوں کے رویئے میں کیا فرق آیا ہے؟"

"لوگوں کو آہستہ آہستہ احساس ہو رہا ہے کہ یہ لوگ نہ تو مجرم ہیں نہ گنہگار۔ یہ مریض ہیں اور انہیں ہمدردی کی ضرورت ہے غصے اور نفرت کی نہیں۔"

ہم ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ جورج نیند سے بے دار ہوگیا۔ میں نے اور سنتھیا نے مل کر اس کی مدد کی اور وہ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اس کے زرد بیمار چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔

"مجھے تمہاری بستی بہت یاد آتی ہے۔ اگلی دفعہ لے کر آنا۔ تم میٹھی پینا میں نمکین پیوں گا۔"

"بہت اچھا!"

"اور میرا کرتا بھی لے کر آنا"

"لیکن تم تو بھائی نہیں بننا چاہتے تھے۔"

"چلو بہن بنا لینا"

اور ہم دونوں مسکرا دیئے پھر وہ اچانک بہت جذباتی ہوگیا۔

"شعیب! میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے۔"

"میں نے بھی!"

"تم نے کیا سیکھا ہے" اس نے پوچھا

"محبت کرنے کے لئے انسان کو قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ اور تم نے"

"دوستی محبت سے بھی عظیم تر جذبہ ہے"

اور پھر وہ منہ موڑ کر لیٹ گیا تکیے میں اس کے آنسو جذب ہو رہے تھے۔

وہ میری اور جورج کی آخری گفتگو تھی۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ جورج چند دنوں کا مہمان ہے۔
اگلے دن سنتھیا نے مجھے بتایا کہ جورج کی خواہش ہے کہ میں چند دن کے لئے کام سے چھٹی لے لوں اور اس کے پاس رہوں تاکہ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہونے لگے تو اس کے پاس موجود رہوں۔

اس شام میں ثمینہ کی گود میں سر رکھے رو رہا تھا۔

"تم رو کیوں رہے ہو"، ثمینہ نے پوچھا

"میرے دل پر بھاری بوجھ ہے۔ میرا دوست مر رہا ہے"

"شعیب! مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں تم نہایت ہی خود غرض انسان ہو"

میں اس جملے کے لئے تیار نہیں تھا۔

"تم خود غرض ہی نہیں، بزدل اور ذلیل بھی ہو۔"

"خیریت! میں حیران پریشان تھا۔"

"تم کیا سمجھتے ہو کہ میں کوئی بیوقوف لڑکی ہوں میں سب کچھ جانتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ جورج تمہارا دوست ہی نہیں محبوب بھی تھا"

"وہ کیسے؟"

"پہلے دن ہی جب میں ان سے ملی تھی، میں نے بل کی آنکھوں میں تمہارے لئے حسد کی چنگاریاں دیکھ لی تھیں اور میں اتنی نادان بھی نہیں کہ یہ نہ سمجھ سکوں کہ جب سے جورج کو ایڈز ہوا ہے تم ہمیشہ کنڈوم CONDOM کیوں استعمال کرتے ہو۔ اگر تم میں ذرا بھی ہمت اور جرأت ہوتی تو تم مجھ سے کھل کر بات کرتے میں نے تم سے کئی بار پوچھا لیکن تم نے موضوع بدل دیا۔

"میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نے ایڈز ٹیسٹ کرایا ہے اور وہ منفی ہے۔"

میرے سر پر گھڑوں پانی گر گیا۔

"میں کئی ہفتوں سے غصّے میں پھنک رہی تھی۔ کئی دفعہ سوچا کہ تم جیسے ذلیل آدمی کو چھوڑ کر چلی جاؤں، لیکن ......"

اور وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کر دیا۔

میں ساری رات کروٹیں بدلتا رہا،

اگلے دن شمسہ نے آ کر میرے گردن پر اپنی باہیں ڈال دیں لیکن..... "میں نے پوچھا؟"

" مجھے تم سے محبت ہے اور جورج سے ہمدردی۔ میں نے اپنا ٹیسٹ بھی کروایا ہے، وہ بھی منفی ہے۔"

"میں ڈر رہا تھا!"

"کہ میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی!"

میں خاموش رہا

"میرا خیال ہے تم دفتر سے چھٹی لو اور جورج کی بھرپور تیمارداری کرو"

لیکن.......لیکن.......

میری زبان لڑکھڑانے لگی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا

"کئی دفعہ ایڈز کی بیماری کئی سالوں کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔"

"جب ہم اس دریا پر پہنچیں گے تو اسے بھی پار کر لیں گے

میں نے شمسہ کو گلے سے لگا لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے شمسہ نے اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے میری روح کا کانٹا نکال لیا ہو ❀



سحر سعیدی

توا گر ہم رکاب ہو جائے
زندگی کامیاب ہو جائے

ساتھ چھوٹے اگر کہیں تیرا
میرا جینا عذاب ہو جائے

میں کسی کا اگر برا چاہوں
میرا خانہ خراب ہو جائے

تشنہ لب کیا کریں کہاں جائیں
جب سمندر سراب ہو جائے

زندگی خواب تو نہیں لیکن
یہ حقیقت نہ خواب ہو جائے

چاند چہرہ کہاں چھپائے گا
تو اگر بے نقاب ہو جائے

● ۱۷ - ۸ - ۱ - ۱ ٹوٹی کی مسجد اورنگ آباد - ۱ ۰ ۰ ۱ ۴۳۱ (مہاراشٹرا)



عین تابش

ہر بات شروع یہاں پہ سوال سے ہوتی ہے
اب دید کی رسم بھی مال و منال سے ہوتی ہے

جو ملنا ہے سو حجاب اٹھا کر مل جائے
تسکین کہاں امید وصال سے ہوتی ہے

جب چاہوں تجھ کو یاد کروں یا بھولوں میں
الجھن ترتیبِ ماہ و سال سے ہوتی ہے

ہم دنیا کو یا دنیا ہم کو کیا سمجھے
یہ دنیاداری بھی اقبال سے ہوتی ہے

ہر چند کلیدِ خوش بختی کفِ دست میں ہے
تسکین طلب مردہ اعمال سے ہوتی ہے

کم ظرف تھے تس پہ بامِ عروج تلک پہونچے
اب ہم کو دہشت خوابِ زوال سے ہوتی ہے

● آمدادی ہاؤس - گیا - (بہار)

ناشر نقوی

◆

سر سے پا تک خوشبو کرتے رہتے ہیں
خواب مجھے بے قابو کرتے رہتے ہیں

ہوش ربا نگری میں دل کھو جاتا ہے
کومل چہرے جادو کرتے رہتے ہیں

ان کے تصور جیسے دل کے آنگن میں
جگمگ جگمگ جگنو کرتے رہتے ہیں

محنت سے تسلیم کی حد تک مجبوری
کیا کیا دست و بازو کرتے رہتے ہیں

وہ خوشیوں کی لذت کو کیا سمجھیں گے
جو آنکھوں کو آنسو کرتے رہتے ہیں

● ۶۱۰، سیکٹر ۱۶، پنچکولہ - (ہریانہ)

عفت موہانی

۸/۱۱۳۰-۹-۱۶- اولڈ ملک پیٹ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۳۶

بلّو

بلّو اپنے چھپر تلے بیٹھا کسی گاہک کی سائیکل میں پنچر جوڑ رہا تھا۔ اس کے ارد گرد الم غلم سامان بکھرا پڑا تھا۔ پھٹے ہوئے ٹائر، پیچ کش، ٹیوب اور پنّا نے کی کی۔ گاہک کی تاکید پر اس کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ تبھی اس نے شہر میں فساد کے پھوٹ پڑنے کی خبر سنی۔ کئی گالیاں اس کے دل کی گہرائی سے نکلیں اور ہونٹوں تک آتے آتے دم توڑ گئیں۔ اس نے مسجد کے امام صاحب سے سن رکھا تھا کہ گالیاں بکنا ایک شریف آدمی کی شان کے خلاف ہوتا ہے۔ بیچارہ شریف تھا کہ نہیں مگر خود کو بہت شریف سمجھتا تھا۔ کیونکہ کسی کے لینے دینے میں نہ تھا۔ نہ اس نے کسی کا کچھ بگاڑا تھا۔ نہ اسے کسی نے آج تک کوئی تکلیف پہونچائی تھی پھر خوامخواہ گالیاں بک کے زبان خراب کیوں کرتا۔ لیکن فساد اور کرفیو کا نام سنتے ہی اس کا جی چاہتا کہ ایسی ایسی گالیاں بکے اور ایسے ایسے کوسنے دے کہ آج تک گوشت نمک نے بھی نہ سنے ہوں۔ اس کا معمول سادہ معمولی کتنا مندہ ہو جاتا تھا۔ روٹی نمک کے بھی لالے پڑ جاتے تھے سرکاری نل سے ایک مٹکا پانی تک نہ لا سکتا تھا۔ اور اس کے پڑوس میں بھی کوئی نہ تھا کہ اس کے آڑے وقت اس کی مدد کر سکتا۔ کیونکہ وہ رہتا ہی ایسی جگہ تھا کہ کہیں اس کا ہمسایہ نہ تھا۔

فساد کا نام سنتے ہی اس کا گاہک گھبرا گیا۔

یونہی دے دے بلو۔ گھسیٹتا ہوا گھر پہونچ جاؤں گا۔“ وہ بولا۔ ”اب کرفیو لگ جائے گا۔ دیکھتے نہیں کہ پولس چیونٹی کی طرح ابل پڑی ہے۔ خدا ہی رحم کرے۔ اب آئی مصیبت دس پانچ دن کے لئے لگ گیا صاحب۔ یہ لو۔“ بلو خود پریشان تھا۔ گاہک کے ہاتھ سے اس نے پیسے جھپٹ لئے اور جلدی جلدی اپنا بکھرا ہوا سامان میلے کچیلے تھیلے میں بھرا اور ٹاٹ کا سائبان گھسیٹ کر کندھے پر رکھا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ گاہک تو نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے مٹھی کھول کر دیکھی۔ اور حیرت سے سر ہلایا۔

”بے چارہ بدحواس ہو گیا تھا۔ دو روپے کی جگہ پانچ روپے کا نوٹ دے گیا۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”خیر! کبھی نہ کبھی تو وہ ادھر سے گزرے گا۔ اس کے تین روپے اسے واپس کر دوں گا۔“

وہ فٹ پاتھ سے نیچے اترا تو ہانپ رہا تھا۔ ابھی اسے مدد رہا نہ تھا۔ وہ روز ہی سائیکلوں کی مرمت کرتا تھا۔ مگر اس کے پاس کوئی ٹوٹی پھوٹی سی سائیکل نہ تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتا تقریباً بھاگ رہا تھا! اور دیکھتا جاتا تھا۔ کہ آس پاس کی دوکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگی تھیں۔ افراتفری میں لوگ بھاگ رہے تھے۔ لوگوں کا ایک سیل بے پناہ تھا جو بھگدڑ کی صورت میں رواں دواں تھا۔ وہ بھی تیز تیز قدم اٹھاتا اس بھیڑ میں مل گیا۔ اور سوچنے لگا کہ گھر میں کھانے پینے کے لئے کچھ تھا کہ نہیں۔ آٹے کی مٹکی تو دو دن پہلے ہی خالی ہو چکی تھی بھر جاول وہ صبح ہی کو پکا کے دکان کھولنے اور کچھ نہ کچھ کمائی کرنے آ بیٹھا تھا۔ صرف پانچ ہی روپے کا کام کر سکا تھا۔ بلکہ صرف دو روپے کا کام کیا تھا کہ کرفیو کی مصیبت نازل ہو گئی اب رک گیا کام بنانے کتنے دنوں کیلئے۔ کیا ہو گا تب تک۔ اس نے ایک آہ سرد بھر کر نیلے آسمان کی جانب دیکھا۔ وہ ہمیشہ کا ساپُر سکون اور خاموش تھا۔ نہ وہاں گھنگھور گھٹا ٹوپ بادل تھے نہ بجلیوں کی خوفناک چمک تھی۔ اور نہ دل ہلا دینے والی گرج تھی۔ خاموش آسمان بڑے تحمل اور صبر سے زمین کے طوفان کا نظارہ کر رہا تھا۔

بلّو کو اپنے خدا سے بہت محبت تھی۔ وہ بڑا مہربان تھا۔ رحیم و کریم تھا۔ وہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو خود انسانوں کے کرتوں کا پھل تھا۔

نفاق، دشمنی، مذہب کے جھگڑوں، اعمال بد کے طور پر سزا تھی کیا ایک ماں اپنے شریر بچے کو سزا نہیں دیتی۔ سو یہ تو سزا تھی۔ اب بہتر تھا

خون بہے گا۔ وہ خون چاہے کسی بھی مذہب کا ہو۔ سرخ ہوگا: کسی کا سبز کسی کا نیلا نہ ہوگا اور وہ سارے انسان رحیم و رام کو سلام و پرنام کرنے والے ہوں گے۔ جن کی صورتیں ایک سی ہوں گی۔ جن کے پیدا ہونے اور مرنے کے طریقے ایک سے ہوں گے۔ اب نجانے کتنی گودیاں اجڑیں گی، کتنے بچے باپ کی یاد میں بلکیں گے کتنی بھری مانگوں سے افشاں چھوٹے گی۔ سیندور مٹے گی۔۔ نجانے کیا ہوگا۔ اب۔

رحم کرنا میرے مالک رحم کرنا۔ اپنے جھونپڑے میں پہونچ کر اس نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی، اور تھیلا کندھے سے اتار کر ایک کونے میں رکھ دیا۔ پھر کان لگا کے سننے کی کوشش کرنے لگا۔ ہر طرف صرف ایک گونج تھی۔ سناٹے کی گونج، بازار بند ہو چکے تھے۔ مدرسے خالی ہو چکے تھے، دکانوں پر تالے لگ گئے تھے۔ زندگی مر چکی تھی زندگی کی چہل پہل پر نزع کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ زندگی کی آنکھیں کھولنے اور سانس لینے میں ابھی دیر تھی۔ ابھی تو صرف پولس کے بھاری قدموں کی خوفناک چاپ تھی جو ہر طرف گونج رہی تھی۔ پولس اسلئے تو نہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے۔ اس کی دل چسپی اور جی بہلانے کے لئے بھی ایسے خونریز کھیل بہت ضروری ہیں:۔

بلو جھونپڑے میں آکے اپنے بوسیدہ ڈبے اور رکھی ہوئی ہانڈیوں میں جھانکا، اس کے پیٹ کی طرح وہ سب خالی تھیں۔ صرف ایک چھاج میں چھٹانک بھر چاول پڑے تھے۔ اس نے اطمینان کی سانس لی، شام تک کا سہارا ہو جائے گا کل کا مالک اللہ ہے!

اللہ کہتے ہوئے اس کے جسم میں مسرت اور فخر کا ایک فوارہ سا چھوٹا تھا کتنی خوشی کی بات تھی۔ سارے جہان کا مالک اس کا بھی مالک تھا۔ اسے اس کا نام لینے اسے یاد کرنے کا حق حاصل تھا۔ کتنا چاہتا تھا وہ اپنے اللہ کو۔ اور بے خبری کی جنت میں سانس لیتے ہوئے حضرت موسیٰ کا چرواہا بن جاتا تھا۔ اگر اللہ اس کے جھونپڑے میں آجاتا۔ تب اگر وہ خوشی کے مارے مر نہ جائے گا تو کتنی خاطریں کرے گا اللہ میاں کی۔ انہیں سلام کرے گا۔ ان کے قدموں سے لپٹ جائے گا۔ اپنے آنسوؤں سے ان کے قدموں کو دھو دے گا! اپنے لئے ان سے کچھ بھی نہیں مانگے گا۔ بس رو رو کر یہی کہے گا کہ میرے اللہ میاں آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ رحیم ہیں کریم ہیں۔ سارے جہانوں کے پروردگار ہیں سب کے پالن ہار ہیں۔ ان سارے انسانوں کو آپ نے بنایا ہے۔ ایک صورت شکل، ایک خون دے کر۔ مذہب کا چھلہ

تو ہم نے خود ہی اپنی ذات پر لگا لیا ہے۔ سارے انسان برابر ہیں۔ مٹھی بھر زندگی لے کے آئے ہیں۔ جو اپنے اختیار کی بھی نہیں۔ اسے بخش دیجئے۔ مٹھی بھر زندگی یوں پل بھر میں کسی گولی یا کسی خنجر سے ختم ہونے والی چیز نہیں۔ جس کی جتنی بھی سانسیں ہیں اسے بخش دیجئے۔ اللہ میاں بخش دیجئے۔ دنیا بھر کے لوگوں کے مقابلے میں میری ایک زندگی کی کوئی حقیقت نہیں۔ میں سب کی طرف سے اپنی قربانی دینے کو تیار ہوں۔ میرے اللہ بچا لے۔ بچا لے دلہنوں کی مانگ اجڑنے سے، ننھے منے بچوں کو یتیم ہونے سے۔۔ بوڑھی ماؤں کے جوان بیٹوں کے مرنے سے اور اسی طرح دل سے باتیں کرتے ہوئے وہ رونے لگا۔

اب چاروں طرف مکمل سناٹا تھا آسمان کی شفاف نیلاہٹوں میں آزاد پرندے تیر رہے تھے، اور ساری دنیا خوف و دہشت کی چادر اوڑھے سو رہی تھی۔

اس نے تھوڑے سے چاول کے لئے مردہ آنچ دیتے ہوئے چولہے پر رکھ دیئے اور پھر اپنی ادھوری سوچوں میں ڈوب گیا۔

ایک زمانہ ہو گیا تھا۔ اسے اس جھونپڑی میں رہتے ہوئے۔ انسانوں سے چھلکتی اس دنیا میں بالکل یک و تنہا۔ اپنی ماں تو اسے یاد ہی نہ تھی۔ لاکھ دماغ پر زور دینے کے باوجود اسے یاد نہ آتا کہ کبھی کسی ماں کی شفیق نرم گرم آغوش میں وہ بیٹھا ہو۔ کسی نے اپنے لب اس کے گال پر رکھے ہوں کسی نے پیار سے اسے کھانا کھلایا ہو۔ ماں تو تبھی دنیا چھوڑ گئی تھی جب وہ سال بھر کا تھا۔ اسے تو بس ابا نے پالا پوسا تھا۔ اسے اتنا یاد تھا کہ وہ ان کی انگلی پکڑ کے بازار جاتا تھا۔ اور آس پاس کے لوگوں کا سودا سلف لاتے ہوئے ابا اسے بھی دو تین بسکٹ یا ایک ٹکڑا مٹھائی کا پکڑا دیتے تھے پھر ایک دن اس نے یہ غلغلہ سنا کہ ابا پر سے ایک بس گزر گئی تھی۔ اس سانحہ کے بعد اسے کچھ یاد نہ آتا۔ پھر کیا ہوا تھا۔ ہوش کی آنکھیں کھولنے کے بعد سے اس نے یہی ایک جھونپڑی دیکھی تھی! اس کے دو تین دوست بھی تھے۔ جو پہلے پہل اس کے ساتھ گولیاں کھیلتے اور پتنگ اڑاتے تھے۔ پھر کرمو تو شہر چلا گیا، اور بہت دنوں تک کرم اس کے ساتھ پنکچر جوڑنے کا کام کرتا رہا۔ اور باپ کے مرنے کے بعد وہ بھی کہیں چلا گیا! اس کے بعد سے بلو اکیلا ہی رہ گیا:۔ تیس سال کا ہو چکا تھا۔ مگر اسے کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ

یہ عمر نئے خواب دیکھنے کی ہوتی ہے۔ پیٹ اگر پیچھے سے جا لگا ہو تب بھی پائل کی جھنکار سن کر جی سیر ہو جاتا ہے اور دل کی ہر دھڑکن میں ایک نازک سی چاپ گونجتی ہے۔ وہ ان ساری نزاکتوں سے ماورئی عجیب سی اور کھی پھیکی زندگی گزار رہا تھا اور مگن تھا۔ ایک چلتی ہوئی سڑک کے فٹ پاتھ پر اس نے ٹاٹ کا سائبان تان لیا تھا اور چنا ورزار خرید کر اپنی دانست میں پنکچر جوڑنے کی ایک شاندار دوکان کھول لی تھی روز وہ بڑے آرام سے بیس پچیس روپے کما لیتا تھا۔ اور خرچ بھی کر دیتا تھا۔ اسے جہانگیر کی معذور ماں پر بڑا ترس آتا۔ جو دو سال سے مفلوج بستر پر پڑی تھی اور نہ مرتی تھی اور نہ جیتی تھی۔ جہانگیر بدمعاش نکلا تھا۔ ماں کی اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ یہ فرض تو بلو نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ کہ اسے کھلانے پلانے اور دوائیوں کا گرانقدر خرچ دس روپیوں کی شکل میں دے دیتا تھا۔ تبھی تو وہ خود ایک پائی پیچھے نہ ڈال سکا تھا۔ مگر خوش رہتا تھا کہ وہ ایک بیمار کی خدمت کر کے بہت سی نیکیاں سمیٹ رہا تھا۔

اس نے ابلے ہوئے چاولوں پر دو چٹکی نمک مرچ چھڑکا اور اور کھا پی کے بورے پر آ لیٹا۔ تھوڑی سی اونگھ آئی تھی کہ یاد آیا۔ کہ ابھی پاس کی مسجد میں جھاڑو دینا اور پانی بھرنا ہے۔ یہ بھی اس کا روز کا فرض تھا۔

ایک دن امام صاحب نے اسے غیرت دلائی تھی۔

"بلو تو خود کو مسلمان کہتا ہے" مگر کبھی نماز نہیں پڑھتا۔ یاد رکھ قیامت کے روز نماز کی پوچھ سب سے پہلے ہو گی تو خدا کو کیا جواب دے گا۔"

بلو شرمندہ ہو کے گڑ گڑایا تھا۔
نماز نہیں آتی۔ مولی صاحب آپ سکھاؤ۔ میں سیکھ لوں گا روز پڑھا کروں گا۔"

مولوی صاحب نے اسے نماز سکھانے کی کوشش کی لیکن وہ ظہر کو مغرب اور فجر کو عشاء کی نمازیں کہنے لگا اور بسم اللہ کے سوا کچھ اور نہ سیکھ سکا تو استاد اور شاگرد دونوں بیزار ہو گئے۔

"تو نہیں سیکھ سکتا میاں۔" مولوی صاحب نے فتویٰ صادر فرما دیا اب میرا بھیجا مت کھانا۔"
میں اللہ کے گھر میں جھاڑو دیا کروں گا۔ نمازیوں کیلئے پانی بھروں گا جا نمازیں بچھاؤں گا۔" بلو نے بڑے یقین سے کہا۔ اللہ میاں

جب پوچھیں گے تو ہاتھ جوڑ کر کہوں گا۔ مالک میں آپ کے گھر کی صفائی کرتا تھا۔ اور میرے سر کے علاوہ میرا دل بھی آپ کو سجدے کرتا تھا۔ اے میرا پروردگار بڑا بخشش والا ہے۔ بخش دے گا۔"

اور بلو مسجد کی صفائی میں جٹ گیا۔ ایک ایک کونہ صاف کرتا جالے جھاڑتا۔ فرش دھوتا۔ اللہ کا گھر ہے۔ عالیشان کوٹھیوں سے بھی عالیشان۔ اسے تو آئینے کی طرح چمکنا چاہیئے۔
پھر کہیں سے ظہر کی آذان ہوئی اور اسے کسی نے آواز بھی دی۔

"بلو کیا سو گئے بھائی۔"
غفور کی آواز پہچان کر وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔
کرفیو لگا ہے۔ کیسے آ گئے یہاں تک؟
وہ بولا "کیا ہوا۔" تم رو رہے ہو کیا۔"
بلو میری سکینہ آخری سانسوں پر ہے۔" غفور اس کے پاس آ کھڑا ہوا میں کیا کروں۔ شہر میں قبرستان بنا ہوا ہے۔ کون سے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔ ڈاکٹر ملے گا بھی کہاں۔ میں بڑی مشکل سے گلیوں گلیوں ہوتا ہوا آیا ہوں۔"

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے غفور بھیا۔" بلو جلدی سے کھڑا ہوتا ہوا بولا۔" چلو میں چلتا ہوں۔ پولس کے پاس جا کے وہ جو بناتے ہیں۔ کرفیو پاس۔ وہ بنوا لیں گے اور سکینہ کو دواخانے میں شریک کروا دیں گے۔ چلو جلدی کرو۔!"

"میں کیسے چلوں غفور پریشان ہو کر بولا۔" گھر پر تمہاری بھابھی اکیلی ہے۔ بیمار بچی کا ساتھ ہے۔ بلو تم ہی کرم کرو۔ اگر بنوا سکتے ہو پاس تو بھیا بنوا لو۔ مگر ذرا سنبھل کے میرے بھائی۔ سنا ہے کہ ایک محلے میں آدمی کو دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم جاری ہوا ہے۔"

"ہاں ہاں۔ تم جمع خاطر رہنا۔" بلو جو ہر ایک کے اچھے برے کام میں آگے آگے ہو جاتا تھا۔ بیمار بچی کی خاطر گھر سے نکلا اور جی کڑا کر کے سڑک پر آ گیا۔ یہاں سپاہی بندوقیں لئے گشت پر تھے۔ اسے دیکھ کر ایک پولس والا للکارا۔ بلو گڑ گڑایا۔

"سرکار مائی باپ۔" اس ہاتھ جوڑ دیئے "میرے بھائی کی بچی بیمار ہے آخری سانس لے رہی ہے۔ اسے دواخانے لے جانا ہے۔ حضور رحم کرو۔ کرفیو پاس دے دو سرکار۔ خدا بھلا

کیسے گا۔

جوا ہی میں بندوق کا کندہ اس کی کمر پہ پڑا۔ اور چند گالیاں کانوں میں
کسی نے اس کی کمزور گردن فولادی انگلیوں کے شکنجے میں جکڑ دی اور آگے دھکیل دیا۔ وہ دور تک بھاگتا ہوا اچھلا گیا۔ جدھر سے گزرا لڑکے بالے کھلے تھے، گالیاں سنیں اور جب کراہتا ہوا مرتا کھپتا غفور کے گھر پہنچا تو دروازے پر ہی اسے سکینہ کی ماں کے رونے کی آواز سن لی۔ اب ایک دوسرا کام درپیش تھا۔ مزدوری کا کام۔ سکینہ تو مر کے شکھ سے ہو گئی تھی۔ مگر دو دن کو بڑی مشکل میں ڈال گئی تھی۔ یہ بلو ہی تھا۔ جس نے پیچھے پچھلے چند لوگوں کو اکٹھا کیا تھا۔ کوئی جیالا بالآخر پاس ہوا لایا۔ سکینہ غریب کی بچی تھی۔ اسے آخری وقت میں بھی نیا لباس نصیب نہیں ہو سکا:۔ ماں کی پرانی ساڑی میں لپیٹ کر اس کا جنازہ تیار ہوا اور چند آدمی اسے لے کے چلے گئے——

رات کو معلوم ہوا کہ مائی تاشنی چل بسی، اس کے گھر سے آہ و بکا کا شور اٹھ رہا تھا۔ اب مائی تاشنی کو پھونکنا تھا۔ اس کے گھر والوں کو تو کوئی ہوش ہی نہ رہا۔ بلو پھر باہر نکلا۔ اب تو سارا شہر پچ پچ شہر خموشاں لگ رہا تھا اور اس مریضانہ روشنی میں پولس کے سپاہیوں کے لمبے لمبے سائے سڑکوں پر حرکت کر رہے تھے۔ کہیں کوئی آدم زاد تھا نہ آوارہ حیوان۔ سب ہی اپنی اپنی مکین گاہوں میں چھپے بیٹھے تھے——

انسان کیوں انسان کا دشمن ہو گیا ہے۔ کسی کو ذرا بھی احساس نہیں۔ کہیں کوئی بیمار تڑپ رہا ہوگا۔ اسے دوا نہیں ملی۔ کہیں کوئی مر گیا ہوگا۔: اسے کفن نصیب نہیں ہوا ہوگا۔

مائی تاشنی جسم میں پانی بھر جانے سے مری تھی۔ اگر اس کا کریاکرم جلدی نہ کیا جاتا تو اس کا پیٹ گھڑی ہی میں پھٹ جاتا۔ مائی تاشنی سے وہ اپنے برے وقتوں میں ادھار لے چکا تھا۔ لہٰذا اب اس کا ادھار چکانا تھا۔ بلو پھر باہر نکلا۔ شاید اب کی پچھلے والے جلادوں سے واسطہ نہ پڑے مگر بھول گیا تھا کہ جلادوں کی شکلیں لاکھ الگ الگ ہوں۔ ان کا کام ایک ہی ہوتا ہے۔ اسے گلی کے نکڑ کے سرے پر دیکھ کر ایک سپاہی چیخا۔

"مار دو پکڑ لو اسے بار بار گھر سے باہر کیوں آ رہا ہے کیا اسے معلوم نہیں کہ شہر میں کرفیو لگا ہوا ہے۔"

حضور۔ مائی باپ۔ محلے کی ایک بوڑھی مائی مر گئی ہے۔

اس کا کریاکرم ——" بلو کہتا ہی رہ گیا۔ اور اس پر گھونسہ برسنے لگا۔

مار ڈالو ——" دوسرا بولا " مجھے تو سالا دہشت گرد لگ رہا ہے۔

کسی خفیہ جماعت کا معلوم ہوتا ہے اس کے پاس آتش گیر ہتھیار ہوگا۔ گولی مار دو" تیسرے نے کہا اور دو تین سپاہیوں نے اسے برہنہ کر دیا۔ اب بلو میں نہ بولنے کی سکت تھی نہ اپنی مدافعت کی۔ وہ دور سے کراہتا وہ جان بچانے کی خاطر اپنی جھونپڑی کی طرف بھاگنے لگا تبھی دفعتاً اسے ایسا لگا جیسے اس کے گھٹنے کے پیچھے سلگتا ہوا انگارہ گھس گیا ہو۔ کسی نے اسے گولی مار دی تھی۔

بلو کے منھ سے ایک چیخ اور سپاہیوں کے حلق سے ہنسی ایک ساتھ نکلی——

وہ جھونپڑی میں آکر گر گیا۔ گولی گوشت کے آر پار ہو گئی تھی۔ اور خون یوں بہہ رہا تھا جیسے نل کی ٹونٹی کھل گئی ہو۔ وہ فرش پر پڑا چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ اور درد کی شدت سے نیم بیہوش ہو چلا تھا۔ اسے ذرا سی دیر کو ہوش آیا۔ اس نے سرک کر پانی کی تلاش میں صراحی ترچھی کی۔ وہ خشک تھی۔ آج صبح اس نے پانی بھی نہیں بھرا تھا اور اب درد پیاس کی شدت میں مل کر اسے موت کے قریب پہنچا رہا تھا۔ اس نے بار بار ہوش میں آکر سوکھی صراحی دیکھی۔ پھر بیہوش ہوا، پھر ہوش میں آیا اور پھر سوچوں سے عاری ہو گیا۔ اس کی ٹانگ اکڑ گئی تھی۔ زخم سے خون رس رہا تھا۔ باہر شام کا سوگوار اندھیرا اتر آیا۔

تیسرے دن کرفیو میں نرمی دی گئی۔ مدتوں سے گھر میں بند لوگ باہر نکلے اور تھوڑی سی چہل پہل پیدا ہوئی۔ دکانیں کھلیں، خریداری کا زور و شور سے شروع ہو گئی۔ محلے کے چند لوگ بڑی ہمدردی سے بلو کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ تین دن ہو چکے تھے۔ وہ گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ آخر کیا کرتا تھا وہ۔ بابا کرم دین، چچا ولی داد اور بھیا مرشد سب اس کی جھونپڑی تک آئے اور چچا ولی داد نے آگے بڑھ کر اسے پکارا۔ پھر ہول کے پیچھے ہٹے کہ دروازوں سے ٹکرا گئے۔ سب گردنیں اونچی کر کے جھونپڑی کے اندر دیکھنے لگے۔

بلو اپنے سوکھے ہوئے خون میں اکڑا پڑا تھا۔ اور لال خون آشام چیونٹیوں کی ایک قطار اس کے کھلے ہوئے منھ میں جا رہی تھی

وہ جو سب کا تھا۔ اس کا کوئی نہ ہوا۔



شارق عدیل

اتر رہا تھا سمندر سراب کے اندر
بچھڑ کے جب میں ملا خود سے خواب کے اندر

رگیں کھنچیں تو بدن خواب کی طرح ٹوٹا
خلا کا زعم بھرا تھا حباب کے اندر

عجب جنون مری انگلیوں میں جاگا ہے
کہ خون ڈھونڈتی ہیں گلاب کے اندر

میں ماہ و سال کے کیتک حساب لکھ کے رکھوں
اسیر پوری صدی ہے عذاب کے اندر

نظر کو فیض ملا تو لبوں پہ مہر لگی
فرات یوں بھی ملی ہے سراب کے اندر

● اے، ایم، یو۔ مارکیٹ۔ علیگڑھ۔ ۲۰۲۰۰۱



شکیل قمر

نقش افلاس کے بے رنگ رہیں گے کب تک
ظلم ریشم کی قباؤں کے سہیں گے کب تک

ہم کو دستورِ جہاں خود ہی بدلنا ہوگا
ورنہ ظالم کو شہنشاہ کہیں گے کب تک

کیوں نہ مظلوم کو تلوار تھما دی جائے
لوگ بڑھتے ہوئے یہ ظلم سہیں گے کب تک

ان کی شہ رگ پہ بھی نشتر کا کوئی وار کرو
حق کو سولی پہ چڑھاتے وہ رہیں گے کب تک

آؤ کچھ چارہ کریں جان کی حفاظت کا قمر
خونِ انسان سے دریا یہ بہیں گے کب تک

● 226 WOODLANDS ROAD
MANCHESTER. M8. 7QJ.



جاوید اکرم

اپنے آپ کو تنہا کر کے دیکھتے ہیں
ہم بھی آج تماشہ کر کے دیکھتے ہیں

شاید ہم پہچان لیں اپنے چہرے کو
آئینے کو دھندلا کر کے دیکھتے ہیں

وہ بھی کیا اتنا ہی ٹوٹ کے چاہتا ہے
اب کے اس سے جھگڑا کر کے دیکھتے ہیں

بہت سنے ہیں ہجر کے قصے ہم نے بھی
پورے چاند کو آدھا کر کے دیکھتے ہیں

دیکھیں اس میں کیا تبدیلی آتی ہے
ہنستے ہنستے غصہ کر کے دیکھتے ہیں

کوئی تو صورت نکلے دل کے بہلنے کی
ایسا نہیں تو ایسا کر کے دیکھتے ہیں

ہر خواہش اب بچوں جیسی لگتی ہے
ہر خواہش کو بوڑھا کر کے دیکھتے ہیں

● ۲/۲۵ بجے، کے، کالونی۔ کانپور ۲۰



جیب کیفی

۱۵۹، ذاکر حسین کالونی، ۵-چوپاسنی روڈ جودھپور ۳۴۲۰۰۳

لذیذ کھانا

کاندھے پر اچانک ہی آہستگی کے ساتھ کسی نے ہاتھ رکھا تو معصوم علی نے گردن گھما کر دیکھا۔ ایک انجان شخص ہونٹوں پر مسکان لیے اس کے برابر کھڑا تھا۔ کون ہے؟ اب سے پہلے کہاں دیکھا ہے اسے؟ ... ذہن پر زور ڈالنے کے باوجود وہ کچھ طے نہ کر پایا تو وہ شخص قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"نہیں پہچانا؟" ہنستے ہوئے وہ بولا۔

"معاف کیجئے، ان دنوں میری یادداشت کچھ کمزور ہو چلی ہے" معصوم علی نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ "پر آپ کی صورت مجھے کچھ پہچانی ہوئی سی لگ رہی ہے۔"

"تو پھر میرا نام ہی بتا ڈالیئے۔" اس نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے، دفتر میں دن بھر میں کئی طرح کے لوگ میرے پاس..."

"دفتر کو ماریئے گولی!" اس نے معصوم علی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا۔ "آپ بس مجھے میرا نام ہی بتا دیجیے۔"

"آپ کا نام..." اس نے اپنی یادداشت کو کریدا پر وہ ناکام رہا۔

"مان لیجیے کہ آپ ہار گئے اور سنیئے ـــــ اولمپک روڈ پر مال گودام سے چلی پھلوں سے لدی بیل گاڑیوں میں سے دو چار پھل چرا لینے والے لڑکوں کے سردار معصوم علی! تم اپنے عزیز دوست کو بھول گئے؟..."

"تم کہیں جبار تو نہیں؟"

"کر دیا نا کباڑا!" وہ تھوڑا جھنجھلایا، "میں جبار نہیں ہوں بھئی! سنو، آٹھویں جماعت میں سب سے پیچھے والی بنچ پر بیٹھنے والوں میں سے ایک میں بھی اور خاص شریف طالب علموں میں ہمارا شمار ہوتا تھا۔"

"سمجھا، ہو نہ ہو تم گوپی ہو، گوپی کشن بستا!" اس نے خود اعتمادی کے ساتھ کہا۔

"پھر وہی کباڑا! میں گوپی کشن نہیں ہوں۔ سنو، ہم ذرا اور بڑی عمر کے ہو جاتے ہیں۔ تارا چند، چتھنی اور امرتی کے نام..."

"ارشاد، ارشاد علی!" جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی معصوم علی نے کہا اور بڑھ کر اس نے اسے گلے سے لگا لیا۔

کچھ پل وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے خاموش شکوے شکایت کرتے رہے۔ بعد میں وہ باتیں کرنے لگے۔

"اتنے برسوں بعد ہم ملے۔ تم نے مجھے پہچانا..." معصوم کہہ رہا تھا "پر میں تمہیں پہچان نہ سکا۔ اس کی وجہ کیا رہی آخر؟"

"وجہ تو تم بھی جانتے ہو۔" ارشاد مسکرا رہا تھا۔

"پھر بھی..."

"اس میں تمہاری تعریف کا پہلو ہی نکلتا ہے۔ لوگوں نے تمہیں بتایا بھی ہوگا۔ برسوں بعد میری جسمانی حالت میں زمین آسمان کا فرق آ چلا ہے جبکہ تمہارے حلیے میں اب تک بھی کوئی خاص تبدیلی ظاہر نہیں ہوئی ہے، ہے کہ نہیں؟" ارشاد نے کہا۔

"ہاں، سچ کہا تم نے۔" کہنے کے بعد اس نے بات کا رخ بدلا۔ "ابھی تک تیری تو کوئی خیر خبر ہی نہیں ملی۔"

"اور میں یہ سمجھا کہ تو مر کھپ گیا ہوگا!" ارشاد نے اپنائیت سے کہا۔

"میں تو تیری فاتحہ بھی پڑھ چکا پیارے!" معصوم نے نہلے پر دہلا جملا۔

"یہ فاتحہ اور جنازے وغیرہ کی بات چھوڑ یار۔" ارشاد نے کہا۔ "تو یہ بتا کہ یہاں کیا کر رہا ہے، اس شہر میں؟"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو ادھر پہلی دفعہ آیا ہے۔" معصوم علی نے کہا "اور ہم کیا اس طرح یہاں کب تک باتیں کرتے رہیں گے؟ چل، کسی اچھی جگہ چلتے ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" ارشاد نے اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ

دونوں فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔

"الّو کی دُم! میں اسی شہر میں رہتا ہوں۔۔۔ برسوں سے" اس نے بتایا۔

"بکواس!"

"کیا مطلب ہے؟"

"مطلب یہ کہ سال میں زیادہ نہیں تو چھ سات دفعہ تو ادھر آنا ہوتا ہی ہے۔ میرا کام ہی ایسا ہے۔۔۔ بجلی کے سامان کی سپلائی۔ پر تو مجھے کبھی دکھائی نہیں دیا۔"

"تو دس لاکھ کی آبادی والے اس شہر میں تو بجلی کا سامان والا کس کس پر نگاہ ڈالتا پھرے گا؟ اور پھر کہاں، ہم آوارہ صورت گھومنے والے ہیں! خیر چھوڑ ان باتوں کو۔ بتا کہ تو کہاں رُکا ہے؟"

"مسافر کا کیا ٹھکانہ، کبھی یہ سرائے تو کبھی وہ ہوٹل اور کبھی کبھی تو کھڑے کھڑے ہی لوٹ گئے۔ البتہ ابھی میں 'مغل دربار' میں رُکا ہوا ہوں۔"

"تو پھر سب سے پہلے ایک کام کرتے ہیں۔" معصوم نے ٹھہر کر کہا۔ "تم مغل دربار سے اپنا بوریا بستر گول کرو اور شہنشاہ معصوم علی کے دربار میں، یعنی اس ناچیز کے غریب خانے پر چلے چلو۔"

"ہو گا، یہ بھی ہو گا۔" چلتے چلتے وہ بھی رُک گیا۔ "لیکن یار، اس دفعہ مجھے بخش دے۔ دراصل میں بڑی جلدی میں ہوں۔ مجھے آج رات ہی واپس لوٹ جانا ہے۔"

"تو پھر ملے ہی کیوں؟ جاؤ، لوٹ جاؤ۔ آئندہ بھی نہیں ملنا۔" معصوم نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

لیکن ارشاد نے جب قسمیں کھا کھا کر اپنی مجبوری ظاہر کرنے کے علاوہ اگلی دفعہ اسی کے ہاں ٹکنے کا وعدہ کیا تو وہ بڑی مشکل سے نارمل ہوا۔ بعد میں وہ اس کے اصرار پر اس کے ساتھ 'مغل دربار' بھی گیا۔

ہوٹل کی چکا چوند نے معصوم کو بہت متاثر کیا۔ دوست کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے سوچا، اپنے ہی شہر میں اس قدر شاندار ہوٹل بھی ہے۔ اس کا اندازہ کر پانا ہی مشکل ہے اور کمرے کے اندر کا منظر دیکھ کر تو اسے سخت حیرانی ہوئی۔ شاندار پلنگ، بستر، قالین، پردے، فریج، ٹی۔وی، فون، ٹیبل کرسی اور سبھی کچھ بہت شاندار۔

"ابھی تک بھی خفا ہے کیا؟" اسے چپ چپ دیکھ کر ارشاد نے پوچھا۔

"نہیں بھئی۔ میں اصل میں تمہارے ٹھاٹ دیکھ رہا ہوں۔"

معصوم بولا "یہ سب دیکھ کر لگتا ہے کہ تمہاری آمدنی خاصی ہے۔"

"یہ جو تم دیکھ رہے ہو سب کمپنی والوں کی طرف سے دی گئی سہولتوں کا ایک حصہ ہے۔" بات کا رخ بدلتے ہوئے ارشاد نے کہا۔ "یار باتیں بہت ہوئیں۔۔۔ بڑی بھوک لگی ہے۔ تم اپنی پسند"

"مجھے تو بالکل ہی بھوک نہیں ہے۔" معصوم نے جھوٹ بولا۔

"دوست سے مت اڑو یار۔ برسوں بعد ملے ہیں۔ بے تکلفی سے کام لو۔"

"تو ٹھیک ہے۔" وہ ہنسنے لگا۔ "جو تمہیں پسند وہی مجھے بھی پسند۔"

کھانے کے دوران وہ دونوں بیتے زمانے کی باتوں کو یاد کر کے ہنسے، اداس ہوئے، مسکرائے اور پچھتائے بھی۔ بعد میں وہ ایک دوسرے کی ازدواجی زندگی کے متعلق مشتاق ہوئے۔

معصوم نے بتایا، ذکیہ اس کی زندگی میں ہے۔ والدین کی پسند اور مرضی سے اس کا نکاح ہوا۔ خوبصورت ہے۔ سلیقہ مند بھی۔ دو بچوں کی ماں ہے۔ پوری گرہستی کو سنبھالے ہوئے۔ خود وہ یو۔ آئی۔ ٹی۔ میں ملازم ہے۔ نقشہ نویس کا عہدہ ہے۔

ارشاد علی بولا، ایک بڑی کمپنی میں بجلی کے سامان کا ایجنٹ ہوں۔ خدا کا کرم ہے۔ آمدنی اچھی ہے۔ گھر بسا ڈالنے کا خیال کئی دفعہ آیا پر نگاہ میں کوئی جچی ہی نہیں۔

"تم سے ایک بات کہوں تو میرے خیال سے دوست کے ناطے تم برا تو نہیں مانو گے۔" سلاد پر لیمو نچوڑتے ہوئے ارشاد نے کہا۔

"کہو۔" معصوم مرغے کی ٹانگ چباتے ہوئے بولا۔

"وعدہ رہا کہ تم برا نہیں مانو گے۔"

"بکو بھی یار!" اس نے ہڈی خالی پلیٹ میں رکھی۔

"تم سے میں کھانا شروع کرنے سے پہلے ہی کہنے والا تھا لیکن۔۔۔" ٹھہر کر ارشاد نے ہاتھ روک لیا۔ "کیا تم ابھی تک خشکے ہو؟"

"خشکے سے مراد کیا ہے تمہاری؟" وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

"مطلب کہ گلا گر تھوڑا تر ہو جاتا تو شاید ضائقہ والی بات نہ ہوتی۔"

"یعنی کہ دارو نا؟۔۔۔ لعنت ہے تم پر!" ہاتھ کا نوالہ روک کر معصوم نے گہری نفرت کے ساتھ کہا۔ "تم ابھی تک بھی نہیں سدھرے!"

"یار! مجھے پتہ تھا کہ انگور کی بیٹی سے تمہیں شروع سے ہی نفرت ہے۔ اسی لئے اتنی دیر بعد بڑی ہمت کر کے تم سے پوچھا ہے۔ خیر چھوڑو اسے اور بتاؤ کہ چنّی، منّی اور چاند کا تمہارا شوق ختم ہو گیا کیا؟" ارشاد نے بات کا رُخ بدل کر اسے موڑ لینا چاہا۔

"ارشاد بھائی اب تم سے کیا کہوں؟ ..." کھاتے کھاتے اس نے ایک بار پھر ہاتھ روک کر "میں اپنے تمام طرح کے شوق ختم کر چکا ہوں۔ بات یہ ہے کہ آدمی کو جب اپنے گھر کی چہار دیواری میں ہی سکون مل جائے اور عمدہ کھانا بھی مل جائے تو پھر کیوں وہ اِدھر اُدھر بھٹکے ہوٹلوں کی طرف دوڑے"

"سمجھا!" سلاد پر ہاتھ صاف کرتا ہوا ارشاد مسکرایا۔ "پھر بھی کبھی کبھی تو ذائقہ بدلنے کا خیال آتا ہی ہوگا۔"

"تم تو جانتے ہو کہ شیطان اپنے کام میں لگا ہی رہتا ہے۔ اور میں بھی آخر ایک انسان ہوں۔ ... اب تم سے کیا کہوں؟ خواہش تو ہوتی ہے لیکن..."

"لیکن کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی، یہی نا؟" معصوم کو اس نے گرفت میں لینا چاہا۔

"یہ بات نہیں ہے یار!" انگلیاں چاٹتے ہوئے اس نے ارشاد کی طرف دیکھا۔ "میں گھر میں ہی اپنے طریقے سے ذائقہ بدلتا رہتا ہوں... تمہاری بھابی بہت سمجھدار ہے۔ سمجھے؟"

"سمجھا لیکن ایک بات ہے۔"

"وہ بھی کہہ ڈالو۔" کرسی سے اٹھ کر معصوم واش بیسن کی طرف بڑھا۔

"تم اگر ساتھ رہو تو تمہارے اسی شہر میں کھانے کا وہ ذائقہ ملے کہ زندگی بھر جسے یاد رکھو!" وہ بھی کرسی سے اٹھ گیا۔

"لیکن یار! یہ گناہ ہوگا۔" واش بیسن پر جھکے جھکے اس نے کہا۔

"اور میرا دعویٰ ہے کہ یہ گناہ بے لذت ہرگز نہ ہوگا۔" ارشاد اب اس کے پہلو بہ پہلو کھڑا تھا

"تو پھر ٹھیک ہے۔" مڑ کر اس نے ارشاد کی طرف دیکھا۔ "آج میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

وہ دونوں ساتھ تھے۔ پیدل۔ برسوں کے بچھڑے اور آج اچانک ہی ملے دوست۔ ایک اسی شہر میں رہنے والا لیکن شہر کے جغرافیے سے نابلد نیک دل، سادہ لوح، نوکری پیشہ اور کامیاب گھریلو زندگی گزارنے والا۔ دوسرا آزاد پنچھی، موقع شناس، تیز طرار، کامیاب بیوپاری، شاطر کھلاڑی اور بھی کئی ایک خوبیوں کا مالک، مہینوں بعد اس شہر میں ایک دو دن کے لئے آنے والا لیکن شہر کے جغرافیے سے پوری طرح واقف۔

ارشاد کے قدم شہر کی سڑکوں اور گلیوں کو اَٹا اُٹا میں اس طرح ناپے چلے جا رہے تھے گویا کہ وہ یہیں کا باشندہ ہو۔ معصوم اس کے ساتھ چلتا ہوا کبھی اللہ ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ کھانا کیسا ہوگا؟ واقعی لذیذ، سادہ یا گھٹیا؟

بھوکے انسان کو تو سوکھی روٹی، چٹنی بھی بھنے گوشت اور پراٹھوں ایسی لگتی ہے اور ظاہر ہے کہ ارشاد اکثر ہی بھوکا رہتا ہے اس لئے لذیذ کھانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ سادہ سے کھانے کو وہ لذیذ ترین بتا رہا ہوں۔ اور اس سے زیادہ کی امید بھی نہیں کی جانی چاہئے۔ تاہم کسی طرح کی گنجائش سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ادھر ارشاد کا خیال تھا کہ معصوم تو کھانا دیکھ کر ہی سیر ہو جائے گا۔ یا وہ اسے دیکھتا رہے، اور کھانا بھی بھول جائے۔ یہ ممکن ہے کہ کھانے پر کسی بھیڑیئے کی طرح ٹوٹ پڑے...

آخر وہ مقام آ ہی گیا، جہاں ارشاد نے دونوں کے لئے لذیذ کھانے کی بات سوچ رکھی تھی، اس نے معنی خیز نگاہوں سے معصوم کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا رہا تھا۔

"تو؟" دبی زبان میں ارشاد نے اس کے کان میں کہا۔ "تم تیار ہو نا؟"

خدا کی قسم! وہ بھی دھیرے سے بولا۔ "میں پوری طرح تیار ہوں۔"

اور جب دروازے پر ہلکے ہلکے تین بار دستک دینے کے بعد ارشاد بت کی طرح صورت اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تو چند ہی پل کے بعد دروازہ تھوڑا کھلا۔ اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی آواز ابھری ——— تشریف لے آئیے!

پہلے ارشاد اور پیچھے پیچھے معصوم اندر داخل ہوا تو دروازہ فوراً بند ہو گیا۔

ابھی کسی طرح کا کوئی لفظ ابھرتا کہ اس سے پہلے ہی معصوم علی کی نگاہ اپنی بیوی ذکیہ پر پڑی اور لذیذ کھانے کی بات پوری طرح سے اس کی سمجھ میں آ گئی ———



فاروق انجینئر

بیتی رت کا نشان ہے باقی
میز پر پھول دان ہے باقی

اب کے بازار میں ہے سناٹا
اب کے گھر میں مکان ہے باقی

کیا ہوا سب بدل گئے مجھ سے
سر پہ تو آسمان ہے باقی

منصفِ وقت کو خیال رہے
میرے حق میں بیان ہے باقی

کیوں زمانے کی بات کرتے ہو؟
گھر میں بھی ہمزبان ہے باقی!

سر پھری ہول سے کہہ دینا
حوصلہ ہے، اڑان ہے باقی

اب تو فاروق مل لئے ان سے
اب بھی کوئی گمان ہے باقی

● ڈی-٣، بختر مل کالونی۔ کوئٹہ۔ ٣٢٢٠٠٨

عظمیٰ سحر

دام صیاد میں کیا شمس و قمر کی سوچیں
اپنے قدموں پہ کھڑے ہوں تو سفر کی سوچیں

اس سے آگے بھی گیا ہے کوئی رستہ کہ نہیں
بول اے دشتِ تمنا کہ کدھر کی سوچیں

کیسے کیسے ہیں بزرگوں کے تقاضے بھی کہ ہم
ہوں اندھیروں میں جواں اور سحر کی سوچیں

ہجرتیں ورثے میں شامل ہوں تو پھر کونسا ملک
اور کس دیس سے منسوب ہوں گھر کی سوچیں

دھوپ اور سائے پرکھنے کی ہے فرصت کس کو
پاؤں کے نیچے زمیں ٹھہرے تو سر کی سوچیں

● 1501 HARVEY RD. APT #450
COLLEGE STATION. TX 77840
(U.S.A)



سرور ساجد

اسیر ہونے سے تو اچھا ہے مرجا
ہوا کے وار سے پہلے بکھر جا

تجھے کھا جائے گی یہ بے پناہی
سمندر آ، مرے پیالے میں بھر جا

تجھے شاید یہ دنیا مان جائے؟
اسی ضد میں کبھی حد سے گزر جا

بچھڑ جانے پہ آخر کیوں تلا ہے؟
قدم کو روک لے اب بھی ٹھہر جا

بہت سفاک ہیں یہ لوگ ساجد
انہی میں رہ انھیں حیران کر جا

● ناظر خان لین، مین روڈ، رانچی ١-٣٤

★ **شفیقہ فرحت** — ای — ۱۸۶۲، داور نیسر، ہمارنی بھوپال

شمارہ ۵ اور ۶ کے اداریے پڑھ کے کل ادبی سرمایے پر سعادی ہیں۔ زبان کی بقا اور ترویج ادب کی تخلیق سے زیادہ ضروری ہے۔ زبان کی جڑیں سوکھ رہی ہیں۔ رنگ اڑ رہا ہے۔ ہم اظہار کے لئے دوسری زبانوں کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ ہمارے عام قاری کا لسانی دائرہ محدود ہوتا جا رہا ہے۔ اردو کو مادری زبان کہنے والوں کی اکثریت بھی معیاری اردو نہ کہہ پاتی ہے نہ بول پاتی ہے۔ اس تباہی میں ٹی وی کا بڑا ہاتھ ہے۔ اور اب فلمیں بھی اسی ڈگر پر چل رہی ہیں۔ اردو نئی نسل کی ضرورت نہیں رہی کیا اسے اس کا عشق بنایا جا سکتا ہے — ۹ 'شاعر' کے قارئین کو اس پر غور و فکر کی دعوت دیجئے اور اپنے اداریوں کو دوبارہ چھاپئے۔

★ **مصطفیٰ کریم** — 5-CAMPION CLOSE, SCALBY, SCARBOROUGH YO13 0QJ (U.K.)

ادبی رسائل جس ڈگر پر چلتے رہے ہیں۔ اس میں سے وابستہ صرف ایک سے کہانی کی افادیت محدود ہو گئی ہے۔ اردو اب اور بھی محدود ہو گئی ہے۔ اردو نہ مسلمانوں کی زبان تھی اور نہ ہے۔ اس حقیقت کے باوجود آج اردو جس حال میں ہے مسلمانوں کی تاریخ کا حصہ ہوا ایک ورق ہے اور اسی لئے تاریخ کے اوراق پر مسلمانوں کی سیاسی شکست جلی حرفوں میں لکھی ہے۔ پر مسلمانوں نے اپنی کوتاہ نظری سے مول لی ہے۔ اس میں غیر کا قصور نہیں، جتنا بتایا جاتا ہے۔ اور صورت حال کے پیش نظر ہر ادبی جریدہ کو تاریخ، معاشیات، سیاست، سماجیات، اور خاص پر سائنٹفک تجزیاتی مضامین ضرور شائع کرنا چاہئے۔ اس کے بغیر نہ اردو کا قد بلند ہو سکتا ہے اور نہ ہی اردو داں طبقے کا شعور گہرا و وسیع ہو سکتا ہے۔ ان نکات کے تحت جب میں نے شاعر کا مطالعہ کیا تو مجھے دیکھ کر افسوس ہوا کہ سہ ماہی "ارتقاء" (کراچی) آپ کی دانست میں تشنہ اور سطحی تھی۔ اگر آپ کے پاس فرصت نہیں تھی کسی ذمے دار ادیب کو رائے زنی کے لئے کہتے۔ راقم الحروف ۱۹۴۷ سے معیاری اردو رسالوں کا قاری رہا ہے۔ مجھے یہ لکھنے میں کوئی عار نہیں کہ "ارتقاء" (کراچی) سے بہتر اردو جریدہ میں نے نہیں پڑھا۔ اس کی وجہ "ارتقاء" کے وہ مضامین ہیں جو ادب کے ان موضوعات کو در خور اعتنا لاتے ہیں جن کا تعلق زندگی سے گہرا ہے۔ حالیہ شمارے میں میر الدین احمد کا افسانہ بہت اچھا ہے۔ بڑی مہارت کو مصنف نے تہہ داری سے پیش کیا ہے۔ کہانی میں مصنف کی انفرادیت نمایاں ہے۔ اس کے برخلاف ابو اللیث جاوید کا "بارش" اور مقصود الٰہی شیخ کی "ایک سادہ سی کہانی" کمزور افسانے ہیں۔ بارش اگر تجریدی کہانی ہے تو ایسی کہانی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس سال بھی میں نے جو مختلف کہانیاں پڑھی ہیں جس میں اس مصنف کے افسانے میرے زیر غور آئے ہیں۔ اس میں تجریدیت ہے، مبہم پلاٹ، اور کردار مجھے نظر نہیں آئے۔ 'ایک سادہ سی کہانی' میں جو تجسس ہے اس کی پردہ کشائی نہیں ہوتی۔ اور یہ افسانے کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ کسی بھی افسانے میں کردار کے حرکات و سکنات پر پس منظر نہ ہو تو اس افسانے میں جان نہیں ہوتی۔ ایپرینشنٹ مصور کی طرح افسانہ نگار بھی بڑا نکات کو نہایت اختصار سے اور لاشعوری طور پر پیش کرتا ہے۔ 'ایک سادہ سی کہانی' میں ان نکات کا فقدان ہے۔ شعر حاسی میں تنزل' اور دیوندر اسر کا مضمون، دونوں مضامین پسند آئے۔ محمد علوی اور وحید اختر کی نظموں نے متاثر کیا۔ انہیں الفاظ بیان نہیں کر سکتے۔ ایسی حوصلہ افزائیاں فاصلہ اور سیاسی دیوار کی وجہ سے مشکل سے ہتے میں آتی ہیں۔ سریندر پرکاش کے ناول کا اسی طرح قسطوں میں شائع ہونا اردو ادب کا المیہ ہے۔ مصنف کو اگر ملی شر نہیں ملتا تو وہ کیا کرے — ۹۔ اپنی جیب کاٹ کر تخلیق شائع کرانا ہر ایک کے بس میں نہیں ہوتا۔

★ **شاہد کلیم** — دودھ کٹورہ — آرہ — ۸۰۲۳۰۱ (بہار)

شاعر مسلسل نظر سے گزر رہا ہے۔ ان دنوں دوستوں سے ملاقات کے دوران بھی شاعر کا ذکر اچھے برے ناموں سے ہوتا رہتا ہے۔ جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ شاعر کی مقبولیت ادبی حلقوں میں دن بدن گھٹتی جا رہی ہے۔ ایک عام تاثر ہے کہ آپ نے ذاتی ترجیحات یا تعلقات کی بنا پر (جنہیں کچھ اور بھی ہو سکتی ہیں) کچھ ناموں کی فہرست تیار کر رکھی ہے۔ جنہیں آپ ترتیب وار شائع کرتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات ان کی تخلیقات پڑھے بغیر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وجہ سے اچھا لکھنے والوں نے آپ کو تعاون دینا بند کر دیا ہے۔ حال کے کچھ شماروں میں تو ۹۰ فیصد تخلیقات تیسرے درجے کی شائع ہوئی ہیں۔ جنہیں آپ "نمائندہ ادب" کہہ کر قارئین کو مغالطے میں ڈالنے کا جرم کرتے رہے ہیں۔

آپ پرچے سالے میں بارہا یہ تاثر دیتے رہتے ہیں کہ آپ نئی نسل سے بہت زیادہ ہمدردی رکھتے ہیں۔ لیکن نئی نسل کے کئی جیسوں ( ) نام شاعر میں کبھی نظر نہیں آتے جبکہ کچھ نام ایسے ہیں جو شاعر اور صرف شاعر میں لگاتار نظر آتے ہیں۔ آپ نے نئی لفظیات — نئی شعری کائنات کے نام سے شاعر کا جو شمارہ نکالا اس میں بھی بیشتر ناموزوں اور گھٹیا کلام کہنے والے تھے۔ لیکن حیرت ہے کہ آپ کی نگاہ ان کے کلام کی خامیوں کی طرف کیسے نہیں گئی۔ اور اس سے بھی زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ آپ نے تازہ شمارہ ۶ — ۵ میں اس کی تعریف میں کئی خطوط شائع کر دیئے ہیں۔ جس سے نئی نسل کے گمراہ ہو جانے کا زبردست خطرہ لاحق ہے۔ آپ کو ان خطوط کو بھی شائع کرنا چاہئے تھا جو آپ کی کوتاہی، ادب دشمنی اور نئے شعراء کے کلام کے نقائص کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ اس طرح کی خود پرستی اور خود ستائی ادبی رسالوں کو تباہی کے جس غار کی طرف لے جا رہی ہے آپ کو اس کا ادراک ہونا چاہئے۔ بہرکیف آپ سے ادب کے قارئین کو اس لئے بھی بڑی بڑی امیدیں ہیں کہ آپ سیماب اکبر آبادی کے جانشین ہیں۔ از راہ کرم شاعر کے پرانے معیار کو پھر سے قائم کیجئے۔ طلق پسندی، ادبی گروہ بندی اور مصلحت سے اوپر اٹھ کر تخلیقات کا انتخاب کیجئے۔ ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ محمد علوی کی جیسی تخلیقات آپ نے تازہ شمارے میں شائع کی ہیں ان سے ادب کو کیا حاصل ہوگا میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر یہی کلام کسی اور کے نام سے بھیجا گیا ہوتا تو آپ نے مسودہ پڑھ کر نہ جانے کتنی گالیاں دی ہوتیں۔ آج کل غلامانہ ادیب کی سیاسی حیثیت کا تعین کرتے ہیں نہ کہ ادبی معیار کا۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہنی چاہئے۔ اگر یہی شاعری ادب کے زمرے میں آتی ہے۔ تو ادب کا خدا حافظ۔ اسی طرح عقیل شاداب کی نہایت مہمل غزل آپ نے شائع کی ہے۔ ایک شعر تو ناموزوں بھی ہے۔

پار جت کیول آنکھوں کا کھیل نہیں
اتنے کم اتنے ساروں سے مت ڈرا

'ساروں' کون سا لفظ ہے۔ مت متروک ہے سوانگ۔

دیوندر اسر کے مضامین جو ان دنوں رسالوں میں شائع ہو رہے ہیں ان کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کسی موضوع پر اپنی کوئی رائے نہیں رکھتے۔ یا کنفیوزڈ ہیں یا صرف انگریزی کی چند نئی کتابوں کے خیالات سے اردو کے قارئین کو واقف کرانا مقصود ہے۔ جبکہ تنقید میں صرف علمیت کے بے جا مظاہرے سے بات نہیں بنتی۔ اگر شاعر کے معیار کا یہی حال رہا تو صرف سیماب اکبر آبادی اور اعجاز صدیقی کا نام اس کی بقا کا ضامن نہیں بن سکتا۔

★ **سعید انجم** — NEBBEJORDET 15, 1266 OSLO 12 NORWAY

شاعر کا مشترکہ شمارہ اور آپ کا خط ملا۔ ساتھ ہی سوالنامہ بھی تھا۔ جوابات کے لئے ابھی بہت سی باتیں غیر واضح ہیں۔ اسکنڈے نیوین ممالک میں سے فن لینڈ اور ناروے پر سوویت یونین کے انتشار کے اثرات کچھ مختلف ہے ہیں۔ یوں کہ ایک کو دوستی کی بنیاد پر سوویت یونین کی نظر کرم کا خصوصی تمغہ تھا تو دوسرے کو دشمنی کی وجہ سے امریکہ کی خصوصی سرپرستی حاصل تھی۔ ان دو ممالک کے لئے نئی صورت حال کا مطلب خصوصی حیثیت کے اخراج کے مترادف ہے۔ چنانچہ دونوں ممالک میں دستیاب مراعات سہولتوں پر گہرے اثرات پڑے ہیں۔ مارکیٹ اکانومی کی کنٹرول اسٹریٹجی ان ممالک پر اسی طرح اثر انداز ہوئی ہے۔ کہ غیر منافع بخش پروجیکٹس کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ چنانچہ بچے، تنہا مائیں اور بوڑھے اس صورت حال سے پہلے متاثر ہوئے۔ پھر بے روزگاروں کی باری آئی۔ ناروے کے ۱۹۹۳ء کے بجٹ کے مطابق لیبر پارٹی نے پارلیمنٹ کو جو تجویز پیش کی ہے۔ اس کے مطابق بے روزگاری کی شرح میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ جو چھ فی صد ہوگی ہے۔ صرف پانچ سال پہلے تک ایسا تصور محال تھا۔ فنون لطیفہ کا بھی یہی حال ہے۔ ادیبوں، فنکاروں کی انجمنوں نے مختلف ادوار میں نئی صورت حال پر اپنا ردعمل کا اظہار کیا ہے۔ لیکن فی الحال کوئی گروہ باآواز بلند یہ نہیں کہتا کہ وہ بھی سوویت یونین کے انتشار کے سبب متاثر ہوئے ہیں۔

★ **جمال اویسی** — محلہ فیض اللہ خاں پور بھنگا (بہار)

آپ کا اداریہ "نہ جاگتا ہے نہ خواب میں ہے" بہت اہم ادار

ہے اور صحیح عمل کرنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ دیویندر اسر کا مضمون ''اردو افسانہ، تہذیب، تجربہ اور مستقبل'' نئی جہت میں سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن یہ مضمون ان کے ایک دوسرے مضمون ''مابعد جدیدیت کا منظر نامہ'' کی بازگشت لگتا ہے۔ جو گزشتہ ماہ ستمبر ۹۳ کے ''آجکل'' میں شائع ہو چکا ہے۔ محمد علوی کی نظمیں STEREO TYPE ہیں۔ ''شاعر نامہ'' کا لہجہ طنزیہ ہوتا تو نظم اچھی ہو جاتی۔ ''پوسٹ ڈیٹنشنٹ'' نسبتاً اچھی نظم ہے۔ ''دل کی جگہ تاکم ہم نہ الفو کا استعمال نہ ہوتا تو یہ بھی چلتی ہوئی ہوتی۔ ''نئی نسل کے نام'' میں محمد علوی نے اپنے متعلق جو کہا ہے:

کہنے کو اب کچھ بھی نہیں
اب کیا شعر کہیں گے ہم

ٹھیک ہی ہوگا۔ لیکن جب وہ یہ کہتے ہیں:

جو بھی کہا اس کے سامنے
آپ کے شعروں پہ بڑتے
دیکھ کے خوش ہولیں گے ہم

تو بات ذرا بحث طلب ہو جاتی۔ خدا کرے محمد علوی صاحب کو خوشی نصیب ہو۔ اور وہ نئی نسل کے تخلیقی کاموں سے خوش ہو سکیں۔ لیکن جہاں تک ان کے کہے ہونے کا اثر نئی نسل کے شعروں پر پڑنے کا سوال ہے تو ممکن ہے کہ اثر پڑ ہی جائے۔ لیکن اس کے آثار نظر نہیں آتے۔ اس لئے کہ غالب کے بعد اردو غزل نے کوئی ترقی نہیں کی۔ اور یہ مسلسل روبہ زوال ہوتی چلی گئی۔ نظم کی تکنیک اور تجربوں میں اضافہ ضرور ہوا۔ لیکن نظیر اکبر آبادی، اقبال، سیماب، جوش، فیض اور اختر الایمان کے بعد کوئی بڑا نظم نگار شاعر پیدا نہیں ہوا۔ محمد علوی صاحب جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نے غزل سے منہ موڑ ضرور کیا ہے لیکن غزل کا حق ادا نہیں کیا۔ نظم کی تو بات ہی الگ ہے۔ کوئی اچھی مثنوی، طویل علامتی نظم (جیسے ویسٹ لینڈ اور) تخلیق نہیں کی گئی۔ نئی نسل پر اثر تب ہو جب اسلاف کوئی بڑا ادبی نامہ چھوڑ کر جائیں۔ غور و فکر کے لئے بڑے بڑے موضوعات دے کر جائیں۔ لہٰذا ایسا کچھ نہیں ہوا۔ نئی نسل کے فکری خدوخال واضح ہو رہے ہیں۔ جو نیا انداز راہ پا رہا ہے۔ وہ عرفان صدیقی، اسعد بدایونی وغیرہ کے یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ خیر سے ان شاعروں کے یہاں محمد علوی، بشیر بدر، شہریار وغیرہ کے اثرات بالکل نہیں ہیں اور یہ خوش کن بات ہے۔

''تکلم لفظ لفظ'' کے تحت آپ نے اس بار مہندر ناتھ کا ایک خط بنام اعجاز صدیقی شائع کیا ہے۔ مہندر ناتھ کو میں نے ایم فل کے دوران بہت پڑھا تھا۔ ان کے افسانوں کے تقریباً مجموعے پڑھ ڈالے اور یہ کام میں نے علی گڑھ میں کیا تھا۔ میرے ایک دوست سید احمد نے ''مہندر ناتھ حیات اور خدمات'' کے نام سے ایم فل کا مقالہ گزشتہ سال (۱۹۹۳) کے وسط میں مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں جمع کیا تھا۔ اس مقالہ پر ڈگری ایوارڈ ہو چکی ہے۔ یہ میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ نے فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ ''ان کے فن پر تحقیقی کام باقی ہے'' سید احمد سے قبل بھوپال میں جناب آفاق احمد صاحب کی نگرانی میں مہندر ناتھ پر پی ایچ ڈی کا کام ہوا تھا۔ یہ دونوں مقالے میرے دیکھے اور پڑھے ہوئے ہیں۔ مہندر ناتھ پر جس نوعیت کا تنقیدی کام ہونا چاہئے تھا نہیں ہوا۔ پہلے ''شاعر'' کی طرف سے پیش قدمی ہونی چاہئے کہ موصوف اس رسالے سے ایک لمبے عرصے تک جڑے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ مہندر ناتھ کی شخصیت کی کئی اور جہتیں تھیں۔ انہوں نے فلموں میں بطور اداکار (ہیرو) کام بھی کیا تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بمبئی شاخ کے سکریٹری تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کے کام کے سلسلے میں انہوں نے عملی طور پر حصہ لیا تھا۔ اس طرح ان کی اور خدمات بھی تھیں۔ سب سے بڑھ کر بہت سادہ لوح طبیعت کے انسان تھے۔ اخلاقی بلندی انکے کردار کا جوہر تھی۔ آپ ''شاعر'' کے صفحات مہندر ناتھ پر لکھے گئے مضامین کے لئے وقف کیجئے تو میں بھی اپنا ایک مضمون آپ کو بھیجوں۔ مہندر ناتھ کے کئی افسانوں کا میں نے تجزیہ کیا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری پر میرا ایک مضمون ''زبان و ادب'' (پٹنہ) میں شائع ہونے والا ہے۔ جناب وحید اختر کی نظم ''دشتِ سکوت'' بہت متاثر کرتی ہے۔ نشتر خانقاہی کی ہندی غزلیں اچھی لگیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ میں آپکی نظموں کی تعریف کروں گا تو پتہ نہیں آپ پر کیا تاثر ہو۔ لیکن پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کی نظموں میں مابعد الطبیعیاتی فکر کی جھلک ملتی ہے۔ آپ پابند اور معرّیٰ نظمیں بھی لکھئے۔

★ یحییٰ نشیط — کل گاؤں، ۴۴۳۳۰۳ (مہاراشٹر)

مشترکہ شمارہ پانچ سو کونا گوں خوبیوں کا حامل ہے۔ شاعر کی ادبی تہذیبی روایات کو برقرار رکھنے اور اس کے وقار کو بلندیوں پر پہنچانے کی آپ کی کاوش واقعی قابل رشک و افتخار ہے۔ میری جانب سے مبارک باد قبول فرمائیے۔ مشترکہ شمارے کے مشمولات میں دیویندر اسر کا مضمون ''اردو افسانہ تہذیب تجربہ اور مستقبل'' فکر کے نئے ابواب کھولتا ہے۔ شہاب سرمدی کا مضمون ''شعر جانسی میں تنزل'' غالباً ہندی فارسی کے تہذیبی رشتے کو کھوجنے کی بہتر کاوش ہے۔ علی جواد زیدی اردو ادب کا معتبر نام ہے۔ مگر یہ بحیثیت شاعر ان کی جو غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں چند اسقام در آئے ہیں۔ ان کی پہلی تینوں غزلیں بحر رمل مثمن محذوف میں ہیں اور آخری غزل رمل مثمن مخبون میں ہیں۔ پہلی غزل کے درج ذیل مصارع میں سکتہ، خارج از وزن اور خارج از بحر جیسے اغلاط پائے گئے ہیں:

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

انھیں یوں ہی کوئی کم تھیں دوالے کے لئے
آپ سے کس نے کہا در (۹ن) بتانے کے لئے (سکتہ)
قطرۂ خونِ شہیداں سے سجے گا اے (دوست ۹) (سکتہ)
پتہ غنوا (ل ۹) غم دل کے فسانے کے لئے (سکتہ)
جانے اس دل (جلے ۹) کی سو میں وہ (لیا ۹) جا دو (تھا ۹) (خارج از وزن)

وہاں یہ دستو (ر ۹) کہ ہر اک (سوالی ۹) (کھو ۹) (خارج از بحر)

تیسری غزل کے دوسرے شعر میں ع ''میں کھتا ہوں کہ مجھ دوسرا کچھ بھی نہیں'' میں شاعر کا عجز جھلکتا ہے۔ قافیہ کی رعایت رکھتے ہوئے شاعر نے ''دوسرا کوئی نہیں'' کی جگہ ''دوسرا کچھ بھی نہیں'' لکھ دیا۔ جو روزمرہ کے خلاف ہے۔ اسی غزل کے آٹھویں شعر میں ع ''شورش طوفاں میں یا امید ہو یا حوصلہ'' میں طوفاں ''کی'' نون غنہ ''کو اعلانیہ پڑھنے اور اسے متحرک کر دینے سے ''یا'' کی تکرار کا نقص جاتا رہے گا۔ چوتھی غزل کے مقطع میں ''دوش عزیزانِ جہاں'' ہونا چاہئے تھا۔ شاید سہو کتابت ہو۔ اسی غزل میں ''جواں زخم'' کی بجائے ''ہرے زخم'' کی ترکیب زیادہ بلیغ اور بامحاورہ ہوتی۔ نشتر خانقاہی نے ہندی غزلوں کو فارسی (اردو) رسم خط میں پیش کر کے یوپی والوں کی عام ذہنیت کے خلاف قدم اٹھایا ہے۔ اردو مجموعے ناگری خط میں لکھنے کا روگ ''بعض بڑے شعرا'' کو لگا ہوا ہے۔ جس سے صرف ''مالی منفعت'' مقصود ہے۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ مہندر ناتھ کے فن پر تخلیقی کام ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر محمد ناصر دہلوری نے پروفیسر آفاق احمد کی نگرانی میں بھوپال یونیورسٹی سے ۱۹۸۶ء میں اسی عنوان پر اپنا مقالہ لکھا تھا۔ مرحوم اعجاز صدیقی نے بھی اسی تعلق سے محمد ناصر کو کافی مدد بہم پہنچائی تھی۔

★ علی حماد عباسی — ۴۳۰ بڑا بہادر، اعظم گڑھ — ۲۷۶۰۰۱

تنقید کی ناکامی تو پوری ایک کتاب ہوگی۔ پہلے ذہن میں یہ بات آئی کہ تنقید کو ناکام کیوں کر کہا جائے؟ اس لئے اس کے واسطے مواد جمع کرنا شروع کیا۔ خاصہ مواد جمع ہو گیا تو پھر یہ خیال ہوا کہ باتھوں کیوں نہ تنقید کے فی زمانہ مروجہ دبستانِ فکر، SCHOOL OF THOUGHT ہی کا جائزہ لیا جائے۔ آج کل دنیا کی زبانوں میں تنقید کے بے شمار مدرسہ ہائے فکر ہیں۔ جدلیاتی، سماجیاتی، نفسیاتی، ساختیاتی، تاثراتی وغیرہ۔ ان پر بھی اظہارِ خیال کرنے کا ارادہ ہے۔ ان کے اوصاف اور کوتاہیوں پر بھی نظر ڈالی ہوگی۔ کیوں کہ ان میں سے ایک SCHOOL OF THOUGHT مکمل نہیں ہے۔ ہماری زبان ابھی تک وہ تنقید وجود میں نہیں آئی ہے۔ جس کو انگریزی میں META CRITICISM کہتے ہیں بہر حال (کام مکمل ہونے) طباعت کی نوبت آئے گی۔ آپ کا خیال بجا ہے کہ کسی فن پارے سے پوشیدہ جہانِ معنی کو دریافت کرنے کا کام تنقید ہی کا ہے۔ الگ سے ایک ڈسپلن ہے۔ لیکن تنقید خلا میں پروان نہیں چڑھتی۔ تنقید کے لئے اعلیٰ ادب کے نمونے بھی سامنے ہونے چاہئے۔ جس زبان میں اعلیٰ تخلیقی نمونے نہیں ملتے۔ اسکی تنقید کم تر ہوتی ہے۔ میں اسی کو ناکامی کا نام دیتا ہوں۔ اسی لئے میں تخلیق کو اولیت حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے نقاد (بڑے نقاد) سے نظم و خود، تخلیق کار ہونے کے دعویدار بھی ہیں، مثلاً شمس الرحمان فاروقی نے شعر کی جو تعریف بیان کی ہے۔ جو علامات شعر کے بتائے ہیں۔ ابہام وغیرہ وہ خود انکی شاعری میں کہیں نظر

نہیں آتے۔ معزز غیر بن افسانے کی بہت بڑی نقاد تھیں۔ لیکن ان کے کتنے افسانے اس معیار پر پورے اترتے ہیں؟ یا یک بڑا سوالیہ نشان ہے اور تو اور انگریزی کے عظیم نقاد ٹی ایس ایلیٹ نے صاف صاف اعتراف کیا ہے کہ جو بھی تنقید انہوں نے لکھی ہے وہ ان کی شاعری کے دفاع میں ہے۔ ہماری زبان میں کوئی یاسا نقاد + محقق ادیب نہیں ہے۔ جو اپنی شاعری کے دفاع میں تنقید لکھتا ہو۔ یا جو شعر کی پرکھ کے لئے معیار متعین کرتا ہو اور اس کی شاعری بھی اس معیار پر پوری اترتی ہو۔

سید فضل الاکرم م ۱۲—۴—۲ بھگتپال ۵۰۵۳۳

شاعر کا مشترکہ شمارہ موصول ہوا۔ خدا کرے کہ اب ہر ماہ کا شمارہ الگ الگ پابندی سے شائع ہوتا رہے۔ دیویندر اسر کا مضمون قابل تعریف ہے موصوف نے افسانے کے تعلق سے نئی یکی شکوک و شبہات کو دور کیا ہے۔ مگر ابھی اس موضوع پر بحث کی گنجائش ہے۔ شاعر میں دن بدن تنقیدی و تحقیقی مضامین کی کمی ہوتی جا رہی ہے۔ براہِ مہربانی زیادہ سے زیادہ مضامین شامل کریں۔ کہانیوں میں ناظر نیاز کی دوسرا پورٹریٹ اچھی لگی۔ نسل کی اتنی مختصر نسلیں پیش کرنے میں آپ کو شرمندگی محسوس نہیں ہوتی؟ آپ کی نظم 'موت سے مکالمہ' ایک بہترین نظم ہے۔ خصوصاً آخر کے مصرعے تو بے جان دار ہیں۔ آپ کی نظموں کا بنیادی فنی ابلاغ ہے جبکہ جدید اردو نظم کا المیہ یہ ہے کہ وہ فنی ابلاغ سے محروم ہو گئی ہیں۔

100, SUNNY GARDEN ROAD
LONDON—NW 4 1RY (UK)

★ ساقی فاروقی

تمہارے رسالے ملتے رہتے ہیں۔ تم میں جو جدید شاعر چھپا ہوا ہے۔ اسے کھل کر سامنے آنے دو اور ساتھ ہی رسالے میں DRASTIC تبدیلیاں کرو تاکہ پتہ چلے کہ ایک تازہ ذہن کے مدیر کے ہاتھوں میں اس کی باگ ڈور ہے۔ خود کو سماجی کرو اور موٹا دو (جس کا اشتہار کا خسارہ نہ ہو) کا شکل میں تبدیلی کرو، فہرست والا صفحہ اداریہ کی الگ جگہ نیا ہو۔ اشتہارات کو الگ جگہ دو۔ کاسکی ——— کو نیا خط دو۔ کتابت کے پیسے بچانے کے لئے PRESENTATION پر زیادتی نہ کرو۔ رسالے کے شروع کے آٹھ دس صفحے بہت اہم ہوتے ہیں۔ دو شمارے ایک ساتھ چھاپنے کا مطلب نہیں کہ دو بار فہرست دی جائے۔ دو بار اداریے لکھے جائیں۔ دو بار نیت ضائع کیا جائے۔ تم کر سکتے ہو اور بہت کچھ کر سکتے ہو۔

★ گلشن بیابانی — نواب پورہ، نیر پرسو پنت ۴۳۱۵۰۲

شاعر کا تازہ شمارہ، مخزن اول تا آخر آپ کے اداریے کے الفاظ کی ترجمانی کرتا ہے۔ واقعی باتوں سے صرف باتیں ہی وجود میں آتی ہیں۔ اور عمل سے عمل وجود پاتا ہے۔ جو کہ اصل ہے۔ شمارہ ۴ کی شعری تخلیقات میں آپ کی متضاد رویوں اور نظریات کی ترجمانی کرتی ہوئی نظمیں دل کو چھو لینے والے انداز میں لکھی گئی ہیں۔

C/O MR. M. A. MAJEED
SEGIAN VILLAGE HAIL — K.S.A.

★ انیسہ تنویر

شاعر میں شامل مواد میرے لئے چراغِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ خصوصاً 'فکر امروز' میں علامہ سیماب اکبر آبادی کے اقوال ہر شمارہ ہمارے فن اور کے لئے یکساں قابل عمل ہیں۔ دوسری تحریروں میں آپ کے 'تجربات' ہیں۔ جو آپ حیات کے 'تجربے' ہیں۔ اور فکر و عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ بیدار کرتے ہیں۔ کہانیوں میں 'کس کی کہانی' (گلزار) اور 'وحشت گرد' (شاہد اختر) متوجہ کرتی ہیں۔ شعری باب میں ساحل احمد، اسعد بدایونی، واجد قریشی، اور نظام یوسف کی غزلیں پسند آئیں۔ دوسرے شمارے میں علی جواد زیدی کی غزلیں اور آپ کی نثری نظمیں، خصوصاً 'روح کائنات کے نام' بہت متاثر کن ہے۔ کہانیوں میں افتخار عظیم صدیقی کی 'کہانی کی تلاش'، عباس خان کی مختصر کہانیاں اور حسن جمال کی 'ڈبلن بی وی مرف سکان محمودی' خاص پسند آئیں، ہر شمارے کو بار بار پڑھتی ہوں اور نئے شمارے کا انتظار رہتا ہے۔

★ سیفی سرونجی — سیفی لائبریری، سرونج (ایم پی)

شاعر دن بدن خوبصورت اور معیاری ہوتا جا رہا ہے۔ آپ کے اداریوں کا جواب نہیں۔ رفعت اختر خان نے جو مشورہ دیا ہے وہ یقیناً قابل توجہ ہے۔ آپ کے تمام اداریوں کا کتابی شکل میں آنا ضروری ہے۔ اور یہ کہ ایک الگ اہمیت کی کتاب ہوگی۔ مخدوش شاعر کا سلسلہ آپ کی نظر میں اچھا ہوگا۔ ورنہ اس کی باریک چھپائی دیکھ کر پڑھنے کو دل نہیں کرتا۔ بہت مشکل سے پڑھنا پڑتا ہے۔ حمید الماس اور محمد علوی کی شعری تخلیقات پسند آئیں۔ آپ کے ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے آپ کی نظموں کی تعریف کر ہی نہیں سکتا۔ گویا آپ کی اچھی تخلیقات کا ہونا بھی آپ کے لئے فائدہ مند نہیں۔

★ مشتاق انجم — ۴۹ کاونڈ گھاٹ روڈ، قصبہ پور، باڑہ

شاعر کے تازہ شمارے میں آپ کا بے باک اداریہ 'نہ جاگتا ہے۔ نہ خواب میں ہے' بری طرح جھنجھوڑ گیا۔ واقعی یہ صحیح ہے کہ اردو کو زندہ رکھنے کے لئے تعلیمی اور معاشی مسائل کو سامنے رکھ کر ملک گیر پیمانے پر کسی عملی تحریک کو ترتیب دینے کا وقت آگیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اردو والے وقت کی اس اہم ضرورت کو صحیح ڈھنگ سے شدت کے ساتھ محسوس کریں۔

★ پی پال رتن (پرنسپل) — بی ۳۵۶۲ نئی آبادی، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

دو شماروں پر مشتمل شاعر کا ایک شمارہ حسب سابق زندہ و تابندہ ہے۔ مگر اس کی توقیر اس کے مقالات کے دم سے ہے۔ دیویندر اسر کا اردو افسانہ 'تہذیب، تجربہ اور مستقبل' نقد و نظر کے مغربی حوالوں کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ بوجھل ہے۔ کاش انہوں نے بقول خود (میں یہ بات اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ ہندستان کے ادب کو محض یورپ کے نظریات سے کھنگالنا دشوار ہے) پوری نظریات کی توضیح کے بجائے اردو میں افسانوی ادب کو زندہ رکھا ہوتا۔ اسی سبب سے یہ مقالہ اہم اور مرعوب کن ہوتے ہوئے بھی فکر انگیز نہیں ہے۔ اور اپنے عنوان کے ساتھ کم میل کھاتا ہے۔ البتہ شہاب سرمدی نے 'شعر جامی میں تغزل' کی بہت خوب نشاندہی کی ہے۔ لیکن کیا یہ ضروری تھا کہ وہ تغزل کی شناخت کے لئے ایران کے فارسی شعرا 'اساتذہ ملال ایران' ہی کو معیار بنا کر چلتے؟ بہر صورت مقالہ فکر انگیز ہے اور اس کے مطالعے سے کئی سوال ذہن میں اٹھتے ہیں مثلاً کیا جامی کی شاعری محض ترجمے کی شاعری ہے؟ کیا ایرانی تغزل اور ہندی تغزل میں یکسانیت ہے؟ یا مشابہت؟ اگر مشابہت ہی ہے تو اختلاف کی بھی گنجائش نکلتی ہے۔ کیا تغزل کا تقابلی مطالعہ ممکن ہے؟ کیا غزل کے اشعار گسہ یدہ کے مترول کے زیادہ قریب نہیں ہیں؟

★ ساجدہ زیدی — گل برگ، دودھ پور، علیگڑھ

اس بار کے شاعر میں دیویندر اسر کا مضمون بہت پسند آیا۔ موصوف کا شعور عصر، وسیع مطالعہ اور ادبی قدار کی مزشناسی قابل تحسین ہے۔ شاعر اچھا نکل رہا ہے۔ آج کل آپ بڑی جانفشانی سے شاعر کا ہر شمارہ ترتیب دے رہے ہیں۔ واقعی یہ LABOUR OF LOVE قابل داد ہے۔

★ کاوش بدری — ۳۲ — سانگر تکیہ، نیو اسٹریٹ، آمبور، ۶۳۵۸۰۲

شاعر شمارہ نمبر ۵ میں محمد علوی نے اپنی نظم 'شاعر بلند' میں لفظ 'برہنہ' کو بر + ہنہ 'باندھا ہے۔ جو غلط ہے۔ مصرع "جو غزل کو برہنہ کرتے رہے" کی بجائے "جو غزل سے بھی بد کرتے رہے" ہونا چاہئے تھا۔ وحید اختر کی نظم 'دشتِ سکوت' فکر انگیز ہے۔ نشتر خانقاہی کی ہندی غزلیں پسند آئیں۔ مظفر حنفی کی جدید لب و لہجے والی غزل بھی بے حد پسند آئی۔ شاعر کے ہر شمارے میں قابل مطالعہ مواد مل جاتا ہے۔

★ شین کاف نظام — کلوں والی گلی، جودھ پور، (راجستھان)

شمارہ مئی جون میں میری دو نظمیں (آخری) ایک نظم بن گئی۔ اب دن نکل گئے اس لئے اس کی تلافی مگر بھی۔ دونوں نظمیں اس طرح مل گئیں کہ شاعری نائب ہماری زبان میں ابھی نظم کو اس کا متوقع مقام نہیں ملا۔ ہم نے نظم کو ہمیشہ دوسرے درجے کی چیز مانا ہے۔ شاعروں نے بھی اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی ہے۔ ترقی پسندوں نے نظم کا استعمال بھی کیا، استحصال بھی۔ لیکن ناقدین نے سوائے چند شعرا کے توجہ سے کسی کو بھی نہیں پڑھا۔ ہمارے ناقدین کی توجہ نظم کی تفسیر اس لئے زیادہ رہی ہے کہ وہ اپنی علمیت بگھار سکیں۔ انہوں نے نظم کے لئے فضا تیار نہیں کی اس لئے نہ راشد کو ٹھیک سا سمجھا گیا نہ میرا جی کو۔ علامتوں کے جنگل میں علم کے پھول اگانے والے بھی میرا جی کو بھی ٹھیک سے نہیں کھ سکے۔ ہمارے ناقدین نے ادب کی افادیت کا اتنا اشتہار کیا ہے کہ ادب کی اہمیت کھوتی ہی بھول گئے۔ کاش ہمیں ایک حسن عسکری اور مل جاتے اور اگر عسکری ممکن نہیں تو ایک سلیم احمد ہی مل جاتے۔ یہ سب باتیں تمہیں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ تم بھی تو نظم کہتے رہے ہو۔

شاعر

بانی علامہ سیماب اکبر آبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰ء

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۴واں سال

علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

جلد ــــ ۶۴

شمارہ ــــ ۱۱

فون: ۳۵۹۹۰۴

مدیر

افتخار امام صدیقی

●

معاون

ناظر نعمان صدیقی

قیمت ۸ روپے

*

زرِ سالانہ ۶۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۷۵ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے

ممالکِ غیر سے

۲۵ ڈالر ـ ۱۵ پونڈ

ماہنامہ شاعر مکتبہ قصر الادب [illegible] پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی

فکر امروز



شاعر کے خیالات میں بھی اس کی سیرت کی طرح پاکیزگی و بلندی اور گہرائی کی ضرورت ہے۔ اس کا مشاہدہ صرف ان مناظر و مظاہر میں صرف ہونا چاہئے جن سے تحقیق و ادراک کا حصول یقینی ہو۔ اس کا مطالعہ صرف ان کتابوں تک محدود ہونا چاہیئے جو بلند پایہ مصنفین کی رہینِ قلم ہوں۔ مبتدی شعراء کا کلام سننے اور دیکھنے سے ذہنی ترقیاں نہیں ہوتیں۔ اس لئے ہمیشہ اپنے سے بہتر کہنے والوں کا کلام دیکھنا اور سننا چاہیئے یہ باتیں خیالات میں ستھراؤ اور ذہن میں جلا پیدا کرتی ہیں۔

[دستور الاصلاح - چوتھا ایڈیشن
مطبوعہ: ۱۹۱۷ء - صفحہ ۹]

سیماب اکبر آبادی

شاعر

ہم عصر اردو ادب نمبر

میں شامل کئے جانے والے ادبی مذاکروں کی
ایک ناتمام جھلک

نثر سے شاعری کی طرف۔ شاعری سے نثر کی طرف اور شاعری

*

شرکاء

آل احمد سرور، احمد سہیل، اقبال متین، اظہار اثر، اکبر حمیدی
تنویر احمد علوی، جاوید وششٹ، حامدی کاشمیری، حنیف نقوی، خالد سہیل، رتن سنگھ
زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، سلام سندیلوی، سلطان سبحانی، سید ضمیر جعفری، شارب ردولوی
شکیب ایاز، شمس الرحمٰن فاروقی، طلحہ رضوی برق، عابد پیشاوری، عصمت جاوید، ظہیر احمد صدیقی
علیم اللہ حالی، عنوان چشتی، فضیل جعفری، کالی داس گپتا رضا، کرامت علی کرامت، کشمیری لال ذاکر
گلزار، گیان چند جین، لطف الرحمٰن، محمد حسن، مسعود حسین خان، نامی انصاری
نظیر صدیقی، وجاہت علی سندیلوی، وزیر آغا، یوسف ناظم — اور کئی اہم نام

اپنی شاعری کے بارے میں مشاہیر نثر نگاروں کے دلچسپ انکشافات
تازہ وغیر مطبوعہ منتخب کلام

ترقی پسندی، جدیدیت اور اس کے بعد۔ نئی دانشوری سے نئی نسل تک

*

شرکاء

آفاق صدیقی، ابن فرید، احمد سہیل، ادا جعفری، اصغر علی انجینئر
اظہار اثر، اکبر حمیدی، اویس احمد دوراں، بلراج کومل، تارا چرن رستوگی، حامدی کاشمیری
حمید الماس، حیدر قریشی، خورشید سمیع، دلنواز صدیقی، رفعت سروش، سعید الظفر چغتائی
سلیم اختر، سید احمد شمیم، سید انیس شاہ جیلانی، سید حسن، سید محمد حسنین، سید محمد عقیل
شان الحق حقی، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، شکیب ایاز، طلحہ رضوی برق، عبد القوی دسنوی، عبد القوی ضیاء
عبد المغنی، عنوان چشتی، غلام ربانی تاباں، مجروح سلطانپوری، محمد حسن، محمد فیروز شاہ
مخمور سعیدی، مظفر حنفی، معین احسن جذبی، ناصر عباس نیر، نظیر صدیقی، وزیر آغا

اور کئی اہم نام

کچھ اور ادبی مذاکروں کے عنوانات اور شرکاء کے ناموں کا اعلان آئندہ شمارے میں

ہجو سبزہ بادہا دو دیدہ ام

شاعر کا یہ شمارہ مشہور شاعر، ادیب اور دانشور علی سردار جعفری کی اسّی ویں سالگرہ کے مبارک موقع پر بطور خراج تحسین پیش کیا جارہا ہے۔ یہ بہت معمولی سی کوشش دراصل نئی نسل کے بہت سارے سوالوں کو اجالنے کی طرف ایک مثبت قدم ہے۔ یہ سوال ترقی پسندوں اور جدیدیوں سے ہیں۔ ایک نظریاتی ادب۔ ایک دوسرے یا رجحان کا ادب۔ نصف صدی کے مختلف منظر ناموں میں اردو شاعری، اردو افسانے، اردو تنقید نے نئی نسل کو جو روایت سونپی ہے۔ وہ بہت سارے سوالیہ نشان قائم کرتی ہے۔ شخصی، گروہی، علاقائی اور مذہبی عصبیتوں نے جو انتشار پیدا کیا ہے وہ اس نصف صدی کو از سر نو دیکھنے، سوچنے اور پرکھنے پر مجبور کررہا ہے۔ کسی معروضی احتساب کو نئی نسل پوری طرح محسوس کررہی ہے۔ اکیسویں صدی میں قدم رکھنے والی نئی نسل اپنے ساتھ جو روایت لے جائے گی اس کے بعض فیصلے بہت اہم ہوں گے۔ ختم ہوتی ہوئی بیسویں صدی کے نصف آخر کی ادبی روایت کا ایک اہم نام علی سردار جعفری کا ہے۔ وہ ہمارے عہد کے معتبر ترین شاعر ہیں۔ طبعی اور ذہنی، دونوں اعتبار سے بے حد فعال اور ہمہ وقت مصروف رہنے والی ایک جیتی جاگتی ہوئی شخصیت کے کارناموں کا مجموعی جائزہ اپنے آپ میں ایک عہد کی تاریخ لئے ہوئے ہے اور اسی ادبی تاریخ سے ہمیں بہت کچھ اخذ کرنا ہے۔ کتنے ہی بنیادی سوال ہیں جو حل طلب ہیں۔ ترقی پسندوں اور ان کے بعد جدیدیوں کے بعض انتہا پسندانہ فیصلے اردو زبان و ادب کے لئے کتنے کارآمد اور کتنے نقصان دہ رہے ہیں۔ ان پر ابھی بحث و تمحیص ہونا باقی ہے اور جعفری صاحب کسی بھی سطح پر نظر انداز نہیں کئے جائیں گے۔ ان سے کسی طویل مکالمے کا یہ موقع تو نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ اظہار تہنیت کے ساتھ انہیں ادب سے سلام کیا جائے۔ ایک تہذیبی منظر نامے پر مدتوں روشن رہنے کی ہنرمندی کی داد دی جائے کہ اس طویل سفر میں انہوں نے دکھ بھی اٹھائے ہیں اور سکھ بھی کمائے ہیں۔ جعفری صاحب کی ایک خوبصورت نظم میرا سفر (۱۹۵۶ء) کے آخری دس مصرعوں کے ساتھ اپنے اظہار عقیدت میں شاعر کے بے شمار قارئین کو شامل کررہے ہیں۔

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایام کے افسوں خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروف سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں

سرورق ★ علی سردار جعفری

عکاسی۔ اسد صفی [ایمسٹرڈم]

شناخت (۴)

نذرِ علی سردار جعفری



میرا گہوارہ

ادبی نام ○ سردار جعفری
خاندانی نام ○ علی سردار جعفری
خاندان ○ سادات جعفری
پیدائش ○ ۲۹ نومبر ۱۹۱۳ء
وطن ○ بلرام پور [ضلع گونڈہ ۔ یوپی]
والد ○ سید جعفر طیار جعفری
تعلیم ○ بی اے [دہلی یونیورسٹی]
ایم ۔ اے [لکھنؤ یونیورسٹی] ۱۹۳۹ء نامکمل
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

محلِ زندگی ●

ادارت ○ نیا ادب [لکھنؤ] ۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۳ء
۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۹ء [لکھنؤ کے علاوہ]
قومی جنگ ۔ [بمبئی] ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۷ء
گفتگو [سہ ماہی] ۱۹۶۸ء تا ۱۹۶۹ء
۱۹۷۱ء تا ۱۹۸۰ء
پہلا مشاعرہ ○ اٹاوہ [یوپی] ۱۹۳۳ء [۲۵ روپے معاوضہ]
قید و بند ○ ●۲۴ دسمبر ۱۹۴۰ء [لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل اور
بنارس ڈسٹرکٹ جیل ۔ تقریباً ۸ ماہ]
●۲۰ جنوری ۱۹۴۹ء [بھیونڈی کانفرنس کے
موقع پر ایک روز قبل بمبئی میں گرفتار کیا گیا۔
کانفرنس چار روز جاری رہی ۔ ۸۰ مندوبین
نے حصہ لیا۔]
۱۹ اپریل ۱۹۴۹ء [آرتھر روڈ جیل بمبئی اور
سینٹرل جیل ناسک ۔ بلا جواز ۱۵ ماہ کی قید
۱۹۵۰ء کو عید کے دن رہائی]
شادی ○ سلطانہ منہاج [پ ۱۹۱۶ء] ۱۹۴۸ء
اولادیں ○ علی ناظم جعفری ۔ علی حکمت جعفری ۔ دو داماد
عزت و توقیر ○ رکن ، سینیٹ بمبئی یونیورسٹی [دوبار]
صدر انجمن ترقی پسند مصنفین ۷۷ ۱۹ء سے ۱۹۸۸ء
جنرل سکریٹری ، آل انڈیا اقبال صدی کمیٹی ۱۹۷۷ء
ٹرسٹی ، نیشنل بک ٹرسٹ ۱۹۹۰ء سے تا حال
اعزازی پروڈیوسر ، ریڈیو ، ٹی وی ۱۹۸۸ء
تا ۱۹۹۰ء
صدر : فلم رائٹرس ایسوسی ایشن
وزیٹنگ پروفیسر ، کوتوں یونیورسٹی اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء
نائب صدر مہاراشٹر اردو اکادمی : ۹۳ ۔ ۱۹۹۲ء
صدر نگراں کمیٹی اردو سفارشات ۱۹۹۱ء
وزیٹنگ پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۹۳ء
اعزازات و انعامات ○ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ [۱۹۶۵ء]
پدم شری [۱۹۶۷ء] ● جواہر لال نہرو
فیلوشپ [۱۹۶۹ء] ● سنت ظہیر ایوارڈ ۱۹۷۶ء
● اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ [۱۹۷۶ء]
● اقبال میڈل [پاکستان ، ۱۹۷۷ء]
● اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ [۱۹۷۹ء]

● مخدوم ایوارڈ [آندھرا پردیش اردو اکادمی
۱۹۸۰ء] ● میر تقی میر ایوارڈ [مدھیہ پردیش
اردو اکادمی ، ۱۹۸۲ء] ● کمارن آسن
ایوارڈ [ملیالم : ۱۹۸۳ء] ● ہندو کش دوستی
میڈل [۱۹۸۴ء] ● ڈی لٹ کی اعزازی
سند [مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ، ۱۹۸۶ء]
● اقبال سمان [حکومت مدھیہ پردیش ،
اقبال مرکز بھوپال ، ۱۹۸۶ء] ● سجل
پور یونیورسٹی ایوارڈ [۱۹۹۲ء] ● اعزاز
میر [لکھنؤ ۱۹۹۳ء]
فلمی دنیا ○ گیارہ ہزار لڑکیاں [پروڈیوسر] ۱۹۶۱ء
گانے ○ انارکلی ، فٹ پاتھ ، دھرتی کا لال ، ستارا ، آسمان
محل ، پرچھائیں ، سپنا ، کملا شٹ ، ایک آدمی
ڈاکیومنٹری ○ پھر لو لوٹے سنت کبیر [فلم ساز ، کہانی ، مکالمے]
● ڈاکٹر محمد اقبال ● جد و جہد آزادی میں
ادب کا حصہ THE LITERy STROM
(۱) ۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۵ء (۲) ۱۹۰۵ء تا
۱۹۲۰ء (۳) ۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۷ء ۔
ٹی وی ○ محفلِ یاراں [بمبئی] ۵ سال
کہکشاں : اردو کے ۷ شاعروں پر ۱۶ ایپی سوڈ
[۱۹۹۲] حسرت موہانی ، جگر مراد آبادی ، جوش
فراق ، مجاز ، مخدوم
روشنی اور آواز کے اسکرپٹ ○ شالیمار باغ دسری نگر ، ۱۹۶۱ء ● لال قلعہ
(دہلی) ۱۹۶۵ء سے تا حال ● سابر متی آشرم
(احمد آباد) ، ۱۹۷۰ء ● تین مورتی ہاؤس
[جواہر لال نہرو کی قیام گاہ ۔ دہلی] ۱۹۷۲ء
یادگار تقریبات میں شرکت ○ سوویت یونین کے ادیبوں کی دوسری کانفرنس
ماسکو دسمبر ۱۹۵۴ء ● صد سالہ جشنِ اقبال لاہور
۷۷ ۱۹ء ● جشن صدرالدین عینی ۔ تاجکستان
اپریل ۱۹۷۸ء ● جشنِ نظامی گنجوی ، گنجہ
آذربائیجان ۱۹۷۸ء ● عرب شعرا کی کانفرنس
عدن (یمن) ۱۹۷۹ء ● عالمی شعرا کی کانفرنس
ماسکو ۔ ۱۹۸۵ء ● جشنِ طلائی انجمن
ترقی پسند مصنفین ۔ لندن ۱۹۸۵ء
سیر و سیاحت ○ سوویت یونین [۱۹۵۴ء پہلی بار] فرانس
[۱۹۵۴] ڈنمارک [۱۹۵۴ء] سویڈن
[۱۹۵۴ء] مصر [۱۹۵۴ء] ناروے
[۱۹۵۴ء] عراق ۔ یونان [۱۹۵۵ء]
بلغاریہ [۱۹۵۹ء] چیکوسلواکیہ [۱۹۶۰ء]
جرمنی [۱۹۷۱ء] انگلستان [۱۹۷۱ء] پاکستان

[۱۹۷۷ء تا ۱۹۹۱ء متعدد بار] یمن [شمالی
جنوبی ۱۹۷۹ء] لبنان [۱۹۷۹ء] امریکہ
[۱۹۸۰ء] کینیڈا [۱۹۸۰ء] خلیجی ممالک
[دوبئی ، دوحہ قطر ، کویت ، مسقط]
تصانیف و تالیفات ○ (نثر) منزل [افسانے] ۱۹۳۸ء ۔ یہ کس کا
خون ہے [ڈرامہ] ۱۹۴۳ء ، پیکار [ڈرامہ]
۱۹۴۳ء ۔ ترقی پسند ادب ۱۹۵۲ء ، لکھنؤ کی
پانچ راتیں ۱۹۶۴ء ۔ غالب اور اس کی شاعری
[انگریزی ، قرۃ العین حیدر کے ساتھ] ۱۹۶۹ء
پیغمبرانِ سخن [کبیر ، میر ، غالب] ۱۹۷۰ء ۔
اقبال شناسی ۔ ۱۹۷۷ء ۔ ترقی پسند ادب کی
نصف صدی [نظام اردو خطبات ۔ دہلی یونیورسٹی]
۱۹۸۷ء ۔
(شاعری) پرواز (نظمیں) ۱۹۴۳ء ۔ نئی دنیا کو سلام
[طویل تمثیلی نظم] ۱۹۴۸ء ۔ خون کی لکیر (نظمیں)
۱۹۴۹ء ۔ امن کا ستارہ (طویل نظمیں) ۱۹۵۰ء
ایشیا جاگ اٹھا (طویل نظم) ۱۹۵۰ء ۔ پتھر کی دیوار
(نظمیں) ۱۹۵۳ء ۔ ایک خواب اور (نظمیں غزلیں)
۱۹۶۴ء ۔ پیراہنِ شرر (نظمیں) ۱۹۶۵ء ۔
لہو پکارتا ہے (نظمیں) ۱۹۷۸ء ۔
ترتیب و تدوین ○ دیوانِ غالب [اردو ہندی] فرہنگ اور دیباچہ ۱۹۵۸ء
دیوانِ میر [اردو ہندی] فرہنگ اور دیباچہ ۱۹۶۰ء
کبیر بانی [اردو ہندی] ترجمہ اور دیباچہ ۱۹۶۵ء
پریم وانی [اردو ہندی] انتخاب اور اردو ترجمہ
فرہنگ ، ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری ۱۹۶۸ء
تراجم ○ ملکی اور غیر ملکی متعدد زبانوں میں نظموں کے ترجمے
امن کا ستارہ [طویل نظم] ۱۷ ہندوستانی زبانوں میں
نئی دنیا کو سلام ۔ ۱۴ ہندوستانی زبانوں میں
تحقیق ○ پی ایچ ڈی کا مقالہ ۔ داؤد کشیری (پٹنہ یونیورسٹی)
پی ایچ ڈی کا مقالہ ______ (رانچی یونیورسٹی)
کتابیں ○ سردار جعفری ۔ محمد ایوب واقف
سردار جعفری اپنی بہنوں کی نظر میں ۔ مرتبہ ۔
کالی داس گپتا رضا ۔ ۱۹۹۱ء ۔
سردار جعفری نمبر [کتاب نما ۔ دہلی] مرتبہ : رفیعہ
شبنم عابدی ۔ ۱۹۹۰ء ۔ دوسرا ایڈیشن (مجلد) ۱۹۹۲ء
سردار جعفری نمبر [افکار ۔ کراچی] مرتبہ : صہبا
لکھنوی ۔ محمد علی صدیقی ۱۹۹۱ء [۴۰۲ صفحات]
زیرِ ترتیب ○ رقصِ مہ و سال [نثر و نظم کا انتخاب]
زہر میرا گہوارہ [نئی نظمیں]
مضامین [مختلف موضوعات پر غیر مطبوعہ مضامین]

علی سردار جعفری
۱۷ دسمبر ۱۹۹۳ء

یہ کوائف ابتدا سے حال تک تقریباً مکمل ہیں ۔
اہم معلومات رسالے میں شامل ہیں ۔

سردار

RAZA LIBRARY
RAMPUR, U.P. (INDIA)

reply please quote

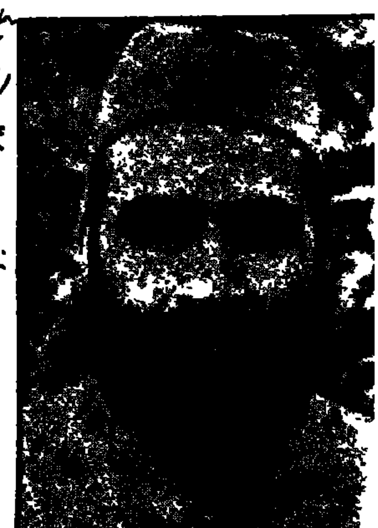
Dated ۲۰ دسمبر ۶۶ء 19

مولانا امتیاز علی خاں عرشی
بنام
علی سردار جعفری

مکرمی و محترمی، سلام مسنون!

دہلی میں آپ سے مفصل ملاقات نہ ہونے کا افسوس رہا۔
مگر اس کی تلافی آپ کے مجموعۂ نظم نے کر دی۔ ابھی ایک ہفتہ کی بات ہے کہ
اکرام علی سلمہٗ نے وہ مجھے دیا۔ میں آج کل صبح کو ناشتے کے بعد کوئی نہ کوئی
کتاب پڑھتا ہوں۔ وقت اتفاق پڑھ لیا کرتا ہوں، یا کسی مشکل کتاب کا مطالعہ کر کے
دل کو تسکین دے لیا کرتا ہوں۔ یہ مجموعہ ہاتھ آیا تو اسے پڑھنا شروع
کر دیا، اور دس بجے تک پورا پڑھ ڈالا اور کسی سے اٹھ کر ملا ہوں گا۔
میں جیسا ادراک اِن نظموں کو سمجھ کر پایا ہوں، شاید
میرے فہم کا سا قصور ہو، نقص ہے۔ مگر آپ کی نظموں کی روح کو بھی برابر سمجھوں گا۔
اور زبان و بیان کا محاسن بے حد بلیغ معلوم ہوا۔ یہ آپ کی فکر کا ادراک اور
ہر قدرت کا نتیجہ تھا۔ مجھے عرصے سے یہ تلاش تھی کہ مقصدی شعر، اور
بیان پر قدرت کا نتیجہ ہے۔ آپ کی نظمیں اور غزلیں
اظہار مقصد میں سچائی اور بے باکی شاعری کا اصل جوہر ہے۔ آپ کی نظمیں اور غزلیں
پڑھ کر اکثر قیلولہ نے ہنسا، قہقہہ لگانا اور یقین کی صدا کو محسوس ہے۔ اور یہ
میں محسوس کرتا ہوں کہ ہر مصرع میں ابلاغ کا زیور سے آراستہ کی جا سکتی ہے جب کہ
آپ بنا سکتے ہیں شاعر کو اپنا مقصد واضح کر سکتا ہے۔ اور ایک
انسان کو سوا دور ہی سے اثر حسن بیان کو نظرانداز کرتا ہوں۔
خدا آپ کا قلم ہے اور زور اور شگفتگی اور تازگی اور شیرینی

عاکر سے آشنا۔ والسلام، خاکسار
عرشی



پ: ۸ر دسمبر ۱۹۰۴ء — م: ۲۱ر فروری ۱۹۸۱ء



علی سردار جعفری

بات سے بات چلے

[بنام خورشید سمیع]

برصغیر کے مشہور ترقی پسند شاعر، ادیب، خطیب اور دانشور علی سردار جعفری نے ۲۹ نومبر ۱۹۹۳ء کو اپنی عمر کے اسّی سال مکمل کر لئے ہیں۔ اس موقع پر ادارہ "شاعر" جعفری صاحب کو ہدیۂ تہنیت پیش کرتا ہے۔ بطور تحفۂ تہنیت کے ایک اہم خط کا متن خصوصیت کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ مسوادِ خط چونکہ گنجلک اور محض اشاروں میں ہے لہٰذا اصل خط کا عکس نہیں دیا جا رہا ہے۔

یہ خط ۳۱ جولائی ۱۹۷۷ء کو خورشید سمیع کے نام تحریر کیا گیا تھا۔ خورشید سمیع مظفر پور (بہار) انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی میں سائنس کے استاد ہیں۔ ادبی رسائل میں ان کے تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے کئی اہم تنقیدی مضامین شاعر میں بھی آچکے ہیں۔ یہ مراسلت گفتگو (سہ ماہی)، کے ترقی پسند ادب نمبر کی ترتیب کے دوران ہوئی تھی۔ ——— مذکورہ نمبر مارچ ۱۹۸۰ء میں طبع ہوا تھا۔ [ضخامت: ۵۹۷ صفحات] اپنے خط میں جعفری صاحب نے نمبر کے جن مضامین کا ذکر کیا ہے وہ ترقی پسند ادب نمبر [جلد اوّل] میں شامل نہیں ہیں اور جلد دوم طبع نہیں ہوئی۔ یہ خط ایک اہم شاعر اور دانشور کے فکری رویّوں کے غمّاز کرتا ہے۔ خط کا ابتدائی اور درمیانی حصہ ایک باخبر اور ذہین مدیر کے طریقۂ کار کو واضح کرتا ہے۔ نام نہاد مدیران رسائل کے لئے یہ ایک پیمانہ ہے۔ ادبی صحافت اور ترتیب و تدوین، جعفری صاحب کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے [نیا ادب سے گفتگو کی ادارت تک] ۔ یہ خط، ترقی پسند تحریک، ترقی پسند ادب اور سردار جعفری کے افہام و تفہیم کا ایک اہم ماخذ ہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے مابین رشتے اور فرق کو ابھارا گیا ہے۔ کئی عالمی شعراء کے فن پاروں کا اصل اور ان کی روح کو اجاگر کرتے ہوئے ترقی پسند شاعری کی بے ہنگم گفتاری کی وضاحت کرتا ہے۔ خط کا بین السطور بہت گتھا ہوا اور بحث طلب ہے۔ ذہن و قلم کی روانی میں اقبال کے ایک مصرعے میں "فرنگی" کی جگہ "مغربی" تحریر ہو گیا ہے۔

۱۹۳۰ سے تا حال، جعفری صاحب کے مضامین نثر و نظم کا ایک بڑا ذخیرہ معروضی نقد و نظر کا منتظر ہے۔ انہوں نے فنونِ لطیفہ کے مختلف شعبوں میں اپنی خلاقانہ شخصیت کا اظہار کیا ہے اور وہ اب بھی فعال ہیں۔ ان کے فن و شخصیت پر تنقیدی تحقیقی کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ افکار [کراچی] دسمبر ۱۹۹۱ء میں اپنا ضخیم سردار جعفری نمبر [۳۳۲ صفحات] شائع کیا ہے۔ ۷۵ ویں سالگرہ کے موقع پر ہم نے شاعر کا سردار جعفری نمبر پیش کرنے کا خاکہ بنایا تھا۔ ایک نئی تکنیک کے ساتھ ایک مسلسل مکالمے کو اس طرح تہذیب کرنا تھا کہ FLASH BACK میں پوری شخصیت سمٹ آئے۔ تصاویر، شعری مجموعے، مختلف حوالے، اشخاص و معاملات، علمی و ادبی اور تہذیبی سرگرمیاں۔ سب کچھ گفتگو میں اس طرح سجایا اور VISUALISE کیا جاتا کہ ایک شخصیت کے حوالے سے تاریخی ادبی دستاویز بن جاتی۔ ہم نے جعفری صاحب کو اس منفرد خاص نمبر کا SYNOPSIS بنا کر دیا تھا مگر وہ اپنی بے طرح مصروفیات کی وجہ سے وقت نہ دے سکے۔ جعفری صاحب پر صحیح معنوں میں ابھی کام ہونا باقی ہے۔ ایک ہمہ جہت شخصیت کے فن کا ASSESMENT ابھی باقی ہے۔ ان کی شاعری کا انتخاب طے کرے گا کہ ان کا شعری قد کیا ہے۔ جب کہ ہو یہ رہا ہے کہ ترقی پسند تحریک کی تاریخ کے تناظر میں مجموعی شعر و ادب کے تذکروں میں سردار جعفری صاحب کا احوال تو ملتا ہے مگر انفرادی سطح پر ان کی شاعری کو نہیں دیکھا جاتا کہ وہ کتنی منشور زدہ ہے اور کتنی نہیں ہے۔ [افتخار امام صدیقی]



۷

حسن اتفاق ہے کہ آج جب میں آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا تو آپ کا ۲۱ جولائی کا خط ملا۔ آپ کا مضمون نقل کر لیا گیا ہے اور کاتب کو کتابت کے لئے دیا جا رہا ہے اس میں دو مقامات پر میں نے لال روشنائی سے نشانات لگا دیئے ہیں پہلے صفحے پر جس جملے کے نیچے نشان ہے وہ سمجھ میں آ جاتا ہے لیکن اگر کسی دوسری طرح لکھا جائے تو شاید بہتر ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کام آپ خود ہی کر سکتے ہیں۔ ویسے یہ جملہ اسی صورت میں چھپ سکتا ہے۔ صفحہ ۷ پر جس جملے کے نیچے نشان ہے اس میں کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے۔ غالباً "بلے بلے" اور "سائے" کے درمیان کوئی لفظ ہو گا۔ ممکن ہے وہ "لفظ مضامین" ہو۔ آپ دیکھ کر تصحیح کر دیجئے اس لئے میں آپ کا اصل مضمون اس خط کے ساتھ ملفوف کر رہا ہوں۔ کتابت کے لئے نقل کافی ہے۔ آپ کا مضمون جس سکشن میں شامل کیا جا رہا ہے اس میں ایک مضمون اصغر علی انجینئر کا ہے۔ "لوکاچ اور جدیدیت"۔ اچھا مضمون ہے۔ ایک مضمون ڈاکٹر محمد حسن کا ہو گا۔ اس کا عنوان ہے "مارکسی تنقید"۔ وہ ابھی موصول نہیں ہوا ہے۔ تیسرا مضمون میں لکھ رہا ہوں۔ "ٹی ایس ایلیٹ، کوڈویل اور اقبال" اس میں جدیدیت اور ترقی پسندی کے خطوط بہت واضح ہوں گے۔ اتفاق یہ ہے کہ جس زمانے میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپنی نظم WASTE LAND لکھی ہے اسی زمانے میں اقبال نے اپنی نظم "خضر راہ" لکھی تھی۔ دونوں پر یورپ کی پہلی جنگ عظیم اور انقلاب روس کا اثر ہے۔ مگر اس فرق کے ساتھ ہم سامراج کے چنگل سے باہر نکل رہے تھے۔ اور انگلستان اور یورپ میں سامراجی نظام موت کے آئینے میں اپنی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس لئے اقبال کے یہاں "آفتابِ تازہ" کی بشارت ہے اور ایلیٹ کے یہاں FEAR IN A HAND FALL OF DUST کا خدشۂ جاں سوز۔ اور جب پیرس میں فاشزم کے خلاف رومین رولاں، ہنری باربوس اور گورکی کانفرنس کر کے تہذیب اور انسانیت کو موت سے بچانے کی بات کر رہے تھے۔ تو انگلستان میں کوڈویل اپنی کتاب PRINCIPLE OF ART لکھ رہا تھا۔ جس میں ایلیٹ کی نظم WASTE LAND کو جدیدیت کا پرچم قرار دیا گیا ہے کوڈویل کے الفاظ میں صرف ایک سطحی کھوئی تہذیب کی تصویر پیش کرتی ہے۔ لیکن کوئی پیغام کوئی لذت، کوئی انبساط فراہم نہیں کرتی۔ یہی وقت ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا کا ہے۔ کوڈویل نے لکھا ہے کہ تہذیب کے اس زوال کا علاج سرمایہ داری نظام کا خاتمہ ہے۔ اس کا علاج صرف WASTE LAND جیسی نظم نہیں ہے۔ ہندوستان اور اردو میں ٹی ایس ایلیٹ کے پرستار اس کی مسیحی مابعد الطبیعات میں کھو جاتے ہیں اور کنسرویٹیو اندازِ فکر دیتے ہیں کہ وہ کولونیل ازم کا زبردست حامی تھا۔ میں اپنا مضمون جلد مکمل کر لوں گا۔ یقین ہے آپ کو پسند آئے گا۔ اس میں ایلیٹ کی شاعرانہ صناعی سے انکار نہیں ہو گا۔

ہمارے یہاں ایک کنفیوژن ہے۔ جدت پسندی اور جدیدیت کو ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ دونوں میں بُعد المشرقین ہے۔ جدیدیت منفی رجحان ہے۔ جو حقیقت کو جامد سمجھنے پر مجبور ہے اور جدت پسندی مثبت رجحان ہے۔ جس میں حقیقت، فعال اور متحرک ہے۔ جدت پسندی کی بہترین تعریف اقبال کے اس شعر میں ہے۔

طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم — ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

اقبال کا پیغمبرانہ اندازِ خدا کے بنائے ہوئے حیرت خانۂ امروز و فردا کو بدل دینے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ ہم انسانی سطح پر نہیں بلکہ انسانوں کے بنائے ہوئے حیرت خانۂ امروز و فردا کو بدلنا چاہتے ہیں۔ جہاں انسان بیچے اور خریدے جاتے ہیں اس کو اقبال نے اپنی نظم "زمانہ" میں "مغربی تاجروں کا قمار خانہ" کہا ہے۔ انسانوں کے لئے انسانیت کی تمنا کرنا خود اپنے آپ کو انسان بنانے کی کوشش ہے۔

جدیدیت اور ترقی پسند تخلیقات کا اصل فرق تنقیدی مباحث میں ظاہر نہیں ہوتا۔ تخلیقات کے تقابلی مطالعے میں ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۹۵۴ء میں روسی ادیبوں کی کانفرنس کے وقت وہاں کے ایک میگزین CROCODILE میں ایک دلچسپ کارٹون چھپا تھا۔ میز کے ایک طرف طالسطائی، پشکن، چیخوف، گورکی وغیرہ بیٹھے ہیں اور دوسری طرف سامنے نئے ادیب کھڑے ہیں۔ اس کے نیچے کچھ اس قسم کی عبارت تھی کہ "زبانی امتحان میں تو آپ بہت کامیاب ہیں۔ اب ذرا اپنی کتابیں پیش کیجئے" اور وہ سب اپنی کتابیں پشت کے پیچھے چھپائے کھڑے ہیں۔ یہی حال جدیدیت کا ہے۔

میں آپ کے اس خیال سے متفق ہوں کہ ترقی پسند تحریک کی از سر نو دریافت اور بازدید ضروری ہے۔ "ترقی پسند ادب نمبر" میں اسی کی کوشش کی جائے گی۔



میں نے آپ کے مقالے میں اس مقام پر جہاں آپ نے برٹرنڈ رسل کے دس نکات کو جدیدیت کے تصورِ انفرادیت کا خاکہ کہا ہے۔ ایک نوٹ دیا ہے جو نیچے نقل کر رہا ہوں۔

" نوٹ :۔ رسل کے ان نکات کو جدیدیت کے تصورِ انفرادیت کا خاکہ کہنا زیادہ صحیح نہیں ہے۔ یہ تصورات ترقی پسند فکر و دانش کا لازمی جزو ہیں اور عرفانِ ذات کے لئے ضروری ہے۔ عرفانِ ذات قیدِ ذات سے الگ چیز ہے۔ اور اس سے اجتماعی ذمہ داری اور شعور کی نفی نہیں ہوتی۔ ثبوت میں اپنے چند پرانے اشعار سند رسل کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔

چھوڑ کر وہم و گماں حسنِ یقیں تک ہو چلو پر یقیں سے بھی کبھی وہم و گماں تک آؤ

اس سے تیغ نگہ آبدار ہوئی ہے
مجھے بتاؤں بڑی شئے ہے جرأتِ انکار

جب ہوں رسوا سرِ بازار تو ہے لطفِ سخن حرفِ حق جب ہو سرِ دار تو ہے لطفِ سخن
اپنے اور غیر ہوں یکجا کہنے پر آمادۂ قتل اور نہ ہو کوئی طرفدار تو ہے لطفِ سخن
مصلحت وقت کی اقرار سکھائے لیکن دل میں ہو جرأتِ انکار تو ہے لطفِ سخن
ظلم کے خوف کے، اور حکومت کے سناٹے میں ایک ایک لفظ ہو بیدار تو ہے لطفِ سخن

ہے ہمیشہ سے یہی افسانۂ پست و بلند
حرفِ باطل زیبِ منبر، حرفِ حق بالائے دار

عرفانِ ذات کی یہ روشنی تمام ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں جگمگا رہی ہے۔"

[سردار جعفری]

اگر آپ کا خیال ہو کہ یہ نوٹ نامناسب ہے تو میں اس کو خارج کر دوں گا۔ بات یہ ہے کہ جدیدیت کی انفرادیت پسندی معاشرے سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے۔ اور ذات کے نہاں خانے کو شعور کا زنداں بنا دیتی ہے۔ وہ لوگ جو اپنی تخلیقی صلاحیت کی آنچ سے اس زنداں کی سلاخوں کو پگھلا دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ان کو جدیدیت قابلِ ملامت سمجھتی ہے اور اپنے قبیلے میں شامل کرنے سے انکار کرتی ہے جیسے ڈاکٹر وحید اختر۔ اور بھی لوگ ہیں جن کو ان کی تخلیقی قوت کشاں کشاں اس زنداں سے باہر کھینچ کر لا رہی ہے جیسے انور سجاد (افسانہ نگار) عتیق اللہ (نقاد اور شاعر) اور سریندر پرکاش (افسانہ نگار) اس پر ان کی نئی تخلیقات شاہد ہیں۔ میں اس پہلو پر ترقی پسند ادب نمبر کے اداریے میں روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ اور اس قسم کی تخلیقات کو انتخاب میں بھی جگہ دی جائے گی۔

ادب اور پروپیگنڈے کے متعلق آپ نے CLEANTHE BROOKS کی کتاب کے جس باب کا حوالہ دیا ہے اس کو دیکھوں گا۔ میں خود بھی اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں کاڈویل کے حوالے سے اسی پر اظہارِ خیال کر چکا ہوں۔ پروپیگنڈے اور ادب میں وہی فرق ہوتا ہے جو پیڑ کی پتی اور پھول کی پنکھڑی میں ہوتا ہے۔ پھول کی پنکھڑی بھی نباتات کے علم کے اعتبار سے پتی ہی ہوتی ہے۔ لیکن اپنے مخصوص حسن و رنگ و نکہت کے ساتھ۔ آل احمد سرور نے کہیں اپنے انداز سے لکھا ہے کہ ہر ادب پروپیگنڈہ ہوتا ہے لیکن ہر پروپیگنڈہ ادب نہیں ہے۔ اس معاملے میں ہماری اور نقاد کے عقیدے کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ وہ جس عقیدے کا حامی ہوتا ہے۔ اس میں اس کو پروپیگنڈا نظر نہیں آتا۔ دوسرا عقیدہ پروپیگنڈہ معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کے اس شعر کو کسی نے کیا پروپیگنڈہ کہہ کر مطعون نہیں کیا ہے

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

لیکن کیفی اعظمی کا یہ مصرعہ پروپیگنڈہ معلوم ہوتا ہے۔ 'نوید فتح ہے، قلبِ عوام کی دھڑکن'۔ قرۃ العین حیدر نے "فن اور شخصیت" کے جان نثار اختر نمبر میں ایک بڑے مزے کی بات لکھی ہے کہ علامہ اقبال تمام عمر اسلام زندہ باد کا نعرے لگاتے رہے۔ اس کا مقصد خدانخواستہ اسلام کی مخالفت نہیں ہے بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اقبال کی شاعری کا اکثر بڑا حصہ پروپیگنڈہ ہے جسے اقبال نے اپنی شاعری میں "حرفِ [illegible]"

[باقی صفحہ ... پر دیکھئے]





بخطِ شاعر

۱

غزل

بیکسی و بیقرار چہرے
سلگتے ہوئے سوگوار چہرے

مٹی میں پڑے دمک رہے ہیں
ہیروں کی طرح ہزار چہرے

لے جا کے انہیں کہاں سجائیں
یہ بھوک کے شاہکار چہرے

افریقہ و ایشیا کی زینت
یہ نادرِ روزگار چہرے

مانوس کتنے کسی طرح دلکش
یہ شمعِ سیہ مزار چہرے

کھوئی ہوئی عظمتوں کے وارث
کملائے ہوئے یادگار چہرے

غازے سے سپیدے سے رنگین
اس دور کے داغدار چہرے

پچکے ہیں فریب در اوصاف
کہ سیدہ ہیں خاکسار چہرے

گزرے ہیں تباہ و دل سے ہو کر
ہر طرح سے بے شمار چہرے

مغرور اناؤں کی گفتگو میں
بیٹھے ہوئے کم عیار چہرے

ناقابلِ التفات آنکھیں
ناقابلِ اعتبار چہرے

شہرت کے بلند آسماں پر
چھپتے ہوئے اشتہار چہرے

پل بھر میں دھواں دھواں نگر سب
پل بھر میں فقط غبار چہرے

سونے کا چڑھا ہوا ہے پانی
پیتل کے ہیں شاندار چہرے

پیتے ہیں تو آب نارسائی
قسمت کے کرایہ دار چہرے

ان سب سے گراں بہا تر ہیں
رندوں کے گناہ گار چہرے

ٹیکے ہوئے نیزہ و سناں پر
وہ شبنمِ نوکِ خار چہرے

چپ چاپ سلگ رہے ہیں
آتش کدۂ بہار چہرے

شعلوں کے مزاج آشنا ہیں
برفاب سے بے شرار چہرے

امید کی شمع سے فروزاں
شائستۂ انتظار چہرے

[illegible]

۲

غزل

آئے ہم غالب و اقبال کے نغمات کے بعد
مصحفِ عشق و جنوں حسن کی آیات کے بعد

اے وطن، خاکِ وطن وہ بھی تجھے دے دینگے
بچ گیا ہے جو لہو اب کے فسادات کے بعد

نار نمرود یہی ہے یہی گلزارِ خلیل
کوئی آتش نہیں آتش کدۂ ذات کے بعد

رام و گوتم کی زمیں حرمتِ انساں کی امیں
بانجھ ہو جائے گی کیا خون کی برسات کے بعد؟

ہم کو معلوم ہے وعدوں کی حقیقت کیا ہے
پرسشِ سنگِ ستم جامِ مدارات کے بعد

تشنگی ہے کہ بجھائے نہیں بجھتی سردار
بزمِ حق گوئی و تسنیم کی سوغات کے بعد



علی سردار جعفری

۱۰، سیتا محل، بومن جی پیٹیٹ روڈ، بمبئی - ۳۶

غالب کے ہم نوا گوئٹے کے دیس میں

"مشہور ایرانی شاعر عمر خیام نے ایک رباعی میں آداب مے نوشی بتاتے ہوئے یہ کہا ہے ے

گر بادہ خوری تو با خردمنداں خور یا با صنم سادہ رُخ و خنداں خور

یہ بڑی خوبصورت بات ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اس شعر میں "یا" کا لفظ فاضل ہے۔ اصل میں یوں ہونا چاہیئے کہ بادہ خوری اس محفل میں کرو جس میں 'خردمنداں' بھی ہوں اور صنم سادہ رُخ و خنداں بھی، اور آج کی شام اس محفل میں دونوں شریک ہیں، اس لئے میں جرمنی کے مردوں اور عورتوں کے نام پر جام اٹھا رہا ہوں۔ لیکن اس موقع پر مجھے ایک پرانی روسی کہاوت یاد آگئی۔ وہ کچھ اس طرح ہے کہ "مردوں کا حُسن ان کی عقل و دانش میں ہوتا ہے اور عورتوں کی عقل و دانش ان کے حسن میں۔ اس لئے میں جرمنی کے حسین مردوں اور عقل مند عورتوں کا جام صحت پینا چاہتا ہوں۔"

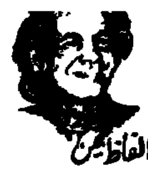
میرے ان الفاظ پر NEUBRANDENBARG کے ایک خوبصورت مہمان خانے میں بیٹھے ہوئے احباب کھلکھلا کر ہنس پڑے اور جام صحت زیادہ خوشگوار ہو گیا۔

میں مشرقی یا مغربی جرمنی کے کسی حصے میں اس سے پہلے کبھی نہیں گیا تھا۔ اس سال ALL INDIA INDO GDR FRIENDSHIP ASSOCIATION کے ایک ڈیلیگیشن میں شریک ہو کر پہلی بار جرمنی میں داخل ہوا تھا۔ میرے ذہن میں جرمنی کے خیال کے ساتھ 'اف شی ان سی' اور 'تھارونس' کا تصور کچھ اس طرح وابستہ تھا کہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس ملک میں کس قسم کا حسن ہو سکتا ہے۔ لیکن مشرقی جرمنی کے شمالی علاقوں کی سیر کرتے ہوئے میں نے وہاں کے فطری اور انسانی حسن کو پہلی بار محسوس کیا جس کو عام انسانوں کی معاشی فراغت نے ایک وقار عطا کر دیا تھا۔

اس تجربے کے ساتھ میرا دوسرا تجربہ جذباتی تھا مگر زیادہ گہرا اور شدید۔ پہلے ہی دن برلن کی مشہور سڑک UNTER DAN LINDEN سے گزرتے ہوئے جب میں BRANDENBURG GATE کے سامنے پہونچا تو اس کے قریب ایک ہوٹل نظر آیا جو کسی زمانے میں نازی فوجی افسروں کی قیام گاہ رہتا تھا۔ اس کے قریب ہی وہ مقام تھا جہاں اپنے بنکر میں ہٹلر نے خودکشی کی تھی۔ اب وہ باقی نہیں ہے لیکن وہ عمارت باقی ہے جس میں بیٹھ کر ۱۹۳۳ء سے لے کر دس سال تک گوئبلز جھوٹ کو سچائی کا روپ دیتا رہا تھا۔ یکایک مجھے وہ نازی الفاظ یاد آ گئے "کہ جب میں کلچر کا نام سنتا ہوں تو اپنا ریوالور سنبھال لیتا ہوں۔"

میں اس عمارت کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا تو وقت کی رفتار پیچھے کی طرف مڑ گئی اور میری یادیں مجھے ۱۹۳۳ء اور اس کے بعد کے علی گڑھ میں لے گئیں جہاں میں مسلم یونیورسٹی میں طالب علم تھا اور میں نے محسوس کیا کہ میرے ادبی، سیاسی اور نظریاتی وجود کی تشکیل میں جرمنی کا بھی ذرا سا دخل ہے۔

وہ ہندستان کی سیاست میں بڑا طوفانی زمانہ تھا۔ چند سال پہلے کانگریس مکمل آزادی کی تجویز منظور کر چکی تھی۔ اور جواہر لال نہرو کی رہنمائی میں ہندستان اپنی بیرونی پالیسی کی تشکیل کر رہا تھا۔ اس کی بنیاد سامراج دشمنی اور فاشزم کی مخالفت پر تھی جس کا عروج



مسولینی کے اٹلی کے بعد ہٹلر کے جرمنی میں ہو رہا تھا۔ نہرو کے الفاظ میں

"HITLER AND HIS CREED RECEIVED THE IMBODIMENT AND INTENSIFICATION OF THE IMPERIALISM AND RACIALISM AGAINST WHICH THE CONGRESS WAS STRUGGLING"

آج ہندوستان میں اردو کے جو بڑے ادیب اور شاعر ہیں ان کی اچھی خاصی تعداد اس زمانے کے علی گڈھ میں موجود تھی اور ہماری ذہنی تربیت میں مسلم یونیورسٹی یونین کے ان مباحثوں نے بڑا حصّہ لیا ہے جن میں ہم لوگ فاشزم کی مخالفت میں آواز بلند کر رہے تھے طالب علموں میں خواجہ احمد عباس اور اساتذہ میں ڈاکٹر محمد اشرف پیش پیش تھے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا ہمیں جرمنی کے اندر کی نازی دشمن تحریک کا اندازہ ہونے لگا۔ اسی زمانے میں ہم نے ارنسٹ تھالمانے کا نام سُنا۔ ہٹلر کا عُروج، رائشٹاگ کی آگ، اسپین کی خانہ جنگی، دوسری جنگِ عظیم، نازی کن سن ٹریشن کیمپ، اسٹالن گراڈ کی جنگ، برلن کا زوال یہ سب وہ منزلیں تھیں جن سے ہمارے شعور کا کارواں گزرا تھا۔

اسی زمانے میں مارکس کی تعلیمات نے میرے لئے ایک نیا افق روشن کیا تھا۔ اسی لئے چالیس سال بعد برلن کی پرانی یونیورسٹی کو بڑے شوق سے دیکھا جس میں مارکس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۹۴۶ء کے بعد سے اس کا نام اس کے بانی کے نام پر HAMBOLDT UNIVERSITY رکھ دیا گیا ہے۔ اب اس کے دس ہزار طالب علموں میں مزدوروں اور کسانوں کے بچوں کی اکثریت ہے اس یونیورسٹی سے میرا جذباتی رشتہ اس لئے اور بھی گہرا ہے کہ میرے علی گڈھ کے استاد اور دوست ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف نے اپنی آخری عمر میں اس یونیورسٹی میں تاریخ کا درس دیا تھا۔ اور اب وہ مرنے کے بعد جی ڈی آر کی خاک میں دفن ہیں۔ اور اسی یونیورسٹی میں ہندوستان کے سابق راشٹرپتی اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین نے تعلیم حاصل کی تھی۔

میری شاعرانہ تربیت میں بھی جرمنی کا چھوٹا سا حصّہ ہے۔ میر اور غالب، حافظ اور سعدی، کالی داس اور تلسی داس کی روایت مجھے ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے وراثت میں ملی تھی۔ انگریزی شعر و ادب کی روایت تعلیم کے ذریعے سے حاصل کی تھی لیکن میری ابتدائی ادبی کاوشوں کو موڑ دینے میں گوئیٹے کا بھی ہاتھ ہے۔ جو اپنے عہد کی تمام تباہی اور بربادی کے باوجود اپنی ترنم ریزی کو برقرار رکھ سکا۔ مجھ سے پہلے اس عہد کا عظیم ترین اردو شاعر اقبال (۱۸۷۷ء سے ۱۹۳۸ء تک) گوئیٹے سے متاثر ہو چکا تھا جس نے اس آفاقی جرمن شاعر کا مطالعہ اصل جرمنی زبان میں کیا تھا۔ گوئیٹے نے کالی داس کی شکنتلا کے حسن کو بھی محسوس کیا تھا اور سعدی اور حافظ کی شاعری کی لطافت اور نزاکت کو بھی۔ ایرانی شاعری کے زیر اثر اس نے اپنی نظموں کا ایک مجموعہ دیوان مغربی کے نام سے شائع کیا تھا۔ پورے سو سال بعد اقبال نے اس کے جواب میں "پیام مشرق" کی تخلیق کی (۱۹۲۴ء) جس کے دیباچے میں اپنا اور گوئیٹے کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

پیر مغرب، شاعر الحالزی — آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی
بست نقش شاہدان شوخ و شنگ — داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابم گفتہ ام پیغام مشرق — ماہتابے ریختم بر بام مشرق
تا شناسائے خودم خود بیں نیم — با تو گویم او کہ بود و من کیم
او ز افرنگی جوانان مثل برق — شعلۂ من از دم پیران شرق
ہر دو دانائے ضمیر کائنات — ہر دو پیغام حیات اندر ممات
ہر دو خنجر، صبح خند، آئینہ فام — او برہنہ من ہنوز اندر نیام
ہر دو گوہر ارجمند و تابدار..... — زادۂ دریائے ناپیدا کنار



اوز شوخی در تہہ قلزم تپید ۔ ۔ ۔ تا گریبان صدف را بردرید
من بہ آغوش صدف تابم ہنوز ۔ ۔ در ضمیر بحر نایابم ہنوز

اقبال کے ذریعے سے دو آتشہ ہو کر گوئٹے کی شاعری اور فکر دوبارہ میرے پاس پہونچی اور اس جام نے مجھے سرشار کر دیا - اب برسوں بعد میں نے جب مشرقی جرمنی کی سرزمین پر قدم رکھا تو یہ سفر میرے لئے مسرت کا باعث تھا - برلن کی ہوائیں ٹھنڈک اور تازگی تھی -

مشرقی برلن میں جدید اور قدیم تعمیرات دوش بدوش دکھائی دیتی ہیں - یہ شہر دوسری جنگ عظیم میں بالکل تباہ و برباد ہو چکا تھا - اس کا چپہ چپہ گذشتہ پچیس سال سے آہستہ آہستہ دوبارہ تعمیر کیا جا رہا ہے - INTERHOTEL STADT BERLIN جسمیں میرا قیام تھا شہر کے مرکزی علاقے ALEXANDER PLATZ میں ہے جو بالکل جدید تعمیر ہے - اس کا یونیورسل کلاک اور جدید قسم کے ایک فوارے سے آراستہ چوک بہت وسیع ہے جہاں عاشقوں کے نوعمر جوڑے ٹہلتے نظر آتے ہیں اور بچوں کے ہجوم ستاروں کی طرح گذرتے ہیں - وہیں برلن کا جدید ترین ٹی - وی - ٹاور ہے اور اس کے پیچھے ایک خوبصورت پارک میں وہ پرانا خوبصورت فوارہ جس میں سے سمندر کا پروقار دیوتا NAPTUNE بلند ہو رہا ہے - بعض پرانی عمارتوں کو جو بمباری میں مسمار ہو گئی تھیں ان کی اصلی شکل میں دوبارہ بنایا گیا ہے جیسے سرخ اینٹوں کا برلن ٹاؤن ہال - وہاں کی مشہور سایہ دار سڑک UNTER DAN LINDEN کے کنارے جرمن تاریخ کا میوزیم ہے - یہ BAROQUE طرز تعمیر کی عمارت جو بت تراشی کے حسین نمونوں سے آراستہ ہے ساڑھے تین سو برس پرانی ہے - یہ اصل میں PRUSSIAN ROYALTY کا اسلحہ خانہ ARSENAL تھا جو اب میوزیم میں تبدیل ہو چکا ہے اور ایک طرح کا تعلیمی مرکز بن گیا ہے - امن کا ایک اور سمبل ۱۷۹۱ء کا بنا ہوا BRANDENBURG GATE ہے جس کو ابتدا ہی میں امن کے نام پر تعمیر کیا گیا تھا - لیکن ۱۹۴۵ء تک اس کے پروقار ستونوں کے درمیان سے فوجی قدموں کی آہٹ جرمن ملٹری ازم کے عروج کا اعلان کرتی رہی - ۱۹۳۳ء میں اسی جگہ نازیوں کا ٹارچ لائٹ جلوس نکلا تھا - نازیوں کی شکست کے ساتھ یہ گیٹ بھی خستہ ہو گیا تھا - اسے دوبارہ اس کی اصلی شکل میں تعمیر کیا گیا ہے - اب اس پر ایک ایسی ریاست کا جھنڈا لہرا رہا ہے جس میں جنگی پروپگنڈا، نسلی منافرت اور قومی عصبیت SHRUVANISM کا اظہار ممنوع ہے - برلن کی عمارتوں کی طرح جرمنی کی معیشت بھی دوسری جنگ عظیم میں غارت ہو چکی تھی - اور جی ڈی آر نے پچیس سال میں اپنی خاکستر سے اپنا جہان پیدا کیا ہے - وہاں کام کی کوئی کمی نہیں ہے کام کرنے والوں کی کمی ہے جسے ہم SHORTAGE OF MAN POWER کہتے ہیں - ملک کی آبادی رقبے کے اعتبار سے بہت کم ہے ہم ہندستان سے جانے والوں کو جو دن رات برتھ کنٹرول کی آوازیں سنتے رہتے ہیں یہ بات بہت دلچسپ لگی کہ جی ڈی آر میں کہیں سرخ تکون نہیں دکھائی دیتا - اس کے برعکس حکومت نوجوانوں کو شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے کے لئے INCENTIVES فراہم کرتی ہے - شادی کے بعد گھر بسانے کے لئے بے سود کے قرض دیا جاتا ہے اس کے بعد پہلا بچہ پیدا کرنے پر ۲۰۰/- روپئے کا انعام اور تیسرا بچہ پیدا کرنے پر ۹۵۰/- کا انعام -

میں نے جس علاقے کی سیر موٹر کے ذریعے سے کی وہ کسی زمانے میں جرمنی کا سب سے پچھڑا ہوا علاقہ تھا جس پر PRUSSIAN JUNKERS کا فیوڈل راج تھا - اعداد و شمار کے بغیر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ جی ڈی آر میں زندگی خوشحال ہے، تعلیم عام ہے، بیروزگاری نہیں ہے - ان کے پاس دولت کی وہ ریل پیل تو نہیں جو مغربی ممالک میں نظر آتی ہے - لیکن دولت کی تقسیم نہایت معقول ہے اور فحاشی کا کوئی مظاہرہ نہیں ملتا - عام لوگ خوش اخلاق ہیں - میں نے اپنی مترجم لڑکی سے جس نے ابھی تعلیم ختم نہیں کی تھی جنسی مسائل سے لے کر سیاست، آرٹ، ادب اور کلچر کے مسائل تک گفتگو کی اور اسے نہایت بیدار مغز پایا ______ ۵۵۵ سال پرانی راسٹاک ROSTOCK یونیورسٹی کے اساتذہ سے لے کر NEUSTRELITZ جواہرلال نہرو پالی ٹکنیکل



اسکول کے طلبا تک سے ملاقات کی اور ان کے اعلیٰ درجے کے تعلیمی نظام کو ان کی قومی زندگی کی ضروریات سے ہم آہنگ پایا۔

تعلیم اور تربیت CRECHES سے شروع ہو جاتی ہے۔ پھر چھ سال کی عمر تک KINDERGARTEN میں تعلیم ہوتی ہے۔ پھر دس سال کا GENERAL POLYTECHNICAL AND SECONDARY SCHOOL ہوتا ہے جس میں زبان، ادب، تاریخ، جغرافیہ، ASTRONOMY، سائنس، MATHMATICS، باغبانی، MANUAL TRAINING POLYTECH-NICAL INSTRUCTIONS CLINICS، میوزک اور اسپورٹس کی تعلیم کے بعد نوّے فیصد لڑکے لڑکیاں دو سال کے VOCATIONAL SCHOOL میں ٹریننگ حاصل کرکے ملک کے کاروبار میں لگ جاتے ہیں۔ دس فیصدی طالب علم اکیڈمک کیریئر اختیار کر کے یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں۔ تعلیم کا بار حکومت پر زیادہ ہے۔ والدین پر کم۔ اعلیٰ اور ٹکنیکل تعلیم حاصل کرنے کے لئے بیرونی ممالک کے طالب علم سرکاری اسکالرشپ پر آتے ہیں۔ ان میں ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیشی طالب علموں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔

اس سفر میں مجھے بہت سے ہندستانیوں اور پاکستانیوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ ہمارے سفیر ARAVINDA RAMCHANDRA DEO مہاراشٹرا کے رہنے والے ہیں اور بڑی نفیس اردو بولتے ہیں۔ مجھے خود بھی اس کا اندازہ ہوا تھا لیکن انہوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ ہندستان کی خارجہ پالیسی کی وجہ سے ہمارا ملک جی ڈی آر میں بہت مقبول ہے اور پنڈت نہرو کا نام لیجنڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندستان کو جدید دنیا کے نقشے میں ایک قابل احترام جگہ دلوانے میں پنڈت نہرو کی شخصیت کا بڑا دخل ہے۔ جواہر لال نہرو پالی ٹکنیکل اسکول کے طالب علموں میں میرا وقار بہت بڑھ گیا جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ میں پنڈت نہرو کو ذاتی طور سے جانتا تھا۔ وہ بچے مسز اندرا گاندھی کا استقبال کرنے کے لئے بے چین ہیں۔

مجھے اس دن بہت خوشی ہوئی جب مغربی برلن سے چند پاکستانی طالب علم مجھ سے ملنے آئے۔ ان کی محبت، خلوص احترام اور دوستی میں کسی قسم کی نمائش نہیں تھی۔

اتفاق سے اس دن میری ملاقات پاکستان کے چند سرکاری افسروں سے ہوئی تھی جن کا رویہ بہت مخالفانہ تھا۔ مشکل سے صاحب سلامت ختم ہوئی تھی کہ انہوں نے ہندستان کے ایٹمی دھماکے کا ذکر چھیڑ دیا۔ ان کو اس پر اصرار تھا کہ اندرا گاندھی ایٹم کے پرامن استعمال کی باتیں کر کے دنیا کو دھوکہ دینا چاہتی ہیں۔ ان کے نزدیک دراصل ہندستان کا مقصد ایٹمی بم بنانا ہے جسے وہ پاکستان کے خلاف استعمال کرے گا۔ میں نے انہیں بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ ہندستان میں امن کی حامی اور پاکستان سے دوستی کی خواہش مند جمہوری طاقتیں بہت مضبوط ہیں۔ لیکن میں ناکام رہا۔ ان کی نفرت اندھی تھی۔

لیکن پاکستانی طالب علموں سے مل کر یہ یقین پھر مضبوط ہو گیا کہ ہندستان اور پاکستان کے درمیان دوستی اور مفاہمت ممکن ہے۔ وہاں کے نوجوانوں میں ترقی پسند جمہوری رجحانات کی کمی نہیں ہے۔ انہوں نے مجھے مغربی برلن آنے کی دعوت دی جسے میں نے بڑی خوشی سے قبول کر لیا۔

میں ان کے ہوسٹل میں شام کے ساڑھے سات بجے پہونچا۔ سب سے پہلی چیز جس پر میری نظر پڑی وہ ایک بڑا سا بینر تھا جس پر جرمنی زبان میں لکھا تھا MIET STREIK یعنی REUT STRIKE طلبا نے مجھے بتایا کہ یہ اسٹرائک پہلی مئی سے چل رہی ہے۔ منتظمین کمرے کا کرایہ ایک سو چھ (۱۰۶) مارکس لیتے ہیں اور اب اس میں پچیس (۲۵) مارکس کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ رقم بہت زیادہ ہے۔ ہم صرف پچھتر (۷۵) مارکس ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ مطالبہ بھی تھا کہ ہوسٹل کا انتظام طلبا کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں۔

یہ طالب علم پاکستان کے درمیانی طبقوں کے معمولی گھرانوں سے آتے ہیں اور مغربی جرمنی میں کام کر کے اپنی روزی کماتے ہیں اور تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ وہ اس وقت اس بات سے پریشان تھے کہ آئندہ سال سے بیرونی طالب علموں کو کام کرنے اور کمانے کی اجازت نہ ہوگی۔ ان کا خرچ پانچسو مارکس ماہوار ہے۔ آئندہ سال سے مغربی جرمنی کی حکومت بیرونی طالب علموں سے ممکن نہیں



مانگے گی۔ کہ ان کے والدین انہیں معاشی طور سے سپورٹ کر سکتے ہیں۔ اس طرح معمولی آمدنی کے طالب علموں کیلئے مغربی جرمنی میں اعلیٰ تعلیم کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اس دائرے میں پاکستان کے علاوہ ایرانی، یونانی اور فلسطینی طالب بھی ہیں۔ ہندوستانی طالب علموں کی نوّے فیصدی اکثریت اپنے خرچ سے آتی ہے۔

شام کی خوشگوار ملاقات میں پاکستان کے بارے میں بھی باتیں ہوئیں جس میں اس امر پر زور تھا کہ وہاں کا اصل مسئلہ ایک غیر فوجی جمہوری نظام حیات کی تعمیر ہے۔

رات کو دس بجے باقاعدہ جلسہ ہوا اور ایک خطبۂ صدارت سے میرا استقبال کیا گیا۔ پھر میں نے بہت سی نظمیں سنائیں میں ۱۹۴۷ء کے بعد سے کبھی پاکستان نہیں گیا۔ پھر بھی یہ نو عمر طالب علم مجھ سے اور میری شاعری سے واقف تھے اور فرمائش کر کر کے نظمیں سن رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ پاکستان آئیے۔ وہاں آپ کے بہت سے چاہنے والے ہیں۔

جب جلسہ برخاست ہو رہا تھا تو کسی نے بہت ولولے کے ساتھ اطلاع دی کہ برلن فلم فسٹول میں کیفی اعظمی کی بیٹی شبانہ آئی ہوئی ہیں۔ پاکستانی طالب علم مجھے وہاں لے جانا چاہتے تھے لیکن رات زیادہ ہو جانے کی وجہ سے میں مشرقی برلن واپس آگیا۔

اس طرح جرمنی میں میرے قیام کے انیس دن پورے ہوئے۔ لیکن یہ سفر ابھی ناتمام ہے کیونکہ میں ویمر جا کر گوئٹے کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا وقت نہ نکال سکا جس کا ایک ہمنوا غالب دہلی میں اور دوسرا ہمنوا اقبال لاہور میں آسودۂ خاک ہے۔ ان تینوں میں ایک عجیب و غریب شاعرانہ اور مفکرانہ مماثلت ہے۔ تینوں نے ایک نئے انسان کا خواب دیکھا ہے۔ جو آج کی نسل کا بڑا قیمتی ورثہ ہے ❀

بقیہ صفحہ ۸ بات سے بات چلے

بھلے۔ رو شراپ کو پسند آئیں گے ؎

مرد فقیر را آتش است میری و قیصری خس است
خار و فرِ ملوک را حرفِ برہنہ بس است
وقت برہنہ گفتن است، من بہ کنایہ گفتہ ام
خود تو بگو کجا برم ہم نفسان خام را

بہر حال یہ مضمون ایسا ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ بحث تو ہمیشہ جاری رہے گی۔ گفتگو کا ترقی پسند ادب نمبر آٹھ سو صفحات کا ہوگا اور آفسیٹ پر چھپ رہا ہے آخر ستمبر تک آئے گا۔ قیمت پچاس روپے ہوگی۔ اس کے لئے اپنے اثرات سے تعلیمی اداروں اور دوسرے حلقوں کے آرڈر حاصل کرنے میں مدد کیجئے۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

پس نوشت:۔ آپ کے استفسار کا جواب: میرے نزدیک برٹش کولونیل ازم کے لیے کوئی معقول اردو اصطلاح نہیں ملے گی۔ استعماریت شہنشاہیت یا IMPERIALISM کے لیے مناسب لفظ ہے۔ میں تو کولونیل ازم کے لفظ کو اردو میں داخل کر لینے کے حق میں ہوں ❀

بقیہ صفحہ ۱۸ ایک خوبصورت پھول

محبت ہے اور وہ ہم سب کے دلوں پر نقش ہے۔

خدا تمہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ [۱۴ مارچ ۱۹۹۲ء کی شام کے ۸ بجے بی بی سی ریڈیو سے بذریعہ ٹیلیفون نشر کی گئی تحریر] ❀



ظلم کی کچھ میعاد نہیں ہے
داد نہیں فریاد نہیں ہے
قتل ہوئے ہیں اب تک کتنے
کوئے ستم کو یاد نہیں ہے
آخر روئیں کس کو کس کو
کون ہے جو برباد نہیں ہے
قید، چمن بھی بن جاتا ہے
مرغِ چمن آزاد نہیں ہے
لطف ہی کیا گر اپنے مقابل
سطوتِ برق و باد نہیں ہے
سب ہوں شاداں سب ہوں خنداں
تنہا کوئی شاد نہیں ہے

یاد آتے ہیں عہدِ جنوں کے کھوئے ہوئے دلدار بہت
اُن سے دُور بسائی بستی جن سے ہمیں تھا پیار بہت
ایک اک کرکے کھل تھیں کلیاں ایک اک کرکے پھول گئے
ایک اک کرکے ہم سے بچھڑے باغِ جہاں میں یار بہت
حسن کے جلوے عام ہیں لیکن ذوقِ نظارا عام نہیں
عشق بہت مشکل ہے لیکن عشق کے دعوے دار بہت
زخم کھویا کھلتی کلیاں، ہاتھ مگر گلدستہ ہے
باغِ وفا سے ہم نے چنے ہیں پھول بہت اور خار بہت
جو بھی بلا ہے لے آتے ہیں داغِ دل یا داغِ جگر
وادی وادی منزل منزل بھٹکے ہیں سردار بہت

شکستِ شوق کو تکمیلِ آرزو کہیے
جو تشنگی ہو تو پیمانہ و سبو کہیے
خیالِ یار کو دیجئے وصالِ یار کا نام
شبِ فراق کو گیسوئے مشک بو کہیے
چراغِ انجمن حیرتِ نظارہ تھے
وہ لالہ رُو جنھیں اب داغِ آرزو کہیے
مہک رہی ہے غزل ذکرِ زلفِ خوباں سے
نسیمِ صبح کی مانند کو بہ کو کہیے
شکایتیں بھی بہت ہیں، حکایتیں بھی بہت
مزا تو جب ہے کہ یاروں کے روبرو کہیے
یہ حکم کیجئے پھر خنجروں کی دلداری
دہانِ زخم سے افسانۂ گلو کہیے

نغمۂ زنجیر ہے اور شہرِ یاراں ان دنوں
ہے بہت اہلِ جنوں کا شورِ بہاراں ان دنوں
اُس وفا دشمن سے پیمانِ وفا ہے اُستوار
زیرِ سنگِ بخت ہے پھر دستِ یاراں ان دنوں
محتسب بھی حلقۂ رنداں کا ہے اُمیدوار
کم نہ ہو جائے وقارِ میگساراں ان دنوں
تیزیٔ تیغِ ادا کی شہرتیں ہیں دور دور
ہے بہت آباد کوئے دل فگاراں ان دنوں
دوستو پیراہنِ جاں خونِ دل سے سرخ تر
بڑھ گیا ہے التفاتِ گل عذاراں ان دنوں
اہلِ دل پر بارشِ لطفِ نگاہِ دل نواز
مہرباں ہے عشق پر چشمِ نگاراں ان دنوں

سلام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا
باعثِ رشک ہے تنہا رویٔ رہروِ شوق
ہم سفر کوئی نہیں دوریٔ منزل کے سوا
ہم نے دنیا کی ہر اک شے سے اُٹھایا دل کو
لیکن اک شوخ کے ہنگامۂ محفل کے سوا
تیغ منصف ہو جہاں، دار و رسن ہوں شاہد
بے گنہ کون ہے اُس شہر میں قاتل کے سوا
جانے کس رنگ سے آئی ہے گلستاں میں بہار
کوئی نغمہ ہی نہیں شورِ سلاسل کے سوا

میں جہاں تم کو بلاتا ہوں وہاں تک آؤ
میری نظروں سے گزر کر دل و جاں تک آؤ
پھر یہ دیکھو کہ زمانے کی ہوا ہے کیسی
ساتھ میرے مرے فردوسِ جواں تک آؤ
حوصلہ ہو تو اُڑو میرے تصور کی طرح
میری تخئیل کے گلزارِ جناں تک آؤ
تیغ کی طرح چلو چھوڑ کے آغوشِ نیام
تیر کی طرح سے آغوشِ کماں تک آؤ
پھول کے گرد پھرو باغ میں مانندِ نسیم
مثلِ پروانہ کسی شمعِ تپاں تک آؤ
لو وہ صدیوں کے جہنم کی حدیں ختم ہوئیں
اب ہے فردوس ہی فردوس جہاں تک آؤ
چھوڑ کر وہم و گماں حسنِ یقیں تک پہنچو
پر یقیں سے بھی کبھی وہم و گماں تک آؤ
اسی دنیا میں دکھا دیں تمھیں جنت کی بہار
شیخ جی تم بھی ذرا کوئے بتاں تک آؤ



تن کی چاندی مَن کا سونا

ہم نے بیچی تن کی چاندی
ہم نے بیچا مَن کا سونا
آنکھ کے ہیرے
ہاتھ کے دریا
بازاروں میں لے کر نکلے
پھر بھی مفلس اور کنگال

اور انھوں نے
ہم سے خریدی تن کی چاندی
ہم سے خریدا مَن کا سونا
لُوٹ لئے آنکھوں کے ہیرے
پی لئے ہاتھوں کے دریا
اور کہلائے
صاحبِ دولت، صاحبِ مال

لیکن اک دن
تن کی چاندی، مَن کا سونا
آنکھ کے ہیرے، ہاتھ کے دریا
سب واپس آجائیں گے
اور زمانہ ہوگا نہال
اور دُنیا ہوگی خوش حال
کوئی نہ ہوگا صاحبِ دولت
کوئی نہ ہوگا صاحبِ مال
کوئی نہ رہ جائے گا مفلس
کوئی نہ ہوگا پھر کنگال

غم کا ہیرا

غم کا ہیرا
دل میں رکھو
کس کو دکھاتے پھرتے ہو
یہ چوروں کی دُنیا ہے

اجنبی آنکھیں

ساری شامیں اُن میں ڈوبیں
ساری راتیں اُن میں کھوئیں
سارے ساغر اُن میں ٹوٹے
ساری نے
غرق اُن آنکھوں میں ہے
دیکھتی ہیں وہ مجھے لیکن بہت بیگانہ وار

لُطفِ سخن

جب ہوں رُسوا سرِ بازار تو ہے لُطفِ سخن
حرفِ حق جب ہو سرِ دار تو ہے لُطفِ سخن
اپنے اور غیر ہوں سچ کہنے پہ آمادۂ قتل
اور نہ ہو کوئی طرف دار تو ہے لُطفِ سخن
مصلحت وقت کی اقرار سکھائے لیکن
دل میں ہو جراَتِ انکار تو ہے لُطفِ سخن
ظلم کے، خوف کے اور موت کے سنّاٹے میں
ایک اک حرف ہو بیدار تو ہے لُطفِ سخن

ایک خواب اور

خواب اب حسنِ تصور کے اُفق سے ہیں پرے
دل کے اک جذبۂ معصوم نے دیکھے تھے جو خواب
اور تعبیروں کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
تشنگی آبلہ پا، شعلہ بکف موجِ سراب
یہ تو ممکن نہیں بچپن کا کوئی دن مل جائے
یا پلٹ آئے کوئی ساعتِ نایابِ شباب
پھُوٹ نکلے کسی افسردہ تبسم سے کرن
یا دمک اٹھے کسی دستِ بُریدہ میں گلاب
آہ پتھر کی لکیریں ہیں کہ یادوں کے نقوش
کون لکھ سکتا ہے پھر عمرِ گزشتہ کی کتاب
بہتے لمحات کے سوتے ہوئے طوفانوں میں
تیرتے پھرتے ہیں پھُوٹی ہوئی آنکھوں کے حباب
تابشِ رنگِ شفق، آتشِ روئے خورشید
مل کے چہرے پہ کھر آئی ہے خونِ احباب
جانے کس موڑ پہ کس راہ میں کیا بیتی ہے
کس سے ممکن ہے تمناؤں کے زخموں کا حساب
آستینوں کو پکاریں گے کہاں تک آنسو
اب تو دامن کو پکڑتے ہیں لہو کے گرداب
دیکھتی پھرتی ہے ایک ایک کا منہ خاموشی
جانے کیا بات ہے شرمندہ ہے اندازِ خطاب
دَر بدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہے جواب
سرکشی، پھر میں تجھے آج صدا دیتا ہوں
میں ترا شاعرِ آوارہ و بے باک و خراب
پھینک پھر جذبۂ بے تاب کی عالم پہ کمند
ایک خواب اور بھی اے ہمتِ دشوار پسند



الوداع

الوداع اے سُرخ پرچم سرخ پرچم الوداع
اے نشانِ عزم مظلومانِ عالم الوداع

اے لباسِ آبروئے ابنِ آدم السّلام
اے ردائے سر برہنہ بنتِ مریم الوداع

اے فراتِ تشنہ کامانِ جہادِ زندگی
قلزمِ تشنہ لبی کی موجِ برہم الوداع

اے جلالِ کاوۂ آہن گر ضحاک[1] کش
اے زوالِ نخوتِ اسکندر و جم الوداع

آفتابِ بطنِ گیتی[2] کی شعاعِ شب شکن
اے منارِ انقلابِ دورِ عالم الوداع

اے خس و خاشاکِ گلشن کے لیے برقِ تپاں
روئے گل پر پرتوِ خورشید شبنم الوداع

اے غرورِ دستِ محنت اے شکوہِ بے نوا
حشر تک دنیا کرے گی تیرا ماتم الوداع

تونے دیکھا ہے عروج اور تونے دیکھا ہے زوال
کاش پھر آئے نہ خونباری کا موسم الوداع

دیدۂ پُرنم سے کل دل نے کہا تھا "مرحبا"
کہہ رہی ہے آج لیکن چشمِ پُرنم "الوداع"

جس کی چنگاری کا اک شعلہ تھی انگڑائی تری
دل میں روشن ہے وہ آتشِ خانۂ غم الوداع

رزم گاہِ خیر و شر میں یاد آئے گی تری
ہم ہیں اب اور لشکرِ ابلیسِ اعظم الوداع

---

[1] فردوسی کے شاہنامے میں ایک خونخوار بادشاہ ضحاک کا ذکر ہے جس کے شانوں پر دو سانپ تھے وہ روزانہ دو انسانوں کا مغز کھاتے تھے اس خونخوار بادشاہ کی سفاکی کے خلاف ایک لوہار نے بغاوت کی جس کا نام کاوہ تھا۔ وہ کاوہ آہن گر کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے اپنے پیر پر بندھے ہوئے چمڑے کو پھر دربار میں فوج کر اپنا پرچم بنایا تھا جو ایران کا قومی پرچم بن گیا اور درفشِ کاویانی کے نام سے مشہور ہوا ضحاک کو قتل کرنے کے لیے جو لشکر گیا تھا اس کا پرچم آہن گر کا پرچم تھا۔

[2] اشارہ ہے اقبال کے شعر کی طرف جو انقلابِ روس کی تہنیت کا شعر ہے ؎
آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

(ستمبر ۱۹۹۱ء)

شعلۂ خورشید محشر

(مشرقی یورپ اور سوویت یونین کے نئے انقلاب سے متاثر ہو کر ایک پرانی زمین میں کچھ نئے اشعار)

عقیدے بجھ رہے ہیں شمعِ جاں گل ہوتی جاتی ہے
مگر ذوقِ جنوں کی شعلہ سامانی نہیں جاتی

خدا معلوم کس کس کے لہو کی لالہ کاری ہے
زمینِ کوئے جاناں آج پہچانی نہیں جاتی

اگر یوں ہے تو کیوں ہے، یوں نہیں تو کیوں نہیں آخر
یقیں محکم ہے، لیکن دل کی حیرانی نہیں جاتی

لہو جتنا تھا سارا صرفِ مقتل ہو گیا لیکن
شہیدانِ وفا کے رُخ کی تابانی نہیں جاتی

پریشاں روزگار، آشفتہ حالاں کا مقدر ہے
کہ اس زلفِ پریشاں کی پریشانی نہیں جاتی

ہر اک شے اور مہنگی اور مہنگی ہوتی جاتی ہے
بس اک خونِ بشر ہے جس کی ارزانی نہیں جاتی

نئے خوابوں کا دل میں شعلۂ خورشیدِ محشر ہے
ضمیرِ حضرتِ انساں کی سلطانی نہیں جاتی

لگاتے ہیں لبوں پر مُہر اربابِ زباں بندی
علی سردار کی شانِ غزل خوانی نہیں جاتی

(ممبئی ۲۵ دسمبر ۱۹۹۱ء)

درد اک چاند ہے

درد اک چاند ہے
ہوتا ہے جو سینے میں طلوع
غم ہے اک نشترِ نور
جو دل و جاں کے اندھیرے میں اتر جاتا ہے

شعلہ لبی

یہ مری شعلہ لبی
تشنہ لبی کی تکمیل
اور تری شعلہ لبی
آتشِ سیّال کا جام
کر دیا جس نے حریفِ لبِ پیمانہ مجھے

پیاس بھی ایک سمندر ہے

پیاس بھی ایک سمندر ہے سمندر کی طرح
جس میں ہر درد کی دھار
جس میں ہر غم کی ندی ملتی ہے
اور ہر موج
تڑپتی ہے کسی چاند سے چہرے کی طرف



علی سردار جعفری

ایک خوب صورت پھول

[راہی معصوم رضا]

کل ۱۵ مارچ ۱۹۹۲ء کو اردو کی بزم سخن سے ایک خوب صورت اور خوش بیان انسان اُٹھ گیا۔ اس کی ایک اپنی ادا تھی، اپنا بانکپن تھا۔ معصوم رضا نام تھا اور راہی تخلص، لیکن ہمیشہ اپنے آپ کو راہی معصوم رضا کہا اور ڈاکٹر راہی معصوم رضا کے نام سے شہرت پائی۔ یگانہ چنگیزی اس کے محبوب شاعر تھے جنہوں نے اپنے بے مثال بانکپن کی قیمت کم معیار لوگوں کی دی ہوئی رسوائی کی شکل میں ادا کی۔ لیکن راہی نے شہرت اور عزت کے ساتھ اپنے بانکپن کو برقرار رکھا اور اس کی داد حاصل کی۔

جب ۱۹۵۳ء میں پہلی بار میں نے راہی کو کشمیر کی حسین و جمیل وادی میں دیکھا تھا تو وہ پھول کی طرح خوبصورت تھا اور شاعری کی طرف راغب تھا آزادی کے آتے آتے اس نے شعر و سخن کی دنیا میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا اس کی شاعری میں اس کے اپنے لہجے کی کھنک تھی۔ فکر اور تخیل کی بلند پروازی تھی اور وہ چھوٹی سے چھوٹی اور طویل سے طویل نظم کہنے پر قادر تھا۔ اس قدرت کلام اور ندرت بیان کا اظہار اس کی نظموں کے مجموعے میں اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی پر طویل نظم کی شکل میں ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب عہد حاضر کی غزل کا نشاۃ ثانیہ شروع نہیں ہوا تھا۔ لیکن کامیابی کے باوجود راہی نے یکایک شاعری ترک کر دی۔ اس کے بعد اس کی تخلیق نے ناول کا پیکر اختیار کیا۔

اس نے ہندی میں کئی ناول لکھے، اُن میں سب سے زیادہ مشہور ناول "آدھا گاؤں" ہے۔ یہ ناول میرے نزدیک ساہتیہ اکیڈمی کے انعام کا مستحق تھا لیکن یہ انعام کیوں نہیں ملا اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ یہ ناول ہندی میں ہے اور اس کے زبان و بیان میں جو سلاست اور روانی ہے۔ جو حسن کاری ہے وہ اردو زبان کی دین ہے۔ اس منزل پر آ کر راہی ہندی زبان کے علم بردار بن گئے تھے لیکن میں اُس وقت بھی اور آج بھی اُن کو اردو کا ادیب سمجھتا ہوں۔ ہندی میں ان کی کامیابی اُردو کی بدولت تھی۔ جو شخص راہی کی طرح اچھی اردو نہ جانتا ہو وہ ہرگز اتنی اچھی ہندی نہیں لکھ سکتا۔ اس کا سب سے زیادہ کامیاب اظہار راہی معصوم رضا کی لکھی ہوئی فلموں کے مکالموں میں ہوتا ہے۔ ہندی فلموں میں مکالمے اور گانے زیادہ تر اُردو ہی میں لکھے جاتے ہیں اور ان کے لکھنے والے بھی اُردو کے جانے پہچانے شاعر اور ادیب ہیں۔

لیکن راہی نے اپنا کمال فن اس وقت دکھایا جب انھوں نے ٹیلی ویژن کے لئے مہابھارت کے مکالمے لکھے، شروع شروع میں لوگوں نے اعتراض کیا کہ ایک مسلمان ادیب ہندو ٹائپ مہابھارت کے مکالمے کیسے لکھ سکتا ہے۔ لیکن راہی کے قلم نے سب کو خاموش کر دیا اور اس کے بعد بہت سے سر احترام میں جھک گئے۔ راہی کی دلیل یہ تھی کہ مہابھارت ہندوستان کا کارنامہ ہے اور یہ ہندوستان کی میراث ہے اور اس کے مکالمے کوئی بھی اچھا ادیب جو ہندی جانتا ہو اعلیٰ درجے کی ہندی میں لکھ سکتا ہے۔ لیکن اس کارنامے کی پشت پر بھی راہی کی اُردو تربیت تھی۔ اصل جوہر سنسکرت الفاظ کی آمیزش نہیں ہے بلکہ جملوں اور فقروں کی ساخت ہے۔ ان کا لب و لہجہ ہے اور یہ ایک اعلیٰ درجے کی ہندی جاننے والے اس ادیب کی دین ہے جو اُردو کی آغوش میں پرورش پا کر جوان ہوا تھا۔ میرے نزدیک ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد اور قومی یک جہتی کے لئے یہ راہی کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

آپ آج اس وقت جب یہ الفاظ بی بی سی کی لہروں پر سن رہے ہیں تو بمبئی کے ایک قبرستان میں راہی کے جسدِ خاکی کو قبر میں اتارنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ احباب اور عزیز جمع ہیں۔ ان کے دل اپنے آخری سلام کے ساتھ یہ کہہ رہے ہیں راہی معصوم رضا تمہاری یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ ایک خوبصورت پھول کی طرح مہکتی رہے گی۔ تم نے بہت سی کتابیں لکھیں، سو سے زیادہ فلموں کے مکالمے اور منظر نامے لکھیں جو سب سے بڑا حرف تم نے لکھا وہ حرف

[باقی صفحہ ۴۱ پر دیکھئے]



ایک پیغام

Ali Sardar Jafri

PADMA SHREE
SPECIAL EXECUTIVE MAGISTRATE

10 SEETA MAHAL
BOMANJI PETIT ROAD
BOMBAY 400 036

PHONE 91 (22) 386 713[illegible]

جناب افتخار امام
مدیر شاعر۔ بمبئی۔

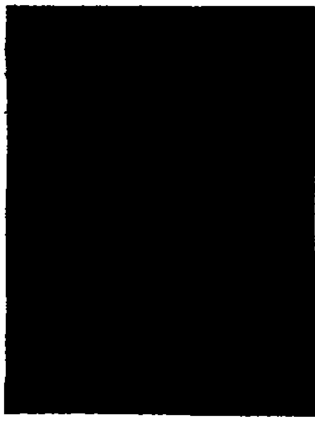
[illegible]

عزیز گرامی۔

[illegible]

[illegible]

علی سردار جعفری



مظہر الزماں خان

مکان نمبر ۲۵۶، سی پی ایل "سی" کلاس، کاچی گوٹھ، حیدرآباد - ۲۷

آخری داستان گو

الاؤ میں آگ دہک رہی تھی۔ شہرباد پودے کے قریب بیٹھی ہوئی تھی جسے دیناداد نے لگایا تھا۔ اور سانپ ڈسا آدمی زمین پر پڑا کراہ رہا تھا اور ایک کہانی کار سانپ ڈسے آدمی کو اپنی کہانی سنا رہا تھا۔

سورج ڈھل چکا تھا اور سائے لمبے ہو گئے تھے۔ بوڑھے نے سجدے سے گردن اٹھائی اور محبت آمیز نظروں سے اپنے جوان بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا۔ صبح کے نکلے اب گھر لوٹے ہو۔ اگر کہیں جانا ہو تو کہہ دیا کرو بیٹا۔ ورنہ ایک تشویش رہتی ہے کہ خزاں کے موسم کی آمد ہے۔

"جی! نوجوان نے گردن جھکا کر کہا۔ دمشق سے سوداگر کچھ نادر چیزیں لے آئے ہیں۔ انہیں سے ملنے چلا گیا تھا بابا۔ ارادہ ہے کہ تجارت کے سلسلے میں یہاں کی چیزیں لے کر کوفہ جاؤں کہ یہاں کا مال کوفہ میں اچھے داموں سے فروخت ہوتا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو اسی قافلہ کے ساتھ چلا جاؤں گا۔

"نہیں بیٹا! سنا ہے کہ کوفہ کے حالات ان دنوں اچھے نہیں ہیں اور اب وہاں کے لوگوں میں ہیرے جواہرات کی تمیز نہیں رہی کچھ دن تم اور انتظار کر لو۔ اور جب حالات معمول پر آجائیں۔ اور درخت اپنے اندر سے نئے پتے نکالنے لگیں۔ چلے جانا۔

" حالات ٹھیک ہی ہیں بابا! نوجوان نے اپنے پاؤں کے ناخنوں پر نظر رکھتے ہوئے کہا۔ ہر طرف امن و امان ہے سارے کنویں مسرور ہیں۔ درخت خوب شیریں پھل دے رہے ہیں۔ زمین سے موتی نکل رہے ہیں اونٹنیوں کی تھنوں میں دودھ بھرا ہوا ہے اور آسمان خوش ہے کہ بڑا پرسکون موسم ہے تجارت میں ہمیں خاصا نفع ملے گا۔ بس آپ کی اجازت چاہئے

" ٹھیک ہے! بوڑھے نے کہا۔ اگر تم نے طے کر لیا ہے تو جاؤ۔ تمہیں خدا کے حوالے کیا۔ لیکن اتنا یاد رکھو کہ زیادہ نفع حاصل کرنے کی لالچ میں اپنے ضمیر کو فروخت نہ کرنا۔"

"نہیں بابا! ایسا نہیں ہوگا۔ تو پھر کل صبح سفر کی اجازت ہے؟"

بیٹے نے باپ کے پاؤں چھوئے تو باپ نے ماتھا چوم کر کہا۔ "جاؤ خدا تمہیں ہر طرح سے کامیاب و کامران کرے کہ میں نے تمہارے ماتھے پر اپنے لبوں سے دعاؤں کا چراغ رکھ دیا ہے۔"

صبح نوجوان جب کوفہ جانے والے قافلہ سے جا ملا تو انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے کہ ہم ابھی کچھ دن اور اسی شہر میں تجارت کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ سن کر نوجوان خود ہی سفر پر نکل گیا اور پھر ایک لمبے سفر کے بعد وہ جب کوفہ کے قریب پہنچا تو شام ہونے والی تھی۔ کہ درختوں کی شاخوں میں اندھیرا اتر آیا تھا اور تمام ہمہ اقسام کے پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں بیٹھے۔ دن بھر کی کہانیاں ایک دوسرے کے سامنے بیان کر رہے تھے کہ نوجوان نے اونٹ کو درخت سے باندھا اور ہاتھ منہ دھو کر توشہ کھولا کہ تھکان کی وجہ سے بھوک خاصی تیز ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی اس نے ایک لقمہ بھی نہ لیا تھا کہ ایک گھوڑ سوار دوڑتے ہوئے آیا اور نوجوان سے کہا۔ اے عزیز۔ بڑا امت سمجھ کہ میں کوفہ سے چلا آ رہا ہوں کہ مجھے مصر جانا ہے جو شاید یہاں سے صرف دو چار کوس پہ ہے۔

اے عزیز۔ تجھ سے میری ایک گزارش ہے کہ تو یہ توشہ اسرائیل کی طرف اشارہ ہے مت کھا اس کے بدلے میں تجھے اپنا توشہ دیتا ہوں کہ یہ تیرے لئے مفید ہوگا۔ نوجوان نے حیرت سے گھوڑ سوار کی طرف دیکھا اور کہا کہ اے دوست مجھے اپنا توشہ کھانے سے کیوں روکتا ہے کہ کہیں کوفہ کے حالات بدل تو نہیں گئے؟ مسافر بولا

"اے عزیز تیرے اس سوال کا جواب فی الوقت میں دے نہیں سکتا۔ بس تجھ سے میری اتنی التجا ہے کہ تو اب یہ توشہ نہ کھا اور اُسے اسی ریت میں دفن کر دے۔ لیکن ——————

صبح جب اٹھے تو دفن کئے ہوئے توشے کو ضرور دیکھ لے تجھے پتہ چل جائے گا کہ میں نے منع کیوں کیا تھا چنانچہ نوجوان مسافر کے کہنے پر توشہ کو ریت کے اندر دبا دیا اور اس کے توشے سے اپنی بھوک مٹائی اور سو گیا۔

رات بھر میں اُسے بڑے بڑے ڈراؤنے خواب دکھائی دیئے۔ لیکن صبح اٹھ کر فجر کی نماز ادا کی اور سفر کے لئے اونٹ پر اسباب لادنے سے پہلے جب اس نے دفن کئے ہوئے توشے کو دیکھا تو حیرت سے اس کی آنکھیں نکل گئی تھیں کہ سارا توشہ تازہ تازہ خون میں تبدیل ہو گیا تھا اور مسافر کا چہرہ .....

اچانک کہانی کار نے ہچکی لی اور پھر زمین پر گردن ڈال دی۔ اور تبھی اچانک گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازوں سے رات بیدار ہو گئی۔ اور سب کے سب دم بخود ہنہناتے ہوئے گھوڑوں کی آوازوں کی طرف دیکھنے لگے۔ جو تیزی سے ان کی قریب آتی جا رہی تھی اور جب وہ تمام گھوڑ سوار جو زرہ بکتر پہنے ہوئے تھے ان کے قریب پہنچ گئے تو سبھوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ لیکن شہرزاد آنکھیں بند کئے بیٹھی رہی۔

"کون ہو تم لوگ؟ اور اتنی تاریک رات میں یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟!"

ایک گھوڑ سوار نے آگے بڑھ کر کہا۔

"ہم سب کہانی کار ہیں جناب عالی۔" سگریٹ والے شخص نے کہا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو۔؟!"

"زہر پیئے ہوئے آدمی کو کہانیاں سنا رہے ہیں۔"

"زہر!؟ کس نے دیا اور یہ کون ہے۔؟"

"پتہ نہیں کون ہے۔ لیکن اُسے ایک زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہے۔"

"سانپ نے ڈسا ہے تو کہانیاں کیوں سنا رہے ہو۔ دوا کرو یا پھر دعا کرو۔"

"کہتے ہیں کہ سانپ ڈسے آدمی کو اگر نیند آ جائے تو وہ مر جاتا ہے۔ اسی لئے ہم سب اُسے بیدار رکھنے کے لئے اپنی اپنی کہانیاں سنا رہے ہیں کہ ہم سب کے سب کہانیاں ہی ہیں۔ —— چھوٹی بڑی، اچھی بری کہانیاں۔"

"ہماری بھی کہانیاں سنو کہ ہماری کہانیوں میں گھوڑے دوڑتے ہیں، تلواریں چلتی ہیں۔ سر کٹ کٹ کر گرتے ہیں۔ بندوقیں داغی جاتی ہیں۔ بارود اور لاشیں ہی لاشیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہماری کہانیاں خون میں تر بتر ہوتی ہیں۔ چنانچہ ابھی ہم ایک پُرامن زمین پر بارود بچھا کر آ رہے ہیں۔ گرم گرم تیل میں سارے پرندوں کو ڈبا کر آ رہے ہیں۔ سنو کہ بڑی دلچسپ کہانیاں ہیں ہماری۔"

"نہیں!" سانپ ڈسے آدمی نے چیخ کر کہا۔ "میں ان کی کہانیاں سننا نہیں چاہتا کہ ان کی کہانیوں کے کردار مجھے سانپ کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔"

"بکواس کرتا ہے۔" گھوڑ سواروں نے کہا۔ "لہٰذا کہانیاں سنانے کی بجائے ہم سب مل کر دستکیں دیں گے۔ تاکہ اس کی نیند کے ساتھ پورا علاقہ بیدار ہو جائے۔"

"کہانی بھی ایک دستک ہوتی ہے جناب!" ایک کہانی کار نے کہا۔

"لیکن ہر کہانی دستک نہیں ہوتی۔" سگریٹ والے آدمی نے کہا۔ "البتہ اچھے کہانی کاروں کی ہتھیلیوں میں دستکیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔"

"کیا صرف کہانی کاروں کی ہتھیلیوں ہی میں دستکیں ہوتی ہیں؟" گھوڑ سواروں نے کہا۔

"ہاں" سگریٹ والے آدمی نے کہا۔ "دستکیں پیغمبروں اور کہانی کاروں کی ہتھیلیوں میں ہوتی ہیں۔ البتہ پیغمبروں کی دستکیں پوری کائنات کو بیدار کرتی ہیں۔ اور ......"

"دیکھو! ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ دستکیں ہماری ہتھیلیوں میں بھی موجود ہیں۔ اور یہ کہہ کر تمام گھوڑ سوار اپنی اپنی ہتھیلیوں کو پوری قوت سے ایک دوسرے پر مارنے لگے۔ لیکن کسی بھی ہاتھ سے دستک نہیں نکلی تھی کہ سب ہتھیلیاں بے آواز ہی تھیں۔ چنانچہ گھوڑ سواروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا

[باقی صفحہ ۷۰ پہ دیکھئے]



ظفر گورکھپوری

یہاں تو خیر، ویرانی بہت ہے
وہاں کیا ہے، جہاں پانی بہت ہے

شکن تک بھی نہیں کوئی قبا پر
مگر اندر پریشانی بہت ہے

نہیں چلنے کے کاغذ کے سفینے
کہ اب ندیوں میں طغیانی بہت ہے

تجھے اے زندگی کچھ دے نہ پائے
ہمیں خود سے پشیمانی بہت ہے

سسک لیتے ہو بربادی پہ اپنی
سنو۔ اتنی بھی آسانی بہت ہے

نہ ملنا، سنگ ہو جاؤ گے تم بھی
مرے اطراف حیرانی بہت ہے

ظفر یہ عشق کم کم ہے تو اچھا
زیادہ ہو تو نقصانی بہت ہے

● اے ۳۰۲ فلوریڈا، شاستری نگر
اندھیری (ویسٹ)، بمبئی ۴۰۰۰۵۸



باقر نقوی

چاہے پھول کے چٹکی لے پتوں سے زور کرے
وہ موسم اچھا موسم جو من کو مور کرے

پیارے تو بھی بالکل میرے دل جیسا نکلا
باہر سے خاموش لگے اندر سے شور کرے

رنگوں کے پردوں میں بھی پہچانا جائے گا
آنکھیں نیلی کر لے یا زلفیں گھنگھور کرے

پار سمندر کرنا بھی واپس بھی آنا ہے
وہ دانہ مت چگ پنچھی جو پر کمزور کرے

ہم سنیاسی لوگ ہیں بابا دھن سے ہمیں کیا کام
چور کو جو سرکار کرے سرکار کو چور کرے

اور لکھے کو بیت ئیں ایسی "جاگیں" تیرے بھاگ
ساقی پیارے مالک تیری لمبی ڈور کرے

نام جپو نیلی چھتری والے کا میاں باقر
چڑھتے دن کو سانجھ کرے جو رین کو بھور کرے

سلہ ساقی فاروقی

● 41-THE CROSSWAYS, HESTON
MIDDX TW5 0JJ (U.K)

احمد صغیر صدیقی

◆

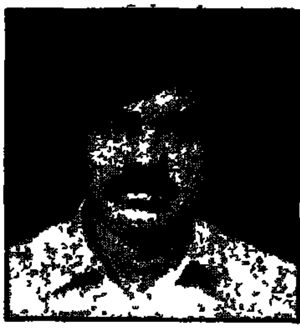
اطراف کے ٹوٹے ہوئے منظر سے نکل کر
دیکھوں تو کبھی خاک کے پیکر سے نکل کر

ہر شکل بنی میری ہی آنکھوں کے ہنر سے
سب رنگ اڑے میرے ہی اندر سے نکل کر

اب منزلِ جاں ہے کوئی خاموش سا دریا
اک چشمۂ آوارہ ہوں پتھر سے نکل کر

آواز ہوں برسوں سے یہیں گونج رہا ہوں
جاؤں گا کہاں گنبدِ بے در سے نکل کر

● ایچ ایریا، ۴۰/۲ ملیر کالونی، کراچی (پاکستان)



غضنفر
اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر، ۱۰-اے مدن موہن مالویہ مارگ لکھنؤ

خالد کی ختنہ

جو تقریب ٹلتی آ رہی تھی، طے پا گئی تھی۔ تاریخ بھی ایسی کہ سبھی کو بھا گئی تھی۔ پاکستان والے خالو اور خالہ بھی آ گئے تھے اور عرب والے ماموں ممانی بھی۔ مہمانوں سے گھر بھر گیا تھا۔

بھرا ہوا گھر جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ در و دیوار پینٹ رنگ و روغن روشن تھے۔ چھتیں چمکیلے کاغذ کے پھول پتوں سے گلشن بن گئی تھیں۔ کمروں کے فرش آئینہ ہو گئے تھے۔ آنگن میں چھاتی ہوئی چاندنی تن گئی تھی۔ چاندنی کے نیچے صاف ستھری جازم بچھ چکی تھی۔

باہر کے برآمدے میں بڑی بڑی دیگیں چڑھ چکی تھیں۔ باسمتی چاولوں کی بریانی سے خوشبوئیں نکل رہی تھیں۔ قورمے کی دیگوں سے گرم مسالوں کی لپٹیں ہواؤں سے لپٹ کر دور دور تک پھیل رہی تھیں۔

دھیرے دھیرے محلّہ پڑوس کی عورتیں بھی آنگن میں جمع ہو گئیں۔ بچوں کی ریل پیل بڑھ گئی۔

رنگ برنگ کے لباس فضا میں رنگ گھولنے لگے۔ سونے چاندی کے گہنے کھن کھن چھن چھن بولنے لگے۔ پرفیوم کے جھونکے چلنے لگے۔ دل و دماغ میں خوشبوئیں بسنے لگیں۔ میک اپ جلوہ دکھانے لگے۔ چہروں سے رنگین شعاعیں پھوٹنے لگیں۔ ابرق سے آراستہ آنکھوں کی جھلملاہٹیں جھلمل جھلمل کرنے لگیں۔ سرخ سرخ ہونٹوں کی مسکراہٹیں کھلکھلا پڑیں۔ ماحول میں رنگ، نور، نکہت تینوں رچ بس گئے۔ جگمگاتا ہوا گھر اور جگمگا اٹھا۔

ابو امی بے حد خوش تھے کہ خوشیاں سمٹ کر ان کے قدموں میں آ پڑی تھیں۔ دلوں میں بے پناہ جوش و خروش تھا کہ جوش ایمانی اور پُرجوش ہونے والا تھا۔ آنکھیں پُرنور تھیں کہ نور نظر سنتِ ابراہیمی سے سرفراز ہونے جا رہا تھا۔ چہرے پر تاب و تپ تھی کہ لخت جگر کی مسلمانی کو تاب و توانائی ملنے والی تھی۔ سانسیں مشک بار تھیں کہ تمناؤں کے چمن میں بہار آ گئی تھی۔

تقریب کا آخری مرحلہ شروع ہوا۔

مہمان برآمدوں اور کمروں سے نکل کر آنگن میں آ گئے۔ چاندنی کے نیچے بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو گئے۔ فرش کے وسط میں اوکھلی آ پڑی۔ اوکھلی پر پھول دار چادر بچھ گئی۔ خوان تازہ پھولوں کے سہرے سے سج گیا۔ مخمل کا کڑھا ہوا کرتا پیکٹ سے باہر نکل پڑا۔

بزرگ نائی نے اپنی بقچی کھول لی۔ استرا باہر آ گیا۔ کمانی تن گئی۔ راکھ کی پڑیا کھل گئی۔

خالد کو پکارا گیا مگر خالد موجود نہ تھا۔ بچوں سے پوچھ تاچھ کی گئی۔ سب نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ابو امی کی تشویش بڑھ گئی۔ تلاش جاری ہوئی۔ ابو اور میں ڈھونڈتے ہوئے کباڑ والی اندھیری کوٹھری میں پہنچے۔ ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو خالد ایک کونے میں دیر تک کسی دوڑائے گئے مرغے کی طرح دبکا پڑا تھا۔

"خالد بیٹے! تم یہاں پڑے ہو اور سارے لوگ اُدھر تمہارے انتظار میں کھڑے ہیں۔ آؤ، چلو! تمہاری ممی پریشان ہو رہی ہیں۔"

"نہیں ابو! میں ختنہ نہیں کراؤں گا۔" خالد منہ بسورتے ہوئے بولا۔

خالد سے ختنے کی بات چھپائی گئی تھی مگر شاید کچھ دیر پہلے کسی نے اسے بتا دی تھی۔

"ٹھیک ہے، مت کرانا۔ مگر باہر تو آ جاؤ۔!" ابو نے بڑے پیار سے یقین دلایا۔ مگر خالد دیوار سے اس طرح چمٹ کر بیٹھا تھا جیسے دیوار نے کسی طاقت ور مقناطیس کی طرح اسے جکڑ لیا ہو۔ ہم نے اس کا ایک ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچنے کی کوشش کی مگر اس کا دوسرا ہاتھ دیوار سے اس طرح چپک گیا تھا جیسے وہ کوئی سانپ ہو جس کا اگلا حصّہ کسی بل میں جا چکا ہو اور دم ہمارے ہاتھ میں۔ نہ جانے کہاں سے اس چھوٹے سے بچّے میں اتنی طاقت آ گئی تھی۔ بڑی زور آوری کے ساتھ مشکل سے اسے کوٹھری سے باہر لایا گیا۔

"امّی! امّی! میں ختنہ نہیں کراؤں گا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"اچھی بات ہے۔ نہ کرانا ختنہ لیکن یہ نیا کرتا تو پہن لو۔ دیکھو تو یہ سارے بچے نئے نئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اور یہ دیکھو! یہ سہرا کتنا اچھا ہے۔ تمہارے سر پر بہت سجے گا۔ لو، لسے باندھ کر دولہا بن جاؤ۔ یہ سب لوگ تمہیں دولہا بنانے آئے ہیں۔ تمہاری شادی بھی تو ہوگی نا!"

"امّی! آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ میں سب جانتا ہوں۔ میں کرتا نہیں پہنوں گا میں سہرا نہیں باندھوں گا۔"

"یہ دیکھو! تمہارے لئے کتنے سارے روپے لایا ہوں!" ابّو نے کڑکڑاتے ہوئے دس دس کے ڈھیر سارے نوٹ خالد کے آگے بچھا دیئے۔

آس پاس کھڑے بچّوں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"اچھا! یہ دیکھو! تمہارے لئے میں کیا لایا ہوں؟" پاکستان والے خالو نے امپورٹیڈ ٹافیوں کا ڈبہ کھول دیا۔

بچّوں کی زبانیں ہونٹوں پر پھرنے لگیں۔

عرب والے ماموں آگے بڑھ کے بولے۔

"دیکھو خالد! یہ کار تمہارے لئے ہے بغیر چابی کے چلتی ہے۔ یوں۔"

تالی کی آواز پر کار اِدھر اُدھر دوڑنے لگی۔

مگر خالد کی آنکھیں کسی صیّاد دیدہ جانور کی طرح کچھ نہ دیکھ سکیں۔ اس کی نظریں تِلی میں سہمی ہوئی ساکت پڑی رہیں۔

ابّو، امّی، خالو، ماموں، پیار، پیسہ، ٹافی، کار سب کچھ دے کے تھک گئے خالد ٹس سے مس نہ ہوا۔

جھنجھلا کر ابّو زبردستی پر اتر آئے۔ خالد کی پینٹ کھول کے نیچے کھسکانے لگے مگر خالد نے کھلی ہوئی پینٹ کے سروں کو دونوں ہاتھوں سے کس کر پکڑ لیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے ساتھ ہونٹوں سے رونے کی آوازیں بھی نکلنے لگیں۔ خالد کے آنسوؤں نے امّی کی آنکھوں میں پانی بھر دیا۔

"مت روؤ میرے لال! مت روؤ! تم نہیں چاہتے تو ہم زبردستی نہیں کریں گے۔ تمہارا ختنہ نہیں کرائیں گے۔" امّی نے روندھی ہوئی آواز میں خالد کو دلاسا دیا اور اپنے آنچل میں اس کے آنسو جذب کر لیے۔ کچھ دیر تک امّی خاموش رہیں۔ پھر خالد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"پچھلے سال تو پھوپھی کے گھر کامران کے ختنے کے وقت تم خود ضد کرتے رہے کہ امّی آپ میرا بھی ختنہ کرا دیجئے مگر آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم اتنے ڈرپوک کیوں ہو گئے؟ تم تو بڑے بہادر بچّے ہو۔ تم نے اپنے زخم کا آپریشن بھی تو ہنستے ہنستے کرا لیا تھا۔ اس میں تو زیادہ تکلیف بھی نہیں ہوتی۔"

"امّی! میں ختنہ کرانے سے نہیں ڈرتا۔"

"پھر کس بات کا ڈر ہے تمہیں بیٹے!" ابّو نے چونک کر بڑی نرمی سے پوچھا

"ابّو! آپ ہی نے تو کہا تھا کہ جن کی ختنہ ہوتی ہے بدمعاش انھیں جان سے مار دیتے ہیں۔"

خالد کا جملہ ابّو کے ساتھ ساتھ سب کے سروں پر فالج کی طرح گر پڑا۔ سب کی زبانیں اینٹھ گئیں۔ چہکتا ہوا ماحول چپ ہو گیا۔ جگمگاتی ہنسی بجھ گئی۔ مسکراہٹیں مرجھا گئیں۔ بچّوں کی انگلیاں اپنے پاجاموں میں پہنچ گئیں۔ بڑوں کی آنکھیں ایک دوسرے کی آنکھوں کو تکنے لگیں۔

تلاشیوں کا گھناؤنا منظر ابھر گیا۔ جسم ننگے ہو گئے۔ چاقو سینے میں اترنے لگے۔ ماحول کا رنگ اڑ گیا۔ نور پر دھند کا غبار چڑھ گیا۔ خوشبو بکھر گئی۔

نائی کا استرا بھی کند پڑ گیا۔ راکھ پر پانی پھر گیا۔

پاکستان والے خالو نے ماحول کے بوجھل پن کو توڑتے ہوئے خالد کو مخاطب کیا۔

"خالد بیٹے! اگر تم ختنہ نہیں کراؤ گے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ تمہارا ختنہ نہ دیکھ کر تمہیں ختنہ والے بدمعاش مار ڈالیں گے۔"

"سچ ابّو؟" خالد سر سے پاؤں تک لرز گیا۔

"ہاں، بیٹے! تمہارے خالو سچ کہہ رہے ہیں۔"

"ٹھیک تو ہے۔ میری ختنہ کر دیجئے۔" جھٹ اس کے ہاتھوں سے کھلی ہوئی پینٹ کے سرے چھوٹ گئے۔ پینٹ کولہے سے نیچے سرک آئی۔ خالد ختنے کے لئے تیار تھا۔ مگر اس کی رضامندی کے باوجود کسی نے بھی اس کے سر پر سہرا نہیں باندھا۔ کوئی بھی ہاتھ کرتا پہنانے آگے نہیں بڑھا۔

اذیت ناک سکوت جب ناقابل برداشت ہو گیا تو پاکستان والے خالو نے آگے بڑھ کر خالد کو اسی میلے میں اوکھل کے اوپر بٹھا دیا۔

تقریب کا آغاز ہو گیا مگر نائی کے تھال میں پیسے نہیں گرے۔ نائی نے مطالبہ بھی نہیں کیا۔

خاموشی سے اس نے سلمانی میں راکھ بھری، کمانی فٹ کی۔ چمٹے میں چمڑے کو کسا اور اس پر لرزتا ہوا استرا رکھ دیا۔ جیسے ختنہ نہیں، گردن کاٹنے جا رہا ہو۔

بقیہ: صفحہ ۲۱ آخری داستان گو

اور کہا چلو کہ یہ سب بے ضرر اور بے ناخن لوگ ہیں کہ کسی کو نوچ بھی نہیں سکتے۔ کہانیوں کی شکل میں بس دستکیں دیتے رہتے ہیں دفعتاً تمام گھوڑے اپنے دونوں پاؤں اٹھا کر ہنہنائے اور پھر سرپٹ دوڑتے ہوئے اندھیرے میں کہیں گم ہو گئے تھے۔



مدحت الاختر

انکار کا عذاب سے رشتہ نیا نہیں
دل ہے کہ محتسب کا کہا مانتا نہیں

کٹھ پتلیوں کے رنگ یہاں ناچتے ہیں سب
کس ہاتھ میں ہے ڈور کوئی دیکھتا نہیں

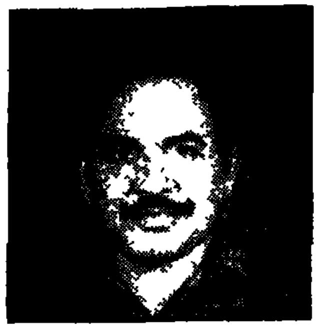
سب جیسے ایک رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں
بستی میں آج کل کوئی اچھا برا نہیں

میں وہ کروں گا جس کا اشارہ مجھے ملے
میرا خیال میرے لئے فیصلہ نہیں

چلتا ہوں سب کے ساتھ کہ جانا مجھے بھی ہے
ورنہ ہجوم راہ سے میں آشنا نہیں

ناظم ہر سوال کے پتھر نہ پھینکئے
پانی بھرا نہ ہو تو کنواں بولتا نہیں

● نیا گودام کامٹی۔۴۴۱۰۰۲ (ناگپور) مہاراشٹر



رونق شہری

ہیئت ابھر رہی ہے تو رخسار تو ہی دے
ہر وجود مطلع آثار تو ہی دے

ہے ثالثی کا تجھ سے ہی قائم بھرم اگر
دست عدو میں اب مری تلوار تو ہی دے

بنیاد اختلاف ہی رکھی ہے تو نے جب
میں چاہتا ہوں بیچ میں دیوار تو ہی دے

فرماں روائے وقت کی دا جب نفی کروں
میرے لبوں کو طاقت انکار تو ہی دے

تو نے مرے غموں کو کیا منفرد بہت
میرے خدا محاسن و معیار تو ہی دے

اک غیر مستحق سے مجھے مت ذلیل کر
جو بھی سزا ہوں ترا گنہگار تو ہی دے

دست ہنر سے دھوپ کے ٹکڑے کو بھی اٹھا
جلتے سروں کو سایۂ اشجار تو ہی دے

● شعبۂ اردو آر۔ایس۔پی کالج جھریا (بہار)

سیف علی

◆

بادۂ ابر نہ ساون کی گھٹا میرے بعد
دامن کوہ میں ہے قید ہوا میرے بعد

میں ہوں رفتار میں ہر ایک صدا سے آگے
تم کو آئے گی کہیں میری صدا میرے بعد

نیل آنکھوں کے کنول ڈوب گئے بجھ سے گئے
یوں چلی یاد کی بے درد ہوا میرے بعد

زلف آوارہ کے ویرانے سے اٹھتا ہے دھواں
شمع رخسار ہے تصویر فنا میرے بعد

رہ گیا سیف کوئی ندی کنارے تنہا
چاند اس پار کہیں ڈوب گیا میرے بعد

● ۴۴۔جی، ۴/۳ اسلام آباد (پاکستان)

نورالحسنین
آل انڈیا ریڈیو، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

پچھلے پہر کی خوشبو

فٹ پاتھ پر چلتے چلتے اس نے اچانک پلٹ کر دیکھا، گاڑیوں کا ریلا کسی طوفان کی مانند چلا آرہا تھا، اور اس سے پہلے کہ وہ سامنے دیکھتا، کوئی خاتون اُس سے بُری طرح ٹکرا گئی، وہ گھبرا گیا۔ اور جلدی جلدی معافیاں مانگنے لگا، لیکن وہ خاتون بنا کسی احتجاج یا غصّے کے آگے بڑھ گئی۔

"عجیب عالم ہے بے حسی کا ــــ!" دوڑتی بھیڑ میں سے کسی نے کہا تھا

"ہاں ــــ!" بے اختیار اُس کی زبان سے نکلا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن اُس کا مخاطب کوئی بھی نہ تھا۔ وہ جھینپ کر رہ گیا۔ اور پھر جلدی جلدی قدم اٹھانے لگا۔ اس کے لیے اس طرح کے واقعات کوئی نئی بات نہ تھے لیکن وہ ہر بار اپنے آپ میں شرمندہ ہو جاتا تھا۔ اپنے موروثی دیہات سے نکلے ہوئے اُسے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ لیکن آج بھی شہر میں اُسے عجیب سی بے چینی ہوتی تھی۔ وہ اب بھی بھاگتی گاڑیوں اور دوڑتی بھیڑ سے بے حد گھبراتا تھا۔ اور اکثر سوچتا، پتہ نہیں یہاں کے لوگ کیسے اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ تو...... اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا۔

آج صبح جب وہ گھر سے باہر نکل رہا تھا تو اس کی بیوی نے زور دے کر کہا تھا، "سنو جی! شام کو دفتر سے آتے آتے ممّو کی ماں کو دیکھنے اسپتال ضرور جانا ــــ بے چاری چار دن سے سرکاری اسپتال میں تڑپ رہی ہے نہ موت ہی آتی ہے۔ اور نہ ہی عیادت کے لیے لوگ ــــ!"

اس نے غصیلی نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا، تو وہ سٹپٹا گئی۔ اور پھر اپنا رُخ بدلتے ہوئے بولی "میں کیا جانوں یہ باتیں .... وہی ممّو کہہ رہا تھا ــــ!"

"بے حس اولاد ــــ!" اس نے اپنے دل میں سوچا، بھلا کوئی اپنی ماں کے بارے میں ایسی باتیں سوچتا ہے ــــ؟ وہ دل ہی دل میں اُسے گالیاں بکتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا ــــ چھی چھی۔ شہری تہذیب نے اتنا سب کچھ چھین لیا، مگر دو وقت کی روٹی کا چکّر شہر سے نکلنے نہیں دیتا۔

کل اگر اُسے بھی کچھ ہو گیا تو ــــ؟ یہ بے حسی اُس کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں تو موت اور عیادت کرنے والے بھی وقت پر نہیں پہنچتے، ایسی بے حس جگہ سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔ وہ اس شہر میں قطعی نہیں رہے گا۔ بلکہ جیسے ہی اُس کا ریٹائرمنٹ ہو جائے گا وہ واپس اپنے گاؤں لوٹ جائے گا اُس نے اطمینان کا سانس لیا ــــ

اُس کے قدم چپ چاپ فٹ پاتھ پر چل رہے تھے ــــ

خیالات کا سلسلہ جاری تھا ــــ

اور خیالوں کے آگے پیچھے گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔

سورج غروب ہو چکا تھا، مسجد کے کناروں پر پرندے لوٹ رہے تھے اور موٴذّن اذان دے رہا تھا ــــــــ"

وہ سوچنے لگا، بچپن میں تو اُس کی کوئی نماز ناغہ نہ ہوتی تھی۔ موسم کی ہر شدت اُس کے جذبۂ عقیدت کے آگے ماند پڑ جاتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں اُس کا گاؤں گھوم گیا۔ اور پھر اُس نے اپنے آپ کو گاؤں کی چھوٹی سی مسجد کی سیڑھیوں پر بیسیوں بار چڑھتے اترتے دیکھا ــــ کس قدر لطف آتا تھا اُس وقت عبادت میں۔ لیکن آج؟ آج بھی گھر کے قریب کی مسجد سے اذان کی آوازیں کانوں سے ٹکراتی ہیں اور مولویوں کی جماعتیں صبح و شام دروازے پر دستک دیتی ہیں لیکن قدم، مسجد کی طرف اٹھتے ہی نہیں ــــ:

"یہ بے حسی نہیں تو کیا ہے؟" آواز پھر اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اُس نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ راہ گیر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

"اندھیر ہے صاحب اندھیر ہے ــــ!"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں ــــ!"

"دلشاد صاحب، زمانے کی یہ ساری خرابیاں محض دین سے بے رخی کا نتیجہ ہیں ــــ بچپن میں اگر بچّوں کو اچھی طرح مذہبی تعلیم مل جائے تو وہ ساری زندگی برائیوں سے دُور رہتے ہیں ــــ!"

"لیکن کیا کریں صاحب ـــ نصاب سے مذہبی تعلیم ہی خارج ہوگئی"

"ہاں ـــ! اب سنتے رہیے جھوٹ، اور کھاتے رہیے دھوکے۔۔!"

وہ ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ ان کی باتیں دل لگا کر سنے۔ لیکن منزل نے اس کا راستہ بدل دیا۔ واقعی بچّوں کے لئے مذہبی تعلیم بے حد ضروری ہے ـــ خدا کا شکر ہے۔ اُس کے بچّے اچھی طرح دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وہ خود بھی دلچسپی لیتا ہے۔ اُس کی خاطر وہ اُن پر گھنٹوں محنت کرتا ہے۔ اس کی تو بڑی خواہش ہے کہ اس کے بچّے زمانے کے لئے مثالی ثابت ہوں۔ لیکن یہ بات اتنی آسان نہیں ہے۔ اس کی خاطر پوری توجّہ چاہئے وقتِ ضرورت بچّوں کی پٹائی بھی کرنی پڑتی ہے۔ اور وہ اس معاملے میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ آج صبح ہی کی تو بات ہے۔ منّا جب نماز کا اعلان کر کے مسجد کے بجائے دوستوں میں نکل گیا تو اس نے اس کی کس قدر پٹائی کی تھی اگر وہ اس وقت انجان بن جاتا تو منّا جھوٹ اور بہانے بنانے میں طاق ہو جاتا ـــ

"بابو جی ـــ! دو دن سے بھوکا ہوں۔ اللہ کے نام پر کچھ دلا دو ـــ!"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک دس بارہ برس کا لڑکا مسکین صورت بنائے کھڑا تھا۔ اس نے اپنی جیب کا جائزہ لیا۔ اور ایک روپیہ اس کے ہتھیلی پر رکھ دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ لڑکا بھاگ کھڑا ہوا۔ روپیہ اس کی مٹھّی میں بند تھا اور وہ بے تحاشا دوڑ رہا تھا۔ اُسے عجیب سا اطمینان محسوس ہوا، اور اس نے اپنے تصوّر میں بھوک کو ہر اقسام کے کھانوں کی پلیٹوں میں نبرد آزمائی کرتے ہوئے دیکھا اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور چال میں اپنے آپ ہی عجیب سی رعونت پیدا ہو گئی۔

"بابو جی ـــ! دو دن کا بھوکا ہوں۔۔ اللہ کے نام پر کچھ دلا دو ـــ!"

آواز پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اور اُس نے دیکھا وہی لڑکا کسی اور راہگیر کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ اُسے بے حد غصّہ آیا۔ اُس نے اُسے گھور کر دیکھا۔ لیکن لڑکے نے اُسے کوئی اہمیت نہ دی۔ گاڑیاں اب بھی اُس کے آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ اور وہ سوچ رہا تھا۔ آخر فریب، جھوٹ اور بے ایمانی کی تربیت کون کرتا ہوگا ـــ؟ لیکن اُسے دُور دُور تک کوئی ایسا مدرسہ نظر نہ آیا۔

جیسے ہی اس نے گھر میں پہلا قدم رکھّا، بیوی کے فکرمند چہرے نے سوال کیا؟

"گئے تھے آپ اسپتال؟ ـــ!"

اِس اچانک سوال کے لئے وہ تیار نہ تھا۔ پریشانی اُس کے چہرے پر تاریک رات کی طرح چھا گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اُس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ اور پھر نہایت پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "وہ واقعی شمّو کی ماں بہت بیمار ہے وہ ٹھیک ہی کہتا تھا کہ یہاں عیادت کے لئے بھی کسی کے پاس وقت نہیں ہے ـــ!"

اُس کی بیوی نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ بے چاری شمّو کی ماں۔

وہ کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ لیکن اُسے عجیب سی ندامت ہو رہی تھی۔ صبح منّے کے منہ پر مارے ہوئے سارے ہی چانٹے پلٹ کر اُس پر برس رہے تھے اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

"سنو جی ـــ! ہمارے محلّے میں تبلیغی جماعت آئی ہوئی ہے۔ اجتماع ہے آج۔ شاید وہی لوگ ہوں گے۔" بیوی کی سرگوشی اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اُس نے بیزارگی سے بیوی کی طرف دیکھا۔ اور پھر کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے منّے کو حکم دیا ـــ "بیٹے اُن سے کہہ دو بابا گھر پر نہیں ہیں ـــ!"

اور منّا چپ چاپ دروازے کی طرف دوڑ پڑا ـــ



یوسف اعظمی

جب ترا ساتھ رہے وقت جواں ہوتا ہے
تو نہ ہو ساتھ تو لمحہ بھی گراں ہوتا ہے

ڈولتی شاخ ہو جس طرح سمندر کے قریب
تیری انگڑائی پہ یوں دل کو گماں ہوتا ہے

تم نہ ڈھونڈو میری آنکھوں میں وہ ماہتاب بدن
وہ بدن جو میری غزلوں میں نہاں ہوتا ہے

ہم جہاں بچھڑے تھے وہ موڑ تو روشن ہے ابھی
یہ غلط ہے کہ ہر ایک موڑ دھواں ہوتا ہے

کانچ کے جسم میں سمٹا ہوا سایہ نہ رہو
دیکھنے والوں کو پتھر کا گماں ہوتا ہے

جب ترا حسن مرے ذہن کا ہمراز نہیں
کیوں میری سوچ میں ہر وقت رواں ہوتا ہے

آنکھ جب خون میں بھیگے ہوئے منظر میں ہے
کوئی موسم بھی ہو موسم یہ گراں ہوتا ہے

صبح تو جس کے تکلم سے اُبھر آتی ہے
اعظمی اس کا تصور بھی اذاں ہوتا ہے

633 N. WASHTENAW
CHICAGO, IL 60659



یعقوب تصور

نہ ماہِ تاباں نہ کوئی تارا رکھا ہوا ہے
کفِ طلب پہ سُلگتا صحرا رکھا ہوا ہے

افق کے اُس پار کیسے جھانکیں بھلا نگاہیں
افق سے پہلے ہی اک تماشا رکھا ہوا ہے

ہیں زہر آلود، خشک کانٹے بھی محو گریہ
کہ شاخ پر پھر گلاب تازہ رکھا ہوا ہے

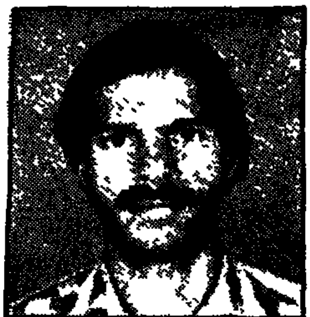
غم و الم تیرگی شکستہ دلی، تنفر
اک حلقہ، زندگی میں کیا کیا رکھا ہوا ہے

تقاضۂ زیست، خشک سالی نحیف طائر
کشادہ پنجروں میں آب و دانہ رکھا ہوا ہے

وہ جس پہ لکھا تھا نام تیرا بصد عقیدت
کتابِ دل میں ورق وہ سادہ رکھا ہوا ہے

شکست خودداری و انا بھی قبول کر لیں
تو پھر تصور حیات میں کیا رکھا ہوا ہے

P.O. BOX 4628
ABUDHABI. U.A.E



اکرم کمال

حیرت مفقود کی حد بادہ گری ہے دور تک
اک نفی ہوتی ہوئی لا منظری ہے دور تک

اک خلا احساس جم کر رہ گیا ہے روح میں
اک گلابی نرم و نازک سی کمی ہے دور تک

یہ سرابوں کا سفر اور راکھ جذبوں کی تھکن
زندگی اک جل بجھی سی ماندگی ہے دور تک

تیرگی کی وسعتوں میں ڈھونڈتی ہے کوئی شے
نکہ جگنو کی قبا میں اڑ رہی ہے دور تک

زہر کے سارے سمندر پی چکا ہوں میں کمال
پھر بھی صحراؤں کے جیسی تشنگی ہے دور تک

۳۲۹۔ تاشقند بیکری جوہو گلی اندھیری بمبئی

نقد و نظر

کرشن چندر (شخصیت اور فن)

شاعر کے ضخیم کرشن چندر نمبر (۱۹۶۷ء) اور جس مرگ (۱۹۷۷ء ایڈیشن) کو کرشن شناسی کا اہم ترین ماخذ تسلیم کیا گیا ہے۔ اردو کے ایک عظیم افسانہ نگار کی شخصیت و فن پر اتنا جامع کام کسی رسالے یا کتاب میں پیش نہیں ہوا تھا۔ اب ۲۵ سال بعد کرشن چندر پر ایک نہایت ہی جامع اور معتبر تحقیقی و تنقیدی کتاب سامنے آئی ہے۔ ایک بالکل ہی مختلف نوعیت کی اس کتاب کے مصنف جگدیش چندر ودھاون (پ ۱۹۱۸ء) اس سے قبل ان کی ایک اور تحقیقی و تنقیدی کتاب "منٹو نامہ" کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہو چکی ہے اور اب وہ راجندر سنگھ بیدی پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کرشن چندر کے حیات و فن کی تمام جزئیات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ممکنہ کوشش کی گئی ہے کہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہے اور حتی کہ جو پیش کیا جائے وہ حوالوں کے ساتھ ہو۔ اردو کے بڑے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر نے سب سے زیادہ لکھا وہ VERSATILE GENIUS تھے۔ ان کے فن پر قلم اٹھانا آسان نہیں اور پھر ایک کے بس کی بات بھی نہیں۔ پریم چند کے بعد اردو افسانہ کو مزید نکھارنے، سنوارنے اور اس کے وقار میں اضافہ کرنے والے کرشن چندر ہی تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ ایک بڑے فن کار کے قد کو پہنچنے والے تنقید نگاروں نے اسے متنازعہ افسانہ نگار بنا دیا اور جس نوعیت کا تنقیدی کام ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہو سکا۔ افسوس تو یہ ہے کہ کرشن چندر کے افسانوں کا کوئی معیاری اور اعلیٰ درجے کا انتخاب بھی شائع نہیں ہوا۔ جگدیش چندر ودھاون کے گرانقدر کام نے کرشن چندر پر تنقیدی و تحقیق کے نئے راستے روشن کر دیئے ہیں۔ کتاب کے دو ابواب ہیں، شخصیت اور فن، شخصیت کے باب میں ۳۰۸ صفحات میں جو مواد سمویا گیا ہے وہ بے حد دلچسپ اور تاریخی ہے۔ حیات اور اس کے بعد شخصیت کے عناصر ترکیبی میں یکے بعد دیگرے ایک جڑنے والی کڑیاں اپنے ربط و تسلسل میں بہت سلجھی ہوئی تہہ در تہہ اور معلوماتی ہیں۔ معلومات کا ایک لا متناہی ذخیرہ ہے۔ ایک عہد اور بے شمار چھوٹے بڑے کردار۔ یہی حال فن کے باب میں ہے۔ مولف کی اپنی دو ٹوک مگر سنبھلی ہوئی رائے درمیان میں یہاں وہاں شامل ہوتی ہے۔ تمام تحقیقی و تنقیدی لوازمہ لفظ لفظ اور سطر سطر دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو تنقید و تحقیق کے روایتی اور مروجہ اصولوں سے انحراف کرتی ہے اور خود مکتفی ہے۔ کتاب کو کہیں سے بھی پڑھ لیجئے تجسس کم نہیں ہوتا۔ کتاب اپنی ترتیب و تہذیب میں تحقیقی و تنقیدی کام کرنے والوں کے لئے ایک روشن مثال ہے۔ ان لوگوں کے لئے بھی جو شخصیات پر مختص مضامین جوڑتے اور جلد کتابیں شائع کرنے کو ادب کی خدمت اور بزعم خود تنقید نگار یا محقق سمجھتے ہیں۔ ہمارے یہاں محقق مواد کی یکجائی کا کام عموماً ہوتا رہتا ہے اور "شخصیت و کارنامے" کے عنوان سے آتا رہتا ہے۔ جگدیش چندر ودھاون کی یہ کتاب ہر اعتبار سے پہلی ایسی تحقیق اور سب کے لئے قابل مطالعہ ہے۔ علمی و تحقیقی کاموں کو کس حد معلوماتی اور پر تجسس کیسے بنایا جاتا ہے یہ کتاب معاونت کرتی ہے۔ کتاب کا باطنی کردار تو خوب سیرت ہے ہی اس کا ظاہری حسن بھی متاثر کرتا ہے۔ دیدہ زیب، روشن کتابت و طباعت، سفید کاغذ، جاذب نظر سرورق۔

★ ضخامت ۶۴۷ صفحات (بقول مولف کتابت شدہ ۳۰۰ صفحات ضخامت کو حدود میں رکھنے کے لئے کم کر دیئے گئے ہیں) ★ قیمت دو سو پچاس روپئے ★ مطبوعہ ۱۹۹۳ء ★ پتہ جگدیش چندر ودھاون ۱۹۳، مکرجی نگر (ویسٹ) دہلی — ۱۱۰۰۰۹

جھوٹ بولتی آنکھیں

اپنی اشاعت کے مسلسل بیسویں سال میں ہفت روزہ "راوی" (بریڈفورڈ برطانیہ) کے مدیر مقصود الہی شیخ کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ (پتھر کا جگر، برف کے آنسو) "جھوٹ بولتی آنکھیں" ۹ افسانوں پر مشتمل ہے۔ مقصود الہی شیخ کا قابل رشک کارنامہ ہفت روزہ 'راوی' ہے۔ اپنے وطن سے دور غیر دیس میں رہ کر کوئی رسالہ یا اخبار نکالتے رہنا بھی آسان نہیں۔ پھر جبکہ وہ کوئی ہفت روزہ ہو، باتصویر ہو اور عصری تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہو۔ یہ غیر معمولی کارنامہ ہی ہے۔ ہر وقت مصروف رہنے والے شیخ صاحب نے برطانیہ میں رہ کر نہ صرف اردو کی خدمت کی ہے بلکہ اپنے اخبار کے ذریعے ہند و پاک اور پوری دنیا کے اردو والوں کو ایک مرکز بنانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ یہ ایک ایسا جہاد ہے جس کی مثال کم ہی ملے گی۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور گاہے گاہے افسانے بھی لکھتے رہے ہیں۔ لیکن سنجیدگی کے ساتھ اپنے فن کی طرف متوجہ نہیں ہو سکے ہیں۔ تاہم ان کے افسانوں کو پڑھ کر یہ احساس البتہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ صرف اور صرف اپنے فن پر توجہ دیتے تو آج ان کا شمار صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا۔ یہاں توجہ سے میری مراد اپنے بارے میں چند حلقوں میں گھومنا، اپنے افسانوں پر مضامین لکھوانا، اپنے آپ پر سیمینار وغیرہ منعقد کروانا، کسی لابی سے جڑ کر اپنی پبلسٹی کروانا اور ہر ممکنہ کوششوں سے اپنے آپ کو بڑا افسانہ نگار منوانا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں واقعی اتنی جان ہے کہ ان کا شمار صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہونا چاہئے۔ شاعری کی طرح، افسانہ بھی تخلیقی عمل ہی ہے۔ افسانے کی کوئی بھی تعریف مکمل نہیں کی جا سکتی۔ کہانی تب اور کہنے کا فن ہر طرح کی تعریف سے بالا تر ہے۔ کہانی کی ابتداء، درمیان اور اس کا اختتام، سب کچھ نامعلوم مگر تخلیقی اسلوب و موضوعات کی کوئی کمی نہیں۔ 'جھوٹ بولتی آنکھیں' کے تمام افسانے بہت خوب صورت بیانیہ سے سجے ہوئے ہیں۔ ہر کہانی جیتی جاگتی دھڑکتی ہوئی پر تجسس، تخلیقی نثر یا تخلیقی بیانیہ کا وصف یہ ہے کہ وہ غیر ضروری لفظوں اور جملوں کو برداشت نہیں کرتے۔ اپنے آپ میں پیوند کاری کی چغلی کرنے دیتے ہیں۔ جس طرح اچھا شعر فنی و لسانی سطح پر بھی اچھا ہو۔ حشو و زوائد سے پاک ہو، کوئی مقصد ہو، کہانی کا معاملہ بھی یہی ہے۔ مقصود الہی شیخ کے افسانوں کی زبان و بیان، موضوع و مواد سب کچھ بہت مختلف اور منفرد معلوم ہوتا ہے۔ کہانی اپنے بیانیہ کی طرف لوٹ آئی ہے۔ نیا تخلیقی بیانیہ کیا ہے؟ میں کہوں گا، مقصود الہی شیخ کے افسانے 'جھوٹ بولتی آنکھیں' کی ہر کہانی خود مکالمہ کرتی ہے کہ وہ کیا ہے۔ یہ دال دوال یا سپاٹ نثر یا محض چھوٹا چھوٹا مکالمہ یا جزئیات سے مملو بیانیہ نہیں ہے۔ مجموعے کی تیسری کہانی 'جھوٹ بولتی آنکھیں'، گلابو اور سلیم کے دو بنیادی کرداروں سے بنی ہوئی ایک نہایت ہی دلچسپ نفسیاتی، جنسی کہانی ہے۔ بظاہر بہت عام سی مگر اپنے باطن میں بہت دور تک پھیلی ہوئی۔ مقصود الہی شیخ کی کہانیوں کا مرکز، جنس کی نفسیات اور اس کی باریکیاں ہیں۔ زبان پر قدرت اور جملوں کی تہہ داریاں کہیں بھی کم معیار اور ادھ کھلی نہیں لگتیں۔ ہر لحاظ سے وہ ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ 'جھوٹ بولتی آنکھیں' میں کئی کہانیاں اس بات کی سفارش کرتی ہیں۔

★ ضخامت ۱۴۴ صفحات ★ قیمت چار پونڈ ★ مطبوعہ جنوری ۱۹۹۳ء

★ پتہ RAVI HOUSE - UNIT E1
LEGRAMS LANE
BRADFORD BD7 1NS

کوکن کے افسانے

کوکن اردو رائٹرز گلڈ یعنی ساحر شیوی نے اردو زبان و ادب سے اپنے بے پناہ عشق کو کتابوں کی اشاعت کے ذریعے اظہار کا مؤثر استعارہ بنا دیا ہے۔ ۱۹۸۸ء سے تا حال کئی اچھی اور اہم کتابیں اپنے ذاتی خرچ سے شائع کروائی ہیں۔ سود و زیاں کے تصور کے بغیر ادب کے جنون کی مثال شاید کم یاب ہو۔ زیر تعارف کتاب کوکن سے تعلق رکھنے والے دس افسانہ نگاروں کے بیس مطبوعہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ نور پرکار، فقیر کلے، شیخ اسماعیل، یونس اگاسکر، ساحر شیوی، آدم نصرت، خالد اگاسکر، نور جہاں نور، رشیدہ قاضی اور انجم عباسی میں سے کئی نام اردو افسانہ نگاروں میں خاصے معروف ہیں۔ یہ سارے افسانے معتبر ادبی اور نیم ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ انجم عباسی نے نہایت ہی سلیقے سے کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ افسانہ نگار مانک ٹالا کے فلیپ کے ساتھ کتاب میں شامل افسانوں پر کوئی تنقیدی مضمون بھی ہوتا۔ سوانحی اشاریوں اور تصاویر کو شامل کیا جاتا تو اس طرح کتاب اور وقیع ہو جاتی۔

★ ضخامت ۱۵۲ صفحات ★ قیمت پچاس روپئے ★ مطبوعہ ۱۹۹۰ء

★ پتہ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی — ۱۱۰۰۰۲

★ آصف فرخی — بی ۱۵۵، گلشن اقبال کراچی (پاکستان)

آپ کی کرم فرمائی سے شاعر برابر مل رہا ہے۔ اور میں پابندی سے مطالعہ کرتا ہوں۔ یوں تو ہر شمارے میں کوئی نہ کوئی تحریر توجہ طلب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن شمارہ نمبر ۵ اور ۶ میں دو چیزیں ایسی تھیں کہ بے ساختہ آپ کو خط لکھنے کو جی چاہا۔ محمد علوی کی نئی مختصر نظمیں اور دیوندر اسر کا مضمون۔ محمد علوی کی نظموں کی نظیر معصومانہ مگر باطنی تہہ دار پرکاری کا کیا ہی کہنا۔ دیوندر اسر کا مضمون بہت فکر انگیز ہے اور انہوں نے علامتی افسانے کے ابلاغ پر جن بعض بھاری کتابوں کا حوالہ دیا ہے ان سے کہیں زیادہ تیکھے مگر کم سنوں میں باخبر ہیں اس لئے کہ اس میں افسانے کی تنقید کو اپنے دوستوں کے نام گنوانے کے بجائے وسیع تر تہذیبی صورت حال کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا گیا ہے۔ مضمون کا ایک ٹکڑا تو بہت ہی بلیغ ہے۔

"اگر ہم سے ہمارا لوک ورثہ، ہمارا کلاسیکی ادب چھین کر ایک لذت پرست پلاسٹک کلچر (CONSUMERISM) اور میڈیا مرد ثقافت کی طرف لے جایا جا رہا ہے تو اپنی شناخت کے تحفظ اور اقدار کی بقا کے لئے ہمارے پاس ادب کی SURVIVAL کے سوائے کیا رہ گیا ہے۔"

اگر افسانہ EMPATHY اور ترسیل میں ناکام رہتا ہے تو اس خلا کو سنگ دل سیاست داں، مکار ریاست، مذہبی بنیاد پرستی اور عصبیت پر کرے گی اور تباہی یہ ہوگی کہ یہ سب کچھ تہذیب کے تحفظ اور ماضی کے احیا کے نام پر ہوگا۔ یہ الفاظ ہم سب سے بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔

★ کرشن کمار طور — ای ۲۴۴ کھنیارا روڈ، دھرم شالہ

تمہاری نظمیں میں نے پڑھیں اور محظوظ ہوا۔ تمہاری ان نظموں کے مزاج میں جو پرکاری ہے اس سے وہی آدمی ہم کنار ہو سکتا ہے جو اپنی شکست کی آواز سننے کی ہمت رکھتا ہو۔ اور یہ ہمت جٹانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں کیوں کہ دلوں میں گرمی اور آنکھوں میں روشنی پیدا کر کے اور خود پر خدا ہونا اختلاط سے زندہ رہنے کی آرزو اور زندگی کو نہ صرف بسر کرنا بلکہ برتنے کا شعور رکھنا ایک ایسی خصوصیت ہے جو اگر کرشمہ نہیں تو کرشمے سے قریب تر ضرور ہے۔ ان نظموں میں چاہے بڑی کیفیتوں کا بیان نہ ہو۔ لیکن ان میں سچے اور سنجیدہ عوامل کے اثرات یقینی طور پر ملتے ہیں۔ یہ نظمیں تنوع وسعت اور ہمہ گیری کے خمیر سے عبارت ہیں ان میں خرابے میں ایک دھیمی مگر خالی آواز نکالنے کا فن روا ہے۔ یہ نظمیں باغی ورت کی یک دھڑ مثال ہیں۔

★ منظور ہاشمی — اے-۱، نذیر احمد روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

'شاعر' کا ہم عصر اردو ادب نمبر کب تک آ رہا ہے۔ ویسے میں پوری صداقت کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ پچھلے چند شماروں سے شاعر کا معیار و مزاج بہت اعلیٰ اور خوبصورت ہوتا جا رہا ہے۔ خاص طور پر شعری تخلیقات زیادہ تر معیاری، متاثر کرنے والی، خوبصورت اور تازہ، شاداب، اور بڑی عصری ہوتی ہیں۔ ان میں یقیناً آپ کے شعری معیار و بصارت کی کارفرمائی ہے۔ میری مبارکباد قبول کیجئے۔

★ حسن شکیل مظہری — 16 BROADACRE STALYBRIDGE CHESHIRE SK 152 TE

'شاعر' کے حالیہ شمارے موصول ہوئے۔ ایک مدت کے بعد ادبی صحیفہ دیکھنے کو ملا۔ آج کل ہندوستان میں رسالہ شائع کرنا اور وہ بھی اردو کا، جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ یہ تو آپ ہی کی ہمت ہے کہ آپ اپنے بزرگوں کی اس ادبی یادگار کو بہ حسن و خوبی سنبھالے ہوئے ہیں۔ میرے اور آپکے بزرگوں میں بڑی یگانگت اور محبت تھی۔ اب تو وہ سب لوگ بس ایک کہانی ہو کر رہ گئے ہیں۔ بہرحال 'شاعر' ایک اعلیٰ معیاری ادبی رسالہ ہے۔

★ قمر قدیر ارم — قمر منزل، بارہ دری مراد آباد ۲۴۴۰۰۱

آپ کی تمام مختصر نظموں میں 'موت سے مکالمہ' سب سے زیادہ اچھی لگی۔ ایک عجیب سی کیفیت ہے اس میں۔ جیسے آپ موت سے نہیں اپنی محبوبہ سے ہم کلام ہیں۔ وارفتگی اور گداز لے کر دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ نظم پہلی نظم "چار دن صرف چار دن" اس میں بھی ایسا ہی بے ساختہ پن ہے۔ دوسری اور تیسری نظمیں موضوع کے اعتبار سے الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک ہی نشست میں لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن سچی اور کھری نظمیں ہیں۔

★ سلیم انصاری — سنگم اپارٹمنٹ مینا کینٹ (جھانسی) یوپی

'شاعر' کے تازہ شمارے میں آپ نے اداریہ 'زندگانا ہے — نہ خواب میں رہے' "میں جن مسائل کا کرب انگیز اظہار کیا ہے اس سے چشم پوشی کسی بھی طرح مناسب نہیں۔ میرالدین احمد کی کہانی "لینڈ لیڈی" اور مقصود الٰہی شیخ کی ایک سادہ سی کہانی ذہن و دل پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ دیوندر اسر کا مضمون اردو افسانہ: تہذیب، تحریر اور مستقبل، اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس میں سنجیدہ قارئین اور ناقدین ادب کو افسانے کے مستقبل کے تعلق سے دعوت غور و فکر دی گئی ہے۔ ان کا یہ جملہ "اردو افسانہ چاہے جتنا بھی جدید اور عظیم ہو جائے۔ بغیر قاری کے زندہ نہیں رہ سکتا"۔ غور طلب ہے۔ منظومات میں مظفر حنفی، نشتر خانقاہی، ساجدہ حمید، اور تحسین رزاقی کی غزلیں پسند آئیں۔ محمد علوی، خالد سعید، علیم اللہ حالی اور احمد امام کی نظمیں جدید اور عصری حسیت سے مملو ہیں۔

★ محمد اسحاق عادل — سنگاہ کشن گنج ۸۵۵۱۰۷ (بہار)

شاعر کا مطالعہ میری ناتواں زندگی کا ایک محبوب مشغلہ ہے۔ میں نے اس کی مدح سرائی کے لئے اپنے حصے بھی الفاظ لے کر شعر ڈھالے سب غیر موزوں نکلے لہٰذا میں اس کے کمالات کی صورت گری سے عاجز ہوں، لیکن میں بجا طور پر بہ انداز فاخرانہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس سے دلی روابط کی بنا پر میری ناقص صلاحیتیں ارتقائی منازل تک رسائی کے لئے لحظہ لحظہ تیز گامی کے ساتھ رو بہ عروج ہیں۔ مجھے امید قوی ہے کہ اگر آپ نے اس کے حسن معیار کو داغ دار ہونے سے بچائے رکھا تو انشاءاللہ تعالیٰ ایک روز یہ تخلیقی تزئین کاری کا مرکز آئینہ دار ہوگا۔

★ صبیح الدین اطہر — ڈیف اینڈ ڈمب ہوائز اسکول، گنیش کالونی اورنگ آباد (مہاراشٹرا)

'شاعر' کا معیار بلند تر ہو گیا ہے۔ آپ کی نثری نظموں میں تہذیب مر جاتی ہے۔ حقیقت کے فکر کی عکاسی کی جھلک یا تصور معلوم ہوتی ہے۔ بہت اچھی نظم ہے۔ دوسری نظم 'روح کائنات کے نام' بھی ایک اچھی نظم ہے۔ افسانے بھی معیاری ہیں۔ قطر میں دو، تین ادبی رسائل پر تبصرہ پڑھا، ہم یہ رسائل منگانا چاہتے ہیں۔ بطور خاص جزائر انڈمان سے ادبی رسالہ منگانا چاہتے ہیں کس طرح منگائیں؟

★ مقصود الٰہی شیخ — "RAVI HOUSE" UNIT E1, LEGRAMS LANE BRADFORD BD7 INS

گزشتہ دنوں (۷ر نومبر) ٹی وی ایشیا ہر کے ایک طویل انٹرویو میں میں نے خصوصاً 'شاعر' (بمبئی) کا دیرینہ معیاری ادبی رسالے کے طور پر ذکر کیا۔ آپ دیکھتے سنتے تو ضرور خوش ہوتے۔ واقعی شاعر ہمارے قلب و ذہن میں داخل ہو چکا ہے۔ خدا آپ کو اور شاعر دونوں کو سلامت رکھے۔

★ جمیل الرحمان — KORMELINK WEG-44 1104 NS AMSTERDAM HOLLAND

گزشتہ دنوں ساقی فاروقی سے 'شاعر' کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ اصل میں آپ کا پتہ (ہندوستانی رسائل کے پتے) میرے پاس نہیں تھا۔ اور یورپ میں تو ایڈریس حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ بہرحال اب پتہ مل گیا تو آپ سے رابطہ قائم ہوا۔ پاکستان کے شاعر و ادیب تو خاکسار کو جانتے ہیں۔ مگر اصل پہچان تو کام ہے۔ آپ سے بھی حوالے سے متعارف ہو ہی جانے کا ہے۔ ویسے لندن کا معاملہ مختلف ہے۔ وہاں پتوں کا حصول بہت آسان ہے۔ ۲۱ اکتوبر کو جرمنی میں انٹرنیشنل مشاعرہ تھا۔ وہاں کے مقامی شعرا میں خاصہ ٹیلنٹ ہے۔ جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ آپ نے یورپ کے شعرا اور اہل ادب کو جس طرح 'شاعر' میں ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ وہ مجھے اچھا لگا۔ آپ آئندہ بھی اسی سلسلے کو جاری رکھیں گے۔ یہ حوصلہ افزا ہے۔

★ عظیم اشرف — جنتوار پور، جوتھ ۸۴۸۲۳۲ سمستی پور (بہار)

'شاعر' کی سب سے بڑی خوبی میری نظروں میں یہ ہے کہ آپ نئی نسل کے قلم کاروں کو نظر انداز نہیں کرتے ہیں۔ اور رسالے کا دیرینہ معیار بھی قائم ہے۔ حیرت ہوتی ہے۔ آپ کی نظموں کو بار بار پڑھتا ہوں اور ہر بار نئے احساس کے ساتھ لطف اندوز ہوتا ہوں۔ 'موت سے مکالمہ' اور 'روح کائنات کے نام' دونوں ہی نظمیں مختلف اور معیاری ہیں۔ ان نظموں پر مبارکباد قبول کیجئے۔

★ رام پرکاش کپور — ۱۸/۱ ایم آئی جی، پدم ناتھ پارو، ڈرگ ۴۹۱۰۰۱ (مدھیہ پردیش)

شاعر کی جلد ۶۴ شمارہ ۵ اور ۶ میں آپ نے ایک بہات

اور اہم بحث کا آغاز کیا ہے۔ آپ ہی نے نہیں پچھلے چند ماہ سے یا یوں کہیے کہ ۱۹۹۳ء کے آغاز سے ہی اردو کے تمام معیاری رسالوں، ہندوستان کے کونے کونے سے۔ شمال جنوب، مشرق مغرب اور مرکز سے شائع ہونے والے تقریباً سبھی رسالوں میں اردو کے کسی نہ کسی زاویے سے بحث کی گئی ہے۔ ایک طرح سے یہ بات بہت حوصلہ افزا ہے کہ بہت لمبے عرصے کے جمود، بے پروائی، لاتعلقی اور مایوسی کے بعد اردو والوں کے ضمیر کو کسی نے اچانک جھنجھوڑ دیا ہے۔ ایک بیداری اور اپنے جائز حقوق کے لئے لڑنے کی اسپرٹ پیدا ہوئی ہے۔ ان تمام مضامین کو دیکھنے کے بعد یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ رسالوں کے ایڈیٹر اپنے نظریوں میں ایک دوسرے سے متفق نہیں ہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ اردو کے زوال کی کیا وجوہات ہیں؟ ہندوستان میں اردو کی کیا پوزیشن ہے؟ اور اردو کو اپنا جائز مقام دلوانے کے لئے کن اقدام کی ضرورت ہے؟ ان تمام موضوعات پر متضاد اظہار خیال کئے گئے ہیں۔ تفصیل میں تو بعد میں آؤں گا۔ اس وقت چند مثالیں دینا چاہتا ہوں۔ آپ نے لکھا ہے "ہمارا اصل اور بنیادی مسئلہ ذریعہ تعلیم اور ذریعہ معاش ہے — اردو کو معاشی وسائل سے پوری طرح جوڑنے کا وقت ہے — اگر اردو کے یہ دو بنیادی مسائل باوجود تمام کوششوں کے حل نہیں ہوتے تو ہمیں سرکاری مدد سے چلنے والی اردو اکادمیوں اور انجمنوں سے باہر آجانا چاہئے" اس کے برعکس "گلبن" کے مدیر نے لکھا ہے کہ "اردو کی ترقی و تحفظ کے لئے ضروری نہیں کہ اس کا رشتہ روزی روٹی سے جوڑا جائے — اردو کے لئے سیاسی بیساکھی کا مطالبہ کرنا وقت ضائع کرنا ہے —" اور ماہنامہ آج کل کے مدیر نے اردو اخباروں و رسائل کے اعداد و شمار دینے کے بعد لکھا ہے "اس اعداد و شمار کو مد نظر رکھتے ہوئے کئی باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔ اول یہ کہ بندی ملازمتوں کے باوجود اردو کی مقبولیت گھٹتی جارہی ہے۔ دوم یہ کہ اردو کا دامن بھی روزی روٹی سے اسی طرح بندھا ہوا ہے جس طرح دوسری زبانوں کا" اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کے سوال پر یہ تین مختلف اور متضاد نظریے ہیں۔ کسی نے لکھا ہے کہ "یہ ہمارے مشترکہ تہذیب و کلچر کی وراثت ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کی پہچان ہے۔ اس لئے اسے زندہ رکھنا ضروری ہے۔" کسی دوسرے نے لکھا ہے "اس میں ہمارے مذہب کا اثاثہ محفوظ ہے۔ اس لئے ہمیں ذاتی طور اردو پڑھانے کا انتظام کرنا ہوگا۔ جس طرح ہم قرآن شریف پڑھانے کا انتظام کرتے ہیں۔" اس کے برعکس کسی نے لکھا ہے "اردو برصغیر ہند و پاک میں صرف مسلمانوں کی زبان ہے" اس غیر حقیقی رویے نے اردو کو بے پناہ نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی وسعتوں کے امکانات بہت ہی محدود ہو گئے ہیں۔ اس طرح کی سوچ کو ہوا دینے والے یہ نہیں سوچتے کہ علم و ادب کو عقائد میں مقید نہیں کیا جاسکتا۔ خود اردو کا سکہ سرمایہ غیر مسلموں کے افکار و تخیلات سے بھرا پڑا ہے۔ اسے کونسے سمندر میں پھینکنا ہوگا۔" اس طرح کے متضاد نظریے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن ایک چیز مشترک وہ ہے اخلاص اور اردو کی ترویج و ترقی کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ۔ ان سب رسائل کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حال میں اردو داں طبقہ میں مندرجہ ذیل نظریے پائے جاتے ہیں۔

۱ — پہلا نظریہ یہ ہے کہ اردو بھی فارسی کی طرح ہندوستان میں ختم ہو رہی ہے۔ اور آئندہ پچاس سال میں یا اس سے بھی پہلے یہ زبان محدود ہو کر رہ جائے گی۔ ایسے نظریے والے دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ جو اردو کے مستقبل سے بالکل مایوس ہو کر پاکستان چلے گئے۔ یا جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جو اردو کے حال اور مستقبل سے مایوس ہو گئے ہیں۔ اور دکھی ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو بے بس اور لاچار محسوس کرتے ہیں۔ کہ وہ اردو کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ مجھے ایسے ہی لوگوں سے کچھ عرض کرنا ہے۔ فرض کیجئے وہ ٹھیک بھی ہوں تو کیا وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے۔ اور اس مشترکہ تہذیبی ورثے کو محدود ہوتے خاموشی سے دیکھتے رہیں گے۔ کیا اس زبان کو زندہ رکھنے کے لئے جد و جہد کرنا ان کا فرض نہیں ہے۔ آنے والی نسلیں ان کے بارے میں کیا سوچیں گی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جد و جہد کرنے سے کامیابی ضرور ملے گی۔

۲ — دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ماضی قریب میں اردو کے جو مسائل و دشواریاں تھیں وہ اب ختم ہو رہی ہیں۔ اور حکومت اردو کے لئے سنجیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جابجا اردو اکاڈمیاں قائم ہوئی ہیں۔ یہ نظریہ بھی پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ اردو اکادمیوں پر ریاستی حکومتیں کروڑوں روپئے خرچ کر رہی ہیں۔ اس خرچ سے اردو کی کیا پیش رفت ہوئی ہے۔ جب سے اردو اکادمیاں قائم ہوئی ہیں۔ کتنے ہزار غیر اردو دانوں کو پڑھنا لکھنا سکھایا گیا ہے۔ سیمناروں اور مشاعروں سے تو اردو کی ترویج و ترقی ممکن نہیں ہے۔ اس وقت اردو کی پوزیشن کیا ہے۔ مرکزی حکومت اور ریاستی سرکاروں نے اردو کو مسلمانوں کی زبان بنا کر محدود کر دیا ہے۔ کسی بھی ریاست یا مرکز میں اردو کی کوئی سرکاری حیثیت باقی نہیں رہی ہے۔ اور اگر ہے (بہار میں؟) تو سرکاری فائلوں تک محدود ہے۔ اردو کے زیادہ تر اخبار ہندی اور علاقائی زبانوں میں تبدیل ہو گئے ہیں اور جو بچے ہیں ان کی سرکولیشن دن بدن کم ہو رہی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اسکول جانے والی نسل اردو سے بے بہرہ ہے۔ کیوں کہ چند گنے چنے اردو اسکولوں کو چھوڑ کر اردو پڑھانے کا انتظام ہی اسکولوں میں نہیں ہے۔

۳ — تیسرے وہ لوگ ہیں جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ اردو واقعی مسلمانوں کی ہی زبان ہے۔ ایوان اردو دہلی کے نومبر ۱۹۹۱ء کے شمارے میں نسیم اختر کا خط شائع ہوا ہے۔ جس کے کچھ حصے نقل کر رہا ہوں "اردو کبھی بھی ہندوستانی سماج کے مختلف طبقوں کی مشترک زبان نہیں رہی ہے۔ کوئی کچھ کہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو کو اس کے زریں عہد میں یعنی تقسیم وطن سے قبل ہندوستانی سماج کے ایک مخصوص طبقے نے اپنے اجداد کی میراث سمجھ کر اور قرآن و حدیث کی تفسیر کی زبان کے طور پر گلے لگایا۔ اور اسی سماج کے دوسرے طبقے کے افراد نے کاروباری، معاشی اور اسی قسم کی دوسری ضرورتوں کے دباؤ کے تحت اردو کو اپنایا۔ لیکن ایک فاصلہ قائم رکھا۔ تقسیم وطن کے بعد یہ ضرورتیں اور ترجیحات یکسر بدل گئیں۔ جس کے نتیجے میں تمام کا تمام منظر نامہ ہی بدل گیا۔" ایڈیٹر ایوان اردو نے اپنے اداریہ میں ان کے جواب میں لکھا:

"جن لوگوں نے اردو زبان کی پیدائش کے تاریخی عمل اور اس کے تدریجی ارتقاء کے مختلف مرحلوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے وہ اسے سرزمین ہند کی ایک مشترکہ زبان ہی مانتے ہیں۔ اور ہمارے نزدیک سچائی بھی یہی ہے ——— یہ مفروضہ بھی صحیح نہیں کہ اردو قرآن حدیث کی زبان ہے۔ اردو مدتوں تک صرف بول چال کی زبان رہی اور اس میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ بہت بعد میں شروع ہوا۔ بہر حال جب یہ سلسلہ شروع ہوا۔ تو صرف قرآن حدیث کے تراجم و تفسیر ہی سامنے نہیں آئیں۔ دوسرے مذاہب کا لٹریچر بھی وجود میں آیا۔ پچھلے دنوں علی گڑھ یونیورسٹی نے ایک دو روزہ کل ہند سیمینار منشی شو برت لال برمن پر منعقد کیا تھا۔ جنہوں نے سو سے زیادہ کتابیں ہندو دھرم کی ترویج و تبلیغ کے لئے لکھیں۔ اور یہ سب اردو میں ہیں۔ یہ کام انہوں نے اپنی بیوی کی فرمائش پر ہندو خواتین کی مذہبی تعلیم و تربیت کے لئے شروع کیا تھا ——— اس خیال سے بھی اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ غیر مسلموں نے محض معاشی ضرورتوں کے تحت اردو کو اختیار کیا۔ جو زبان صرف معاشی مقاصد سے سیکھی جائے اس میں کسی تخلیقی سرگرمی کا تصور محال ہے۔ اور اس حقیقت سے کون واقف نہیں۔ کہ غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں نے اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی کتابیں اردو میں اتنی تعداد میں نہیں چھپیں جتنی آزادی سے پہلے ہندوؤں کی مذہبی کتابیں خاص طور سے گیتا، رامائن اور مہابھارت اردو میں چھپیں اور آج بھی اس نسل کے لئے چھپتی ہیں۔"

۴ — چوتھے وہ لوگ ہیں۔ جو یہ مانتے ہیں کہ اردو مشترکہ زبان ہے۔ مشترکہ تہذیب و تمدن کی وارث ہے۔ لیکن یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ حالات میں ہندوستان میں اسے صرف مسلمانوں کی زبان بنا دیا گیا ہے اور وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ انگریزی، ہندی، دوسری صوبائی زبانیں بڑھتے ہوئے متعصبانہ ماحول میں اردو کو پنپنے نہیں دیں گی۔ اس لئے اردو کے لئے سیاسی بیساکھی کا مطالبہ کرنا وقت ضائع کرنا ہے۔ اور مسلمانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ اردو کی ترقی و بہبودی کا انتظام اپنے بل بوتے پر کرنا ہوگا۔ اس میں ہمارے مذہب کا اثاثہ محفوظ ہے۔ اس لئے ہمیں ذاتی طور پر اردو پڑھانے کا اس طرح انتظام کرنا ہوگا۔ جس طرح قرآن شریف پڑھانے کا انتظام کرتے ہیں۔ اس زمرے میں وہ لوگ بھی شامل ہیں۔ جو "گلبن" کے ایڈیٹر کی طرح سوچتے ہیں کہ "اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ فاصلہ خون پیدا کرتا ہے۔ اگر سے نفرت کی آگ ہی بھڑکتی ہے۔

جس طرح قرآن شریف پڑھانے کا انتظام کرتے ہیں۔ اس زمرے میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو "کلمین" کے ایڈیٹر کی طرح یہ سوچتے ہیں کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ فساد خون ہی پیدا کرتا ہے۔ اس سے نفرت کی آگ ہی بھڑکتی ہے اور تعصب پروان چڑھتا ہے۔ ہم جتنا اس پر زور دیں گے اتنا ہی زیادہ اردو کے خلاف نفرت پیدا ہوگی اور اگر اردو کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ ترک کر دیں اور اسے اپنی مذہبی اور ثقافتی وراثت کہہ کر اپنے بل بوتے پر سیکھیں تو نفرت کی آگ بڑی حد تک سرد پڑ جائے گی اور اگلے بیس سالوں میں ہندوستان کی جو تہائی آبادی اردو سیکھ لے گی۔"

ہم اپنا یہ قانون اور جمہوری حق صرف اس لئے چھوڑ دیں۔ کیوں کہ فرقہ پرست عناصر اپنے ذاتی مفاد اور تعصب کی بنا پر اس کی مخالفت کر رہے ہیں — نہیں بالکل نہیں۔ ہمیں یہ حق ہمارے جمہوری دستور نے دیا ہے۔ اور اس بنیادی حق کیلئے ہم ضرور جدوجہد کریں گے۔ اور جہاں تک اپنے بل بوتے پر سیکھنا اور ہندوستان کی جو تہائی آبادی کا اردو سیکھ لینے کی امید کرنا ہے۔ یہ تھیوری میں ہی ٹھیک لگتا ہے۔ عملی طور پر اگر ناممکن نہیں تو نہایت مشکل ضرور ہے۔ اس سلسلے میں ایک ذاتی تجربہ بیان کرتا چلوں گا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے گھر میں میر فیس کے اردو پڑھانے کا انتظام کیا تھا۔ مقامی اخباروں میں بھی لکھوایا۔ اردو بلٹز میں بھی اس بارے میں میرا ایک خط شائع ہوا تھا۔ ذرگ میں وہ بلٹز کافی تعداد میں آتا ہے۔ دوستوں اور واقف کاروں کے ذریعے بھی اس کی پبلسٹی کی تھی۔ میرے کئی جاننے والے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے۔ جس علاقے میں رہتا ہوں اور وہاں گرد و نواح میں مسلمانوں کی کافی آبادی ہے۔ لیکن کوئی اردو پڑھنے نہیں آیا۔ کیوں کہ متمول گھرانوں کے لوگ تو اپنے بچوں کو انگلش میڈیم اسکولوں میں ہی پڑھاتے ہیں۔ اور غریب لوگ اس وقت تک اردو پڑھنے کی طرف راغب نہیں ہو سکتے۔ جب تک اردو روزی روٹی سے نہ جڑ جائے۔

اب آخر میں میں اپنا نظریہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ایسے بہی خواہوں کی کمی نہیں ہے۔ جو اس زبان کو محدود نہیں ہونے دیں گے اور اس کے فروغ کے لئے ہر ممکن کوشش و قربانی دیں گے۔ ایسے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملک میں ہزاروں کی تعداد میں انجمنیں ادارے سوسائٹیاں اور جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ لیکن اردو کے نام پر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے یا طاقتور آواز بننے کی کوشش آج تک نہیں ہو سکی ہے۔ کیوں نہ ملک گیر سطح پر ایک غیر سیاسی جماعت کی تشکیل کی جائے۔ جس کی انفرادی ممبر شپ کے ساتھ ساتھ یہ جماعتیں بھی شامل کر لی جائیں اور اردو سے پیار کرنے والے سب لوگوں کو اس میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے۔ اس جماعت کا ایک سوتریہ کاریہ کرم (ONE POINT PROGRAM) ہو کہ اردو کو ہندوستان میں اس کا جائز حق دلوانا ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلا قدم اردو کو یوپی، بہار، دہلی، ہریانہ، پنجاب، مدھیہ پردیش، راجستھان اور آندھرا پردیش میں

دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلوانا ہے۔ صرف کاغذات میں نہیں عملی طور پر تمام سیکولر پارٹیوں کے الیکشن مینی فیسٹو میں یہ موجود ہے۔ سیاسی پارٹیوں کو وعدہ وفا کرنے پر مجبور کرنا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ایک اور کام کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس بات کی عام رائے بنانی ہوگی اور عام لوگوں کو یقین دلانا ہوگا کہ اردو والے ہندی اور علاقائی زبانوں کے خلاف نہیں۔ اردو والے علاقائی زبانوں یا ہندی کی جگہ اردو کو نہیں دلوانا چاہتے۔ ہندی قومی زبان مان لی گئی ہے۔ اور علاقائی زبانوں کو بھی اپنے اپنے علاقوں میں سرکاری زبانوں کا درجہ حاصل ہے۔ ہمارا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ اردو کو دوسری زبان کا درجہ دیا جائے۔ اس کے منظور ہونے سے اردو کسی بھی طرح ہندی یا علاقائی زبانوں کے لئے خطرہ نہیں ثابت ہو سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ اردو زبان کا ادب و شاعری دوسری زبانوں کے بولنے والوں کے لئے بے پناہ کشش رکھتے ہیں۔ لیکن یہ دوسری زبانوں کی جگہ نہیں لے گی۔ ہاں یہ سارے ہندوستان کی رابطے کی زبان بن سکتی ہے۔ اور اس میں رابطے کی زبان بننے کا تاریخی و لسانی وصف بھی ہے۔ لیکن یہ کسی زبان کے لئے خطرہ نہیں بن سکتی۔

★ سید انیس شاہ جیلانی — محمد آباد، تحصیل صادق آباد (پاکستان)

شمارہ نمبر ۵ اور ۶ دونوں شمارے موصول ہوئے۔ ایک اچھے ادبی پرچے کا حصول اعزاز ہے۔ میں اول تا آخر پڑھتا بھی ہوں۔ اور اس کی ستائش بھی لگاتار رہتا ہوں کہ اہل نظر میں میری قدر و منزلت میں اضافہ ہو۔ خاص التفات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

★ فیصل — کم فاران — 60-RUSHOLME RD. TORONTO ONT M6J 3H5 CANADA

شمارہ نمبر ۵ اور ۶ میں مریض (کنور سین) اور کس کی کہانی (گلزار) قابل تعریف ہیں۔ اردو افسانے میں کہانی واقعی بہت کچھ اتنی مدھی ہے۔ دلو مدار سر کا مقالہ "اردو افسانہ۔ تہذیب، تجربہ اور مستقبل" مذکورہ دونوں کہانیوں سے ایک حاکمانہ ربط رکھتا ہے۔ معاشرتی بیماریاں تو دستور ہیں۔ لیکن اردو افسانہ اس کی گھس میں مبہم علامتوں اور استعاروں کے تعاقب میں کہیں بہت دور نکل گیا ہے۔ استاد ورکہ قاری کو بھی بہت پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ ہر ماہ لکھنے والوں میں تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مبہم علامت کو ہی افسانے کے معیار کا پیمانہ قرار دے دیا گیا ہے؟ دوسرا اور ٹرسٹ (اظہر جاوید) کوشش کے باوجود ٹھیک طرح سے کچھ میں نہیں آسکا افسانہ نگار حقیقت میں کہنا کیا چاہ رہا ہے۔ بالکل اس گزشتہ خواب کی طرح جو کہ صبح یاد کرنے کے باوجود بھی ٹھیک طرح سے یاد نہ آسکے۔ علامت اگر مبہم ہو تو افسانے کا مرا دوبالا کر دیتی ہے۔ کتاب (مقدر حمید) کو پڑھ کر کسی بھی طرح کی ذہنی پریشانی نہیں ہوتی۔ مقدر حمید نے بہت خوبصورتی سے اپنے مدعا کو کہانی کے انداز میں شروع کر کے علامت پر ختم کیا ہے۔ لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ علامت اور استعاروں کے کندھے پر سوار کہانی نے کس قسم کی ترقی کی ہے؟ کنور سین اور گلزار نے بھی یہی سوال اٹھایا ہے۔ حکیم صاحب میں مریض ہوں۔ آپ کا میرا بولی داس کا ساتھ ہے۔ سر مں اور آپ لکھتے پڑھتے ہو گئے ہیں۔ باقی سب تو بہت بعد کی بات ہے۔ یہ آلات یہ مشینیں یہ اوزار ان سب کو وجود میں آئے فرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔" مریض (کنور سین) "کس کی کہانی کی بات کر رہے ہو مصلی صاحب! جن کی کہانی لکھتے ہو۔ وہ تو وہیں وہیں کے وہیں کھڑے ہیں۔ میں اپنے باپ کی جگہ

بیٹھا ہوں۔ اور آپ اپنے مصلی صاحب کی بیٹھک پر ہو۔ ترقی کو نسی کہانی نے کر لی؟" کس کی کہانی (گلزار) آج کی اردو کہانی کے اسی لیے کمرہ ماشرف عالم ذوقی نے بھی دہرایا ہے۔ افسانے کو اگر زندہ رہنا ہے تو اسے ہر حال میں اپنے قاری کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا۔ علامتوں کی تلاش کے بجائے گم کہانی کی تلاش پر زور دینا ہوگا۔

★ اویس احمد دوراں — محلہ فیض اللہ چک، دربھنگہ (بہار)

شاعر شمارہ نمبر ۶ میں آپ کی ستّی پر نظمیں پڑھیں۔ پہلی چار نظموں کا عنوان نہیں ہے۔ دو نظمیں "موت سے مکالمہ" اور "روح کائنات کے نام" عنوان کے ساتھ ہیں۔ چار ان صرف چار دل والی نظم میں "حد لمحہ تنہائی" اور "آسماں بحر خامشی" خوبصورت ترکیبیں ہیں۔ اس میں معنوی تہہ داری اور وسعت فکر موجود ہے۔ یہی نظم کسی کے ہجر کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ اس نظم میں زندگی سے بیزاری اور موت کی آرزو ہے۔ تصوف اسی پر زور دیتا ہے۔ خود کو بہت ضائع کر لیا۔ نظم کا حسن اس کے حزنیہ لہجے میں پنہاں ہے۔ مگر حزنیہ ہونے کے باوجود میں اس نظم کو رجائیت کے خانے میں رکھنا چاہوں گا۔ تیسری نظم بھی گہری فکر و بصیرت کی حامل ہے۔ پہلے حصے میں روح اور اس کے بعد مادہ کی روشنی میں نظم تخلیق ہوئی ہے۔ اس میں عینیت کا فلسفہ شاعر کی فکر اور اس کے تصور شعری کی اساس ہے۔ چوتھی نظم "زمین کی تہوں میں" مختصر مگر جامع اور خوبصورت ہے۔ مگر کیا آرزو نے موت اچھی چیز ہے؟ کیا خدا نے اس سے منع نہیں کیا؟ خودکشی اسی لئے تو حرام ہے۔ دنیا میں رہ کر ہی دنیا کی تلاش کرتی چاہئے۔ اس کو سنوارنا اور نکھارنا چاہئے۔ اعلیٰ درجات اور علیحدہ علیحدہ شعور ہر کس و ناکس کے حصے میں نہیں آتے۔ لیکن ماکامل شعرا ان تمام اوصاف سے مملو رہتے ہیں میں کہتا ہوں کہ اس مختصر مگر جامع نظم کا شاعر ان باطنی اوصاف سے محروم نہیں ہے۔ اس کی نگاہ میں بصیرت ہے اور اس کی فکر بالغ ہے۔ اس کے لئے اپنے ذہنی کمالات کا مظاہرہ منتشر دنوں کے ساتھ کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ جو بھی فکری اپروچ ہو۔ وہ زندگی کے لئے ہو، موت کے لئے ہرگز نہیں۔ جس شاعری میں موت کی آرزو مندی ہو وہ اپنے ظاہری و باطنی حسن کے باوجود میری نظروں میں پذیرائی کا حق نہیں رکھتی۔ پانچویں نظم "موت سے مکالمہ" میں بھی شاعر موت کی آرزو کرتا ہے۔ حالانکہ یہ موت (اس کا احساس یا خوف؟) ہے جو شاعر کے جسم کو جو ماہ و سال کی سان پر رکھا ہوا ہے۔ ہر وقت ہر لحہ کم جتی رہتی ہے نظم کے آخری بند میں شاعر کا یہ کہنا درست ہے کہ شب و روز کے تسلسل کا ایک لمحہ خود شاعر ہے اور دوسرا لمحہ موت ہے مگر یہ کہنا کہ "میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں" نہ صرف حکم خداوندی کے منافی ہے۔ چھٹی نظم "روح کائنات کے نام" دراصل نعت پاک ہے۔ اس نظم میں آپ نے نبی کریم کو خوبصورت والہانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ نظم کا دوسرا حصہ بہت جاندار اور خوبصورت ہے۔ "حرا کا تخلیقی عمل بھی جاری ہے" "الطبیعیات" آخری مصرع رجائیت سے معمور ہے۔ (ساتھی پر نظمیں از احمد امام صدیقی) کے طویل تجزئیے سے چند اقتباسات: مذکورہ نظموں پر پسندیدگی کے بہت سارے خطوط موصول ہوئے ہیں۔ اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ طویل تجزیوں کے لئے اور ان خطوط کے لئے ادارہ شاعر شکر گزار ہے اور مزید خطوں کی اشاعت کے لئے

فکر امروز



جو لوگ شعر موزوں نہ کہہ سکیں انھیں یہ تعلیم نہ دیجئے
کہ وہ گنگنا کر یا گا کر شعر کا وزن دیکھ لیا کریں۔ یہ عادت
بہت بُری ہے۔ ایسے شاگردوں (شاعروں) لہٰذا
بیجئے کہ وہ بات اعدہ شعر کی تقطیع کرنا سیکھیں
دو چار مرتبہ تقطیع کرکے بتا دینے سے تقطیع کرنا
آجاتا ہے۔ جن کی طبیعت فطرتاً موزوں ہو، انھیں
بھی طریقۂ تقطیع سے بے نیاز نہ ہونا چاہیئے۔
[دستور الاصلاح ـ صـ۴۴]

سیماب اکبر آبادی

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم
جاری شدہ ۱۹۳۰
بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم
اشاعت کا ۶۴واں سال
علمی ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر

جلد ــــ ۶۴
شمارہ ــــ ۱۲
فون: ۳۵۹۹۰۴

مدیر
افتخار امام صدیقی
●
معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت ✕ روپے

زرِ سالانہ ۶۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۷۵ روپے

شاعر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے
ممالکِ غیر سے
۲۵ ڈالر ـ ۱۵ پونڈ

ماہنامہ شاعر مکتبہ قصر الادب بمبئی سینٹرل پوسٹ آفس پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ ممبئی

محفلے اپنی

۱۹۹۳ء تمام ہوا

شاعر کی ۶۴ ویں جلد کے اس آخری شمارے کے ساتھ ۱۹۹۳ء تمام ہوا۔ اس پورے سال کو ناامیدوں، مایوسیوں اور خوف و ہراس سے تعبیر کیا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ ۱۹۹۱ء اور ۱۹۹۲ء کی شدتوں کو اس ایک ختم سال میں بہت محسوس کیا گیا۔ ہمارے تمام تر خواب جو بکھر رہے تھے۔ انہیں کسی طور سمیٹنے کی سعی میں شاعر کے کتنے ہی موضوعاتی، خوب سیرت شمارے نذر قارئین کئے گئے، یہ امر باعث مسرت ہے۔ ہم عصر اردو نمبر کی ترتیب کے دوران شاعر کو متاثر کئے بغیر ظہور رنگ لہجے، نئی نفسیات — نئی شعری امکانات اردو کی نئی بستیاں شعر — ۵ اسلامی ممالک کی کہانیاں اور گوشۂ سردار جعفری کے علاوہ کئی شماروں کا باطنی معیار موضوع گفتگو رہا ہے۔ اس پورے سال میں شاعر کے مندرجات کے علاوہ ترتیب و تہذیب کا جو حسن روشن کیا گیا اس کی بہت پذیرائی ہوئی ہے۔ اس پذیرائی نے ہمارے حوصلے بلند کئے ہیں۔ ۹۳ء شاعر کا سال کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب شاعر ہر ماہ اپنی نئی سج دھج کے ساتھ شائع ہوگا۔ جنوری ۱۹۹۴ء کا شمارہ قارئین تک بروقت پہنچ سکے گا۔ اب ۹۴ء میں ہم عصر اردو ادب نمبر کے خاص کئی اہم موضوعاتی شمارے قارئین کو پڑھنے کے لئے ملیں گے۔ شاعر کی ترتیب و تہذیب کو ہم خلق کر رہے ہیں۔ ۹۴ء میں شاعر کے لئے کچھ اور بھی منصوبے زیر غور ہیں۔ مگر ان سب کے لئے تمام اردو والوں کا مشورہ اور تعاون ضروری ہے۔ اردو والوں کی حوصلہ افزائی اور پذیرائی میں بھی مزید شدت کی ضرورت ہے۔ اب شاعر محض ایک ادبی رسالہ نہیں رہ گیا ہے۔ ایک تحریک، ایک ادبی روایت بن گیا ہے۔ اور اس روایت کو زندہ و تابندہ رکھنے کی ذمہ داری اردو والوں پر ہے۔ کیا آپ شاعر سے اپنے رشتے کو مستحکم اور محکم نہیں کریں گے؟

اردو کی نئی بستیوں کے قارئین و قلمکار

خدا کا احسان و کرم ہے کہ شاعر ہند و پاک کی سرحدوں سے نکل کر اب پورے گلوب میں پھیل رہا ہے۔ شاعر کی پذیرائی ہو رہی ہے۔ قارئین شاعر میں اضافہ اور نئی بستیوں کے قلمکاروں سے رابطہ بتدریج بڑھ رہا ہے۔ شاعر کے مندرجات، ترتیب و تہذیب اور اداریوں کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عالمی سطح پر اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے نئی بستیوں میں جو کام ہو رہے ہیں۔ وہ حوصلہ افزا ہیں۔ کئی ممالک مثلاً امریکہ، کینیڈا، جاپان، برطانیہ، جرمنی، آسٹریلیا، افریقہ جیسے ملکوں میں علمی و ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں تیز تر ہیں۔ شاعر نے بھی عالمی سطح پر اردو قلمکاروں کو ایک امانی بنانے کی سمت میں اپنی کوششیں تیز کر دی ہیں اور اس اعلان کا عملی روپ ہوگا "اردو کی نئی بستیاں نمبر"۔ ہم نے اپنے طور پر کام کا آغاز کیا ہے۔ شاعر کو اردو کی تمام نئی بستیوں تک پہنچانے کا عزم کیا ہے۔ الحمد للہ خاطر اطمینان بخش تعاون حاصل ہو رہا ہے۔ لوگ ہاتھ بڑھا رہے ہیں۔ اردو کی نئی بستیوں کے قارئین و قلمکار حضرات سے گزارش ہے کہ وہ شاعر کو اپنے حلقۂ اثر میں متعارف کرواتے رہیں۔ اپنی تخلیقات کے ساتھ اپنے قلمکار احباب کو بھی شاعر کی طرف متوجہ کریں۔ اپنے اداروں، انجمنوں اور ان کی سرگرمیوں کو شاعر کے ذریعے بہت دور تک پہنچانے میں ہماری مدد کریں۔ قارئین کا حلقہ وسیع تر کریں۔ شاعر کو ہر ممکنہ تعاون دیں، سرپرستی فرمائیں تاکہ ہم عصر اردو ادب نمبر کے بعد مجوزہ "اردو کی نئی بستیاں نمبر" تاریخی، ادبی، حوالہ جاتی و دستاویزی بن سکے۔ ہم شاعر کے قارئین و قلمکاروں کے بے حد شکر گزار ہیں کہ وہ اپنی معیاری تخلیقات، اپنی مطبوعات اور سالانہ زر رفاقت سے نواز رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ سبھی تیز تر ہو

جلد ۶۴ [۱۹۹۳] شمارہ ۱۲ دسمبر

ڈاکٹر سید عبداللہ
ایم اے، ایم او ایل، ڈی لٹ،
پرنسپل و یونیورسٹی پروفیسر (اردو)
صدر شعبہ اردو و عربی

فون ۲۰۷۳
یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

2631/A-1/uo.
22.7.63

مکرمی السلام علیکم -

آپ کا خط محررہ ۵ جولائی ۱۹۶۳ء موصول ہوا - شکریہ -

" شاعر " کے خاص نمبر کے لئیے فی الحال کوئی مفصل مضون آپ کو ارسال نہ کر سکون گا - اپنے خیالات کا اظہار جس خط مین کیا ہے آپ اسی کے ضمن مین شائع فرما دین - کتاب کے دیباچے کے متعلق عرض ہے کہ مین عموماً دیباچہ نہین لکھتا - مین لاہور سے باہر جا رہا ہون - اگست کے آخر مین آپ کو مطلع کر دون گا - اس وقت کتاب کا مسودہ بھیجدیجئیے مین انشاءاللہ آپ کے ارشاد کی تعمیل کر دون گا -

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہون گے -

فقط و السلام

نیاز مند

سید عبداللہ

سیّد عبداللہ بنام اعجاز صدّیقی

ڈاکٹر سید عبداللہ [پ: ۵ اپریل ۱۹۰۶ء (منگلور ضلع مانسہرہ پاکستان)- م: ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء لاہور] اپنے مزاج و معیار میں خاصے مختلف واقع ہوئے تھے - شاعر کا ایک خاص نمبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا تھا - ڈاکٹر صاحب کا مذکورہ اہم خط ذخیرۂ خطوط میں محفوظ ہے - خط میں جس مسودے کا ذکر ہے وہ کونسی کتاب ہو سکتی ہے، اندازہ نہیں - لوحِ محفوظ (سیماب اکبرآبادی) یا جدید شرح دیوانِ غالب (سیماب اکبرآبادی) دروں سخن (شعری مجموعہ: اعجاز صدّیقی) یا خطباتِ سیماب - جب اعجاز صدّیقی نے کتاب کا مسودہ ارسال کیا تھا کہ نہیں، ڈاکٹر صاحب نے دیباچہ تحریر کیا تھا کہ نہیں؟ - یہ تحقیق طلب ہے -

(ادارہ)



محمود ہاشمی

46-HOBMOOR ROAD-BIRMINGHAM
B10 9BU (U.K)

ادب ہی کیوں

دریائے ٹائین کے کنارے آباد نیو کاسل میں مجھے مقامی ادیبوں کی انجمن کی ایک تقریب میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک نوجوان افسانہ نگار نے افسانہ سنایا۔ اس کے بعد جب افسانے کے حسن و قبح پر بحث ہوئی تو زیادہ زور اس پر تھا کہ یہ افسانہ کہاں اور کس قدر معاوضے پر چھپ سکتا ہے۔ اس کی ٹکنیک اور ادبی حیثیت کا بھی چلتے چلاتے ذکر ہوا۔ لیکن گھوم پھر کر تان اسی پر ٹوٹتی رہی کہ افسانے کی ضخامت میں اگر اتنے الفاظ کی کمی کر دی جائے، اور فلاں کردار کو اجاگر کیا جائے تو فلاں رسالہ اسے زیادہ معاوضے پر قبول کر لے گا۔

میں جو ادب کو بکاؤ مال نہ سمجھنے کی روایات میں پلا بڑھا تھا، ذہنی طور پر بکھر سا گیا۔

انجمن کے اس سال کے صدر کے بارے میں معلوم ہوا، کہ وہ ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں کاپی رائٹر ہیں اور ان کا کل ادبی سرمایہ ان کی وہ تحریریں ہیں جو وہ مختلف اشتہاروں میں لکھتے ہیں۔

ادب اور ادیب کے ادب کے ساتھ رویّے کے بارے میں میری خاصی ذہنی اتھل پتھل ہو رہی تھی۔

یہ ادب ہے کیا؟ اور یہ کیوں سمجھا جائے کہ ادب کی تخلیق صرف افسانہ، ناول یا اس طرح کے پیمانوں ہی میں ہو سکتی ہے۔ اشتہار میں ادب کیوں نہیں ہو سکتا۔ ادب تو ایک عام بات چیت میں بھی تخلیق ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر اپنے زمانے کے بڑے نقاد اور شاعر تھے۔ اُن کی وفات کے بعد ان کے متعلقین نے مختلف رسالوں وغیرہ میں چھپی ہوئی تخلیقات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کے کتابی صورت دینے کا عزم کیا تو پتہ چلا۔ کہ اپنے حلقۂ احباب میں وہ جو ادبی پھلجھڑیاں چھوڑا کرتے تھے، اس کے مقابلے میں ان کا تحریری سرمایہ بہت کم ہے ۔۔ یہی حال پطرس بخاری کا تھا۔ وہ ادب کو "پطرس کے مضامین" کی صورت میں ایک شاہکار دے گئے لیکن اگر وہ اپنی تحریری اساس کی طرف زیادہ توجہ دیتے، تو شاید ہمیں پطرس کے مضامین کی جلد دوم بھی مل جاتی۔ وہ اپنے "ادب پارے" اکثر و بیشتر دوست و احباب کی محفلوں ہی میں بکھیرتے رہے۔ اور اپنے ذہن کی آسودگی کا مداوا اپنی گل افشانیٔ گفتار" میں ہی ڈھونڈا۔ انگریزی سے کالز ونڈ کے ناولٹ سیب کا درخت عصمت چغتائی پر مضمون اور ان کی دوسری گنتی کی تحریریں آندھی کے ساتھ محض گرد راہ ہیں۔

خطابت بھی گفتگو ہی کا ایک انداز ہے۔ جو نسبتاً طویل ہوتا ہے۔ ایک لحاظ سے اچھا خطیب بھی کچھ حد تک ذرا غیر مرتب انداز میں ہی سہی ادب ہی تخلیق کرتا ہے۔ پنجاب کے عطاء اللہ خان بخاری اور حیدرآباد دکن کے بہادر یار جنگ ادیب نہ تھے، لیکن ان کی خطابت کی عظمت میں اس ادبی جوہر کا بھی کچھ نہ کچھ دخل ضرور تھا جو ان کی تقریروں میں چھلکتا تھا۔ انہیں ادبی لحاظ سے تحریری صورت دینے کے لئے تھوڑے سے ریاض اور اپنی ترجیحات کو بدلنے سے وہ ادیب بھی بن سکتے تھے لیکن وہ نہ بنے اور آخر کیوں بنتے؟ زندگی میں ادب ہی سب کچھ تو نہیں۔ ہر شخص کا حق ہے کہ وہ جس طرح چاہے، اپنی تکمیل ذات کرے۔ یہ تو افتادِ طبع، ماحول اور دل کے معاملات ہیں۔ کسی نے گفتگو کا بادشاہ بن کے انجمن آرائی کی یا کسی نے خطیب بن کر ہزاروں لاکھوں کے مجمع پر حکمرانی کی تو یہ اُس کے کمالِ فن ہی کی دلیل ہے۔ زندگی میں محفل آرائی کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے۔ جتنی مثال کے طور پر کوئی مشاعرہ لوٹنے کی۔ تخلیق کے اظہار اور اپنی ذات کے اظہار کے کئی ذریعے ہیں، نت نئے رنگ ہیں اور ان میں کوئی کسی دوسرے سے کم یا حقیر نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر "ادیبوں کی انجمن" کی صدارت کوئی اشتہار لکھنے والا کر رہا ہے تو اس میں کیا قباحت ہے۔ اور اگر کوئی افسانے اس لئے لکھتا ہے کہ وہ اس کا ذریعۂ معاش ہیں تو مجھے اس پر محض اس وجہ سے ناک بھوں نہیں چڑھانا چاہیئے کہ میں اُس سرزمین سے آیا ہوں۔ جہاں ادیب "تانگا پیر" بنا بیٹھا ہے اور یہ سمجھنے کا عادی ہو گیا ہے

کردہ آسمانی صحیفے تخلیق کر رہا ہے جو انمول ہوتے ہیں جن کی پیسوں کی صورت میں کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اور اگر ہوتی ہے تو اُس پر ان کے خالق کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ اس کی آفاقی حیثیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ لین دین کی باتیں دنیاداری کی باتیں ہیں اور ان سے اُسے دور ہی رہنا چاہیئے، اس کے لئے یہی بس ہے۔ کردہ تخلیق کے کیف میں کھویا رہے۔

مشہور ناول نگار اور افسانہ نگار عزیز احمد لندن اسکول آف افریقن اینڈ اورئینٹل سٹڈیز میں لکچرر ہوکر آئے تھے اور اُن کا ایک افسانہ "تیری دلبر کا بھرم" بی۔ بی۔ سی سے نشر ہوا تھا۔ ایک مرتبہ اُن سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا "کیا آج کل آپ کوئی نیا ناول یا افسانہ لکھ رہے ہیں؟" وہ جیسے بلبلا اٹھے، بولے "ہٹاؤ جی، اتنا لکھا، اتنا لکھا، اور ہمیں ملا کیا؟ جو چھوٹی چوٹ نقاد اٹھتا ہے کہتا ہے، فحش نگار ہے۔ کیا فحش نگار کہلانے کے لئے لکھیں؟"

وہ بھرے بیٹھے تھے۔ "اب اردو میں تو ہرگز ہرگز نہیں لکھونگا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ہم اُردو کی خدمت کر رہے ہیں، اُردو بھی تو ہماری کوئی خدمت کرے ہم نے اپنے سب سے بڑے افسانہ نگار پریم چند کو ہندی کی طرف بھگا دیا۔ اُردو والے تو بس زبانی جمع خرچ ہی سے اپنے ادیبوں کا دل بہلاتے ہیں۔ اُردو کی خدمت کرو، بس خدمت کئے جاؤ۔ ہم تو اُردو کی خدمت کرتے کرتے تنگ آگئے۔"

کچھ عرصہ بعد وہ ٹورنٹو یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر بن کر چلے گئے۔ اور پھر اُن سے اُس زمانے میں ملاقات ہوئی جب وہ انگریزی کتاب

STUDIES IN ISLAMIC CULTURE IN THE INDIAN ENVIRONMENT.

کی اشاعت کے سلسلے میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے بات کرنے آئے تھے اور اتفاقات نے مجھے برطانیہ میں اُردو کے پہلے اخبار ہفت روزہ "مشرق" کا ایڈیٹر بنا رکھا تھا۔ وہ 'مشرق' کے دفتر میں آئے، بڑی محبت سے ملے۔ 'مشرق' کے پرچوں کی ورق گردانی کرتے رہے اور کہا "یہ آپ نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ اُردو کی اس سے بڑی خدمت اور کیا ہوسکتی ہے کہ اِس دیارِ غیر میں اِس کا نام بلند کیا جائے۔"

اُردو کی خدمت؟ ـــــ مجھے ان کی پچھلی گفتگو یاد تھی اِس لئے میں چونکا ضرور۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔

جب وہ جانے لگے تو "مشرق" کا تازہ شمارہ اپنے بیگ میں رکھتے ہوئے پھر کہا۔ "آپ نے لندن سے مشرق کا اجرا کر کے اُردو کی بڑی خدمت کی ہے۔" پھر مسکرا کے بولے "ہم پاکستانیوں کا تو کام ہی خدمت کرنا ہے۔ اُردو کی خدمت کرو، پاکستان کی خدمت کرو، اسلام کی خدمت کرو۔"

میں نے اُن سے پھر کبھی یہ نہ پوچھا۔ کہ اُردو کی خدمت کے بارے میں اب اُن کے کیا خیالات ہیں؟ ❀

راہی فدائی

وہ تھا سبک مد اس کے سر کچھ بھی نہ تھا
اس پہ کبھی اس کا ہنر حاوی نہ تھا

تھے مصلحت بردار میری تاک میں
خوش میں بھی تھا میرا ہدف کوئی نہ تھا

تھی عمر بھر روشن سہاروں کی تلاش
معصوم رشتہ خون کا کافی نہ تھا

دو ہی قدم چل کر شرافت گر پڑی
ظلمت کدہ تھا، خوف تھا ساتھی نہ تھا

وہ تھوکتا تھا چاند پر وقتِ غضب
اس کے رویے پہ فلک شاکی نہ تھا

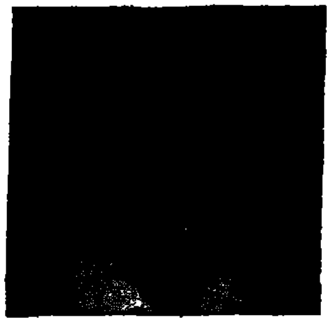
باہر لکھا تھا خون سے "خوش آمدید"
اندر کہیں اخلاص کا داعی نہ تھا

اس کی زبان قابو میں تھی وقتِ نزاع
لیکن قلم جذبات سے عاری نہ تھا

شاداب جذبے دھوپ میں کمھلا گئے
آب و ہوا کا فیصلہ حتمی نہ تھا

راہیؔ تنفر نے کیا جس کا شکار
تھا استعارہ خوف کا وحشی نہ تھا

● ۱۸۴/۶ برہان الدین اسٹریٹ، کڈپہ (اے۔پی)



کرشن کمار طور

عالم مری مثال سے آگے نہیں گیا
میں بھی کسی کمال سے آگے نہیں گیا

موسم مسافرت کا اتارا ہے ہم پہ کیوں
دل بس اس اک سوال سے آگے نہیں گیا

مٹی کے ذائقے سے میں کرتا نہ انحراف
خنجر مرے زوال سے آگے نہیں گیا

دشمن مرے مزاج سے واقف نہیں ابھی
برسوں میں اس خیال سے آگے نہیں گیا

بنتا ہے اس کو نقشِ زوال آخر ایک روز
وہ دل جو احتمال سے آگے نہیں گیا

اک مہرباں کو کرتا بھی شرمندہ کس طرح
زندہ میں اپنے حال سے آگے نہیں گیا

کھلنے تھے تجھ پہ اور بھی اسرارِ جسم طورؔ
تو کیوں شبِ وصال سے آگے نہیں گیا

● ای/۱۳۴، کھانیارا روڈ، دھرم شالہ۔ ۱۷۶۲۱۵



توصیف تبسم

تمام عمر رہی ایک آرزو دل میں
ہو ایک یاد جو بن کر رہے لہو دل میں

وہ ایک جذبۂ بے مہر، وہ عدو میرا
گرفت میں تھا مگر اب ہے دوبدو دل میں

وہ اک ستارہ شبِ غم کی آخری حد پہ
وہ مہرباں نظر جیسے دمد جو دل میں

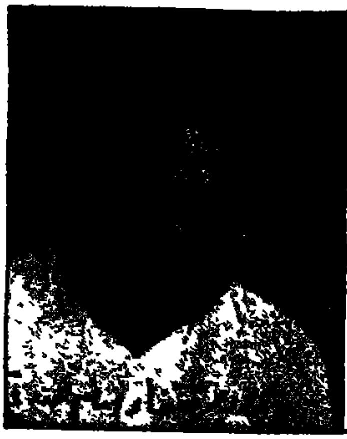
حنائے ناخن و گلبرگ لب کی یاد میں ہم
لہو تو روئیں مگر اب کہاں لہو دل میں

گلِ خزاں تو نہ تھے پھر کہاں گئے آخر
جو کھینچے تھے بہت رنگ و بو دل میں

پرانے زخم ابھی تک تلاش کرتا ہے
بنامِ چارہ گری دستِ حیلہ جو دل میں

ضرور مانگی تھی ہم نے دعائے یکتائی
مگر نہ یوں کہ رہے ایک دشت ہو دل میں

● ۱۶۸۷، اسٹریٹ ۶، رمنا ۹/۳، اسلام آباد (پاکستان)



حسین الحق

صدر شعبۂ فارسی، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا (بہار)

نیو کی اینٹ

سلامت اللہ نے آفس جاتے ہوئے دیکھا تھا پھر دفتری کاموں کی بھیڑ میں بات ذہن سے نکل گئی۔

مگر شام کو جب وہ اپنے گھر کے پاس پہنچا تو بھیڑ ویسی کی ویسی ہی نظر آئی، صبح میں تو آفس جانے کی جلدی بھی تھی اور ایک خیال یہ بھی آیا تھا کہ ہوگا کوئی فنکشن ..... بچے بچیاں بڑی ہو جاتی ہیں تو ان کے تلک یا چھیکا وغیرہ کا فنکشن بھی کیا کم بھیڑ اکٹھی کرتا ہے ..... مگر شام کو بھی بھیڑ ویسی ہی نظر آئی تو اس کو تشویش ہوئی ... کیا کوئی بیمار ہے؟ اب آفس کی جلدی تو تھی نہیں۔ اس نے سائیکل اپنے دروازے پر لگائی اور دو گھر چھوڑ کر تیسرے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا بات ہے بھائی؟ سب خیریت تو ہے؟ پوجن بھائی کہاں ہیں؟ وہ ایک آدمی سے اتنا ہی پوچھ پایا تھا کہ شیو پوجن نظر آ گئے

"آداب شیو پوجن بھائی۔ بڑی بھیڑ ہے؟ صبح بھی دیکھا سب خیریت ہے نا؟"

"ارے آپ نہیں جانتے؟ شیو پوجن جی تو ....."

ایک آدمی بہت لہک کر کچھ بتانے کے موڈ میں تھا کہ اچانک شیو پوجن نے اسے ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے سلامت اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے قدم گھر کے باہر لگے منڈپ سے آگے بڑھانے شروع کر دیئے ..... سلامت اللہ بھی شیو پوجن کے ساتھ آگے بڑھنے پر مجبور تھا ..... اس آدمی کے بولنے، شیو پوجن کے، اس آدمی کو ہاتھ سے ایک طرف کرنے، سلامت اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھنے اور منڈپ سے آگے کی طرف قدم بڑھانے میں شاید دو سیکنڈ کا وقفہ گزرا ہوگا، اس بیچ شیو پوجن چپ رہے پھر بولے ... "نہیں کوئی خاص بات نہیں ... تنگ ہم باہر گئے تھے ..."

شیو پوجن کی اس گفتگو کے درمیان ہی ایک اور آواز سنائی دی جو آدمی سلامت اللہ کو شیو پوجن کے بارے میں کچھ بتانے جا رہا تھا ..... اس سے کوئی اور دوسرا آدمی شاید اطلاعاً کہہ رہا تھا ..... سالا مسلّا ہے!"

یہ جملہ سلامت اللہ نے بھی سنا اور شیو پوجن نے بھی ... دونوں کے بیچ یہ جملہ پہنچتے ہی شیو پوجن زور سے ہنسے ... اور سنایئے کیا حال چال ہے؟ سب خیر خیریت ہے نا"

سلامت اللہ کو اچانک محسوس ہوا کہ وہ تو ننگا ہے ..... مادر زاد برہنہ ..... وہ اور شیو پوجن دونوں گیٹ تک آ چکے تھے

"اچھا شیو پوجن جی .... آداب!" وہ سمجھ نہ پایا کہ اس کے اور شیو پوجن کے بیچ اب اور کون سا لفظ باقی بچا تھا!

"نمستے!" شیو پوجن نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے .... سلامت اللہ تیزی سے اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

شام .... وہ بھی دسمبر کی ..... چاروں طرف اندھیرا جھک آیا تھا ..... بجلی فیل تھی اس لیئے ہر گھر میں لیمپ لالٹین جل چکی تھی، اچانک اسے اپنا گاؤں یاد آ گیا ...... شام ہوتے ہی وہاں بھی ہر گھر میں مٹی کے چراغ اور لالٹین جل اٹھتی تھیں، پوس اور ماگھ کے جاڑے ہیں، گھر کی بیٹھک میں سب جمع ہوتے رحیم چچا، سبطے ماموں، رامیشور چاچا، منگرو کاکا!

اس نے اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک نظر شیو پوجن کے گھر پر ڈالی اور اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔

گھر میں داخل ہو رہا تھا تو گلی میں بچوں کے کھیلنے کی آواز سنائی دی "جے کنہیا لال کی ..."

بچے ماں کے کمرے میں لوڈو کھیل رہے تھے، بڑا لڑکا اپنے ٹیبل پر پڑھ رہا تھا، بیوی کچن میں تھی، دیکھتے ہی عجب انداز میں بولی

"آپ آگئے؟"

"کیوں کیا بات ہے؟" اُسے کچھ حیرت سی ہوئی، وہ روز ہی آتا ہے اور بیوی بنا کچھ کہے بس ہلکے سے مسکرا کر استقبال کرتی ہے.... پھر یہ؟

"نہیں اندھیرا ہو رہا تھا اس لیے جی لگا ہوا تھا۔"

"کیا الٹی پلٹی سی باتیں کر رہی ہو؟ اندھیرا کیا آج ہی ہوا ہے۔؟"

"اچھا اچھا منھ ہاتھ دھو لیجیے چائے تیار ہے" اسے لگا وہ بات کا رخ بدل رہی ہے۔

"ابّو ابّو! شیو پوجن چاچا کے یہاں اینٹ آئی ہے۔" اس کی بیٹی اس کی آواز سنتے ہی دوڑی آئی۔

وہ شاید عادت کے مطابق دن بھر کی اہم خبریں سنانے کے موڈ میں تھی

"چلو جا کے پڑھو۔ لائٹ آگئی ہے" بیوی نے جھپٹ کر اس کا بازو پکڑا اور اپنے کمرے کی طرف دھکیل دیا۔

"پاگل ہوگئی ہو؟ اس طرح کیوں ڈانٹتی ہو؟ اور یہ شیو پوجن کے یہاں اینٹ کیسی؟"

"چپ رہیے۔" اس نے منھ پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے بولی۔ آواز دوسرے گھروں میں بھی جاتی ہے۔ پہلے منھ ہاتھ دھو کر کچھ کھا پی لیجیے"

سلامت اللہ کچھ نہ بولا، وہ تھکن محسوس کر رہا تھا اور بھوک بھی لگی تھی، ٹفن کے وقت کا کھایا کتنی دیر تک پیٹ میں رہتا؟ آج تو کوئی اسامی بھی نہیں پھنسا کہ ناشتہ پانی کرا دیتا.... مگر شیو پوجن، اسے پھر باہر کی بھیڑ یاد آئی....

پھر بیٹی کا جملہ... "اینٹ آئی ہے۔" اور اچانک شیو پوجن کا جملہ بازگشت کی طرح گونجا۔ "تک باہر چلے گئے تھے۔

"سنو!" اچانک اس کی چھٹی حس جاگ اٹھی اور آہستہ سے بیوی کو پکارا

"کیا ہے؟"

"یہ شیو پوجن.... اجودھیا گیا تھا کیا؟"

"جی باہر اسی کی بھیڑ ہے۔" بیوی آہستہ سے بولی اور تھکے قدموں پھر کچن میں چلی گئی۔

بجلی پھر گل ہوگئی تھی اور پورے گھر میں ایک عجیب سناٹا رینگ رہا تھا، آس پاس کے گھروں سے لالٹین کی کمزور لو اس طرح تھرتھراتی اور رینگتی اس کی کھڑکیوں اور شعاع دانوں سے گھر کے اندر چلی آرہی تھی کہ اُسے لگا سانپ کی کینچلی چمک رہی ہے اندھیرا کچھ اور گہرا ہوگیا تھا..... گلی میں بچے کھیل رہے تھے..... "جے کنہیا رام کی!"

"سنو" اس نے پھر بیوی کو پکارا

"جی!"

"تمہارے ابا کے دو تین خط آچکے ہیں نا؟ اب تو بڑے دن کی چھٹی بھی ہونے والی ہے، اپنے میکے ہو کر آؤ۔"

"اچھا چلی جاؤں گی، لیجیے کچھ کھا لیجیے۔" وہ آہستہ سے بولی۔ اس کا انداز دل رکھنے والا تھا۔

اس نے تھوڑا سا کھایا.... وہ کم از کم پانچ گھنٹے کا بھوکا تھا مگر اب بھوک ہی نہیں لگ رہی تھی...... چائے پی کر اس نے سگریٹ سلگائی اور صوفے پر ہی نیم دراز ہو کر ایک کش لیا اور ایک عجب بے خیالی کے عالم میں خیال آیا، مکان ملتا کہاں ہے، مسلم علاقوں میں تو کرایہ آسمان چھوتا ہے، مالک مکان سمجھتا ہے وہ خدا ہے، مکان نہیں دے رہا ہے کرایہ دار کی عمر بڑھا رہا ہے...... مگر کرایہ دار بھی تو بیوی... بچوں کے سبب اور کیا.... لیکن یہاں تو آمدنی محدود، رشوت کے نام پر چائے پانی..... یا کبھی قسمت نے یاوری کی تو دس بیس روپئے..... آمدنی والا ٹیبل اُسے آج تک ملا ہی نہیں ہے۔

ایسے میں وہ سرکاری کوارٹر چھوڑ کر کہاں جاتا؟ اور کوارٹر بھی کیا؟ ال آئی جی فلیٹ..... مگر ایک کلرک کو ال آئی جی ــ نہیں ملتا تو اور کیا ملتا۔

"جے شری رام۔" اچانک ایک زوردار نعرہ گونجا اور وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

"بیٹھیے بیٹھیے۔" بیوی جلدی سے پاس آئی اور آہستہ سے بولی "گھبرانے کی بات نہیں صبح سے ہی چل رہا ہے ادیکھنے والوں کا پھر کوئی نیا غول آیا ہوگا۔"

وہ بیٹھ گیا مگر دل کی دھڑکن تو بڑھ ہی گئی تھی... اس نے محسوس

کیا اس سردی میں بھی ماتھے پر پسینہ آگیا تھا۔

گئی رات تک گلی میں بھیڑ کا احساس ہوتا رہا، رہ رہ کر نعرے سنائی دیتے رہے اور تنہائی کا اگیا بیتال سلامت کے کندھوں پر چڑھا چیٹر چیٹر اس کی کھوپڑی کھاتا رہا۔

"میکے جانے کی بات آپ نے کیوں کی؟" رات میں جب بچے سو گئے تو بیوی نے آہستہ سے پوچھا

"کیوں؟ نعرے نہیں سن رہی ہو؟ نعرے تو عقیدت کے طور پر لگائے جا رہے ہیں۔

"عقیدت کو نفرت بنتے کتنی دیر لگتی ہے؟"

بیوی چپ ہو گئی، رات آہستہ آہستہ گہری اور تاریک ہوتی جا رہی تھی، وہ بہت دیر تک جاگتا رہا، خلافِ معمول جاگتا رہا، ورنہ وہ تو دن بھر کا تھکا ماندہ بستر پر اس طرح گرتا تھا کہ اسے اس کا پتہ نہ چلتا کہ بیوی کس وقت اس کے بغل میں آکر لیٹی۔ مگر آج وہ جاگ رہا تھا، آج وہ کیوں جاگ رہا تھا؟ شیو پوجن؟ مگر اس کے لہجے میں تو کوئی خاص بات نہیں تھی..... اینٹ؟ نہیں جب ۶ر دسمبر گزر گیا تو.... تو پھر؟ اچانک جملہ گونجا... سالا مسّلا ہے اُسے لگا کسی نے اس کے کانوں میں انگارے ڈال دیئے ....ہاں یہی وہ لفظ ہے جو سات گھنٹوں سے اسکی آنتیں کاٹ رہا ہے... پندرہ برس کی کوار تر کی زندگی میں پہلی مرتبہ تھا.... کل تک وہ صرف سلامت بھائی تھا۔!

اچانک اسے اپنے کچھ رشتہ دار یاد آگئے.... اپنا بھائی برکت اللہ، چچا عزّت اللہ، ماموں عبدالستار.... یہ سب لوگ اب کراچی میں تھے۔ ایک مرتبہ ایک شادی میں وہ بھی کراچی گیا تھا ہفتہ گیا اور چلا آیا۔ اس وقت اسے کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی۔

بلکہ.... اُسے یاد آیا.... اس کے ماموں نے جب کہا: سلامت تم بھی یہیں آجاؤ.. تو وہ جھنجھلا کر بولا تھا کیوں؟ کیا میں وہاں بھوکا مر رہا ہوں؟"

"نہیں۔ یہ بات نہیں۔ ماموں نے اُسے سمجھانا چاہا۔" وہاں اس قدر فسادات ہوتے ہیں کہ برا بر تشویش ہوتی رہتی ہے"

"ماموں سنہ ۴۷ کے بعد آپ لوگ تو کم از کم فسادات کا حوالہ نہ دیا کیجئے۔" شاید اُس کے لہجے میں تلخی کچھ زیادہ آگئی تھی۔

ماموں تو ایک دم چپ ہو گئے اور باقی لوگوں نے بھی، جب تک وہ وہاں رہا پھر اس حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔

"کیا ماموں صحیح کہہ رہے تھے؟ اچانک اس کے من میں ایک زہریلا ناگ پھن کاڑھ کر کھڑا ہو گیا۔

ایک منٹ کے لئے وہ کشمکش کا شکار رہا۔ پھر سر جھٹک دیا۔ نان سنس جو کچھ میرے اردگرد ہے، وہی میرا ہے۔"

"ہرے راما، ہرے کرشنا...." اس کے خیال کی رو اچانک ٹوٹ گئی۔ شیو پوجن کے یہاں بھجن شروع ہو چکا تھا۔

"یہ؟" اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا

"یہ تو ایک جھانکی ہے، متھرا کاشی باقی ہے۔" اسے شہر کی دیوار پر لکھا ایک نعرہ یاد آگیا۔

دور سے ایک گاڑی کی آواز فضاؤں کا سینہ چیرتی اس تک پہونچی.... ٹھنڈ کچھ اور بڑھ گئی تھی، باہر یخ بستہ ہواؤں کا زور اپنے شباب پر تھا بیوی بچے لحاف میں گرد مڑائے سو رہے تھے۔ اس نے لحاف سے ذرا سا سر نکال کر دیوار گیر گھڑی دیکھی... دو بج رہے تھے.... پھر نگاہ خود بخود کلنڈر کی طرف چلی گئی۔

۲۰ر دسمبر!.... اچانک ایک عجیب اٹ پٹی سی بات اس کے ذہن میں آئی۔ "کیا ۶ر دسمبر گزر گیا؟"..... پھر اس سے لگے لگے ایک اور مبہم سوال..."۶ر دسمبر کیوں آتا ہے؟...." پھر ایک اور خوف.... کیا ۶ر دسمبر پھر آئے گا؟"..... ایسے ہی اٹ پٹے خیالات کے درمیان وہ اونگھ گیا۔

صبح سویرے بھجن کی آواز سے اُس کی نیند ٹوٹی، بچے اسکول کالج کی تیاری میں مصروف تھے۔ اس نے کھڑکی کھول کر دیکھا۔ شیو پوجن کے یہاں بڑی ہما ہمی تھی۔ شاید بہت سارے لوگ رات یہیں رک گئے تھے، نل کے نیچے منھ دھونے اور نہانے کا سلسلہ جاری تھا، نوکر پورے گھر میں جھاڑو لگا رہا تھا، غالباً نئے مہمانوں کے استقبال کی تیاری تھی۔

"آج بچوں کو نہ جانے دو، اور تم بھی تیار ہو جاؤ میں تم لوگوں کو حیات بھائی کے یہاں چھوڑتا ہوا آفس جاؤں گا سلامت نے بیوی سے کہا

"کیوں؟"

"تم لوگوں کو اکیلا چھوڑ کر آفس میں جی نہیں لگے گا"

بیوی نے ایک منٹ سوچا پھر بولی۔ کالونی میں عزیز بھائی انعام صاحب اور فضل احمد بھی تو ہیں۔ ذرا ان لوگوں سے بھی مشورہ کر لیجئے"

سلامت اللہ کو یہ بات پسند آئی، وہ گھر سے نکلا اور سیدھے نظر جھکائے ان تینوں سے ملنے چلا گیا، وہ تینوں بھی اس نئی صورتِ حال سے اوبے ہوئے تھے مگر چونکہ شیو پوجن کا گھر ان کی لائن میں نہیں تھا اس لئے اتنا زیادہ متاثر نہیں تھے، ویسے فضل احمد کی بات اس کے جی کو لگی کہ "آج دن بھر دیکھ لیا جائے"۔ پھر انعام الحق کہنے لگے "میری چھٹیاں باقی ہیں۔ تم لوگ اطمینان سے جاؤ۔ میں آج چھٹی لے لیتا ہوں"

مگر آفس میں بھی اطمینان کہاں، شیو پوجن بھی اُسی آفس میں تھے جس میں سلامت اللہ تھا اور شیو پوجن کے لوٹ آنے کی خبر سب کو مل چکی تھی بلکہ ایسا محسوس ہوا جیسے آفس والوں میں کل کئی لوگ وہاں ہو بھی آئے کیونکہ گفتگو گھوم پھر کر شیو پوجن تک پہونچ رہی تھی.... اور باوجود یہ کہ سلامت اپنے ٹیبل پر تھا مگر دوسری میزوں پر ہونے والی سرگوشیوں کی طرف سے اپنے کان کیسے بند کر لیتا؟

"مگر بھائی۔ نکالنے والے بھی بڑے گنی تھے۔ ایسا نکالا ہے کہ کہیں سے ٹوٹی نہیں ہے۔"

"ارے تو ہے بھی تو پانچ چھ سو برس پرانی.... تب میٹریل میں بھی تو ملاوٹ نہیں ہوتی تھی"

"شیو پوجن کی تو پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہے"

"کیوں نہ ہو؟ اس کو شکر جیسا سنگھرش تو مان ہی لیا گیا ——— تو کل کو شیو پوجن سوتنتر تا سینانی کی پنشن بھی لے گا جو درشن کرتا ہے وہ دکھشنا بھی دیتا ہے اور پھر دھرم سنگھرش کا ایک انگ بن کر شیو پوجن راتوں رات دھارمک بھی بن ہی گیا!"

"سلامت اللہ کا گھر تو شیو پوجن کے گھر کے پاس ہی ہے اس کا کیا حال ہے؟" ایک بہت مدھم سرگوشی ابھری

"وہی ہوگا، جو ان لوگوں کا سارے دیش میں ہے۔"

سلامت اللہ اچانک چونک اٹھا۔ تو اس رگڑے جھگڑے میں وہ باضابطہ ایک پارٹی ہے؟.... اچانک ہی جیسے پورا منظر نامہ بدل گیا، اب تک وہ صرف اپنے بچوں، اپنے گھر اور اپنی کالونی کے حوالے سے سوچ رہا تھا مگر اسے اچانک احساس ہوا کہ ہاری ہوئی فوج کا ایک سپاہی وہ بھی ہے.... وہ ایک ایسی جنگ میں ہارا ہے جس میں اس نے حصہ نہیں لیا.... اُسے اپنے آپ پر ہنسی بھی آئی اور ترس بھی آیا.... مگر ان کا کیا کروں؟ اُسے اپنے ہم پیشہ یاد آگئے.... ان میں ایک تو شیو پوجن ہی ہے جو ایک ایسی جنگ کا فاتح ہے جس میں اس کا مقابلہ کرنے والا کوئی تھا ہی نہیں..... اور پھر باقی بچے یہ میرے دوست جو ایک ایسی جیت پر خوش ہیں جس میں ان کا کوئی حصہ نہیں... مگر تب اسی پل مولانا عبدالجبار کی ایک تقریر یاد آگئی....

"انہی کی طرح ہم نے بھی مادرِ وطن کو خوب صورت بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی..... گرینڈ ٹرنگ روڈ، تاج محل، لال قلعہ ہم نے بنوایا...."

سلامت اللہ نے اچانک ہی اپنے آپ کو ایک شدید قسم کی نفرت اور ادب کے گھیرے میں گھرتا محسوس کیا..... اب تو حالات سے مگر نفرت کن سے؟ ہم پیشہ دوستوں سے یا مولانا عبدالجبار سے؟ اسے اس سوال کا کوئی صحیح جواب نہ مل سکا۔ بے خیالی میں اس نے میز کی دراز کھولی اور اس میں پڑا انیا ہفتہ وار نکالا جو اس نے چند دنوں قبل خریدا تھا..... اسی بے خیالی میں وہ اس کے صفحات الٹنے لگا... الٹتے پلٹتے وہ ایک صفحے پر رک گیا... پورے صفحے پر ایک رنگین تصویر تھی... ڈھیر سارے لوگ گنبد پر چڑھ کر اس کو توڑتے ہوئے...."

درد کی ایک تیز لہر اٹھی اور جھنجھوڑیا بگولے کی طرح اس کے اندر اندر سر سے پیر تک دوڑتی رہی.... اس نے محسوس کیا اس درد میں دکھ کے ساتھ شرمندگی بھی شامل ہے.... اس کا جی چاہا چیخ چیخ کر رو دے... اس کا جی چاہا کوئی اسے پرسہ دے... تسلی کے دو چھوٹے بول بول ہی دے .. اُسے بیٹی کا جملہ یاد آگیا.... شیو پوجن کے یہاں اینٹ آئی ہے.... اس ایک اینٹ پر نقوش ابھرنے لگے ... سورت میں مادرزاد برہنہ بھاگتی عورتوں کا عکس... بمبئی میں جلتی لاشیں..... اُسے گلزار یاد آگئے.... یہ زندہ بولتے ہیں بیٹی/

جہیز مانگے گی.... پھر خسرو کی جیسے چیخ سی سنائی دی.... ارے لکھو بابل مورے.... ہفتہ وار سے نکل کر وہ تصویر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی اور سینہ پیٹنے لگی.... ظالمو میرے گو ہر نہ چھینو۔"

"سلامت!" اُسے کہیں بہت دور سے آتی ایک آواز سنائی دی اور وہ چونک پڑا۔

اس کا کلیگ فضل احمد اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھے اُسے پکار رہا تھا.... اس نے چونک کر اپنے آپ کو دیکھا۔ ہفتہ وار کھلا پڑا تھا اس کی آنکھیں تر تھیں اور آفس کے سبھی لوگ اُسے دیکھ رہے تھے.... وہ ہڑ بڑا کر باتھ روم کی طرف دوڑا باتھ روم منہ ہاتھ دھو کر نکلا تو اس کی طبیعت بالکل اُچاٹ ہو چکی تھی۔ اسی عالم میں وہ باس کے کمرے میں چلا گیا۔

"سر میں گھر جانا چاہتا ہوں"

"گھر؟" باس نے گھڑی دیکھی، صرف دو بجے تھے

"جی سر۔ میں بہت تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں"

"اچھا جاؤ!" باس نے نہ جانے کیا سوچ کر اجازت دے دی۔

"سلامت!" جب وہ چیمبر سے نکلنے کے لئے مڑا تو باس نے پکارا

"جی سر؟"

کبھی کبھی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے ہونے یا نہ ہونے پر اپنا کوئی اختیار نہیں رہتا، ایسے میں آدمی کو تھوڑا دھیرج سے کام لینا چاہیئے.....

"ہر PLASE TEMPORARY ہوتا ہے"

باس جو کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔ شاید سلامت نے وہ سن لیا اور آہستہ روی آفس سے باہر آگیا۔

مگر وہ تصویر اُسے بار بار یاد آتی رہی، اُس کے اندر پھر پھلا ایک ہل چل سی مچی، کاش وہ وہاں ہوتا تو کم از کم اپنی جان تو دے ہی دیتا.... دہلی میں بیٹھے کئی لوگوں کے لئے بڑی بھدی بھدی گالیاں اُسے یاد آئیں.... ان سبھوں کو تو گولی مار دینا چاہیئے حفاظت کا نعرہ بلند کر رہے تھے.... دھوکے باز کہیں کے.. کم از کم وہ وہاں ہوتا.....

پھر اس نے اپنے کو میدان جنگ میں بڑے زوروں کی جنگ لڑتے دیکھا، اس کے چاروں طرف دشمنوں کا ایک جم غفیر، ڈھالوں، تلواروں نیزوں بھالوں سے لیس اور وہ تنہا، بغیر زین کسے ہوئے گھوڑے پر ایک ٹوٹی تلوار لئے ہوئے.... اس نے دیکھا کہ وہ ٹوٹی تلوار کے سہارے لڑ رہا ہے، دائیں بائیں اوپر نیچے آگے پیچھے سے اس پر حملے ہو رہے ہیں، وہ سب کا سامنا کرتا ہوا، مارتا کاٹتا گنبد پر چڑھ جاتا ہے۔ اور اُن سے ایک دھواں دھار جنگ لڑنے لگتا ہے جو گنبد گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اسی عالم میں گھر آگیا

گھر میں داخل ہوتے ہی جیسے بیوی نے بم پھینک دیا۔ "کئی بار شیو پوجن جی آپ کو تلاش کرتے ہوئے آئے"

"شیو پوجن؟ مجھے کھوج رہے تھے؟"

"جی ہاں!"

"کیوں؟ مجھے کیوں؟"

"پتہ نہیں۔ لیکن کئی مرتبہ آچکے ہیں جا کے مل لیجئے"

"میں کیا کروں گا جا کر؟ پھر کوئی پاگل کچھ نہ کچھ کہہ دے گا..... اچانک اُسے جملہ یاد آگیا..... سالا ملّا!"

"کیوں کسی نے کچھ کہا کیا؟"

"نہیں..... مطلب نعرہ وارہ.... اب وہ بیوی کو اتنی تفصیل کہاں بتاتا!

"نعرہ.... کوئی ضروری ہے کہ آپ ہی کو سنانے کے لئے رہو.... ویسے بہت دیر سے کوئی نعرہ بھی سنائی نہیں دیا ہے اور پھر ایک دو دن کا معاملہ نہیں، ہمیں بھی تو یہیں رہنا ہے جا کے مل لیجئے... دریا میں رہ کے....."

وہ ایک تذبذب کے عالم میں گھر سے نکلا اور شیو پوجن کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

"ارے؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، آفس سے واپسی پر وہ اپنے ہی خیالوں میں ایسا گم رہا کہ شیو پوجن کے گھر کی طرف ذہن ہی نہیں گیا.... وہاں تو منظر ہی دوسرا تھا، منڈپ ہٹ چکا تھا، بھیڑ تقریباً ختم ہو چکی تھی، بجلی بھی بند ہو چکا تھا.. اس کے پکارتے ہی شیو پوجن ہڑ بڑا کر باہر نکلے.... ارے سلامت بھائی، آپ؟ میں آپ کو کئی بار کھوج چکا"

"کیا بات ہے؟"

"آئیے آئیے نا۔" وہ اُسے لئے بیٹھک میں چلے گئے

بدھنا... چائے لے آرے۔" انہوں نے نوکر کو آواز دی

"دیکھئے۔ ایسا ہے کہ ....." تھوڑی دیر ادھر ادھر کی بات کرکے وہ اصل پوائنٹ پر آ ہی گئے ..... میں نے آپ کو بتایا ہی تھا کہ میں باہر گیا تھا۔ پھر آفس میں بھی آپ کو معلوم ہو ہی گیا ہوگا یہ تو آستھا کا معاملہ تھا سلامت بھائی ..... آپ کچھ خیال مت کیجئے۔ آپ دیکھ ہی رہے تھے۔ کتنی بھیڑ تھی .... مگر آج سوچا ملے ہے"..... شیو پوجن تھوڑا ٹھہر کر بولے ..... "اصل میں دلی اور یہاں دونوں جگہ تو ہم لوگوں کی ورودھی پارٹیاں ہیں .... تو اب اسی کو بہانہ بنا کر دھر پکڑ ہو رہی ہے تھانے سے دتو دگاجی کھبر بھجوائے ہیں کہ اوپر کا آدیش ہے .... پالن کرنا ہی ہوگا۔ آج کسی وقت چھاپہ پڑ سکتا ہے .... اب اسے کہاں لے جاؤں ا؟"

اس نے بڑی حیرت سے شیو پوجن کو دیکھا .... سوتنتر تا سینانی دھرم سنگھرش کا انگ؟ دھارمک؟ وہ شیو پوجن کو ایک ٹک تکتا رہا اور وہ بولتے رہے۔ "رمیشور جی، ہری پرساد اگروال صاحب سب نے انکار کر دیا .... اور بات بھی ٹھیک ہی ہے میرے بعد ان لوگوں کے گھروں کی بھی تلاشی ہو سکتی ہے ..... ایسے میں اب لے دے کے آپ ہی بچ جاتے ہیں جہاں تلاشی کا چانس نہیں .... کرپا کر کے اس کو آپ اپنے یہاں رکھ لیجئے۔ میں نے سوچا مگر ادھر ادھر پھینکنے کی ہمت نہیں ہوئی، شری نارائن بتا رہے تھے کہ سی آئی ڈی والے گھوم رہے ہیں، اور پھر..... اتنا کہہ کر وہ رکے، سلامت اللہ کو دیکھا اور آہستہ سے بولے ..... یہ تو آپ کے لئے بھی اتنی ہی مہتو پورن (ضروری) ہے۔

سلامت اللہ کو ہنسی آگئی ..... اس نان سنس میں اب کیا سنس تلاش کیا جائے؟

مگر پھر اچانک گلزار یاد آگئے .... یہ زندہ یونہی ہے بیٹی/جہیز مانگے گی ..... اُسے لگا جہیز دینے کا وقت آگیا ... ایک مرتبہ پھر اسے لگا وہ تصویر نکل کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی ..... پورا سراپا آگ میں جھلس رہا تھا اور شعلے سانپ کی زبان کی طرح لپلپا رہے تھے ..... لاکھوں میں ایک بے کس و دلگیر ہائے ہائے اُسے لگا وہ پکار رہی ہے ... سلامت اللہ .... سلامت اللہ!

"اچھا یہ تو بتائیے .... یہ کس حصّے کی ہے؟" اچانک سلامت اللہ نے ایک بہت ہی غیر متعلق سوال کر ڈالا

"یہ؟ یہ.. نیو کی ہے .... اوپر کا تو زیادہ حصّہ برباد ہی ہو چکا۔" شیو پوجن نے بلا جھجک اور بڑی صفائی سے جواب دیا۔

مگر جب وہ اُسے لئے ہوئے اپنے گھر پہونچا تو بیوی بالکل الف ہو گئی اور بپھری شیرنی کی طرح جیسے اس پر جھپٹ پڑی۔ "آپ کی عقل ماری گئی ہے کیا؟ کل سے اسی کے سبب اتنا پریشان تھے اور آج اسی کو گھر اٹھا لائے؟"

"یہ بہرحال اپنی چیز ہے!" سلامت اللہ نے سمجھانا چاہا

"اپنی چیز ہے؟" وہ غصّے میں ناچ ناچ گئی۔ "کسی کو ناسور یا پھوڑا ہو جائے تو وہ بھی تو اس کی اپنی ہی چیز ہوتا ہے۔ تو کیا وہ اُسے سینت سینت کر اپنے پاس رکھے رہتا ہے؟"

"لاحول ولا قوۃ!" سلامت اللہ بگڑ اٹھا "کیا بے ہودہ باتیں کرتی ہو؟ کہاں ناسور؟ کہاں یہ؟ اسے اس کی حفاظت کرنا اور حرمت بچانا ہمارا فرض ہے"

"اچھا ابو۔ ایک بات بتلائیے۔" اچانک کالج میں پڑھنے والا بیٹا بول پڑا۔ "آپ ہی نے بتایا تھا کہ واجد علی شاہ کے وقت سے یہ ہمارے لئے مسئلہ بنی ہوئی ہے، تو پھر ایک ایسی چیز جو ہر دور میں ہر آدمی کے لئے مسئلہ بنی رہی حد یہ کہ اب شیو پوجن چاچا کے لئے بھی مسئلہ بن گئی اُسے اپنے سر منڈھ لینا کہاں کی عقلمندی ہے؟"

سلامت نے آنکھیں پھاڑ کر سامنے دیکھا .... ہاں اس کا بیٹا ہی تھا مگر دھند گہری تھی اس لئے شناخت مشکل ہو رہی تھی۔

پھر بیوی کی آواز سنائی دی "وہ کوسٹ گہری تھا نہ ..... ان کا کوئی ٹھکانہ کہیں یہ شیو پوجن کے گھر جاتے جاتے ہماری طرف مڑ گئے تو؟ نہ بابا نہ .....؟ بی بی لنڈوری بھلی ..... بیوی بالکل مرنے مارنے پر تلی ہوئی تھی۔

"دیکھو تم لوگ سمجھنے کی کوشش کرو۔" سلامت اللہ کو محسوس ہوا کہ اب وہ اپنے گھر میں بھی ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا ہے۔

"ارے جائیے جائیے۔" بیوی غصّے میں ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ "کسی اور کو جاکے سمجھائیے اور اس سے پہلے خود سمجھنے کی کوشش کیجئے، دہلی میں بیٹھے سورما تو اس آگ سے گھبرائے بھاگ کھڑے ہوئے ہم کم اوقات بندے کس قطار و شمار میں ہیں؟"

یہ بات سلامت کے جی کو لگ گئی .... واقعی جب آگ لگی تو دہلی میں بیٹھے

[باقی صفحہ ۲۶ پر دیکھئے]



جوہر صدیقی

سوکھے پتّوں کی جو آواز سنائی دے گی
زندگی پھر نہ بہاروں کی دہائی دے گی

جانے کیوں اس کے تصور سے خوشی ہوتی ہے
جو ملاقات نہیں دردِ جدائی دے گی

دھوپ سورج کی ہے اور چھاؤں درختوں کی یہاں
زندگی کیا مجھے ہر چیز پرائی دے گی

ان بزرگوں کی بڑائی نہیں ہم کو تسلیم!
موت بھی جن کی ہم ایسوں کو بڑائی دیگی

آج دنیا نظر آتی ہے تمھیں ذرّہ نواز
یہی غربت کے عوض کل تمھیں رائی دیگی

رنگ لائیں گی بزرگوں کی دعائیں جوہر
گرد بیٹھے گی تو منزل کی دکھائی دے گی

● ڈی۔ ۲۶/۲۸ پانڈے حویلی وارانسی ۱۰۰۱-۲۲۱ (یوپی)



انند موہن کیف

یہ سفر بہر صورت، طے مجھی کو کرنا ہے
زخم زخم جینا ہے، سانس سانس مرنا ہے

اپنی کشتیوں کے سب بادباں گرا ڈالو
ایک سمت بہنا ہے، ایک گھاٹ اترنا ہے

چاکِ دل سے دامن کا ربط کیوں بڑھاتے ہو
شہر چھوڑ دینے تک، شہر سے گذرنا ہے

آندھیوں کے رستے میں بستیاں ہیں یادوں کی
دن سمٹ لئے تو کیا، رات بھر بکھرنا ہے

کیف راستے کا وہ موڑ ابھی نہیں آیا
قافلہ امیدوں کا جس جگہ ٹھہرنا ہے

● ۸/۹۲ سول لائنز، جھانسی ۰۰۱-۲۸۴ (یوپی)



اختر آنولوی

نمودِ ذات کی کوشش ہزار ہی کہئے
مگر یہ میری انا کا وقار ہی کہئے

روایتوں کی وضاحت صداقتوں کی امیں
ہر ایک تیغ کو پھر ذوالفقار ہی کہئے

جو آج راہ روانِ طلب کی منزل ہے
مرے سفر کی اُسے رہ گذار ہی کہئے

فرازِ دار کا مجھ کو بنا دیا ہے چراغ
مری زباں جسے خنجر کی دھار ہی کہئے

ہر اہلِ حق سے تقاضہ ہے بادِ گلشن کا
کہ خار کو بھی گلِ نو بہار ہی کہئے

نہ آس پاس شناسا نہ دور دور حبیب
اسے تو ذات پرستی کی مار ہی کہئے

نگارِ زیست نہ ہاتھ آئی نیند کیا آئے
اسیرِ ہجر کو اختر شمار ہی کہئے

● ۵۔ فرینڈشپ مارکیٹ، چوک بازار، ڈھاکہ



احمد سہیل

7520 - COOK ROAD, H-2210
HOUSTON TX 77072 (U.S.A)

ڈیرک الٹن والکوٹ

۱۹۹۲ء میں کسی کو یہ امید نہ تھی کہ جزائر غرب الہند کے ایک نامعروف ادیب و شاعر کو ادب کا نوبل انعام ملے گا۔ ڈیرک الٹن والکوٹ DEREK ALTON WALCOTT غرب الہند کے پہلے ادیب ہیں جنہیں نوبل انعام سے نوازا گیا۔ یہ وہی ادیب ہیں جنہوں نے اپنی پچیس (۲۵) نظمیں چھپوانے کے لئے اپنی والدہ سے دو سو ڈالر لیئے تھے۔ آج اسی ادیب کی جیب میں نوبل انعام سے حاصل ۱.۲ ملین ڈالر کی رقم موجود ہے جو انہوں نے خیرات کے لئے وقف کر دی ہے۔

ڈیرک الٹن والکوٹ ۲۳ جنوری ۱۹۳۰ء میں کاسٹریں سینٹ لوسیا (غرب الہند) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام وارویک تھا جو سرکاری ملازم تھے (غالباً استاد بھی رہے)، ان کی والدہ ایلیس اسکول میں استانی تھیں۔ ڈیرک کا ایک جڑواں بھائی اور بڑی بہن بھی تھی۔ ڈیرک جب ایک سال کے تھے تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ انھوں نے ۱۹۵۴ء میں فے موسٹن سے شادی کی اور ۱۹۵۹ء میں اسے طلاق دے کر مارگریٹ ادتھ میلرڈ سے شادی رچالی۔ ۱۹۹۲ء میں اس سے بھی طلاق ہوئی۔ ڈیرک نے تیسری شادی اداکارہ اور رقاصہ مارسن میٹی اور سے کی۔ ان کی پہلی بیوی سے ایک بیٹا اور دوسری بیوی سے دو بیٹیاں ہیں۔

۱۹۵۳ء میں انھوں نے سینٹ میری کالج لوسیا سے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور پھر یونیورسٹی آف ویسٹ انڈیز کنگسٹن جمیکا میں بھی زیر تعلیم رہے۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بحیثیت شاعر اور ڈرامہ نگار کیا۔ سینٹ لوسیا کالج کے لڑکوں کے سیکنڈری اسکول گرینڈا۔ (کنگسٹن کالج جمیکا) میں استاد کے فرائض بھی انجام دیئے اور ایک جریدے "ٹرینیڈاڈ گارجین" میں بطور آرٹ کریٹک۔ کے مضامین بھی لکھتے رہے۔ ۱۹۵۹ء میں انھوں نے پلسٹ آف اسپین ٹرینیڈاڈ میں تحریک تھیٹر ورکشاپ کی بنیاد بھی رکھی۔ اور وہاں کے ناظم مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۱ء میں کولمبیا یونیورسٹی میں اور ۱۹۸۲ء میں بوسٹن یونیورسٹی میں تخلیقی تحریروں کے وزیٹنگ پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۵ میں ڈیرک نے امریکہ کی رٹگرس اور ییل یونیورسٹی میں بھی لیکچر دیئے۔

اردو میں غرب الہند کی ادبی روایت کو سرے سے تعارف ہی نہیں کروایا گیا، کیوں کہ عموماً یہ ہوتا آیا ہے کہ اردو میں وہی شعر و ادب متعارف ہوا جو نصاب میں شامل رہا یا جہاں اردو بولنے والے آباد ہوئے۔ جزائر غرب الہند میں ہندوستانی نژاد افراد تو موجود ہیں لیکن ان میں اردو ادب اور زبان سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ہاں البتہ امریکہ اور کبھی کبھار یورپ میں غرب الہند کے ادیب و شاعر اکا دکا آتے جاتے رہتے ہیں اور یہاں کے اخبارات و رسائل میں ان کی چیزیں کم ہی چھپتی ہیں۔ ۱۹۷۹ کی بات ہے جب میں امریکہ کی نیگرو شاعری کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اسی حوالے سے مجھے جزائر غرب الہند کی شاعری کا مطالعہ کرنے کا بھی موقعہ ملا اور کئی اچھے شعراء کا بھی انکشاف ہوا جو اردو میں ترجمہ نہ ہو سکے یا ہمارے یہاں کے لکھنے پڑھنے والے ان ادیبوں کی ادبی حیثیت کا اندازہ نہ لگا سکے۔ ان شعراء میں مجھے سب سے زیادہ ڈیرک والکوٹ نے متاثر کیا۔ ان کا نسلی ورثہ انگریزی، ولندیزی اور افریقی ہے۔ لہٰذا ان کے شعری مزاج میں ایک عجیب قسم کی ثقافتی رنگا رنگی بکھری ہوئی ہے۔ جس کا اظہار انھوں نے بڑے ہی دلکش انداز میں کیا ہے۔ وہ ایک افریقی تمدنی احساس محرومی کا شکار ہیں۔ برطانوی تہذیب کے موضوعات ان کے لئے شناسا ہوتے ہوئے بھی اجنبی ہیں۔ اپنی ادبی دور کی ایک

نظم میں انہوں نے اپنے افریقی ورثے اور برطانوی نوآبادیاتی نظام تلے اپنے وجود کو کچلا ہوا محسوس کیا ۔

Where shall I turn, divided to the
vein?
I who have cursed
The drunken officer of British rule,
how choose
Between this Africa and the English
tongue I love?

وہ نوآبادیاتی سامراجی نظام کا شکار ہو کر کیریبین میں کہیں روپوش ہو جاتے ہیں ۔ یہ روپوشی ذہنی جلاوطنی ہے اور نہ ہی انہیں فراری کہا جا سکتا ہے کیوں کہ وہ جس خطۂ زمین سے تعلق رکھتے ہیں وہاں کی دنیا چند ہو میل دور کی دنیا (امریکہ) سے یکسر مختلف ہے ۔ وہ اپنے تصورات یا خوابوں میں اپنے کیریبین کے ماحول کو اٹھا کر امریکہ لے جاتے ہیں اور کبھی امریکی فضا کو اپنے آبائی وطن میں لے آتے ہیں کئی فنکارانہ مغالطے ان کی شاعری میں نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں مثلاً ان کی مشہور نظم ۔

A FARCRY FROM AFRICA FROM IN GREEN NIGHT کو پڑھ کر اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنا جذباتی تعلق افریقہ کے خطے سے جوڑنا چاہتے ہیں، وہ اپنے کیریبین (ناسٹلجیا) سے جہاں انبساط حاصل کرتے ہیں تو انہیں دوسری طرف ایک انجانا سا خوف بھی ہے ۔ جہاں انہیں پالش پالش کیا گیا لیکن اس خطے میں جہاں برطانوی افسر شراب پی کر لوگوں پر حکومت کرتا ہے وہاں شاعری کی ترجیحات تذبذب کا شکار ہو جاتی ہیں اور وہ یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ وہ افریقی تہذیب کو اپنائیں یا انگریزی تمدن کو ۔ جس سے وہ بہت محبت کرتے ہیں ۔ لیکن انہیں اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ وہ اتنے "سیاہ" نہیں کہ اپنے سیاہ فام ہونے پر فخر کر سکیں اور نہ ہی اتنے سفید (گورے) ہیں کہ انہیں اپنے سفید فام ہونے پر ناز ہو ۔ نسلی آمیزش نے ایک ادھوری رجائیت اور ادھوری قنوطیت کی فضا پیدا کر دی ہے ۔ وہ اپنی نظم THE SCHOONER FLIGHT میں احساس دلاتے ہیں کہ انہیں تاریخ سے معذرت کر لینی چاہیے کہ وہ نوآبادیاتی تعلیم (نظام) کی آواز ہیں ۔ "میں ڈلندیزی "نیگرو" (سیاہ فام) ہوں اور مجھ میں ایک انگریز بیٹھا ہوا ہے نہ ہی میرا کوئی بدن ہے اور نہ ہی قوم" ۔ گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ ڈیرک نے اپنی سیاہ فام محرومی پر اتنے آنسو نہیں بہائے جتنا انھوں نے گورے فن سے اپنے شعری احساس کی تزئین کی ۔ انھوں نے کیریبین جزائر کی اسطور، لوک کہانیوں، پریوں شہزادوں کے قصے، زبانی فن، لطائف اور روایتی گیتوں کے تفہیم کو مغربی علوم کے مطالعے کے بعد ایک ذاتی اسلوب اور تجربے کو اپنی تحریروں میں دریافت کیا، وہ معاشی معاشرتی یا سیاسی تبدیلی صرف اپنی شناخت کی حد تک ہی چاہتے ہیں کیوں کہ ان کا اصل بحران ان کی ذات کی گم شدگی ہے جس نے ان کے اظہار کو کہیں کہیں اتنا پیچیدہ بنا دیا ہے کہ ابہام کے بادل مشکل ہی سے چھٹتے ہیں ۔ لیکن شاعر کا فن نہایت ہی حساس ہے ۔ جب نوآبادیاتی نشہ اور نسلی ورثے کی دشواریاں انگریزی زبان کی بلاغت کے بعد اثر انگیز ہو جاتی ہے تو وہ اپنے ہاتھوں سے انگریزی تمدن اور مقامی کیریبین ورثے سے ایک دوسرے سے باہم کر دیتے ہیں اور نہایت فنکاری سے انہیں ایک دوسرے سے جدا بھی کر دیتے ہیں ۔ جس طرح وہ بین الثقافتی تجربے کو اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں اسی طرح وہ سیاسی معاملات کو بھی اپنی شاعری میں مختلف رنگوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ ان کی شاعری کا سیاسی حصہ نعرہ "انقلاب" ہے ۔ ان کی شاعری کی کتاب THE STAR APPLE KINGDOM میں انھوں نے دو بڑی عالمی طاقتوں کی کشمکش میں ترقی پذیر اور پس ماندہ ممالک کی صورت حال کی تصویر کھینچی ہے، خاص طور پر ان کی نظم EGYPT TOBAGO میں "ہیرو یک تعطل" کے احساس کو بیان کیا ہے کس طرح کا استحصالی قوتیں غیر متحرک ہو جاتی ہیں جب ان پر خود اپنے کھوکھلے ہو جانے کا انکشاف ہوتا ہے ۔ یہ نظم دنیا کے تیزی سے تغیر پذیر حالات کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ ڈیرک کی نظمیں اپنی گہری معاشرتی معنویت کا خود ہی جواز پیدا کرتی ہیں وہ نہ زیادہ تجسس پیدا کرتے ہیں نہ قاری کو تجزیہ عمل سے گزارتے ہیں اور نہ ہی ان کی شاعری میں سکوت وجود کی پریشان کن فضا قائم ہوتی ہے ۔

ڈیرک نے شاعری کے علاوہ ڈرامے بھی لکھے۔ ان کے ڈراموں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے ڈراموں میں لسانی جبری موجودگی کا اپنے قارئین یا ناظرین کو شدت سے احساس دلاتے ہیں۔ انھوں نے کبھی کبھی لایعنی ڈرامے سے اپنی وابستگی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ خیالات کو الفاظ پر فوقیت دیتے ہیں اور وہ خیال کو حرکات و سکنات کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔ اداکاروں کی ڈرامائی حرکات نے مکالمے کو خود بخود راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ ان کے یہاں خیال اور اس کے اظہار میں فطری سادگی ملتی ہے وہ جتنے بھی الفاظ مکالمے میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ خیال کے ساتھ پورا انصاف کرتے ہیں۔ ماضی ان کا مسئلہ ہے لیکن امروز و فردا میں بھی وہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں کردار کہانی کو پیش کرتا ہے۔ کردار کو پیش نہیں کرتی۔ مراد یہ کہ کردار اور لفظ کی ان کے یہاں ثانوی حیثیت ہوتی ہے۔ وہ اپنے کھیلوں میں لوک روایت۔ لطیفے اور لوک کہانیوں کو تمثیلوں کی شکل میں پیش کرتے ہیں جو مکمل طور پر " لوک ڈراموں " کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جس میں ماہی گیر قیدیوں، جھینگروں مینڈکوں اور پرندے ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ شیطان بھی اسٹیج پر آ کر عجیب و غریب آوازیں نکالتا ہے جن میں مقامی مسائل کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ان ڈراموں میں شیطان کا کردار کسی اہم کردار سے کسی طور پر کم نہیں ہوتا۔ ڈیرک کا مشہور ڈرامہ DREAM ON MONKEY MOUNTAIN (1971) بھی کیریبین لوک کہانیوں سے متاثر ہو کر لکھا گیا جس میں ضعیف الاعتقادی اور نوآبادیاتی حقائق تفاوت سے پیدا ہونے والے خوف اور وسوسوں کو اس طور پر بیان کیا گیا ہے جہاں ماضی ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ لوک روایت کے خواب بھی نوآبادیاتی دنیا میں آزادی کے عنصر (خیال) کو زندہ رکھتے ہیں۔ نقادوں نے ان کے ڈراموں کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے بہت سے ڈرامے " شاعرانہ " ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے شاعرانہ موضوعات کو نئی وسعت دیتے ہوئے اپنے ثقافتی تجربہ کو ایک تشویش اور سفاکی کی زبان عطا کی لیکن یہ ڈرامہ جتنا دلچسپ ہے اتنا ہی پیچیدہ بھی ہے جس میں کیریبین جزائر کے سیاہ فام لوگوں کے رسوم و رواج معاشرتی پہلوؤں اور ان سے پیدا ہونے والے عمرانیاتی مظاہر کی گہرائیوں میں اترا گیا ہے۔

ڈیرک کے فن پر کئی لوگوں نے لکھا جس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے اس مضمون کو لکھنے کے لئے متفرق مضامین اور ایک مصاحبے سے بھی مدد لی گئی ہے۔ چند اہم ماخذات کی فہرست دی جاتی ہے جو یقیناً اردو تحقیق اور تنقید میں بہتر حوالہ جاتی خبرت ہوگی۔ ڈیوڈ میسن DAVID MASON نے ——— DEREK WALCOTT: POET OF THE NEW WORLD کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو لٹریری ریویو ۱۹۸۴ء اسپرنگ میں شائع ہوا۔ ایرسکن پیٹرز ERSKINE PETERS نے اپنے مقالے THE THEME OF MADNESS IN THE PLAYS OF DEREK WALCOTT میں ڈیرک کے افریقی امریکی تجربے کے ڈرامائی دیوانہ پن کو واضح کیا گیا ہے۔ یہ مضمون کالج ایسوسی ایشن جرنل دسمبر ۱۹۸۸ء میں چھپا۔ RAITERADA لائی ٹریرڈا نے AMERICAN MIMICRY, DEREK WALCOTT کے عنوان سے مقالہ لکھا یہ ڈی سی نیشن ایبسٹریکٹ انٹرنیشنل اکتوبر ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ دی امریکن پوئیٹری ریویو نے مئی۔ جون ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں ویلیری ٹروبلڈ VALERIE TRUEBLOOD کا مضمون بعنوان DEREK WALCOTT شائع کیا اس مضمون میں ویلیری نے ان کے شاعرانہ اسلوب اور لسانی تشکیلات پر نہایت ہی دلچسپ باتیں کی ہیں۔ ڈیرک کے کیریبین ثقافتی وراثت کے تعلق سے جے۔ اے۔ رمسرن J.A.RAMSARAN نے DEREK WALCOTT, NEW WORLD MEDITEREAN POET کے عنوان سے مضمون لکھا اور ان کے تاریخی شعور کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔ یہ مضمون " ورلڈ لٹریچر رٹین ان انگلش " (1) 21 V اسپرنگ ۱۹۸۲ میں شائع ہو چکا ہے۔ ڈیرک کی شاعری کا ایک عام تاثر لئے ہوئے ایک مضمون HISTORY OF DEREK WALCOTT'S VOICE: A STUDY OF POETRY بھی ملتا ہے جو " لٹریری ہاف ایرل " جنوری ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون کو ہنیا ایچ ایچ گودا ANNIAH H-H GOWDA نے لکھا۔ ڈیرک نے خود اپنے فن پر THE POET IN THE THEATRE کے عنوان سے لکھا جو امریکہ کے

جریدے پوئیٹری ریویو ونٹر ۹۱-۱۹۹۰ کی اشاعت میں شامل ہے۔ ڈیرک یوں تو انٹرویو کم ہی دیتے ہیں، لیکن ان کا ایک مصاحبہ پارٹیزن ریویو اسپرنگ ۱۹۹۰ میں AN INTERVIEW WITH DEREK WALCOTT کی سرخیوں سے شائع ہوا۔ انٹرویو لینے والے ڈیوڈ مونٹی نیگرو DAVID MONTEGRE تھے۔ یہ انٹرویو اس لئے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں ڈیرک نے اپنے فن اور اس کے پس منظر پر بڑی تفصیل سے باتیں کی ہیں۔ "کنٹیمپرری آتھرز" نیو ریوژن سیریز نمبر ۲۶ میں صفحہ ۴۱۵ تا ۴۳۸ میں ڈیرک پر بڑا معلوماتی مضمون شامل ہے اس کے علاوہ پچاس سے زیادہ مقالات اور مضامین ان کے فن و شخصیت پر شائع ہو چکے ہیں جن کا احاطہ یہاں ممکن نہیں۔

والکوٹ کے فکر و فن کا اجمالی اشاریہ

ڈیرک والکوٹ کو ان کی تخلیقات پر کئی انعامات اور اعزازات مل چکے ہیں جن کی فہرست یہ ہے

AWARDS HONORS Rockefeller fellowship, 1957, Jamaica Drama Festival prize 1958, for "Drums and Colours"; Guinness Award, 1961, Heinemann Award, Royal Society of Literature, 1966, for *The Castaway*, and, 1983, for *The Fortunate Traveller*, Cholmondeley Award, 1969, for *The Gulf*, Eugene O'Neill Foundation-Wesleyan University fellowship, 1969; Order of the Humming Bird, Trinidad and Tobago, 1969; Obie Award, 1971 for "Dream On Monkey Mountain", honorary doctorate of letters University of the West Indies, 1972, Jock Campbell/*New Statesman* Prize, 1974, for *Another Life*, John D and Catherine T MacArthur Foundation grant, 1981; *Los Angeles Times Book Review* Prize in poetry, 1986, for *Collected Poems, 1948-1984* National Writer's Council Prize, Welsh Arts Council

ڈیرک نے شاعری کے علاوہ خاصی تعداد میں ڈرامے بھی لکھے۔ ان تخلیقات کی تفصیل یہ ہے۔

WRITINGS

POETRY

Twenty-Five Poems, Guardian Commercial Printery, 1948
Epitaph for the Young A Poem in XII Cantos, Advocate (Bridgetown Barbados), 1949
Poems, Kingston City Printery (Jamaica), 1953.
In a Green Night Poems 1948-1960 (also see below), J. Cape, 1962
Selected Poems (includes poems from *In a Green Night Poems, 1948-1960*), Farrar Straus, 1964
The Castaway and Other Poems (also see below), J. Cape, 1965
The Gulf and Other Poems, J Cape, 1969, published with selections from *The Castaway and Other Poems* as *The Gulf Poems* Farrar, Straus, 1970
Another Life (long poem), Farrar, Straus, 1973, 2nd edition published with introduction, chronology and selected bibliography by Robert D Hammer, Three Continents Press, 1982
Sea Grapes, J Cape, 1976, slightly revised edition, Farrar, Straus, 1976
Selected Verse, Heinemann, 1976
The Star-Apple Kingdom Farrar Straus, 1979
The Fortunate Traveller Farrar, Straus, 1981
Selected Poetry selected, annotated and introduced by Wayne Brown Heinemann, 1981
The Caribbean Poetry of Derek Walcott, and the Art of Romare Beardon, Limited Editions Club (New York), 1983
Midsummer, Farrar, Straus, 1984
Collected Poems, 1948-1984 Farrar, Straus, 1986
The Arkansas Testament Farrar, Straus 1987

PLAYS

Henri Christophe. A Chronicle in Seven Scenes (first produced in Castries, St. Lucia, West Indies, 1950, produced in London, England, 1951), Advocate (Bridgetown, Barbados), 1950
Harry Dernier A Play for Radio Production, Advocate, 1951.
Wine of the Country, University College of the West Indies (Mona, Jamaica), 1953
The Sea at Dauphin A Play in One Act (first produced in Mona, Jamaica, 1953, produced in London, 1960; also see below) Extra-Mural Department, University College of the West Indies, 1954
Ione A Play with Music (first produced in Port of Spain, Trinidad, 1957), Extra-Mural Department, University College of the West Indies, 1957
"Drums and Colours An Epic Drama" (published in *Caribbean Quarterly*, March-June, 1961), first produced in Kingston, Trinidad, April 23, 1958
"In a Fine Castle," first produced in Jamaica, 1970 produced in Los Angeles, Calif, 1972
"Ti-Jean and His Brothers" (also see below), first produced in Port of Spain, Trinidad, 1958, produced Off-Broadway at Delacorte Theatre, July 20, 1972
Malcochon, or, Six in the Rain (one-act, first produced as "Malcochon" in Castries, St Lucia, 1959, produced in London under title "Six in the Rain," 1960, produced Off-Broadway at St Mark's Playhouse, March 25, 1969, also see below), Extra-Mural Department, University of West Indies, 1966
"Dream on Monkey Mountain" (also see below), first produced in Toronto, Ontario, Canada, 1967, produced Off-Broadway at St Mark's Playhouse, March 9, 1971
Dream on Monkey Mountain and Other Plays (contains "Dream on Monkey Mountain," "Sea at Dauphin;" "Malcochon,

Goldstraw, Irma. *Derek Walcott: An Annotated Bibliography of His Works*. Garland Publishing, 1984
Hamner, Robert D. *Derek Walcott*. Twayne, 1981
Walcott, Derek. *Collected Poems, 1948-1984*, Farrar, Straus, 1986
Walcott, Derek. *Dream on Monkey Mountain and Other Plays*, Farrar, Straus, 1970

PERIODICALS

Books and Bookmen, April, 1972
Book World December 13 1970
Chicago Tribune Book World, May 2, 1982, September 9, 1984, March 9, 1986
Christian Science Monitor, March 19, 1982, April 6, 1984
Georgia Review summer 1984
Hudson Review, summer, 1984
Literary Review, spring, 1986
London Magazine, December, 1973-January 1974, February-March, 1977
Los Angeles Times, November 12, 1986
Los Angeles Times Book Review, April 4 1982, May 21, 1985, April 6, 1986, October 26, 1986, September 6, 1987
Nation, February 12, 1977, May 19, 1979, February 27, 1982
National Review, November 3, 1970, June 20, 1986
New Republic, November 20, 1976, March 17, 1982, January 23, 1984, March 24, 1986
New Statesman, March 19, 1982
New Yorker March 27, 1971, June 26, 1971
New York Magazine, August 14, 1972.
New York Review of Books, December 31, 1964, May 6, 1971, June 13, 1974, October 14, 1976, May 31, 1979, March 4, 1982
New York Times, March 21, 1979, August 21, 1979, May 30, 1981, May 2, 1982 January 15, 1986, December 17, 1986
New York Times Book Review, September 13, 1964, October 11, 1970, May 6, 1973, October 31, 1976, May 13, 1979, January 3, 1982, April 8, 1984, February 2, 1986, December 20, 1987
New York Times Magazine May 23, 1982
Poetry, February, 1972, December, 1973, July, 1977, December, 1984, June, 1986
Review, winter, 1974
Spectator, May 10, 1980
Time, March 15, 1982
Times Literary Supplement, December 25, 1969, August 3, 1973, July 23, 1976, August 8, 1980, September 8, 1980, September 24, 1982, November 9, 1984, October 24, 1986
Tribune Books (Chicago), November 8, 1987.
TriQuarterly, winter, 1986
Village Voice April 11, 1974.
Virginia Quarterly Review, winter, 1974, summer, 1984.
Washington Post Book World, February 21, 1982, April 13, 1986.
Western Humanities Review, spring, 1977

or, Six in the Rain," "Ti-Jean and His Brothers," and the essay "What the Twilight Says: An Overture"; also see below), Farrar, Straus, 1970
"The Joker of Seville" (musical; also see below), first produced in Port of Spain, Trinidad, 1974
"The Charlatan," first produced in Los Angeles, 1974
"O Babylon!" (also see below), first produced in Port of Spain, Trinidad, 1976
"Remembrance" (three-act, also see below), first produced in St Croix, Virgin Islands, December, 1977, produced Off-Broadway at The Other Stage, May 9, 1979
"Pantomime" (also see below), Port of Spain, Trinidad, 1978, produced at the Hudson Guild Theater, 1986
The Joker of Seville & O Babylon! Two Plays, Farrar, Straus, 1978
Remembrance & Pantomime Two Plays, Farrar, Straus, 1980
"The Isle Is Full of Noises," first produced at the John W. Huntington Theater, in Hartford, Conn, April, 1982
Three Plays (contains "The Last Carnival," "Beef, No Chicken," and "A Branch of the Blue Nile"), Farrar, Straus, 1986

Also author of "Franklin, a Tale of the Islands," "Jourmard," and "To Die for Grenada"

CONTRIBUTOR

John Figueroa, editor, *Caribbean Voices*, Evans, 1966
Barbara Howes, editor, *From the Green Antilles*, Macmillan, 1966
Howard Sergeant, editor, *Commonwealth Poems of Today*, Murray, 1967
O R Dathorne, editor, *Caribbean Verse*, Heinemann, 1968
Anne Walmsley, compiler, *The Sun's Eye West Indian Writing for Young Readers*, Longmans, 1968
Orde Coombs, editor, *Is Massa Day Dead?*, Doubleday, 1974
D J Enright, editor, *Oxford Book of Contemporary Verse, 1945-80*, Oxford University Press, 1980
Errol Hill, editor, *Plays for Today*, Longman, 1985.

Also contributor to *Caribbean Literature*, edited by George Robert Coulthard, *New Voices of the Commonwealth*, edited by Sergeant, and, *Young Commonwealth Poetry*, edited by Peter Ludwig Brent

ڈیرک والکوٹ پر نہ صرف غرب الہند کے رسائل و جرائد میں
مضامین شائع ہوئے بلکہ یورپ اور بالخصوص امریکہ میں ان کی
شاعری اور فن ڈرامہ پر بھی علمی و ادبی سطح پر کئی اہم تنقیدی مضامین
شائع ہوئے ہیں۔ امریکہ کے اخبارات میں بھی صحافیانہ رنگ میں
ڈیرک کی فن کارانہ ثقافت کو ابھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ چند
بنیادی رسائل و جرائد کی تفصیل درج ہے جو ان کے فن و شخصیت
کا احاطہ کرتی ہے۔

BIOGRAPHICAL/CRITICAL SOURCES

BOOKS

Contemporary Literary Criticism, Gale, Volume 2, 1974, Volume 4, 1975, Volume 9, 1978, Volume 42, 1987.
Dictionary of Literary Biography Yearbook: 1981, Gale, 1982

ڈیرک الٹن والکوٹ



ایک محب وطن دوسرے وطن پرستوں سے

تم میری خاموشی کی تعظیم کرو۔
جو دغا فریب کا عادی ہو
وہ بولنے سے گھبراتا ہے۔
مجھ سے اکثر بھول ہوئی ہے۔
شہر میں بارش ہوئی تو اس کے شور کو میں نے
آوازوں کا ایک سمندر سمجھا ہے۔
ان آنکھوں نے کیا کیا دیکھا
مرد سمجھتا تھا میں جن کو
ان کو دیکھا عاجز ہوتے۔ سمٹے۔ سکڑے
جنگلی چوہوں کی مانند
سوراخوں کے اندر چھپتے۔

اور پھر ان سے حیراں ہوتے۔
اور چوہوں کی بے حد قسمیں
گھر کے چوہے۔ کھیت کے چوہے
گرجا گھر کے بھولے چوہے۔
اور وہ شاعر
جو حاصل نہیں کر پائیں گے نیولے کا کردار کبھی۔
اور وہ نیولے
جو مٹنے لگتے ہیں جو سن کر
سانپ کی لہراتی ہوئی بین۔
بدی کے بکر فرسودہ سے مرزدہ
آخر اک دن خوفِ عقوبت سے گھبرا کر
دندانِ خون آلودہ
گردن میں گڑ جاتے ہیں۔

اور چبا کر پوچھتے ہیں
وہی پرانا ایک سوال
میرا مطلب۔ جناب عالی۔ وہی کہ " شر کیا ہے " " انسان "
شر جس سے تاریخ بھری ہے۔
شر کہ دغا احباب کی ہے۔
میری بات سنو۔ دیکھو۔ یہ بڈھے سانپ کی باتیں ہیں۔
میرے لیے یہ سب ہے چشیدہ۔ سب ہے دیدہ
تم میری خاموشی کی تعظیم کرو۔
میں نے دیکھی ہیں تحریکیں
بدل گئیں جو غداری سے وحشت خیز فسادوں میں۔
مجھ سے بیشک بھول ہوئی۔
میں سمجھا یہ آوازیں تھیں
کہساروں میں بوندوں کی۔
ایسی لاکھ زبانوں کی
جو پتھریلی سڑکوں میں بھی گل بن کر کھل جاتی ہیں۔
میں سمجھا یہ نیزے تھے۔ یہ کرسٹل تھے گویائی کے۔
میری کڑواہٹ کو مانو۔
زہر برا تسلیم کرو۔
اب میں کان نہیں دھرتا ان غلط سلط سی باتوں پر۔
جو جذبات سے عاری ہے
جو دغا فریب کا عادی ہے
وہ بھی گویا ہو ہی گیا۔

جبر

زندگی گلاس کی پتیوں کو سدا
یونہی ضرب مسلسل سے مٹی میں دلتی رہے گی۔
اس تشدد کی تعظیم کرتا ہوں
عشق فولاد ہے۔

توڑتے ہیں جو پتھر کو
اور پتھروں میں جو اک وحشیانہ تعلق ہے

دل میں مرے اس کی تعظیم ہے۔
درمیاں ان کے بھی ایک تفہیم ہے۔

میں سمجھ لوں اسے بھی جو یتاق ہے
اک جھپٹتے ہوئے دوڑتے شیر میں
اور ہرنی میں جو ڈر سے مفلوج ہے
جس کی آنکھوں کی دہشت میں ہے
ایک قرار سا۔

پر جو میری سمجھ میں نہیں آئے گا
ہے یہ وحشی کہ جو راقم الحرف ہے
جس کا دعویٰ ہے
وہ مرکز خلق ہے۔

ترجمہ: ضمیر احمد

بشکریہ: دریافت (کراچی)، نومبر ۱۹۹۲ء



ملک زادہ جاوید

گھر میں کیسے کیسے چہرے اُگ آئے
منصب ہاتھ میں آیا رشتے اُگ آئے

بارش کا موسم تو بیت گیا لیکن
اُجلی دیواروں پہ دھبے اُگ آئے

اک تصویر ملی البم میں دھندلی سی
ذہن میں بھولے بسرے لمحے اُگ آئے

پاؤں سمیٹے اپنے جب تاریکی نے
صبح ہوئی گلیوں میں بچے اُگ آئے

مُردہ غزلوں کی اس بنجر دھرتی پہ
اگلی نسلوں کے بھی لہجے اُگ آئے

● معرفت: رضیہ حامد، ۲۵۰ بی، سیکٹر ۱۷ - نوئیڈا - (یوپی)

انور حسین انور

◆

بات تیری نکلتی رہتی ہے
شمعِ احساس جلتی رہتی ہے

اتنی سنجیدگی بھی ٹھیک نہیں
دوستوں میں تو چلتی رہتی ہے

تشنگی ایک لاش کی صورت
اپنا کاندھا بدلتی رہتی ہے

میں سفر جا گنے کا کرتا ہوں
اور یہ رات ڈھلتی رہتی ہے

روز و شب خون لگتے رہتے ہیں
روز حسرت نکلتی رہتی ہے

زندگی وقت کے حصاروں میں
شمع جیسی پگھلتی رہتی ہے

سانس کو نام کو ہے سینے میں
ریل گاڑی سی چلتی رہتی ہے

● ۱۰۰۱- چھتہ علی رضا - میرٹھ (یوپی)



فیاض الدین صاحب

راستہ ختم ہوا پاؤں کا چھالا نہ گیا
تھم گئی گردِ سفر گرد کا ہالہ نہ گیا

دھند کے پار نگاہوں نے سحر دیکھ تو لی
آنکھ والوں کی مگر آنکھ کا جالا نہ گیا

زلف بکھری تو ہر اک سمت کا خوشبو کا سفر
زلف سے اپنا گرفتار سنبھالا نہ گیا

لاکھ کاجل نے سیہ رات کی چادر کھینچی
چشمِ جاناں سے مگر دن کا اجالا نہ گیا

تیرے در پر تو ہے انکار کی زنجیر پڑی
تیری چوکھٹ سے مگر مانگنے والا نہ گیا

پھر یہ تنہائی ترے روپ کا آنچل مانگے
غم کے بادل سے کوئی چاند نکالا نہ گیا

● 243-N. ISABEL ST. H-16
GLENDALE, CA 91206-USA

فیروز مکرجی

62, WINDER MERE ROAD, HASWELL HILL
LONDON - N10 ENGLAND

انمول سرمایہ

ٹوکری رکھ دیتے لیکن کشن سنگھ کے لئے سبز پتوں میں سجا ہوا پھل اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیتے اور جب کشن سنگھ ان کی گود میں آکر بیٹھ جاتے تو بڑے پیار سے وہ پھل انہیں دے دیتے ان کی ماں کمو خان سے شکایت کرتیں "تمہارا لایا ہوا پھل تو کھا لیتا ہے لیکن اس کے بعد کچھ نہیں کھانا چاہتا۔ بڑی مشکل سے کھانا کھلاتی ہوں دیکھو تو کیسے دبلا ہے"

"ابھی تو بچہ ہے بیٹا جب بڑا ہوگا تو سمجھ آجائے گی"

پھر ان کی ماں کی توجہ ٹوکری کی طرف چلی جاتی سبزیاں دیکھ کر وہ خوش ہو جاتیں "بازار والی سبزیوں میں یہ بات کہاں اور تمہاری سبزیوں کی بات ہی اور ہے" وہ اس قسم کا کوئی جملہ کہتیں جیسے وہ سبزیاں و پھل ان کے شوہر کے باغ سے نہیں آئے تھے بلکہ کمو خان ان کے لئے تحفے لے کر آئے ہیں۔

وہ پھر ہنیا لے کر زمین پر بیٹھ جاتیں اور سبزیاں کاٹنا شروع کر دیتیں۔ رسوئیے کو بلا کر ہدایتیں دیتیں کہ کون سی سبزی کب پکے گی۔

روزانہ کے اس چھوٹے سے کام کو انجام دینے میں ان کی خوشی ان کے دل کا سکون ان کے چہرے پر چمک اٹھتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ اب تک نسبتاً معصوم تھے، فرج، فریزر، ٹیلی ویژن حاصل کرنا زندگی کا مقصد نہیں بن گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں اب تک جاذبیت تھی عزیزوں رشتے داروں اور دوستوں سے رشتے اب تک مستحکم تھے۔ اسی لئے کشن سنگھ کی شخصیت اور ان کے خیالات کی داغ بیل جو اس زمانہ میں پڑ گئی تھی ان میں کمو خان کی یادیں بھی اجاگر تھیں۔

جب انہوں نے ہوش سنبھالا تھا کمو خان کو دیکھا تھا۔ کمو خان کی محبت کمو خان کی نگہداشت اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے بچپن کے ان دنوں کی یادیں ان کے لئے بڑی خوشگوار تھیں۔

اس زمانہ میں بچوں کو پڑا نے کام کرنے والے کو صرف نام لے کر پکارنے کی اجازت نہیں تھی۔ انہیں کسی نہ کسی رشتے سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ انہوں نے بھی شروع ہی سے کمو خان کو کمو ما کہہ کر پکارا تھا۔ اس وقت انہیں یہ بھی تمیز نہیں تھی کہ وہ ان کے والد کے ملازم تھے یا ان کے ماموں انہوں نے اپنی والدہ کو انہیں کمو بھیا کہتے ہوئے سنا تھا بعد کو انہیں معلوم ہوا کہ وہ اس گاؤں سے ان کے یہاں کام کرنے آئے تھے۔ جہاں انکی ماں کا میکہ تھا۔ اس زمانے میں صرف اتنا جانتے تھے کہ روز صبح کو کمو خان سبزیوں اور پھلوں کی ٹوکری اس طرح سجا کر لاتے تھے جیسے وہ ان کی والدہ اور ان کے لئے سبزیوں اور پھلوں کا تحفہ لے کر آئے ہیں کیونکہ اس میں کوئی نہ کوئی ان کا پسندیدہ پھل بھی ضرور ہوتا تھا۔ بچپن کی یادوں کے ساتھ وہ ٹوکری بھی ان کی آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔

دروازے میں داخل ہوتے ہی وہ آواز دیتے "کشن بیٹا آؤ میں تمہارے لئے پھل لایا ہوں" اس وقت ان کی عمر شاید تین چار سال کی ہوگی۔ لیکن انہیں اب تک یاد تھا کہ ان کی آواز سنتے ہی سارے کھیل چھوڑ کر بھاگتے ہوئے وہ وہاں جاتے کمو خان پھلوں کی ٹوکری لئے کھڑے ہوتے۔

کمو خان کی آواز سن کر ان کی ماں کہتیں "آؤ بھیا اندر آجاؤ دیکھوں تو کیا کیا لائے ہو" اور وہ ان کے پاس سبزیوں اور پھلوں کی

انہیں یاد تھا جب وہ کمو خان کے ساتھ کہیں جاتے ہوئے کبھی تھک جاتے تو وہ انہیں اٹھا کر کندھوں پر بیٹھا لیتے انہیں محسوس ہوتا کہ وہ یکایک بہت قد آور ہو گئے ہیں اور اگر چاہیں تو ہاتھ اٹھا کر آسمان بھی چھو سکتے ہیں کبھی کبھی چاندنی راتوں میں

کموّخان کے کندھوں پر بیٹھے ہوئے انہیں احساس ہوا کہ کموماما ہی نہیں چندا ماما بھی ان کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔

جب ہوش سنبھالا تو انہیں اپنے خاندان اور کموخان کی زندگی کے فرق کا احساس ہوا۔ اب وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کموخان ان کے ماموں نہیں بلکہ ان کے باغ کے مالی ہیں حالانکہ دوسرے نوکران کی عزت کرتے تھے ان کے والد بھی ان سے برابری کا برتاؤ کرتے تھے اس لئے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کموخان کی زندگی اتنی مختلف کیوں تھی۔ ان کا چھوٹا سا گھر اس قدر سونا کیوں تھا؟

باغ کے ایک کونے میں دوسرے نوکروں کے کوارٹروں سے الگ ایک کشادہ سا کمرہ اس کے آگے برآمدہ جہاں ایک کونے میں کموخان خود ہی کھانا پکاتے تھے ایسا لگتا تھا کہ اس ساری دنیا میں وہ بالکل اکیلے تھے۔ اگر ان کا کوئی خاندان تھا، کسی سے رشتہ تھا تو وہ ان ہی کے خاندان کے ساتھ تھا۔

ایک دن انہوں نے اپنے والد سے پوچھا۔ بابوجی کموخان کا کوئی بیٹا نہیں ہے کیا؟ ان کے والد نے ہنس کر پوچھا تمہیں یہ فکر کیوں پڑ گئی؟

انہوں نے جواب دیا "اگر ان کا بیٹا ہوتا تو ہم باغ میں اس کے ساتھ کھیلتے" تین بہنوں کے بعد وہ پیدا ہوئے تھے اور بڑھ کر اپنے ہم جنس ساتھی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی بہنوں کے ساتھ گڑیا گڈوں کے کھیلوں میں دلچسپی کم ہوتی جا رہی تھی۔ تینوں بہنوں کی محبت اور شفقت کے باوجود وہ کبھی کبھی اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنے لگے تھے "بابوجی ان کے گھر میں تو کوئی اور نہیں رہتا ہے وہ تو بالکل اکیلے ہیں۔ کیا ایک بھی بیٹا نہیں ہے ان کا" ۔ انہوں نے کہا ______ "ہے کیوں نہیں" ان کے والد نے جواب دیا۔ "تو کہاں ہے؟" "یہ تم ان سے ہی پوچھو" اور موقع ملتے ہی انہوں نے کموخان سے پوچھا۔ کموماما تمہارا بیٹا کہاں ہے۔؟

کموخان کھرپی لئے ہوئے سبزی کی کیاریوں کی نلائی کر رہے تھے۔ ان کا ہاتھ ایک دم رک گیا لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور پھر اور بھی تیزی سے صفائی شروع کر دی انہوں نے پھر سوال کیا مگر کموخان اسی طرح خاموشی سے کام کرتے رہے۔ جیسے انہوں نے سوال سنا ہی نہیں۔ وہ جانتے تھے کہ جب بڑے بچوں کی کسی بات کا جواب نہیں دینا چاہتے، تو وہ خاموش ہی رہتے ہیں اسی لئے انہوں نے دوبارہ سوال نہیں دہرایا۔ لیکن جب وہ بڑے ہوئے تو معلوم ہوا کہ کموخان ہمیشہ اکیلے ہی نہیں تھے۔ ایک دن وہ اپنی نئی نویلی دلہن کو لے کر آئے تھے اور ان کا سونا گھر بس گیا تھا۔ گاؤں سے رشتہ داروں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی ان کا چھوٹا بھائی آیا ہوا تھا۔ ایک دن وہ حسب معمول کھانا کھانے گھر گئے لیکن بڑی جلدی باہر نکل آئے ان کے چہرے پر وحشت چھائی ہوئی تھی۔ دو دن کے لئے وہ غائب ہو گئے جب واپس آئے تو ان کا بھائی گاؤں واپس جا چکا تھا وہ سیدھے ان کے والد کے پاس چلے گئے نہ جانے ان دونوں میں کیا باتیں ہوئیں لیکن کچھ دیر میں ایک نوکر کے ساتھ ان کی بیوی کو گاؤں بھیج دیا گیا اور اس کے بعد نہ وہ کبھی واپس آئیں اور نہ کموخان ہی گاؤں گئے۔

نہ جانے کیا زخم انہوں نے کھایا تھا کہ اپنے خاندان اپنے رشتہ داروں سے وہ ایسا ڈر گئے تھے کہ دوبارہ قریب آنے کی انہیں ہمت نہیں تھی اور اب ان کا رشتہ کسی سے تھا تو وہ کشن سنگھ سے تھا ان کے والدین سے تھا۔ ان کے خاندان سے تھا ان کی ماں بھی کہا کرتی تھیں "ارے کمو بھیا تو اپنے ہی ہیں یہ بھی تو ایک زمانہ میں ہماری طرح ٹھاکر تھے۔ یہ گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں تھے۔ وہ تو ان کے باپ نے مقدموں میں ساری جائداد لٹا ڈالی تمہارے بابو آپ ہی ان کے گاؤں سے بلا کر لائے تھے اور اتنا بڑا باغ ان کے سپرد کر دیا وہی سب کچھ دیکھ بھال کرتے ہیں ہمارے سوا ان کا ہے ہی کون"

" ماں انہوں نے اپنی بیوی اور بچے کو کیوں چھوڑ دیا"

"پاگل ہیں اور کیا کہیں" وہ بولتی اور بات بدل دیتی۔ ایک عرصے بعد انہیں معلوم ہوا کہ گاؤں جانے کے سات ماہ بعد ان کی بیوی کے بیٹا ہوا بالکل باپ کی شکل لیکن کموخان نہ کبھی گاؤں گئے اور نہ بیٹے کی شکل دیکھی۔ حالانکہ ان کے بیوی بچے دونوں ان ہی کے یہاں رہتے تھے۔ نہ انہوں نے ان کو طلاق دی اور نہ انہوں نے ہی مانگی وہ لوگ کہتے تھے "ہم ٹھاکروں کی اولاد ہیں ہمارے یہاں طلاقیں نہیں ہوتیں" ایک زمانہ گزرنے کے بعد کشن سنگھ کو احساس ہوا کہ کموخان کی بیوی کے متعلق ان کی ماں اور باپ کی خاموشی میں کیسی وفاداری اور کموخان کے احساسات کے لئے کیسی عزت چھپی ہوئی تھی جو دکھ ان کو ہوا تھا اسے دونوں ہی جانتے تھے اور جو رشتہ ان کے ساتھ تھا اس کا یہی تقاضہ تھا کہ ان کے راز کو فاش نہ کیا جائے۔

کشن سنگھ بچپن کی حدوں کو پار کر کے جوانی کی منزل پر آئے ہی

تھے کہ سارے دیش میں قیامت آگئی۔ دیش دو ٹکڑوں میں بٹ گیا اور آزادی کے ساتھ ساتھ تباہی اور بربادی بھی آئی اس طوفان میں نہ جانے کتنی جانوں کے ساتھ کتنے گھر لٹ گئے رشتے ختم ہو گئے۔ کتنی قدریں کھو گئیں۔ کسی طرح ان کا چھوٹا سا علاقہ پوری طرح اس تباہی کی زد میں نہیں آیا زیادہ تر آبادی ہندوؤں کی تھی فسادات کی خبریں دوسرے شہروں اور گاؤں سے آتی رہیں۔ ایک دو چھوٹے چھوٹے فسادات ہوئے لیکن خون خرابہ نہیں ہوا کشن سنگھ کے والد خود کانگریس کے ممبر اور اس علاقے کے لیڈر بھی تھے۔ لیکن وہ ان کانگریسیوں میں تھے جنہوں نے اپنے آپ کو مذہبی تعصبات سے بلند رکھا تھا اور یہ ان کا اثر بھی تھا کہ ان کا علاقہ تباہی سے بچ گیا۔

زمانہ گزر گیا اور کشن سنگھ نے وکالت پاس کرکے باپ کی پریکٹس سنبھال لی۔ چالیس سال کا طویل زمانہ تیزی سے گزر گیا کتنی تبدیلیاں آئیں کتنے گھر بگڑے کتنے بنے، پرانی قدروں کی جگہ نئی قدروں نے لے لی۔ اس کا اثر کشن پر بھی پڑا ان کے خاندان میں پہلی بار ان کی لڑکیاں اعلیٰ تعلیم کے لئے یونیورسٹی گئیں۔ نوکریاں کیں۔ اور شادی کے بعد اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اور والدین کے انتقال کے بعد گھر میں میاں بیوی ہی رہ گئے تھے اور گھر سونا سونا ہو گیا۔

ماں باپ کسی کے ہمیشہ زندہ نہیں رہتے لیکن ان کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ہم خود موت کے زیادہ قریب آ گئے ہیں۔

جیسے وہ دونوں ہمارے اور موت کے درمیان راستہ روکے ہوئے کھڑے تھے۔ اور اب اس کا سامنا ہمیں خود ہی کرنا پڑے گا۔ کچھ یہی احساسات کشن سنگھ کے بھی تھے ان کے دل پر غم کا بوجھ ابھی ہلکا نہیں ہوا تھا۔ کہ سارے ملک میں ایک بار پھر فسادات شروع ہو گئے۔ لیکن فضا اس بار دوسری ہی تھی اس بار نعرہ ہندستان اور پاکستان کا نہیں تھا بلکہ رام جنم بھومی کی حفاظت کا سوال تھا۔ وہ جگہ جس کا نشان سینکڑوں سالوں سے شاید ہی کسی کو معلوم تھا اب ہر ایک ذہن میں بابری مسجد اس طرح ابھری تھی جیسے سمندر سے کشتی ابھری ہوں۔ نعرے بلند کئے جا رہے تھے کہ ہر ہندو کا دھرم رام جنم بھومی کی رکھشا کرنا ہے۔ بابری مسجد کو توڑ کر وہاں رام مندر بنانا ہے اس کے بنانے میں کتنے ہی گھر بگڑ جائیں گے کتنے ہی بے گناہ مارے جائیں اس کی فکر رام جنم بھومی کے حفاظت کرنے والوں کو نہیں تھی شہر میں ہر طرف افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔

لوگ سہمے ہوئے تھے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے محلوں میں اور مسلمانوں نے ہندوؤں کے محلے میں آنا جانا بند کر دیا تھا۔ جیسے شہر میں چھوٹے چھوٹے پاکستان اور ہندوستان بن گئے ہوں کشن کے پرانے مسلمان دوستوں نے مصلحتاً ان کے یہاں آنا بند کر دیا تھا۔

زبان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن کشن سنگھ سمجھ گئے تھے کہ کیا وجہ ہے۔ وہ خود ان کے یہاں آتے جاتے رہے۔ اسی طرح ان کی خاطر مدارات ہوتی رہی، لیکن ماحول بدل گیا تھا اس میں زندگی نہیں رہی تھی۔ صرف سائے باقی رہ گئے تھے۔ مگر بڑھتے ہوئے اندھیروں میں وہ بھی کھوتے جا رہے تھے۔

ساری تبدیلیوں کے باوجود گھگو خان اسی طرح اپنی پرانی وضع پر قائم تھے۔ جہاں گہ سودا سلف خریدا کرتے تھے، جہاں سے وہ اپنے حقے کے لئے تمباکو لاتے تھے انہیں دوکانوں پر وہ اب بھی روزانہ جاتے تھے کئی بار کشن سنگھ کو خوف بھی ہوا کہ کہیں ان پر کوئی حملہ نہ کر دے انہوں نے کہا بھی "گھگو ماما تم آج کل زیادہ باہر نہ جایا کرو۔ شہر کی آب و ہوا خراب ہے نہ جانے کب تم پر کوئی حملہ نہ کر دے تمہارا سودا سلف کوئی نوکر لا دیا کرے گا"

"کیسی باتیں کرتے ہو بیٹا، میں مرد ہوں عورت نہیں کہ گھر میں بند ہو جاؤں اور میں تو بوڑھا آدمی ہوں نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں سب مجھے جانتے ہیں کسی کی مجال ہے کہ مجھ پر ہاتھ اٹھائے بیٹا ہم میواتی ٹھاکروں کی اولاد ہیں۔ کسی سے ڈرتے نہیں"

کشن سنگھ نے ان پر محبت آمیز نظر ڈالی۔ وہ بوڑھے ہو چکے تھے لیکن محنت کی وجہ سے ان کا جسم اب بھی گٹھا ہوا تھا اسی طرح تن کر اب بھی چلتے تھے ان کی چوڑی ہڈی اور دراز قد دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اب تک بڑھاپے نے انہیں مات نہیں دی ہے۔ گاؤں والوں کی طرح وہ بھی دھوتی کرتا پہنا کرتے تھے ان کی بول چال وہی تھی جو ان کے گاؤں والوں کی تھی مگر ان کی سفید داڑھی دیکھ کر آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ مسلمان ہیں کشن سنگھ کو خیال آیا کہ یہی سفید داڑھی جو ان کے چہرے کو پر وقار بناتی تھی کسی کو ان پر حملہ کرنے کے لئے اکسا بھی سکتی تھی لیکن وہ جانتے تھے کہ ان سے کچھ کہنا بیکار ہے وہ بڑے اتنہا ضدی انسان تھے ایک دفعہ جو فیصلہ کر لیں اس سے ہٹنا جانتے ہی نہیں تھے اپنے اٹل فیصلے کے مطابق انہوں نے ساری زندگی اکیلے ہی گزار دی۔

اس دن کشن سنگھ ابھی سو ہی رہے تھے کہ ان کے ہیرا سنگھ نے آکر بتایا کہ باغ سے ایک مالی گھبرایا ہوا آیا ہے کہتا ہے کہ کمو خان شام کو سودا لینے بازار گئے تھے اب تک واپس نہیں آئے کوئی نہیں جانتا کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ کشن سنگھ گھبرا اٹھے مالی کو بلا کر اسے ڈانٹنے لگے "ساری رات انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی اس سے پہلے کیوں نہیں آئے بیوقوف کہیں کے وغیرہ وغیرہ" مالی بیچارہ کم عمر لڑکا تھا نیا نیا گاؤں سے آیا تھا صبح صبح اٹھ کر کمو خان کے کمرے میں تالا لگا دیکھ کر گھبرایا ہوا ان کے پاس آیا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا قصور کیا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ صاحب کا غصہ اس پر نہیں ان لیڈروں پر تھا جو خاموشی سے سب دیکھ رہے تھے۔ اور اس کے خلاف آواز اس لئے نہیں بلند کر سکتے تھے کہ اگلے الیکشن میں ووٹ کم ہو جائیں گے۔ دھرم کے ان رکھشکوں پر تھا جو رام جنم بھومی میں مندر بنانے بنانے اس نیو کو کھود رہے تھے جو گاندھی جی نے ڈالی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ انہیں اپنے اوپر غصہ تھا۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ غفلت کی وجہ سے وہ اپنی ماں کی چھوڑی ہوئی امانت کی حفاظت نہیں کر سکے تھے۔ کمو خان ان کے مائیکہ کا رشتہ دار تھا جہاں ان کے بچپن کی خوشگوار یادیں اب بھی بسی ہوئی تھیں کمو خان جنہیں انہوں نے ہمیشہ چچا کہہ کر پیار سے پکارا تھا اور جنہوں نے ان سب کو ہی اپنا لیا تھا۔

دن کے بارہ بج گئے تھے کشن سنگھ کچھ کھائے پیئے بغیر آفس میں ٹہل ٹہل کر پولس اور ضلع کے حاکموں کو فون کر کے ان کے جواب کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کی بیوی نے انہیں سمجھایا بھی "گھبراتے کیوں ہو بوڑھے آدمی ہیں ہو سکتا ہے راستے میں طبیعت خراب ہو گئی ہو اور کسی دوست یار رشتہ دار کے یہاں رک گئے ہوں۔" "تم بچوں کی طرح کیوں بول رہی ہو اس شہر میں ہمارے سوا ان کا یہاں کوئی نہیں ہے" انہوں نے چڑ کر جواب دیا اور بے چینی سے ٹہلتے رہے۔

پھر فون کی گھنٹی بجی اس سے پہلے کہ ان کا کلرک فون اٹھاتے انہوں نے خود ہی اٹھا کر کہا۔ "ہلو میں کشن سنگھ بول رہا ہوں" فون پر بات ختم کر کے انہوں نے کلرک سے کہا "تھانے دار کا فون تھا۔ ایک لاش شہر کے باہر پڑی ہوئی ملی ہے اس کی شناخت کے لئے مجھے بلایا ہے گھر جا کر بتا دو" پھر اسی طرح رات کے گندے کپڑے پہنے تھانے چلے گئے جب سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ کمو خان رات بھر غائب رہے تھے انہیں یقین تھا کہ وہ اب زندہ نہیں ہیں۔ لیکن تھانے میں لاش کے چہرے سے چادر ہٹائی گئی تو بے ساختہ ان کے منہ سے چیخ نکل گئی "رام رام" انہیں توقع نہیں تھی کہ ان کی لاش کے ساتھ اس طرح بے حرمتی کی جائے گی۔ ان کی سفید نورانی داڑھی کو جلایا گیا تھا جس کی وجہ سے ان کی پلکیں بھوئیں سب جل گئی تھیں اور چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ کشن سنگھ کا گلا رندھ گیا۔ ان کی آواز کہیں کھو گئی مگر ان کے آنسوؤں کا باندھ ٹوٹ گیا۔ کشن سنگھ جنہوں نے اپنے ماں باپ کے غم کو بڑے وقار سے سہا تھا جنہوں نے ان کی یاد میں صرف اپنے کمرے کی تنہائی میں آنسو بہائے تھے ——— اب کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے اس طرح رو رہے تھے جیسے آج ان کے والدین اور کمو خان کی موت ایک ساتھ ہوئی ہے۔ اور وہ بالکل اکیلے رہ گئے ہیں ان کی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھوں کے سامنے وہ ساری تصویریں گزر رہی تھیں جنہیں بڑے قیمتی خزانے کی طرح انہوں نے اپنے دل اور ذہن کے گوشوں میں محفوظ کر لیا تھا۔ ان کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسوؤں کا تار ٹوٹ ہی نہیں رہا تھا۔ کلرک اور ڈرائیور دونوں ہی خاموش بیٹھے ہوئے تھے ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کو ایک نوکر کے مرنے کا اتنا غم کیوں ہے اور کیا کہہ کر کو دلاسہ دیا جائے۔

جب تک کار گھر آکر رکی کشن سنگھ نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا تھا۔ کلرک نے پوچھا "صاحب کمو خان کے گاؤں خبر بھجوا دوں"

"ہاں" انہوں نے مختصر سا جواب دیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولے "کورٹ میں خبر دے دو کہ آج کے مقدموں کی تاریخ بڑھا دی جائے، کلرک ہکا بکا ہو کر ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ سوائے اپنے والدین کی موت کے آج تک کورٹ سے غیر حاضر نہیں ہوئے تھے۔

شام ہونے سے پہلے ہی گاؤں سے آنے والے عزیزوں کو لاش مل گئی پولس والے چاہتے تھے کہ جلدی ہی اسے دفنا دیا جائے رشتہ داروں میں کمو خان کا بیٹا بھی شامل تھا۔ اسے دیکھ کر کشن سنگھ کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ کمو خان کو دیکھ رہے ہیں اس کی شکل اس کے جسم کی ساخت اس کا باتیں کرنے کا انداز سب اپنے باپ کا ہو بہو چربہ تھا۔ لیکن اس باپ کو شاید اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کشن سنگھ کی طرح کبھی وہ اس کی گود میں نہیں بیٹھا تھا۔ نہ اس کے کندھوں پر بیٹھ کر چاند کے ساتھ ساتھ چلا تھا۔ نہ وہ اس کے لئے میٹھے میٹھے پھلوں کے تھیلے لائے تھے بلکہ اس باپ کی ضد اور غصے کی بنا پر اپنی

پیشانی پر ملک کی بد نامی کا داغ لے کر ساری عمر گزار دی تھی لیکن آج وہ اپنے جوان بیٹوں کو لے کر اس باپ کی لاش لینے آیا تھا جسے اپنے خاندان، اپنی اولاد کو رد کر کے ان کے والدین اور ان کو اپنا لیا تھا۔ اس رشتے کو وہ کس نام سے یاد کریں یہ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

جب انہوں نے کفن دفن اور دوسرے اخراجات دینے کے لئے کہا تو کھوفان کے خاندان والوں نے اسے رد کر دیا لاش کو تھانے سے مسجد لے جایا گیا غسل دینے کے بعد کفن پہنا کر چہرہ ہمیشہ کے لئے ڈھک دیا گیا تھا۔ کیونکہ وہ اتنا بگڑ گیا تھا کہ پہچاننا بھی مشکل تھا نماز جنازہ میں نہ کشن سنگھ شریک ہو سکتے تھے اور نہ ان کے گھر والوں نے انہیں جانے دیا۔ کھوفان کی موت نے شہر اور آس پاس کے گاؤں کے مسلمانوں کے دل میں غصے اور انتقام کی لہر دوڑا دی۔

صرف اس لئے نہیں کہ ایک بے گناہ اور معصوم شخص کو قتل کیا گیا تھا بلکہ جس طرح ان کی بے حرمتی کی گئی تھی اس سے وہ سب محسوس کر رہے تھے کہ ان کی بھی بے حرمتی ہوئی ہے۔ یہی جذبہ کشن سنگھ کے دل میں بھی شعلوں کی طرح بھڑک رہا تھا کھوفان صرف ان کے باغ کے مالی ہی نہیں وہ بھی ان کی طرح ٹھاکروں کی اولاد تھے انہیں ٹھاکروں کا خون ان کی رگوں میں اٹھا اٹھ کر آج انہیں بدلہ لینے کے لئے پکار رہا تھا لیکن وہ کس سے بدلہ لیں؟

اس گمنام قاتل سے جس نے کھوفان کی لاش کی بے حرمتی کر کے ان کی اور ان کے خاندان کی بھی بے حرمتی کی تھی۔ ان کے دھرم کے رکھشکوں سے جنہوں نے یہ آگ بار بار بھڑکائی تھی یا ان لیڈروں سے جو خاموشی سے سب دیکھ رہے تھے۔ نہ جانے کتنے جذبات ان کے دل میں طوفان کی طرح بھڑک رہے تھے اور وہ سب سے پیچھے پیچھے کھوفان کے جنازے کے ساتھ ساتھ قبرستان کی طرف چلتے رہے جنازہ بغیر کسی فساد کے آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا حفاظت کے لیے کافی تعداد میں پولس ساتھ تھی۔ مگر ہر ایک جانتا تھا کہ یہ امن وقتی ہے وہ غصہ جوان لوگوں کے دلوں میں بھی تھا جنہوں نے کھوفان کا نام بھی کبھی نہیں سنا تھا نہ جانے اس کی زد میں کون کون آئے گا یہ نہیں معلوم تھا کشن سنگھ جنازے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے جا رہے تھے انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ اتنے بڑے ہجوم میں وہ بالکل اکیلے ہیں اور وہ صرف کھوفان کو ہی دفن نہیں کرنے جا رہے تھے ان کے ساتھ ان قدروں ان پیار کے رشتوں ان وضعداریوں کو بھی دفن کرنے جا رہے تھے جو سینہ بہ سینہ ایک انمول سرمائے کی طرح انہیں ملی تھیں۔ ❁

بقیہ صفحہ ۳۴ نیو کی اینٹ

سورما بھی تو صرف دور دور ہی سے "آگ آگ" کا شور مچاتے رہے۔ مگر قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے؟ جب وہ باہر آیا تو دیکھا کہ شیو پوجن کے گھر والے کہیں روانہ ہو رہے ہیں۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اس نے شیو پوجن کے لڑکے سے پوچھا جو گھر میں تالا لگا رہا تھا۔

"جی۔ ہم لوگ موسی کے یہاں کاشی جا رہے ہیں۔"

"اور شیو پوجن جی؟"

"وہ پہلے ہی اسٹیشن جا چکے۔" اتنا کہتے ہوئے لڑکا بھی رکشے پر بیٹھ گیا۔

شاید باپ کی ہدایت کے مطابق وہ بھی زیادہ بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا..... شیو پوجن کی اسٹریٹجی سلامت اللہ کی سمجھ میں آگئی..... بال بچوں والا آدمی ڈر کے بھاگے نہیں تو کیا کرے؟

مگر اصل مسئلہ یہ نہیں ہے۔ شیو پوجن تو گیا جی سے نکلتا ہے اور کاشی چلا جاتا ہے اور چاہے گا تو کاشی سے اپنے ماما کے یہاں متھرا چلا جائے گا لیکن سلامت اللہ کیا کرے جس کو شیو پوجن نے زبردستی نیو کی اینٹ سونپ دی ہے!؟ ❁

مٹھی بھر نظمیں

ترجمہ

ندا فاضلی

کم یانگ شک

کم یانگ شک [پیدائش ۱۹۳۱ء] کورین زبان کی جدید شاعرہ ہیں۔ موسیقی اور مصوری سے ان کی دلچسپی ان کے موسیقار والد اور مصور والدہ کی وراثت ہے۔ فطرت کی قربت اور بڑے بھائی (جس کا اکیس سال کی کم عمری میں انتقال ہو گیا) کی ادبی ذہانت نے ان میں الفاظ شناسی کا رجحان بیدار کیا۔ کم کی شاعری کا آکاش کوریا کی جغرافیائی اور تہذیبی جگمگاہٹوں سے منور ہے۔ خوش الحان پرندوں، صنوبر کے اونچے درختوں، برف ڈھکے پہاڑوں، ہرے بھرے جنگلوں نے ان کے الفاظ کو غنائی امیجری میں ڈھالا ہے۔ ان کی نظمیں اپنی مخصوص ملکی شناخت کے باوجود کائنات میں انسان کی تہذیبی اور روحانی قدروں کی آفاقیت کی ترجمان ہیں۔ ان کی اس شعری خصوصیت کو سراہتے ہوئے کینیڈا کے مشہور شاعر نقاد اروِنگ لیٹن نے ایک بار کہا تھا۔ "ایسا لگتا ہے ورڈس ورتھ یا شاید ٹینی سن نے دوبارہ کوریا میں جنم لیا ہے۔" کم یانگ شک کی شعری دنیا میں ورڈس ورتھ، گوئٹے، رسل، شمالی ہندوستانی، ٹیگور (گیتانجلی کا انہوں نے کوریائی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے۔) کے ساتھ بودھ اور اپنشد کے فلسفہ (اپنشد اور بودھ دھرم پر انہوں نے مقالے لکھے ہیں) کے اثرات نمایاں ہیں۔ ان کے رموز و علائم کا مزاج تلمیحاتی اور پراسرار رہتا ہے۔

اس شاعرہ کی بچپن کی یادیں کوریا کی تاریخ کے تاریک دور کی نشانیاں ہیں۔ ان کی پیدائش سے شاید دو تین سال پہلے ٹیگور نے اپنی ایک نظم میں اس سیاسی استحصال کا یوں اظہار کیا ہے

ایشیا کے سنہری دور کا
روشن چراغ کوریا
اب کہاں ہے
مشرق کو اس کے دوبارہ روشن ہونے کا انتظار ہے۔

کم یانگ شک کی شاعری، ہنگامی موضوعات سے دور، انسان اور فطرت کے ٹوٹے رشتے کی بحالی کا تجسس ہے۔ ان کی مخصوص لفظیات میں یہ رشتہ نت نئے زاویوں میں جھلکتا ہے۔ کہیں یہ وقت کے تیز رو بہاؤ میں انسان کی وجودی بے بسی کا مرثیہ ہے۔ کہیں جسم اور روح کی کشمکش کا قضیہ ہے اور کہیں زمین و آسمان کی وسعتوں میں جبلتی آزادیوں کا نغمہ بن کر ابھرتا ہے۔ اس کا مزاج راہبانہ ہوتے ہوئے بھی اپنے عہد کی ذہنیت کی تخلیقی مصوری ہے۔

بَیل

جب صبح ستارے بجھ کر سو جاتے ہیں
تو بیل
آسمان کی طرف منہ کر کے ڈکراتے ہیں
ان کی ابھری ہوئی آنکھوں کی پتلیوں میں
قناعت کے آنسو جھلملاتے ہیں
اپنے دکھوں کو
جبڑوں میں جگالتے ہوئے
بیل ڈکراتے ہیں
اور ڈکراتے ہوئے
نئی صبح کے انتظار میں کہیں دور
نکل جاتے ہیں۔

ایک نظم

آؤ ہم
کسی پرانی دھن پر رقص کریں
آؤ ہم
کسی قدیم ساز میں نئی دھن بھریں

تمہارے ہونٹ اڑ کر
آکاش پر آدھا چاند بن جائیں
آؤ ہم
کسی پراچین نگر پہ
پرندوں سے ڈولیں
برستے بادلوں میں
اپنی اپنی چھتریاں کھولیں
میرے پستانوں کی وادی میں
کھو جاؤ
میں تم میں
تم مجھ میں
سو جاؤ
کسی گلی کے کیفے میں چھپ کر

سور
صلیب
اور عیسیٰ
سے دور ہو جائیں
کوئی میرا گیت گنگنائے
مجھے کیا، کوئی گورا ہے یا کالا۔
کوئی ایک آنکھ کا ہے
یا دو آنکھوں والا
اس شکستہ صلیب کے سامنے
اس شکستہ دھوپ گھڑی کے سامنے
مجھے کسی انجانی نیند میں اتر جانے دو
مجھے پیار کے آئینے میں سنور جانے دو

ایک پینٹنگ کو دیکھ کر

مرغے، مرغیاں اور بکرے
سیاہ چاند سے
برس رہے ہیں
انسان، مرغے، مرغیوں اور بکروں میں
بدل رہے ہیں
اور مرغے، مرغیاں اور بکرے
انسانوں میں ڈھل رہے ہیں
جانور نما یہ انسان
ہوا اور روشن کرنوں کی طرح
چاروں طرف بکھرتے ہیں
رات بھر
سیاہ چاند تلے
رقص کرتے ہیں۔

میرے دیس

میرے دیس!
تو لہسن کی گانٹھ کے سمان ہے
میری روح
میری جان ہے
جنگلی پیاز تیری پہچان ہے۔

میرے دیس!
تو کسی کی چٹائی پر سوکھتی ہوئی
لال مرچوں کے سمان ہے
انوکھی تیری شان ہے۔

میرے دیس!
تو سویا کی پھلیوں کے سمان ہے
جو نمک میں گل رہی ہیں
صدیوں سے مٹی کے برتنوں میں
روپ بدل رہی ہیں۔

میرے دیس!
تو مٹی کے برتن کے سمان ہے
تجھ میں گھل مل جانا ہی
میری پہچان ہے۔

میں اور میرا بھائی

جب وہ بیس اوپر ایک کا تھا
میں پندرہ کی تھی

جب وہ اکیس سال کی عمر میں مرا تھا
میں نے پندرہواں سال پورا کیا تھا

میرے آئینہ میں اب بیس اوپر نو کا اضافہ
لیکن اس کا ابھی تک اکیسواں سال ہے

وہ ہمیشہ اسی طرح جوان رہے گا
میرے مرنے تک
وہ بوڑھا نہیں ہوگا۔

فطرت کی گود

ایک اونچے پہاڑ کے نیچے
کالی پرانی چٹان کی دراڑ میں
ایک ننھا سا پودا جھانک رہا ہے
اس کے سر پہ ایک سفید پھول سجا ہے

مجھے نہیں معلوم
گھاس کی پتی کی طرح کمزور جسم
اور پتلی گردن کے وجود کا کیا نام ہے

ہزاروں سال بوڑھی چٹان
کوئل کی کوک
ہوا کا رقص
اور یہ ننھا منا سبز پودا
سب ایک دوسرے سے جڑے ہیں
کیونکہ یہ
فطرت کی گود میں پلے بڑھے ہیں۔

گوپو سینگ

گوپو سینگ سنگاپور کے ممتاز جدید شاعر ہیں۔ ان کے دو ناول "اگر ہم طویل خواب دیکھیں" اور "بلیدان" اپنے سماجی موضوعات اور طرز نگارش کے لحاظ سے کافی مشہور ہوئے۔ پہلے گوپو کا دوسرا ناول جو جدیت نام کی تباہ کاریوں میں بیسویں صدی میں انسان کے المناک مرثیہ کے روپ میں لکھا گیا ہے۔ روس کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان ناولوں کے علاوہ وہ کئی اہم ڈراموں اور کہانیوں کے مصنف بھی ہیں۔ "آئی وٹنیس" (عینی گواہ)، شاعر کی حیثیت سے ان کا پہلا تعارف ہے۔ ان میں شامل نظموں کے بارے میں، پروفیسر ایڈون تھمبو نے لکھا ہے۔

ڈاکٹر گوپو کی شاعری کا مرکزی موضوع فرد اور سماج کی عدم مطابقت کی کشمکش ہے۔

گوپو پیشے سے ڈاکٹر ہیں۔ ان کا مزاج حساس اور امید پرور باقی ہے۔ ان کی شاعری بھی ان کی نثری کاوشوں کی مانند زندگی کو وسیع انسانی تناظر میں جاننے پہچاننے کا عمل ہے۔ آج کے تجارتی ماحول میں جس میں محبت و انسانیت خرید و فروخت کی اشیاء بن گئی ہیں، ڈاکٹر گوپو اپنی تخلیقی سمتوں میں اس انسان کی تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں جو تاریخ کے لمبے رستے میں کہیں بکھر گیا ہے۔ اس مسلسل تلاش نے انھیں مغربی ہیئت پرستوں کی طرح اپنے ہی لاشعور میں مقید نہیں کیا ہے۔ وہ تیسری دنیا کے ہوشمند فن کار ہیں۔ ان کی سوچ سماجی اور تہذیبی ہے۔ ان کی شاعری میں سمندر، سورج، دن اور رات کے استعارے کائنات میں خیر و شر کے تضاد اور تصادم کے اشارے ہیں۔ تجارتی تہذیب میں انسانی اقدار کی گمشدگی، اور اردگرد کے غیر انسانی ماحول نے انہیں تنہا ضرور کیا ہے، لیکن ان کی تنہائی ان کی شعوری ناوابستگی سے روشن بھی ہے۔ یہی سماجی شعور ان کی شعری شناخت ہے۔ جہاں ہیں انفرادی ذات کا نوحہ گر بنانے کے بجائے ذات و کائنات کی سماجی ہم رشتگی کا نغمہ گر بناتی ہے۔

ڈاکٹر گوپو کا تخلیقی ذہن، اپنے دیس کے تاریخی شعور کے آئینے میں دوسری سرحدوں کو منعکس کرتا ہے۔ ان کی نظمیں جدید ہیئتی نیستی سے دور ہو کر بھی وقت کی المناکیوں کو شفقت آمیز بنانے کے فن سے واقف ہیں۔

گوپو کی شعری جمالیات فن میں قاری کی محویت کی نفی نہیں کرتی بلکہ اس محویت کی کچھ شرائط ضرور متعین کرتی ہے۔

کچھ بھی نیا نہیں

کچھ بھی نیا نہیں ہے
سب کچھ عادت بن چکا ہے

میں اب
کچھ بھی نیا نہ ہونے کے خوف سے
خوف زدہ نہیں ہوں

میرے اردگرد
بکھرتی ناآسودگیاں
مجھے اب نہیں جھنجوڑتیں

یہ ویران
سنسان خلائیں
جو آپ ہی آپ
وقت بنتی رہتی ہیں
کل
آج
ابھی
کافی عرصے سے میں نے
اس یکسانیت سے کھیلنا چھوڑ دیا ہے
ہر کھلونے کو توڑ دیا ہے

ہر دن
میں پتھریلی خاموشیوں کا درد سہتا ہوں
بار بار دیکھے ہوئے مناظر سے
گزرتا رہتا ہوں

ایسے جاگنے سے کیا فائدہ
ــ سورج کی ہنسی!
کسی نئے وعدے کا اعلان
اور پھر وہی
بوڑھا ہوتا خالی آسمان
درخت
بے حس آسمان کے آگے رقص کرتے ہیں
کچھ دیر لہراتے ہیں
اور پھر
بھوری سے ہری
ہری سے بھوری ہوتی
شام میں ختم ہو جاتے ہیں

ہر شام اسی طرح
صبح کا خواب لئے
رات میں ڈھلتی ہے
شام کا خواب لئے
صبح میں بدلتی ہے
کچھ بھی نیا نہیں ہے
سب کچھ عادت بن چکا ہے۔

ایک دوست کے ساتھ

ہم جیسے ہی
چاند کی شانت شیتل روشنی میں بھیگتے
درختوں کے درمیان سے گزرے
ایک انجانے خوف نے
میرے خیالوں کو منتشر کر دیا
میں نے سوچا
تم سے بات کرنا
تمہارے ساتھ چلنا
ایک ملاقات سے دوسری ملاقات تک
انتظار کرنا
کتنا طویل سفر ہے
لیکن زندگی مختصر ہے۔

چاند کو دیکھتے ہوئے ایک خیال

مجھے معلوم ہے
زندگی اتنی جلدی نہیں بدلتی

ایک رات
کئی دن
کئی سال
یہ سچ ہے میں تمام عمر
کسی امید کے سہارے
ناامید رہا ہوں
لیکن
اس کے علاوہ
کوئی اور چارہ بھی تو نہیں تھا۔



ایک منظر

عورت
ہاتھ میں پتے تھامے
پتے کو گھسیٹے جا رہی ہے
تیز ہواؤں سے ٹکرا رہی ہے
دو آنکھیں پیچھے سے
ان کو دیکھے جا رہی ہیں
میری خاموش مسکراہٹ میں
دبی کچھ خواہشیں جگمگا رہی ہیں۔

عثمان اوانگ

عثمان اوانگ [پیدائش ۱۹۳۰ء] ملیشیا کے اہم شاعر وادیب ہیں۔ وہ کئی شعری مجموعوں کے خالق ہونے کے ساتھ اپنے ڈراموں اور تنقیدی مضامین سے بھی ادب میں اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں۔ عثمان کا ادبی سفر ۱۹۴۸ء سے اب تک مسلسل جاری ہے۔ وہ ملیشیائی ادب کی ایک فعال آواز ہیں۔ عثمان کے ادبی شعور کی تعمیر میں ملیشیا کے دورِ غلامی کی احتجاجی تحریکات اور ۱۹۵۷ء میں ملکی آزادی کے بعد کے سماجی حالات نے اہم رول ادا کیا ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ہر دور میں عام آدمی کے ہم قدم رہے ہیں۔ ان کی اسی انسان دوستی نے انھیں کائنات میں وجودی تنہائیوں کے ماتم گسار بنانے کے بجائے زندگی کے حسن کا فن کار بنایا ہے۔ ان کی نظمیں درمیانی طبقے کی کتابی نا آسودگیوں اور ان سے تراشیدہ نفسیاتی الجھنوں کے دائرے سے آزاد ہیں۔ زندگی سے ان کی شدید محبت نے ان کے یہاں ظالم اور مظلوم اور خیر و شر کی واضح شناختیں متعین کی ہیں۔ ان کا شعری مزاج سیاسی اور مسائلی ہے۔ لیکن ذاتی تجربوں کی شمولیت نے اسے اکہری وضاحت سے محفوظ رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے ان کی نظمیں سیدھی اور ڈائرکٹ ہونے کے باوجود وقت کے ساتھ پرانی نہیں ہوئیں۔

عثمان کی ابتدائی شاعری پر اظہار و بیان کے روایتی پیرایوں کے گہرے اثرات ہیں، لیکن اپنے دیگر معاصرین کی طرح وہ وہیں تک محدود ہو کر نہیں رہ گئے۔ انھوں نے ادب کی بدلتی قدروں کو قبول بھی کیا ہے۔ اور ۱۹۵۰ء کی جدید ادب کی تحریک کو اپنے توانا شعری حسیت سے بھی نوازا ہے۔ عثمان اوانگ ملیشیائی ادب کا ایک ایسا نام ہے جو نئے اور پرانے دونوں حلقوں میں قابلِ احترام سمجھا جاتا ہے۔

عثمان کی شاعری اپنے سماج کی شخصی تنقید ہے جو آدمی کی عظمت کا قصیدہ بھی ہے اور اس کے دکھ درد کا مرثیہ بھی۔ ملیشیا کے ممتاز نقاد رحمان شادی نے عثمان کے بارے میں کہا "مجھے یقین ہے میری طرح میرے ہم وطن بھی اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ عثمان ہمارے ملک کا شہری ہے، ہماری دھرتی کا سپوت ہے۔"

تحفہ

میرے بچے نے ابھی بولنا نہیں سیکھا ہے
اس کا دل پیغمبر کے چہرے جیسا ہے
پُرنور
معصوم
اس کی مسکراہٹ اور آنسو
اس کے دل کے الفاظ ہیں
مہکتے پھولوں کی مانند
صبح کے سورج کے ہم راز ہیں
اس کا جنم دن ہر سال
یونہی میرے دوستوں کے تحفوں سے آباد رہے
ہر دل یوں ہی شاد رہے
لیکن
جنگی جہازوں اور خوفناک ٹینکوں سے
اس کی معصوم دنیا کو برباد نہ کرو
اُسے ایسے کھلونے مت دو
جو محبت اور انسانیت کے بجائے
اس کے دل میں نفرت کی آگ بھڑکائیں
اسے انسان سے جانور بنائیں
دنیا صرف بارود کا دھواں ہی تو نہیں ہے
اُڑتی چڑیا بھی ہے
نیلا آسمان بھی ہے
ہل چلاتا کسان بھی ہے
میرا بچہ ابھی معصوم ہے
اسے تو ایک ٹوٹی پنسل بھی ہنسا سکتی ہے

بچہ میرا ہو یا دوسروں کا
ان کے دلوں کو ابھی سے
ہتھیاروں سے گھائل نہیں کرو
انھیں جرائم میں شامل نہیں کرو
ان کے چہروں پر پیار کی روشنی رہے
یہی دنیا کے لئے
زندگی سے ان کی دوستی ہے۔

بوڑھے برگد کا قتل

اسی نو آباد شہر کے ایک راستے پہ
ایک بوڑھا برگد
اپنی مضبوط باہوں میں موسموں کو سمیٹے
اپنی جٹاؤں میں دھوپ کو لپیٹے
سیکڑوں سال سے کھڑا تھا
اس کی شاخوں میں چڑیاں گیت گاتی تھیں
اس کے اردگرد تتلیاں منڈلاتی تھیں
اس کی چھاؤں میں بچوں کی ٹولیاں
دن بھر ہنستی گاتی تھیں

اچانک ایک کالی صبح
ٹیکنالوجی کے بھیانک دیو نے
اپنے تیز نوکیلے دانتوں سے اس پر وار کیا
اور زمیں دوز کر دیا۔
یہ بہت پہلے کا واقعہ ہے
لیکن اب بھی جب شام آکاش پر پنکھ پھیلاتی ہے
خاموش فضاؤں سے کوئی کراہتی آواز آتی ہے

خدا حافظ چاند
خدا حافظ سورج
خدا حافظ گیت گاتی چڑیو
خدا حافظ ہنستے کھیلتے بچو!۔

میری محبوب

میری محبوب
میں سمندر کے جھاگ سے
ایک ریشمی ... بنوں گا
اس سے تجھے باندھ کے رکھوں گا۔

میں نغمہ بار موجوں سے
ایک قالین بناؤں گا
اُسے تیری آرام گاہ میں بچھاؤں گا۔

میں بادلوں کی
ایک اوڑھنی بناؤں گا
اُسے تجھے اوڑھاؤں گا۔

میں پہاڑوں کی کھلی ہواؤں سے
ایک شبینہ گاؤن بناؤں گا
اُسے تجھے پہناؤں گا۔

میں مغرب کے آسمان سے
ایک ستارہ توڑ لاؤں گا
اُسے تیرے آنچل پہ سجاؤں گا۔

میں آکاش کے چاند کو
دھرتی پہ لے آؤں گا
اس سے اپنی تیرہ آرزوئیں جگمگاؤں گا۔

میں جلتے سورج کو بجھا کر
تیری رات کے سمندروں میں نہاؤں گا
تیرے ہونٹوں کے شہد سے
جیون کی ہر کڑواہٹ کو بھلاؤں گا۔
میری محبوب
کتنے خواب ہیں جو
آسمانی فریبوں سے زمینی حقائق کا خون کرتے رہتے
اپنے آپ پہ ہنستے رہتے

۱۰۳، امر اپارٹمنٹ، ڈانڈ پاڑہ - ۱، کھار، بمبئی - ۵۲

مکتوبات

★ **شمس الرحمان فاروقی** — ۱۶ ہاشمی کمپاؤنڈ، نئی دہلی
تازہ شاعر میں مرحوم کے ایک خط کے کالم کا اہتمام اچھا لگا ہے۔ بعض غزلیں بھی بہت عمدہ ہیں۔ بعض غزلیں کمزور بھی۔

★ **خورشید افروز** — پینک ٹائنڈ، دوما نگر، ... (اگرات)
تمہاری انتھک محنت نے شاعر کو خوب سے خوب تر بنا دیا ہے۔ ہر شمارہ ایک نئی مثال قائم کر رہا ہے۔ تازہ مشترکہ شمارہ اپنی ترتیب و مواد اور گیٹ اپ کے اعتبار سے بہت اہم ہو گیا ہے۔ اپنے اداریے میں تم نے مختصر نظموں کی کمی کی بات اٹھائی ہے۔ وہ غلط نہیں۔ مجھے بھی اس بات کا احساس رہا ہے۔ خود میرا اپنا معاملہ یہ رہا ہے کہ میں نے ایک مدت سے اس طرف توجہ نہیں دی۔ مختصر نظم یا نظم، جو بھی ہو اس پر ایک بار پھر بحث ہونی چاہئے۔ گزشتہ شمارے میں شامل تمہاری "ننھی ہیر نظمیں" پسند آئی تھیں۔

★ **عبد القوی دسنوی** — عبد الس کالونی، لعت پورہ، حمید ... بھوپال
شاعر کا تازہ شمارہ پسند آیا۔ ۱۵ اسلامی ممالک کی ۱۵ کہانیاں ۵۲ شعرا — ۵۲ غزلیں۔ نیا پن ہے اور غور و فکر کی دعوت بھی ہے۔ ترتیب میں بھی ایک نیا حسن ہے۔ لیکن نثر نگاروں نے کیا قصور کیا تھا جو ان کی تصاویر شائع کرنے سے روک دی گئیں۔ کیا شعرا آپ کے شاعر ہونے کا ثبوت تو نہیں شمار ہوتے ہیں؟

★ **اسرار اکبر آبادی** — ۷/۲۳۳ اشوک نگر، (یوپی)
شاعر کی ایک اشاعت خاص کے ذریعہ آپ نے دنیا کے پندرہ ممالک کی طرف پندرہ کھڑکیاں کھول کر ہندوستان کے اردو قارئین کو دل کشا اور دل سوز تر تیب منظر مہیا کرائے ہیں۔ ہندوستان میں عالمی پیرائے سے تیار افسانے پر بحث و مباحثہ جاری ہے اور ناقدین ہنوز کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پائے ہیں۔ ایسے تصفیے میں دونوں شمارے خاص طور سے ممد و معاون ہوں گے۔ بشر طیکہ نیت خیر کی ہو۔ اشاعت خاص کی پیڈنگ اور طباعت جاذب نظر ہیں۔ شمارہ نمبر ۸ کے صفحات ۱۲۵ اور ۱۲۸ کی غزلیں ہمارے اعتبار سے گل نظر ہیں۔ صفحہ ۱۲۳ پر ایک مصرعے میں "رنگ" بروزن "رن" نظم ہو گیا ہے۔ یا تمیں صرف آپ کے حکم کی تعمیل میں لکھ دی ہیں۔ دونوں شماروں میں آپ نے مقبول و معروف شعرا کی تخلیقات شائع کی ہیں۔ آپ کی غزل آپ کے تخیلی اور سفری مزاج کی عکاس ہے۔ مبارکباد۔

★ **نامی انصاری** — ۱۹۹۸/۵ ... کنج، کانپور
شاعر کے تازہ شمارے کی ترتیب آپ نے بدل دی ہے اور حاشیے پر غزلیں شائع کی ہیں۔ مگر مسلم ممالک کے افسانہ نگاروں کی تخلیقات نئے ہی حروف میں شائع کی ہیں کہ ان کا پڑھنا دشوار ہے۔ مجھے ان کہانیوں کے پڑھنے میں دلچسپی تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ دوسرے ملکوں میں افسانے کے کیا رجحانات ہیں اور ان کی فنی حیثیت کیا ہے۔ آپ خود سوچئے کہ اگر دونوں شماروں میں ایک ایک افسانہ کم ہو جاتا اور اس کی جگہ نئی افسانے ذرا اور جلی حروف اور روشن طباعت کے ساتھ چھپتے تو یہ خاص شمارہ کتنا جاندار ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ ہو تا شاعر کے قارئین تک پہنچانے کی آپ کی خواہش اپنی جگہ غلط نہیں ہے مگر ہم جیسے زیادہ عمر کے قارئین کے لئے تو یہ ہلکی سیاہی اور مہین حروف دشواریاں پیدا کر دیتے ہیں۔

★ **سلیم شہزاد** — ۲۲۲ منگلوار وارڈ، مالیگاؤں (مہاراشٹر)
شاعر کا اسلامی ممالک کی کہانیاں نمبر موصول ہوا۔ اس بار آپ نے نسان شامل نہیں کیا اور رچہ کو انفرادیت دے دی۔ اداریے میں آپ نے لکھا ہے تو صحیح ہی ہو گا کہ پاکستانی اردو رسائل بشمار انگشت بھارت میں آتے ہیں۔ اور بشمار انگشت ہی پڑھے جاتے ہیں۔ ان سے بعض چیزیں بھارتی اردو رسائل میں ڈائجسٹ کر لی جائیں تو تباحت ہی کیا ہے۔ اس شمارے کے حاشیوں میں جو غزلیں آپ نے شامل کی ہیں۔ ان کا رنگ بھی انفرادی لگا مگر معلوم ہوتا ہے کہ اردو شعر و افسانہ کی لے کہیں اٹک گئی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ تنزل پر سیماب اکبر آبادی کا جو بیان آپ نے فکر امروز میں شائع کیا ہے اسے میں ادبی اصطلاحات کی فرہنگ میں تنزل کے ذیل میں شامل کر رہا ہوں۔

★ **راہی فدائی** — ۴۸/۷۸ بہان الدین اسٹریٹ، کڈپہ ۵۱۶۰۰۱
اشاعت خاص دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ آپ کی فکر رسالے کی انفرادیت کے نت نئے پہلو ڈھونڈ نکالتی ہیں۔ ایک ہی جلد میں ۱۵ مختلف زبانوں کے تراجم کو سمو دینا کرشمے سے کم نہیں۔ آپ کی مخلصانہ خدمات سے اردو ادب کے ذخیرے میں اچھا اضافہ ہو رہا ہے۔ آپ کے ان کارناموں کو تاریخ ادب اردو نہیں بھول پائے گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ غزلوں میں عرفان صدیقی، منصور سبزواری، صادق، نثیر جمال اور انور ندیم خوب نظر رہے ہیں۔

★ **پروین کمار اشک** — کرشنا داری بیٹھانکوٹ (پنجاب)
شاعر کا تازہ شمارہ بہت خوبصورت شائع ہوا ہے۔ اب یہ سادہ بہت آگے نکل گیا ہے۔ ۵۲ غزلیں بغور پڑھیں۔ کسی کسی غزل میں کوئی کوئی شعر دل کو چھوتا ہے۔ کئی نامی شاعر بہت ہلکے نظر آئے۔ بعض غزلیں خاصی روایتی ہیں۔ جن کی اشاعت کی چنداں ضرورت نہ تھی کہ ادب میں ایسی غزلوں سے کوئی اضافہ نہیں ہونے والا۔ تنے شمارے کا انداز پیش کش بڑا دل خوش کن ہے۔

★ **محمد اسلم** — پوسٹ نمبر ۱۶۳۰ الدھیری (ویسٹ) بمبئی ۵۸
شاعر کی اشاعت خاص، خاصہ تنوع لئے ہوئے ہے۔ اسلامی ممالک کی کہانیاں عمدہ ہیں۔ بعض کہانیاں تو دل میں ترجمانی ہیں، جن میں زائد المیلاد تھی، ویکھی میں، میں مشتبہ ہوں، مجازی ملا۔ نجیب محفوظ اور مرساعلی زادہ (ایران) کی کہانیاں بکواس ہیں۔ ندا فاضلی کی غزل ... سہل انہیں پڑھ چکا ہوں۔ آپ نے دوبارہ کیسے شائع کر دی؟ شاعر کا یہ شمارہ دلچسپ ہے۔ ایک کہانی میں مترجم ہوں، میں مشتبہ ہوں، میں آخری پیراگراف میں صدر مترال کی جگہ شاید صدر، صدام ہونا چاہئے تھا۔ یا مصر مترال کا نام بھی تو میں میں نہ رہنا چاہئے تھا۔ مکتوبات میں ندا فاضلی کا خط قابل توجہ ہے۔

اور قابل عمل بھی۔ میں ان سے متفق ہوں۔ اکمل فضل مرزا کے خط کے مندرجات بھی قابل توجہ ہیں۔ میں کیا، بیشتر قارئین شاعر کو اس طرح کا رسالہ دیکھنا چاہتے ہوں گے۔ جس میں سیاست، آرٹ، کلچر، سائنس، مذہب، تاریخ، جغرافیہ جیسے موضوعات شامل ہوں۔ ممکن ہے کہ آپ بھی ایسا ہی سوچتے ہوں۔ لیکن وسائل کی کمی راہ روکتی ہے۔

★ **شاہد عزیز** — ۱۶۹ اسلام تلائی ملاوے، ہوارہ ۳۲۳
شاعر کا تازہ شمارہ اپنی اشاعت خاص کی وجہ سے ایک خاص نمبر کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے کمال کیا ہے کہ ۱۵ اسلامی ممالک کی ۱۵ بہترین کہانیاں اپنے پڑھنے والوں کو ایک تحفے کے روپ میں دی ہیں۔ مرساعلی زادہ کی کہانی "مرشہاب" دل کو چھو کر گزر گئی۔ کیا خوب کہانی ہے۔ اس کہانی کی روانی ایسی ہے، جیسے کوئی جلتی ہوئی بہتی چلی جا رہی ہوں۔ بڑا مختلف اسلوب ہے اس کہانی کا اس قدر خوبصورت اشاعت میں شامل غزلیں بھی اتنی ہی معیاری ہوتیں تو دل خوش ہو جاتا۔ مگر افسوس کہ زیادہ تر غزلیں اس معیار کی نہیں کہ انہیں کسی اشاعت خاص میں شامل کیا جائے۔ خاص طور پر ... اور بشیر بدر کی غزلیں۔ مشاعروں میں تو یہ دودھ کے کٹورے اور چٹنی خوب چلتی ہیں۔ مگر ادبی رسالوں میں ادب چاہئے۔ اب ان سے کون کہے کہ اگر اچھا کچھ نہیں لکھا جا رہا ہے تو کچھ دن آرام کر لیں۔

★ **ارشد کمال** — ۲۴۴ بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی — ۲۵
پندرہ اسلامی ممالک کی پندرہ کہانیوں پر مشتمل شاعر کے دو شمارے (۷—۸) ایک ساتھ ملے۔ ہمیشہ کی طرح پیش کش میں ایک سلیقہ ہے۔ ترتیب حسن ہے۔ لیکن اداریہ پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ کہانیاں 'مانگے کا اجالا' ہیں۔ یہ تسلیم کہ جس پاکستانی رسالے (سہ ماہی ادبیات) سے یہ کہانیاں لی گئی ہیں۔ ہندوستان میں اس کے پڑھنے والوں کی تعداد نہیں کے برابر ہے۔ تاہم شاعر جیسے رسالے میں کسی دوسرے رسالے سے مستعار لی ہوئی کہانیوں کو ایک اشاعت خاص کے تحت پیش کرنا سوائے سہل پسندی کے اور کچھ نہیں۔ جس رسالے کے پاس "تراجم اور طبع زاد کہانیوں کی کمی نہیں رہتی" اسے کیا ضرورت ہے کہ وہ اپنے قارئین کو شائع شدہ کہانیاں پڑھنے پر مجبور کرے۔ کسی ایک شمارے میں اس طرح کی ایک یا دو تخلیقات شامل اشاعت ہوں تو قابل برداشت ہوتی ہیں۔ لیکن مکمل دو شماروں کو ان سکنڈ ہینڈ کہانیوں کے لئے وقف کر دینا چہ معنی دارد؟ قاری کی بھی اپنی ایک نفسیات ہوتی ہے۔ اور ایک باذوق مدیر ہونے کے ناطے آپ کو اس بات کا اندازہ ہونا چاہئے کہ مستعار لی ہوئی چیزیں (خواہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہوں) خود کو قاری سے پڑھوانے پر مجبور نہیں کر سکتیں۔ ممکن ہے میری یہ باتیں آپ کو ناگوار معلوم ہوں اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ مدیر رسالہ کی ہاں میں ہاں ملانے والے حضرات آپ کی اس سہل پسندی کو غیر معمولی ہوش کا نام دیں۔ لیکن میں تو وہی

کہوں گا۔ جو خدا لگتی بات ہوگی۔ خدارا اسطرح کی 'اشاعت خاص' سے شاعر کے وقار کو مجروح نہ کریں۔ شعری حصہ مجموعی طور پر شاعر کے اپنے معیار پر پورا اترتا ہے۔ تاہم اس میں شامل متعدد غزلیں مطبوعہ ہیں۔ شاید اسکی وجہ یہ ہے کہ ان تخلیقات کی چھان پھٹک کر کے متعلقہ قلمکاروں کو کوئی واضح جواب دینے میں آپکو اتنا زیادہ وقت لگتے ہیں کہ اس درمیان یہ چیزیں کسی دوسرے رسالے کی زینت بن چکی ہوتی ہیں۔ بہر کیف ایک عرصہ کے بعد 'شاعر' کے صفحہ پر آپ کی غزل پڑھنے کو ملی یوں تو پوری غزل سے پختہ کاری کی خوشبو آرہی ہے۔ تاہم یہ شعر ذہن سے چپک کر رہ گیا ہے۔

عجب گھٹن سی ہے مجھ میں کہاں یہ قید ہوں میں
زمین پاؤں تلے، آسمان سر پر ہے

★ایک تبصرہ

ماہنامہ شاعر اردو کا وہ رسالہ ہے۔ جو گزشتہ ۶۴ برسوں سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں قطعاً کوئی باک نہیں کہ شاعر کا ادبی مزاج شروع سے ہی منفرد رہا ہے۔ نئے لکھنے والوں اور نئے موضوعات کی تلاش اور انھیں اردو والوں سے متعارف کرانے کی کوشش۔ اس 'مزاج' کی اہم خصوصیتیں ہیں۔ ہمارے اہم شعروں اور ہم عصروں میں ایسے کئی مشہور نام مل جائیں گے جن کی ہمت افزائی کرنے میں اور جنھیں ادبی دنیا سے متعارف کرانے میں اعجاز صدیقی مرحوم نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ اردو والوں کی بے حسی اور مالی وسائل کی کمی کے باوجود افتخار امام صدیقی اور ناظر نعمان صدیقی نے اس سلسلے کو منقطع نہیں ہونے دیا۔ پچھلے چند برسوں میں افتخار امام صدیقی نے کئی اہم یک موضوعاتی شمارے شائع کئے ہیں۔ میری دانست میں زیر تبصرہ شمارہ پچھلے تمام یک موضوعاتی شماروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہم اور وقیع ہے۔ اس سے پہلے بعض رسالوں مثلاً 'ذہن جدید' اور 'شب خون' وغیرہ میں فلسطینی اور لبنانی کہانیوں کے تراجم شائع ہوتے رہے ہیں لیکن ترکی، شام، عراق، مصر، ازبکستان، آذربائیجان اور تاجکستان جیسے اسلامی ممالک کے افسانوی ادب سے اردو کا قاری تقریباً ناواقف اور نابلد رہا ہے۔ جیسا کہ مدیر شاعر نے اپنے ادارتی نوٹ میں وضاحت کر دی ہے کہ شاعر کے زیر نظر شمارے میں شائع ہونے والی تمام کہانیاں مجلہ 'ادبیات' کے ایک خصوصی نمبر سے مستعار ہیں۔ لیکن چونکہ ادبیات ہمارے ہندوستان میں دس بارہ ادیبوں یا شاعروں تک ہی پہنچ پاتا ہے۔ اسلئے تمام قارئین کے لئے یہ کہانیاں بالکل نئی ہیں۔

آجکل ہمارے یہاں اس بات پر بہت زور دیا جا رہا ہے کہ افسانے کو زمین سے جڑا ہوا ہونا چاہئے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ افسانہ نگار کا بنیادی فرض عصری حقائق کی فنی ترجمانی کرنا ہے۔ انہیں پڑھ کر مجھے خوشگوار تعجب ہوا کہ ان سے لے کر تاجکستان تک کے زیادہ تر افسانہ نگار غیر معمولی حد تک اپنے اپنے ملک کے تلخ و ترش اور حساس مسائل سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان افسانوں کا اسلوب صحافتی بھی ہے اور براہ راست بھی۔ لیکن دونوں طرح کے افسانے بہر حال ایسی شدت تاثر کے حامل ہیں۔ جن سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثال کے طور پر زیر نظر شمارے کا پہلا افسانہ 'مرثیہ آب' جو ایرانی افسانہ نگار مرسالی زادہ کا تحریر کردہ ہے اور جس کا ترجمہ حسین القاقی نے کیا ہے۔ بنیادی طور سے احتجاجی افسانہ ہے۔ اس افسانے میں ایک خاتون کی اعصابی اور نفسیاتی کشمکش کو بڑے اچھے ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ مجھے مراکش کے طاہر بن جلون کا افسانہ 'میں عرب ہوں، میں مشتبہ ہوں' بھی بہت پسند آیا۔ اسے محمد عمر میمن نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار محمد بو سعید برسوں سے اپنے بال بچوں کے ساتھ ہالینڈ میں مقیم اور پیشے کے اعتبار سے ایک معمولی مزدور ہے۔ بو سعید ایک سیدھا سادا مسلمان ہے۔ نماز پابندی سے نہیں پڑھتا۔ لیکن روزے رکھتا ہے۔ اس کی روز مرہ شہری زندگی میں سیاست کا کوئی عمل دخل نہیں ہے اسکے بچے اس حد تک مقامی کلچر کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں کہ وہ ان سے عربی میں گفتگو کرتا ہے تو وہ فرانسیسی میں جواب دیتے ہیں۔ اسکے باوجود خلیجی جنگ کے بعد دوسرے عربوں کی طرح اسے بھی فنڈامنٹلسٹ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اسے طرح طرح سے محض اسلئے ذہنی اذیت میں مبتلا کیا جاتا ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ آخر میں بو سعید خدا اور رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دہائی دے کر التجا کرتا ہے کہ 'ہم عربوں کے ساتھ کچھ تو التفات کیا جائے ہمیں کچھ کم شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جائے اور محبت نہ سہی کچھ تو عزت تو کی جائے۔' محمد بو سعید دراصل ان تمام عربوں کی علامت ہے جو برسوں سے مختلف مغربی ممالک میں آباد ہیں۔ یہ لوگ چھوٹے موٹے کام کر کے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں انہیں سیاست سے اگر کوئی دلچسپی ہے تو صرف اتنی کہ جب امریکہ اتحادی ہزاروں بم عراق پر گراتا ہے تو عراقی نہ ہونے کے باوجود مسلمان ہونے کے ناطے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ اپنی تکلیف کا اظہار بھی نہیں کرتے پھر بھی مغربی ممالک کے شہری انہیں مشتبہ سمجھتے ہیں انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان پر دھاوا بولتے رہتے ہیں۔ 'میں عرب ہوں، میں مشتبہ ہوں' ایک حقیقت پسندانہ اور بے حد دردناک افسانہ ہے۔ اس درد کی شدت کو افسانہ پڑھ کر ہی سمجھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ شامی افسانہ نگار عارف الخوری کا افسانہ 'کوہزاد' 'ملیشیائی فیبیلی کا ایک گانا' ذراسی لڑکی' فلسطینی زین العابدین الحسینی کا 'قمیص' پہلے پڑھا جا چکا ہے اور آذربائیجان کے انور محمد خانلی کا افسانہ 'برف کا مجسمہ' بھی ہم عصر تلخ حقائق کا مظہر اور موثر اظہار ہیں۔ ان افسانوں کا مطالعہ کم از کم میرے لئے ایک نیا ادبی تجربہ ثابت ہوا ہے۔ 'شاعر' کے وسیلے سے مختلف افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے ملک کے بارے میں جو انکشافات کئے ہیں وہ اردو قارئین کیلئے یقیناً نئے بھی ہیں اور انوکھے بھی۔ اسلامی ممالک سے متعلق سیاسی اور تفریحی مضامین تو آئے دن ہم پڑھتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن ان افسانوں کا مطالعہ ہمیں ایک بالکل نئی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ جن لوگوں کو بھی ادب سے عموماً اور اسلامی ممالک کے ادب سے خصوصاً تھوڑا بہت بھی لگاؤ ہے انھیں شاعر کا یہ شمارہ ضرور خریدنا، پڑھنا، پڑھ کر محفوظ کر لینا چاہیئے۔ صوری اعتبار سے بھی مدیر شاعر نے زیر نظر شمارے میں ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ دونوں کے ہر دو صفحات کے دائیں اور بائیں حاشئے میں ایک ایک غزل شاعر کی تصویر کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ غزلوں کے درمیان والے حصے میں نثر ہے۔ اسطرح یہ پرچہ زیادہ دیدہ زیب ہو گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس عمل میں بہت سے پائے کے شاعروں کے ساتھ کچھ اچھے شاعر بھی MARGINALISE ہو گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ افتخار امام نے جان بوجھ کر ایسا نہ کیا ہو۔ لیکن ہمیں یہ بات بھی کھٹکی کہ کیونکہ اسوقت غزل کے نام پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کا بیشتر حصہ واقعی اس قابل ہے کہ اسے حاشیہ بندی اور حاشیہ آرائی سے زیادہ اہمیت نہ دی جائے۔

فضیل جعفری ——— مدیر روزنامہ انقلاب (ممبئی) ادبی ایڈیشن —
۱۵ دسمبر ۱۹۹۳

★شاہد اختر ——— مغل پورہ، سہسرام ۸۲۱۱۱۵

شاعر کا تازہ شمارہ اپنی صحت مند روایت اور مخصوص اجتہادی حیثیت کی بنا پر بہت ہی دلکش ہے۔ اس میں ہر جگہ آپکی محبت اور سنجیدگی نمایاں ہے۔ ہندوستان کی سطح پر شائع ہونے والے ادبی رسائل میں شاعر اپنی مثال آپ ہے۔ غزلوں میں صدیقی مجیبی کی غزل مشترکہ شمارے کی جان ہے۔ باد مخالف کی زد میں اردو شاعری کے چراغ کو جلائے رکھنا بہر حال ایک اہم ادبی فریضہ ہے۔ قابل احترام ہیں وہ شعراء جو اس سلسلے میں اپنا خون جگر صرف کر رہے ہیں۔ اس شمارے کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں بے روح غزلوں کی بھرمار نہیں ہے۔ جو دیگر رسائل کا مقدر بنی ہوئی ہے۔ نئی نفسیات نئی شعری جہات کا سلسلہ واقعی بہت اہم ہے۔ اس کو جاری رکھنے تک نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

★دلکش نازی پوری، جوادیہ عربی کالج محمد آباد گہنہ بنارس

شاعر کا نیا مشترکہ شمارہ بلا مبالغہ اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ کہانیوں کے انتخاب میں آپ نے جس چابکدستی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ آپ کا حصہ ہے۔ ہر کہانی سبق آموز اور ترجمہ عمدہ ہے۔ میری جانب سے ان کہانیوں کے تخلیق کار اور مترجمین کو مبارکباد۔ آپ سے ایک التماس اور ہے جو کہانیاں شامل انتخاب نہیں ہو سکیں انہیں بھی شائع کر دیجئے۔

★مسرور قیصر ——— اشرف نگر، ہونیگرا ۸۲۳۲۰۱ (بہار)

شاعر کا مشترکہ شمارہ شاندار اور قیمتی تخلیقات کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ کہانیوں میں 'شناخت' اور 'تنور' کے علاوہ 'وان سے دان' اور دیہاتی لڑکی' پسند آیا۔ ان کہانیوں میں گرچہ کوئی نیا پن یا جدت نہیں ہے یا موضوع کے لحاظ سے نئی کہانی کے زمرے نہیں

اصغر نے بنام آپ کے ترنتی حسن اور سلطنۃ مندی نے انہیں
قابل مطالعہ بنا دیا ہے۔ شعری حصہ اپنی انفرادیت کی غمازی کر رہا
ہے۔ شاعری ہر زمانے میں اپنے عہد کی عکاس رہی ہے اور شاعر
کے مختلف جذبات و احساسات کی ترجمان بھی۔ اس لئے آج بھی
شاعری کو عروج حاصل ہے۔ البتہ تو یہ شاعری کی وہ خصوصیات
جس کے ذریعے میں جذبات اور وقت کی عکاسی کا اظہار ہوتا
رہا ہے۔ وہ جب وقت دسمبر ہوتی جا رہی ہیں۔ آج کا شعر و ادب
سیاسی، مشینی اور معاشی مسائل کا شکار ہو رہا ہے۔ ادب و شعر کی
علامات تبدیل ہو رہی ہے۔ لیکن اس کی روح مرتی جا رہی ہے۔
میرے خیال میں ایسا نہیں ہونا چاہئے۔

★ سعادت حسین — سید اور دادرانی، ممبئی نگر، کلکتہ، بہار
اسلامی ممالک کی کہانیوں اور غزلوں پر مشتمل یہ شمارہ بہت
پسند آیا۔ شمارہ نمبر ۹ میں ہم بن بالوں کی کہانی 'میں عرب ہوں'
میں مقتبس ہوں' شائع کی ہے۔ اس قدر بہتر ترتیب و تزئین اور
انتخاب پر ادارہ شاعر کو مبارکباد۔ ہر شمارہ ایک نئے تنوع کے ساتھ
پڑھنے کو مل رہا ہے۔

★ سید محمود راشق — قطعہ شہید، سیلاب، سدا گھور،
آپ جس باقاعدگی اور اہتمام کے ساتھ 'شاعر' نمبر شمارہ شائع
کر رہے ہیں۔ اس کے لئے آپ لائق صد تحسین و مبارکباد ہیں۔
شاعر کا اعلیٰ معیار اور دلکش کتابت و طباعت مثالی ہے۔ پرورست
اسلامی ممالک کی کہانیوں کے تراجم آپ نے شائع فرمائے ہیں۔
اس سے مختلف ممالک کے مزاج شناخت و ادب کو سمجھنے میں مدد
کی۔ حسین کی ذی رو سے لگی آپ کی معیاری غزل پڑھ کر تخیلات کی
گہرائیوں میں گم ہو گیا۔ حامد اقبال صدیقی اور سیم محمد وقی دونوں
نے متاثر کیا۔

★ محمد وسیم ندوی — ۲۲ / ۲۳، دھلائی مارکیٹ ایریا،
مشہد

شاعر کے بدن پر اسلامی ممالک کا جبہ اچھا لگا۔ میرا خیال ہے
کہ کبھی کبھی روایتی لباس کے علاوہ دوسرے طرز کا پہناوا بھی
استعمال کرنا چاہئے۔ گستاخی معاف ہو تو عرض کروں آپ کی ایک
خوبصورت نوسکے کی غزل شائع ہوئی ہے۔ تاہم مطلع کے مصرعہ
ثانی میں کہیں کہیں کلام ابھی خامی ہے۔ نفس ترتیب لفظی کو دیکھیں تو
عجیب سا ضرب۔

★ نسیم سہسرامی — سر اقبال اکیڈمی، پیرو، بھوج پور۔
(بہار)

'شاعر' شمارہ نمبر ۷ اور ۸ کمال سے زیادہ پسند آیا۔ لکھا ہے
شاعر کو خوب سے خوب تر بنانے کے سوا آپ کی زندگی میں اور
کوئی کام نہیں ہے۔ شعری حصے میں بعض فنی سقم آپ کی توجہ
چاہتے ہیں۔

محسن زیدی:۔ مرزبیس شکل جلد بہ جلد و مل جاتی ہوتی
آخری لفظ مخفی جا رہا ہے
کلیم عمیدی:۔ کسی اداں کو نج شور کا تیرے دل میں

یہاں کہا جاتا تو بہتر تھا کسی اداں تیرے دل میں گونج شور کا
اور نہ سم عمی کا سایا بدری کی بجلیے اعمی غصیلیں ہوتا ہے
کا لفظ 'سایہ' ہے
مزار اور سی سنہری ایک لہر تجھے بہا کے لے گئی کہاں
لہر وزن اور ہے۔ نہ کہ سفر تقیر کا شعر ہے:

عشق پیری میں عمر کہاں تک
یہ بھی اک لہر ہے جوانی کی

نندہ قیصر کی غزل عمر میں غوطہ کھا رہی ہے۔ جو تھے شعر میں
اجتماع ردیفین ہے۔ یوسف جمال نے (مکتوبات) لکھا ہے کہ
تیور، 'دستخط' اور 'معنی' صرف جمع آتے ہیں۔ لیکن فرہنگ
آصفیہ میں 'معنی' کی جمع 'معین' اور 'معانی' موجود ہیں۔

★ مظہر امام — بی ۲۹/۱۲ پاکٹ — ۴ مسعود بہار بیس — دہلی
شاعر کا اسلامی کہانیاں نمبر دیکھا تو طبیعت خوش ہو گئی۔
ادبیات تک کتنے لوگوں کی رسائی ہے؟۔ اس طرح کا کام اگر شاعر
آئندہ بھی کرتا رہے تو اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا۔ اور عصر جس
سلیقے سے نثر اور نظم کی سیٹنگ ہوتی ہے اس کا جواب نہیں۔ میں
دیر تک دل ہی دل میں داد دیتا رہا، اپنے بعض دوستوں سے اس
کی تعریف کر بیٹھا۔ مبارکباد۔

★ ضیاء الانجم — کے ٹکس روسے مصدر بازار، جبلپور،
آپ بیش قیمت اور شمارہ پیش کر کے ادبی دنیا میں ہل چل مچا
دیتے ہیں۔ آپ کے یہ تحسین قدم ادبی دنیا کے لئے مشعل راہ ہے کم
نہیں۔ کہانیاں بھی پسند آئیں۔ ان کہانیوں کے مترجم لائق ستائش
ہیں۔ دیگر زبانوں کے تراجم ایک دوسرے کو قریب لاتے ہیں۔
اپنی اور ان کی سوچ کا جب موازنہ کرتے ہیں۔ تو ایک عجیب سی
کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ امید ہے آپ آئندہ بھی اس نوع کے
شمارے شائع کریں گے۔ غزلیات میں صد بخش مجھی نے 'دل کا
قافیہ کھل' باندھا ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے؟۔ نسیم محمد وقی نے
اپنی ایک غزل میں 'مرے ملنے' باندھا ہے۔ یہ ترکیب کچھ عجیب
سی لگتی ہے۔

★ سہیل اختر — ۱۵۱ 'ستیہ نگر' بھونیشور، اڑیسہ
مذکورہ شمارے کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ کا
خلوص، محنت و مشقت اور تزئین کے لئے بہترین چیز پیش
کرنے کا جو جذبہ ہے ہر صفحے سے عیاں ہے۔ شاعر پڑھنے کے بعد
ادبیات' کا وہ شمارہ جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے۔ پڑھنے کا بڑا
اشتیاق پیدا ہوا۔ لیکن پاکستانی رسالوں کی دستیابی کا جو مسئلہ ہے
اسکا علم کسے نہیں ہے۔ سو دل مسوس کر رہ جانے کے سوا چارہ
بھی کیا تھا۔ آپ کی کوشش لائق تقلید ہے۔ ویسے 'نقوش جدید' میں
غیر ملکی ادب پیش کرنے کی کوشش شروع سے ہی جاری ہے۔
لیکن بقیہ ادبی رسالے اس جانب متوجہ کیوں نہیں ہو رہے ہیں۔ شاید
ادارت کی کرسی پر بیٹھے بیٹھے مدیران ذرا
سہولت پسند ہو گئے ہیں۔ غیر ملکی ادب چھوڑیئے ہندوستان کی
مختلف زبانوں میں جو ادب تخلیق کیا جا رہا ہے۔ کیا ان مدیران کا

فرض نہیں ہے کہ قاری کو اسی سے باخبر رکھیں؟۔ ادبی رسالے
والا قاری سب پڑھتا ہے ہی بے توقف دسترخوان پر سب کچھ
چن دے اسے کھانے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ نا کھانے تو بھوکا
مرے۔ مدیروں کا کام جب یہ بھی چل رہا ہے۔ تو انہیں محنت
جاں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جہاں تک آپ کی منتخب شدہ
کہانیوں کا سوال ہے تو مجھے لگا آپ کے انتخاب کے معیار نے
بہت سی اعلیٰ کہانیوں کو انتخاب کے دائرے کے باہر ہی چھوڑ دیا
ہے۔ (اور یہ میں آپ نے اعتراف بھی کیا ہے) پھر بھی 'مرثیہ
آپ (ایران)، تنور، (عراق)، کوہ زلزلہ (شام)، میں عرب ہوں میں
مقتبس ہوں (مراکش) اور دوسرے حصے میں فلسطین پہلے مر جاتا ہے
(فلسطین) اور برف کا مجسمہ (آذر بائیجان) کی کہانیاں لاجواب ہیں۔
خاص طور سے ایرانی اور فلسطینی کہانیوں نے تو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔
غزلوں کا انتخاب بھی خوب ہے۔ ہاں کہیں کہیں یہ ضرور یہ
محسوس ہوا کہ آپ نے اچھی تخلیقات پر بڑے نام والوں کو ترجیح
دی ہے۔ مکتوبات میں رزاق ملانی صاحب نے بڑے اہم سوالات
اٹھائے ہیں۔ ان کے خیالات سے میں پوری طرح متفق ہوں۔
میرا بھی یہی خیال ہے کہ جس راستے کی انہوں نے نشاندہی کی
ہے۔ اس پر چلنا مدیر، قاری اور تخلیق کار سب کے لئے سودمند ہی
ہوگا۔ مکتوبات میں کچھ ایسے خط بھی ملے۔ جس میں نئی نسل کی
تخلیقات کو 'تیسرے درجے' کی تخلیقات اور نئی نسل کو
EASY GO کہا گیا ہے۔ محترم بزرگوں سے یہ تو نہ ہو سکا اپنا ادبی
ورثہ نئی نسل کو سونپتے، الٹا اسے لعنت ملامت کرنے میں لگے
ہوئے ہیں۔ ادبی شخصیت کے پیدا ہونے اور معتبر
ہونے میں وقت تو لگتا ہی ہے اور پھر مزید یہ کہ نئی
نسل کے تخلیق کاروں کے سامنے جو چیلنج ہے وہ پہلے کسی دور کے
لکھنے والے کے ساتھ نہیں تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ محترم
بزرگوں کو یہ احساس ہو گیا ہے کہ اب ان میں وہ دم خم باقی نہیں رہا
ہے اور وہ پوری قوت سے نئی نسل کے خلاف پروپیگنڈہ میں لگے ہوئے ہیں یا یہ بات ہے کہ نئی نسل سے وہ
بوکھلا گئے ہیں۔ خیر 'شاعر' سے ہی کو اور نیچے کر آپ نے جو
راستہ چنا ہے اس پر چلتے رہیں۔ خدا آپ کے عزائم کو مستحکم اور آپ کو
کامیابی نصیب فرمائے۔

★ صادق نواب — محسن منزل، شاستری نگر، کھپولی —
۴۱۰۲۰۸

شاعر کا نیا مشترکہ شمارہ بہت خوب ہے۔ سرورق جاذب نظر
ہے۔ ترتیب و تہذیب میں ایک مختلف جمالیاتی حسن ہے۔ تمام
کہانیاں متوجہ کرتی ہیں۔ اس سلسلے کو جاری رکھیے۔ یہ آپ اچھا
کر رہے ہیں کہ شعراء کو نظم کی طرف راغب کر رہے ہیں۔ اردو
میں اب اچھی نظموں کا خزانہ خالی ہو رہا ہے۔ مختصر نظمیں تو خال
خال ہی پڑھنے کو ملتی ہیں۔ نظم کی دیگر اصناف کی طرف بھی شعراء کو
متوجہ ہونا چاہئے۔ نئی نسل کے شعراء غزل کے ساتھ گیت، رباعی
اور پابند نظموں کی طرف بھی آئیں۔

... BOMBAY-400 008.
64 Years of Publication ❋ (Publishing Date 27-28) ❋ Issue No. 11-12-1993 ❋ Telephone No. 359904.
Registered with the Registrar of Newspapers at R N No 14482/57